بدلا میرے ہمراز کا رنگ

فرحت اشتیاق

پیش لفظ

''بدلا میرے ہم راز کا رنگ'' میری اُن تحریروں کا مجموعہ ہے جن میں، میں نے مزاح کی چاشنی شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں سمجھتی ہوں مزاح لکھنا سنجیدہ تحریر لکھنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ یوں اِس مجموعے میں شامل تمام تحریریں مجھے اپنی بقیہ تحریروں سے زیادہ عزیز ہیں کہ اِن میں، میں نے اپنے قارئین کے لبوں پر مُسکان لانے کی بڑی سنجیدہ کوشش کی ہے۔

اگر میرا لکھا کوئی ایک جُملہ، کوئی ایک لفظ بھی مصائب میں گھرے میرے کسی ایک بھی قاری کے لبوں پر مسکراہٹ لے آیا تو میں سمجھوں گی میں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ لکھنے کی اِس صلاحیت کا حق ادا کر دیا۔ گوناگوں مسائل میں گھرے میرے ہم وطنوں کو اِس وقت کسی چیز کی اگر سب سے زیادہ ہے تو وہ ایک ہنسی، ایک دل خوش کُن بات، ایک مُسکان ہی ہے۔

آخر میں، میں علم و عرفان پبلشرز خاص طور پر جناب گُل فراز احمد صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے میری گذشتہ کُتب کی طرح اِس کتاب کی بھی انتہائی خوبصورت اور معیاری انداز میں اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔

فرحت اشتیاق

بدلا میرے ہم راز کا رنگ.....

سقراط، بقراط قسم کی لڑکیاں مجھے ہمیشہ ہی سے زہر لگتی ہیں۔ بہت دقیق، فلسفیانہ، عالمانہ اور ادبی طرزِ گفتگو اور وہ بھی کسی لڑکی کے منہ سے ،میرے لیے بڑی ہی ناقابلِ برداشت قسم کی چیز ہے۔ اسی ناپسندیدگی کی وجہ سے مجھے ثوبیہ محسن بھی بری لگا کرتی تھی۔ پتا نہیں یہ لڑکی خود کو سمجھتی کیا تھی، ارسطو کی جانشین یا پھر افلاطون کے خاندان کا کوئی فرد۔ عام لڑکیوں والی تو اس میں کوئی بات تھی ہی نہیں۔ نہ بننے سنورنے کا شوق، نہ جیولری نہ میک اپ۔ ہر وقت کتابوں، اخبارات اور جرائد میں منہ دیے پتا نہیں کون سے الجھے ہوئے مسائل کا حل تلاش کیا کرتی تھی۔ اس کے لیے تفریح کی بہترین جگہ یا تو کوئی لائبریری تھی یا پھر کوئی بک فیئر، کوئی سیمینار، کوئی سائنسی نمائش، کتابوں سے اس کا اتنا عشق دیکھ کر مجھے اکثر اپنے بچپن کا ایک شعر یاد آ جایا کرتا تھا جو میرا جگری دوست فراز اکثر سنایا کرتا تھا۔

ہمیں دنیا سے کیا مطلب مدرسہ ہے وطن اپنا
کتابوں میں دفن ہوں گے، ورق ہو گا کفن اپنا

پتا نہیں یہ شعر اس نے کہاں سے سنا تھا۔ مجھے چونکہ شعر و شاعری سے کوئی علاقہ نہیں اس لیے اس بارے میں قطعی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا اور ثوبیہ کو دیکھ کر مجھے اکثر فراز اور اس کا وہ شعر ضرور یاد آیا کرتے تھے۔

ثوبیہ محسن جو میری سگی ماموں زاد تھی اسے سب پیار سے بیہ کہا کرتے تھے اور میں کسی پیار میں تو نہیں البتہ سب کی تقلید میں اسے بیہ ہی کہا کرتا تھا۔ یوں میری اس سے کوئی خاص انڈر اسٹینڈنگ نہیں تھی۔ کزنز ہونے کی حیثیت سے جو تھوڑی بہت بات چیت ہمارے درمیان ہوا کرتی تھی اس میں بھی دوستی کا رنگ ہرگز شامل نہیں ہوتا تھا۔ بچپن میں مجھے اس کے اس بقراطی پن کا اتنا زیادہ اندازہ نہیں تھا۔ میرا سارا بچپن قطر میں گزرا تھا۔ میں ان بچوں میں سے ہوں جو منہ میں سونے چاندی کی کٹلری لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ دولت کی ریل پیل تھی، روک ٹوک کرنے والا کوئی تھا نہیں اسی لیے تھوڑا سا لاپرواہ اور حد درجہ ضدی ہو گیا تھا۔

میں سات سال کا تھا جب ممی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ممی کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد پاپا نے دوسری شادی کر لی تھی۔ سلمیٰ آنٹی جو میری سوتیلی ماں تھیں ان کے ساتھ میری کبھی بھی انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو سکی۔ یہ تو نہیں تھا کہ وہ مجھ پر سوتیلی ماؤں والے روایتی مظالم کرتی تھیں اور نہ ہی میں اتنا سیدھا اور معصوم تھا کہ خاموشی سے ظلم برداشت کروں مگر پھر بھی پاپا کی شادی کے بعد میں اپنے گھر اور پاپا سے تھوڑا دور سا ہو گیا تھا۔ ننھیالی رشتہ داروں میں مجھے اپنے ماموں جان کا گھرانہ بہت پسند تھا۔ اس پسندیدگی کی سب سے بڑی وجہ میری سویٹ سی مامی تھیں۔ اسکول کے دنوں میں میں دو چار مرتبہ ان لوگوں کے ہاں چھٹیاں گزار کر جا چکا تھا اور ہر بار مامی کا پُر شفقت اور ممتا بھرا انداز مجھے دوبارہ ان لوگوں کے گھر آنے کی وجہ فراہم کیا

کرتا تھا۔ بیہ ماموں جان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ تب میں تھوڑے بہت دنوں کے لیے مہمان کی حیثیت سے آیا کرتا تھا اس لیے محترمہ کا افلاطون پن اتنا زیادہ میرے سامنے کھل کر نہیں آ سکا تھا۔ اس وقت اس کی کبھی کبھار کی عالمانہ گفتگو کو میں اتفاقیہ بات سمجھ کر برداشت کر لیا کرتا تھا مگر جب سے میں پڑھنے کی وجہ سے کراچی آیا تھا اور ماموں جان ہی کے گھر ٹھہرا تب سے اس کے عالم فاضل پن سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ پاپا مجھے الیکٹریکل انجینئرنگ کرنے کے لیے اسٹیٹس بھیجنا چاہتے تھے مگر میں نے وہاں کے مقابلے میں پاکستان جا کر پڑھنے کو ترجیح دی تھی۔

شاید میرے اندر کہیں ماں سے محرومی کا احساس بچپن ہی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ سلمیٰ آنٹی کے اجنبی رویوں نے مجھے کبھی بھی ان کو ماں کی حیثیت دینے پر آمادہ نہیں کیا تھا۔ پاپا میرے اس فیصلے پر حیران تھے، مجھے خود بھی اپنے آپ پر تعجب تھا۔ شروع میں مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں نے صرف اور صرف مامی کی وجہ سے کراچی جا کر پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پاپا کو میں نے اطمینان دلا دیا تھا۔

''بیچلرز ڈگری پاکستان سے لے لوں پھر اس کے بعد جہاں سے آپ کہیں گے وہیں سے ماسٹرز کروں گا۔''

میرے فیصلہ کن انداز پر وہ مان گئے تھے اور جو میں ماموں جان کے گھر آنے کے لیے بے تاب تھا تو کچھ غلط تو نہیں تھا۔ ماموں جان کے ساتھ میرا ظاہر ہے خونی رشتہ تھا مگر مامی جس طرح مجھ پر ممتا نچھاور کرتیں، جس جس طرح میرا خیال رکھتیں وہ سب مجھے بہت اچھا اور غیر معمولی سا لگا کرتا تھا۔ دولت سے محبت نہیں خرید سکتے، پاپا کے پاس دولت کے انبار تھے مگر میرے لیے محبت نہ تھی یا شاید محبت تو تھی وہ اس کا اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ میں نے این ای ڈی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔

بیہ کراچی یونیورسٹی سے انٹرنیشنل ریلیشنز میں آنرز کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی مگر ظاہر یوں کرتی گویا میری نانی دادی ہے۔

''تمہارے امتحان سر پر ہیں اور تم دوستوں اور آؤٹنگز میں مصروف ہو، کچھ سیریس ہو جاؤ پڑھائی میں۔'' روک ٹوک تو میں نے کبھی کسی کی برداشت نہیں کی تھی، اس چھٹانک بھر کی لڑکی کو تو میں لاتا کس گنتی میں تھا۔

شروع شروع میں میں نے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کافی کوششیں کیں مگر جلد ہی مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس سے دوستی کا مطلب یہ تھا کہ پھر آپ گھنٹوں بیٹھ کر انتہائی خطرناک اور خوفناک قسم کی گفتگو کو برداشت کریں اور جہاں تک میرا سوال ہے تو مجھے اس بات میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی کہ مرزا محمد ہادی امراؤ جان ادا لکھ کر رسوا کیوں ہوئے اور یہ کہ ایک صاحب تھے، اسد نام کے جو بچپن میں مجنوں پر سنگ اٹھایا کرتے تھے اور بڑے ہو کر بے چاروں کا منہ اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ کعبہ جا سکتے۔

ابتدائی چند نشستوں کے بعد تو میں خود ہی اس کے ساتھ زیادہ اٹھنے بیٹھنے سے پرہیز کرنے لگا تھا۔ اس کی اپنے ہم عمروں کی بہ نسبت ماموں جان کی ایج گروپ کے لوگوں سے زیادہ بنا کرتی تھی۔ ماموں کے تمام دوستوں کی وہ انتہائی پسندیدہ لڑکی تھی۔ اکثر وہ ماموں جان کے ساتھ جم خانہ چلی جایا کرتی تھی صرف ان کے کسی دوست سے گفت و شنید کرنے کے لیے۔

''بہت دن ہو گئے لیاقت انکل سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

وہ ماموں جان سے مخاطب ہوتی اور وہ بغیر کوئی اعتراض کیے صاحبزادی کو ساتھ لے جاتے اور یہ لیاقت انکل جو عمر میں ماموں جان سے

شاید کچھ بڑے ہی ہوں گے۔ اسٹیٹ بینک میں کسی اونچی پوسٹ پر فائز تھے۔ پچھلے دنوں جب وہ اپنی بیگم اور دونوں صاحبزادیوں کے ساتھ ماموں جان کے ہاں ڈنر پر آئے تھے تب بیہ پورے وقت روپے کی قیمت کے عدم استحکام اور معیشت کی زبوں حالی، یورو کے آنے کے بعد ڈالر پر کیا اثرات مرتب ہوئے، یورپی ممالک کی کرنسی ایک ہو جانے کے نتیجے میں اسٹیٹ بینک کو کیا فوائد حاصل ہوئے وغیرہ پر کافی سیر حاصل گفتگو کرتی رہی تھی۔ لیاقت انکل اس کی عالمانہ گفتگو سن کر جھوم رہے تھے۔ چلتے وقت انہوں نے ماموں جان سے کہا تھا۔

''محسن تمہاری بیٹی جینئس ہے، اتنی ذہین اور قابل، بہت آگے جائے گی بھئی تمہاری بیٹی، لکھوالو مجھ سے، یہ لڑکی خوب نام کمائے گی۔''

کہنے کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹیوں پر ملامتی نظریں بھی ڈالی تھیں جو پڑھائی میں تو اچھی خاصی تھیں مگر بجائے اپنی قابلیت بڑھانے اور مطالعہ کرنے کے سارا وقت فیشن اور کپڑوں کے مرض میں مبتلا رہا کرتی تھیں۔ ماموں جان ان کے تبصرے پر فخریہ انداز میں مسکرائے تھے۔ جہاں تک میرا سوال ہے مجھے لیاقت انکل کی بیٹیاں نارمل اور ماموں جان کی صاحبزادی سنکی محسوس ہوتی تھی۔ ماموں جان کا ہر دوست اور ہر ملاقاتی اس کی قابلیت کے یونہی گن گایا کرتا تھا اور ان تعریفوں پر محترمہ خود کو کوئی توپ چیز سمجھنے لگی تھیں۔

ماموں جان کے برابر والے مکان میں جو پروفیسر صاحب رہا کرتے تھے ان کے ساتھ ثوبیہ کی خاص طور پر بہت ہی زیادہ دوستی تھی۔ کبھی پڑھائی کی دھن میں مگن بیہ صاحبہ ان کے گھر نہ جا پاتیں تو وہ فوراً خود ہی تشریف لے آیا کرتے تھے۔ پروفیسر حضرات تو چلو ہوتے ہی ایسے ہیں مگر یہ لڑکی ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر عجیب عجیب باتیں بڑے ہی مزے میں کیا کرتی تھی۔ کبھی میں باہر سے آتا، پروفیسر انکل اور بیہ لان چیئرز پر براجمان نظر آتے، آپس میں خوب زوردار بحثیں ہو رہی ہیں۔ کبھی کبھی اس محفل میں ماموں جان بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ بحث ومباحثے سے زیادہ بیٹی کی قابلیت کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہتے تھے۔ اندر جاتے جاتے میرے کانوں میں کچھ اس قسم کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔

''اقبال نے تو حسن کو خدا سے شکوہ کرتے ہوئے دکھایا کہ جہاں میں کیوں نہ مجھے لازوال کیا مگر کیٹس کا اس بارے میں اقبال سے ذرا مختلف نظریہ ہے۔'' بیہ مقررانہ انداز میں کہتی۔

''پروفیسر انکل اس کی بات کی نفی کرتے، اپنی جوابی دلیل پیش کرتے اور بحث طویل سے طویل ہوتی چلی جاتی یا پھر یہ کہ ''ہاں شیکسپیئر کے اس سانٹ کا جواب نہیں ہے۔ محبت میں شیکسپیئر نے اور اسی بات پر تو فیض کا وہ خوبصورت مصرعہ بھی یاد آتا ہے کہ ''پریم کتھا کا انت نہ کوئی'' کتنی گہرائی ہے اس مصرعہ میں۔''

اور میں اس قسم کی باتیں سن کر جلدی سے اندر مامی کے پاس بھاگتا تھا۔ ماموں جان کے ساتھ بیٹھ کر روزانہ بڑی پابندی سے بزنس نیوز دیکھا کرتی تھیں محترمہ۔ میں نے آج تک کبھی کسی لڑکی کو اسٹاک ایکسچینج کی صورتِ حال پر اتنی روانی سے بولتے نہیں سنا تھا۔ انڈکس کتنے پوائنٹس بڑھا، حصص کے کاروبار میں مندی کا رجحان کیوں رہا اور سرمائے کی مالیت کتنے کھرب اور کتنے ارب روپے پر پہنچی ہوئی ہے۔ وہ بڑی روانی سے اپنے والدِ محترم کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

پچھلے دنوں مامی کے رشتے کے کوئی بھائی جو اندرونِ سندھ کہیں رہتے تھے اور زمینداری کے پیشے سے وابستہ تھے کی کراچی آمد ہوئی تھی۔

ان کی اپنی کئی ایکڑ قابلِ کاشت اراضی تھی جس پر وہ گنے کی فصل اگایا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی بہن کے گھر قیام کرنے ہی کو ترجیح دی تھی اور بیہ کو ان کے ساتھ زراعت کے موضوع پر تفصیلی تبادلہ خیال کرتا دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ یہ لڑکی واقعی کریک ہے۔ کوئی موضوع چھوڑا بھی ہے اس نے یا نہیں۔ وہ اتنے مزے سے ان سے گنے کی کاشت کے لیے پانی کی صحیح مقدار کی فراہمی پر بات چیت کر رہی تھی۔

''سمجھیں مارچ اپریل سے ہی گنے کی فصل کے لیے پانی کی درست مقدار فراہم ہو جانی چاہیے۔''

وہ گلاسز اپنی ناک پر سیٹ کرتی سنجیدگی سے بول رہی تھی اور مامی کے عزیز بھائی جان بھانجی صاحبہ کی باخبری کے معترف ہوئے جا رہے تھے۔ کرنٹ افیئرز کی تو خیر بات ہی کیا تھی۔ وہ سب تو محترمہ کی فنگر ٹپس پر رہا کرتے تھے۔ گیارہ ستمبر کے بعد کے واقعات، بیشتر اسلامی ممالک کی Pro-American پالیسی، چائنا، رشیا اور انڈیا کی چپکے چپکے امریکہ کے خلاف ایک نئے بلاک کی تشکیل، مسلمان ممالک کے عوام کا بتدریج امریکہ کے خلاف بڑھتا ہوا غم و غصہ اور نفرت، کیوبا کے قیدی، وال اسٹریٹ جرنل کا صحافی اور چرچ پر حملہ۔ ان سب کے کے پس پردہ اصل حقائق۔ دن بھر میں وہ جب تک چار پانچ اخبارات و جرائد کھنگال نہیں ڈالتی تھی اسے چین نہیں آتا تھا۔ جنگ اور ڈان سے شروع ہوتا یہ سلسلہ ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، خلیج ٹائمز، نیوز ویک، گارجین، وال اسٹریٹ جرنل وغیرہ وغیرہ تک دراز ہو جایا کرتا تھا۔

ماموں جان اپنی جینئس اور انٹلکچوئل صاحبزادی پر بہت فخر کیا کرتے تھے مگر مامی کو میں نے کبھی اس کی ان باتوں پر خوش ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اگرچہ انہوں نے کبھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی مگر مجھے پھر بھی اندازہ تھا کہ وہ ان باتوں پر چڑتی ہیں۔

مجھے یہاں رہتے تین سال ہو گئے۔ تھرڈ ایئر کا امتحان دے کر میں فائنل ایئر میں آیا تھا۔ ان گزرے تین برسوں میں میری مامی کے ساتھ بہت ہی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ بیٹی صاحبہ کے پاس تو غیر متعلقہ باتوں کے لیے زیادہ وقت نہیں ہوتا تھا سو مامی اپنی ہر بات مجھ سے ہی شیئر کیا کرتی تھیں۔

پاپا اس تمام عرصہ میں ایک بار مجھ سے ملنے کراچی آئے تھے۔ میں بھی تین مرتبہ دوبا ہو آیا تھا۔ فون وغیرہ پر تو پاپا اور دونوں بھائیوں کے ساتھ رابطہ رہا ہی کرتا تھا۔ بیہ کا آنرز کا آخری سال تھا۔ ان ہی پرسکون دنوں میں مامی نے ایک روز اپنی محبت کا واسطہ دے کر ایک اتنی مشکل اور ناممکن خواہش مجھ سے کر دی کہ میں سکتے کی کیفیت میں منہ پھاڑے کتنی دیر تک ان کو تکتا رہا۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں مامی سے کہوں کے اس کے بجائے آپ مجھ سے یہ کہتیں۔

''عباس! اگر مجھ سے محبت ہے تو میری خاطر ماؤنٹ ایورسٹ سر کر کے دکھاؤ یا انٹارکٹیکا کے سرد ترین موسم میں تن تنہا تین چار ماہ رہ کر دکھاؤ۔''

میں یہ سب کر گزرتا مگر جو بات انہوں نے مجھ سے التجائیہ انداز میں آنکھوں میں آنسو بھر کر منوائی تھی وہ تو دنیا کی ناممکن ترین بات تھی۔ فوری طور پر تو میں مامی کے آنسوؤں اور التجاؤں کے زیرِ اثر آ گیا تھا اور ہزار کوشش کے باوجود انہیں منع نہیں کر پایا تھا مگر جب بعد میں جذبات کا طوفان تھم جانے پر غور کیا کہ مامی کی محبت میں میں نے کتنے مشکل کام کی ذمہ داری قبول کر لی ہے تو میرے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ ان کی وہ سقراط کی نانی ٹائپ بیٹی اس وقت بھی ٹی وی پر نیشنل جیوگرافک چینل پر کینگروز سے متعلق ڈاکومینٹری دیکھنے میں مگن تھی جس وقت وہ آہستہ آواز میں

مجھ سے التجائیں کر رہی تھیں۔

''ایک ہی بیٹی ہے میری، ایسے کون پسند کرے گا اسے۔ تمہارے ماموں جان کو تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں ہے۔ لاڈ پیار میں بیٹی کا ستیا ناس کر دیا۔ دنیا میں کتنے لوگ ہیں جن کے ایک ہی اولاد ہوتی ہے مگر وہ ان کی مناسب پرورش کرتے ہیں۔ اس کی ان باتوں پر شروع ہی سے انہوں نے ضرورت سے زیادہ تعریفیں کر کے اسے بالکل ہی خبطی بنا دیا ہے۔ دیکھو ذرا اپنی عمر کے لوگوں میں اٹھتی بیٹھتی ہی نہیں ہے۔ تم کچھ ایسا نہیں کر سکتے عباس کہ میری بیٹی نارمل ہو جائے۔ نارمل لڑکیوں کی طرح بی ہیو کرنے لگے۔ مجھے تو اب اس کی شادی سے متعلق سوچ سوچ کر ہول اٹھنے شروع ہو گئے ہیں۔ خاندان میں کسی ایک نے بھی کبھی اشارتاً بھی بیہ کے لیے پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا اور خاندان والے بھی اپنے رویے پر حق بجانب ہیں۔ ایسی علامہ قسم کی لڑکیاں کس کو پسند آئیں گی۔''

بیہ ان تمام باتوں سے یکسر لاتعلق کینگروز کا لائف اسٹائل، ان کی غذا اور نشو ونما کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں مصروف تھی۔ آج کل وہ کتابیں بھی شکاریات ہی کے موضوع پر پڑھ رہی تھی۔ مامی نے اس روز پہلی مرتبہ مجھ سے بیہ کے بارے میں تفصیلی بات کی تھی۔ وہ اس کی حرکتوں پر سخت شاکی اور نالاں تھیں۔ اس کے مستقبل کی طرف سے بے حد فکر مند تھیں۔

دراصل پچھلے دنوں ان کی بڑی بہن جو اٹلی میں رہا کرتی تھیں اپنے لائق فائق اور ہینڈسم بیٹے کے لیے خاندان میں سے کسی لڑکی کا انتخاب کرنے پاکستان آئی تھیں۔ ان کی آمد کی وجہ سمجھتے ہوئے سارا خاندان ہی ان کے استقبال کے لیے نہایت پرجوش تھا۔ مامی اور ان کی بہن میں بہت محبت تھی اور اکثر فون وغیرہ پر بات ہونے پر مامی نے ان کے انداز میں یہ بات محسوس کی تھی کہ وہ بیہ میں انٹرسٹڈ ہیں۔ انٹرسٹڈ وہ بے چاری یوں ہو گئی تھیں کہ انہوں نے بچپن کے بعد سے بھانجی کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ بس خود ہی خود فرض کر لیا تھا کہ میری بہن کی بیٹی ہے تو ہو بہو اسی جیسی ہو گی۔

مامی نے ان کے آنے سے پہلے بیہ کو کافی کچھ سمجھایا تھا۔ اس نے ان کی نصیحتوں پر تو کیا عمل کرنا تھا، ہاں اپنی زبان و بیان کے کرشمے خوب دکھائے تھے۔ خالہ جان سے پہلی ہی ملاقات میں اس نے مامی کے ارمانوں پر اوس ڈال دی تھی۔ میں تو ان تمام ملاقاتوں میں موجود نہیں رہا تھا مگر مامی نے مجھے تفصیل سے ساری باتیں بتائی تھیں۔ بجائے خالہ جان کو اپنے سگھڑاپے، رکھ رکھاؤ اور ان کے ہونہار فرزند کو اپنی خوبصورتی اور ڈریسنگ سے متاثر کرنے کے وہ ان سے اٹلی کی تاریخ، وہاں کے لوگ اور وہاں کے طرز زندگی پر گفتگو کرتی رہی تھی۔ خالہ جان بھانجی کے منہ سے اتنی روانی سے انٹلکچوئل گفتگو سن کر انگشت بدنداں بیٹھی تھیں۔

''سارے یورپ میں آپ کو اتنے ماہر چور اور جیب کترے نہیں ملیں گے جتنے اٹلی میں اور نیپلز تو خیر مافیا کے سلسلے میں مشہور ہے ہی۔''

وہ کزن صاحب سے سنجیدگی سے کہتی پھر کچھ دیر بعد اپنے خالو سے جو سوئے اتفاق کنسٹرکشن کے بزنس سے وابستہ تھے، ان سے وہاں کے آرکیٹیکچر پر باتیں شروع کر دیتی۔

''ٹاور آف پیسا کو کون نہیں جانتا۔ پیسا صرف اسی لیے تو مشہور نہیں کہ وہاں گلیلیو پیدا ہوا تھا۔ وہاں کا مشہور ٹاور وہ کیوں ٹیڑھا ہو گیا اس بارے میں تو آج تک انجینئرز اور آرکیٹکٹس بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔''

پھر روئے سخن خالہ جان کی طرف ہو جاتا۔

''اٹالین پیزا اور پاستا اب پاکستان میں بھی بہت مقبول ہیں۔ زیتون تو خوب وافر پیدا ہوتی ہے اٹلی میں، اور روایتی اٹالین دعوتیں کتنی مزے کی ہوتی ہیں۔ مہمانوں کے سامنے ایک دم سے ساری میز نہیں سجا دیتے ہماری طرح بلکہ ایک ایک کر کے ڈشز کی رونمائی ہوتی ہے۔ اکثر مہمان بے چارے اس لالچ میں کہ کیا پتا اگلی ڈش اس والی ڈش سے زیادہ مزے دار ہو پہلی کو ذرا سا چکھنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ پہلی ڈش عمدہ تھی، بعد والی تو یونہی سی ہے۔ کتنا پر تجسس قسم کا ہوتا ہے ان لوگوں کا ڈنر۔''

وہ مامی کی تنبیہی نظروں سے بے نیاز مسلسل گل افشانی کرتی رہی۔

''آپ کیا کبھی اٹلی گئی ہیں؟'' آخر کار کزن صاحب نے مجبور ہو کر پوچھ ہی لیا تھا۔

''نہیں، میں کبھی اٹلی نہیں گئی۔ ہاں اسپین گئی تھی ایک مرتبہ ماما اور ڈیڈی کے ساتھ۔ برابر برابر تو ہیں دونوں ملک۔ اٹالین اور اسپینش زبانوں میں کچھ خاص فرق بھی نہیں ہے۔ جسے اسپینش آتی ہو وہ اٹالین بہت جلدی سیکھ سکتا بالکل اسی طرح جیسے جاپانی اور کورین زبانیں۔''

وہ فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہی تھی۔ مامی کے خدشات سو فیصد سچ ثابت ہوئے تھے۔ خالہ جان نے بہن سے اوپری دل سے بھی بھانجی کے لیے بات نہیں کی تھی بلکہ اپنے بھائی کی بیٹی کو پسند کر کے جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا انتظام کروایا تھا اور اسی واقعہ نے مامی کو حالات کی سنگینی کا احساس دلایا تھا۔

''میری کوششوں سے اگر اس کے لیے کوئی رشتہ آ بھی گیا تو یہ ہر بار اسی طرح کی حرکتیں کیا کرے گی۔''

وہ میرے سامنے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھیں۔ کاش میں مامی سے اتنی محبت نہ کرتا ہوتا، کم از کم ان کو منع تو کر دیتا۔ وہ لڑکی جو مجھ سے دو سیکنڈز کے لیے بھی برداشت نہیں ہوتی تھی اسے میں سدھاروں اور اسے سدھار لینا کیا اتنا آسان کام تھا۔

یوں میں کوئی زاہد خشک نہیں، ایسے میں اگر میری کزن صاحبہ کچھ ڈھنگ کی مخلوق ہوتیں تو میں مامی کے کہنے پر اس بگڑی ہوئی لڑکی کو سدھارنے میں بڑی خوشی محسوس کرتا مگر وہ چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا، اسے برداشت کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ چلو کسی ایک آدھ مضمون میں اسے دلچسپی ہوتی تو میں دل پر بھاری پتھر رکھ کر اسے سننا گوارا کر لیتا مگر یہاں تو دنیا زمانے کا کوئی موضوع ایسا نہیں تھا جس میں آنسہ ڈاکٹریٹ کیے ہوئے نہیں تھیں۔

☆

میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا خوشی خوشی مامی کے ہاتھوں کے پکے مزے دار لنچ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کھانے پینے کا میں شوقین ہوں اور مامی میرے اس شوق کی تسکین کا اکثر ہی خاصا معقول انتظام کرتی ہیں۔

''مزہ آ گیا مامی! یہ چھولوں کا پلاؤ اور پالک پنیر، سچ کتنے دنوں سے میرا یہ دونوں چیزیں کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔''

مامی نے خوبصورت سے کرسٹل کے پیالے میں جیلی وغیرہ سے سجے سجائے کسٹرڈ کو میرے آگے رکھا تھا اور کسٹرڈ دیکھتے ہی میں نے چاول

کی ڈش اٹھاتے اپنے ہاتھوں کو فوراً روک لیا تھا۔ میٹھا تو مجھے اتنا پسند ہے کہ صرف سویٹ ڈش سے ہی پورا پیٹ بھر سکتا ہوں۔ وہ میرے لیے اپنے ہاتھوں سے کسٹرڈ نکالنے لگی تھیں۔ مامی کی یہی باتیں تو مجھے ان کا دیوانہ بناتی ہیں۔ اس طرح میرا خیال رکھتی ہیں کہ میں خود کو کسی سلطنت کا راجا مہاراجا سمجھنے لگ جاتا ہوں۔ شاید مامی کو بیٹا نہ ہونے کی محرومی کا احساس تھا اور وہ میرے لاڈ اُٹھا کر بیٹے کی کمی پورا کرنے ہی کی کوشش کرتی ہیں۔

''تم نے کچھ کیا عباس؟''

کچھ دیر بعد مامی نے مجھ سے آہستگی سے دریافت کیا تھا۔ لنچ پر اکثر میں مامی کی وجہ سے گھر آجایا کرتا تھا۔ میرے دوست گھر جلدی بھاگنے پر میرا مذاق اڑاتے تھے مگر میں پرواہ نہیں کرتا تھا۔ میرے شرمندگی کے عالم میں نفی میں سر ہلا دینے پر وہ مزید مایوس سی ہوگئی تھیں۔

''آپ فکر مت کریں، کرتا ہوں میں کچھ۔'' مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں کروں گا کیا مگر پھر بھی ان کی اداس شکل مجھ سے دیکھی نہیں جارہی تھی اسی لیے تسلی دینے پر مجبور ہوگیا تھا۔

''پلیز کچھ کرو عباس! مجھے فکر کے مارے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ آج کل تو اچھی خاصی لڑکیوں کے رشتے مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ نہ کپڑوں کا ہوش نہ بالوں کی فکر، اپنی دنیا میں مگن، کلنگ کے نام پر شاید وہ صرف چائے ہی بنا سکتی ہے اور وہ بھی جو شاندے سے ملتے جلتے مزے والی۔ میں تو سب کوششیں کر کے دیکھ چکی مگر اسے تو جیسے کسی بات سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ کل میں نے کسی بات پر جل کر کہہ دیا کہ ''ان حرکتوں پر کون بیاہنے آئے گا تمہیں'' تو جھٹ سے جواب میں بولی ''نہ آئے، یہ مرد ذات اس قابل بھی نہیں کہ اس پر سوچا جائے، عورتوں کو اپنا محکوم بنا کر خوش ہوتے ہیں مرد۔ میں تو کبھی کسی کی حاکمیت برداشت نہ کروں۔'' کہتے وقت یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ ابا جان بھی وہیں تشریف فرما ہیں اور ان کی سنو بجائے اسے کچھ سرزنش کرتے یا سمجھاتے خاموشی سے بیٹھے مسکراتے رہے۔''

وہ بہت شکستہ لہجے میں بول رہی تھیں۔ اچھا خاصا مزے دار کسٹرڈ مجھے انتہائی بدذائقہ اور کڑوا محسوس ہونے لگا تھا۔

''اچھا مامی! آپ کی خاطر میں یہ کڑوا گھونٹ پینے پر آمادہ ہوں۔'' میں نے دل ہی دل میں انہیں مخاطب کیا تھا۔

☆

شام میں وہ افلاطون کی نانی اپنے وزن سے بھی کئی گنا وزنی کتاب ہاتھوں میں لیے لان میں بیٹھی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے بیہ؟'' لہجہ دوستانہ کر کے میں اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ کتاب پر سے سر اٹھا کر مجھے گھور کر دیکھا گیا تھا۔ گلاسز کے پیچھے سے جھانکتی وہ خطرناک نگاہیں مجھے بری طرح سہما گئی تھیں۔

''آج کل تم یونیورسٹی کتنا لیٹ جانے لگے ہو۔ پہلا پیریڈ تو روزانہ ہی مس ہو جاتا ہوگا۔ یہ کھیل کود اور تفریحات کام نہیں آئیں گی زندگی میں جو لوگ اپنے آج کی قدر نہیں کرتے ان کا آنے والا کل ان کی قدر نہیں کرتا۔''

میرا بس نہیں چل رہا تھا اس علامہ ابنِ علامہ کو ایسی ایسی سناؤں کہ طبیعت صاف ہو جائے۔

وہ مجھے نصیحت کر کے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ کتاب کی سمت توجہ کر چکی تھی۔ جہاں تک میری اسٹڈیز کا سوال ہے تو اس معاملے میں

میں کبھی بھی لاپرواہ نہیں رہا۔ میں نے اپنے لیے وہی مضامین پسند کیے تھے جن میں دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اپنے دیگر کلاس فیلوز کی طرح رٹے مارنے اور نوٹس کے پیچھے بھاگنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ کلاس میں ہونے والا لیکچر ہی میرے لیے کافی ہوا کرتا تھا۔ الیکٹریکل انجینئرنگ سے متعلق کتابیں پڑھنا، پروفیشنل جرنلز کا مطالعہ کرنا، کرنٹ افیئرز سے باخبر رہنا، بس میں اس حد تک خود کو محدود رکھنا پسند کیا کرتا تھا۔ ان ٹاپکس کے علاوہ اسپورٹس کا موضوع بھی ایسا ہے جس کے بارے میں میری معلومات ہمیشہ مستند اور اپ ٹو ڈیٹ ہوتی ہیں۔ اسکول کالج تک اپنے اسکول کی اسنوکر ٹیم کا کیپٹن بھی رہ چکا ہوں اور باکسنگ چیمپئن بھی اور اب بھی پابندی سے اسکواش اور ٹیبل ٹینس کھیلنا پسند کرتا ہوں۔ پابندی سے اس لیے کیونکہ مجھے اپنی فٹنس بہت عزیز ہے مگر یہ میرے ماموں جان کی اکلوتی صاحبزادی پتا نہیں خود کو میری نانی دادی سمجھنے پر کیوں تلی بیٹھی رہتی تھی۔ مامی کا خیال نہ ہوتا تو اس فضول لڑکی پر دس بار لعنت بھیج کر اپنے کمرے میں جا چکا ہوتا۔

''کیا پڑھ رہی ہو؟'' دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے کچھ دیر بعد سوال پوچھا تھا۔ ''یا اللہ! مجھ کمزور اور ناتواں پر رحم فرما۔''

اب کی بار چہرے پر تھوڑی سی رعونت لاتے ہوئے مجھے جواب سے نوازا گیا تھا۔ ''آج کل میں ابنِ خلدون کو پڑھ رہی ہوں۔''

''کچھ مجھے بھی سناؤ، مجھے بھی ہسٹری سے کافی دلچسپی ہے۔''

بچپن میں کبھی کہیں پڑھا تھا کہ ابنِ خلدون کوئی تاریخ دان تھے اسی وجہ سے اتنی بات بول پایا تھا۔ میری بات سنتے ہی اس کے لبوں پر خوشگوار سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

ڈیڑھ گھنٹہ تک میں مسلسل دل ہی دل میں اس دعا کو دہراتا رہا تھا۔ اس نے کیا کیا کہا وہ سب میرے سر کے اوپر سے گزر رہا تھا، میں تو بس خود کو صبر کی تلقین کرتا وہاں جم کر بیٹھا ہوا تھا۔

''آج کے تاریخ دان دراصل ابنِ خلدون ہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ تاریخ کس طرح مرتب کرتے ہیں۔ اس بارے میں لوگوں کو ابنِ خلدون ہی سے استفادہ کرنا پڑتا۔''

خدا کے واسطے ابنِ خلدون کی پڑنانی چپ ہو جاؤ۔ میرا دل دہائیاں دے رہا تھا۔ مامی یہ آپ نے مجھے کس الجھن میں ڈال دیا۔

☆

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

''مہاتما گوتم بدھ چھٹی صدی قبل مسیح میں کپل وستو یعنی جو آج کل نیپال کہلاتا ہے وہاں راجا شدھودھن کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔''

''ٹالسٹائی نے بہت کچھ لکھا اور بہت اچھا لکھا مگر وار اینڈ پیس کا تو جواب نہیں، سنو ذرا تم یہ پیراگراف حیران رہ جاؤ گے۔''

''حافظ شیرازی کی غزلوں میں سادگی کے ساتھ ساتھ رنگینی بھی ہے اور ایک عجیب پرتاثیری کیفیت ہے مثلاً یہ اشعار.....''

''دانتے کی شاعری اکثر لوگوں کو اپیل کرتی ہے مگر مجھے کچھ خاص پسند نہیں۔''

''ڈارون کا انسان پہلے کیا تھا اور انسان کے ارتقاء کے بارے میں نظریات دراصل مذہب سے دوری کا نتیجہ ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمیں اس پر سوچنے کی کیا ضرورت ہے کہ انسان نے اپنی موجودہ شکل کیسے حاصل کی۔''

''سکندرِ اعظم جس نے دنیا کے بے شمار ملک فتح کیے جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی کھلی مٹھی یہ بتا رہی تھی کہ وہ دنیا سے خالی ہاتھ جا رہا ہے۔''

''قبلائی خان، چنگیز خان کا پوتا تھا اس کی سلطنت میں جاپان، چین، برما، مشرقی افریقہ اور جنوبی ہند وغیرہ شامل تھے۔''

''کیا بات تھی ایسی ''کنفیوشس'' میں جو چین میں آج بھی لاکھوں لوگ اس کے بنائے ہوئے اصولوں کو مذہب کے طور پر مانتے ہیں۔''

''مونالیزا بنانے میں لیونارڈو ڈاونچی کو چار سال لگے تھے، سوچو ذرا وہ اپنے فن سے کتنا سچا عشق کرتا تھا جو چار سال لگا کر وہ شہرۂ آفاق تصویر بنائی۔''

''اس زمانے میں جب مشرقی ممالک، مغربی ممالک کے بارے میں اور مغربی ممالک مشرقی ممالک کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اس قدیم دور میں مارکو پولو کے سفرنامہ نے یورپ والوں کو ایشیائی ممالک سے متعلق درست معلومات فراہم کی تھیں۔''

''ہم نیوٹن کا بہت مذاق اڑاتے ہیں کہ اچھا بھلا بیٹھے بیٹھے اس نے سیب کو درختوں پر سے زمین پر گرتے دیکھ کر یہ کیوں سوچا کہ سیب زمین پر ہی کیوں گرا؟ خاموشی سے گرا ہوا سیب اٹھاتا اور کھانا شروع ہو جاتا۔ یہی تو ہم جیسے سطحی سوچ رکھنے والوں اور نیوٹن میں فرق ہے۔ ہم نے تو محاورے تک اسی قسم کے بنا لیے ہیں کہ آم کھاؤ پیڑ مت گنو وغیرہ۔ جینئس لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔''

کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ گزشتہ کئی دنوں سے مسلسل اسی قسم کی طویل گفتگو سنتے سنتے میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ جب تک اس کے پاس بیٹھا رہتا مسلسل خود کو صبر کی تلقین کرتا رہتا۔

میری کایا پلٹ پر وہ ایک دو روز تو حیران ہوئی پھر اپنی حیرانی پسِ پشت ڈال کر اپنے کب کب کے جمع کیے ہوئے علم کے گوہرِ آبدار میرے اوپر لٹانے شروع کر دیئے تھے۔ غالباً اسے صرف اور صرف ایک سامع کی ضرورت تھی۔ کوئی بھی ہو بس جو سن سکتا ہو، پتا نہیں میرے دماغ میں بھیجہ نام کی کوئی چیز بچی تھی یا نہیں۔ بہر حال یہ تھا کہ آج کل مامی مجھے روزانہ بڑی پابندی سے نہار منہ چاروں پانچوں مغز کھلایا کرتی تھیں۔ رات کو سونے سے پہلے بھی دودھ میں شہد اور بادام ڈال کر میرے لیے لاتی تھیں۔

وہ تھوڑی شرمندہ نظر آ رہی تھیں۔ انہیں پتا تھا ان کی محبت میں میں کس کڑے امتحان سے گزر رہا ہوں۔

☆

''بیہ! میں برٹش کونسل جا رہا ہوں، تم چلو گی؟''

میں تو پہلے بھی اکثر کسی نہ کسی ریفرینس بک کی تلاش میں برٹش کونسل جایا کرتا تھا۔ بیہ پر اس حوالے سے مامی کی طرف سے کافی سختی تھی۔ یونیورسٹی کے علاوہ اسے کہیں اکیلے گاڑی لے کر آنے جانے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ زیادہ تر وہ وہاں ماموں جان کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ آج کل میں اسے اکثر اپنے ساتھ لائبریری لے جایا کرتا تھا۔ میری آفر پر اس کے چہرے پر اس طرح خوشی اور مسرت چھا جاتی تھی جیسے میں اسے سوئٹزرلینڈ کی سیر کرانے لے جا رہا ہوں۔

وہ کتابوں کے درمیان گھری خوش خوش وقت گزارا کرتی تھی۔ واپسی پر کبھی کبھار ہم کہیں آئس کریم یا برگر وغیرہ کھانے کے لیے بھی رک جایا کرتے تھے۔ اگر میک ڈونلڈز میں برگر کھا رہے ہوتے تو سارا وقت وہ مجھے فاسٹ فوڈز کی تاریخ بتاتی رہتی۔

اس روز ''Ponderosa'' میں بیٹھ کر مزے دار کھانوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ مسلسل ساؤتھ انڈین کھانوں کی ہسٹری سناتے ہوئے میرا موڈ خراب کر رہی تھی۔ کتنی بار میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی مگر وائے افسوس۔

''تم نے نوٹ کیا بیہ! دوبارہ اونچی قمیصوں کا فیشن آ گیا ہے۔''

ہمارے پاس سے ایک خوبصورت سی لڑکی خوب سجی سنوری، اونچی سی قمیص اور ٹراؤزر پہنے گزری تو میں نے موضوع تبدیل کرنے کی آخری کوشش کی۔

''یہ بے چاری کم علم لڑکیاں، ان کی زندگی تو صرف کپڑوں اور میک اپ تک ہی محدود ہوتی ہے۔ مجھے تو ترس آتا ہے اس قسم کی لڑکیوں پر۔ تمہیں پتا ہے یہ جو کاسمیٹکس کی اشیاء یہ خواتین استعمال کرتی ہیں خاص طور پر پرفیومز اور ہیئر اسپریز ان میں Carbons Chloro-flouro کتنی بڑی مقدار میں شامل ہوتے ہیں اور یہ کتنا خطرناک کیمیکل ہے، اوزون کی لیئر کو تباہ کرنے میں اس کا کتنا بڑا ہاتھ ہے مگر ان جاہلوں کو کون سمجھائے۔''

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس آئن اسٹائن کی پھپھو کو اٹھا کر باہر پھینک دوں جبکہ وہ ہنوز اوزون کی لیئر کی تباہی پر اظہار افسوس کرنے میں مصروف تھی۔ مامی میری کوششوں پر میرا بہت شکریہ ادا کرتی تھیں اور میں مارے مروت کے انہیں بتا نہیں پاتا تھا کہ آپ کی محبت میں میں آج کل کس اذیت سے گزر رہا ہوں۔

سارا دن اس افلاطون کے ساتھ گزار کر اب میں سکون سے بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ چھٹی کا دن تو مزید آزمائش کا حامل ہوا کرتا تھا۔ مامی سے ایک کپ چائے بنوا کر اور دو گولی ڈسپرین کھا کر میں خود کو ان خطرناک باتوں کے اثرات سے نکالنا چاہ رہا تھا۔ اگر یونہی سو گیا تو ساری رات ڈراؤنے خواب آئیں گے۔ آسکر ایوارڈز کی تقریب تو یوں بھی میں کبھی مس نہیں کرتا تھا۔ اتنی حسین حسین پریاں اپنے حسن کی بجلیاں گراتی ہوئی، کوئی بدذوق ہی ہوگا جو ان پریوں کو دیکھ کر مسحور نہ ہو جاتا ہو۔ اسی وقت بیہ دروازے پر دستک دیتی اندر داخل ہوئی تھی۔ میں نے ''نکول کڈمین'' سے بمشکل نظریں ہٹا کر بیہ کی طرف دیکھا تھا۔ خدا نے کیا فرصت سے بنایا ہے اس حسینہ کو۔ نکول کڈمین کے بعد بیہ کو دیکھنا ایسا ہی تھا جیسے سویٹ ڈش کھاتے کھاتے کسی نے میرے آگے کریلوں کی بھری ہوئی پلیٹ رکھ دی ہو۔ اپنی اس احمقانہ تشبیہہ پر مجھے بے ساختہ ہنسی آئی تھی مگر میں نے اسے بیہ سے

چھپا بھی لیا تھا۔ ''اچھا یہ آسکرز۔'' وہ ٹی وی اسکرین پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے بولی تھی۔ ''کل ہی میں پڑھ رہی تھی کہ آسکر کا مجسمہ.....''

اس سے پہلے کہ وہ اپنی شعلہ بیانی شروع کرتی میں نے اس کی بات کاٹ کر کچھ بیزاری سے پوچھا تھا۔

''تمہیں کوئی کام تھا بیہ؟''

''ظاہر ہے اس وقت آنے کا مقصد کوئی کام ہی ہوگا۔'' ٹوکے جانے پر اس کا تھوڑا سا منہ بن گیا تھا۔

''میرے مونیٹر کے ساتھ پتا نہیں کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔ تصویر کلر ڈ نہیں آ رہی اور کمپیوٹر بھی خود بخود Safemode میں چلنے لگا ہے۔''

وہ ہنوز ناراضی بھرے انداز میں اپنے آنے کی وجہ بتانے لگی تھی۔ میں ٹی وی بند کر کے اس کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گیا تھا۔ جتنی دیر میں اس کے کمپیوٹر کے ساتھ مصروف رہا، وہ مجھے فادر آف کمپیوٹر Charles Babbage کے بارے میں پتا نہیں کیا کیا داستانیں سناتی رہی۔

''بیہ! تم تھوڑی دیر چپ نہیں رہ سکتیں۔''

تنگ آ کر میں نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔ اس وقت کیونکہ میں اسی کا کام کر رہا تھا اس لیے وہ فوراً ہی چپ ہو گئی تھی۔

☆

کافی دنوں بعد میری ارسلان اور احمد کے ساتھ چیٹنگ ہو رہی تھی۔ دونوں بڑی پابندی سے مجھے ای۔میل بھیجا کرتے تھے۔ اکثر تو میں پڑھائی اور دوستوں میں مصروف کئی کئی دن تک ان کی میل پڑھ بھی نہیں پاتا تھا۔ سلمیٰ آنٹی کے برخلاف میری اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے بہت اچھی دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ میرے چھٹیوں میں دوہا جانے کا سبب بھی میرے پیارے بھائی ہی ہوا کرتے تھے جو مجھے اصرار کر کر کے بلایا کرتے تھے۔

اس وقت بھی ہم لوگ بڑے مزے میں چیٹنگ کر رہے تھے تب ہی ایک تیز نسوانی چیخ میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''یا اللہ رحم۔'' چیخنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی کا گلا تیز دھار چاقو سے کاٹا جا رہا ہو۔ ''بچاؤ'' دوبارہ چیخ سنائی دی تھی۔

''یہ ثوبیہ کی آواز ہے۔'' میں بوکھلائے ہوئے انداز میں تیزی سے اٹھا تھا۔ ماموں جان اور ممی کسی ڈنر میں گئے ہوئے تھے۔ کہیں کوئی چور ڈاکو تو نہیں گھس آئے گھر میں۔ میں دوڑتا ہوا بیہ کے کمرے کی طرف بھاگا تھا، چیخوں کی آوازیں بتدریج بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ رگوں میں دوڑتا غیرت مند خون اچانک جوش مارنے لگا تھا اور جوش میں ہی تو انسان ہوش کھو دیتا ہے۔ میں نے یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی کہ کہیں وہ کسی اسلحے سے لیس نہ ہوں۔ یہ سوچے بغیر میں دھاڑ سے دروازہ کھول کر اس کے کمرے میں گھسا تھا۔

اندر کا منظر میری توقع کے بالکل برعکس تھا۔ اسے کمرے میں اکیلا دیکھ کر میں سٹپٹا گیا تھا۔ وہ بیڈ پر چڑھی آنکھیں بند کیے زور زور سے چیخ رہی تھی۔

''کیا ہوا بیہ؟'' میں حیرت سے خالی کمرے کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ میری آواز سنتے ہی اس نے ایک دم آنکھیں کھول دی تھیں اور چیخنا بھی بند کر دیا تھا۔

''شکر ہے عباس تم آ گئے۔ یہ دیکھو ادھر، اف میرے اللہ۔''

وہ بیڈ پر بدستور چڑھ کر کھڑی ہوئی مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔ اس کے کارپٹ کی طرف اشارہ کرنے پر میں نے کارپٹ پر نظریں دوڑائیں تو وہاں موجود چیز کو دیکھ کر میرا دل چاہا اس بے وقوف لڑکی کا گلا دبا دوں۔ کتنی بری طرح اس نے مجھے ڈرایا تھا۔ پتا نہیں میں کیا سوچ بیٹھا تھا۔ میں کارپٹ پر ادھر سے اُدھر مٹر گشت کرتی چھپکلی کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اب اسے غصے سے گھور رہا تھا۔

''لاحول ولا قوۃ، کچھ عقل ہے تم میں کہ نہیں۔ یہ اتنی سی چھپکلی، اسے دیکھ کر تم خطرناک چیخیں مار رہی تھیں۔ ذرا اپنا سائز دیکھو اور ذرا اس چھوٹے سے رینگنے والے جانور کو دیکھو۔ ٹی وی پر تو کل خوب ڈائنوسارز کے بارے میں معلوماتی فلم دیکھی جا رہی تھی اور حال خود کا یہ ہے کہ چھپکلی کو دیکھ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔'' میں نے بغیر کسی لحاظ کے اسے اچھی طرح جھاڑ پلائی تھی۔

''کیا کرتی پھر میں، کمرے سے نکل کر باہر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ کارپٹ کے علاوہ کہیں اور ہوتی تو میں بھاگ کر کمرے سے ہی نکل جاتی۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھرے کچھ شرمندگی کے عالم میں بولی تھی۔

''پلیز، عباس اسے مار دو نا۔'' وہ میرے گھورنے پر ڈرتے ڈرتے بولی تھی۔ غصہ تو مجھے اس پر بہت شدید آ رہا تھا، میں نے خار بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی نظریں چھپکلی پر مرکوز کی تھیں۔ اگلے دو منٹوں کے بعد وہ بے چاری اس دارِ فانی سے کوچ کر چکی تھی۔ میں بغیر کچھ کہے سنے کمرے سے باہر نکلنے لگا تو وہ چلا کر بولی۔

''اسے پھینک تو دو عباس۔''

''خود پھینکو، میں کوئی تمہارا نوکر لگا ہوں۔'' میں نے جواباً غصہ سے کہا تھا۔

''پلیز میرے اچھے بھائی نہیں ہو۔ دیکھو ایک تو مجھے اس سے ڈر بہت لگتا ہے اور دوسرے گھن بھی بہت آتی ہے۔ دیکھتے ہی متلی ہونے لگتی ہے۔''

''اور میں نے تو ساری زندگی چھپکلیوں اور سانپوں کے ساتھ گزاری ہے۔'' میں نے جل کر سوچا تھا۔ دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتے میں نے ''اسے'' اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آنے کے بعد واش روم میں ہاتھ دھونے گھس گیا تھا۔ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو وہ کمرے میں موجود تھی۔

''تھینک یو عباس! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے بہادر ہو۔ واقعی تمہیں چھپکلیوں سے بالکل ڈر نہیں لگتا؟''

وہ معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر یوں بول رہی تھی جیسے میں نے شیر کا شکار کر لیا تھا۔ اصولاً چھپکلی مارنے پر بہادری کا میڈل ملنے پر میری مردانہ غیرت کو جوش میں آ جانا چاہیے تھا مگر مجھے پتا نہیں کیوں ہنسی آ گئی تھی۔ فلسفیانہ اور عالمانہ تاثرات کی جگہ اس وقت اس چہرے پر معصومیت ہی معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔

''اچھا ان آنکھوں میں کبھی سادہ سی معصومیت بھی چھاتی ہے۔'' میں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے سوچا تھا اور پتا نہیں کیوں وہ معصومانہ سا تاثر مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

کافی دیر تک میری بہادری کی شان میں قصیدہ گوئی کر کے وہ جا چکی تھی اور میں اب تک بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ جس وقت یہ سقراط بقراط نہیں بنی ہوتی تو خاصی معقول نظر آتی ہے۔

☆

ایکسپو سینٹر میں پاکستان کے علاقائی ملبوسات، دستکاری اور کشیدہ کاری وغیرہ سے متعلق نمائش لگی ہوئی تھی۔ عام طور پر ہمارا گروپ ایکسپو سینٹر میں ہونے والی نمائشوں کو مس نہیں کیا کرتا تھا۔ آج نمائش میں جانا یوں ہو گیا کہ سلمان کو اپنی بہنوں اور بھابھی کے لیے جو کوئٹہ میں رہتی تھیں کچھ تحائف خریدنے تھے۔ اسی کے اصرار پر ہم پانچوں ایکسپو سینٹر پہنچے تھے۔

یونیورسٹی سے وہاں تک پہنچنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ سلمان کے علاوہ باقی سب ہی وہاں صرف تفریحاً آئے تھے مگر ملتانی کڑھائی والے سوٹس کے اسٹال پر رک کر فیصل کو اپنی منگیتر صاحبہ کا خیال آ گیا تھا اور وہ اس کے لیے سوٹ پسند کرنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑے یوں ہی نظریں دوڑاتے دوڑاتے ایک سوٹ پر جا کر میری نظریں ٹھہر گئی تھیں۔ آف وہائٹ کلر کا وہ خوب صورت سا سوٹ جس پر سرخ رنگ کے دھاگوں سے کڑھائی کی ہوئی تھی مجھے ایک ہی نظر میں اپنی طرف متوجہ کر گیا تھا۔ اسے خریدتا دیکھ کر میرے دوست بہت حیران تھے۔ اتنی زنانہ شاپنگ تو میں نے زندگی میں کبھی نہیں کی تھی۔ کبھی اگر اپنی کسی کزن یا کلاس فیلو کو کوئی گفٹ دیتا بھی تھا تو کوئی قلم یا پھر کوئی کتاب یا پھر کوئی ڈیکوریشن پیس۔ ان چیزوں سے ہٹ کر تو میں نے آج تک کبھی کسی کو کچھ نہیں دیا تھا۔

''یار! یہ مامی کے لیے خرید رہا ہوں۔''

بولتے وقت مجھے احساس تھا کہ میں دوستوں سے جھوٹ بول رہا ہوں۔

''بے چارہ عباس جہاں زیب، کب اس معصوم کی زندگی میں سویٹ مامی کے علاوہ کوئی اور خاتون تشریف لائیں گی جن کے لیے یہ کچھ خریداری کر سکے۔''

فیصل نے میرا مذاق اڑایا تھا۔ میں اپنے روٹین کے انداز میں کوئی جوابی کارروائی نہیں کر سکا تھا۔ دراصل میں خود اپنی اس خریداری پر اب تک اچنبھے میں مبتلا تھا۔ مامی کا نام لے کر جھوٹ بولنے پر تھوڑی سی شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔ اس لیے مامی کے لیے اسی اسٹال سے ایک کڑھا ہوا دوپٹہ خرید لیا تھا۔ واپسی میں گھر جاتے ہوئے میں خود اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔

''صد حیف تم پر عباس جہانزیب! اپنے اردگرد بے شمار حسین، ذہین اور نہایت معقول قسم کی لڑکیوں کے موجود ہوتے ہوئے اس افلاطون کے لیے تحفے خریدتے پھر رہے ہو۔''

خود پر یہ بات منکشف ہوتے ہی کہ یہ سوٹ کس کے لیے خریدا گیا ہے میں اپنے آپ سے بدظن ہو گیا تھا۔ اپنے اندر پیدا ہوتی یہ تبدیلی تو میں کافی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا مگر دانستہ خود کو جھٹلانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

''لعنت ہے تمہاری چوائس پر عباس جہانزیب!'' میں خود کو کوس رہا تھا۔ کیا دنیا میں معقول لڑکیوں کا قحط پڑ گیا تھا۔ وہ جس کے ساتھ چند

منٹ گزارنا مجھے دوبھر ہوا کرتا تھا آج کل میں بڑے سکون سے بیٹھ کر اس کی افلاطونی گفتگو سنا کرتا تھا حالانکہ اس روز کے بعد وہ معصومانہ سا تاثر دوبارہ کبھی نظر نہیں آیا تھا مگر مجھ جیسے احمق انسان کے لیے تو وہ ایک تاثر ہی کافی گہرا ثابت ہوا تھا۔ محبت کی اس تعریف میں کہ محبت اندھی ہوتی ہے اب آپ اس بات کا اضافہ کرلیں کہ اندھی ہونے کے ساتھ ساتھ محبت احمق، الو، گھامڑ، پاگل اور بے وقوف بھی ہوتی ہے اور یہ کہ اگر پاگلوں کے سر پر سینگ ہوا کرتے تو عباس جہانزیب بھی سر پر سینگ لیے گھوم رہا ہوتا۔

شام میں میں نے اسے اور مامی کو ان دونوں کے لیے خریدے گئے تحفے پکڑائے تھے۔ مامی دوپٹہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

''بہت پیارا ہے۔ عباس تمہاری چوائس بہت اچھی ہے۔'' (آج سے پہلے مجھے بھی یہی خوش فہمی تھی مامی۔) وہ محترمہ سوٹ دیکھ کر شانِ بے نیازی سے شکریہ کہتی دوبارہ ٹائمز کے تازہ شمارے کی طرف متوجہ ہوگئی تھی اور شکریہ کا بھی کیا دل جلانے والا انداز تھا۔

''بہت شکریہ، ویسے اس تکلف کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی۔''

شاید در پردہ مجھے یہ سمجھانا مقصود تھا کہ ان کپڑوں، جوتوں اور زیورات سے متاثر ہونے والی لڑکیوں میں میں شامل نہیں ہوں۔ مجھے اگر کوئی تحفہ دینے کا شوق تمہارے دل میں جاگا ہی تھا تو کوئی کتاب دیتے تحفے میں۔ کوئی انسائیکلوپیڈیا، کوئی فلسفیانہ اور عالمانہ سی بک۔ دوپہر سے جو خود پر جھلاہٹ اور غصہ مسلسل سوار تھا وہ مزید بڑھ گیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا دیوار سے جا کر اپنا سر ٹکرا دوں۔ اپنے اس فضول سے دل کو نکال کر ہی پھینک دوں جو بلاوجہ مجھے عاجز کر رہا تھا۔

مامی کے بہت روکنے کے باوجود ''میں نے تمہارے لیے اسٹرابیری کیک بیک کر کے رکھا ہوا ہے، وہ کھاتے جاؤ۔'' میں معذرت کرتا گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔ کچھ وقت جم خانہ اور پھر باقی کا وقت دوستوں میں گزار کر پھر میں رات گئے ہی گھر واپس آیا تھا اور جب رات کو سونے لیٹا تو سونے سے پہلے جو آخری خیال میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ وہ یہ سوٹ پہن کر لگے گی کیسی۔

''تف ہے تم پر عباس۔'' میں نے غصے میں تکیہ اٹھا کر دور پھینکا تھا۔ پتا نہیں یہ کیا خناس بھر گیا تھا میرے دماغ میں۔ یا اللہ مجھے اس افلاطون کے شر سے پناہ میں رکھ۔'' میں نے جلدی سے اللہ کو یاد کیا تھا۔

☆

''پیراڈائز لاسٹ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے عباس؟ تم ملٹن کی اس معرکتہ آلارا تخلیق کے بارے میں کیا نظریہ رکھتے ہو؟'' وہ لان میں میرے ساتھ بیٹھی پچھلے ایک گھنٹے سے ملٹن پر بولنے میں مصروف تھی۔

''بیہ! تم بالوں کی کٹنگ کیوں نہیں کروالیتیں۔ ذرا سے چینج سے تم بہت اچھی لگنے لگو گی۔''

میرے اس جملے پر اس نے ناپسندیدہ نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ ہر وقت بالوں کا گھونسلہ بنائے پھرتی ہے، الجھے بکھرے بال، کلپ سے نکلی بے تکے انداز میں اردگرد بکھری لٹیں۔ اگر انہیں ذرا سا سنوار دیا جائے تو کتنی بہتر لگ سکتی تھی یہ ملٹن کی مداح۔ میں بغور اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

''چھوڑو اسے، تمہیں پتا ہے مجھے اچھا دچھا لگنے کا کوئی شوق نہیں، ہاں میں تم سے کیا کہہ رہی تھی؟'' وہ میری بات نظر انداز کر کے دوبارہ

شروع ہو چکی تھی۔

''تمہارے فیوریٹ مرزا غالب کی کلاسیکل غزلوں پر شیما کرمانی پرفارم کر رہی ہیں، چلو گی دیکھنے؟'' میں نے کچھ دیر بعد اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا تو بڑی خوشی خوشی وہ جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

''تم تیار ہو جاؤ، میں اتنی دیر میں اپنی میلز چیک کر لیتا ہوں۔'' میں کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا تھا۔

''تیار ہونے کی کیا ضرورت ہے، دوپہر میں ہی تو نہا کر یہ کپڑے پہنے تھے، اچھے خاصے ہیں۔'' وہ اپنے کاٹن کے انتہائی فضول سوٹ کو اچھے خاصے کہہ کر میرا موڈ آف کر گئی تھی۔ پھر بھی میں اتنی جلدی ہمت ہارنے والوں میں سے نہ تھا۔

''تم وہی سوٹ پہن لو نا بیہ جو میں نے دیا تھا۔'' اپنے ہی لہجے میں موجود ڈھیر ساری اپنائیت اور کسی بڑی ہی شدید خواہش کی موجودگی نے مجھے اندر ہی اندر جھنجھلاہٹ میں مبتلا کیا تھا۔

''کیا تم کپڑوں و پڑوں کے غم میں پڑ گئے ہو۔ ہٹاؤ اس ٹاپک کو۔ جلدی سے چلو مجھے تو بڑی ایکسائٹمنٹ ہو رہی ہے۔ شیما کرمانی پرفارم کرے گی، اف مزہ آ جائے گا۔''

(عشق انسان کو یونہی ذلیل کرواتا ہے۔ تب ہی تو دنیا کے تمام عاشق پیٹ بھر بھر کر ذلیل و خوار ہوئے ہیں۔)

میں غصے میں اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا مگر وہ میرے گھورنے سے بے نیاز جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''مجھے یاد نہیں رہا تھا آج تو فیصل کے گھر پر سارے دوستوں کو جمع ہونا تھا۔ مامی کو بتا دینا، میں رات میں دیر سے آؤں گا، کمبائن اسٹڈی کا پروگرام ہے ہمارا۔''

میں دل ہی دل میں کھولتا گاڑی کی چابی اٹھا کر پورچ کی طرف چلا گیا تھا۔ سمجھتی کیا ہے یہ اسٹوپڈ خود کو۔ گھنٹوں میرا دماغ کھولتا رہا تھا۔

☆

''بیہ! پلیز ایک کپ چائے پلا دو۔'' میں کمپیوٹر پر اپنے پروجیکٹ کا کچھ کام کر رہا تھا، وہ بھی وہیں موجود تھی۔ شاید کوئی نوٹس وغیرہ بنائے جا رہے تھے۔

''تم خود بنا لو، دیکھ نہیں رہے میں کتنی بزی ہوں۔''

وہاں سے صاف انکار آیا تھا۔ سر اٹھائے بغیر مجھے جواب دے کر وہ اسی شد و مد سے لکھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ میری مردانہ انا پر بڑی کاری ضرب پڑی تھی اس انکار سے۔ اس کے بجائے میں نے یہ فرمائش اپنی کسی اور کزن یا دوست سے کی ہوتی تو وہ آدھی رات کو بھی سر کے بل جا کر میرے لیے چائے بنا کر لے آتی بلکہ اگر پہلے چائے کے باغات میں سے جا کر پتی لانی پڑتی وہ بھی لے آتی۔ اپنی شخصیت پر میں یونہی تو فخر نہیں کیا کرتا۔ لڑکیاں جس طرح مجھے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔ سرگوشیوں میں میری اسمارٹنس اور ذہانت کی تعریفیں کرتی ہیں۔ وہ سب مجھے ساتویں آسمان پر پہنچانے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔

میرا موڈ بری طرح خراب ہو گیا تھا۔ یا یہ لڑکی بدل جائے یا پھر میرے دل میں پیدا ہو جانے والے یہ اوٹ پٹانگ خیالات تبدیل ہو جائیں ورنہ میں لازمی پاگل ہو جاؤں گا۔ میں دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔

☆

مامی کی مروت میں شروع کیا جانے والا کام آہستہ آہستہ میری زندگی کا روگ بنتا جا رہا تھا۔ مامی احساسِ ممنونیت سے مغلوب ہو کر کبھی میرا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کرتیں تو میرا دل رونے کو چاہنے لگتا۔

''مامی! آپ کی لاڈلی نے واقعی مجھے بھی پاگل بنا دیا ہے کیونکہ کوئی ہوش مند آدمی تو اس طرح کی باتیں سوچ نہیں سکتا۔''

ان ہی الجھے الجھے سے دنوں میں زرمین جو مامی کی بھانجی تھی اس کی اسلام آباد سے آمد ہوئی تھی۔ گریجویشن کرنے کے بعد فی الحال وہ فارغ تھی اور چھٹیاں گزارنے خالہ کے گھر آ گئی تھی۔ کیا لڑکی تھی وہ، بے تحاشا حسین اور اس پر ستم یہ کہ اسے اپنی اس خوبصورتی کا پورا پورا احساس بھی تھا۔ حسن خود آگاہ بھی ہو تو مزید قیامت ڈھاتا ہے۔ اس پر گفتگو کا سلیقہ بھی تھا محترمہ کے پاس۔ اس سے بات کرتے ہوئے نہ سر میں درد ہوتا تھا نہ کہیں بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔ سارا دن وہ مامی کے ساتھ گھر پر ہوتی تھی اور اکثر کھانا وغیرہ وہی بنا لیا کرتی تھی۔

''عباس ڈنر گھر پر ہی کرنا، سی فوڈز ملیں گے آج تمہیں کھانے میں۔''

میں سلمان کے گھر جانے کے لیے نکل رہا تھا جب پیچھے سے زرمین نے آواز دی تھی۔ میں گردن ہلاتا باہر نکل گیا تھا۔ وہ بڑی بے تکلف سی لڑکی تھی۔ آتے ہی اس نے خود ہی میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اکثر اس سے کافی دوستانہ ماحول میں گپ شپ ہو جایا کرتی تھی بلکہ آج لنچ کرتے ہوئے تو مامی نے مجھ سے اسے کہیں گھمانے پھرانے لے جانے کے لیے بھی کہا تھا۔

''سارا دن زرمین بے چاری گھر میں بور ہوتی رہتی ہے۔ موقع ملے تو اسے کہیں گھما لاؤ۔ پھر باقاعدہ پکنک کا پروگرام میں تمہارے ماموں جان سے پوچھ کر رکھتی ہوں۔''

میں نے ان کی بات پر خاموشی سے گردن ہلا دی تھی۔

رات کا کھانا واقعی بہت مزے دار تھا۔ ماموں جان بھی زرمین کے سگھڑاپے سے بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ بیبیہ صاحبہ حسبِ دستور خاموشی سے کھانا کھاتی کسی فلسفیانہ مسئلے کا حال تلاش کرنے میں مصروف تھی۔ جب سے زرمین آئی تھی میرا بیبیہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بہت کم ہو گیا تھا۔ کل بھی جب وہ مجھے کسی کتاب میں سے کوئی خطرناک سی بات سنانے آئی اور ابھی شروع کیا ہی تھا کہ زرمین بھی وہیں آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا یہ تم بورنگ چیزیں پڑھتی رہتی ہو بیبیہ۔'' وہ منہ بگاڑ کر اس سے بولی پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''عباس! تم مجھے کمپیوٹر آپریٹ کرنا سکھا دو نا۔ جس کسی کو دیکھو آج کل کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور آئی ٹی کی باتیں کرتا نظر آتا ہے، مجھے تو ایسا لگتا ہے انگلش لٹریچر پڑھ کر بھی میں جاہل کی جاہل رہ گئی۔''

''سنڈے کو آ جانا، تمہیں تھوڑا بہت بتا دوں گا، ہاں اگر زیادہ اچھی طرح سیکھنا چاہتی ہو تو کوئی انسٹی ٹیوٹ جوائن کر لو۔ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا۔''

میں نے جواباً بڑی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تو وہ فوراً بولی ''تھوڑا بہت بھی چلے گا۔''

پھر میں زرمین کے ساتھ باتیں کرنے لگا اور بیہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

اتوار کے دن دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر میں اور زرمین اسٹڈی میں آ گئے تھے۔ میں اسے کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتیں سمجھا رہا تھا جب بیہ اندر داخل ہوئی تھی۔ ایک نظر ہم دونوں پر ڈال کر وہ کوئی کتاب کھول کر میز کرسی سنبھال چکی تھی۔ بظاہر زرمین کے ساتھ باتوں میں مصروف ہونے کے باوجود میں یہ بات محسوس کر گیا تھا کہ بیہ کی ساری توجہ ہم لوگوں کی طرف تھی۔ وہ کتاب کھول کر بیٹھی ہوئی ضرور تھی مگر پڑھا اس نے ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

اس جیسی لاپرواہ اور خود میں مگن رہنے والی لڑکی کو کسی دوسرے کے معاملات میں دلچسپی لیتے بلکہ تجسس میں مبتلا ہوتے دیکھ کر مجھے خاصا تعجب تھا۔ شام میں میں اور زرمین سی ویو جا رہے تھے۔ میں نے اخلاقاً بھی بیہ سے چلنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہاں سے صاف انکار سننے کو ملے گا، فائدہ اپنی بے عزتی کروانے کا۔ اس قسم کی تفریحات کو تو وہ بے کار اور ناکارہ قسم کے لوگوں کے کرنے کا کام کہا کرتی تھی۔

☆

''مامی! مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے، پلیز کچھ کھانے کو دیں۔''

میں نے یونیورسٹی سے آتے ہی حسبِ عادت کچن کے باہر سے ہی چلانا شروع کر دیا تھا۔ کچن میں زرمین اور بیہ دونوں موجود تھیں۔

''بیٹھو عباس! میں لاتی ہوں تمہارے لیے کھانا۔'' زرمین نے مسکراتے ہوئے فوراً کہا تھا۔

''تم تو ماما کے ساتھ شاپنگ کرنے جا رہی تھیں نا۔''

کچھ طنزیہ سے انداز میں وہ زرمین سے مخاطب ہوئی تھی۔ میں نے چونک کر اسے بغور دیکھا تھا۔

''ہاں جا تو رہی ہوں لیکن کھانا نکالنے میں کتنی دیر لگے گی۔'' وہ اس کے طنزیہ انداز کا نوٹس لیے بغیر آرام سے بولی تھی۔

''تم جاؤ، میں دے دوں گی۔'' وہ دوبارہ اسی جلے کٹے انداز میں بولی تھی۔

''تم؟'' زرمین نے بڑے تعجب سے تصدیق چاہی تھی۔ آخر وہ بھی اس کی کزن تھی۔ شروع ہی سے واقف ہو گی محترمہ کی عادتوں سے۔ میں بہت گہری نگاہوں سے اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔

''نہیں بھئی زرمین! تم ہی کھانا نکال دو، بیہ کے ہاتھوں سے نکلے سالن اور چاولوں میں سے فلسفہ، تاریخ اور ادب وغیرہ ہی کا ذائقہ آئے گا اور اس وقت میرا کوئی بدذائقہ چیز کھانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔''

میں نے بہت سکون سے کہتے ہوئے ایک بھرپور نظر اس کے دھواں دھواں ہوتے چہرے پر ڈالی تھی اور کچن سے باہر نکل آیا تھا۔ اب آیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ عورت کی نفسیات کے اس رخ پر تو میں نے اس نے پہلے کبھی غور کیا ہی نہیں تھا۔ جو کام میری توجہ اور التفات نہ کر پایا تھا وہ میری بے گانگی، لاتعلقی اور کسی دوسرے میں دلچسپی بخوبی سرانجام دے دے گی۔ میں اپنے آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کرتا خود ہی خود مسکرائے جا رہا تھا۔

☆

بنت حوا بھی عجیب تماشا ہے، کل تک جو مجھے کوئی بہت ہی بے کار، لاابالی اور غیر سنجیدہ سا لڑکا سمجھ کر بری طرح نظر انداز کیا جاتا تھا اب اچانک ہی میں بہت خاص اور بڑی ہی اہم شخصیت بن گیا تھا۔ ویسے اس کے اس ردِ عمل سے اتنا تو میرے دل کو اطمینان ہوا تھا کہ اندر سے وہ بہر حال ایک نارمل لڑکی ہے۔ خدا بھلا کرے زرمین کا جو بالکل درست موقع پر کراچی آئی تھی۔ حالانکہ میری اس سے صرف دوستانہ انداز میں بات چیت ہوا کرتی تھی۔ اسے خود بھی میری طرف سے کوئی خوش فہمیاں یا غلط فہمیاں لاحق نہیں تھیں مگر بیہ نے اپنے دل میں جو گمان پالنا شروع کیے تھے وہ اسے ہماری دوستی کو کسی اور رنگ میں سوچنے پر مجبور کیا کرتے تھے۔ کچھ خود میں بھی جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کر رہا تھا جو اس کے شکوک میں اضافہ کریں۔

پہلے میں شام کا بیشتر وقت گھر سے باہر دوستوں وغیرہ میں گزارا کرتا تھا۔ آج کل زیادہ وقت گھر پر رہنے لگا تھا۔ مامی نے تو زرمین کو صرف کہیں گھمانے پھرانے کے لیے لے جانے کو کہا تھا مگر میں اسے دو مرتبہ شاپنگ کرانے ساتھ لے گیا تھا۔ اس سے پہلے صرف سنا ہی تھا کہ عورتوں کی خریداری سے خدا پناہ میں رکھے مگر زرمین کے ساتھ بازاروں کی خاک چھانتے اس بات کا یقین بھی آ گیا تھا۔ کیا لڑکی تھی وہ، دل ہی نہیں بھرتا تھا اس کا شاپنگ سے۔ طارق روڈ، بہادر آباد، حیدری، صدر، کلفٹن کوئی جگہ جو اس نے چھوڑی ہو۔ گھنٹوں وہ بازاروں میں ماری ماری پھرتی تھی اور جب گھر واپس آئی تو مامی سے شکوہ کرنے والے انداز میں بولی۔

''ابھی تو میں رابی سینٹر نہیں گئی، یہ عباس جلدی مچا رہا تھا۔'' میں نے جلدی کے لفظ پر آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا تھا۔

''اور آنٹی میٹرو پر کیا زبردست ورائٹی آئی ہوئی ہے، سچ میرا تو سب کچھ خرید لینے کو دل چاہ رہا تھا۔''

میں گھنٹوں اس کے ساتھ خوار ہونے کے بعد مزید یہ زنانہ گفتگو برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

''شمائل کے نئے پرنٹس دیکھے آپ نے، یہ دیکھیں یہ بلو سوٹ کتنا زبردست لگ رہا ہے۔''

وہ شاپنگ بیگز میں سے مختلف اشیاء نکال نکال کر انہیں دکھا رہی تھی اور میری نظریں سامنے صوفے پر خاموشی سے بیٹھی بیہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ زرمین اور اس کی شاپنگ کو بڑی سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی۔ زرمین کے ساتھ بازاروں میں پھرنا کوئی خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔ میرے سر میں درد ہو گیا تھا اس کی کپڑوں جوتوں کی باتیں سن سن کر مگر اب جو بیہ کے اس اداس چہرے پر نظر پڑی تو اچانک ساری تھکاوٹ اترتی ہوئی محسوس ہوئی حالانکہ شاپنگ کے لیے جاتے وقت زرمین نے بیہ سے بھی چلنے کے لیے کہا تھا مگر میں نے اس کے جواب دینے سے پہلے ہی فوراً کہا تھا۔

''بیہ کو کپڑوں وپڑوں اور شاپنگ وغیرہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ جتنی دیر ہم شاپنگ کرنے میں وقت برباد کریں گے اتنی دیر میں تو یہ ایک آدھ کتاب نمٹا لے گی۔''

میرا انداز سراسر مذاق اڑانے والا تھا، وہ اتنی سیدھی اور اللہ میاں کی گائے نہیں تھی کہ اپنے بارے میں کوئی کمنٹس سن کر جواب نہ دے مگر اس وقت وہ میری بات پر کچھ کہے بغیر زرمین سے بولی تھی۔

''تم لوگ جاؤ زرمین۔''

زرمین تو اس کے بعد بھی کھڑی اس سے کچھ بات کرتی رہی تھی مگر میں بے نیازی سے کندھے اچکا کر پورچ کی طرف چلا گیا تھا۔

☆

زرمین کا پندرہ روز کا یہ دورہ میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا تھا۔ اس کے آجانے سے وہ سوئی ہوئی خود سے مگن اور لاپرواہ لڑکی جاگ گئی تھی۔ حالانکہ اتنے دنوں تک مستقل مزاجی سے سارا وقت گھر پر ٹکتے، زرمین کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے، ٹی وی دیکھتے، کارڈز کھیلتے میں بری طرح بور ہوگیا تھا مگر پھر بھی میں نے اس بوریت کو بڑے سکون سے برداشت کیا تھا۔ وہ جاتے وقت میری مہمان نوازی اور اس کے لیے اتنا زیادہ ٹائم نکالنے پر کافی شکریہ ادا کر کے گئی تھی۔

اس روز میں یونیورسٹی سے گھر آیا تو ایک بہت ہی مختلف نظارہ دیکھنے کو ملا۔

''جلدی آجاؤ عباس! تمہارے فیوریٹ چائنیز رائس اور چکن چلی بنائی ہے میں نے۔''

مامی نے میری شکل دیکھتے ہی کھانے کا مینو بتایا تھا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے چہرے پر پھیلتے حیرت بھرے تاثرات کو چھپاتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔ پانچ منٹ بعد میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ مامی بے تحاشا خوش نظر آرہی تھیں۔ خوشی ان کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔ میں ان کی خوشیوں اور مسکراہٹوں پر خود بھی دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

آج کل تو یونیورسٹی کے بعد سیدھا اچھے بچوں کی طرح گھر تشریف لائی جانے لگی تھی۔ کافی دنوں سے یہی ہو رہا تھا کہ لنچ پر وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد میں کچھ دیر ستانے کے ارادے سے کمرے میں آگیا تھا۔ مامی بھی میرے پیچھے پیچھے ہی کمرے میں آگئی تھیں۔

''تم نے دیکھا عباس! اُف میرے اللہ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا۔'' وہ میرے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی تھیں۔

''سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا جب صبیحہ نے مجھ سے کہا کہ آج وہ یونیورسٹی نہیں جائے گی اور یہ کہ آج اسے میرے ساتھ بیوٹی پارلر جانا ہے۔''

میں ان کی باتوں پر خاموشی سے مسکرا رہا تھا۔ یقین تو اب تک مجھے بھی نہیں آرہا تھا کہ وہ گھونسلا جو اس کے سر پر رہا کرتا تھا ختم بھی ہوسکتا ہے۔ میرے کہنے پر کہ ''بالوں کی کٹنگ کروالو۔'' کس طرح منہ بگاڑ کر محترمہ نے کہا تھا۔

''مجھے اچھا وچھا لگنے کا کوئی شوق نہیں۔''

اور اب بڑی خاموشی سے جا کر اچھا لگنے کی ایک کوشش کر لی گئی تھی اور خیر کوشش کافی کامیاب بھی رہی تھی۔ کتنی بدلی بدلی اور پیاری لگ رہی تھی وہ صرف ہیئر اسٹائل چینج کر لینے سے۔ پتا نہیں اس کٹنگ کا نام کیا تھا مگر شانوں سے ذرا نیچے آتے اس کے وہ براؤن کلر کے سلکی بال بے حد خوبصورت لگ رہے تھے۔ مامی کے جانے کے بعد میں کتنی دیر تک لیٹا ہوا اس تبدیلی کو انجوائے کرتا رہا تھا۔

شام میں وہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ میں نے بظاہر ایک لاپرواہ سی نگاہ اس پر ڈالی تھی اور کورڈلیس اٹھا کر اس کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ بالوں کے ساتھ ساتھ لباس میں بھی کافی بہتری آئی تھی۔ ایک تو پورا سوٹ ایک ساتھ ورنہ میں نے اسے کبھی سوٹ کا ہم رنگ دوپٹہ اوڑھے نہیں دیکھا تھا۔ میں فیصل سے فون پر بات کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کن انکھیوں سے اس کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔

''مجھے تو لڑکیوں کے لمبے بال پسند ہیں۔ بالوں ہی میں تو عورت کا سارا حسن ہوتا ہے۔'' وہ ڈاکٹر عزیز کے اسائنمنٹ پر بات کر رہا تھا،

میری اس بے موقع اور انتہائی فضول بات پر حیرت سے بولا تھا۔

''خیر تو ہے عباس! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

میں اس کی حیرت پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ زیادہ ہنسی تو مجھے بیہ کے چہرے پر موجود تاثرات کو دیکھ کر آ رہی تھی۔

''آج کل کی یہ پرکٹی لڑکیاں، کتنی کوفت ہوتی ہے ایسی لڑکیوں کو دیکھ کر، ابھی پچھلے دنوں اسلام آباد سے مامی کی ایک رشتہ دار آئی تھیں ہمارے گھر، کیا حسین لمبے بال تھے اس لڑکی کے، گھٹنوں کو چھوتے ہوئے۔'' میں مسکراہٹ دبائے ہوئے سنجیدگی سے بولا تھا۔

''کس کو سنا رہے ہو یہ ساری باتیں، کون بیٹھا ہے تمہارے پاس۔''

وہ میرا ہی دوست تھا آخر جینئس کیوں نہ ہوتا۔ میں بغیر کوئی جواب دیئے ہنسنے لگا تھا۔ بیہ ایک دم ٹی وی بند کرتی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اسے جاتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے میں نے دوبارہ اسائنمنٹ پر بات شروع کرنی چاہی تھی مگر فیصل میری کچھ دیر پہلے کی بکواس کی وجوہات دریافت کرنے پر مصر تھا۔

''بتائیں گے بیٹا تمہیں وقت آنے پر، ابھی صبر کرو۔''

میں نے اس تسلی دیتے ہوئے مزید کچھ بتانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

آج کل میں اسے دل بھر کر نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ لان میں یا لاؤنج میں میرے پاس آ کر بیٹھتی بھی تو میں کچھ ہی دیر میں وہاں سے اٹھ جایا کرتا تھا۔ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کر دیا تھا۔ مامی کو پڑھائی کی مصروفیت کہہ کر مطمئن کیا ہوا تھا۔

اس روز اتوار تھا، میں سارا دن دوستوں کے ساتھ گزار کر مغرب سے کچھ پہلے گھر واپس آیا تھا۔ ماموں جان، مامی اور بیہ تینوں لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، میں سب کو سلام کرتا وہیں بیٹھ گیا تھا۔

''عباس کے لیے بھی چائے لاؤ بیہ۔'' مامی کے کہنے پر وہ فرمانبرداری سے فوراً اٹھ گئی تھی۔

''مامی! آپ کو کیا میں بہت برا لگنے لگا ہوں۔'' میں نے تھوڑی غمزدہ شکل بناتے ہوئے انہیں مخاطب کیا تھا۔ وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی تھیں جیسے میری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''بیہ جو چائے بنائے گی اسے چائے کے علاوہ سب کچھ کہا جا سکتا ہے اور ایسا عجیب و غریب محلول پی کر مجھ بے چارے پر کیا گزرے گی اس کا اندازہ آپ بھی کر سکتی ہیں۔''

ماموں جان اور مامی میرے تبصرے پر مسکرانے لگے تھے جبکہ وہ دوبارہ واپس بیٹھ گئی تھی مگر شکل پر بارہ بج رہے تھے، منہ اچھی طرح پھولا ہوا۔

''اتنی بری چائے بھی نہیں بناتی میری بیٹی، ہم لوگ اس وقت بیہ ہی کے ہاتھوں کی بنی چائے پی رہی ہیں اور اچھی خاصی چائے بنائی ہے اس نے۔'' ماموں جان نے لاڈلی بیٹی صاحبہ کا منہ بنتا دیکھ کر جلدی سے کہا تھا۔ مامی کو اٹھتا دیکھ کر میں نے بے ساختہ انہیں روکا تھا۔

''آپ بیٹھیں مامی! میرا چائے پینے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا۔'' میرے کہنے پر وہ دوبارہ بیٹھ گئی تھیں۔

''تمہیں اب کہیں اور تو نہیں جانا؟'' کچھ دیر بعد ماموں جان نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میرے نفی میں سر ہلانے پر وہ بولے۔

''بیہ کی فرینڈ کی انگیجمنٹ ہے، تم چھوڑ آنا اسے۔'' اگر ماموں جان کے بجائے یہ فرمائش خاتون نے کی ہوتی تو میں جھٹ انکار کر دیتا مگر اب سوائے اقرار میں گردن ہلانے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

نماز کے بعد میرا کچھ دیر پڑھنے کا پروگرام تھا، اپنے کمرے میں آنے سے پہلے میں نے اس سے کہہ دیا تھا۔

''جس وقت چلنا ہو مجھے بتا دینا میں اپنے کمرے میں ہوں۔''

کوئی نو بجے کے قریب میرے کمرے کا دروازہ بجا تھا۔ دستک دے کر وہ اندر آ چکی تھی۔

''چلو عباس!'' میں نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر ایک پل کو اس کی سمت دیکھا تھا اور اپنی نظریں اس پر سے واپس ہٹانے میں مجھے خاصی مشکل ہوئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اسے دوبارہ دیکھوں مگر دل کو ڈانٹ ڈپٹ کر میں نے بڑی لاپروائی سے بغیر اس پر نگاہ ڈالے کہا تھا۔

''تم چلو پورچ میں، میں آ رہا ہوں۔''

وہ خاموشی سے واپس مڑ گئی تھی۔ گاڑی کی چابی اٹھاتا میں پورچ میں آیا تو وہ گاڑی کے پاس ہی کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ سر جھکائے پتا نہیں زمین پر کیا تلاش کیا جا رہا تھا۔ پہلی نظر میں تو کیونکہ اسے نظر انداز کر ہی چکا تھا اس لیے اب دوبارہ دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا جبکہ وہ سر جھکائے ہوئے بھی تھی۔ اتنے اچھے طریقے سے ڈریس اپ ہوئے تو میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سی گرین کلر کا پیارا سا سوٹ، کھلے ہوئے بال، جیولری اور شاید میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ ویسے اس بے ڈھنگی لڑکی کو میک اپ کرنا آتا تو نہیں ہوگا۔ پتا نہیں میک اپ تھا یا نہیں بہر حال لپ اسٹک تو لگی ہوئی تھی۔

''اتنی بری چوائس بھی نہیں ہے میری۔'' میں نے اپنی کچھ عرصہ پہلے کی رائے پر نظرِ ثانی کی تھی۔

''مجھ جیسے ہینڈسم بندے کے ساتھ یہ لڑکی سوٹ کرے گی۔''

خود سے کہتے ہوئے میں نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ وہ خاموشی سے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ یونہی گاڑی چلاتے چلاتے میرا دھیان اس کے گلاسز کی طرف گیا تھا۔

''اوہ تو کونٹیکٹ لینسز بھی لگ گئے۔'' میں نے اپنی بے خبری پر افسوس کیا تھا۔ آج کل زیادہ وقت گھر سے باہر رہنے کی وجہ سے مامی سے بھی زیادہ بات چیت نہ ہو پاتی۔

خوبصورت لڑکیاں جب خاموش ہوتی ہیں تو اور خوبصورت لگتی ہیں اور خاص طور پر جب یہ خاموشی آپ ہی کی وجہ سے ہو۔ میں اس کی خاموشی کو بھی انجوائے کر رہا تھا۔ اس کی دوست کے گھر پر اسے ڈراپ کرتے ہوئے میں نے بڑے بے مروت انداز میں کہا تھا۔

''ٹھیک دو گھنٹے بعد میں تمہیں لینے آؤں گا، چاہے تم اس وقت فارغ ہوئی ہو گی یا نہیں، میں بالکل انتظار نہیں کروں گا۔''

وہ گفٹ ہاتھ میں لیے دروازہ بند کرتے کرتے ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔

''تم مت آنا لینے، میں روحی سے کہہ دوں گی وہ مجھے ڈراپ کروا دے گی۔''

بہت ناراضی اور غصے سے یہ جملہ بولا گیا تھا، باقی غصہ گاڑی کے دروازے پر اتارا گیا تھا۔ اتنی زور سے دروازہ بند کیا تھا کہ کتنی دیر تک میرے کانوں میں دھماکے ہوتے رہے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود میرا ارادہ تھا اسے لینے کے لیے جانے کا مگر جب گھر پہنچا تو مامی نے بتایا۔

''بیہ کا فون آیا تھا کہہ رہی تھی واپسی میں عباس کو مت بھیجئے گا، ابھی تو فنکشن شروع بھی نہیں ہوا، بہت دیر لگے گی۔''

میں نے بغیر کوئی تبصرہ کیے سر ہلا دیا تھا مگر واپسی میں جب اسے ایک اسمارٹ سے لڑکے کے ساتھ گاڑی میں آتا دیکھا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اگرچہ وہ اس لڑکے کے ساتھ اکیلی نہیں تھی۔ لڑکے کی برابر والی سیٹ پر غالباً بیہ کی سہیلی بیٹھی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر ان لوگوں کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ میں ٹیرس پر کھڑا جلتا بھنتا یہ سین دیکھ رہا تھا۔ زیادہ آگ تو مجھے اس وقت لگی جب وہ مسکرا کر ان محترم کو بطورِ خاص خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ اگرچہ آواز مجھے نہیں آ رہی تھی مگر اندازہ تو ہو رہا تھا کہ کیا بات ہو رہی ہے۔ میرے ساتھ تو کبھی اخلاق نہیں نبھایا گیا اور وہ رسل کرو کا جانشین بہت اچھا لگ رہا تھا جو مسکرا مسکرا کر شکریے ادا کیے جا رہے تھے۔

یہ سب سوچتے وقت یہ خیال نہیں آیا تھا کہ آج کل میں خود اس کا کتنا دل جلاتا ہوں اور وہ بھی جان بوجھ کر، جبکہ وہ مجھے جلانے کے لیے نہیں مسکرائی تھی۔ اسے تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ میں ٹیرس پر کھڑا ہوں۔

☆

چھٹیاں ہوئیں تو میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کا پروگرام بنایا۔ اسلام آباد، مری بھوربن، نتھیا گلی وغیرہ وغیرہ سے ہوتا ہمارا آگے کافی سارے شمالی علاقوں میں گھومنے کا پروگرام تھا۔

''تم اسلام آباد بھی جاؤ گے؟'' میں سامان پیک کر رہا تھا جب وہ کمرے میں آئی تھی۔ اسلام آباد کے ساتھ اسے کیا پریشانی ہے مجھے اچھی طرح معلوم تھا اس لیے جھٹ سنجیدگی سے بولا۔

''اسلام آباد تو جانا ہی ہے، زرمین سے وعدہ کیا تھا میں نے کہ چھٹیوں میں اسلام آباد ضرور آؤں گا۔''

زرمین کا ذکر کرتے وقت لہجے میں خوب ساری مٹھاس بھی گھول لی تھی۔

''کیا لڑکی ہے بھئی وہ، میں تو اب تک حیران ہوں۔ اس قدر خوش لباس اور خوش گفتار، اس کے پاس بیٹھو تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔'' میں نے پہلے مرتبہ اس طرح برملا زرمین کی تعریف کی تھی وہ بھی اس سے۔ وہ اپنے تاثرات مجھ سے چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

''صحیح کہہ رہے ہو، میری سب کزنز میں زرمین کو سب سے زیادہ ڈریسنگ کا سینس ہے۔''

حالانکہ دل ہی دل میں وہ زرمین کو گالیاں دے رہی ہوگی مگر منہ سے اس کے لیے پھول جھڑ رہے تھے۔ میں اپنی مسکراہٹ اس سے چھپاتا بیگ میں کپڑے رکھنے لگا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میرا زرمین کے گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اگر میری کزن ہوتی تو میں جاتا اچھا بھی لگتا۔ بلاوجہ مامی کے رشتہ داروں میں گھسنا نہ تو مجھے ایسا کوئی شوق ہے اور نہ ضرورت۔ یہاں بھی اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت ان محترمہ ہی کی وجہ سے دے دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد سے تو میری کبھی اس سے بھولے بھٹکے بھی کوئی بات چیت یا رابطہ نہ ہوا تھا۔

☆

خوب سارے دن گھوم گھام کر ہم لوگ واپس آ گئے تھے۔ میں گھر پہنچا تو بیہ گھر پر اکیلی تھی۔ ماموں جان اور مامی کی بابت اس سے دریافت کرتا میں اپنے کمرے میں جانے لگا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا میگزین سائڈ میں رکھتے ہوئے مجھ سے کھانے کا پوچھا تھا۔

''لڑکی واقعی سدھر گئی ہے۔'' میں نے خود سے کہا تھا۔ مامی اس کی انہی باتوں سے تو چڑا کرتی تھیں، کوئی آئے کوئی جائے وہ اپنی ذات میں مگن۔

''چائے پلا دو۔'' میں نے کھانے کے لیے منع کرتے ہوئے چائے کا کہا تو وہ جتانے والے انداز میں بولی۔

''سوچ لو میری بنائی ہوئی چائے کو چائے کے علاوہ سب کچھ کہا جا سکتا ہے اور پھر اس میں سے فلسفہ، ادب اور تاریخ وغیرہ کی خوشبو بھی آ رہی ہوگی۔''

میں اس کے دل جلے انداز پر اپنی مسکراہٹ چھپا نہیں پایا تھا۔

''کوئی بات نہیں یار! کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے چائے میں فلسفیانہ مزہ شامل کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔''

وہ بغیر کچھ کہے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ میں یونہی کچھ سستی کے عالم میں وہیں صوفے پر دراز ہو گیا تھا۔ پاس رکھا میگزین جو وہ پڑھتے پڑھتے الٹ کر وہیں رکھ گئی تھی، میں نے وقت گزاری کے لیے اٹھا لیا۔ وہ صفحہ جو وہ پڑھتے پڑھتے گئی تھی اسے دیکھتے ہوئے بے ساختہ میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ سردیوں میں کینوؤں کے چھلکوں کا ماسک کس طرح تیار کیا جائے گا اور بادام میں دودھ ملا کر ماسک کس طرح تیار ہوتا ہے، ملتانی مٹی کس قسم کی جلد کے لیے مناسب رہتی ہے، پلکیں لمبی گھنی کرنے کے لیے زیتون کے تیل کا مساج اور بالوں میں انڈا اور دہی ملا کر کب اور کیوں لگائے جاتے ہیں، یہ سب اس میں درج تھا اور میرا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا تھا۔

قدموں کی چاپ پر میں نے جلدی سے میگزین واپس رکھ دیا اور آنکھیں بند کر کے یوں لیٹ گیا جیسے اس وقت سے اسی پوزیشن میں تھا۔ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لیتے میں نے ایک نظر بغور اسے دیکھا تو احساس ہوا کہ ان میں سے بہت سے نسخے غالباً بڑی پابندی سے استعمال کیے جا رہے تھے۔ حالانکہ وہ بالکل سادہ سے حلیہ میں تھی، نہ میک اپ نہ کوئی اور تیاری مگر اپنے نئے فریم والے گلاسز میں جو اس کے چہرے پر زبردست سوٹ کر رہے تھے۔ اتنی اچھی تو لگ ہی رہی تھی کہ میں ایک ٹک اسے دیکھے گیا تھا۔ وہ میرے اس طرح دیکھنے پر کچھ سٹپٹا گئی تھی۔

''جہاں زیب انکل کا فون آیا تھا، کہہ رہے تھے وہ لوگ پاکستان آ رہے ہیں، ارسلان اور احمد کی چھٹیاں ہو گئی ہیں نا۔'' اس کے بتانے پر میں چائے پیتا کچھ سوچنے لگا تھا۔

☆

پاپا کے آنے پر میں نے پہلی فرصت میں ان سے وہ بات کر لی تھی جو کافی دنوں سے کرنا چاہ رہا تھا۔ انہیں میری پسند سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ وہ لوگ سلمیٰ آنٹی کے بھائی کے گھر ٹھہرے تھے اور میری خواہش پر پاپا، سلمیٰ آنٹی، ارسلان اور احمد اسی شام ماموں جان کے ہاں آ گئے تھے۔ میرے فائنل ایگزیمز ختم ہو گئے تھے، آج کل میں اپنے پروجیکٹ میں مصروف تھا۔ پروجیکٹ سے فارغ ہو جانے کے بعد تو مجھے یہاں سے چلے ہی

وغیرہ آئے بیٹھے تھے۔

''بھیا جلدی سے اندر آئیں۔'' ارسلان پورچ میں ہی میرا استقبال کرنے کھڑا تھا۔ میں پاپا لوگوں کی آمد اور اتنے پرجوش انداز پر حیران تھا۔ کل ہی تو یہ لوگ ہو کر گئے تھے آج پھر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اندر بڑھا تو کچن سے نکلتی مامی بھی میری طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ سب کی مسکراہٹوں اور خوشیوں کا پس منظر اچانک ہی میری سمجھ میں آ گیا تھا۔

''جلدی سے فریش ہو کر آ جاؤ، سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔''

مامی نے مجھ سے کہا تھا۔ ڈرائنگ روم سے باقی تمام لوگوں کی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں فریش ہو کر ڈرائنگ روم میں آیا تو اندر کا منظر میری خوشیوں میں اضافہ کا باعث تو تھا مگر حیرت کا نہیں۔

میں اندازہ لگا چکا تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ ارسلان اور احمد کا شور شرابا، پاپا اور سلمٰی آنٹی کے پاس بیٹھی بیہ اور وہ بھی میرا لایا ہوا سوٹ پہنے، حالانکہ اسے خریدتے وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ سوٹ وہ ہماری انگیجمنٹ کے دن پہنے گی۔ میں ان لوگوں کے بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ کوئی بڑے پیمانے پر تقریب تو ہو نہیں رہی تھی جو وہ خاص طور پر تیار ہوتی مگر اس سوٹ اور بالکل معمولی سی تیاری کے ساتھ بھی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ سر جھکائے بالکل خاموش، کچھ شرماتی ہوئی۔ پاپا نے اسے رنگ پہنائی تھی۔ سلمٰی آنٹی نے مٹھائی کھلائی تھی، سب خوش تھے، ہنسی مذاق، قہقہے، ہنگامے۔

جلدی جلدی میں بھی مامی نے ڈنر پر خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ وہ سارا وقت سر جھکائے شرمائی شرمائی سی رہی تھی اور میں اسے شرماتا دیکھ کر خاصا حیران ہو رہا تھا۔ کھانے کے بعد وہ لوگ چلے گئے تو ماموں جان اور بیہ بھی اپنے اپنے بیڈ رومز میں چلے گئے۔

میں اور مامی لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مامی سے تو میری ہمیشہ سے ہی دوستی رہی ہے، یوں بھی ہر بات وہ مجھ سے شیئر کرتی تھیں اب اس رشتے پر خوشی کا اظہار میرے سامنے کیوں نہ کرتیں۔

''مجھے تو ہمیشہ ہی سے تم اچھے لگتے ہو عباس مگر اس نظر سے تو میں نے کبھی تمہارے لیے سوچا نہیں تھا۔ میں نے کبھی تمہارے اور بیہ کے متعلق اس طرح نہیں سوچا تھا بلکہ کبھی بھولے بھٹکے بھی یہ خیال میرے دل میں نہیں آیا۔ تم نے یہ بات کیسے سوچ لی؟'' میں ان کے سوال پر مسکرا دیا تھا۔ ''اس لیے مائی سویٹ مامی! کہ آپ نے تو صرف اپنی بگڑی ہوئی صاحبزادی کو سدھارنے کا کام میرے ذمے لگایا تھا مگر میں نے یہ سوچا کہ کہیں میرے سدھارنے کے کچھ عرصہ بعد وہ دوبارہ نہ بگڑ جائے اس لیے کیوں نہ یہ ذمہ داری مستقل ہی قبول کر لوں۔''

وہ میرے جواب پر ہنس پڑی تھیں۔ ''میں اس لڑکی کی طرف سے کتنا فکرمند رہا کرتی تھی۔ لوگ تو ماؤں کی تربیت کو ہی الزام دیتے ہیں۔ ہر وقت فلاسفر بنی، نہ کپڑوں کا ہوش نہ دنیا زمانے کی کوئی فکر اور اب تم نے دیکھا ہے اسے تیار ہونے کا ڈھنگ بھی آ گیا ہے۔ کچھ لڑکیوں والے کام بھی کرنے لگی ہے اور تو اور آج کل کلنگ میں بھی دلچسپی لینے لگی ہے۔ یہ سب صرف تمہاری وجہ سے ہے عباس! ورنہ میں تو ہر جتن کرنے کے بعد مایوس ہو چکی تھی۔''

وہ میرا ہاتھ تھام کر تشکرانہ انداز میں بول رہی تھیں مگر میں ان کی بات زیادہ توجہ سے سن نہیں سکا تھا۔ میں سامنے لگے آئینہ میں بیہ کو لاؤنج

جانا تھا اور جانے سے پہلے میں اپنی نیا پار لگانا چاہتا تھا۔ یوں بھی پچھلے دنوں جو بیہ کی کوئی رشتہ دار خاتون بڑی پابندی سے یہاں کے چکر کاٹ رہی تھیں اور ہر چکر میں اسے خوب لپٹا لپٹا کر پیار بھی کیا کرتی تھیں وہ مجھے خاصا مشکوک کر دیا کرتا تھا۔

یہ بات بھی مامی سے باتوں باتوں میں پتا چل چکی تھی کہ وہ اپنے لاڈلے سپوت کے لیے رشتہ ڈھونڈنے میں مصروف ہیں اور یہی بات مجھے ڈرا رہی تھی، ساتھ ساتھ غصہ بھی آ رہا تھا، پہلے بھی تو یہ ہی بیہ تھی، تب تو کوئی اسے پوچھتا بھی نہیں تھا اور اب اتنی دیوانہ وار چاہت۔ اب لوگوں کو اس کا دل بھی خوبصورت نظر آنے لگا ہے اور بھی بہت سی اچھائیاں نظر آنے لگی ہیں۔ اسے اس رنگ میں تو میں اپنے لیے لایا ہوں، اب کسی اور کو اتنی آسانی سے اسے لے جانے دے سکتا ہوں۔ وہ میرے گھر کے علاوہ کوئی گھر نہیں ہو سکتا اور وہ میرے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا جس سے تمہاری زندگی وابستہ ہوگی۔

ماموں جان اور مامی پہلے تو حیران ہوئے تھے۔ میں بھی وہیں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ پتا نہیں حوروں کا مذکر کیا ہوتا ہے بہر حال اگر آسمان سے وہ بھی آ جاتا مامی تب بھی مجھے اس پر ترجیح دیتیں، اتنا اندازہ تو مجھے اچھی طرح تھا۔ بغیر کسی سوچ بچار کے ماموں جان اور مامی نے فوراً رشتے کے لیے اپنی طرف سے منظوری دے دی تھی۔

''ہمارے لیے تو عباس سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں ہو سکتا مگر بیہ سے پوچھنا بھی تو ضروری ہے۔ میں اس معاملے میں اولاد پر زبردستی کرنے یا اپنا فیصلہ مسلط کرنے کا قائل نہیں۔''

ماموں جان نے بڑی سنجیدگی سے پاپا سے کہا تھا۔

☆

''تم افیئر زرمین سے چلا رہے ہو اور پروپوز مجھے کر رہے ہو۔'' (یہ افلاطون کی بچی مانے گی نہیں، ارے احمق لڑکی ایسے موقعوں پر لڑکیاں شرماتی ہیں نہ کہ لڑنے کھڑی ہوتی ہیں) میں نے اس کے لال پیلے ہوتے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

''میرا زرمین کے ساتھ کوئی افیئر نہیں ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا تھا۔

''ہاں میں تو پاگل ہوں نا، مجھے تو جیسے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔'' وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوئی تھی۔

''اس اسٹڈی میں رکھی آدھی سے زیادہ کتابیں تمہاری ذاتی ملکیت ہیں اور اتنی عالم فاضل لڑکی کو پاگل سمجھنے کی حماقت تو میں کبھی بھی نہیں کر سکتا مگر بہت کتابیں پڑھنے کے باوجود بھی تمہارا علم خام رہ گیا۔ تمہیں لوگوں کے چہرے پڑھنے نہیں آئے۔ کون تمہارے لیے کیا فیلنگز رکھتا ہے یہ سمجھنا نہیں آیا۔''

میں ایک دم کرسی چھوڑ کر اس کے عین سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کیے بہت گہرے لہجے میں بولا تھا۔ وہ میرے انداز پر ایک دم بوکھلا سی گئی تھی۔ وہ جتنے طوفانی انداز میں چیختی چلاتی اسٹڈی میں آئی تھی اس کے برخلاف بڑی خاموشی سے چپ چاپ باہر نکل گئی تھی۔

اگلا دن میرے لیے بہت سی خوشیاں لے کر آیا تھا۔ میں پروجیکٹ کے سلسلے میں مختلف فرمز اور کمپنیوں میں خوار ہوتا شام میں گھر آیا تو پاپا

کی طرف آتے اور پھر ایک دم مڑ کر تیزی سے واپس جاتے دیکھ چکا تھا اور اسی چیز نے مجھے مامی کی بات پر توجہ نہیں دینے دی تھی۔

''میرا خیال ہے اب سونا چاہیے۔'' میرے کہنے پر وہ بھی گھڑی دیکھتی اٹھ گئی تھیں۔ انہیں شب بخیر کہتا میں سیدھا اس کے کمرے کی طرف آیا تھا۔ جو باتیں اس نے سن لی تھیں وہ اس انداز میں اس تک نہیں پہنچنی چاہیے تھیں اور اس بات نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میری دستک کے جواب میں جب کافی دیر تک کوئی آواز نہیں آئی تو میں خود ہی دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ دونوں ہاتھ لٹکائے وہ بیڈ پر بالکل ساکت سی بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے اندر آنے کا بھی اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

''بیہ!'' میں نے اسے آواز دی تھی مگر اس نے سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں اس کے بالکل سامنے کارپٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

''میری بات سنو بیہ!'' میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے کہا تھا اور آگے بھی بہت کچھ بولنا چاہتا تھا کہ وہ فوراً ہی میرا ہاتھ جھٹک کر چلائی تھی۔

''تم میرے ساتھ مزید کوئی ڈرامہ مت کرنا عباس! اس وقت مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی ہے۔ میں جسے محبت سمجھتی تھی وہ تو ڈرامہ تھا۔ مجھ بگڑی ہوئی کو سدھارنے کا ایک پلان۔ تمہاری توجہ، تمہاری ہر ایک بات سب جھوٹ تھی۔ یہ سوٹ جو آج میں نے بڑی خوشی خوشی پہنا تھا کہ اسے تم میرے لیے بہت پیار سے لائے تھے یہ بھی جھوٹ تھا، دھوکا تھا۔ کیوں تم ماما کی محبت میں اتنی بڑی قربانی دے رہے ہو عباس! مجھ میں تو کوئی اچھائی ہی نہیں ہے۔ ہاں واقعی میرا علم خام رہ گیا۔ مجھے لوگوں کو سمجھنا نہیں آیا۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

''ایسا نہیں ہے بیہ! تم بالکل غلط سمجھ رہی ہو۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ سوٹ میں واقعی تمہارے لیے بہت پیار سے لایا تھا۔'' میں نے اس کے آنسو صاف کرنا چاہے تو اس نے ہاتھ جھٹک دیے۔

''ہم لوگ تم میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے تھے، یہ بالکل سچ ہے۔ تم خود بتاؤ تمہارا وہ انداز کیا نارمل انداز کہلایا جا سکتا تھا۔ مامی کی اس حوالے سے فکرمندی بالکل جائز تھی۔ ماموں جان نے تمہاری قابلیت اور علم کی تعریفیں کر کر کے تمہیں عام لڑکیوں سے بہت مختلف بنا دیا تھا۔ اتنا مختلف کہ تم ابنارمل لگنے لگی تھیں۔ میں نے مامی کے کہنے پر تم میں تبدیلی پیدا کروانے کی یا اگر تم مائنڈ نہ کرو تو تمہیں سدھارنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ اس وقت میں نے صرف مامی کے کہنے پر یہ بات مانی تھی ورنہ تم جس طرح کی ہولناک اور خطرناک باتیں کیا کرتی تھیں ان سے میں پناہ مانگا کرتا تھا مگر یہ بالکل شروع شروع کی بات ہے۔ بالکل شروع کی جب میں تمہیں مامی کی خاطر برداشت کرتا تھا۔ بعد میں آہستہ آہستہ پتا نہیں مجھے کیا ہوا تھا جو کام میں نے مامی کی خاطر شروع کیا تھا وہ خود اپنی خاطر کرنے لگا تھا۔ تم ہر طرح تبدیل ہو جاؤ، بالکل ایک آئیڈیل لڑکی بن جاؤ، میرے لیے تم بالکل ویسی ہی ہو جاؤ جیسا میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ بس یہی میری خواہش تھی۔ مجھے تو تم اس طرح بھی اچھی لگتی تھیں، اگر میں تمہیں اس رنگ اور اس روپ میں نہ ڈھالتا، تم سر جھکانا اور شرمانا نہ سیکھتیں، بننا سنورنا تمہیں نہ آتا تو پھر بعد میں جب ہم ایک ساتھ کہیں جاتے تو لوگ تمہاری چوائس اور تمہارے ٹیسٹ کی تو خوب تعریفیں کیا کرتے اور مجھے بدذوق اور پاگل قرار دیتے۔''

سنجیدگی سے شروع کی گئی بات کے آخر میں میں غیر سنجیدہ ہو گیا تھا مگر وہ تب بھی ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔ اسی لیے ناراض شکل لیے خفا خفا

سی بیٹھی تھی۔

''ہاں اب تو تم مجھے اسی طرح نظر انداز کرو گی، اب تمہارے اور بہت سے طلب گار جو پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ تمہاری ممانی جان بھی خوب پھیرے لگا رہی ہیں۔ خوب تم پر دل بھر کر انہیں پیار آتا ہے۔ اب تم سب کو بہت پیاری لگتی ہو، بہت گڈ لکنگ اور بہت اٹریکٹو، اور یہ ہے بھی بالکل سچ، مگر بیہ! میں نے تمہاری خوبصورتی کی وجہ سے تم سے محبت نہیں کی، تم مجھے اس وقت بھی اچھی لگتی تھیں جب تم خوبصورتی کے کسی پیمانے پر پوری اترتی نظر نہیں آتی تھیں۔''

میں نے شکوہ کرنے والے انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا، وہ اب میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے ناراضی اور خفگی کی دھند کچھ چھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''اور ویسے تو تمہیں اچھا لگنے اور تیار ہونے کا کچھ خاص شوق نہیں مگر پھر بھی تم ان کپڑوں میں بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اب ہو سکتا ہے یہ اچھا لگنا کینوؤں، مالٹوں، ملتانی مٹی اور کھیرے کی وجہ سے ہو بہر حال یہ سچ ہے کہ تم ان کپڑوں میں ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو۔''

وہ اپنی تعریف پر تھوڑا سا شرمائی تھی مگر جملے کا اختتامی حصہ سن کر اس نے مجھے گھورنا شروع کر دیا تھا۔

''پرفیوم بھی تم نے پتا نہیں کون سا لگایا ہے مگر جو بھی ہے خوشبولا جواب ہے۔'' میں نے خوب گہرا سا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

'' حالانکہ ان پرفیومز اور ہیئر اسپریز میں کتنے خطرناک اور مہلک کیمیکلز شامل ہوتے ہیں، خاص طور پر '' Carbons chloro-flouro'' اور یہ کتنا خطرناک کیمیکل ہے، اوزون کی لیئر کی تباہی میں بہت بڑا ہاتھ ہے اس کیمیکل کا۔''

میں نے شرارت بھری نگاہیں اس کے چہرے پر ڈالیں تو کچھ جھینپ کر اس نے ایک دم وہاں سے اٹھنا چاہا تھا۔

''ابھی آپ کہاں جا سکتی ہیں محترمہ! ابھی تو مجھے آپ سے مہاتما گوتم بدھ کے اقوال سننے ہیں، گنے اور کپاس کی فصلوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں اور ڈارون کے نظریہ کے بارے میں بھی تو ہم لوگ سیر حاصل گفتگو کریں گے۔''

میں نے اسے مزید چھیڑا تو وہ مجھے گھورتے ہوئے چلائی تھی، ''سدھر جاؤ تم عباس۔''

ساتھ ہی پاس رکھا کشن بھی میرے اوپر پھینکا گیا تھا جو میں نے بڑے آرام سے کیچ کر لیا تھا۔

❁.....❁

یہ خواب تو اک سراب ہے

اگر آپ کو کسی ناپسندیدہ شخص کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جائے تو آپ کو کیسا لگے گا؟ اور اس پر ستم یہ بھی ہو کہ آپ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہ کر سکتے ہوں، نہ اس شخص سے اور نہ ہی اپنے قریب ترین کسی اور فرد سے۔ آج کل میں ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہوں، میری زندگی کا سب سے اہم فیصلہ اتنے آرام سے میری مرضی کے بغیر کر دیا گیا کہ میں دیکھتی ہی رہ گئی۔ میرے سارے خواب، ہر تمنا سب بکھر کر رہ گئے۔ اپنی آنے والی زندگی کے حوالے سے۔ سب ہی کے کچھ خواب ہوتے ہیں۔ کچھ خوبیاں جو ہم اپنے شریکِ سفر میں چاہتے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے خوابوں میں آنے والا وہ اچانک ہی ایک دم کہیں سے آجائے گا اور ہماری زندگی کو محبتوں کے نئے معنی سے آشنا کروا دے گا۔ میں بھی اس آنے والے کے بارے میں بہت کچھ سوچا کرتی تھی، میں نے اپنے خواب کبھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کیے تھے۔ مگر مجھے پھر بھی پورا یقین تھا کہ جیسا میں سوچا کرتی ہوں، وہ ہو بہو ویسا ہی ہوگا۔ اتنا ہی سنجیدہ مزاج اور میچور۔

چودہ پندرہ سال کی عمر میں بھی مجھے ہا ہو کرتے اچھل کود مچاتے لڑکے کبھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ بڑی عمر کے مرد ذمہ دار اور قابلِ بھروسہ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی شخص کے ساتھ میں خوش رہ سکتی تھی، ایسا ہی شخص مجھے تحفظ فراہم کر سکتا تھا۔ زندگی کے بارے میں جس کا ایک واضح نظریہ ہو، جو مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہو، جس کے اندر فیصلہ کرنے کی زبردست صلاحیت ہو اور ایسا شخص میں نے کئی بار چپکے سے دعا مانگتے ہوئے اپنے لیے اللہ سے بھی مانگا تھا۔

مجھے اپنی دعاؤں کے قبول ہونے کا پورا پورا یقین بھی تھا اور اس یقین کے سہارے میں بڑے آرام سے اس کا انتظار کر سکتی تھی۔ مگر مما نے اتنے اطمینان سے میرے ارمانوں کا خون کر دیا کہ میں بس روتی ہی رہ گئی۔ اس سے پہلے کسی فلم میں یا کسی کہانی میں ایسی کوئی سچویشن دیکھتی تو ہیروئن کا کتنا مذاق اڑایا کرتی تھی۔

''بڑی نیک پروین ہیں محترمہ، اماں ابا نے شادی طے کر دی اور وہ بس آنسو بہاتی رہ گئیں۔ ایسا بس صرف فلموں ہی میں ہو سکتا ہے، رشتہ طے ہو گیا اور بیچاری مظلوم سی ہیروئن کو پتا تک نہیں۔''

مگر جب خود میرے ساتھ یہی سب کچھ ہوا تو مجھے پتا چلا کہ ہماری زندگی بھی کسی ناول یا فلم سے کم نہیں ہوتی۔ کیا میں کبھی سوچ سکتی تھی کہ مما جو چھوٹی بڑی ہر بات اور ہر چیز میں میری رائے اور مشورے کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ خود میری ہی زندگی کے فیصلے کا اختیار مجھے دینا تو دور کی بات مجھ سے پوچھنا تک گوارا نہ کریں گی۔

اپنے ددھیالی رشتہ داروں سے مجھے ہمیشہ سے چڑ تھی اور اس کے لیے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہوں۔ جن لوگوں نے کبھی میری مما کو کوئی

سکھ نہیں دیا وہ مجھے کیا سکھ دیں گے اور میری مما کی سادگی اور معصومیت کہ وہ ان ہی مکار اور چاپلوس لوگوں کی باتوں میں ایک مرتبہ پھر آ گئی ہیں۔

میں نے نو سال تک مما کو سسرالیوں کا ناروا سلوک برداشت کرتے دیکھا ہے۔ مما سمجھتی ہیں، میں اپنے بچپن کی باتیں بھول گئی ہوں مگر یہ مما کی بھول ہے۔ مجھے دادی اماں، پھپھو اور سب سے بڑھ کر ستارہ آنٹی کا ہر وہ برا سلوک جو انہوں نے میری مما کے ساتھ کیا اچھی طرح یاد ہے۔ مما کا قصور صرف اتنا ہی تو تھا کہ وہ پاپا کی پسند تھیں۔ پاپا نے انہیں پسند کر کے ان سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں پاپا سے جونیئر تھیں۔ پاپا کا ماسٹرز کا آخری سمسٹر تھا اور مما آنرز میں تھیں۔ ان دونوں کا کوئی افیئر نہیں چلا تھا، بس پاپا کو وہ اچھی لگی تھیں اور انہوں نے اپنے والدین کو ان کے گھر رشتہ لے جانے کے لیے کہا تھا۔

دادی اماں کا رویہ وہی عام ساسوں والا تھا۔ بیٹے کی پسند کی ہوئی لڑکی کو قبول کرنا ان کے لیے ناقابلِ قبول تھا پاپا کی ضد اور دادا جان کے سمجھانے پر وہ مان تو گئی تھیں، مگر دل سے انہوں نے مما کو اپنی بہو تسلیم نہیں کیا تھا۔ یونیورسٹی کی پڑھی ہوئی آزاد خیال لڑکی جس نے شادی سے پہلے ہی ان کے بیٹے کو قابو میں کر لیا تھا۔ اس کی ان کی نظر میں وہ عزت کبھی بھی نہیں پا سکتی تھی جو بڑی بہو کی تھی۔

ستارہ آنٹی جو ان کی سگی بھتیجی تھیں، انہوں نے خود اپنے بیٹے کے لیے منتخب کیا تھا اور فرماں بردار بیٹے نے ماں کی پسند پر سر جھکا دیا تھا۔ مجھے تو آج تک بڑے پاپا پر حیرت ہوتی ہے، کہاں ان جیسا پڑھا لکھا اور جینئس بندہ اور کہاں میٹرک پاس ستارہ آنٹی۔ کیا جوڑ تھا دونوں کا۔ وہ شکل صورت میں اچھی تھیں۔ خاندان بھر میں ان جیسا اچھا کھانا کوئی نہیں پکاتا، مگر ایک ذہین اور قابل مرد کے لیے بیوی میں صرف یہی خصوصیات تو کافی نہیں ہوتیں۔

مجھے لگتا ہے انہیں مما سے دشمنی بھی اسی وجہ سے تھی۔ وہ ان کے مقابلے میں خود کو کمتر سمجھتی ہوں گی۔ انہیں دیورانی کا خود سے زیادہ پڑھا لکھا ہونا حسد میں مبتلا کرتا ہوگا اور اسی حسد کے سبب انہوں نے مما کی زندگی کو جہنم بنا دیا تھا۔

اور میری مما اتنی سیدھی اور اللہ میاں کی گائے ٹائپ کی چیز ہیں کہ کبھی اف تک نہیں کی۔ آج تک ان کا یہی حال ہے وہ کسی کو جواب نہیں دے سکتیں۔ بعد میں کڑھ لیں گی، رو لیں گی کہ فلاں رشتہ دار آ کر یہ کہہ گیا۔ پاپا بھی مما کی اس عادت کو ناپسند کرتے ہیں۔

پاپا کی فیملی کوئی بہت لمبی چوڑی فیملی نہیں تھی۔ بڑے پاپا، پاپا اور پھپھو، وہ تین ہی بہن بھائی تھے۔ دادا جان کا میری پیدائش سے بھی پہلے انتقال ہو گیا تھا اور ان کے انتقال کے بعد دادی اماں کو مما کے ساتھ برے سے برا سلوک کرنے کی کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔ دادا جان مما سے بہت پیار کرتے تھے۔ مما آج بھی ان کا ذکر بڑی محبت اور احترام سے کرتی ہیں ویسے تو مما نے کبھی دادی اماں کی بھی ہم لوگوں سے برائی نہیں کی۔ میں اگر مما کی جگہ ہوئی تو ایسی عورت جو ساری زندگی مجھے تکلیف دینے کا باعث بنی ہو تو مرنے کے بعد اگر برے لفظوں سے یاد نہیں کروں گی تو کم از کم اس کی مغفرت کے لیے دعائیں بھی نہیں مانگوں گی، اتنا ظرف مجھ میں تو نہیں۔

میری یادداشت غیر معمولی طور پر اچھی ہے اور اپنے بچپن کے اتنے بہت سے واقعات مجھے یاد ہیں جو عام طور پر بچوں کو بڑے ہو کر یاد نہیں رہتے۔

گھر میں نوکروں کے ہوتے مما چوبیس گھنٹے کچن میں جتی رہتی تھیں اور اس پر بھی دادی اماں اور ستارہ آنٹی کا منہ پھولا ہی رہتا تھا۔ جب تک پھپھو کی شادی نہیں ہوئی وہ بھی ماں اور بھاوج کی تقلید میں مما کو ستانا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ مما نے پاپا سے کبھی بھی ان کے گھر والوں کے رویے کی

شکایت نہیں کی۔ پاپا کے سامنے کبھی کوئی جھگڑا ہوتا بھی نہیں تھا۔

مما اچھی نہیں لگتی تھیں تو ان کے بچے دادی اماں کو کیسے اچھے لگ سکتے تھے۔ کہکشاں آپی گھر کی اکلوتی بچی ہونے کے سبب سب ہی کی لاڈلی تھیں، دادی اماں بھی انہیں بہت چاہتی تھیں مگر انہیں پوتی سے زیادہ پوتے کا ارمان تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر عون مما کے ہاں پیدا ہوتا اور میں ستارہ آنٹی کے ہاں تو شاید دادی اماں مما کی تمام خطائیں معاف کر دیتیں۔ پہلا پوتا انہیں مما دے دیتیں اور اپنے سارے گناہ بخشوا لیتیں مگر افسوس ایسا ہو نہیں سکا۔

مما، پاپا کے ہاں پہلی اولاد میں یعنی مائلہ شبیر علی ہوئی اور ٹھیک اسی روز ستارہ آنٹی نے دادی اماں کی برسوں پرانی آرزو عون ہاشم علی کی صورت میں پوری کر دی تھی۔ عون کے پیدا ہونے پر گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی، اسی ہاسپٹل میں عون کے پیدا ہونے کے چار گھنٹے بعد میری پیدائش ہوئی تھی اور پوتے کی خوشی میں مگن دادی اماں نے تو میری شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

میرے ایک سال بعد ہی روشنا کے پیدا ہو جانے نے عون کی اہمیت مزید بڑھا دی تھی۔ ستارہ آنٹی خود کو مما سے کوئی بہت اونچی، خاص قسم کی ہستی تصور کرنے لگی تھیں۔ عون گھر میں سب ہی کا چہیتا تھا، اس کے آگے ہم لڑکیاں تو دادی اماں کو بالکل گھاس کوڑا لگا کرتے تھے۔ ان کے غیر ضروری لاڈ پیار نے اسے بہت سرکش اور بدتمیز بنا دیا تھا۔ اسے ڈانٹنے کی تو کوئی ہمت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بڑے پاپا تک کی مجال نہ تھی کہ بیٹے کو کسی غلطی پر سرزنش ہی کر سکیں۔ وہ آتے جاتے کبھی مجھے تھپڑ مار دیتا، کبھی روشنا کو دھکا دے کر اس سے چاکلیٹ اور کھلونے چھین کر بھاگ جاتا اور دادی اماں اسے شرارت قرار دیتیں۔

جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا ویسے ویسے اس کی بدتمیزیاں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ مما کی مجال نہ تھی کہ پاپا ہی سے اس کی کسی حرکت یا دادی اماں کی غیر ضروری پشت پناہی پر حرفِ شکایت زبان پر لے آتیں روشنا تو باقاعدہ اس سے ڈرنے لگی تھی، اسے آتا دیکھ کر وہ سہم کر ایک دم میرے پیچھے چھپ جایا کرتی تھی۔ اکثر میں آرام سے بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی ہوتی اور وہ آہستگی سے کھڑکی سے ربڑ کا سانپ یا چھپکلی رائٹنگ ٹیبل پر اچھال دیتا، میں چیخ مار کر دور ہٹ جاتی اور زور زور سے رونا شروع کر دیتی اور وہ سکون سے واپس اپنے کمرے میں گھس جاتا۔ دیواریں پھلانگنے اور کھڑکیوں سے کودنے میں اسے حد درجہ مہارت حاصل تھی۔ جب تک سب جمع ہوتے وہ دیوار پر چڑھ کر کھڑکی سے واپس اپنے کمرے میں گھس چکا ہوتا تھا اور میرے ہزار یقین دلانے پر بھی دادی اماں یہ بات مانتی نہ تھیں کہ سانپ اسی نے پھینکا ہے۔ الٹا مجھے ڈانٹ پھٹکار کر مما کی بھی کلاس لینا شروع ہو جاتی تھیں۔

''ماؤں کا کام ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی اچھی تربیت کریں، یہ تربیت کر رہی ہو تم لڑکی کی۔ سات برس کی ہو گئی ہے اور چیخ چیخ کر شور ایسے مچا رہی ہے کہ میرا تو دل ہی دہل گیا۔ کسی روز تمہاری اسی لاڈلی کی وجہ سے دیکھ لینا میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ ایسے چیختی ہے کہ میرا تو دل بند ہونے لگتا ہے۔''

وہ مما کو ملامت کرتی مجھ پر قہر آلود نظریں ڈالتی وہاں سے چلی جاتیں اور مما یہ یقین ہونے کے باوجود کہ میں سچ کہہ رہی تھی۔ بجائے چپ کرانے کے فوراً ہی واپس کچن میں چلی جاتیں۔ رات میں مجھے اور روشنا کو سوتے وقت مما کہانی ضرور سنایا کرتی تھیں اور دن بھر میں وہی وقت ہوتا تھا جب ہمیں مما سے بات کرنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ مجھے اور روشنا کو عون سے کم سے کم بات کرنے کے لیے کہتیں۔

''مما! مجھے تو عون سے بہت ڈر لگتا ہے، میں تو اسے دیکھ کر فوراً کمرے میں چھپ جاتی ہوں۔''

روشنا جلدی سے صفائی دیتی تو وہ سر ہلا کر مجھے سمجھانے لگتیں مگر میں روشنا کی طرح ڈر کر اور چھپ کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ روشنا پوری کی پوری مما پر پڑی تھی اور میں شاید اپنے ددھیال پر چلی گئی تھی۔ عون کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی اور اسکول میں اس حوالے سے اسے بہت سے پرائز اور سرٹیفکیٹس وغیرہ بھی ملتے رہتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ سانپ والی بدتمیزی پر میں نے اس کی بالکل نئی بنائی ہوئی ڈرائنگ پر انک کی بوتل گرادی تھی۔ بوتل کا ڈھکن کھول کر اس اینگل سے ٹیڑھا کر کے رکھ دیا تھا کہ سب کو لگے کہ جیسے کسی کا ہاتھ غلطی سے ٹکرا گیا ہوگا۔ عون تو عون ستارہ آنٹی اور دادی اماں تک نے گھر میں واویلا مچا دیا تھا، اس نے صاف صاف سب کے سامنے میرا نام لیا تھا۔ ظاہر ہے اسے معلوم تھا کہ کل سانپ والی حرکت کے بعد یہ جوابی حرکت کون کر سکتا تھا۔

دادی اماں نے اس روز پہلی مرتبہ میرے منہ پر تھپڑ مارا تھا، ستارہ آنٹی نے زبانی ہی برا بھلا کہنے پر اکتفا کیا تھا۔ مما دور کھڑی سب دیکھ رہی تھیں، ان کی اتنی جرات ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ میری حمایت میں ان دونوں سے کچھ کہتیں۔ روشنا مجھے تھپڑ لگتا دیکھ کر ڈر کر چھپ گئی تھی اور وہ بدستور نگاہیں ترچھی کر کے میری طرف دیکھ رہا تھا یوں جیسے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھ کچا چبا جائے۔

میں اس روز مما سے بھی بدظن ہوگئی تھی۔ دادی نے مجھے مارا اور مما نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا، مجھے آ کر بچایا بھی نہیں۔ میں بیٹھ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ کہکشاں آپی نے آ کر مجھے چپ کرانے اور پیار کرنے کی کوشش کی تو میں نے ان کا ہاتھ نفرت سے جھٹک دیا تھا، وہ بھی تو ستارہ آنٹی کی بیٹی تھیں، عون کی بہن تھیں۔

مما نے اکیلے میں پیار کیا تو مجھے ان کے پیار کرنے کی ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مجھے پیار سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ غلطی میری تھی اور بڑے اگر غلطی ہونے پر کچھ ڈانٹ ڈپٹ کر لیں تو اس پر ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اس بات کا ذکر پاپا سے نہ کرنے کا مجھ سے زبردستی وعدہ لیا تو مجھے مما پر اور بھی زیادہ غصہ آیا۔ اگلے روز اسکول جاتے ہوئے میں اس سے منہ پھیر کر سائنس کے سوالات دہراتی رہی تھی۔

اس روز ہمارا سائنس کا ٹیسٹ تھا۔ مجھے ٹیسٹ کی تیاری پاپا نے کرائی تھی، مما کو تو گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ ہمیں پڑھا سکتیں۔ سو مما کبھی کبھار اتفاقاً ہی پڑھائی میں کچھ مدد کرتی تھیں۔

سائنس کا پیریڈ شروع ہوا اور ٹیچر نے سوالات بورڈ پر لکھ دیے تو ہم سب ٹیسٹ کرنے میں مصروف ہوگئے۔ میں بڑے مگن انداز میں ڈائیگرام بنانے کے بعد اس میں کلر کر رہی تھی، جب ٹیچر اپنی سیٹ سے اٹھ کر ایک دم میرے پاس آ گئی تھیں۔ میرے سر پر کھڑی وہ مجھے بہت غصے سے گھور رہی تھیں۔ میں ابھی ان کے گھورنے پر حیران ہو ہی رہی تھی کہ انہوں نے میری ڈیسک پر کونے میں مڑے ہوئے اس کاغذ کو اٹھا لیا اور اسے کھول کر دیکھنے لگیں، جس چیپٹر کا آج ٹیسٹ تھا اس کے تقریباً تمام سوالات اس پیپر پر لکھے ہوئے تھے۔

میں نے رو رو کر انہیں یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ میں چیٹنگ نہیں کر رہی تھی۔ مگر وہ میری بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔ میرے ہاتھ سے ٹیسٹ پیپر چھین کر انہوں نے کھڑا رہنے کی سزا سناتے ہوئے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ پیرنٹس میٹنگ میں وہ مما پاپا سے میری اس حرکت کی شکایت ضرور کریں گی۔ ساری کلاس کے سامنے ڈانٹ پڑنے اور سزا ملنے پر میری بری حالت تھی۔ کھڑے کھڑے میں سر جھکا کر روئے چلی جا رہی تھی۔

روتے روتے اچانک ہی میرا دھیان عون کی طرف چلا گیا تو میں نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا وہ ٹیسٹ کرنے میں مصروف تھا مگر چہرے پر بڑی خوشی سے بھرپور مسکراہٹ نظر آ رہی تھی وہ میرے آگے والی رو میں بیٹھتا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات مجھے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ یہ حرکت کس کی ہے، اب چاہے میں اس سے جتنا بھی لڑ جھگڑ لیتی، اسے جتنا چاہے برا کہہ لیتی اس سے فرق تو کچھ بھی نہیں پڑنا تھا۔ میری جو بے عزتی کلاس میں سب کے سامنے اس نے کروانا چاہی تھی وہ تو ہو چکی تھی، حالانکہ میں پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ سائنس اور انگلش کے ٹیچرز کی تو میں خاص طور پر بہت پسندیدہ تھی مگر اس واقعہ کے بعد سائنس کی ٹیچر پڑھاتے پڑھاتے کوئی بھی سوال پوچھتیں تو سب سے پہلے مجھے ہی کھڑا کر کے جواب مانگتیں۔ ٹیسٹ لیتیں تو خاص طور پر میرے پاس آ کر ضرور تھوڑی دیر بعد کھڑی ہو جاتیں اور میں ان کی نظروں میں اپنا امیج خراب ہو جانے پر سوائے رونے کے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بہت ذہین تھا، اگر سنجیدگی سے دل لگا کر پڑھتا تو شاید ہر سال اسکول میں ٹاپ کیا کرتا مگر دادی اماں کے ناز نخروں نے اسے بری طرح بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہوم ورک بھی وہ بہ حالتِ مجبوری کیا کرتا، اگلے دن پیپر ہوتا اور وہ اطمینان سے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا ہوتا۔

پڑھائی میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دیئے بغیر بھی وہ اسکول میں بڑی مشہور و معروف قسم کی شخصیت تھا۔ اسپورٹس کی بات ہو رہی ہے تو وہ ہر کھیل میں سب سے آگے ہے۔ سوئمنگ اس سے اچھی کوئی نہیں کر سکتا، کرکٹ، ٹیبل ٹینس وہ بہترین کھیلتا، ڈراموں میں اداکاری کی بات ہے تو اس سے اچھا اداکار کوئی نہیں۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کو اسٹیج کرنا ہوتا تو عون سے بہتر ڈائیلاگ ڈلیوری اور درست تلفظ کسی کا بھی نہیں ہوتا تھا، گانوں کی بات ہو رہی ہے تو وہ کسی بھی مشہور گلوکار کا گایا ہوا گانا بڑے بہترین انداز میں گا لیا کرتا تھا۔ وہ اسکول والوں کے لیے قیمتی اثاثہ تھا اس لیے پرنسپل تک اس کے ناز نخرے بخوشی اٹھا لیا کرتے تھے اسکی وجہ سے ہر ٹرافی اور ہر شیلڈ ہمارے اسکول کے ہی حصے میں آیا کرتی تھی۔

پتا نہیں کون لوگ ہیں جو یہ کہا کرتے ہیں کہ پڑھو گے لکھو گے تو بنو گے نواب۔ وہ تو کھیل کود کر نواب بنا پھرتا تھا اور میں پڑھائی میں اچھی ہونے کے باوجود اتنی ہر دل عزیز نہیں تھی۔ پہلے صرف گھر والے ہی اس کی تعریفیں کیا کرتے تھے جبکہ اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ باہر والوں کے لیے بھی کچھ خاص قسم کی شخصیت بنتا چلا جا رہا تھا۔ ان غیر ضروری مدح سرائیوں نے اس کا دماغ بری طرح خراب کر دیا تھا۔ وہ اپنے دوستوں میں راجہ اندر بنا پھرتا تھا۔

گھر کے حالات ویسے ہی تھے۔ وہی دادی اماں اور ستارہ آنٹی کا ناروا سلوک اور وہی مما کا صبر۔ ان دنوں مما کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ خاموشی سے ہر ظلم سہنے اور کسی سے بھی دل کا حال نہ کہنے کی وجہ سے وہ بہت ہی زیادہ کمزور ہو گئی تھیں۔ پھر اس روز کسی رشتہ دار کی آمد پر دعوت کا ڈھیر

سارا کھانا پکاتے ہوئے مما کچن میں ہی چکرا کر گر گئی تھیں۔

پاپا کو اس روز میں نے پہلی بار دادی اماں سے خفگی سے بات کرتے سنا تھا۔ پاپا کے زیادہ کہنے سننے پر وہ رونے بیٹھ گئی تھیں۔ ستارہ آنٹی ان کے غصے کو اور ہوا دے رہی تھیں۔ ''ارے میرے بیٹے کو قابو میں کر لیا، میسنی، ڈائن۔'' وہ مما کو مختلف برے برے ناموں سے یاد کر رہی تھیں۔

اس واقعہ کے تین چار روز بعد ہی ہم لوگ الگ گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ پاپا نے کرائے کا الگ گھر لے لیا تھا۔ پاپا کی جاب بہت اچھی تھی کہ ہمیں دادا جان کی دولت جائیداد میں سے کچھ نہ بھی ملتا ہم تب بھی بہت خوشحال زندگی گزار سکتے تھے۔ بڑے پاپا کے علاوہ گھر کا ہر فرد ہمارے الگ ہونے پر ناراض ہو گیا تھا۔ دادی اماں نے تو پاپا کی زندگی بھر شکل نہ دیکھنے کی قسم کھالی تھی۔ بڑے پاپا نے پاپا کے اس فیصلے کو بالکل درست قرار دیا تھا بلکہ ان کا کہنا تھا کہ پاپا کو یہ فیصلہ آج سے چند سال پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔

مما علیحدہ ہو جانے پر خوش نہیں تھیں، انہیں دادی اماں کی ناراضی کا غم بہت بری طرح پریشان کیے رکھتا تھا۔ جہاں تک ہم بہنوں کی بات تھی تو ہم دونوں ہی نے یہاں آ کر سکون کا سانس لیا تھا۔ ہم اپنے ماں باپ کے ساتھ بہت خوش و خرم اور مطمئن تھے۔ روشنا اور میں جو اس گھٹے ہوئے ماحول میں رہتے رہتے عجیب سے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے یہاں آ کر آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگے۔

ہمارے الگ ہونے کے چار مہینے بعد ایرج پیدا ہوا تھا۔ ہمارا پیارا سا چھوٹا بھائی۔ میں اور روشنا دونوں ہی بھائی کے ہونے پر بہت خوش ہوئے تھے۔ اپنی زندگی کے وہ سال جو دادی اماں کے زیرِ سایہ گزارے تھے انہوں نے لاشعوری طور پر مجھے اور شاید روشنا کو بھی متاثر کیا تھا۔ اگر ہماری ایک اور بہن ہو جاتی تو شاید ہم لوگ باقاعدہ سوگ مناتے۔ شکر تھا کہ عون کی ویلیوکم کرنے کے لیے خاندان میں ایک اور لڑکا پیدا ہو گیا تھا۔

بڑے پاپا، ستارہ آنٹی کو لے کر ایرج کو دیکھنے آئے تھے مگر دادی اماں کی ناراضی بدستور قائم تھی۔ انہوں نے ہمارے گھر قدم نہ رکھنے اور پاپا کو نہ دیکھنے کی جو قسم کھائی تھی وہ اسے توڑنے پر تیار نہ تھیں مگر مما کی نیک فطرت دادی اماں کو منائے بغیر کیسے رہ سکتی تھی، چنانچہ وہ پاپا کے پیچھے لگ گئیں اور آخر کار انہیں منا کر ہی دم لیا۔ سو دل نہ چاہنے پر بھی ہم مما پاپا کے ساتھ وہاں آ گئے۔

بڑے پاپا کے بہت سمجھانے اور مما کے بہت معافیاں مانگنے پر بھی انہوں نے ہم لوگوں سے ملنا گوارا نہیں کیا تھا اور کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

دادی اماں کی ناراضی پورے دو سال چلی تھی اور ناراضی ختم ہونے کا باعث ان کی شدید قسم کی بیماری بنی تھی تب ہی انہوں نے پہلی مرتبہ مما کے سر پر پیار سے ہاتھ بھی پھیرا تھا اور مجھے، روشنا اور ایرج کو بھی پیار کیا تھا۔ پاپا تو ان کی ناراضی کے زمانے میں بھی ہفتے میں ایک بار وہاں ضرور جایا کرتے تھے مگر مما اور ہم لوگ اس دوران کبھی دوبارہ وہاں نہیں گئے تھے۔

مما کے اپنی ساس کے ساتھ شادی کے اتنے سالوں بعد تعلقات صحیح ہو گئے تھے اور وہ اس پر بہت خوش تھیں۔ دادی اماں اس ری یونین کے بعد صرف دو ماہ ہی زندہ رہی تھیں اور اس دوران ہم لوگ اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ حالانکہ اب وہ ہمیں پیار کرتی تھیں مگر پھر بھی مجھے اور روشنا کو ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ صرف وہی لوگ کیوں مجھے پھپھو کی فیملی سے بھی نفرت تھی۔ میری کسی ددھیالی کزن سے دوستی نہیں تھی۔

عون سے اسکول میں واسطہ پڑتا تھا مگر میری اس سے بھی کوئی خاص بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ وہ کلاسز بھی کم ہی اٹینڈ کرتا تھا۔ اس کی غیر نصابی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ وہ اکثر ان ہی میں مصروف رہا کرتا تھا۔ اگر میں اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی تو وہ بھی مجھے کچھ خاص لفٹ نہیں کرواتا تھا۔ ہاں اب اس نے بچپن والی بدتمیزیاں اور مجھے تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ دادی اماں کے انتقال کے بعد ستارہ آنٹی نے ان کی گدی سنبھال لی تھی۔

ہم لوگ اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہو چکے تھے اور ہمارے گھر میں مما پاپا کے ساتھ ساتھ دنیا جہان کی ہر آسائش اور آرام موجود تھا۔ مما اب ہمیں خود توجہ سے بیٹھ کر پڑھایا کرتی تھیں۔ پڑھائی میں تو ہم اچھے تھے ہی مما کی توجہ نے ہماری صلاحیتوں کو مزید نکھار دیا تھا۔ میٹرک میں میری 88% آئی تھی اور بغیر کسی سفارش اور تعلقات کے مجھے بہترین کالج میں ایڈمیشن مل گیا تھا۔ عون کا اے گریڈ آیا تھا۔ مجھے اس پر بھی بہت حیرت تھی۔ بغیر اے ون گریڈ لائے اسے آدم جی کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ سفارشی کہیں کا، اس کے سگے ماموں جو وہاں پروفیسر تھے۔ اپنی صلاحیتوں پر ایڈمیشن لے کر دکھاتا تو میں جانتی۔

مما پاپا تو میرے اتنے اچھے نمبر لانے پر بہت خوش ہوئے ہی تھے مگر بڑے پاپا بھی بے پناہ خوش ہوئے تھے۔ مجھے خوب شاباش دینے اور شاندار گفٹ دینے کے ساتھ ساتھ وہ مما اور پاپا کے ساتھ بیٹھے عون کے کم نمبر آنے پر افسوس کر رہے تھے اور ستارہ آنٹی کا منہ بیٹے کی برائیاں سن کر اچھی طرح پھول چکا تھا۔ بڑے پاپا کا خیال تھا کہ اتنی کم عمری میں ملنے والی غیر ضروری اہمیت، شہرت اور تعریفوں نے اسے اچھا خاصا بگاڑ دیا ہے۔ وہ پاپا سے بڑی فکرمندی سے اس کی اصلاح کے لیے مشورے طلب کر رہے تھے۔ مجھے ان کی فیملی میں سوائے بڑے پاپا کے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور عون سے تو بالکل بھی نہیں۔ مگر پھر بھی مجھے ایک روز اس بات سے بہت خوشی ہوئی تھی کہ کسی ایک معاملے میں تو میں اس سے آگے تھی۔

کہکشاں آپی کی ستارہ آنٹی نے بی اے کرتے ہی اپنے بھانجے سے شادی کر دی تھی۔ بی اے تک بھی شاید بڑے پاپا کی وجہ سے پڑھ گئی تھیں وگرنہ ستارہ آنٹی تو انہیں اپنی طرح میٹرک کرتے ہی رخصت کر دیتیں۔ ان کے شوہر سول سروس میں تھے۔ دونوں میں کم از کم بھی دس بارہ سال کا فرق تھا۔ شادی کے فنکشن سے آکر مما پاپا سے ان کے شوہر کے عمر میں بڑے ہونے پر ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی تھیں جبکہ میں کہکشاں آپی کی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔ کتنے ڈیسنٹ اور سوبر سے تھے ایاز بھائی۔ سلور فریم کے گلاسز ان پر کتنے سوٹ کر رہے تھے۔ سنجیدگی اور متانت سے سب سے گفتگو کرتے۔ میں نے انہیں شادی کے کسی فنکشن میں اوٹ پٹانگ مذاق کرتے یا بے ہنگم قہقہے لگاتے نہیں دیکھا تھا۔

انٹر کے دو سال میرے لیے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ مجھے اچھی طرح پتا تھا کہ میرے کیریئر کا دارومدار ان ہی دو سالوں پر ہے اسی لیے میں خوب محنت سے پڑھائی کر رہی تھی۔ آگے جا کر میں کمپیوٹر سائنس پڑھنا چاہتی تھی۔ عون بھی میری طرح پری انجینئرنگ گروپ میں تھا۔ اس کی پڑھائی کا کیا حال تھا یہ تو میں نہیں جانتی تھی ہاں البتہ اس کی پہلے سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی مقبولیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس نے شوقیہ ماڈلنگ شروع کر دی تھی، اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس نے اپنا میوزک گروپ بنا لیا تھا، اس کے بینڈ کو ٹی وی پر بھی پرفارم کرنے کا موقع ملنے لگا تھا۔ یونیورسٹی اور مختلف کالجز میں ہونے والے فنکشنز میں تو اس کا بینڈ پرفارم کرتا ہی تھا۔ میری اسکول کی فرینڈز جواب کالج میں بھی میرے ساتھ تھیں بڑے

جوش وخروش سے اس کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ کلاس کی دوسری لڑکیوں کو فخریہ بتاتیں کہ عون ہاشم علی ان کا کلاس فیلو رہ چکا ہے اور میرا تو وہ کزن بھی ہے۔

مجھے لڑکیوں کی اس ذہنیت سے بہت چڑ تھی۔ اس کی جن خوبیوں کی بناء پر لڑکیاں اسے پسند کیا کرتی تھیں ان میں سے کوئی ایک بھی میرے نزدیک قابلِ تعریف بات نہیں تھی۔ گٹار لے کر بے ہنگم ناچ کو دان لوگوں کو بڑی اعلیٰ پائے کی موسیقی لگتی تھی۔ ٹی وی پر دو تین ایڈز کر کے موصوف خود کو کوئی سپر ماڈل سمجھنے لگے تھے۔ خاندان کے کسی فنکشن میں بھی وہ اور اس کے تمام گویّے دوست پوری دھوم دھام سے شرکت کرتے تھے اور لڑکیاں اس پر اور اس کے چھچھورے دوستوں کی اسمارٹ نیس پر فدا ہو ہو جاتی تھیں۔

سیکنڈ ایئر کے امتحان سر پر تھے اور موصوف دل و جان سے اپنے البم کی تیاریوں میں مصروف۔ مجھے اندیشہ تھا کہ انٹر بھی وہ شاید ہی کر پائے مگر جب رزلٹ آیا تو وہ ہمیشہ کی طرح اچھے نمبر لے کر پاس ہو گیا تھا۔ مجھ سے تو اس کی پرسنٹیج بہر حال کم تھی مگر نمبر اچھے تھے۔ میں اس کے پاس ہو جانے کا سن کر چکرا کر رہ گئی تھی۔ ایسی کیا اس کے پاس جادو کی چھڑی تھی کہ پڑھے بغیر پاس ہو جاتا تھا۔ مجھے لگا ضرور اس سب کے پیچھے اس کے پروفیسر ماموں ہی کی مہربانیاں ہوں گی۔ یقیناً ان کے بورڈ میں بھی اچھے تعلقات ہوں گے اور لاڈلے بھانجے صاحب ماموں جان کی عنایتوں کے طفیل خوب اچھے نمبر لے کر بڑے پاپا کی متوقع ڈانٹ پھٹکار سے بھی بچ گئے تھے۔

بڑے پاپا اس کی پڑھائی کے علاوہ دیگر شعبوں میں اعلیٰ ترین کارکردگی پر خاندان کے دیگر افراد اور ستارہ آنٹی کی طرح فخر محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ ہر لمحہ اکلوتے بیٹے کے بگڑ جانے کے اندیشے میں گھرے رہتے تھے حالانکہ اب یہ اندیشے بے سود تھے۔ اس کی تربیت دادی اماں اور ستارہ آنٹی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور ان دونوں کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بہت زیادہ خود سر، ضدی اور بدتمیز بنا دیا تھا یہاں تک کہ اب بڑے پاپا بھی اگر چاہتے تو اسے کسی کام سے روک نہیں سکتے تھے۔

وہ لاڈلے بیٹے کو بی بی اے اور ایم بی اے کروانا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ اسے آئی بی اے میں داخلہ دلوانے کا تھا مگر اس نے آئی بی اے میں ایڈمیشن لینے سے صاف انکار کر دیا تھا اور انڈس ویلی اسکول میں آرکیٹیکچر ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لے لیا تھا۔ بڑے پاپا نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ چلو بیٹے نے کسی بری فیلڈ کا انتخاب تو نہیں کیا۔

اکلوتے بیٹے کا میرٹ کی بنیاد پر انڈس ویلی میں داخلہ ہوا تھا اور ستارہ آنٹی نے اس خوشی میں گھر پر شاندار قسم کے فنکشن کا اہتمام کیا تھا۔ پڑھائی کی مصروفیات کے سبب میں رشتہ داروں کے ہاں بہت ہی کم جایا کرتی تھی اور ستارہ آنٹی لوگوں کے ہاں تو بہت کم بھی نہیں جایا کرتی تھی مگر اس روز پاپا کے کہنے پر مجھے وہاں جانا ہی پڑا تھا۔

ستارہ آنٹی کے رویے میں کہکشاں آپی کی شادی کے بعد سے ہی تبدیلی آنی شروع ہو گئی تھی۔ اب مما سے بات کرتے ہوئے ان کا لہجہ طنزیہ نہیں ہوتا تھا۔ مجھ سے، روشنا اور ایرج سے بھی بڑی محبت اور پیار کا سلوک کرتی تھیں۔

مما کا خیال تھا کہ ان کا صبر رائیگاں نہیں گیا اور آخر کار وہ سسرال میں اپنی جگہ بنانے اور سب کے دلوں میں گھر کرنے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ میں تو کم از کم یہ بات نہیں مان سکتی تھی کہ وہ بدل گئی ہیں۔ انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی، بس شاید بیٹی بیاہنے کے بعد سے انہیں تھوڑا بہت

خوفِ خدا ہو گیا تھا اور انہوں نے اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ کہکشاں آپی کی ساس جوان کی سگی خالہ بھی تھیں فطرت میں ہو بہو اپنی بڑی بہن جیسی تھیں اور انہوں نے کہکشاں آپی کو کافی تنگ کر کے رکھا ہوا تھا وہ تو شکر تھا کہ ایاز بھائی بہت اچھے اور سلجھے ہوئے انسان تھے اور اسی وجہ سے ان کی زندگی خوشگوار گزر رہی تھی۔

''خود کی بیٹی کی بات آئی تو اللہ یاد آنے لگا''۔ میں نے ایک بار مما کے سامنے یہ بات کہی تو وہ بہت ناراض ہوئی تھیں۔

''جو لوگ دوسروں کی تکلیف پر خوش ہوتے ہیں وہ خود بھی کبھی خوش نہیں رہتے''۔

انہوں نے کافی سخت لہجے میں مجھے ڈانٹا تھا۔

☆

اس روز فنکشن میں کہکشاں آپی کی پوری سسرال اور پھپھو کی فیملی کے علاوہ خاندان کے تقریباً تمام افراد بھی وہاں مدعو تھے۔ عون کے دوستوں کی بھی ایک بڑی تعداد وہاں نظر آ رہی تھی۔

''تم نے کہاں ایڈمیشن لیا؟''

میں نے اسے رسمی سی مبارک باد دی تو شکریہ کہتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ اس کے ساتھ اسامہ اور دو تین کزنز کے ساتھ ساتھ اس کے چار پانچ دوست بھی کھڑے ہوئے تھے۔

''میں نے بی ایس میں ایڈمیشن لیا ہے''۔ میرے ساتھ روشنا اور ایرج بھی کھڑے ہوئے تھے۔

''اوہ بی۔ ایس؟ کہاں کے۔ یو سے؟'' وہ تھوڑا سا حیران ہوا تھا۔

میں نے گردن ہلائی تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا ''این ای ڈی میں ایڈمیشن کیوں نہیں لیا، انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت نہیں کرنی تمہیں''؟

میرے اتنے اچھے نمبر تھے کہ مجھے این ای ڈی میں بڑے آرام سے داخلہ مل سکتا تھا مگر وہاں داخلہ نہ لینا میری اپنی چوائس تھی۔

''یہاں تو ویسے بھی جسے دیکھو ڈاکٹر یا انجینئر بن کر ہی ملک و قوم کی خدمت کرنے کا عزم رکھتا ہے''۔

اس کا لہجہ پتا نہیں کیوں مجھے طنزیہ محسوس ہو رہا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے میرا ذہن اتنا محدود نہیں ہے، مجھے پتا ہے کہ میڈیسن اور انجینئرنگ کے علاوہ بھی بہت اچھی اچھی فیلڈز ہیں جن میں انسان اگر چاہے تو ملک و قوم کی خدمت کر سکتا ہے''۔

میں نے اچھے خاصے تپے ہوئے انداز میں اسے جواب دیا تھا۔ اس نے میرے انداز پر غور کیا تھا یا نہیں مگر وہ اب اپنے دوستوں کو ہنستے ہوئے بتا رہا تھا ''مائلہ اور میری ڈیٹ آف برتھ ایک ہی ہے، اپنی سالگرہ کا کیک ہم دونوں نے اکٹھے کاٹا تھا''۔

اس کے دوست اس بات پر بہت حیران ہو رہے تھے۔ بہت سالوں بعد یہ میری اس سے طویل گفتگو ہوئی تھی جو بمشکل چار یا پانچ منٹ

جاری رہی ہوگی۔

ڈیٹ آف برتھ والی بات پر اس کے ایک منہ پھٹ قسم کے دوست کا بے ساختہ تبصرہ ''Oh valentinesday whata coincidence'' مجھے اچھا خاصا غصہ دلا گیا تھا۔ چودہ فروری میری تاریخ پیدائش تھی اور اس روز سے پہلے میں نے یہ بات کبھی بھی اتنی اہمیت دے کر نہیں سوچی تھی کہ ہم دونوں کی تاریخ پیدائش ایک ہی ہے۔ روشنا اور تمام کزنز سمیت سب ہی اس بات کو مذاق کے طور پر انجوائے کرتے ہوئے ہنس پڑے تھے جبکہ میرا موڈ بری طرح خراب ہو گیا تھا۔

یونیورسٹی میں کلاسز شروع ہوئیں تو میں ایک مرتبہ پھر پوری تندہی سے اپنی اسٹڈیز میں مصروف ہو گئی۔ روشنا اور ایرج مجھے کتابی کیڑا اور پڑھاکو آنٹی کہہ کر چھیڑنے لگے تھے مگر BS کی ٹف پڑھائی کوئی مذاق نہیں تھی، میں تو پہلے ہی سال میں بوکھلا کر رہ گئی تھی۔ امتحان کی تیاری پوری ہوتی میں تب بھی نروس رہا کرتی تھی جبکہ روشنا اور ایرج میرے برعکس ہمیشہ پرسکون پائے جاتے تھے۔ روشنا خاص طور پر امتحانوں کے دنوں میں بھی موقع نکال کر بڑے آرام سے فلمیں دیکھ لیا کرتی تھی، شاپنگ کرنے چلی جایا کرتی تھی، کچن میں مما کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔

انٹر کے بعد روشنا نے بھی انڈس ویلی میں ایڈمیشن لے لیا تو عون کا ذکر ہمارے گھر میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہونے لگا۔ وہ اسکول کے زمانے میں لڑکیوں کا فیوریٹ تھا اب تو خیر بات ہی کیا تھی۔ باقی لڑکیوں کی تو خیر ہے مگر روشنا کے منہ سے اس کے قصیدے سن سن کر میں بیزار ہو گئی تھی۔ تنگ آ کر ایک دن میں نے اسے ٹوکا تو وہ برا مانے بغیر ہنستے ہوئے بولی ''تم بری بری شکلیں بناتی رہو، میں تو اس کی کزن ہونے کے ناطے فخر محسوس کرتی ہوں''۔

''اس گویے کی کزن ہونے پر صرف تم جیسی احمق لڑکیاں ہی فخر محسوس کر سکتی ہیں''۔ میں روشنا پر بگڑی تھی۔

''تم اس سے جیلس ہوتی ہو تو دوسری بات ہے ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک غیر معمولی انسان ہے۔ بہت اچھا کیا اس نے جو آئی بی اے میں ایڈمیشن نہیں لیا تھا۔ بالکل درست فیلڈ چنی ہے اس نے اپنے لیے۔ اس کی ذہانت کی دھوم ہے وہاں۔ اس کے اکثر اساتذہ کی نظر میں وہ ایک پیدائشی آرکیٹکٹ ہے۔ تم اگر پچھلے دنوں ہمارے ہاں ہونے والی ایگزیبیشن میں آئی ہوتیں تو اس کے بنائے ہوئے مختلف بلڈنگز کے ماڈلز دیکھ کر دنگ رہ جاتیں۔ اس کے کونسیپٹس اور کریٹیویٹی کو سب ہی نے کتنا اپریشیٹ کیا تھا''۔

روشنا کی جیلسی والی بات مجھے بہت بری لگی تھی۔ اب یہی اوقات رہ گئی ہے میری کہ میں عون ہاشم علی سے جلوں گی اور کوئی نہیں رہ گیا جلنے کے لیے۔ ٹی وی وغیرہ پر ویسے اب اس کی آمد خاصی کم ہو گئی تھی۔ شاید بڑے پاپا کی فضیحتوں نے آخر کار کام دکھا ہی دیا تھا اور بیٹا سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

روشنا تو فائن آرٹس میں تھی مگر عون سے اس کی پھر بھی اچھی ہائے ہیلو تھی۔ دو چار مرتبہ وہ ہمارے گھر روشنا کو ڈراپ کرنے بھی آیا تھا ورنہ اس کا ہمارے گھر کوئی خاص آنا جانا نہیں تھا۔

☆

میرے آخری سمسٹر کے ایگزامز ہونے والے تھے جب بڑی خالہ کے ہاں سے صدف کی شادی کا بلاوا آیا۔ ان کے گھر کی پہلی شادی تھی لہٰذا ہمارے ہاں سے سب کی شرکت لازمی تھی۔ وہ دونوں جانے کے لیے بہت پرجوش تھے۔

''واہ سے کوئی خاص دور تھوڑی ہے مری وغیرہ، ہم مری بھور بن سب جگہیں گھوم کر آئیں گے''۔

وہ دونوں مجھے جلانے کے لیے خوب مزے لے لے کر گھومنے پھرنے کے پروگرام ترتیب دے رہے تھے۔ شادی کی تاریخوں میں میرے امتحان ہونے والے تھے۔ اس روز ستارہ آنٹی اور بڑے پاپا ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔ مما کے منہ سے شادی میں جانے کا ذکر سن کر ستارہ آنٹی نے فوراً ہی بڑی گرم جوشی سے مجھے اپنے گھر ٹھہرنے کی پیشکش کی۔ سب لوگوں کے بغیر مجھے اکیلے تو گھر میں رہنا نہیں تھا، میرا ارادہ یہی تھا کہ چھوٹی خالہ کے پاس رک جاؤں گی۔ بیماری کے سبب وہ شادی میں شرکت نہیں کر رہی تھی اور میرا شروع ہی سے اپنے ننھیال کی طرف زیادہ جھکاؤ رہا تھا مگر اب ستارہ آنٹی کی پرخلوص پیشکش پر مما جیسی مروت کی ماری ہوئی خاتون انکار کیسے کر سکتی تھیں۔ وہ چاہتیں تو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر منع بھی کر سکتی تھیں مگر انہوں نے تو سسرالیوں کو سر آنکھوں پر بٹھانے اور ان کی کوئی بات رد نہ کرنے کی قسم کھائی ہوئی تھی سو انکار کیسے کرتیں۔ سب کے سامنے میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی مگر بعد میں ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں مما سے اس بات پر ناراض ہوئی تھی۔ انہوں نے میری ناراضی کا بالکل بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔

''چار پانچ دن کی تو بات ہے، چاہے خالہ کے گھر رہ لو چاہے بڑے پاپا کے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کون سا سال دو سال تمہیں وہاں قیام کرنا ہے، وہ اتنی محبت سے کہہ رہی تھیں مجھے منع کرنا اچھا نہیں لگا''۔

پتا نہیں ان کی مکاری میں مما کو محبت کہاں سے نظر آ جاتی تھی۔ مجھے تو ان کا میٹھا شہد جیسا لہجہ بھی مکاری سے بھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ برے دل سے یا اچھے دل سے میں بہرحال ان کے گھر آ گئی تھی۔

مما پاپا وغیرہ کے جانے سے پہلے ہی بڑے پاپا مجھے خود لینے آ گئے تھے۔ کتنے دنوں بعد میں ان لوگوں کے گھر آئی تھی۔ اس فنکشن کے بعد ان چار سالوں میں شاید میں دوسری مرتبہ ان کے گھر آئی تھی۔ یہاں آ کر مجھے بچپن کے بہت سے تکلیف دہ واقعات یاد آ جاتے تھے۔

''دیکھیں! کیسی رونق ہو گئی ہے گھر میں مائلہ کے آنے سے، واقعی گھر میں بیٹیوں کے ہونے سے رونق ہوتی ہے''۔

ستارہ آنٹی میرے کندھے کے گرد محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے پاپا سے مخاطب ہوئیں تو وہ بھی تائیدی انداز میں مسکرا دیئے تھے۔

''کہکشاں کی شادی کے بعد سے تو یہاں الو بولتے ہیں، عون کی اپنی اتنی مصروفیات ہیں کہ وہ رات گئے ہی گھر واپس آتا ہے اور گھر آ کر یا تو پڑ کر سو جائے گا یا پھر وہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچنے بیٹھ جائے گا''۔

وہ بیٹے کی عدیم الفرصتی پر نالاں نظر آ رہی تھیں۔ میرے آنے سے پہلے ہی انہوں نے میرے لیے کمرہ وغیرہ ٹھیک کروا رکھا تھا۔ ڈنر پر میری وجہ سے خوب دعوتی اہتمام تھا، ان کے اور بڑے پاپا کے محبت بھرے اصرار پر میں نے بے تکلفی سے کھانا کھایا تھا۔ ان کے ہاتھ کا پکا کھانا جس کی سارے خاندان میں دھوم تھی۔ اگر وہ مکاری کر رہی تھیں، بڑے پاپا کو دکھانے کے لیے یہ سب کر رہی تھیں تب بھی میں وقتی طور پر ان کے خلوص

سے متاثر ہوگئی تھی۔ کھانے کے بعد میں کمرے میں آکر پڑھنے بیٹھ گئی تو وہ تھوڑی ہی دیر بعد میرے لیے کافی بنا کر لے آئیں۔

''دیر تک جاگ کر پڑھو گی، کافی سے نیند بھاگ جائے گی''۔ انہوں نے اپنائیت سے کہا تو میں نے شکریہ کے ساتھ کپ لے لیا تھا۔

عون سے اگلی صبح ناشتے کی میز پر ملاقات ہوئی تھی۔

''کیسی ہو؟'' اخبار پر سے نظریں ہٹا کر اس نے میری طرف دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہوں''۔ میں کہہ کر بیٹھ گئی۔

چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے وہ اٹھا تو ستارہ آنٹی فوراً بولیں ''دو چار منٹ ٹھہر جاؤ، مائلہ ناشتہ کر لے تو اسے بھی ساتھ لیتے جانا''، وہ گردن ہلا کر واپس بیٹھ گیا۔

بچپن کے بعد سے اب اتنے سالوں بعد وہاں آنا اور ان لوگوں خصوصاً عون سے بات چیت کرتے ہوئے مجھے بڑی اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اتنے قریبی رشتے کے باوجود مجھے ان لوگوں سے بہت تکلف سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا، بلاوجہ کی ڈیوٹی نبھانی تو کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی، پھر مجھ میں اس کے لیے چارم تھا بھی کیا، میں اس کی گرل فرینڈ کی طرح گلیمرس نہیں تھی۔ کتابی کیڑا ٹائپ لڑکیاں ایسے فلرٹ لوگوں کو کبھی بھی اچھی نہیں لگ سکتیں۔ اسے تو یقیناً شوخ بھڑکیلے میک اپ اور ماڈرن نظر آنے والی ایسی لڑکیاں جو اسے دیکھ کر سرد آہیں بھرتی ہوں اچھی لگتی ہوں گی مگر میں اس کے تاثرات سے یہ اندازہ نہیں لگا پائی کہ وہ اس بات پر ناراض ہوا ہے یا نہیں۔ راستے میں پڑھائی کے حوالے سے ہی اس نے مجھ سے تھوڑی بہت بات چیت کی۔

مجھے یونیورسٹی ڈراپ کر کے وہ خدا حافظ کہتا چلا گیا تو میں سیمینار لائبریری میں آگئی، کل ہونے والے پیپر کے ساتھ ہی مجھے اسائنمنٹ بھی جمع کروانا تھا، اسائنمنٹ زیادہ اچھا بنانے کے چکر میں ابھی تک مکمل نہیں ہو سکا تھا، بات بات پر پریشان ہونا تو یوں بھی میری پرانی عادت تھی اسی لیے تھوڑی تھوڑی پریشانی شروع ہو چکی تھی، اسائنمنٹ تو تقریباً بن ہی چکا تھا، دو چار پوائنٹس ہی رہ گئے تھے اور انہیں میں نے سیمینار لائبریری میں بیٹھ کر مکمل کر لیا مگر اب اتنے سارے صفحات ٹائپ کرنا اور وہ بھی اتنے مختصر وقت میں مجھے پریشان کر رہا تھا، پیپر کی تیاری پوری تھی مگر سب کچھ دہرانا بھی تھا۔

دو ڈھائی گھنٹے یونیورسٹی میں لگے اور میں فوراً ہی گھر واپس آگئی، ستارہ آنٹی سے کمپیوٹر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ایک کمپیوٹر اسٹڈی میں اور ایک عون کے کمرے میں رکھا ہے۔ میں اسٹڈی میں آکر اسائنمنٹ ٹائپ کرنے لگی مگر وہاں کہیں بھی مجھے پرنٹر نظر نہیں آرہا تھا، میرا خیال تھا کہ پرنٹر اس نے اپنے کمرے میں رکھا ہوا ہوگا۔

میں چپ چاپ یہ سوچ کر ٹائپنگ کرتی رہی کہ رات میں جب وہ گھر آئے گا تو اس سے پوچھ کر پرنٹ آؤٹ نکال لوں گی۔ دن بھر وقفے وقفے سے پڑھتی بھی رہی اور اسائنمنٹ بھی مکمل کرتی رہی۔ کل کی بہ نسبت وہ آج جلدی واپس آگیا تھا، ستارہ آنٹی کھانا لگانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

''کیسی ہو رہی ہے تمہاری تیاری؟'' چمچ سے پلیٹ بجاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا تو سالن کا ڈونگہ ٹیبل پر رکھتی ہوئی ستارہ آنٹی فوراً بولیں ''سارا دن پڑھتی رہی ہے، میں تو اسے دیکھ دیکھ کر ہولتی رہی، اتنی کمزور سی تو ہے اور اوپر سے اتنی مشکل پڑھائی''۔

وہ کچھ نہ بھی بتاتیں تب بھی میرا حلیہ دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ میں پاگلوں کی طرح پڑھتی رہی ہوں۔ تیل چپڑے ہوئے بال اور سوٹ سے میچ نہ کرتا ہوا دوپٹہ، تیل کل رات میں نے یہ سوچ کر ڈال لیا تھا کہ صبح شیمپو کرلوں گی مگر دن بھر اسائنمنٹ کے چکر میں الجھ کر شیمپو کرنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔

''عون! تمہارے پاس پرنٹر ہے؟'' کھانے کے دوران ہی میں نے اس سے پوچھا تو اس نے گردن ہلا دی تھی۔

''مجھے کچھ پرنٹ آؤٹس نکالنے ہیں'' میں نے اسے بتایا۔

کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔

''یہ پرنٹر تم مجھے ایک رات کے لیے ادھار دے سکتے ہو، میں اسٹڈی میں ہی آرام سے ٹائپ کر کے پرنٹس لے لوں گی''۔

''اسٹڈی میں کیوں، تم اطمینان سے یہاں پر بیٹھ کر ٹائپ کرلو''۔

میرے کہنے پر اس نے فراخ دلانہ انداز میں کہا تو میں نے انکار اس وجہ سے نہیں کیا کہ اسٹڈی اتنے کونے میں بالکل الگ تھلگ سے کمرے میں بنائی گئی تھی اور رات کے وقت اکیلے وہاں بیٹھنے کا تصور ہرگز بھی خوشگوار نہیں تھا۔ آفر بھی اس نے خود ہی کی تھی میں نے تو اس سے التجا نہیں کی تھی کہ مجھے اپنے کمرے میں بیٹھ کر کام کرنے دو۔ میں جتنا ٹائپ کر چکی تھی وہ فلاپی پر کاپی کر کے اپنی فائل سمیت دوبارہ اس کے کمرے میں آ گئی۔ وہ ڈرائنگ بورڈ پر شیٹ پھیلائے کام میں مصروف تھا، ارد گرد ڈھیر سارے پوائنٹرز، پنسلیں، مارکرز وغیرہ پھیلائے وہ ڈرائنگ بنانے میں مگن تھا۔ مجھے بچپن میں اس کی ڈرائنگ پر انک گرانے والی بات آج تک یاد تھی، پتا نہیں اسے بھی یاد تھی یا وہ بھول چکا تھا۔ ستارہ آنٹی ہم دونوں کے لیے کافی لے کر آئیں۔

''تھوڑی سی دیر سو جاؤ، رات بھر جاگ کر صبح پرچہ کیا خاک دیا جائے گا'' انہوں نے بالکل مماوالے انداز میں تشویش ظاہر کی۔

''سو گئی تو میرے اسائنمنٹ کا کیا ہوگا'' میں نے کافی کا سپ لیتے ہوئے تھکے تھکے انداز میں کہا تو عون پوائنٹر بند کرتا میری طرف گھوم کر بولا ''آخری دن کے لیے کام کیوں چھوڑ کر رکھا ہوا تھا''۔

اب مجھے اس سے بحث کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، اتنے دنوں سے بھی میں کوئی فارغ نہیں بیٹھی ہوئی تھی، پڑھنے ہی میں مصروف تھی، وہ کچھ دیر بڑے غور میری طرف دیکھتا رہا پھر ایک دم اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

''جس سپیڈ سے تم ٹائپ کر رہی ہو یہ کل شام تک ہی ٹائپ ہو پائے گا، ہٹو میں کر دوں''۔

میں اس کی پیشکش پر حیران ہوتی جلدی سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''میں کرلوں گی''۔

''مانا کہ میں تمہاری طرح کمپیوٹر سائنس کا اسٹوڈنٹ نہیں ہوں مگر ٹائپنگ اسپیڈ میری بہر حال تم سے کہیں زیادہ اچھی ہے، چیٹنگ کرنے کا اور کوئی فائدہ ہوتا ہو یا نہیں کم از کم بندے کی ٹائپنگ اسپیڈ تیز ہو جاتی ہے'' وہ اپنی بات کو انجوائے کرتا ہوا خود ہی ہنس پڑا۔

''تمہارے کام کا حرج ہوگا عون!'' میں اس کی مدد لینے سے ہچکچا رہی تھی۔

''وہ اتنا اہم..... کام نہیں ہے، کل کرلوں گا۔ فرنٹ ایلیویشن ہو چکی ہے کھڑکیوں، دروازوں کی ڈیٹیلنگ رہ گئی ہے وہ کل ہو جائے گی''۔

اس نے لاپروائی سے جواب دیا تو میں کمپیوٹر کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ اس کی اسپیڈ واقعی بہت اچھی تھی، کھٹا کھٹ اس کے ہاتھ کی بورڈ پر چل رہے تھے۔ پتا نہیں اس کی سمجھ میں میری رائٹنگ آئے گی یا نہیں میں نے اس میں کاٹا پیٹی بھی تو بہت زیادہ کی ہوئی تھی، یہی سوچ کر میں وہیں اس کے بیڈ کے کونے پر ٹک کر اپنی لیکچر نوٹ بک کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو مجھے عجیب سا لگتا رہا تھا جس سے کبھی میری سرسری سی بھی بات نہ ہوتی تھی اس کا احسان لینا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ مجھ سے لاتعلق بڑی تیز رفتاری سے ٹائپ کیے چلا جا رہا تھا۔ پیر لٹکا کر بیٹھے بیٹھے پاؤں سن سے محسوس ہونے لگے تو میں بیڈ کے اوپر ٹانگیں رکھ کر بیٹھ گئی اور لیکچرز میں سے خاص خاص باتیں دہرانے لگی۔

''تم ابھی تک رٹو طوطا ہو''؟

کام کرتے کرتے اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ اور یہ بات مجھے دونوں ہی زہر لگے، جل کٹڑا کہیں کا۔ میں ہمیشہ اسکول میں پوزیشن جو لیتی تھی اور وہ خود ''بی گریڈ'' ظاہر ہے اس بات پر وہ مجھ سے جلتا ہی ہوگا۔

''میں کوئی رٹا ونا نہیں لگا رہی ہوں''۔

میں نے پرزور انداز میں تردید کی حالانکہ اس وقت میں واقعی بعض فارمولے رٹنے میں مصروف تھی۔ وہ میرے انداز پر ایک نظر مجھ پر ڈال کر ہنس پڑا اور پھر دوبارہ مونیٹر پر نظریں جما دی تھیں۔ مجھے بہت سخت نیند آ رہی تھی مگر نیند بھگا کر میں زبردستی جاگنے اور پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ میرا اسائنمنٹ ٹائپ کرے اور میں نوابوں کی طرح کمرے میں جا کر سو جاؤں مجھے ایسا کرنا بڑا غیر اخلاقی سا لگا۔

گھڑی پر ایک نظر ڈالی تو ڈھائی بج رہے تھے۔ وہ تقریباً کام مکمل کر چکا تھا۔ دیکھنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ چند ہی صفحے رہ گئے ہیں ایک نظر اسے فائل میں موجود صفحات کو دیکھتے ہوئے میں دوبارہ اپنے نوٹس اور لیکچرز کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پڑھتے پڑھتے کس وقت میری آنکھ لگی مجھے بالکل نہیں پتا، آنکھ کھلی تو ہڑبڑا کر میں نے کمپیوٹر کی ٹیبل کی طرف دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا، کمرے کی لائٹ آف تھی، نائٹ بلب جل رہا تھا، میں جس طرح بیٹھی ہوئی تھی اسی طرح بیٹھے بیٹھے سوتی رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ جاگتے وقت میرے اوپر کمبل نہیں ڈالا ہوا تھا، جو نوٹ بک میرے ہاتھ میں تھی وہ ابھی بھی اسی طرح میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔

مجھے اپنے اس طرح سو جانے پر سخت شرمندگی ہو رہی تھی۔ پاس رکھا ٹائم پیس اٹھا کر ٹائم دیکھنا چاہا، میرا خیال تھا کہ چار ساڑھے چار بج رہے ہوں گے مگر گھڑی میں ساڑھے سات بجتے دیکھ کر میری شرمندگی پریشانی اور ندامت میں ڈھل گئی۔ ابھی میں ڈھنگ سے شرمندہ بھی نہیں ہو پائی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی تو خود پر سے کمبل ہٹاتی میں جلدی سے اٹھ کر دروازے تک پہنچی، دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑا نظر آیا اٹھنے کے ساتھ ہی سب سے پہلے اس کا سامنا ہو جانے پر مجھے مزید شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

''نیند پوری ہو گئی؟'' وہ مسکرایا۔ اپنے ہی کمرے میں دستک دے کر آنا اسے پتا نہیں کیسا لگ رہا تھا مگر میں تو بہر حال اتنی بری طرح شرمندہ اس سے پہلے زندگی میں کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مجھے گم صم سا کھڑا دیکھ کر خود ہی اندر آ گیا۔ وارڈ روب کھول کر وہ غالباً اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔

''تمہارا اسائنمنٹ ٹیبل پر رکھا ہے'' سر گھما کر اس نے مجھ سے کہا، میں چپ چاپ کمپیوٹر ٹیبل کے پاس آ گئی۔ وہ خالی ٹائپ کر دیتا تو وہ بھی میرے اوپر احسان تھا مگر اس نے تو اسائنمنٹ کا ٹائٹل پیج تک تیار کر دیا تھا۔ کسی بھی چیز کی Presentation ہی سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور اس نے ٹائٹل پیج اور انڈکس والا صفحہ اتنے اچھے اور آرٹسٹک انداز میں بنایا تھا کہ مجھے پہلے مرتبہ اس کے بارے میں روشنا کی رائے سے تھوڑا سا اتفاق کرنا پڑا تھا۔ کمپیوٹر گرافکس میں اسے یقیناً بہت مہارت حاصل تھی اور اس کا اس نے میرے اسائنمنٹ کے ٹائٹل پیج پر بڑی عمدگی سے استعمال کیا تھا۔

''تھینک یو عون!'' میں سب چیزیں سمیٹتے ہوئے واپس اس کے پاس آئی۔

''اب اس کے جواب میں میں You are always welcome نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہر وقت میں اتنی نیکی کے موڈ میں نہیں ہوتا ہوں''۔

وہ بے فکری سے مسکراتے ہوئے بے ساختہ بولا۔ میں جواباً کچھ بولے بغیر خاموشی سے اس کے کمرے سے نکل آئی۔ نہا کر حلیہ درست کیا، یونیورسٹی جانے کی تیاری مکمل کی، ڈائننگ روم میں آئی تو عون اور بڑے پاپا دونوں ناشتہ کرنے میں مصروف تھے، ساتھ ہی ساتھ اخبار کی کسی خبر پر بھی زور و شور سے بحث جاری تھی۔ ستارہ آنٹی یقیناً کچن میں تھیں۔ میں بڑے پاپا کو سلام کرتی کچن کی طرف جانے ہی لگی تو وہ پلیٹ ہاتھ میں لیے کچن سے نکلتی نظر آئیں۔

''تمہیں پسند ہے نا چینی والا پراٹھا، وہی بنا رہی تھی تمہارے لیے''۔

ہاتھ میں پکڑی پراٹھے کی پلیٹ میرے آگے رکھتے ہوئے انہوں نے محبت بھرے انداز میں کہا تو میں ان کے اتنی اچھی طرح میری پسند ناپسند یاد رکھنے پر حیران رہ گئی۔ میں ان کی مہمان نوازی سے بھرپور انداز پر حیران سی ہوتی ناشتہ کرنے لگی۔

''ابھی میں ڈراپ کر دوں گا مائلہ کو واپسی پر تم لے لینا'' بڑے پاپا نے چائے کا سپ لیتے ہوئے عون کو مخاطب کیا تو میں اس کے جواب دینے سے پہلے ہی جلدی سے بولی۔

''واپسی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے بڑے پاپا! میں اپنی کسی فرینڈ سے کہہ دوں گی وہ چھوڑ دے گی''۔

پہلے ہی میں اس کا خاصا احسان لے چکی تھی خواہ مخواہ میری وجہ سے کلفٹن سے خوار ہوتا یونیورسٹی آئے۔

''کتنے بجے ختم ہو گا تمہارا پیپر؟'' میری بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس نے بڑے سکون سے پوچھا تھا، میں نے ٹائم بتایا تو وہ ٹیبل سے اٹھتا ہوا بولا۔

''تم وہیں رک کر میرا انتظار کرنا''۔

میں اس کے حکمیہ انداز پر جز بز سی ہو گئی تھی۔ بڑے پاپا اور ستارہ آنٹی خاموشی سے ہم لوگوں کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ ٹیبل پر سے اپنا موبائل، سن گلاسز، فائل اور گاڑی کی چابی اٹھاتا سب کو خدا حافظ کہہ کر لاؤنج سے نکل گیا تھا۔ بڑے پاپا مجھے یونیورسٹی چھوڑتے ہوئے آفس چلے گئے

تھے۔ پیپر حسب توقع اچھا ہوا تھا۔ پیپر دے کر اپنی دوستوں کے ساتھ باہر نکلی تو میرا خیال تھا کہ ابھی کافی دیر تک عون کا انتظار کرنا پڑے گا مگر میرا یہ خیال اسے گاڑی میں بیٹھا دیکھ کر فوراً ہی غلط ثابت ہو گیا۔

''اوئے ہوئے! آج کل تو بڑے ہینڈسم اور اسمارٹ لوگ اپنی مائلہ کو یونیورسٹی چھوڑنے اور لینے آنے لگے ہیں'' رخشی نے معنی خیزی سے آنکھیں نچا کر کہا۔ میں اسے گھورتی ہوئی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی تھی، گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے پیپر کے بارے میں پوچھا تھا۔

''ہاں۔ اتنے رٹے لگا کر تو پیپر اچھا ہی ہونا تھا''۔ میرے جواب پر وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔ اسے رٹے والی بات پر میرے چڑنے کا پتا چل گیا تھا اسی لیے جان کر مجھے چڑا رہا تھا۔ میں نے بجائے چڑنے یا کچھ کہنے کے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

گھر پہنچے تو ستارہ آنٹی کی غیر موجودگی پر ابھی میں متعجب ہو ہی رہی تھی کہ وہ سیڑھیوں کی طرف جاتا ہوا مجھ سے بولا ''ماما کی کال آئی تھی میرے پاس، ہمارے ایک رشتے کے ماموں ہوتے ہیں ان کی ڈیتھ ہو گئی ہے وہ ایمرجنسی میں وہاں گئی ہیں، مجھے کہہ رہی تھیں کہ مائلہ کو یونیورسٹی سے لاتے ہوئے باہر کہیں سے لنچ کروا دینا۔ اب میرا تو اس وقت باہر کہیں سے لنچ کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ تم فریش ہو کر آ جاؤ پھر دونوں مل جل کر لنچ کا بندوبست کرتے ہیں''۔

میں اس کی بات پر سر ہلاتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ دس منٹ بعد میں کچن میں آئی تو وہ وہاں پہلے سے موجود تھا، فریزر میں منہ ڈالے وہ پتا نہیں کیا نکالنا چاہ رہا تھا، میں بھی اس کے پاس ہی آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ فریزر میں شامی کباب، پسندے، کوفتے، سموسے، رول وغیرہ اسٹور کرنا مما نے ستارہ آنٹی سے ہی سیکھا تھا۔ فریزر میں گوشت، قیمہ، مچھلی وغیرہ سب کچھ موجود تھا مگر جو چیز وہ ڈھونڈ رہا تھا وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

''اسے بھی آج ہی دھوکا دینا تھا، تب ہی ماما باہر لنچ کرنے پر اصرار کر رہی تھیں'' فریزر بند کرتے ہوئے اس نے مایوسی سے کہا تھا۔

''اب کیا کریں'' اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے فریج کھول کر دیکھا تو اس میں بھی کچھ قابلِ ذکر ریڈی میڈ چیز نظر نہیں آئی۔

''چلو آملیٹ بنا لیتے ہیں'' اس نے انڈوں کیطرف دیکھتے ہوئے چٹکی بجائی تو میں تھوڑی پریشان سی ہو گئی۔ پڑھنے کے علاوہ مجھے دنیا میں کوئی کام کرنا نہیں آتا تھا اور ککنگ تو بالکل بھی نہیں حالانکہ مما اس بات پر مجھے کتنا برا بھلا کہا کرتی تھیں، شرمندہ کرتی تھیں کہ چھوٹی بہن اتنا بہترین کھانا پکاتی ہے اور بڑی سوائے چائے بنانے اور برتن دھونے کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ مما کچن میں مصروف ہوتیں یا روشنا کچھ کام کر رہی ہوتی تو میری حیثیت وہاں ہیلپر کی ہوتی تھی۔

اب ستارہ آنٹی جیسا شاندار قسم کا میکسیکن یا اٹالین آملیٹ میں تو نہیں بنا سکتی تھی اور کسی لڑکی کے موجود ہوتے ہوئے لڑکا کام کرے یہ بھی بڑی نامناسب سی بات تھی۔ وہ کام کرتا تو لامحالہ مجھے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنی پڑتیں۔

''کیا ہوا؟ کیا سوچنے لگیں؟'' اس نے میری طرف بغور دیکھا۔

''چیز سینڈوچ بنا لیتے ہیں''۔ گھر میں بھی وقت بے وقت بھوک لگنے پر میں چیز سینڈوچ سے ہی لطف اندوز ہوا کرتی تھی، ڈبل روٹی پر چیز کا سلائس رکھا اور سینڈوچ میکر میں رکھ دیا، جھٹ پٹ گرما گرم خستہ سینڈوچ تیار ہوتا تھا۔

''اب میں نے تو ناشتے میں چینی والا پراٹھا نہیں کھایا تھا جو خالی خولی سینڈوچ سے میرا گزارا ہو جائے۔ ایک سیب اور تھوڑا سا کورن فلیکس کھا کر اس وقت تو مجھے سخت قسم کی بھوک لگ رہی ہے''۔

خواہ مخواہ میرے پراٹھا کھانے کو نظر لگا رہا تھا۔

''ویسے پراٹھے کھا کھا کر بھی تم اتنی دبلی پتلی ہو یہ بات خاصی قابلِ رشک ہے''۔ میرا منہ بنتا دیکھ کر وہ ہنستے ہوئے بولا۔''ارے واہ! کیا زبردست آئیڈیا آیا ہے''ایک دم چٹکی بجاتے ہوئے اس نے کچھ سوچ کر کہا پھر مجھ سے مزید کچھ کہے بغیر وہ کچن سے نکل گیا، دو منٹ بعد ہی اس کی واپسی ہوگئی، میں کرسی پر بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ فریج فریزر اور کیبنٹ میں سے مختلف چیزیں نکال رہا تھا، میں اس کی حرکات وسکنات ملاحظہ کر رہی تھی۔ ابھی وہ سب چیزیں اکٹھی کر ہی رہا تھا کہ ان کے گھر کام کرنے والا لڑکا ایک ہاتھ میں تھیلی اور دوسرے میں گاڑی کی چابی لیے کچن میں گھسا۔

''شاباش بہت جلدی لے آئے تم''اس کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لیتے ہوئے عون نے اسے سراہا تھا۔ تندوری نان کا اسے کیا کرنا تھا، میں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا کرو گے اس کا''میں اٹھ کر اس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

''تم یہ چیز نان پر اسپریڈ کرو''۔

مشروم زکا کین اوپنر سے کھولتے ہوئے اس نے مصروف انداز میں کہا تھا، وہ کیا کرنا چاہ رہا تھا میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ چیز ٹماٹو سوس، مشروم ز، نمک اور کالی مرچ کا چھڑکاؤ کر کے وہ نان مائیکرو ویو میں رکھے جا چکے تھے، میں نے اس کی پوری پوری مدد کروائی تھی جبکہ وہ مائیکرو ویو کے سر پر کھڑا ہمارے لنچ کے تیار ہو جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

''تم چاہو تو اسے دیسی پیزا کہہ سکتی ہو چاہو تو ریڈی میڈ پیزا یا جو نام تمہیں اچھا لگے وہ کہہ لو مگر یہ میری گارنٹی ہے کہ یہ ڈش تمہیں پسند آئے گی''۔

اوون کھول کر بقول اس کے دیسی پیزا پلیٹوں میں منتقل کرتے ہوئے اس نے مجھے مخاطب کیا، میں اس بھاپ اڑاتے گرم گرم لنچ سے پورا پورا انصاف کرنے لگی تھی۔

''واقعی یہ بہت مزے کا ہے''نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے میں نے تعریف کی۔''لیکن یہ آئیڈیا تمہارے پاس آیا کہاں سے؟''

''یہ کہکشاں آپی کی ایجاد ہے، انہوں نے ہی مجھے بھی سکھایا تھا''وہ اٹھ کر فریج میں سے پیپسی کے دو کین بھی نکال لایا۔''ویسے پیزا بیک کرنا کتنا دردِ سری ہے، مما یا روشنا جس دن پیزا بیک کرتی ہیں کتنے گھنٹے ان کے کچن میں گزر جاتے ہیں، اصل مسئلہ ہی اس کی روٹی بنانا ہے''۔

پیپسی کا سپ لیتے ہوئے میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ پوچھ بیٹھا۔

''تم کھانا نہیں پکاتیں؟''

''نہیں مجھے کلکنگ نہیں آتی، جو تھوڑی بہت چیزیں میں بنا لیتی ہوں وہ ایسی ہیں جو شاید تم بھی بنا لیتے ہو گے''میں نے بغیر شرمندہ ہوئے

بڑی ڈھٹائی سے اعتراف کیا۔

''بے چارہ تمہارا میاں، اس بے چارے کی تو ساری تنخواہ ہوٹلنگ میں خرچ ہو جایا کرے گی'' وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔

''ہوٹلنگ کیوں، ہم کوئی کک رکھ لیں گے''۔

اب اگر وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں میاں کے ذکر پر شرما جاؤں گی تو یہ اس کی بھول تھی، اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا، ایسے جیسے میرا جواب اس نے بہت انجوائے کیا ہے۔

''لیکن کک بھی مفت خدمات انجام نہیں دے گا، بات تو وہی ہوگئی، ایک اضافی بوجھ تو پڑ گیا نا اس مظلوم کی جیب پر'' وہ بڑی شریر نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''تم کیوں اس غم میں ہلکان ہو رہے ہو، بے فکر رہو میں کسی کنگلے سے شادی نہیں کروں گی، اس کی آمدنی اتنی ہوگی کہ میرے تمام نخرے بخوشی اٹھا سکے'' میں نے اسی خود اعتمادی سے اس کی شوخی سے بھرپور مسکراہٹ نظر انداز کرتے ہوئے کہا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''اچھا! اب مجھے تو جانا ہے، تم گھر پر اکیلی رہ لوگی نا'' کچھ دیر بعد اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو میں نے سر ہلا دیا۔

''ویسے ماما بھی تھوڑی دیر میں آجائیں گی'' اپنی پلیٹ سنک میں رکھتے ہوئے اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔ پتا نہیں روزانہ اتنی پابندی سے وہ کہاں مٹرگشت کرنے جاتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد دس بارہ فون کالز آئی تھیں جو سب کی سب اس کے لیے تھیں اور جن میں سے چھ کالز لڑکیوں کی تھیں، اس کے لیے لڑکیوں کے فون آنے پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ عصر کے وقت ستارہ آنٹی کی واپسی ہوگئی تو میری بوریت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ بڑے پاپا آفس سے آگئے تو شام کی چائے میں نے ہی بنائی اور ہم لوگوں نے لان میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے چائے پی۔ ایک بات تو مجھے ماننی ہی پڑ رہی تھی اور وہ یہ کہ یہاں رہنے کے نام پر میں جتنی بیزار ہوئی تھی اب اتنا ہی مزہ آرہا تھا۔ عون سمیت وہاں سب کا رویہ بہت دوستانہ اور اپنائیت لیے ہوئے تھا، مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اتنا گھر جیسا ماحول تو مجھے خالہ کے گھر بھی نہیں ملتا، ان کی لمبی چوڑی سسرال، وہاں ہر وقت میلے کا سا سماں رہتا تھا، وہاں پڑھائی کا ماحول بننا بڑا مشکل تھا جبکہ یہاں بہت سکون اور ہمارے ہی گھر کی طرح کا ماحول تھا۔

رات کھانے کے بعد مما کا فون بھی آگیا تھا۔ روشنا نے مہندی اور شادی کے دن کا احوال خاص طور پر میرا دل جلانے کے لیے سنایا تھا، فون سے فارغ ہو کر میں دو ڈھائی گھنٹہ اسٹڈی کر کے سو جانے کا پروگرام بناتی کتابیں وغیرہ کھول کر بیٹھ گئی، اگلا پیپر دو دن بعد ہونا تھا اور یہ دو دن کا گیپ سب کچھ دہرانے کے لیے کافی تھا۔ صبح میری آنکھ دیر سے کھلی تھی، ہلکا پھلکا ناشتہ کر کے میں دوبارہ کمرہ نشین ہوگئی تھی، پھر لنچ کے لیے بلائے جانے پر ہی کمرے سے نکلی۔ ہم دونوں نے کھانا شروع کیا ہی تھا جب عون بھی گھر آگیا۔ ستارہ آنٹی اس کے آجانے پر بڑی حیران نظر آرہی تھیں۔

''بس گھر پر لنچ کرنے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کا موڈ ہو رہا ہے، آج آفس تھوڑا ٹھہر کر جاؤں گا'' میں نے آفس کے ذکر پر تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں تمہیں ضرورت کیا ہے بلاوجہ خوار ہونے کی، پہلے پڑھائی مکمل ہو جاتی جاب واب پھر اس کے بعد ہوتی رہتی'' ستارہ آنٹی نے اس کی مصروفیت کا ذکر بڑی ناپسندیدگی سے کیا۔

''تم نے جاب کر لی ہے عون؟'' میں نے بے ساختگی میں پوچھا، اس کے گردن ہلانے پر ستارہ آنٹی ناراضی سے بولیں۔

''میں نے کتنا منع کیا تھا مگر یہاں میری سنتا ہی کون ہے، بیٹا خبطی ہے تو ابا مہا خبطی، میرے منع کرنے پر الٹا ناراض ہو رہے تھے کہ بیٹے کے کیریئر میں رکاوٹیں کھڑی کر رہی ہوں''۔ وہ ان کی ناراض شکل دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔

''اصل میں میرے ایک پروفیسر ہیں ان کی اپنی کنسلٹیٹی ہے انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کی تھی، میں انکار کیوں کرتا اس میں میرا ہی تو فائدہ ہے، دورانِ تعلیم ہی اگر آپ کو اپنی فیلڈ سے متعلق معلومات حاصل ہو رہی ہوں تو اس میں حرج ہی کیا ہے، یقین کرو ان چھ ماہ میں میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ گزشتہ چار سالوں میں نہیں سیکھ پایا تھا''۔

''اچھا تو تم شام میں وہاں بزی ہوتے ہو''؟

میرے پوچھنے پر وہ سر ہلا کر بولا ''جتنی بھی کنسلٹنگ فرمز ہیں ان میں اصل کام ہوتا ہی شام میں ہے، کلائنٹس وغیرہ شام میں ہی آتے ہیں، کلاسز وغیرہ سے فارغ ہو کر میں وہاں چلا جاتا ہوں، دکھاؤں گا میں تمہیں اپنے نئے پراجیکٹ کی ڈرائنگز، ہمارا کلائنٹ مری میں فائیو اسٹار ہوٹل بنانا چاہتا ہے، اس کا پچاس فیصد کام سمجھو میں نے ہی کیا ہے''۔

وہ اپنے پروفیشن کے حوالے سے متصل جواب دیتا ہوا اپنی تعریف خود ہی کرنی شروع ہو گیا۔

''پھر تمہاری باقی ایکٹویٹیز کا تو بہت حرج ہوتا ہوگا، اسپورٹس، ماڈلنگ، سنگنگ وغیرہ'' میں نے اس طرح کہا جیسے اس کی ان تمام ہابیز کی میں بہت بڑی مداح تھی۔

''نہیں کسی چیز کا حرج نہیں ہوتا، میں ایک ہی وقت میں بہت سے کام کر سکتا ہوں اور وہ بھی مہارت کے ساتھ، ماڈلنگ کو تو ان دنوں میں نے خود ہی خیر باد کہا ہوا ہے اور سنگنگ کی جہاں تک بات ہے تو اگلے سال تک ہمارا دوسرا البم ریلیز ہو جائے گا، اب جلدی جلدی البمز ریلیز ہوں تو اس کی اتنی کچھ خاص ویلیو نہیں بنتی، ذرا سا اپنے فینز کو انتظار کرواؤ پھر مارکیٹ ویلیو اور بڑھ جاتی ہے''۔

بڑا بے شرم بندہ تھا یہ عون ہاشم علی بھی، میرے طنزیہ انداز کا نوٹس لیے بغیر وہ اپنے بے سرے گانوں پر مشتمل نئے البم اور چند پاگل اور بے وقوف لڑکیوں کو جو اس کے گانوں کی نہیں بلکہ اس کی پرسنیلٹی کی دیوانی تھیں اپنا فین قرار دیتے ہوئے اس طرح جواب دے رہا تھا جیسے میں نے مہدی حسن سے یہ سوال پوچھ لیا تھا۔ لنچ کے بعد میں پھر سے پڑھنے بیٹھ گئی تھی، ستارہ آنٹی اور عون بھی اپنے بیڈ رومز میں چلے گئے تھے، وہ سارا دن میں نے پڑھتے ہوئے گزارا۔

''سارا دن پڑھتے پڑھتے تم بیزار نہیں ہوئیں؟'' رات میں عون میرے کمرے میں آ گیا تھا، میں نے نوٹس ایک طرف رکھ کر نفی میں سر ہلایا تو وہ سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔

''پاگل ہو جاؤ گی اتنا پڑھ کر، اب جو تم پڑھ رہی ہو تو پلے کچھ نہیں پڑ رہا ہوگا، دماغ فریش ہو تو ہی صحیح کام کرتا ہے، کمرے سے باہر نکلو ذرا کھلی فضا میں سانس لو، خود کو ریلیکس کرو''۔ میں اس کی بات خاموشی سے سن رہی تھی۔

''چلو ایک چکر باہر کا لگا کر آتے ہیں''۔

میں اس کی پیشکش پر حیران، سارا دن باہر پھر کر بھی اس میں مزید پھرنے کا اسٹیمنا موجود تھا، اس نے دوبارہ اصرار کیا تو میں اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آ گئی۔ ستارہ آنٹی اور بڑے پاپا لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے، ان سے پندرہ بیس منٹ میں واپس آ جانے کا کہتے ہم دونوں سڑک پر نکل آئے تھے۔

''کیسا لگ رہا ہے باہر آ کر؟'' واک کرتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا تو لگ رہا ہے ویسے میں پڑھتے ہوئے بیزار بالکل نہیں ہو رہی تھی'' میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

''پھر تو تمہاری ہمت کی داد دینی پڑے گی، مجھے تو تمہاری حالت دیکھ کر رحم آ رہا تھا، کیسا گھٹا ہوا ماحول لگ رہا تھا کمرے کا، چاروں طرف کتابیں، نوٹس، فائلیں، اف میں تو اس طرح کبھی بھی نہیں پڑھ سکتا'' اس نے باقاعدہ کان پکڑ کر توبہ کی۔ ''مجھے تمہارے طریقۂ کار سے اختلاف ہے، پڑھائی کو اس طرح بوجھ بنا کر نہیں بلکہ انجوائے کر کے کرنا چاہیے''۔

اسے اپنی طرف بغور دیکھتا پا کر میں تھوڑی نروس ہو گئی، کہیں اسے میری سوچ کے بارے میں علم نہ ہو جائے بے چارے کو اپنے بارے میں جو جو خوش فہمیاں لاحق ہیں سب دھری کی دھری رہ جائیں گی، اس کے خیال سے تو وہ دنیا کا سب سے ہینڈسم اور ذہین لڑکا تھا جس پر زمانے بھر کی ہر لڑکی دل و جان سے فدا ہونے کو تیار بیٹھی تھی۔

پندرہ بیس منٹ تک آس پاس کی گلیوں میں واک کرتے ہم واپس گھر آ گئے تھے واپسی میں اس نے اپنے اور میرے لیے آئس کریم خریدی تھی، میں اس کی عنایتوں کا سبب سمجھنے سے قاصر تھی، کیا وہ دوسری لڑکیوں کی طرح میرے ساتھ بھی فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر صرف کزن اور اپنے گھر میں مہمان ہونے کی حیثیت سے اتنا ٹائم دے رہا تھا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں گھر واپس آ گئی تھی، ستارہ آنٹی اور بڑے پاپا خود مجھے گھر چھوڑنے آئے تھے۔ راستے میں گاڑی طارق روڈ پر رکوا کر انہوں نے مجھے میرے بہت منع کرنے کے باوجود دو سوٹ دلوائے تھے۔ مما جٹھانی کی بہت شکر گزار تھیں جنہوں نے ان کی بیٹی کا اتنی اچھی طرح خیال رکھا تھا۔

☆

میں امتحانوں سے فراغت کے بعد چھٹیوں کے مزے لے رہی تھی، رزلٹ آ جانے کے بعد میرا ایم ایس میں ایڈمیشن لینے کا پروگرام تھا، روشنا کے لیے ہمارے ماموں کے لائق فائق بیٹے کا رشتہ آیا تو خاندان کا دیکھا بھالا لڑکا جو بہت سی خوبیوں کا مرقع بھی تھا، مما پاپا کو اقرار کرتے ہی بنی گو مما کو چھوٹی بیٹی کا رشتہ پہلے طے ہو جانے پر کافی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

اس رات بڑے پاپا، ستارہ آنٹی اور عون ہمارے گھر آئے تھے، وہ دونوں تو اکثر آتے ہی تھے مگر عون اس طرح پہلی مرتبہ آیا تھا شاید روشنا

سے دوستی ہونے کی وجہ سے وہ بھی مبارک باد دینے آ گیا تھا۔ میں، روشنا اور ایرج عون سے باتیں کر رہے تھے جبکہ مما پاپا کی ستارہ آنٹی اور بڑے پاپا سے گفتگو ہو رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے آج کل؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تو میں بے فکری سے بولی۔

''آرام ہو رہا ہے، مزے کر رہی ہوں''۔

''یہ تو بہت ہی اچھا کر رہی ہو، ویسے بھی جس طرح تم پڑھتی ہو اس کے بعد لمبا آرام ضروری ہو جاتا ہے'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''اور تمہارا فائیو اسٹار ہوٹل کہاں تک پہنچا؟'' میں نے سوال کیا تو وہ اسی سنجیدگی سے بولا۔

''وہ پراجیکٹ بھی تقریباً مکمل ہی ہو گیا ہے، زیادہ مصروف تو میں اپنے تھیسس میں ہوں''۔ اس کا فائنل ایئر شروع ہو چکا تھا۔ روشنا اس سے تھیسس کے حوالے سے مختلف باتیں پوچھ رہی تھی جب اچانک ہی مما کی آواز میرے کانوں میں پڑی تھی، ہم لوگ فلور کشنز پر بیٹھے تھے اور وہ لوگ دور صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''میں مائلہ سے پہلے روشنا کا رشتہ طے کرنے کے حق میں نہیں تھی مگر اب انہوں نے رشتہ ہی روشنا کے لیے دیا تو میں اپنے منہ سے مائلہ کا نام کیسے لے سکتی تھی، پھر بھی میں نے بھائی جان سے صاف کہہ دیا ہے جب تک مائلہ کی شادی نہیں ہو جاتی میں روشنا کے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں''۔

مجھے مما کی اس بات پر سخت غصہ آیا تھا، میرے برابر ہی میں تو عون بھی بیٹھا ہوا تھا اور ظاہر ہے اس نے اپنے کان بند تو نہیں کر رکھے ہوں گے، کیا سوچ رہا ہو گا وہ کہ میں اتنی گئی گزری ہوں مجھے کوئی پوچھ بھی نہیں رہا۔ جہاں تک میری پسند کا سوال تھا تو شعیب ایک کزن اور اب بہنوئی ہونے کے ناتے تو مجھے اچھا لگتا تھا مگر اگر وہاں سے میرے لیے رشتہ آتا تو میں اسے کبھی بھی پسند نہ کرتی۔ وہ روشنا سے صرف ڈھائی سال بڑا تھا تو مجھ سے تو صرف ڈیڑھ سال بڑا ہوا، یعنی ہمارے ایج گروپ کا۔ حالانکہ وہ ایم بی اے کر چکا تھا، اسے جاب بھی فوراً مل گئی تھی مگر وہ میرے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا، مگر اب میں یہ بات کسی سے کہہ تو نہیں سکتی تھی مگر مما پر بہرحال مجھے بہت غصہ آیا تھا۔

''تمہیں مائلہ کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے'' ستارہ آنٹی نے ایک نظر مجھ پر ڈال کر مما سے کہا تو میں چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی، ان کے اور بڑے پاپا کے چہرے پر موجود معنی خیز مسکراہٹ مجھے الجھن میں مبتلا کر گئی تھی۔

میں نے عون کی طرف دیکھا تو وہ اس تمام گفتگو سے یکسر لاتعلق روشنا اور ایرج کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا مگر میرا دھیان اب ان لوگوں کی باتوں کی طرف سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔

وہ لوگ جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو ہم سب انہیں گیٹ تک خدا حافظ کہنے آئے تھے۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے مما کے پاس کھڑے ہو کر سرگوشی میں کچھ بات کی تھی جس کے جواب میں مما مسکرا دی تھیں، بات میں سن نہیں پائی تھی مگر میرا تجسس کے مارے برا حال تھا، ان لوگوں کے جاتے ہی میں نے مما سے پوچھا کہ ستارہ آنٹی آپ سے کیا بات کر رہی تھیں تو انہوں نے ٹالنے والے انداز میں ''تمہارے مطلب کی بات نہیں ہے'' کہہ دیا تھا۔ مما کے اس جواب پر میرا موڈ خراب ہو گیا تھا مگر میں یہ نہیں جانتی تھی کہ آنے والے دنوں میں یہ خراب موڈ مستقل میری زندگی

کا حصہ بننے والا تھا۔ پہلی مرتبہ مما کے منہ سے یہ بات سن کر کہ عون کا پرپوزل میرے لیے آیا ہے مجھے کتنا شدید غصہ آیا تھا میں اندازہ نہیں کر پائی تھی پھر اپنا غصہ میں نے یہ سوچ کر ضبط کر لیا تھا کہ جب مما کو انہیں انکار کرنا ہی ہے تو میں بلاوجہ اپنا خون کیوں جلاؤں، ظاہر ہے مما انہیں انکار کر دیں گی، جن لوگوں نے انہیں کبھی سکون سے نہیں رہنے دیا وہ ان کی بیٹی کو کب خوش رکھ سکیں گے۔ جب وہ جٹھانی کے روپ میں اتنی خطرناک تھیں تو پھر ساس بن کر تو جو ستم اپنی بہو پر نہ ڈھا دیتیں کم تھا مگر مما نے سرسری سے انداز میں اس رشتے کے بارے میں میری رائے جاننا چاہی یوں جیسے کوئی رسم پوری کر رہی ہوں ورنہ فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر چکی تھیں۔

میں صدمے اور رنج سے چیخ اٹھی تھی، مما اور روشنا کے سامنے چیخ چیخ کر اس رشتے سے انکار کرتے ہوئے میرے پاس ان لوگوں کی مخالفت میں کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

ستارہ آنٹی کے مظالم، ان کی مکاریاں، عون کے معاشقے اور تمام گرل فرینڈز مگر میرے ہر اعتراض کا ان دونوں کے پاس جواب تیار تھا۔

''ستارہ بھابھی اب بدل چکی ہیں، کئی بار انہوں نے مجھ سے اپنے پچھلے سلوک کی معافی تک مانگی ہے''۔

''لڑکیاں خود اس کے پیچھے آتی ہیں، وہ کسی کے پیچھے نہیں پڑا، میرا اس سے تم سے زیادہ واسطہ ہے، روزانہ اس سے ملتی ہوں، سوائے ہائے ہیلو کے اس کی بطور خاص کسی سے بھی زیادہ دوستی نہیں ہے''۔

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے ساتھ اس طرح ہو سکتا ہے، میری زندگی کا فیصلہ ہو رہا تھا اور میرے علاوہ اس فیصلے میں باقی ہر کوئی شریک تھا، میرا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا، کیا کیا خواب دیکھا کرتی تھی میں اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں اور ان خوابوں کی تعبیر کتنی بدصورت نکلی تھی۔ کیا میرے لیے وہ عون ہاشم علی ہی رہ گیا تھا، کوئی ایک بات بھی تو ایسی نہیں تھی جو مجھے اس کے حق میں ہموار کر سکتی۔ ایسے ہی میں مما کو بوجھ لگنے لگی تھی تو عون سے کہیں بہتر رشتہ میرا پچھلے دنوں آیا تھا جسے مما نے فوراً ہی منع کر دیا تھا۔

''وہ لڑکا ہے؟ کم از کم بھی پینتیس سال سے کم عمر نہیں ہوگی اس کی''۔

اب میں مما کو کیسے سمجھاتی کہ جو بات آپ کو خرابی نظر آ رہی ہے وہ ہی مجھے خوبی محسوس ہو رہی ہے حالانکہ وہ اچھا خاصا خوش شکل بندہ تھا، آرمی میں ڈاکٹر، مگر مما کو اس کی ایج زیادہ لگی تھی اور میرے لیے درست بندہ وہ میرا ہم عمر قطعاً غیر سنجیدہ اور لاابالی سا عون تھا۔ مما اور مجھ میں نظریاتی اختلاف تھا اور میں انہیں قائل نہیں کر پا رہی تھی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ قائل ہونا ہی نہیں چاہتی تھیں، میرا انکار ان کے نزدیک ایک بچکانہ اور احمقانہ حرکت تھی۔ آخری ہتھیار رونا تھا اس پر بھی مما کا دل موم نہیں ہوا تھا۔

''وقت کے ساتھ جب تمہیں عقل آئے گی تو پتا چل جائے گا کہ عون تمہارے لیے بہترین انتخاب ہے اس کی عادتیں اچھی ہیں، ہم لوگوں کا دیکھا بھالا ہے اور سب سے بڑی بات میں تمہیں بتاؤں کہ اس رشتے میں ستارہ بھابھی اور ہاشم بھائی کے ساتھ عون کی مرضی بھی شامل ہے ستارہ بھابھی نے مجھے خود بتایا ہے کہ عون نے ان کے اور ہاشم بھائی کے پوچھنے پر کہ وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تمہارا نام لیا تھا۔ کیا اب بھی تم انکار کرو گی، کتنی قدر رہو گی تمہاری وہاں، ساس، سسر، شوہر سب کی پسندیدہ بن کر رہو گی تم وہاں''۔

مما تو مجھے اس کے ساتھ رخصت کر دینے میں بھی دیر نہ کرتیں مگر وہ دو سال سے پہلے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، فائنل ایئر مکمل ہو جانے کے بعد اس کا ماسٹرز کرنے کے لیے امریکہ جانے کا ارادہ تھا۔

نکاح والے دن کے لیے میرا بہترین جوڑا اور بیش قیمت جیولری آئی تھی، مما اور روشنا اس آف وائٹ گھاگرے کے خوب قصیدے پڑھ رہی تھیں۔

''جب نکاح پر اتنا بہترین ڈریس آیا ہے تو رخصتی پر تو ستارہ آنٹی پتا نہیں کیا زبردست چیز لائیں گی، کتنا زبردست کام بنا ہوا ہے، بالکل نازک سا'' روشنا دوپٹے کا تفصیلی معائنہ کرتے ہوئے قصیدے پڑھ رہی تھی تو مما جیولری کی خوبیاں گنوا رہی تھیں۔

یہ ساری زندگی کا معاملہ تھا اور زندگی کپڑوں اور جیولری کے سہارے نہیں گزر سکتی، میں لولی پاپ کے طور پر ملنے والے اس ڈریس اور جیولری سے خوش ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔

نکاح والے دن میں سب کو بہت حسین اور بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی، روشنا کے برعکس مجھے جیولری اور میک اپ سے الجھن ہوتی تھی اس لیے میں اکثر سادے سے حلیے میں ہی رہا کرتی تھی، آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھ کر میرا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ یہ سب تیاریاں کس کے لیے تھیں، وہ جسے میں گویا کہا کرتی تھی، جسے میں نے کبھی بھی غیر معمولی اہمیت نہیں دی تھی، جو میرے آئیڈیل سے بالکل بھی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ''آہ میرا آئیڈیل'' میرے منہ سے ایک سرد آہ نکلی تھی۔ نکاح کے وقت سب لڑکیاں روتی ہیں، وہ بھی جو اس سے پہلے ہسبنڈ ہنٹنگ کرتی رہی ہوتی ہیں مگر میرا رونا ان سب سے مختلف تھا، اگر میرا ہونے والا شوہر میری پسند کے مطابق ہوتا تو شاید میں رسمِ دنیا نبھانے کے لیے بھی نہ روتی۔

نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے میرے رونے کو سب ایک مشرقی لڑکی کا ماں باپ اور بہن بھائی سے جدا ہو جانے والا رونا سمجھ رہے تھے۔

تصویریں، مووی، لوگوں کے دلچسپ تبصرے، میں کسی بھی چیز پر توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ عون تھوڑی دیر ہی بمشکل سکون سے بیٹھا ہوگا۔

''بس اب بند کر مجھ سے نہیں بیٹھا جا رہا، ویسے بھی اتنی تصویریں کافی ہیں'' وہ ستارہ آنٹی کے ٹوکنے اور کہکشاں آپی کے منع کرنے کے باوجود میرے برابر سے اٹھ گیا تھا، اسٹیج سے اتر کر اب وہ سب کزنز وغیرہ کے ساتھ ہلا گلا کرنے اور باتیں کرنے میں مشغول ہو گیا تھا۔ اگر کوئی ایسا مہمان وہاں آتا جس نے اسے پہلے دیکھ نہ رکھا ہوتا تو وہ حیرت سے پوچھتا کہ ان سب میں سے دولہا کون ہے، رسمی طور پر جو ایک ہار اس کے گلے میں ڈال دیا گیا تھا اس نے وہ بھی فوراً ہی اتار دیا تھا۔ اس کی ڈریسنگ اس کا اسٹائل اور منچلا انداز کوئی بھی یہ بات ظاہر نہیں کر رہی تھے کہ وہ دولہا ہے۔

نکاح کے ایک ڈیڑھ ہفتے بعد بڑے پاپا نے اپنے گھر پر ڈنر رکھا تھا جس میں ہم لوگوں کو، پھپھو کی فیملی اور کہکشاں آپی کی سسرال کو انوائٹ کیا گیا تھا۔ میرا وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر ستارہ آنٹی نے فون کر کے مما کو خاص طور پر تاکید کی تھی۔

''میری بہو کو ضرور لانا''۔ نکاح کے بعد سے انہیں مجھ پر مزید پیار آنا شروع ہو گیا تھا، مما سے فون پر بات ہوتی تو مجھ سے بات کرنا بھی لازم ہوتا تھا۔ اب یہ نہیں تھا کہ میں اپنی مرضی سے جو دل چاہے پہنوں اور منہ اٹھا کر وہاں چلی جاؤں، اب وہاں اس طرح تیار ہو کر جانا تھا جو ان کی

بہو کے شایان شان ہو۔ میرے پہننے کے لیے کپڑے مما نے منتخب کیے تھے اور میک اپ سر پر سوار ہو کر روشنا نے کروایا تھا۔

ہم لوگ وہاں پہنچے تو سب لوگ لاؤنج میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ عون، ایاز بھائی سے باتیں کر رہا تھا، اس کے جڑواں بھانجے یاسر اور مدثر اس کے کندھے پر لٹکے ہوئے تھے۔ سب ہی ہم لوگوں کو ویلکم کہنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے مگر ستارہ آنٹی نے جس طرح سب سے پہلے آگے بڑھ کر مجھے خوب لپٹا کر پیار کیا تھا میں خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے سب لوگ مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ یاسر اور مدثر اپنے ماموں جان کو چھوڑ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے، مائلہ بجو ایک دم میں مامی ہو چکی تھی۔

ڈنر کا سارا اہتمام ستارہ آنٹی نے خود کیا تھا، وہ بڑے آرام سے چالیس پچاس افراد کی دعوت کا کھانا پکا لیا کرتی تھیں، ان کا گھڑا پا اور سلیقہ تو اظہر من الشمس تھا تب ہی بھی مما کو اچانک ہی تشویش لاحق ہوئی تھی۔

''مائلہ کو تو ککنگ بالکل بھی نہیں آتی، میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، کتنا میں چاہتی ہوں کہ یہ کھانا پکانا سیکھ لے مگر اسے بالکل بھی انٹرسٹ نہیں ہے''۔ کھانا کھاتے ہوئے مما نے اپنے برابر بیٹھی ستارہ آنٹی سے بڑی شرمندگی سے کہا تھا۔

''اس عمر میں سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، تم فکر مت کرو، میں اسے سب سکھا دوں گی''۔

ہاں جب وہ یہ پیار محبت کی کینچلی اتاریں گی اور اپنا خطرناک قسم کا ساس پنا ظاہر کریں گی تو میرے اچھے بھی کھانا پکانا سیکھ ہی جائیں گے، دادی اماں تو شاید پھر کچھ رحم دل رہی ہوں گی پھر پاپا مما سے شدید محبت کرتے تھے، انہوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے گھر والے ان کی بیوی کو اس کا جائز مقام نہیں دے رہے تو بیوی بچوں کو لے کر الگ ہو گئے تھے۔

مما کو تو ایک میچیور ذمہ دار اور محبت کرنے والا شوہر ملا تھا اور میں؟ میرا شوہر گھر سے باہر مختلف لڑکیوں کے ساتھ افیئر چلانے میں مصروف ہو گا، راتوں کو دیر سے گھر آیا کرے گا، جن دنوں اپنے البمز میں مصروف ہو گا تو شاید گھر آیا ہی نہیں کرے گا اور میں گھر پر ظالم ساس کے ہتھے چڑھی رہوں گی، ان کے طنزیہ جملے ہوں گے، دل دکھانے والی باتیں ہوں گی اور میں خاموشی سے سب سنا کروں گی اس لیے کہ میرا تو کھونٹا ہی بڑا کمزور ہے۔

عون بطور خاص میری طرف متوجہ نہیں تھا، وہ سب کے ساتھ ہنسی مذاق اور شور شرابے میں مصروف تھا، ڈنر کے بعد سب کے پرزور اصرار پر اس نے اپنے دو تین بے سرے گانے گٹار پر سنائے تھے، میں بیزاری سے بیٹھی ہوئی تھی، گاتے وقت اس نے کئی مرتبہ میری طرف دیکھا تھا، گھر آ کر روشنا نے یہ بات مجھے اس طرح بتائی جیسے اس کے دیکھ لینے سے میری کتنی عزت بڑھ گئی تھی۔

''عون تمہیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، شکر ہے تم صحیح حلیہ میں گئی تھیں'' جیولری اتارتے ہوئے وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

''آتے وقت میں نے اسے اس بات پر چھیڑا تو پتا ہے وہ کیا کہنے لگا؟'' وہ سسپنس پیدا کرتے ہوئے بولی مگر میں نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا تو خود ہی بتانے لگی ''کہنے لگا اپنی بیوی ہی کو تو دیکھ رہا ہوں، کسی پرائی لڑکی پر تو نظر نہیں ڈالی میں نے''۔ وہ اس بات کو ابھی انجوائے کر رہی تھی۔

''میں نے اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ تمہیں اس کی لڑکیوں کے ساتھ دوستیاں بالکل پسند نہیں ہیں'' وہ اس طرح بولی تھی جیسے کوئی بہت بڑا

کارنامہ انجام دے آئی ہو اور اب مجھ سے اس کی داد حاصل کرنا چاہ رہی ہو، مجھے جتنا بھی غصہ آ رہا ہو مگر روشنا سے کچھ بھی کہنا سننا بے کار تھا، میرا رزلٹ نکاح سے بھی پہلے نکل چکا تھا، اپنے اعزازی نمبروں سے پاس ہو جانے پر میں ڈھنگ سے خوشی بھی نہیں منا پائی تھی۔

رزلٹ کے دو دن بعد وہ منحوس دن آ گیا تھا جب مجھے اس کے ساتھ منسوب کر دیا گیا تھا، اب تو نکاح کو ہوئے بھی تین ماہ ہو چکے تھے، میرا آگے پڑھنے کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا، عجیب سی بیزاری اور کوفت نے مجھے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، مما کے اصرار پر میں نے تنک مزاجی سے "میرا موڈ نہیں ہے" کہہ دیا تھا۔

☆

میں مما کے ساتھ کچن میں مصروف تھی، وہ آج کل دل و جان سے میری ٹریننگ کرنے میں مصروف تھیں، کھیر کھانا کتنا آسان ہے اور پکانا؟ میرے خدا، کتنی بڑی دردِ سری۔ مما سالن میں ادرک وغیرہ کاٹ کر ڈالنے میں مصروف تھیں ساتھ ساتھ مجھے بھی کھیر سے متعلق مختلف ہدایات دے رہی تھیں۔

"بیٹا! فون ہے تمہارا" پاپا کی آمد مجھے اس وقت بڑی اچھی لگی تھی۔

"کس کا فون ہے، آپ منع کر دیتے، مائلہ بعد میں کال کر لیتی" مما کا منہ بن گیا تھا۔

"عون کا فون ہے" پاپا مما کے خفگی بھرے انداز پر مسکرا دیئے تھے۔

"کس ڈش کی شامت آئی ہوئی ہے" میرے سلام کا جواب دیتے ہی اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ایسے ہی میں مما کی ہیلپ کروا رہی تھی" میں نے سرسری سا انداز اختیار کیا۔ اس کے فون کرنے پر مجھے کافی حیرت ہو رہی تھی اور میں مسلسل اس کی وجہ سوچنے میں مصروف تھی۔ اتنے سارے دنوں میں یہ اس کی مجھ سے پہلی براہِ راست گفتگو تھی۔

"یار! اب کچھ پکانا سیکھ ہی لو، ایک تو یہ کہ میں کوئی بہت بڑا لارڈ نہیں، اب اگر تمہاری قسمت میں کوئی کنگال نہیں تھا تو کوئی ڈیوک بھی نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ ماما کو نوکروں کے ہاتھوں کا پکا کھانا بالکل پسند نہیں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ کوئی کلکنگ کلاسز جوائن کر لو" وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے یہی مسئلہ حل کرنے کے لیے اس نے فون کیا تھا، میرے خاموش رہنے پر وہ دوبارہ خود ہی بولنے لگا۔

"ویسے آج کل کر کیا رہی ہو، ایڈمیشن کیوں نہیں لیا" ایم ایس" میں"۔

"بس تھوڑے دن ریسٹ کرنے کا موڈ ہو رہا ہے، لوں گی ایڈمیشن" میں نے آہستگی سے کہا تھا۔

"اچھا کل تمہیں کہیں جانا تو نہیں ہے؟" میری بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے مختصراً کہا۔

"ٹھیک ہے پھر کل تم رات میں تیار رہنا، ہم ڈنر ساتھ کریں گے"۔

میرے "ٹھیک ہے" کہنے پر اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا، نکاح کے اتنے دنوں بعد اسے پتا نہیں اچانک کیا سوجھی تھی، میں

حیرت سے سوچتی واپس کچن میں آ گئی تھی، مما کے استفسار پر میں نے ڈنر والی بات کے بارے میں بتا دیا تھا۔

''ہاں کل فورٹینتھ ہے نا' اسی لیے وہ تمہیں لے جانا چاہ رہا ہوگا'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو مجھے بھی ایک دم یاد آیا تھا، زندگی میں پہلی بار میں خود اپنی ہی سالگرہ بھول گئی تھی، کل میری سالگرہ تھی اور مجھے یاد تک نہیں تھا۔

نکاح کے بعد سے میری اس بارے میں خاموشی کو گھر والے میری نیم رضامندی سمجھ رہے تھے یعنی یہ کہ میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے اور یہ بات جھوٹ تھی بھی نہیں، میں واقعی حالات سے سمجھوتا کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔

اگلے روز مما یا روشنا کے کچھ کہے بغیر خود ہی اہتمام سے تیار ہو گئی تھی، پلین گرے ٹراؤزر اور گھٹنوں سے ذرا اونچی پلین ہی شرٹ کے ساتھ پرنٹڈ بڑا سا دوپٹہ لیا تھا، ٹراؤزر کے پائنچوں اور فرنٹ اوپن شرٹ کے دامن پر ایمبرائیڈری بنی ہوئی تھی۔

روشنا نے عون کو برتھ ڈے گفٹ یا ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے ایک کارڈ ہی دے دینے کے لیے کہا تو میں نے صاف انکار کر دیا تھا، اس کی خدمت میں گفٹ اور کارڈ پیش کرنے لگوں تو مجھ میں اور اس کے آگے پیچھے پھرنے والی لڑکیوں میں کیا فرق رہ جائے گا، یہ تو عون تھا جسے میں نے دل پر پتھر رکھ کر قبول کیا تھا اگر وہ میرا پسندیدہ ترین شخص بھی ہوتا میں تب بھی تحفہ یا کارڈ دینے میں کبھی پہل نہیں کرتی۔

آٹھ بجے کے قریب وہ آیا تھا، میں تیار بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی، مما پاپا سے کھڑے کھڑے سلام دعا کر کے اس نے مجھ سے چلنے کے لیے کہا تھا، اس کے برابر گاڑی میں بیٹھی میں اس کی کانوں میں چبھنے والی موسیقی کو بمشکل برداشت کر رہی تھی۔

''یہ ہیئر کٹ سوٹ کر رہا ہے تم پر'' والیوم ذرا سا کم کرتے ہوئے اس نے ایک نظر مجھ پر ڈال کر کہا۔

''تھینک یو'' میں نے متانت سے جواب دیا تو وہ ایک دم ہنس پڑا، اب کوئی تعریف کرے تو جواب میں شکریہ ہی ادا کرتے ہیں، میں نے کون سی ہنسنے والی بات کی تھی۔

''تم خود بھی بہت اچھی لگ رہی ہو'' میں نے اس کے لہجے میں چھپی شرارت محسوس کر لی تھی، اس لیے اب کی بار جواباً تھینک یو نہیں بولی، میں اس کی طرف سے نظریں ہٹائے کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف تھی۔

لال قلعہ میں اس کے ساتھ بیٹھ کر میں نے اس کے کہنے پر اپنی پسند کی دو تین چیزوں کا آرڈر کر دیا تھا، اس نے اپنی پسند کی چیزیں منگوائی تھیں، شرمانے ورمانے کا مجھے کوئی شوق نہیں مگر اب وہ اس طرح بالکل سامنے بیٹھا اتنے غور سے میری طرف دیکھے چلا جا رہا تھا تو میرا نروس ہو جانا لازمی تھا۔

''میں ایک چیز تو گاڑی میں ہی بھول آیا، تم بیٹھو میں دو منٹ میں آتا ہوں'' وہ کچھ یاد آ جانے پر اٹھتے ہوئے بولا تو میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ اتنی دیر سے خود کو لاپرواہ پوز کر کے قصداً ادھر اُدھر دیکھتے میں تنگ آ چکی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ واپس آ گیا اور آتے ہی اس نے ایک کارڈ اور خوبصورت سے رپینگ پیپر میں لپٹا گفٹ میری طرف بڑھایا، میں نے شکریہ کے ساتھ وہ دونوں چیزیں تھام لی تھیں، اس کا دل رکھنے کے لیے اخلاقاً کارڈ کھول کر دیکھا تو اس پر لکھے الفاظ پر میں تعجب سے ایک نظر اسے

اور پھر کارڈ پر لکھا ''Congratulation on your Graduation'' کو پڑھا۔

''تمہارے پاس ہونے کا گفٹ ذرا زیادہ ہی لیٹ ہو گیا، اصل میں جب تمہارا رزلٹ آیا میں جیوری بھگتانے میں مصروف تھا اس سے فارغ ہوا تو میں نے سوچا دیر تو ہو ہی گئی ہے اب پاس ہونے کا گفٹ تمہاری سالگرہ کے گفٹ کے ساتھ ہی دوں گا'' میرے کچھ کہے بغیر اس نے خود ہی وضاحت کر دی تھی، پھر ایک اور کارڈ میری طرف بڑھایا تو میں سمجھ گئی کہ وہ برتھ ڈے کارڈ ہو گا۔

''تم تو مجھ سے اپنی عمر بھی نہیں چھپا سکتیں، اس بات پر تو تمہیں ضرور افسوس ہوتا ہو گا''۔

اب میں اسے کیا بتاتی سارا افسوس اس عمر ہی کا تو تھا، اس کے سامنے تفصیل سے کیا پڑھنے بیٹھتی سو ایک نظر ڈال کر واپس لفافے میں ڈال دیا تھا۔

''ہاتھ آگے لاؤ'' پاس رکھی مخملی ڈبیا اٹھاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تو میں نے بجائے ہاتھ آگے کرنے کے جلدی سے دونوں ہاتھ ہی ٹیبل پر سے ہٹا لیے تھے، مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے برتھ ڈے گفٹ دے گا مگر یہ کہ گفٹ میں رنگ ملے گی جو وہ پہنائے گا بھی خود، وہ بھی اتنے سارے لوگوں کے بیچ۔

''عون! تم مجھے دے دو، میں خود پہن لوں گی'' میں نے ایک نظر اس پر ڈال کر سنجیدگی سے کہا تو وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''اپنی اس مہینے کی تقریباً ساری تنخواہ تمہارے تحفوں پر خرچ کر دی ہے، ابھی اپنے پاپا جتنا امیر تو ہوں نہیں، غریب سا بندہ ہوں، اب اگر تم نے اس غریب کا دل توڑ دیا تو یہ بے چارہ تو بس آہ بھر تا رہ جائے گا''۔ مجھے اس کی فضول ضد پر غصہ آ رہا تھا، وہ بدستور انگوٹھی ہاتھ میں لیے میرے ہاتھ بڑھانے کا منتظر تھا، میں نے بادل نخواستہ ہاتھ آگے کر دیا تھا، اس نے بڑی خوشی خوشی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انگوٹھی پہنا دی تھی، میں نے فوراً ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا، وہ شاید اسے میری شرم سمجھ رہا ہو گا جبکہ میرا غصے اور کوفت سے برا حال تھا، ایسی چھچھوری حرکتیں مجھے کبھی بھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔

''تم سوچ رہی ہو گی کہ میں نے تمہیں ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے نہ کارڈ دیا نہ پھول اور نہ ہی گفٹ۔ بے فکر رہو پھول گاڑی میں رکھے ہیں یہاں اتنا بڑا گلدستہ اٹھا لانا آکورڈ لگ رہا تھا اس لیے اسے گاڑی میں چھوڑ دیا''۔ اس کی بات پر میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا کہ پھول بھی لے ہی آتے، انہوں نے کیا بگاڑا تھا۔

''تم نے مجھے برتھ ڈے وش نہیں کیا'' خاموشی سے کھانا کھاتے کھاتے اس نے اچانک شکوہ کیا تھا، میں تھوڑی سی شرمندہ ہو گئی تھی۔

''سوری'' میں نے فوراً معذرت کی تھی اور پھر اسے سالگرہ کی مبارک باد دے دی تھی، وہ بڑی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا، میں اس سے نظریں چرائے چھری کانٹے کے ساتھ مصروف تھی۔

''صرف ہیپی برتھ ڈے، ہیپی ویلنٹائن ڈے نہیں؟'' اسی طرح مجھ پر نظریں جمائے وہ بڑے عجیب سے لہجے میں بولا تھا۔

میں نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا تھا، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ بڑی سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا، میں کچھ گڑبڑا سی گئی تھی، کیا اسے پتا چل گیا ہے کہ میں اس سے شرما نہیں رہی بلکہ بیزار ہو رہی ہوں، اس کا ساتھ مجھے خوشی فراہم نہیں کر رہا بلکہ کوفت اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہا ہے۔

''تم اس رشتے پر خوش ہونا مائلہ؟'' ابھی میں اس ادھیڑ بن میں ہی لگی ہوئی تھی کہ اسے ویلنٹائن ڈے وش کروں یا نہ کروں وہ بول اٹھا تھا، اس کے لہجے میں سنجیدگی اور تشویش کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا، یوں جیسے میرا جواب اس کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ بے اختیار فورک میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، دل یک دم اتنی تیزی سے دھڑکا تھا، وہ مجھ سے براہ راست یہ سوال پوچھ بیٹھے گا میں نے سوچا نہیں تھا۔

''یہ سوال کیوں پوچھا تم نے، ظاہر ہے میں خوش ہوں تب ہی تو یہاں اس وقت تمہارے ساتھ بیٹھی ہوں'' خود کو کمپوز کر کے میں نے بڑے دھیمے انداز میں کہا تھا۔

''میری طرف دیکھ کر کہو یہ بات، سر جھکا کر انسان اس وقت بات کرتا ہے جب جھوٹ بول رہا ہو'' وہ غصے سے بولا تھا۔

''میں جھوٹ نہیں بول رہی عون!'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو'' وہ چلایا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سخت غصے میں ہے اور بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کر رہا تھا، یہ کیا ہو رہا ہے، میں ہراساں ہو گئی تھی، ڈرتے ڈرتے میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بڑے الجھے ہوئے انداز میں بیٹھا تھا۔

''تم نے انکار کیوں نہیں کیا تھا، تم پر کسی نے زبردستی تو نہیں کی تھی، تم کہہ سکتی تھیں کہ تمہیں یہ رشتہ قبول نہیں'' اس کا لاپرواہ اور غیر سنجیدہ انداز بالکل غائب ہو چکا تھا، وہ بہت الجھا ہوا اور مضطرب لگ رہا تھا، اس کی سنجیدہ انداز میں کہی گئی اس بات پر میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''تم نے انکار کیا تھا؟'' بڑے تھکے ہوئے انداز میں اس نے مجھ سے پوچھا تھا، بے اختیار میری گردن ہل گئی تھی۔

''میں ابھی شادی وادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی تھی، میں نے مما کو منع کیا تھا''۔ یہ بات کہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی میں نے چھپانے کی کوشش کی تھی مگر اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ میری بات سے زیادہ میرے چہرے پر موجود تاثرات کو اہمیت دے رہا ہے۔

''تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا، تم صرف ایک فون کر دیتیں، میں سب کچھ خود ہینڈل کر لیتا، تمہاری اس خاموشی نے ہم دونوں کا کتنا بڑا نقصان کر دیا ہے، مائلہ! تم نے یہ بالکل بھی اچھا نہیں کیا'' وہ مجھ پر سے نظریں ہٹا کر بڑی آہستگی سے بولا، میں کچھ بھی نہیں بول پا رہی تھی بلکہ اب میرے بولنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا، میری آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں سے قطع نظر وہ جانے کے لیے اٹھ گیا، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا وہ میرے بیٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے مجھ سے قطعاً لاتعلق، میرے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی بڑے طوفانی انداز میں اسٹارٹ کر دی، انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے بہت جلدی مجھے گھر پہنچا دیا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے میری نظر پچھلی سیٹ پر پڑے سرخ گلابوں کے مہکتے بوکے پر پڑی تھی، اس پر لگے ہوئے کارڈ میں پتا نہیں میرے لیے کیا لکھا گیا تھا۔

میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ پا رہی تھی، خدا حافظ تک میرے منہ سے نہیں نکل سکا تھا، وہ عاشق نہیں شوہر تھا، چاہے میں نے اسے خوشی سے قبول کیا تھا یا ناخوشی سے مجھے رونا آ رہا تھا، بے تحاشا رونا، دل چاہ رہا تھا یہیں کھڑے کھڑے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دوں، سب کچھ کتنا غلط ہو گیا تھا، ایسا کبھی بھی نہیں ہونا چاہیے تھا، میرے بیل بجانے پر ایرج گیٹ کھولنے آیا تھا، وہ اسے اندر بلانے کے لیے کچھ کہنا چاہ رہا تھا جب بغیر کچھ کہے وہ ایک دم گاڑی اسٹارٹ کر کے چلا گیا تھا۔ ایرج نے اس کے اس طرح فوراً بغیر ملے یا کوئی بات کیے چلے جانے پر میری طرف حیرت سے دیکھا۔

''عون کو کچھ ایمرجنسی ہوگئی تھی، اس کے کسی دوست کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اس لیے تو ہم لوگ بھی اتنی جلدی واپس آ گئے ہیں''۔

پہلے ایرج اور پھر اندر آ کر مما اور روشنا سے بھی میں نے یہی بات کہی تھی، اصل بات بتانے کی میری ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ روشنا کی نظر میرے ہاتھ پر پڑی تو وہ باقی باتیں بھول کر میرے ہاتھ کو پکڑ کر دیکھنے لگی تھی، مما نے بھی بڑی محبت بھری نگاہوں سے میری انگلی میں اس ڈائمنڈ رنگ کو دیکھا تھا۔

''یہ والا کارڈ تو میں دیکھ سکتی ہوں نا'' روشنا مما کے سامنے ہی شروع ہوگئی تھی Congratulation والا کارڈ بڑے غور سے پڑھ کر وہ گفٹ دیکھنے لگی تھی، میں کمرے میں آئی تو روشنا بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئی تھی، اس سے اور کیا کیا باتیں ہوئیں، رنگ عون نے ہی پہنائی تھی یا تم نے خود پہن لی تھی! اسے اس قسم کی باتوں میں دلچسپی ہو رہی تھی، تھوڑی دیر اس کے سوالوں کا جواب دے کر میں نے بڑی مشکلوں سے ''روشنا! مجھے نیند آ رہی ہے'' کہہ کر جان چھڑائی تھی۔ اس کے نکلتے ہی میں نڈھال سی بیڈ پر گر گئی تھی، کچھ دیر پہلے ہونے والی تمام باتیں مسلسل میرے ذہن میں چکرا رہی تھیں۔ الجھن، گھبراہٹ، آنے والے وقت کی فکر، اب کیا ہوگا، آنکھوں سے متواتر آنسو بہے چلے جا رہے تھے۔ جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی ذہن الجھ رہا تھا۔ اپنے ہاتھ پر نظر پڑی تو بے اختیار اس کا خوشی سے جھلملاتا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ کیا وہ عون ہاشم علی جیسا دل پھینک شخص مجھ سے محبت کرتا تھا، کیسے اس کا چہرہ ایک دم بجھ سا گیا تھا، اس کے چہرے پر ایک دم اداسی بھی تو چھا گئی تھی۔

ساری رات روتے ہوئے گزر گئی تھی اگلے روز میں نے بہت چاہا کہ عون کو فون کروں، یہ کہوں کہ نکاح سے پہلے وہ مجھے پسند نہیں تھا مگر اب نئے رشتے میں بندھ کر میں اسے پسند کرنے لگی ہوں مگر کیا وہ میرے جھوٹ کا یقین کر لے گا؟ کتنی بار ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے کی کوشش کی اور پھر بغیر ملائے ہی ریسیور واپس رکھ دیا، وہ میری بات کا یقین نہیں کرے گا یہ خیال ہر دوسری بات پر حاوی ہو جاتا تھا۔

کاش میں نے نکاح ہونے سے پہلے ہمت کر کے اس کو ہی اپنے انکار سے آگاہ کر دیا ہوتا، کم از کم آج اس طرح کی صورتِ حال سے تو نہ دوچار ہو رہی ہوتی۔

دن پر دن گزر رہے تھے اور ہر گزرتا دن میری فکر میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا، ستارہ آنٹی اور بڑے پاپا کا رویہ حسب سابق تھا، وہ دونوں اکثر ملنے آ جایا کرتے تھے، ہر بار آمد پر میرے لیے کچھ نہ کچھ ساتھ ضرور لاتے تھے۔

عون پہلے کون سا ہمارے گھر بہت آتا جاتا تھا جو کوئی اس کے نہ آنے پر حیران ہوتا، روشنا سے ایک بار میں نے سرسری سے انداز میں اس کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''وہ بے چارہ ایگزیمز اور تھیسس میں مصروف ہے، تم فون کر لو تمہاری ناک نہیں کٹ جائے گی، ویسے کل ملا تھا مجھے پروفیسر نجمی کے آفس میں، سب کی خیریت پوچھ رہا تھا، تمہاری بھی'' تمہاری بھی پر خاص زور ڈالتے ہوئے وہ مسکرائی تھی۔

☆

عون کا رزلٹ آ چکا تھا، اس کی فرسٹ پوزیشن آئی تھی، اس کے B.Arch میں ایڈمیشن کے وقت میں نے جو کچھ سوچا تھا اس سب کے بر

جھنجھلائے ہوئے انداز میں میری طرف متوجہ ہوا تھا۔

''میں ایسا کچھ بھی نہیں چاہتی عون! پلیز تم اس طرح کی باتیں مت کرو''۔

اتنے بے تاثر اور غیر جذباتی انداز میں کی جانے والی اس کی باتوں نے مجھے اندر تک ہلا دیا تھا، ایسی کوئی انتہائی بات تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔ میری بھرّائی ہوئی آواز پر وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔

''کیا تمہیں ایسی زندگی گزارنا اچھا لگے گا جس میں محبت کا کوئی گزر نہ ہو، صرف سمجھوتا اور مصلحت ہو''۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے تھکے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھی اپنے ہاتھوں کو گھورتی رہی تھی۔

''میرے لیے ایسی زندگی گزارنا بہت مشکل ہے پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ دو سال بعد جب میں واپس آؤں تو ایک جھوٹی اور مصلحت آمیز زندگی گزارنے پر خود کو آمادہ کر سکوں''۔

عجیب آنچ دیتا لہجہ تھا اس کا۔ کیا محبت اس کے لیے اتنی اہمیت رکھتی تھی، میں اسے دل پھینک اور بھنورا صفت کہتی تھی، میرے نزدیک وہ ایک فلرٹ تھا، میرے دل کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی، اپنی کوئی بھی کیفیت میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، جب میں خود ہی نہیں سمجھ پا رہی تھی تو اس سے کیا کہتی، مجھے گیٹ پر اتار کر وہ فوراً ہی چلا گیا تھا۔

☆

آج کل میں یونیورسٹی خود گاڑی ڈرائیو کر کے لے آتی تھی۔ تین بجے میں یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تھی اور اب جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ دوپہر کے تین بجے سڑکوں پر اتنا زیادہ ٹریفک بھی نہیں تھا اسی لیے میری اسپیڈ بھی خاصی تیز تھی۔ کالج یونیفارم پہنے وہ لڑکی ایک دم میری گاڑی کے آگے آ گئی تھی، فوری طور پر بریک لگا دینے کے باوجود پوری رفتار سے دوڑتی گاڑی اس سے بری طرح ٹکرا گئی تھی۔

میں حواس باختہ سی گاڑی سے اتر آئی، خون میں لت پت وہ سڑک پر بے ہوش پڑی تھی، میں جلدی سے اس پر جھکی تھی، اس کے دل کی دھڑکن چیک کرتے ہوئے مجھے خود اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، ہاتھ پاؤں بری طرح کانپ رہے تھے۔ کتنے عرصے سے میں گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی اس سے پہلے کبھی کوئی معمولی سا حادثہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اسے خون میں نہایا دیکھ کر میری حالت غیر تھی۔ سفید یونیفارم جگہ جگہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے گاڑی میں اٹھا کر ڈالتے ہوئے میں محسوس کر رہی تھی کہ میرے اعصاب کسی بھی لمحہ میرا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں مگر مارے پریشانی کے مجھ سے گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو پا رہی تھی۔

''کیا کروں، کیا پاپا کو فون کروں؟''

میں نے خود سے پوچھا تھا۔ نہیں وہ بہت جلدی پریشان ہو جاتے ہیں اور مما وہ تو پاپا سے بھی زیادہ چھوٹے دل کی ہیں۔ برابر والی سیٹ پر رکھا موبائل اٹھاتے ہوئے میں نے ٹیلی فون انڈکس میں سے بغیر کچھ سوچے سمجھے عون کا موبائل نمبر نکال کر ملایا تھا۔ میں مما پاپا سب کو چھوڑ کر اسے ہی کیوں فون کر رہی ہوں، میں نہیں جانتی تھی۔

خلاف بڑے شاندار انداز میں اس نے انڈس ویلی سے پاس آؤٹ کیا تھا۔ مما، پاپا، روشنا اور ایرج اسے پاس ہونے کی مبارک باد دینے گئے تھے، سب کے بہت کہنے پر بھی میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔ مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ان آٹھ، نو ماہ کے دوران میں اس سے ایک بار بھی نہیں ملی تھی، اب وہ میرے ساتھ کیا کرے گا، کیا میری پسندیدگی کو انا کا مسئلہ بنالے گا اور شادی کے بعد اس بات پر مجھے ٹیز کرنے کی کوشش کرے گا، اس نے اس بارے میں کسی سے بھی کچھ نہیں کہا اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ وہ اس بات کو صرف اپنے تک ہی رکھنا چاہتا تھا۔

روشنا کہتی ہے اسے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں اور میں کون سی قلوپطرہ ہوں جو وہ مجھ پر مرتا ہوگا، وہ شادی کے بعد مجھے خوب اچھی طرح مزہ چکھائے گا، میرا بھیانک مستقبل دن رات مجھے ہولاتا رہتا تھا، کبھی لگتا کہ وہ مجھے اس طرح لٹکا کر رکھے گا، کبھی بھی رخصتی کے لیے نہیں کہے گا بلکہ امریکہ جا کر شاید وہیں شادی وادی بھی کرلے اور میں یہاں اس کے انتظار میں بیٹھی رہوں گی۔

اس کا ایڈمیشن ہوگیا تھا، آج کل وہ بوسٹن جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا، یونیورسٹی میں ایڈمیشن شروع ہوئے تو میں نے پاپا کے کہنے پر ایم ایس میں ایڈمیشن لے لیا تھا، میرا خیال تھا ستارہ آنٹی اس بات کو ناپسند کریں گی مگر انہوں نے بھی کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا۔

☆

اس رات عون کا بہت عرصے بعد ہمارے گھر فون آیا تھا اور وہ بھی میرے لیے۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں'' بڑا غیر جذباتی سا انداز تھا۔

وہ کیوں ملنا چاہتا ہے اور کیا بات کرنا چاہتا ہے، میں پریشان سی ہوگئی۔

''میں کل تمہیں یونیورسٹی سے پک کرلوں گا' تم کتنے بجے فارغ ہوگی۔'' میں نے ٹائم بتادیا تو اس نے ''ٹھیک ہے میرا انتظار کرنا'' کہہ کر بات ختم کردی تھی۔

اس کے برابر گاڑی میں بیٹھی میں تھوڑی دیر بعد اس کے سنجیدہ سے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک ڈرائیو کر کے اس نے گاڑی ایک بالکل ہی سنسان سی سڑک کے کنارے پر روک لی تھی۔

''بات کرنے سے پہلے میں تمہیں اس بات کا یقین دلا رہا ہوں کہ ہماری اس بات چیت کا ذکر کسی سے نہیں ہوگا لہٰذا تم بالکل سچ سچ اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر میرے سوال کا جواب دو''۔

میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔

''تمہیں پتا ہے نا میرا ایڈمیشن ہوگیا ہے، دو تین مہینے میں سمسٹر شروع ہوجائے گا تو میں چلا بھی جاؤں گا، جانے سے پہلے میں تم سے تمہارا فیصلہ جاننا چاہتا ہوں، اتنے دنوں میں یقیناً تم نے کوئی نہ کوئی فیصلہ کر ہی لیا ہوگا، کسی کے بھی ردِعمل کا سوچے بغیر تم وہ بات کہو جو تم چاہتی ہو، تم کہو گی تو میں اس رشتے کو ختم کردوں گا''۔ وہ بہت بے لچک اور مضبوط انداز میں بات کر رہا تھا۔

''خاموش رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، مائلہ! پہلے ہی تمہاری خاموشی نے ہم لوگوں کو خاصا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے'' وہ

''ہیلو'' اس کی آواز سنتے ہی میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

''عون! میری گاڑی سے ایک لڑکی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے'' مجھے خود نہیں پتا تھا کہ میں رو رہی ہوں۔

''تم کہاں سے بات کر رہی ہو مائلہ؟'' وہ فوراً بولا تھا۔

''خاتونِ پاکستان کالج کے پاس سے'' ایک نظر مڑ کر اس لڑکی پر ڈالتے ہوئے میں نے روتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''اچھا تم روؤ مت، میں آ رہا ہوں'' اس کے بات کرنے کے اسٹائل سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بات کرنے کے ساتھ چلتے ہوئے کچھ کام بھی کر رہا تھا۔

''پلیز تم جلدی آ جاؤ''۔ اس کی آواز سن کر پتا نہیں کیسی ڈھارس ہوئی تھی کہ مجھ سے گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی۔ وہ مسلسل مجھ سے بات کیے جا رہا تھا، مختلف ہدایتیں دے رہا تھا، کون سے ہاسپٹل جانا ہے یہ بھی مجھے اس نے بتایا تھا۔

''میں فون بند کر رہا ہوں، تم وہاں پہنچو، میں تمہیں گیٹ پر ہی ملوں گا''۔

میں انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی دوڑا رہی تھی۔ میرے ہاتھوں کسی انسان کی جان چلی جائے ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ وعدے کے مطابق ہاسپٹل کے گیٹ کے باہر ہی مل گیا تھا، اسے دیکھتے ہی مجھے اور رونا آنے لگا تھا۔ وہ جلدی سے چلتا ہوا میری گاڑی کے پاس آیا تھا۔ میں گاڑی سے باہر نکل آئی تھی۔ لڑکی پر ایک نظر ڈال کر اس نے تسلی دینے والے انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''Be brave'' بس یہ دو لفظ وہ مجھ سے بولا تھا۔ میرے برخلاف نہ اس کے چہرے پر پریشانی نظر آئی تھی اور نہ ہی وہ حواس باختہ ہوا تھا، بڑا پرسکون اور مکمل طور پر کمپوزڈ۔ ہم ہاسپٹل کے اندر آ چکے تھے، مجھے ایک بینچ پر بٹھا کر وہ یہاں وہاں بھاگتا پتا نہیں کیا کرتا پھر رہا تھا۔ مجھے بینچ پر بیٹھنے کے لیے کہتے ہوئے اس نے اس لڑکی کے گھر والوں کو فون کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کا بیگ گاڑی سے نکال کر میں نے اس میں سے اس کے گھر کا فون نمبر ڈھونڈ کر وہاں کال کر دی تھی اور اب بینچ پر بیٹھی مسلسل دعائیں کیے جا رہی تھی۔ میں روتے ہوئے خدا سے اس انجان لڑکی کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اس کے سر میں سے جس طرح خون کا فوارہ نکلا تھا وہ مجھے ابھی تک دہشت میں مبتلا کیے ہوئے تھا، پتا نہیں اس کے کہاں کہاں چوٹیں آئی تھیں۔ میں نے تو کبھی کسی کو سوئی تک نہیں چبھوئی اور آج۔ جبکہ آج تو واقعی بہت بڑی بات ہو گئی تھی، اس جگہ تو شاید کوئی مضبوط اعصاب کی لڑکی بھی میری ہی طرح ری ایکٹ کر رہی ہوتی۔

عون مجھے یہاں بٹھا کر خود پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا، میں اس کی واپسی کی منتظر تھی، وہ آئے اور آ کر کہے کہ ''خطرے کی کوئی بات نہیں، معمولی سی چوٹیں تھیں، وہ لڑکی اب بالکل ٹھیک ہے''۔ کافی دیر بعد عون مجھے کوریڈور میں نظر آیا مگر وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ پولیس یونیفارم میں دو افراد بھی تھے۔

''پولیس؟'' میں نے دہل کر سوچا تھا۔ اتنی دیر میں ابھی تک یہ بات تو میرے ذہن میں آئی بھی نہیں تھی کہ یہ پولیس کیس تھا۔ یا اللہ! میں نئے سرے سے کانپ اٹھی تھی۔ جتنی محفوظ اور پرسکون زندگی میں نے گزاری تھی وہاں پولیس، تھانہ، عدالت سب صرف ڈراموں اور فلموں ہی میں

دیکھا جاسکتا ہے۔

وہ لوگ میرے پاس نہیں آرہے تھے بلکہ دور کھڑے آپس میں بات کررہے تھے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں ان لوگوں کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی تھی، عون غصے میں اور جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا۔

''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ ایکسیڈنٹ بالکل اتفاقیہ ہوا ہے، اس لڑکی کو جان بوجھ کر مارنے کی میری کوئی نیت نہیں تھی، اگر مجھے فرار ہونا ہوتا تو اسے خود ہاسپٹل لے کر نہ آیا ہوتا، اس کے گھر والوں کو خود فون کر کے انفارم نہیں کرتا، ایکسیڈنٹ کے وقت میری کزن میرے ساتھ تھی اور وہ اس حادثے کو دیکھ کر بہت زیادہ ڈر گئی ہے، اگر مجھے خود اسے گھر چھوڑنے کے لیے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی تو کم از کم مجھے ایک فون کال کی اجازت تو مل سکتی ہے۔ میں اسے گھر بھجوادوں، بے فکر رہیں، میں کہیں بھاگ نہیں رہا''۔

یہ عون کیا کہہ رہا ہے، وہ لوگ آپس میں کوئی اور بات بھی کررہے تھے مگر میری سمجھ میں اب ان لوگوں کی کوئی بات نہیں آرہی تھی، میں ایک دم بینچ پر سے کھڑی ہوگئی تھی، اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر میں خود بھی تیز تیز اس کی طرف بڑھی تھی۔

''تم نے جھوٹ کیوں بولا عون؟'' وہ میرا سوال نظر انداز کر کے مجھے واپس بینچ کی طرف لے آیا اور بولا ''تم گھر جاؤ، احمر کو میں نے فون کر کے بلایا ہے، وہ تمہیں گھر چھوڑ آئے گا''۔ اس کا لہجہ بہت دوٹوک قسم کا تھا۔

''کیوں جاؤں میں گھر، ایکسیڈنٹ مجھ سے ہوا ہے تو اس کی سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیے'' میں نے بہت خفگی سے اس کی سمت دیکھا تھا، شاید میری آواز بھی تھوڑی بلند ہوگئی تھی تب ہی وہ ایک دم سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''یہاں پر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، اس لڑکی کو معمولی چوٹیں آئی ہیں، وہ جلد ہی ہوش میں آجائے گی، تم اتنی ٹینس لگ رہی ہو اس لیے میں تمہیں گھر جانے کو کہہ رہا ہوں''۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو، وہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے اگر وہ ٹھیک ہوتی تو تم کبھی بھی مجھے بچانے کے لیے جھوٹ نہ بولتے، میں ابھی پولیس کو.....''۔ میری غصے میں کہی گئی بات کو اس کی چیخ نے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''جب میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم گھر جاؤ تو تمہاری سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آرہی'' وہ اتنی زور سے چلایا تھا کہ آس پاس سے گزرتے کئی لوگوں نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا تھا۔

مجھے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''احمر تم آگئے'' سیڑھیوں ہی پر اسے اپنا دوست نظر آگیا تھا۔ ''مائلہ کو گھر پہنچا کر تم واپس یہیں آجانا''۔

وہ مجھے اور احمر کو سیڑھیوں پر کھڑا چھوڑ کر واپس مڑ گیا تھا۔ مجھے بے تحاشا رونا آرہا تھا، اسے مصیبت میں ڈال کر خود اطمینان سے گھر چلی جاؤں کیا میرا ضمیر مجھے اس بات کی اجازت دے سکتا تھا، میں بے اختیار اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

''عون!'' میرے پکارنے پر وہ پیچھے مڑا تھا۔ ''ایک رشتہ ہے نا ہمارے درمیان ایسا جس کے ناتے میں تمہیں کسی بات کا حکم دے سکتا ہوں، تم

سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو'' وہ بہت آہستگی اور دھیمے سے انداز میں بولا تھا۔

''لیکن عون.....!'' میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر وہ میری بات کاٹتے حکمیہ انداز میں بولا۔

''تم اس وقت مجھے میرا یہ حق استعمال کرنے دو، بغیر کوئی سوال کیے''۔

''چلیں'' پیچھے کھڑا احمر بھی ہم لوگوں کے پاس ہی آ گیا تھا۔ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی مگر جا رہی تھی۔ اس نے اپنے حق کی بات کس وقت اور کس انداز میں کی تھی۔ سارا راستہ میں روتی رہی تھی، احمر مسلسل مجھے سمجھا رہا تھا، تسلی دے رہا تھا۔ مجھے گیٹ پر اتار کر وہ واپس ہاسپٹل چلا گیا تھا۔

مما میرے دیر ہو جانے پر ادھر سے ادھر پریشان پھر رہی تھیں۔ پاپا کو فون کر کے آفس سے بلوا لیا گیا تھا۔ جس طرح میں روتی ہوئی گھر میں گھسی اس سے سب اور بھی پریشان ہو گئے تھے۔ میں نے روتے روتے ساری بات بتا دی تھی۔

''عون نے سارا الزام اپنے اوپر لے لیا، اگر وہ لڑکی نہیں بچی پھر کیا ہو گا؟'' میں نے روتے ہوئے مما سے کہا تھا جو خود بھی بہت پریشان سی لگ رہی تھیں۔

''عون کچھ بھی کہتا رہے، میں پولیس کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی۔ بتا دوں گی کہ وہ مجھے بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے'' میں مما کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔

پاپا اسی وقت ہاسپٹل چلے گئے تھے۔ مما مجھے دلاسا دے رہی تھیں مگر ان کے چہرے پر چھایا تفکر مجھے مزید ہراساں کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں مما نے پاپا کو فون کیا تھا، میں پاس کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی، وہ بہت فکرمندی سے مما سے کہہ رہے تھے۔

''دعا کرو، لڑکی کی حالت ٹھیک نہیں ہے، اس کے سر میں بہت شدید چوٹیں آئی ہیں، ڈاکٹرز زیادہ پرامید نہیں لگ رہے''۔ فون بند کرتے ہی مما وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی تھیں۔ میں بھی جیسے کسی سکتے کی کیفیت سے باہر نکلی تھی۔ یہ وقت تو دعا کا تھا۔ بیٹھ کر رونے اور پریشان ہونے سے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہونا تھا۔ ہمارے گھر میں سوگ کی سی کیفیت تھی۔

ساری رات میں، مما اور روشانہ دعائیں مانگتے رہے تھے۔ مما نے بیچ بیچ میں کئی بار پاپا کو فون کیا تھا۔ ہر بار یہی پتا چلتا تھا کہ وہ آئی سی یو میں ہے اور اسے ہوش نہیں آ رہا ہے۔ میری ذرا سی غفلت کتنے لوگوں کو پریشان کرنے کا باعث بنی تھی۔ صبح نو بجے کے قریب پاپا کا فون آیا تھا، وہ خوشی سے بھرپور آواز میں اس کے ہوش میں آ جانے کی نوید سنا رہے تھے۔ اس کے بہت چوٹیں آئی تھیں، بہت سا خون ضائع ہو گیا تھا، پاؤں میں فریکچر ہو گیا تھا مگر وہ زندہ تو تھی، بغیر کسی معذوری کے۔ اس کی یہ چوٹیں، یہ فریکچر سب ٹھیک ہو جائیں گے اور وہ پہلے ہی کی طرح نارمل زندگی گزارے گی۔ میری وجہ سے اسے اور اس کے گھر والوں کو کوئی بہت بڑا صدمہ اور دکھ نہیں اٹھانا پڑا۔ میں رو رو کر اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔ کتنی بڑی آزمائش میں سے مجھے میرے اللہ نے نکال دیا تھا۔

کل دوپہر سے لے کر آج صبح نو بجے تک کا یہ سخت ترین وقت شکر تھا کہ ٹل گیا تھا۔ اس کے علاج معالجے کی مکمل ذمہ داری پاپا نے لے لی

تھی۔گھر واپس آکر پاپا مما کے پوچھنے پر وہاں کی تمام باتیں تفصیل سے بتا رہے تھے۔

''آج سے تمہاری ڈرائیونگ پر پابندی ہے'' مما نے عون کی بھاگ دوڑ، پاپا کی پریشانی سب کا احوال سنتے سنتے اچانک مجھ سے سرد انداز میں کہا تھا۔

''اب اسے ڈانٹو تو مت۔وہ خود بھی تو بہت پریشان رہی ہے'' پاپا نے میری طرف داری کرنے کی کوشش کی تو مما نے انہیں بھی ٹوک دیا۔

''آپ بے کار میں اس کی وکالت مت کریں، کتنا سب کا خون خشک کروایا ہے اس نے، اور بے چارہ عون، اسے بھی کتنا پریشان کیا ہے''۔

مجھے ان کی ڈانٹ ڈپٹ بالکل بھی بری نہیں لگ رہی تھی بلکہ مما مجھے اس سے پہلے کبھی اتنی اچھی لگی ہی نہیں تھیں جتنی آج۔

''مما آپ صحیح کہتی تھیں، آپ نے واقعی میرے لیے ایک بہترین انسان پسند کیا ہے'' میں دل ہی دل میں ان سے مخاطب تھی۔وہ مجھے ڈانٹ کھا کر ہنستا دیکھ کر اور غصے میں آگئی تھیں۔

''ڈھٹائی دیکھو، میں ڈانٹ رہی ہوں اور محترمہ یوں ہنس رہی ہیں جیسے انہیں لطیفے سنائے جا رہے ہوں'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی تھیں اور میں نے ہنستے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

''مما! آپ اس دنیا کی سب سے اچھی مما ہیں''۔روشنا اور پاپا میرے اسٹائل پر ہنس پڑے تھے جبکہ مما نے اپنے لبوں پر آتی بے ساختہ مسکراہٹ کو بمشکل پیچھے دھکیلا تھا۔

میں اسے امیچور رکھتی تھی، وہ غیر سنجیدہ ہے، لاابالی ہے، ایسا شخص مجھے کیا تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔یہ تھے میرے خیالات عون ہاشم علی کے بارے میں۔اور میں خود؟ میں خود کیا تھی، کیا میں بہت میچور اور سمجھ دار تھی۔نہیں میں بالکل بھی میچور نہیں تھی، بچپنا اور ناسمجھی تو مجھ میں تھی اس میں تو نہیں۔وہ تو بہت ذمہ دار اور میچور تھا۔اس نے سوچ سمجھ کر مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور جسے اس نے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا اس کا ساتھ وہ پوری دیانت داری کے ساتھ نبھانے کے لیے تیار تھا۔امیچور تو میں تھی جو خوابوں کی دنیا میں رہا کرتی تھی۔اونہہ آئیڈیل۔یہ آئیڈیل آخر کیا بلا ہے جو ہم لڑکیاں اسی ایک لفظ کو اپنی زندگی کی اساس بنا لیتی ہیں۔میرا آئیڈیل بڑی عمر کا گریس فل سا مرد، جو پختہ سوچ کا مالک ہو، جو زندگی میں کبھی کوئی مشکل وقت پڑنے پر مجھے سہارا دے سکے، جس کے فیصلے بروقت اور دوٹوک ہوں، جس کے ساتھ ہونے پر میں خود کو محفوظ سمجھوں۔

عون مجھے اسی لیے تو اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ میرا ہم عمر ہے، اس کی اچھل کود، گانا بجانا میں اس سب سے نفرت کرتی تھی۔اس بہت اچھے انسان کو اپنی ایک احمقانہ ضد کے پیچھے گنوانے جا رہی تھی۔میرے آئیڈیلزم نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔اپنے خوابوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگتے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ سامنے موجود سچائی میرے خوابوں سے کہیں حسین ہے، وہ میرے خوابوں میں آنے والے سے بھی بڑھ کر اچھا ہے، اتنا اچھا کہ مجھے خود پر فخر ہو رہا ہے کہ ایسا شخص میری زندگی میں شامل ہے جو میری طرف آئی کوئی بھی بلا اپنے سر لینے کو تیار ہے، میری طرف آتی کوئی بھی مصیبت وہ خود پر لے لیتا ہے۔اسے خود سے بڑھ کر میری فکر ہے۔اس نے کبھی میرے ساتھ محبت کے بلند بانگ دعوے نہیں کیے مگر اپنے عمل سے اپنی محبت کی سچائی اور شدت کو ضرور ظاہر کر دیا ہے؟ کیا اس سے بڑھ کر کوئی مجھے تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔فرض کیا مجھے میرا آئیڈیل مل جاتا۔کوئی مشکل

وقت پڑتا اور وہ میرا ساتھ نہ دے پاتا پھر؟ یا ساتھ تو ہوتا مگر میری کسی غلطی کی سزا کو خود بھگتنے کے لیے تیار نہ ہوتا، مجھ پر آیا الزام خود پر نہ لیتا پھر میں کیسا محسوس کرتی، کیا اس وقت مجھے تحفظ کا احساس ہو سکتا تھا؟ عون! تم میرے لیے اللہ کی طرف سے انعام ہو۔ میرے مما، پاپا کی میری خوشیوں کے لیے مانگی جانے والی کوئی دعا ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ پر فخر ہے۔ عون! محبت تو شاید میں تم سے بہت پہلے ہی سے کرنے لگی تھی۔ بس صرف یہ تھا کہ میں خود اپنے آپ سے جھوٹ بولتی رہی۔ اپنے احمقانہ خوابوں میں الجھ کر اس محبت کو کبھی دریافت ہی نہ کر پائی جو میرے دل میں تمہارے لیے پیدا ہو چکی تھی۔ یہ محبت ہی تو تھی عون جو میں آج تک تمہاری پہنائی یہ انگوٹھی اپنی انگلی سے نہیں نکال پائی۔ تمہارا انگوٹھی پہنانا جو مجھے بہت عامیانہ پن لگا تھا مگر میں اسے کبھی اتار نہ سکی۔

''مجھے تم سے محبت ہے'' یہ جملہ کتنا تھرڈ کلاس، کتنا چیپ اور بے ہودہ لگتا ہے مگر آج جس سے میں یہ جملہ بولنے جا رہی ہوں اس سے یہ بات بولنے میں مجھے شرمندگی محسوس نہیں ہو رہی۔ پہلے ہی میں اپنی نادانی اور کم فہمی کے سبب اسے خود سے بہت دور کر چکی ہوں۔ مجھے اسے واپس اپنی طرف لانا ہے، خود اس کے پاس جا کر۔

☆

پاپا آفس کے کام سے اسلام آباد جا رہے تھے، رات تک میں نے کسی کو بھی اپنے صبح کے پروگرام سے آگاہ نہیں کیا تھا، مجھے تیار ہو کر نیچے آتا دیکھ کر مما اور پاپا دونوں ہی حیران ہوئے تھے۔

''اتنی صبح صبح کہاں جانا ہے بیٹا؟'' بریف کیس میں اپنی فائلز رکھتے ہوئے پاپا نے تعجب سے پوچھا تھا۔

''مجھے بڑے پاپا کے گھر جانا ہے، آپ مجھے وہاں ڈراپ کرتے ہوئے چلے جائیے گا''۔

پاپا نے ایک نظر مجھے اور ایک نظر وال کلاک کو دیکھا جو چھ بجا رہی تھی کہ آج کے دن کی مبارک باد اسے سب سے پہلے میں دینا چاہتی ہوں۔ آج اسے برتھ ڈے وش کرنے والی سب سے پہلی ہستی میں کہلائی جانا چاہتی ہوں بلکہ آج ہی کیوں، آئندہ آنے والی بے شمار سالگرہوں پر بھی اسے سب سے پہلے میں وش کرنا چاہتی ہوں۔ اتنے دن اسی لیے تو رکی رہی تھی۔ مجھے آج کے دن کا انتظار اس سے پہلے کبھی اتنی شدتوں سے نہیں ہوا تھا۔

پاپا بدستور میری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے جبکہ مما کی سمجھ میں شاید ساری بات آ گئی تھی۔ وہ پاپا کے بالکل پاس ہی کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آہستہ سے پاپا سے کچھ کہا تھا، ان کی بات سنتے ہی پاپا مسکرا دیئے تھے۔

''چلو!'' مجھ سے مزید کوئی سوال کیے بغیر انہوں نے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ کمرے میں سے پھول اور کارڈ وغیرہ اٹھا کر میں ان کے پیچھے بھاگی تھی۔ بڑے پاپا گیٹ پر ہی مل گئے تھے۔ وہ ابھی ابھی واک کر کے واپس آئے تھے، پاپا سے دعا سلام کر کے وہ میری طرف متوجہ ہوئے تھے، انہوں نے مجھ سے صبح صبح آنے پر کوئی سوال نہیں کیا تھا، میرے ہاتھوں میں موجود پھولوں نے کسی بھی قسم کے سوال جواب کی گنجائش ہی ختم کر دی تھی۔

وہ باہر لان میں موسم انجوائے کر رہے تھے اور میں سیدھی اندر آ گئی تھی۔ بہاروں کا یہ موسم مجھے اپنے اندر باہر ہر طرف پوری شدتوں سے محسوس ہو رہا تھا۔ ستارہ آنٹی تخت پر بیٹھی تسبیح کرنے میں مصروف تھیں، اپنے وظیفے کے دوران وہ مجھ سے بات چیت تو نہیں کر سکتی تھیں البتہ پاس بلا کر

پیار ضرور کیا تھا۔ گھر میں اور سب نے مجھے اس کے لیے پھول لاتے دیکھ لیا مگر مجھے اپنے دیکھ لیے جانے پر کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ یہ پھول میں اس کے لیے لائی تھی جس میں اور مجھ میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہماری پسند، ناپسند، عادتیں سب ایک دوسرے کی ضد ہیں اتنے سارے اختلافات کے باوجود ایک چیز ہے جو ہم میں مشترک ہے جو ہمیں ساری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر رکھ سکتی ہے اور وہ ایک چیز محبت ہے اور یہی ایک چیز دوسری ہر چیز سے بڑھ کر اہم ہے۔ ہم میں سب کچھ مشترک ہوتا مگر محبت نہ ہوتی کیا اس سے یہ بات بہتر نہیں کہ محبت ہے اور کچھ نہیں۔ میں دروازے پر دستک دیے بغیر اندر آ گئی تھی، وہ بیڈ پر آڑا ٹیڑھا پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔ کمپیوٹر آن تھا، غالباً کمپیوٹر پر ڈرائنگ بناتے بناتے کچھ دیر ستانے کے ارادے سے لیٹ گیا ہوگا، ورنہ کمپیوٹر آن چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ دیر میں اس کی بنائی ڈرائنگ بغور دیکھتی رہی تھی، غالباً کسی گھر کی انٹیریئر ڈیزائننگ کی جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر فارغ ہوئی عون کی طرف متوجہ ہوئی۔ اف یہ عون کتنے بے تکے انداز میں سوتا ہے۔ تکیہ، کمبل دور پڑے ہوئے تھے، اے سی چلائے فروری کے مہینے کو غالباً جون جولائی سمجھا جا رہا تھا۔

''آئندہ ہونے والی لڑائیوں میں سے ایک لڑائی اے سی چلائے جانے پر بھی ہونی ہے'' میں نے خود سے کہا تھا۔

پھول اور کارڈ اس کے سرہانے رکھ کر میں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ٹائم پیس اٹھایا اور اس میں الارم لگا کر دوبارہ اسے وہیں رکھ دیا۔ میرے رکھتے ہی الارم زور و شور سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔ الارم بھی ایسا پسند کیا تھا موصوف نے جیسے مردے مل کر کورس گا رہے ہوں مگر اس وقت اسے سن کر میں مسکرائی تھی۔ ادھر اُدھر ہاتھ مار کر اس نے تکیہ اٹھایا اور اپنے سر پر رکھ لیا تھا مگر وہ شور ایسا نہ تھا کہ تکیہ سے دب سکتا۔ دو چار کروٹیں اس نے بے چینی کے عالم میں لیں جیسے اپنے ڈسٹرب کیے جانے پر بہت جھنجھلا رہا ہو۔ مجھ پر ابھی تک اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔ اپنے اٹھائے جانے کا سارا غصہ بے چارے ٹائم پیس پر نکالا گیا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر جو وہ سیدھا ہوا تو نظریں سیدھی مجھ پر پڑی تھیں۔

ایک سیکنڈ کے لیے تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا رہا تھا۔ بے یقینی اور حیرت کے سبب اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکل سکا تھا۔ لیٹے لیٹے وہ تحیر سے میری سمت دیکھے جا رہا تھا پھر ایک دم سے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''گڈ مارننگ!'' میں بیڈ سے کچھ ہی فاصلے پر رکھی راکنگ چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ میرے گڈ مارننگ کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''Many happy returns of the day'' میں نے گفٹ اور کارڈ اس کی طرف بڑھائے تھے۔ اتنی دیر میں پہلی بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔ گفٹ اور کارڈ میرے ہاتھ سے لیتے لیتے اس کی نظر اپنے پاس رکھے پھولوں پر بھی پڑ گئی تھی اور پھولوں کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی تھی۔

''اتنی صبح صبح مبارک باد؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''ہاں، اس لیے کہ آج تمہیں سب سے پہلے میں وش کرنا چاہتی تھی'' میں نے اطمینان سے کہا تھا۔ ''پچھلی سالگرہ پر میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا تھا، تمہیں وش تک نہیں کیا تھا'' میں نے شرمندگی سے اعتراف کیا تو وہ فوراً بولا۔

''اچھا تو اپنے پچھلے سلوک کے ازالے کے لیے صبح صبح تشریف لائی گئی ہے''۔

''عون! میں تم سے اپنی پچھلی ہر بدتمیزی کے لیے معذرت کرنے آئی ہوں'' میں نے اس کا طنزیہ لہجہ نظر انداز کر کے لجاجت سے کہا تھا۔

''تم نے میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی، تمہیں معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر میں تمہیں پسند نہیں تو اس میں بدتمیزی کی تو کوئی بات نہیں، ہم زبردستی کسی کے دل میں اپنی محبت کیسے پیدا کروا سکتے ہیں، مجھے تم سے بس اتنی سی شکایت ہے کہ تم نے اس رشتے کو قبول ہی کیوں کیا تھا، مجھے یہ بات ڈسٹرب کرتی ہے کہ تم نے مجھے اپنے دل کی خوشی کے ساتھ قبول نہیں کیا، میں تم پر مسلط کیا گیا ہوں'' وہ اسی سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوا تھا۔

''ایسا نہیں ہے عون!'' میں آگے کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر اس نے میری بات کاٹ دی تھی۔

''پلیز مائلہ! میرے ساتھ محبت کا کوئی جھوٹا اظہار مت کرنا، یہ بات میں برداشت کر گیا کہ تم نے مجھے بہ حالتِ مجبوری قبول کیا ہے مگر یہ بات برداشت نہیں کر پاؤں گا کہ تم مجھ سے جھوٹی محبت جتاؤ، تمہاری ناپسندیدگی کو میں اپنی انسلٹ نہیں سمجھتا مگر اس بات کو ضرور اپنی انسلٹ سمجھوں گا اور کوئی میری انسلٹ کرے میں یہ بات برداشت نہیں کر سکتا۔''

اس کا لہجہ بہت دوٹوک اور ناراضی لیے ہوئے تھا۔ اب میں اسے اپنا یقین کیسے دلاؤں، میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ کیسے بتاؤں کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی، مجھے واقعی اس سے بہت شدید محبت ہو گئی ہے۔

''میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، اس روز جو کچھ ہوا وہ سب کرنا میرا فرض تھا اگر میں نے تمہاری ذمہ داری قبول کی ہے تو اسے ہر حال میں نبھانا مجھ پر فرض ہے''۔

وہ کتنے غلط انداز میں بات کو سوچ رہا تھا، میں کیا اس کے احسان کا بدلہ چکانے آئی تھی، اس کی بدگمانی نے مجھے بہت دکھی کر دیا تھا۔ کتنے خشک انداز میں وہ ذمہ داری اور فرائض کی باتیں کر رہا تھا یوں جیسے ہم میں اور تو کوئی رشتہ تھا ہی نہیں۔

''کوئی فرض ورض ادا نہیں کر رہے تھے تم، صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں میری بہت پرواہ ہے اس لیے تم میرا خیال رکھ رہے تھے، اگر اپنے منہ سے یہ بات کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے تو تمہاری ناک نہیں کٹ جائے گی''۔

میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے اور میں روتے ہوئے چڑچڑے انداز میں بولی تھی۔ دوپٹے سے آنکھیں اور ناک رگڑتے مجھے اپنے رونے اور اس کے اجنبی انداز پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

''یہ لو'' اس نے ٹشو پیپر باکس میری طرف بڑھایا تھا، میں نے بجائے ٹشو لینے کے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتی نگاہوں سے میری سمت دیکھ رہا تھا۔

''تم سمجھ رہے ہو میں تمہارے احسانوں کے بوجھ تلے دب کر احساسِ ممنونیت کے زیرِ اثر تم سے محبت کا اظہار کرنے آئی ہوں''۔ میں نے خفا خفا سی نظریں اس پر ڈالیں وہ جواباً کچھ بھی نہیں بولا، اس بات سے اور بھی دل برداشتہ ہو گئی تھی۔

''ایک بے وقوفانہ سا آئیڈیلزم تھا جو میرے ذہن پر سوار رہا کرتا تھا۔ میرا آئیڈیل مجھ سے عمر میں بہت بڑا، کوئی سوبر اور میچور سا آدمی۔ تم

شاید یہ سمجھتے ہو کہ میں کسی اور کو پسند کرتی تھی اور اسی لیے تمہارے لیے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی لیکن تم بالکل غلط سمجھتے ہو عون! مجھے تم بہت پہلے سے اچھے لگتے ہو، بس اپنے احمقانہ خیالوں کی دنیا میں رہتے ہوئے میں خود سے بھی اس بات کا اعتراف نہیں کر پاتی تھی کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ اس کا ثبوت یہ رنگ ہے، یہ میں تمہیں دکھانے کے لیے آج پہن کر نہیں آئی ہوں بلکہ اسی روز سے یہ میری انگلی میں جوں کی توں موجود ہے۔ ہاں اس روز جس طرح تم نے میرا ہر الزام خود پر لے لیا تو مجھے ایک دم احساس ہوا کہ تم میرے آئیڈیل سے بھی بڑھ کر اچھے ہو، میں تو بس خود اپنی ہی ضد میں اس بات کو قبول نہیں کرتی تھی، خود اپنے آپ سے ہار مان جانے کے لیے تیار نہیں تھی مگر آج میں تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف کرنے آئی ہوں کہ تم میرے لیے اس دنیا کے سب سے اچھے انسان ہو، مجھے اس بات پر فخر محسوس ہوتا ہے کہ تم میری زندگی میں شامل ہو، تم واقعی بہت اچھے ہو عون!''۔

میں اسے ہر صورت اپنا یقین دلانا چاہتی تھی، اس کی ہر بدگمانی دور کرنا چاہتی تھی۔ بات ختم کر کے اس کی طرف اپنی بات کا اثر دیکھنے کے لیے نظر ڈالی تو وہ بڑی شرارت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''اور تعریفیں کرو نا میری، تمہارے منہ سے اپنی تعریفیں سن کر بہت مزہ آ رہا ہے'' میں ایک دم جھینپ سی گئی تھی۔

''زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے، خود تو اپنی انا کا پرچم اونچا کیے فرض اور ذمہ داری کا راگ الاپ رہے ہیں اور مجھ سے توقع رکھی جا رہی ہے کہ میں قصیدوں پر قصیدے پڑھتی چلی جاؤں'' اتنی دیر سے اس کی یہی بات تو مجھے مسلسل غصہ دلائے جا رہی تھی۔

''تم تو اچھے خاصے رومینٹک قسم کے خیالات رکھتی ہو، میں خوامخواہ فکر مند تھا کہ میرے جیسے رومینٹک اور آرٹسٹک اپروچ رکھنے والے بندے کو تم میں کیا چارم نظر آیا ہے''۔ اس کے ان کمنٹس پر مجھے اور بھی غصہ آیا تھا۔ وہ میری ناراض شکل پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

''اس روز تم سے فون پر بات کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ تمہاری آواز میں وہ گرم جوشی اور خوشی محسوس نہیں ہو رہی جو ہمارے نئے رشتے کے حوالے سے ہونی چاہیے تھی، پھر میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر ٹال دیا تھا مگر اگلے روز جب ہم ڈنر کرنے گئے تو تمہاری شکل دیکھتے ہی مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ میں مسلسل تمہارے تاثرات نوٹ کر رہا تھا، کتنی دیر تک خود کو جھٹلا سکتا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ تم اس رشتے پر خوش نہیں ہو اور یقین کرو اس بات نے مجھے بہت ہرٹ کیا تھا۔ اس روز جتنا میں ہرٹ ہوا جیسا میں نے دکھ محسوس کیا اس سے پہلے کبھی بھی نہیں کیا تھا۔ اس بات پر نہیں کہ تم مجھے پسند نہیں کرتیں بلکہ اس بات پر کہ میں زبردستی تمہاری زندگی میں شامل ہو گیا تھا، مجھے تم پر بھی بہت غصہ آیا تھا''۔

اچانک سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میں اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''جب تم اپنے پیپرز کی وجہ سے یہاں آ کر رہی تھیں اور مجھ سے پرنٹر پر کام کرنے کی اجازت مانگی تھی، میں صرف مہمان سمجھ کر تمہارے ساتھ اچھی طرح بات چیت کر رہا تھا، مجھے اندازہ تھا کہ تم بچپن کی باتوں کو اب تک دل سے لگائے بیٹھی ہو اور ان باتوں پر تم ہم لوگوں سے ناراض بھی ہو، صرف تمہاری غلط فہمی دور کرنے اور اپنائیت کا احساس دلانے کے لیے میں نے تمہارا اسائنمنٹ ٹائپ کرنے کی بات کی تھی۔ میرا خیال تھا اسائنمنٹ میرے حوالے کر کے تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ گی مگر تم تو وہیں جم کر بیٹھ گئی تھیں، ٹائپ کرتے کرتے جو میری نظر اتفاقاً تم پر پڑی تو تم بے خبر سو رہی تھیں۔ اب چاہے تم لڑکیوں سے دوستی کے حوالے سے مجھ سے کتنی بھی مشکوک رہتی ہو مگر میرے بیڈ روم میں اتنے دھڑلے سے گھس آنے والی تم پہلی

لڑکی تھیں اور اس وقت میرے دل نے فیصلہ کیا تھا کہ اس پہلی لڑکی کو ہی آخری لڑکی بھی ہونا چاہیے''۔

وہ کھل کر مسکرایا تھا۔ اس کی بات پر میں بھی مسکرا دی تھی۔

''ویسے تم جان بوجھ کو وہاں سوئی تھیں، ہے نا؟''

مجھے پتا تھا وہ مجھے چھیڑ رہا ہے مگر میں پھر بھی چڑ گئی تھی۔

''میں صرف اس وجہ سے وہاں بیٹھی رہی تھی کہ تم میرا کام کر رہے تھے، تمہیں کام سونپ کر خود کمرے میں چلا جانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا''۔

وہ میری وضاحت کا نوٹس لیے بغیر مسکراتا رہا، اس طرح جیسے اسے میری کسی وضاحت پر کوئی یقین نہیں۔

''تمہارے خیال سے میں جھوٹ بول رہی ہوں'' میں جھنجھلائی تھی۔ وہ میری بات کا جواب دیئے بغیر پاس رکھا بکے اٹھا کر دیکھنے لگا تھا، اس کا اچھی طرح معائنہ کر کے وہ کارڈ کھول کر پڑھنے لگا تھا۔

''یہ تم میرے لیے ویلنٹائن ڈے پر کارڈ لائی ہو یا کوئی ڈاکٹر کا نسخہ۔ اتنا فضول اور ان رومینٹک۔ اتنا زیادہ سنسرڈ اظہارِ محبت میں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے''۔

مجھے احساس ہوا کہ کام کی ساری بات ہو چکی ہے اور اب عون ہاشم علی نے پٹڑی سے اترنا شروع کر دیا ہے اس لیے بغیر کوئی جواب دیئے کرسی پر سے اٹھ گئی تھی۔ بتایا تھا نا میں نے آپ کو مجھے شرماتی لجاتی لڑکیاں زہر لگتی ہیں اور اس وقت اگر میں تھوڑی دیر اور ٹھہرتی تو خوامخواہ لال گلابی ہو رہی ہوتی۔

''ارے جا کہاں رہی ہو'' وہ مجھے جاتا دیکھ کر چلایا تھا۔

''میں بڑے پاپا کے پاس لان میں جا رہی ہوں، تم بھی چینج کر کے وہیں آ جاؤ''۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا۔

''اچھا میرے ایک سوال کا جواب تو دیتی جاؤ؟'' وہ بیڈ پر سے اتر آیا تھا اور میرے سامنے آ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا تھا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''میرے جانے میں پندرہ دن رہ گئے ہیں، اگر میں پندرہ دن کے نوٹس پر رخصتی کے لیے کہوں تو کیا مان جاؤ گی؟''

اس کی آنکھوں سے جھانکتی شرارت نے مجھے لمحہ بھر کے لیے کنفیوز کیا تھا مگر اگلے پل میں نے بڑے اطمینان سے گردن اقرار میں ہلا دی تھی اور پھر فوراً ہی کمرے سے بھی باہر نکل آئی تھی بغیر اس کی طرف دیکھے۔ آخر اتنی مشرقیت تو مجھ میں ہے ہی۔

❁.....❁

یہ شراکت گوارا ہے مجھے!

''ہائے اللہ بھابھی! کیا بتاؤں آپ کو، مجھے ووٹ ڈالنے کا کس قدر شوق ہے۔ ابھی ریفرنڈم ہوئے اور پچھلے سال جو سٹی گورنمنٹ کے انتخابات ہوئے تو دونوں مرتبہ میں پاکستان میں نہیں تھی ورنہ میں تو ووٹ ڈالنے لازمی جاتی۔'' ساحرہ بھابھی آنے والے الیکشنز کے حوالے سے خاصی پرجوش نظر آرہی تھیں۔

''ہاں اب تو آپ ووٹ ڈال بھی سکتی ہیں۔ ووٹر کی کم سے کم عمر ۱۸ سال جو کردی گئی ہے۔''

کہا تو میں نے طنزیہ انداز میں تھا مگر وہ اپنی عمر کے بارے میں اتنی کونشس رہا کرتی تھیں کہ میرا طنز سمجھے بغیر کچھ شرمائے ہوئے انداز میں ہنس پڑیں۔

''آپ بھی بھابھی بس! بناتی بہت ہیں۔ اب خیر میں اٹھارہ سال کی بھی نہیں ہوں، ہاں جب ۹۶،۹۷ میں الیکشن ہوئے تو میرا بہت دل چاہا تھا ووٹ ڈالنے کو لیکن.....''

''لیکن اس وقت تو آپ کا شناختی کارڈ بھی نہیں بنا تھا۔'' میں نے بظاہر دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ان کی بات کاٹی تو وہ میرے ان کو اتنا ''چھوٹا'' سمجھنے پر خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بنی وہ مسلسل خوشگوار انداز میں مسکرائے جارہی تھیں۔

''خیر، اب تو ووٹر کی عمر بھی ۱۸ سال کردی گئی ہے اور ووٹر کے لیے گریجویٹ ہونے کی کوئی شرط بھی عائد نہیں کی گئی ہے لہٰذا آپ کا شوق انشاء اللہ اس بار ضرور پورا ہو ہی جائے گا۔''

میں نے پھر لفظوں میں مٹھاس گھول کر ان پر وار کیا۔ اب کی بار ان کے چہرے پر کچھ ناگواری سی پھیل گئی تھی۔ اپنے کانوینٹ سے پڑھے ہوئے ہونے پر تو انہیں جی بھر کر غرور ہے۔ کانوینٹ سے پڑھا ہوا ہے یا جہاں سے بھی، انٹر کے مساوی تعلیم ہے ان کی۔ الیکشن لڑنا چاہیں تو نااہل قرار پائیں گی لیکن اپنی انگلش پر غرور بہت ہے انہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنی لندن میں ابتدائی اسکولنگ اور پھر پاکستان آکر کانوینٹ سے پڑھنے کا قصہ تفصیلی سنا دیا تھا۔ میرے سامنے بہت پوز کر کر کے برٹش لب و لہجے میں انگریزی اس طرح بولی جاتی ہے کہ اکثر میرا دل چاہتا ہے میں اپنی ایم اے انگلش فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کی ڈگری لاکر ان کے سامنے رکھ دوں اس پر چھوٹا بننے کا بہت شوق ہے۔

''پہلے پہل کراچی آنے پر جب میں ان سے ملی تو ان کی بالترتیب نو اور سات سال کی بیٹیوں کو دیکھ کر میں نے یہی سوچا تھا کہ ان کی شادی یقیناً کم عمری میں ہوگئی ہوگی۔ وہ عمر میں مجھ سے شاید پانچ چھ سال بڑی ہوں گی اور اتنی سی عمر کی بڑائی پر انہیں آپ جناب اور بھابھی وغیرہ کے نام سے بلانا مجھے آکورڈ لگا تھا اس لیے میں نے عورتوں کی مخصوص فطرت سے ہٹ کر انہیں ان کے نام ساحرہ سے اور تم کر کے باتیں شروع کردیں۔ اصولاً

انہیں میری اس بڑائی اور اعلیٰ ظرفی تسلیم کرنا چاہیے تھا۔ ایک تو وہ ویسے ہی عمر میں مجھ سے بڑی تھیں پھر دو دو بچیوں کی اماں جان، جب کہ میں نئی نویلی شادی شدہ، تازہ تازہ یونیورسٹی سے فارغ شدہ۔ مگر انہوں نے بجائے میری اعلیٰ ظرفی سے متاثر ہونے کے میرے ایم اے پاس ہونے کا سنتے ہی مجھے امیمہ بھابھی، امیمہ بھابھی کرنا شروع کر دیا۔ دل ہی دل میں تو میں جل بھن کر خاک ہوگئی، فوراً ہی اپنی اعلیٰ ظرفی سے دست بردار ہوتے ہوئے میں نے بھی جواباً انہیں ساحرہ بھابھی کہنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں عورتیں عمر چھپانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں، ان سے مل کر اس بات کی صداقت پر مجھے یقین آ گیا تھا۔ کبھی کسی پرانے واقعہ کا حوالہ دے دیں تو فوراً ہی اس فکر سے کہ کہیں میں اس سے ان کی صحیح عمر کا اندازہ نہ لگالوں جھٹ کہیں گی۔

''گلف وار جب ہوئی میں اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس وقت تو اتنے چھوٹے تھے کہ یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی کہ عراق نے کویت پر آخر حملہ کیا ہی کیوں؟ جواب امریکہ کے ہاتھ اپنی شامت بلوا بیٹھا ہے۔''

جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسنا شاید اسے ہی کہا جاتا ہے۔

۹۱ میں یہ چھوٹی سی بچی تھیں اور اسکول میں پڑھتی تھیں، عمر چھپانے کے معاملے میں تو انہوں نے ہماری فلمی اداکاراؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب تو میں نے اپنی پانچ چھ سال والی رائے پر بھی نظر ثانی کر لی تھی۔ میرا خیال ہے یہ اس سے کچھ زیادہ ہی بڑی ہوں گی۔ چھیل چھبیلی بنی پھرتی ہیں، کالج گرلز جیسی ڈریسنگ اور ناز و ادا ایسے کپڑے تو میں نہیں پہنتی، ہر فیشن بے دھڑک اپناتی ہیں۔ اپنی عمر اور جثہ دیکھے بغیر پچانوے کلو وزن کے ساتھ زپ اور پلیٹوں والی خوب تنگ شرٹ اور ٹراؤزر پہنے جب میں نے انہیں دیکھا تو بمشکل اپنی مسکراہٹ ان سے چھپائی تھی۔ میری مسکراہٹ سے بے نیاز وہ خود کو قلوپطرہ سے کم نہیں سمجھ رہی تھیں۔

خوب صورت وہ بے شک بہت ہیں لیکن اس حسن پر داغ اس موٹاپے کی وجہ سے لگ گیا ہے۔ شانوں پر لاپروائی سے دوپٹہ ڈالے اور بالوں کی بیچ کی مانگ نکال کر دونوں طرف میٹرک اور انٹر کی بچیوں کی طرح ہیئر کلپ بھی ایسے ہوتے ہیں کہ کسی پر اسٹرابریز بنی ہیں، کسی پر ٹیڈی بیئر، کسی پر خوب صورت اور کیوٹ سی بلی بنی ہے۔ شروع شروع میں میں حیران بھی ہوئی اور مجھے ہنسی بھی بہت آئی مگر پھر آہستہ آہستہ ان کا پرابلم میری سمجھ میں آ ہی گیا۔ وہ واقعی خود کو اٹھارہ سے اوپر ماننے کو تیار ہی نہیں تھیں۔

ساحرہ بھابھی میرے برابر والے فلیٹ میں رہتی ہیں۔

اسامہ کی کراچی پوسٹنگ ہوئی تو میرے لیے یہ بہت بڑی خوشی کی خبر تھی۔ ساس نندوں کو بھگتنا کوئی آسان کام نہیں، میں تو شادی کے چھ مہینوں میں ہی تنگ آ گئی تھی۔ ساس میری ایسی مکار اور چالاک خاتون ہیں کہ کیا بتاؤں، اوپر سے بیٹا پوری طرح اماں کے کنٹرول میں ہے، میری کیا مجال کہ کبھی پلٹ کر انہیں کوئی جواب دے سکوں۔ بات بات پر روک ٹوک اور تنقید..... ایسے میں سسرالیوں سے پیچھا چھٹنے کا سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا تھا۔ مجھے خوشی خوشی کراچی جانے کی تیاری کرتا دیکھ کر اسامہ بڑی بے مروتی سے بولے۔

''تم کہاں کی تیاری کر رہی ہو، میں کراچی اکیلا جاؤں گا۔ ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، حرا کی اپنی کالج کی اور پڑھائی کی مصروفیت ہے

ایسے میں کوئی تو ہو ان کے پاس۔''

میرا دل جل کر خاک ہو گیا تھا۔ ماں باپ کی سکھائی تہذیب اور مروت آڑے آ گئی تھی ورنہ پوچھتی کہ کیا یہاں مجھے ممی کی خدمت کے لیے لایا گیا ہے اور گھر میں موجود نوکر کیا مر گئے ہیں اور سب سے بڑے خادم میرے سسر جو بیگم کے آگے اف تک نہیں کرتے۔ پتا نہیں بڑی بی نے بیٹوں کے ساتھ ساتھ میاں کو بھی کس طرح قابو کر کے رکھا ہوا ہے۔ مجال ہے ان کی مرضی کے بغیر پتہ بھی ہل سکے۔ میرے منہ پھلانے اور ناراض ہونے کا اسامہ نے رتی برابر بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔ نہ آیا ہمیں اپنی ساس کی طرح میاں کو قابو کرنا اور اپنے اشاروں پر چلانا۔ حالانکہ شادی کے شروع شروع کے دنوں میں میں اسامہ کو بزار و مانگ قسم کا انسان سمجھتی تھی لیکن ہنی مون پیریڈ ختم ہوتے ہی میری یہ خوش فہمی بھاپ بن کر اڑ گئی تھی۔ میں جو یہ سمجھا کرتی تھی کہ شادی کے اولین دنوں کی طرح وہ ساری زندگی ''جادو ہیں تیرے نین غزالاں سے کہوں گا'' کہتے ہوئے گزار دیں گے قطعاً ثابت ہو چکا تھا۔ اب تو انہیں سوائے مجھ میں عیب نکالنے اور وقت بے وقت رعب جمانے کے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔

ناچار دل پر پتھر رکھ کر میں خاموش ہو گئی تھی میری ناراضی کی وہاں پرواہ کسے تھی لیکن اماں نے بیٹے کو یونہی تھوڑی قابو میں کر کے رکھا ہوا تھا۔ جب اچھی طرح بیٹے کے ہاتھوں اس حوالے سے میرا دل جلوا چکیں تو از خود ہی بیٹے کے پیچھے لگ گئیں کہ

''اکیلے کیسے رہو گے، امیمہ کو بھی ساتھ لے جاؤ، نئی نئی شادی ہوئی ہے وہاں خوب گھومنا پھرنا۔''

میری بات کی تو کوئی ویلیو ہی نہیں تھی لیکن امی کا حکم کیسے ٹالا جا سکتا تھا۔ ساتھ ساتھ ممی کی شان میں خوب قصیدے بھی میرے سامنے پڑھے گئے جو بہو کا اتنا خیال کر رہی تھیں۔ مجھے کراچی لے جا کر گویا میرے اوپر ایک طرح سے احسان کیا گیا تھا۔

اپنے اوپر کیے جانے والے اس احسان کے باوجود میں اسامہ کے ساتھ جانے پر بہت خوش تھی۔ وہاں ہم دونوں اکیلے ہوں گے۔ کوئی ان کے کان بھرنے والا بھی نہیں ہو گا۔ دو تین مہینوں میں ہی انہیں ممی کے اثر سے نکال دوں گی۔ اسامہ کی جاب بھی بہت شاندار تھی ان کی فرم کی طرف سے انہیں کراچی کے پوش علاقے میں فرنشڈ اپارٹمنٹ بمعہ گاڑی ملا تھا۔ الگ گھر میں رہنے کی حسرت کس لڑکی کو نہیں ہوتی، میں تو قیمتی ساز و سامان سے آراستہ، سجے سجائے فلیٹ کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئی تھی حالانکہ اسلام آباد میں میرا سسرالی گھر بہت شاندار اور بڑا تھا مگر وہاں میرا دل جلانے کو ہر وقت ساس اماں جو موجود رہا کرتی تھیں۔ یہاں تو میں اپنی مرضی سے رہوں گی، اپنی مرضی سے سوؤں گی، اپنی مرضی سے اٹھوں گی، اپنی مرضی کا کھانا پکاؤں گی۔

لیکن وائے افسوس میری قسمت میں اپنی مرضی کی زندگی گزارنا لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ ممی نہیں تھیں تو ان کا بیٹا ان کی کمی پوری کرنے کو سارا وقت مجھے نچائے رکھتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسامہ مجھے اپنی ساس کی فوٹو کاپی لگنے لگتے۔ میرا سونا، آرام کرنا، سب انہیں زہر لگتا ہے۔ کبھی جو اس بات کا لحاظ کر لیں کہ بیگم میری اتنی میٹھی اور گہری نیند سو رہی ہیں تو چلو آج میں خود ہی ناشتہ کر کے آفس چلا جاؤں۔ چیخ چلا کر مجھے جگایا جائے گا، ساتھ ساتھ لعن طعن کی جائے گی کہ رات ہی ان کے کپڑے وغیرہ نکال کر کیوں نہیں رکھے تھے۔ ناشتا صاحب بہادر کی مرضی کا ہونا چاہیے ورنہ ایسی ایسی باتیں سننے کو ملتی ہیں کہ توبہ بھلی۔ اور تو اور جوتے بھی میں پالش کروں۔ پکی نوکرانی سمجھ لیا گیا ہے مجھے۔ اس پر بھی اکثر پھوہڑ عورت اور جاہل عورت کے القاب

سے نوازا جاتا ہے اور یہ القاب صبح آفس سے لیٹ ہونے کی صورت میں سخت طیش کے عالم میں دیے جاتے ہیں۔

ہماری شادی کسی افیئر کا نتیجہ نہیں، جو میں ان کے بدلے رویوں پر کڑھوں کہ پہلے تو یوں میرے ساتھ پیار بھری باتیں کی جاتی تھیں اور ویسے تو شادی محبت کر کے کی جائے یا بغیر محبت کے بعد کے حالات دونوں ہی صورتوں میں اسی قسم کے ہی ہوتے ہیں۔ سیدھی سادی ارینجڈ میرج ہے ہماری۔

میری بڑی نند عظمیٰ آپی نے ایک محفلِ میلاد میں مجھے دیکھتے ہی اپنے لائق فائق اور ہینڈسم بھائی کے لیے پسند کر لیا تھا۔ انہیں اپنے بے شمار خوبیوں کے مالک لاڈلے بھائی کے لیے جو پوری طرح اماں اور بہنوں کے کہنے میں تھا ایک بھولی بھالی اور سیدھی سادی لڑکی کی تلاش تھی اور مجھ معصوم کی شکل میں ان کی یہ خواہش پوری ہوگئی تھی۔ ان لوگوں کی مکاریاں دیکھ کر تو اب میں سوچتی ہوں کاش اسامہ کی کسی تیز اور چالاک سی لڑکی سے شادی ہوئی ہوتی، چار دن میں سب کو تگنی کا ناچ نچا دیتی۔ میری جیسی بے زبان اللہ میاں کی گائے (جسے جس کا جو دل چاہے کہہ دے) کا تو یہاں گزارا ہی نہیں۔

☆

ہمیں کراچی آئے تیسرا دن تھا جب ایک روز دوپہر کے وقت ساحرہ بھابھی مجھ سے ملنے چلی آئیں۔ وہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی اور پہلی ملاقات میں ہی خاتون مجھے خاصی چھچھوری لگی تھیں لیکن نیا شہر تھا یہاں کی جگہوں اور لوگوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے کسی نہ کسی سے دوستی تو کرنی ہی تھی۔ اس لیے ان کی بہت سی عادتیں پسند نہ آنے کے باوجود بھی میں انہیں برداشت کر لیا کرتی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ساحرہ بھابھی کے شوہر، اسامہ کے یونیورسٹی فیلو نکلے۔ دراصل اسامہ نے ایم ایس سی کراچی یونیورسٹی سے ہی کیا ہے۔ پڑھائی کی وجہ سے وہ کئی سال کراچی میں رہے تھے اس لیے انہیں کراچی کے راستوں اور جگہوں سے مکمل شناسائی تھی۔ عدیل بھائی، اسامہ پرانے دوست اور واقف کار نکلے تو مزید ہمارے گھرانوں میں قربت پیدا ہوگئی۔

ساحرہ بھابھی کے ساتھ میں نے کراچی کے مختلف شاپنگ سینٹرز وغیرہ کا دورہ کیا۔ گھر کے لیے ضرورت کی خاص خاص چیزیں خریدیں۔ وہ بھاؤ تاؤ بھی ٹھیک ٹھاک کر لیا کرتی تھیں ورنہ مجھے تو دکانداروں سے قیمتیں کم کروانی کبھی نہیں آئیں۔ ان کی باتیں اگر آپ میں برداشت کرنے کا حوصلہ ہے تو پھر ان کے ساتھ کے کئی فائدے بھی ہیں اور باتیں ان کی وہی چھچھوری جنہیں میں بمشکل برداشت کیا کرتی تھی۔

''میں لندن میں پیدا ہوئی، میری ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی، حالانکہ ''ان'' کی خود کی انگلش اتنی اچھی ہے لیکن میرے آگے ''انہیں'' بھی Oxford dictionary کی مدد لینی پڑتی ہے۔''

وہ عدیل بھائی کا نام نہیں لیتی تھیں۔ ٹپیکل مشرقی خاتون جو شوہر بیچارے کا ذکر ہر وقت یہ، وہ ان اور انہیں کہہ کر کیا کرتی تھیں۔ شادی سے پہلے ہم دوستوں کا گروپ عورتوں کی اس قسم (جو شوہروں کو اسمِ ضمیر سے مخاطب کرتی ہیں) کا دل کھول کر مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن شادی کے بعد میں نے ایسی خواتین کا مذاق اڑانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ خود میری ساس کو میرا اسامہ کا نام لینا سخت ناپسند ہے اور شادی کے ابتدائی دنوں ہی میں

انہوں نے مجھے اسامہ کو اسامہ کہنے سے منع کر دیا تھا۔ اب میں بغیر نام لیے آپ جناب کر کے ہی ان سے بات کیا کرتی ہوں۔

ہاں پیچھے میں کسی سے ان کے بارے میں بات کر رہی ہوں تو کبھی یہ، وہ اور ان نہیں کرتی، سیدھا سیدھا نام لیتی ہوں ان کا۔ ان کا نام تو ویسے بھی آج کل زبانِ زد عام ہے۔ ہر چھوٹے بڑے کے منہ پر یہی نام ہے یہاں تک کہ امریکی صدر تک کو سوتے میں ''اسامہ اسامہ'' کی آوازیں اور اسامہ کے بھوت اپنے اردگرد ناچتے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں اگر میں ان کا نام لے لیتی ہوں تو مضائقہ ہی کیا ہے۔

اسامہ نام سے یاد آیا، اسامہ کا ایک دوست امریکہ میں رہتا ہے۔ پچھلے دنوں اس بے چارے کی کم بختی آئی اور اس نے دوست کی محبت میں آ کر ایک مختصر سی E-mail انہیں بھیج دی۔ جس میں صرف یہ درج تھا۔ ''اسامہ! میں خیریت سے ہوں، تم کیسے ہو؟''

ابھی E-mail بھیجے آدھا گھنٹہ ہی ہوا ہوگا کہ ایف بی آئی والے اس کے گھر پہنچ گئے، بڑی مشکلوں سے بے چارے کی گلو خلاصی ہوئی۔

افوہ میں بھی کہاں سے کہاں نکل جاتی ہوں۔ بات ہو رہی تھی ساحرہ بھابھی کی اوچھی باتوں اور شو آف کی۔ ایسی چھچھوری عورت میں نے ساری زندگی نہیں دیکھی۔ اپنی لندن کی تعلیم پر تو جو غرور انہیں ہے سو ہے۔ میاں کی تعلیم اور پوسٹ پر بھی خوب دل کھول کر اتراتی ہیں محترمہ۔

''اب میں اتنے بڑے آفیسر کی بیوی ہوں، خود مین ٹین کر کے نہ رکھوں اور اپنی Appearance کا خیال نہ رکھوں تو لوگ کیا کہیں گے۔ اس لیے لباس اور تیاری پہ اتنی توجہ دیتی ہوں'' اپنے ساتھ بیوٹی پارلر لے جاتے ہوئے انہوں نے فخر سے سر اونچا کر کے کہا تھا۔

ہر مہینہ جس پارلر وہ جاتی تھیں وہیں میں بھی جانے لگی تھی۔ وہاں ان کی اچھی واقفیت تھی اس لیے میرا کام بھی ان کے ساتھ آنے کی وجہ سے اچھا ہو جایا کرتا تھا ورنہ یہاں وہاں سے بالوں کی کٹنگ کروا کر تو میں کبھی مطمئن ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بچیاں ان کی دونوں ماما پارسی میں پڑھ رہی ہیں۔ بچیوں کی اچھی اسکولنگ پر بھی انہیں بڑا ناز تھا۔ کوئی پوچھے نہ پوچھے خود ہی۔

''فروا اور مریم ماما پارسی میں پڑھتی ہیں۔'' بتایا کرتی تھیں۔

کوئی نئی شاپنگ کی گئی ہے تو جب تک سارے جگ میں اس کی تشہیر نہ کر لیتیں ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

''یہ Noritake کا ڈنر سیٹ'' انہوں'' نے گل پلازہ سے خرید لیا حالانکہ میں منع بھی کر رہی تھی کہ کیا ضرورت ہے اتنی مہنگی کراکری خریدنے کی مگر ''انہیں'' پتا ہے ناں کہ مجھے برتن جمع کرنے کا کریز ہے اس لیے پیسوں کی پرواہ کیے بغیر اتنا مہنگا ڈنر سیٹ خرید لیا۔ اب اس کی قیمت میں آپ کو کیا بتاؤں، آپ خود سمجھدار ہیں Origional جاپانی ہے اور ڈیزائن بھی بالکل نیا ہے۔ چھیانوے پیسز کا۔''

ساری بلڈنگ میں وہ اپنی شاپنگز کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں۔ روزمرہ کے گھریلو استعمال کی اشیاء کو دیکھ کر تو میں کبھی کوئی خاص متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے میرے میکے اور اب سسرال میں بھی ضروریات زندگی کی تمام بہترین اور قیمتی اشیاء موجود ہیں لیکن جب انہوں نے اپنی سالگرہ پر عدیل بھائی کی جانب سے تحفے میں ملنے والی وائٹ گولڈ کی پلاٹینم جڑی انگوٹھی دکھائی تو میرا رشک و حسد سے برا حال ہو گیا۔ شادی کے اتنے سالوں بعد بھی عدیل بھائی بیگم کے اس طرح نخرے اٹھاتے ہیں اور ایک میرے شوہر صاحب ہیں، انہیں تو ایسی باتیں چونچلے بازی نظر آتی ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے

میری سالگرہ آئی تو انہوں نے مجھے وش تک نہیں کیا تھا جبکہ میں ان کی جانب سے شاندار سے تحفے کینڈل لائٹ ڈنر اور ڈھیر ساری رومانٹک گفتگو کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ سالگرہ سے کئی دن پہلے باتوں باتوں اپنی ڈیٹ آف برتھ بھی انہیں بتادی تھی۔ خوش فہمی ہی تھی میری جو میں یہ سمجھ رہی تھی کہ انہوں نے میری سالگرہ کا دن یاد رکھ لیا ہوگا اور اب عین سالگرہ کے دن وہ ضرور مجھے سرپرائز دیں گے مگر وہاں تو وہی صبح میری لاپروائیوں پر ناراض ہوتے معمول کے انداز میں آفس روانگی ہوگئی تھی۔

کیسا میرا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہا تھا اگرچہ مما پاپا اور بہن بھائیوں کے تحائف مجھے بذریعہ کوریئر سروس دوپہر کے وقت مل گئے تھے، شام میں سب نے فون کر کے بھی وش کیا تھا مگر میرا دل پھر بھی خوش نہیں ہوا تھا۔ رات میں جب ان کی نگاہ مما پاپا کے بھیجے گئے تحائف پر پڑی تو انہیں میری سالگرہ یاد آئی تھی۔

''سوری بھئی! میں تمہیں وش کرنا بھول گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں سالگرہ وغیرہ کی خرافات کو مانتا ہی نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے تمہیں برتھ ڈے منانا اچھا لگتا ہے۔ اینی وے ہیپی برتھ ڈے..... ایسا کریں گے کل کہیں باہر ڈنر کرلیں گے اور پھر تم اپنی پسند کا کوئی گفٹ بھی خرید لینا۔''

اپنی طرف سے یہ میرے ساتھ بڑا غیر معمولی سلوک کیا تھا انہوں نے، مجھے باہر کھانا کھلانے لے جائیں گے اور شاپنگ بھی کرائیں گے۔ میرا دل جل بھن کر رہ گیا تھا، میں نے پھولے منہ سے گفٹ لینے سے انکار اور ڈنر کے لیے جانے سے معذرت کر لی تھی۔ بجائے شرمندہ ہونے کے الٹا وہ میرے ناراض ہونے پر ہنستے رہے تھے۔

پھر اگرچہ انہوں نے مجھے شاپنگ بھی کروائی تھی اور باہر کھانا بھی کھلایا تھا اور وقتی طور پر میں خوش بھی ہوگئی تھی مگر جب ساحرہ بھابھی نے اپنے کینڈل لائٹ ڈنر اور وائٹ گولڈ کی پلاٹینم سے سجی انگوٹھی کے بارے میں مجھے بتایا تو اپنی کم نصیبی پر مجھے بہت رونا آیا۔ کیسے وہ دونوں میاں بیوی نئے نویلے جوڑے کی طرح ساتھ پھرتے تھے۔ عدیل بھائی جیسے اسمارٹ بندے کو اس گوشت کے پہاڑ کو کہیں ساتھ لے جاتے شرمندگی بھی نہیں ہوتی تھی۔

ساحرہ بھابھی کی سسرال کراچی میں ہی تھی۔ وہ خوب لڑ جھگڑ کر وہاں سے شادی کے ایک سال بعد ہی الگ ہوگئی تھیں۔ خود تو خیر کبھی سسرال کی طرف پھٹکتی بھی نہیں تھیں لیکن عدیل بھائی کے بھی اپنے ماں باپ سے ملنے کے لیے جانے پر انہوں نے پابندی عائد کر رکھی تھی۔ ساس بے چاری بیٹے اور پوتیوں کی محبت سے مجبور ہو کر کبھی یہاں ملنے آ بھی جاتیں تو وہ انہیں منہ نہیں لگاتی تھیں۔ پھر کئی دنوں تک وہ عدیل بھائی سے بھی ناراض ناراض پھرا کرتی تھیں۔ میں دل ہی دل میں اس بات پر سخت حیران تھی۔ ایسا کون سا تعویذ انہوں نے عدیل بھائی کو گھول کر پلا دیا تھا جو وہ اس طرح ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔

میرے دل میں کھد بد ہوتی تھی۔ دل چاہتا تھا ان سے راز کی یہ بات پوچھوں، آخر وہ کون سا نسخہ ہے جس کی مدد سے شوہر کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ پھر میرے پوچھے بغیر یہ عقدہ ایک روز خود انہوں نے ہی کھول دیا یہ بتا کر کہ ان کی ممی کے ایک پیر صاحب ہیں، بہت پہنچے ہوئے اور ان پیر صاحب نے ہی انہیں پڑھی اور دم کی ہوئی چینی، نمک اور کالی مرچیں دی ہیں جن کو وہ عدیل بھائی کی چائے اور کھانے وغیرہ میں بڑے خفیہ طریقے

سے استعمال کرتی ہیں۔ اگر چہ یہ بات کسی کو بتانے والی نہیں تھی لیکن زیادہ بولنے کا نقصان یہی تو ہوتا ہے کہ بندہ بولتا پہلے ہے سوچتا بعد میں ہے۔

روانی میں بولتے بولتے اچانک انہیں اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تو چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں۔ پھر اپنی جھینپ مٹانے کے لیے وہ کافی دیر تک اس بات کو اپنا مذاق قرار دینے کی کوشش کرتی رہیں لیکن خیر میں نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلیں، جھوٹ اور سچ میں فرق تو میں کر ہی سکتی تھی۔ تب میری سمجھ میں آیا تھا کہ عدیل بھائی کو کاٹھ کا الو انہوں نے کیسے بنایا ہے۔ بے ساختہ میرا دل چاہا کہ میں ان سے پیر صاحب کا پتا پوچھوں اور رازداری کا وعدہ لیتے ہوئے اپنے لیے بھی چینی، نمک اور کالی مرچیں منگواؤں لیکن میری اس خواہش کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ میری ماسٹرز کی ڈگری تھی جو مسلسل میرے اوپر تھوتھو کر رہی تھی۔ پھر یہی ہوا کہ میں ہار گئی، میری ڈگری جیت گئی۔ دل مسوستے ہوئے میں ان سے پیر صاحب کا پوچھے بغیر اٹھ گئی۔

میں نے اسامہ کو ساحرہ بھابھی کی باقی تمام باتیں سنسر کر کے صرف یہ بات بتائی کہ

''عدیل بھائی اپنی ساری تنخواہ لا کر بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے بھی بعد میں ساحرہ بھابھی ہی سے پیسے مانگتے ہیں۔''

تو وہ بہت دیر تک میری طرف دیکھ کر ہنستے رہے تھے۔ ہنسنے کا انداز ایسا تھا جیسے ایک معصوم سے بچے کی کسی طفلانہ بات پر کوئی بزرگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ میں ان کے ہنسنے بلکہ اپنا مذاق اڑائے جانے پر چڑ گئی تھی۔

''اگر کوئی عورت یہ سمجھتی ہے کہ اسے اپنے شوہر کی تنخواہ اور تمام تر آمدنی بالکل ٹھیک ٹھیک پتا ہے تو پھر وہ یقیناً احمقوں کی جنت میں رہتی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے عدیل بھائی اتنے سیدھے نہیں جتنے نظر آتے ہیں لیکن میں آپ کو بتاؤں باہر لوگوں کے ساتھ ڈیلنگ میں وہ جتنے بھی تیز ہوں گھر میں ساحرہ بھابھی کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی۔ ساحرہ بھابھی کی مرضی کے بغیر وہ اپنے والدین تک سے نہیں ملتے۔''

میں نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں ان کی تردید کی تھی۔ لہجے میں بہت ساری حسرتیں اور اپنی تقدیر کی ستم ظریفی پر ماتم بھی شامل تھا۔ کاش میں ساحرہ بھابھی جتنی خوش نصیب ہوتی وہ تو واقعی اسم بامسمّٰی ہیں۔ بڑا سوچ سمجھ کر ان کے ماں باپ نے ان کا نام رکھا ہے۔

☆

دوپہر میں نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر بجائے سونے کے میں ساحرہ بھابھی کے گھر آ گئی تھی۔ بیل بجانے پر دروازہ فروا نے کھولا تھا۔

''السلام علیکم امیمہ آپی۔'' اس نے گرم جوشی سے مجھے سلام کرتے ہوئے اندر آنے کے لیے راستہ دیا تھا۔

شروع شروع میں فروا اور مریم مجھے آنٹی اور اسامہ کو انکل کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ ویسے تو خیر مجھے چھوٹا بننے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن جب ان کی اماں میرے برابر کی بلکہ مجھ سے بھی چھوٹا بننے کی کوشش کرتی ہیں تو میں کیوں مروت برتوں، میں نے ایک دو دفعہ کے بعد ہی انہیں آنٹی کہنے پر ٹوک دیا تھا اور خود ہی آپی کہنے کی تجویز انہیں دی تھی جو ان دونوں نے مان بھی لی تھی۔ اسامہ کو البتہ اپنے انکل کہلائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا لہٰذا وہ اب بھی انکل ہی کہلائے جاتے تھے۔

''ماما نہار ہی ہیں۔'' مجھے لاؤنج میں لا کر بٹھاتے ہوئے فروا نے بتایا تھا۔

مریم بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں میری آمد سے قبل یقیناً ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھیں۔ میں نے ساحرہ بھابھی کا انتظار کرتے ہوئے وقت گزاری کے لیے ان کے ساتھ ٹی وی دیکھنا شروع کر دیا۔ کیبل والے نے اپنے چینل پر ریتھک کی ''کہونا پیار ہے'' لگائی ہوئی تھی۔ فلم میں ان دونوں کی دلچسپی قابلِ دید تھی۔

''امیمہ آپی! یہ مریم ہے ناں اس نے ''کہونا پیار ہے'' پوری پندرہ بار دیکھی ہے۔ آپ کہیں سے بھی کوئی ڈائیلاگ بول کر دیکھ لیں یہ آگے کے ڈائیلاگز فوراً سنانا شروع ہو جائے گی۔'' فروا نے بہن صاحبہ کی ''قابلیت'' کی مجھ پر دھاک بٹھانے کی کوشش کی۔

ماں ''ماما'' کی اسکولنگ پر اتراتے نہیں تھکتیں اور بچیوں کا حال دیکھو۔'' میں نے دل میں سوچا تھا۔

''میری سب فرینڈز کو ریتھک بہت پسند ہے اور میری ایک فرینڈ کو تو وہ اتنا پسند ہے کہ جب اس نے سوزانے سے شادی کی تو مارے غم کے وہ تین دن تک اسکول ہی نہیں آئی۔'' مریم نے بڑے مزے سے مجھے بتایا تھا۔

''واقعی یہ پکی ماں کی پکی اولاد ہے۔ سچ ہی تو کہتے ہیں لوگ، جیسی ماں ویسی بیٹی، آگے جا کر خوب اماں کا نام روشن کریں گی صاحبزادیاں۔''

میں ان کے پکے پن پر انگشت بدنداں بیٹھی تھی۔ جب تک ساحرہ بھابھی کی آمد نہیں ہوئی، میں حیرت سے ان دونوں سے ریتھک کی تمام فلموں اور اینٹی سوزانے ویب سائٹ'' کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی۔

ساحرہ بھابھی حسبِ معمول بڑی خوشی اور گرم جوشی سے مجھ سے ملی تھیں۔ مزید جب میں نے ان کے ہاتھوں کے بنائے دہی بڑوں کی تعریف کی جو انہوں نے کل مریم کے ہاتھ میرے گھر بھجوائے تھے تو وہ اور بھی خوش ہو گئیں۔ اپنی تعریفیں سننے کا تو انہیں از حد شوق تھا۔ ہم دونوں ہی جب کوئی خاص ڈش بناتے تو ایک دوسرے کے گھر ضرور بھیجتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کوکنگ واقعی بہت اچھی کرتی تھیں۔ ماش کی دال کے دہی بڑے بنانا تو میں ایک عرصے سے سیکھنا چاہ رہی تھی مگر کوئی سکھانے والا ہی نہیں مل رہا تھا۔ کھانا میرے میکے میں بھی بہت اچھا اور خوش ذائقہ پکتا تھا، کھانے پینے کے وہاں سب شوقین ہیں لیکن ہمارے گھر میں دہی بڑے کبھی نہیں بنے۔ دہی پھلکیوں کو ہی دہی بڑوں کا نام دے دیا جاتا تھا۔ سسرال میں آئی تو ساس کے پکائے کھانوں کی سارے زمانے میں واہ واہ تھی۔ میں نے شاہی ٹکڑے اور ماش کی دال کے دہی بڑے ان سے سیکھنا چاہے تو انہوں نے کہا۔

''ابھی نئی نئی دلہن ہو، ابھی میرے ہاتھ کا پکا ہوا ہی کھالو، سیکھنے کے لیے تو عمر پڑی ہے۔'' کہہ کر ایک طرح مجھے ٹال دیا۔ صاف ظاہر تھا وہ مجھے سکھانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ اپنے گن مجھے سکھا دیے تو پھر بیٹے کو قابو کس ہتھیار سے کریں گی۔ یہاں اسامہ کو سارا وقت ممی کے ہاتھوں کے کھانے ہی تو یاد آیا کرتے تھے۔ میں کتنا بھی جان مار کر پکا لوں مجال ہے جو منہ سے ایک تعریفی جملہ نکل جائے۔ خود سے ہمت کر کے پوچھ لوں تو ''ہاں ٹھیک پکا ہے'' کہہ کر میرا دل توڑ دیا جاتا ہے، کبھی کبھی تو بغیر لحاظ کے میرے منہ پر کھانے کی خامیاں بھی بتا دی جاتی ہیں۔

پرسوں میں نے ان کی فرمائش پر جھینگوں کی بریانی پکائی۔ بڑی مشکلوں سے خوب محنت کر کے اور کئی گھنٹے کچن میں برباد کر کے۔ اور حاصل کیا ہوا؟ دونوالے لے کر ہی انہوں نے پلیٹ پیچھے ہٹادی۔

''اس میں ہیک آرہی ہے۔'' اتنا سا بھی انہوں نے میرے دل ٹوٹنے کی پرواہ نہیں کی۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ ڈش میں نے پہلی مرتبہ بنائی ہے اور پہلی غلطی تو قابلِ معافی ہوتی ہے بلکہ رات میں سونے سے پہلے مجھے نصیحت کی گئی کہ اب کی بار جب میں اسلام آباد جاؤں تو ممی سے کھانا پکانا سیکھوں، جس عورت کو ڈھنگ کا کھانا پکانا نہ آتا ہو اسے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ صرف ایک بریانی صحیح نہ پکنے پر انہوں نے مجھے کھری کھری سنائی تھیں حالانکہ کوکنگ میں اچھی خاصی کیا کرتی تھی۔ غلطی تو بڑے سے بڑے باورچی سے بھی ہوسکتی ہے میں تو پھر ایک معصوم سی ناتجربہ کار لڑکی ہوں۔ نئی نئی اس جہنم میں جھونکی گئی ہوں۔ ان کے اتنے طویل لیکچر اور مزید ممی کے ہاتھوں کی پکی جھینگوں کی بریانی کا قصیدہ سن کر میرا موڈ مزید آف ہوگیا تھا۔

میری جگہ ہوتی کوئی منہ پھٹ لڑکی تو کہتی کہ'' ویسے تو آپ کی ممی بڑا اللہ اللہ کرتی رہتی ہیں، تہجد، اشراق، اور چاشت، جب دیکھو مصلہ بچھائے بیٹھی ہیں اور انہیں مذہب کی اتنی بنیادی معلومات بھی نہیں کہ جھینگا مکروہ ہے اور اس بات پر تمام Marine Scientists اور تمام علمائے کرام متفق ہیں کہ جھینگے مچھلیوں کے اس گروپ سے تعلق نہیں رکھتے جو کھانی حلال ہیں۔ اصولاً تو آپ کے مذہبی گھرانے میں اتنی دین دار ممی کے ہوتے ہوئے ایک مکروہ چیز پکنی ہی نہیں چاہیے اور مجھے جو جھینگے پکانے نہیں آئے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے گھر میں گو مذہب کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا لیکن کوئی مکروہ چیز بھی نہیں پکتی۔

کاش میں ان سے یہ بات کہہ سکتی لیکن اگر کہہ بھی دیتی تو فائدہ کیا تھا۔ سچ سننا اور برداشت کرنا کون سا آسان کام ہے۔ میرے اس سچ اور وہ بھی کڑوے سچ پر تو انہیں ضرور ہی مرچیں لگتیں۔ ساحرہ بھابھی سے میں اکثر باتوں باتوں میں کوئی نہ کوئی ترکیب پوچھ لیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس لیے آئی تھی ذرا ایک بار مجھے وہی بڑے بنانے آجائیں تو سامنہ حیران رہ جائیں گے۔ ان کی ممی سے بھی زیادہ مزیدار دہی بڑے میں انہیں بنا کر کھلاؤں گی۔

میں تعریفیں کر کے ساحرہ بھابھی کو چڑھایا تو وہ ذرا سا ٹال مٹول کے بعد مجھے ترکیب بتانے پر آمادہ ہو ہی گئیں۔ ترکیب بتا کر کون سا وہ میرے اوپر کوئی احسان کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے میں نے انہیں خوبانی کا میٹھا اچار گوشت کی ترکیب بھی تو بتائی تھی۔ اگر وہ مجھے ترکیبیں بتا دیتی ہیں تو میں بھی ان کے استفسار پر کوئی ترکیب ان سے چھپاتی نہیں ہوں۔

جلدی جلدی ترکیب نوٹ کرتے ہوئے مجھے کچھ شک سا ہوا کہ شاید ساحرہ بھابھی کچھ پریشان ہیں۔ بظاہر وہ معمول کے انداز میں ہنس رہی تھیں، باتیں کر رہی تھیں مگر پھر بھی مجھے وہ کچھ الجھی ہوئی نظر آئیں اور تو اور آج دوران گفتگو انہوں نے کسی بات پر'' میں اتنے بڑے آفیسر کی بیوی ہوں۔ لندن میں پیدا ہوئی تھی میں، میری اسکولنگ وہیں ہوئی تھی۔ فروا کی'' ماما'' میں جو انگلش کی ٹیچر ہیں وہ بھی میری انگلش سے امپریس نظر آتی ہیں۔'' قسم کا کوئی جملہ نہیں کہا تھا اور یہ بات خاصی تشویش ناک تھی یوں بے دھڑک پوچھنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے سرسری سے لہجے

میں ان کی طبیعت وغیرہ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنے بالکل ٹھیک ٹھاک اور تندرست ہونے کا یقین دلایا۔

میں مزید اصرار کر نہیں سکتی تھی اسی لیے چائے پی کر اور ترکیب نوٹ کر کے واپس اپنے گھر آ گئی۔

میں بڑی آس بھری نگاہوں سے اسامہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اب وہ کوئی تعریفی جملہ کہیں گے، زیادہ نہ سہی کم از کم یہی کہہ دیں گے۔

''امیمہ! آج تم نے کھانا بہت اچھا پکایا ہے۔''

اس سے زیادہ تعریف کی تو میں نے کوئی امید رکھی ہوئی بھی نہیں تھی۔ وہ ان مردوں میں سے ہیں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ زیادہ تعریفیں اور ستائشی کلمات بیویوں کا دماغ خراب کر دیتے ہیں لہٰذا بیوی کو اس کی اوقات میں رکھنے کے لیے کم سے کم تعریف اور زیادہ سے زیادہ تنقید کرنی چاہیے لیکن پھر بھی ایسے حوصلہ شکن رویے کی توقع بھی نہیں تھی مجھے۔ آج تو میں نے اپنی طرف سے محنت کرنے اور ان کی پسند کے کھانے بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ چکن جلفریزی، یخنی پلاؤ، ماش کی دال کے دہی بڑے، ان کی فیورٹ اولیو (Olive) آئل اور سرکہ والی مزیدار سلاد اور میٹھے میں ٹرائفل۔

دوپہر میں ساحرہ بھابھی سے ترکیب پوچھ کر آنے کے بعد پھر میں نے سارا وقت کچن میں گزارا تھا۔ پرسوں رات جو انہوں نے مجھے 'چلو بھر پانی' والا طعنہ دیا تھا وہ میں کسی طور بھول نہیں پا رہی تھی۔ سخت غصہ اور طیش تھا مجھے اس طعنے پر اور اب جب تک میں اس پھوہڑ پن کے الزام سے بری نہ کر دی جاؤں مجھے سکون نہیں مل سکتا تھا مگر وہ تو اتنے معمول کے انداز میں کھانا کھا رہے تھے جیسے آج ٹیبل پر انہیں کوئی غیر معمولی انتظام اور اہتمام نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

''آپ یہ پلاؤ لیں ناں، بہت اچھا بنا ہے۔''

میں نے بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود ہی تعریف کا فریضہ انجام دے کر پلاؤ کی ڈش ان کی طرف بڑھائی تھی۔ شاید میرے الفاظ پر ان کو تعریف کرنا یاد آ جائے، جبکہ پلاؤ تو واقعی پکا بھی بہت عمدہ تھا۔ ان کی انتہائی سخت قسم کی نقاد اور عیب نکالنے میں ماہر اماں بھی اس میں کوئی برائی نکال نہیں پائیں گی۔ چاول کیسے بکھرے بکھرے پکے ہیں، ایک ایک دانہ الگ ہے، نہ زیادہ نرم ہوئے ہیں نہ کچھ کسر رہی ہے اور خوشبو کیا عمدہ آ رہی ہے، سونف اور دھنیا بالکل صحیح مقدار میں ڈالے ہیں میں نے۔

میرے کہنے پر انہوں نے تھوڑے سے چاول اپنی پلیٹ میں ڈال لیے تھے اور اسی خاموشی اور سنجیدگی سے کھانے لگے تھے۔ مجھے رونا آنے لگا اس بے حسی پر۔ شاید میرے چہرے پر بھی کچھ اسی قسم کے تاثرات نظر آنے لگے تھے تب ہی وہ میری طرف دیکھ کر مبہم سا مسکرائے تھے۔

''لگتا ہے آج سارا دن کچن میں گزار دیا ہے۔''

''اتنی ساری چیزیں بنانے میں مجھے سارا دن نہیں لگتا، دو گھنٹے میں تیار کر لی تھیں میں نے یہ تمام ڈشز۔''

ان کی زچ کرتی مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے اپنے سگھڑاپے کے ساتھ ساتھ اپنی پھرتی اور تیزی بھی ان کے سامنے اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے شرارتی سے انداز میں مسکراتے رہے تھے۔ خوش ہی ہو رہے ہوں گے کہ بیوی کو پوری طرح قابو کر کے رکھا ہوا ہے، اشاروں پر ناچتی ہے۔ ذرا سا پھوہڑ پن کا طعنہ دیا تو کمر کس کر مزید محنت اور جان مارنے کو تیار ہو گئی۔

کھانے کے بعد وہ کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگے تھے جب کہ میں برتن دھونے کے بعد ان کے لیے بلیک کافی بنا رہی تھی۔ کپ کے نیچے ساسر رکھتے مجھے ان کی باتوں کی آواز آئی۔ وہ کسی سے فون پر باتیں کر رہے تھے اور یہ ''کسی'' کون ہوگا یہ بات میں فون پر ہونے والی گفتگو سنے بغیر بھی جانتی تھی۔ روز رات میں اماں سے لوری سنے بغیر نیند تھوڑی آتی ہے موصوف کو۔ میں کپ لے کر کمرے میں آئی تو ممی کی کسی بات کے جواب میں کہہ رہے تھے۔

''اف ممی! آپ کے ہاتھوں کی پکی نہاری کا سن کر تو میرے منہ میں پانی آ گیا ہے، دل چاہ رہا ہے کسی بھی طرح فوراً اسلام آباد پہنچ جاؤں، آپ کے ہاتھوں کا مزہ تو ساری دنیا میں مجھے کہیں نہیں مل سکتا۔''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ یہاں ہم خدمت کر کر کے ادھ موئے ہوئے جا رہے ہیں اور ایک تعریفی جملہ نہیں اور وہاں کوسوں دور بیٹھی ممی کے قصیدے زور و شور سے پڑھے جا رہے ہیں۔ ایسا سلوک تو کوئی اپنے گھر کی ملازمہ سے بھی نہیں کرتا ہوگا۔ میں نے اپنا سارا غصہ کپ سائڈ ٹیبل پر پٹخ کر نکالا تھا۔ اتنے زور سے کپ پٹخا تھا کہ وہ بے ساختہ چونک گئے تھے۔ ایک نظر مجھے دیکھ کر انہوں نے ایک نظر کپ پر ڈالی تھی۔ زور سے پٹخے جانے کی وجہ سے تھوڑی سی کافی ساسر میں بھی چھلک گئی تھی۔

وہ چائے، کافی سب بہت تیز گرم پیتے ہیں اسی لیے فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا تھا۔ ساتھ ہی ممی سے اظہارِ عشق بھی زور و شور سے جاری تھا۔ بے کار میں دل جلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دادی کہا کرتی تھیں کہ غصہ آئے تو فوراً وضو کر لیا کرو، میں یہی بات یاد کرتی وضو کر کے عشاء کی نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی تھی۔

☆

میرا کسی بات پر موڈ آف ہو جائے تو پھر اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہوتا اس لیے اگلا پورا دن اسی آف موڈ کے ساتھ گزارا تھا۔ اپنے غم میں لگ کر مجھے ساحرہ بھابھی کا الجھا الجھا اور پژمردہ انداز بھی بھول گیا تھا۔ میں پاس کے سپر اسٹور سے گھر کی کچھ چیزیں خرید کر واپس آ رہی تھی جب لفٹ کی طرف آتے ساحرہ بھابھی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ ان کی ملازمہ مہناز بھی تھی جسے صبح سے رات تک کے لیے انہوں نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ اچھی صاف ستھری اور خوبصورت سی لڑکی تھی ایسی کہ اس سے کھانا وغیرہ پکواتے ہوئے بالکل بھی گھن نہیں آتی تھی بلکہ پہلی مرتبہ ان کے گھر میں اسے کام کرتے دیکھ کر میں کام کرنے والی کی بجائے ان کی کوئی رشتہ دار سمجھی تھی۔ اس کی بول چال، لباس سب بہت عمدہ اور شہری رکھ رکھاؤ والے تھے۔ وہ مہناز کے ساتھ یقیناً سبزی وغیرہ ہی خریدنے گئی ہوں گی۔ ہم عورتوں کی زندگی اس روٹی سالن اور چکی چولہے سے باہر نکلتی ہی کب ہے۔ سوچتے ہوئے میں نے ایک سرد آہ بھری تھی۔

لفٹ میں ہم تینوں ساتھ ہی تھے۔ وہ خلافِ عادت بالکل خاموش تھیں۔ میری باتوں کا بھی بڑے پھیکے پھیکے سے انداز میں جواب دے رہی تھیں۔ میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا تو وہ مجھے کچھ روئی روئی سی نظر آئیں۔ ایسا لگ رہا تھا وہ گھنٹوں روتی رہی ہیں، میرا ہمدرد اور سدا کا نرم و مہربان دل تڑپ اٹھا تھا۔

گھر آ کر سامان اندر رکھ کر اور دروازہ واپس لاک کر کے میں نے ان کی بیل بجائی تھی۔ دروازہ انہوں نے ہی کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ زبردستی مسکرائی تھیں ورنہ ایسا لگ رہا تھا کہ میرا آنا پسند نہیں آیا۔ مہناز کچن میں سبزی بنانے میں مصروف تھی۔ بچیاں یقیناً اس وقت اسکول گئی ہوئی ہوں گی۔ مجھے لے کر وہ اپنے بیڈ روم میں ہی آ گئی تھیں۔ ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی تو بہر حال تھی اکثر وہ مجھے ڈرائنگ روم یا لاؤنج کے بجائے اپنے کمرے میں بٹھا لیا کرتی تھیں۔

''آپ بہت پریشان لگ رہی ہیں بھابھی! پرسوں بھی میں نے یہ بات نوٹ کی تھی لیکن پوچھا قصداً نہیں تھا کہ کہیں آپ میری بے تکلفی کا برا نہ مان جائیں لیکن آج تو آپ پرسوں سے بھی زیادہ ڈپریسڈ لگ رہی ہیں، پلیز مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟''

مدر ٹریسا، عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی تو ہمیشہ سے میری فیوریٹ شخصیات رہی ہیں سو اس وقت میں انہیں کی جانشین بن بیٹھی تھی۔ میرے ہمدردانہ انداز میں ان کے کندھے پر ہاتھ رکھنے کی دیر تھی کہ وہ بلک بلک کر رونا شروع ہو گئیں۔ میں ان کے رونے پر پریشان ہو گئی تھی۔

''کیا بات ہو گئی ہے بھابھی! آپ پلیز اس طرح روئیں تو مت۔''

میں خود رو پڑنے کے قریب تھی۔ ہمدردی اور محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ انہوں نے اپنا بھاری بھرکم سر میرے نازک سے کندھے پر ٹکا دیا تھا اور میرا درد سے برا حال تھا۔

''کیا بتاؤں تمہیں امیمہ! میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

درد و غم اور کرب و بلا میں مبتلا انہوں نے مجھے میرے نام سے اور ''تم'' کر کے مخاطب کیا تھا۔ دکھ میں شاید انسان کے منہ سے سچ نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ غالباً اللہ یاد آنے لگتا ہے اس لیے میں ان کے بالآخر مجھے اپنے سے چھوٹا تسلیم کر لیے جانے پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اسی خوشی میں ان کے Humpty dumpty جیسے وجود کا بوجھ (جو اس وقت میرے اوپر پڑا ہوا تھا) بھی خوشی خوشی برداشت کر رہی تھی۔

''عدیل مجھے اس طرح دھوکا دیں گے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

آج تو کایا پلٹ کا دن تھا۔ یہ، وہ، ان اور فروا کے پاپا کی جگہ عدیل بھائی کو عدیل کہا جا رہا تھا اور اس نام لینے میں مٹھاس یا محبت نہیں بلکہ غصہ اور غم بھرا ہوا تھا۔

''آپ آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ جائیں بھابھی۔!''

آخر میں یہ بوجھ کب تک برداشت کرتی۔ چنانچہ بڑی محبت سے ان کی کمر کے پیچھے گاؤ تکیہ لگا کر ان کا بوجھ خود پر سے ہٹا کر گاؤ تکیہ کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ وہ میرے کہنے پر اسی طرح زور و شور سے روتی ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھیں۔ میرا تجسس کے مارے برا حال تھا لیکن زیادہ کریدنے اور ایکسائیٹمنٹ کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کہیں گی میں اتنے غم میں مبتلا ہوں اور یہ اتنی ایکسائیٹڈ ہو رہی ہے۔ عدیل بھائی جیسے بے دام کے غلام نے آخر ایسا کیا کر دیا جو وہ یوں رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔

میں نے محبت اور اپنائیت کے اظہار کے طور پر فریج میں سے ان کے لیے پانی نکالا اور پھر خود اپنے ہاتھ سے اصرار کر کے انہیں پانی پلایا۔

دوگھونٹ لے کر ہی انہوں نے میرا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا تھا۔

''میری ممی کہا کرتی تھیں کہ مرد ذات بڑی خبیث ذات ہے۔ ساری زندگی اس کے ساتھ گزار دو، خدمت اور وفاداری میں خود کو مٹا لو لیکن پھر بھی موقع ملنے پر یہ دھوکا دینے سے چوکے گا نہیں۔ تب میں ان کی یہ بات مانا نہیں کرتی تھی لیکن آج یقین آ رہا ہے کہ ممی کی بات بالکل سچ تھی۔ کبھی نہ کبھی عمر کے کسی نہ کسی حصے میں جا کر یہ دھوکا ضرور دیتے ہیں، بے وفائی ضرور کرتے ہیں۔ کہنے والے سچ کہتے ہیں کہ مرد بیوی کا کبھی نہیں ہوتا، بیوی سے نہ محبت ہوتی ہے نہ انسیت، نہ خدمتوں اور وفاداریوں کا پاس ہوتا ہے۔ مرد یا اپنی ماں کا ہوتا ہے یا بیٹی کا۔ بس عورت کے صرف ان دو رشتوں کے ساتھ وہ وفادار اور مخلص ہوتا ہے۔ بیوی کی تو یہ اوقات ہے کہ دل بھر گیا اور جیب نے اجازت دی تو دوسری لے آئے۔''

وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں بولیں عدیل بھائی اور کسی عورت کا چکر، میرا دل نہیں مان رہا تھا اس کو۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے انہیں ساحرہ بھابھی کے آگے پیچھے پھرتے اور والہانہ چاہت لٹاتے دیکھا تھا اور پھر پیر صاحب کی پڑھ کر دی ہوئی چینی وغیرہ اتنی بے اثر تو نہیں ہو سکتی تھی۔

''شک تو مجھے پچھلے کئی مہینوں سے تھا، تمہیں پتا ہے امیمہ! اللہ نے عورت کے دل میں ایک بڑا حساس آلہ فٹ کر رکھا ہے۔ شوہر کوئی گڑبڑ یا بے ایمانی کر رہا ہو تو بیوی کے دل کو فوراً خبر ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی میرے دل نے یہ خبر دی تھی لیکن میں نے اپنے دل کی اس اطلاع پر الٹا اسی کو ڈانٹ ڈپٹ دیا تھا۔ میرا اندھا یقین ہی مجھے لے ڈوبا، اپنے شک اور وہم کو گہری نیند سلا کر میں بڑے مزے میں تھی۔ بظاہر کوئی گڑبڑ تھی بھی نہیں، ان کا رویہ میرے اور بچیوں کے ساتھ بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہمیشہ ہوا کرتا ہے بلکہ اسے سے بھی کچھ زیادہ ہی اچھا۔ وہی ہم لوگوں کو آؤٹنگ پر لے جانا، ہر دوسرے تیسرے دن باہر کھانا کھلانا، شاپنگ کروانا، سب کچھ بہت اچھا تھا۔ ان کے کسی انداز سے میں کوئی شک کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ایسے میں اپنے دل میں ابھرتے وہم کو میں نے ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی یہاں تک کہ انہوں نے گھر لنچ بھجوائے جانے سے منع کیا تو میں اسے بھی ان کی محبت اور اپنا خیال رکھا جانا ہی سمجھی۔ کہا بھی انہوں نے مجھ سے یہی تھا کہ ''اب ڈرائیور کو لنچ لینے کے لیے گھر نہیں بھیجا کروں گا، تم پر ویسے ہی گھر کے اتنے کاموں کا بوجھ ہے، آفس میں ہی کہیں باہر سے منگوا کر لنچ کر لیا کروں گا۔''

میں ایسی پاگل اور بے وقوف لڑکی کہ ان کی چالاکی سمجھی ہی نہیں، لنچ تو روز انہیں اس ''ڈائن'' کے ساتھ کسی اچھی سی جگہ پر کرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں میرے محبت سے پکا کر بھیجے گئے کھانے کی ضرورت کسے ہے۔''

وہ پھر رونا شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ کیا پیر صاحب اور ان کے تعویذ گنڈوں کے باوجود عدیل بھائی کی زندگی میں واقعی ایک عدد ''ڈائن'' آ چکی تھی۔

''دو چار دفعہ لنچ ٹائم میں آفس فون کرنے پر ان کی سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ سر لنچ کرنے باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں نے زیادہ کریدا تو پتا چلا وہ ''چڑیل'' جس کے ساتھ آج کل روزانہ پابندی سے لنچ ہو رہا ہے وہ بھی کسی نہ کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر وہ ان کے آفس میں نئی اپوائنٹ ہوئی ہے۔ عدیل ہی کے انڈر کام کر رہی ہے۔ بالکل فریش ایم بی اے کر کے آئی ہے اور انہیں دیکھو اپنی ایک ماتحت جو بالکل جونیئر ہے اسے

سارے شہر میں لے کر گھومتے پھر رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ مجھے تو کبھی پتا ہی نہیں چلے گا۔ میں تو جیسے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھی ہوں، ان کی چکنی چپڑی محبت بھری باتوں میں کھوئی رہوں گی۔ ایسی احمق بھی نہیں ہوں میں اور کل تو میں نے خود ان دونوں کو میک ڈونلڈ میں ساتھ بیٹھے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔''

ان کی اس بات پر میرا فطری تجسس پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔

''کیسی ہے وہ؟ کیا بہت حسین ہے اور انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ کر آپ نے ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟''

میرے پوچھنے پر وہ نفرت حقارت سے گویا ہوئیں۔

''حسین اور خوبصورت کیا، خالی ادائیں ہی ادائیں ہیں اور جوانی میں تو گدھی پر بھی بہار آ جاتی ہے۔''

وہ اب دوپٹے سے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ خشک کر رہی تھیں پھر جیسے کچھ یاد آ جانے پر خود ہی دوبارہ بولنا شروع ہو گئیں۔

''تمہیں تو پتا ہے معروف ڈیزائنر کے ڈریسز کے علاوہ کوئی کپڑے پہننا مجھے پسند نہیں۔ آواری کراچی اور لاہور کے مشہور ڈریس ڈیزائنرز کی سردیوں کے ڈیزائن کیے گئے ملبوسات کی نمائش لگی تھی۔ میں فروا اور مریم کو لے کر کل وہیں گئی تھی۔ زیادہ نہیں بس ایک ہی سوٹ خریدا میں نے پندرہ ہزار کا۔ واپسی میں فروا اور مریم پیچھے لگ گئیں کہ ہمیں میک ڈونلڈ لے چلیں۔ انہیں ہی لے کر گئی تھی وہاں۔ ابھی ہم لوگ اندر بھی نہیں گھسے تھے کہ سامنے کی میز پر عدیل اور وہ حرافہ آمنے سامنے بیٹھے نظر آئے۔ کیا پیار بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جا رہا تھا۔ بچیوں کے سامنے اور وہ بھی کسی پبلک پلیس پر کیا سین کری ایٹ کرتی اسی لیے انہیں بہلا پھسلا کر خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ عشق کی پینگیں بڑھاتے انہوں نے تو میری طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔''

اتنی مصیبت اور غم میں ہونے کے باوجود وہ مجھے سوٹ کی قیمت بتانا نہیں بھولی تھیں۔

''رسی جل گئی پر بل نہیں گئے۔'' میں نے دل میں سوچا تھا۔ اگرچہ کہ اس وقت مجھے ان سے بہت ہمدردی ہو رہی تھی، دل بھر کر ان پر ترس آ رہا تھا لیکن یہ اوچھا پن ہمیشہ کی طرح مجھے زہر ہی لگا تھا۔ وہ میرے تاثرات سے بے خبر بولنے میں مصروف تھیں۔

''کل تو انہیں آفس کے کام سے ارجنٹ فیصل آباد جانا پڑ گیا، آج شام میں واپس آئیں گے۔ اب پتا نہیں یہ آفس کا کام تھا بھی یا نہیں۔ میرا تو اعتبار ہی ختم ہو گیا ہے۔ بہر حال جو بھی ہے آج ذرا یہ حضرت آئیں تو سہی۔ ایسی کمزور بھی نہیں ہوں میں۔ آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکیں گے اور میں خاموش تماشائی بنی رہوں گی۔''

وہ عدیل بھائی کا حشر نشر کرنے کو تلی بیٹھی تھیں۔ میں بے ساختہ انہیں اس کارروائی سے روکنے سے خود کو روک نہیں پائی تھی۔

''آپ ایسا کچھ مت کیجئے گا بھابھی! ابھی تو وہ اس خیال میں ہیں کہ آپ کو کچھ پتا ہی نہیں، ساری بات کھل گئی تو یہ لحاظ اور مروت بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر تو وہ اور بھی کھل کر اور ڈھٹائی سے ''اس'' سے ملا کریں گے۔ آپ کیا انہیں ایسا کرنے سے روک سکتی ہیں۔ ہم عورتوں کے اختیار میں ہے ہی کیا۔ بس صرف یہ آنسو جو ہم موقع بہ موقع کثرت سے بہاتے ہیں۔ آپ خاموشی اور بردباری سے معاملے کو ہینڈل کرنے کی کوشش کریں۔''

میرا مخلصانہ انداز میں دیا گیا مشورہ انہیں بہت پسند آیا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو امیمہ! غصے سے کام بگڑتے ہیں۔ شکر ہے تم آ گئیں ورنہ آج تو میں فیصلہ کیے بیٹھی تھی کہ عدیل کو چھوڑوں گی نہیں۔ تھینک یو امیمہ! تم واقعی میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آ گئیں۔ صحیح کہہ رہی ہو تم، مجھے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ جلد بازی اور جذباتی ہونے سے نقصان میرا ہی ہوگا۔''

وہ میرے ہاتھ تھام کر تشکرانہ انداز میں بولی تھیں۔

☆

''عدیل بھائی آج کل کسی لڑکی کے چکر میں ہیں۔''

میں نے ٹی وی دیکھتے اسامہ کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ایک تو خیر میں پیٹ کی ویسے ہی بہت ہلکی ہوں دوسرے اس وقت تو میں کسی نہ کسی طرح ان کی توجہ ٹی وی اسکرین پر سے ہٹا لینا چاہتی تھی۔ وہ ESPN پر ٹینس کا خدا معلوم کون سا ٹورنامنٹ دیکھ رہے تھے۔ اسپورٹس میں انہیں بے تحاشا دلچسپی ہے میں جانتی ہوں اور ٹینس میں تو خاص طور پر دلچسپی ہے۔ بات یہیں تک ہوتی تو غنیمت تھا لیکن اس دلچسپی کی اصل وجہ تو اینا کورنیکوا ہے، جانتے ہی ہوں گے آپ لوگ اسے۔ آج کل ساری دنیا کے مردوں کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی ہے کم بخت، پچھلے دنوں اسے ایک اعزاز سے بھی نوازا گیا ہے اور وہ اعزاز اور ایوارڈ ایسا ہے کہ ہمارے ہاں کی کسی خاتون کو دیا جائے تو وہ اعزاز دینے والے کی جوتوں سے تواضع کرے گی۔ اب اگر اس اعزاز کے بارے میں زیادہ تفصیل آپ کو نہیں معلوم تو کسی باخبر بندے سے معلوم کر لیں۔ میں تو بھئی سچی بات ہے شرمیلی بہت ہوں، ایسی بات بتاتے مجھے شرم آ رہی ہے۔ اسامہ کی تو فیورٹ ہے اینا کورنیکوا۔ مجال ہے جو اس کا کوئی میچ مس کر دیں یہاں تک کہ کسی اسپورٹس چینل پر اس کا کوئی پرانا میچ بھی آ رہا ہو تو اتنی دلچسپی سے دیکھیں گے، کھیل کو نہیں اینا کورنیکوا کو۔ اور یہ بات میں کس طرح برداشت کر سکتی ہوں۔ جب بھی اسامہ ٹی وی پر اسے دیکھنے بیٹھتے ہیں میں بھی پاس آ کر بیٹھ جاتی ہوں، کبھی انہیں باتوں میں لگانے کی کوشش کرتی ہوں یا کبھی ''اس وقت تو فلاں چینل پر میرا فلاں پسندیدہ ڈرامہ آ رہا ہوگا'' کہہ کر چینل بدل دیتی ہوں۔

اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ وہ سنہری زلفوں والی روسی حسینہ مسلسل میرا بی پی بڑھا رہی تھی اور میں میاں کی توجہ اپنی طرف کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''آپ سن نہیں رہے میری بات۔ میں آپ کو عدیل بھائی کے بارے میں بتا رہی ہوں، کسی لڑکی سے عشق فرما رہے ہیں موصوف۔'' میں نے دوبارہ انہیں مخاطب کیا تھا۔

''سن لیا ہے میں نے۔'' انہوں نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹائے بغیر مجھے جواب دیا تھا۔

''اور اگر کسی لڑکی سے اسے عشق یا محبت قسم کی کوئی چیز ہو ہی گئی ہے تو اس میں اتنا حیران ہونے یا برا ماننے کی کیا بات ہے، وہ بھی انسان ہے۔ آخر کب تک اپنی موٹی بیگم کے گن گاتا رہے۔ میں تو پہلے بھی اس کے حوصلے اور ہمت پر حیران ہوا کرتا تھا۔ اتنا ہینڈسم اور اسمارٹ بندہ کب

تک اپنے وزن سے بھی وزنی بیوی کے نخرے اٹھا سکتا ہے۔ میں اس کی جگہ ہوتا اور میری بیوی اتنی موٹی ہوتی تو میں تو پہلی فرصت میں خاتون کو ہاتھ پکڑ کر باہر نکالتا اور ایک خوبصورت، دبلی پتلی اور نازک سی لڑکی کو بیاہ کر لے آتا۔''

وہ ہنوز اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولے تھے اور میرا سکون اور اطمینان غارت ہو گیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے اگر کبھی میں موٹی ہو گئی تو مجھے چھوڑ کر آپ دوسری شادی کر لیں گے۔'' میرا رنج اور صدمے سے برا حال تھا۔

''بالکل.....'' وہ قابلِ رشک حد تک مطمئن تھے۔ ''عدیل جیسا صابر کوئی ہوتا ہے۔ میں تو بیوی کے روپ میں جرمن ٹینک کو بھی برداشت نہیں کروں۔ تم ایک کلو بھی ذرا اپنا وزن بڑھا کر تو دکھاؤ اگلے ہی دن ایک حسین اور نازک سی لڑکی میری زندگی میں آ چکی ہو گی۔''

وہ ذرا سی بھی مروت برتے بغیر صاف گوئی سے بولے تھے۔ ابھی تو خیر فکر کی کوئی بات نہیں میں بہت سلم اور نازک سی ہوں لیکن آنے والے وقت کا کسے پتا ہے۔ اگر جو کل کو میرا وزن تھوڑا بہت بھی بڑھ گیا تو یہ تو مجھے گڈ بائے کہنے میں ایک لمحہ نہیں لگائیں گے۔ ساحرہ بھابھی کو بھول کو یہاں تک کہ اینا کورنیکوا کو بھی بھول کر میں اپنے غم میں پڑ گئی تھی۔ انہوں نے میرے مزید کچھ نہ بولنے پر ٹی وی پر سے نظریں ہٹا کر بغور مجھے دیکھا۔

''ابھی سے زیادہ غم مت کرو۔ پچاس کلو ساڑھے پانچ فٹ قد کے حساب سے مناسب وزن ہے۔ فی الحال تم سے زیادہ خوبصورت اور سلم لڑکی میرے اردگرد دوسری کوئی بھی نہیں ہے۔''

بڑے دنوں بعد انہوں نے مجھے خوبصورت کہا تھا۔ میرا مرجھایا ہوا دل پھر بھی زیادہ خوش نہیں ہو پایا تھا۔ بات تو انہوں نے فی الحال کی کی ہے یعنی آگے گنجائش نکل سکتی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے زیادہ خوب صورت اور نازک اندام مل گئی تو۔ میں نے شاکی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''بالکل سچ کہہ رہا ہوں یار! کسی خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھوں تو بھی اس کے خوبصورتی کے پوائنٹس تم سے کم نکلتے ہیں۔'' وہ زیادہ ہی خوشگوار موڈ میں تھے ورنہ میری ایسی تعریف کرنا تو انہوں نے خود پر حرام قرار دے رکھا تھا۔

''پھر بھی گھنٹوں بیٹھ کر اتنی محویت سے اینا کورنیکوا کو دیکھتے ہیں۔''

شکوہ آخر کار میرے لبوں سے نکل ہی گیا تھا۔ وہ جواباً قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

☆

ایک عورت ہونے کے ناتے (یہاں عورت سے مراد کم عمری لڑکی یعنی میں امیمہ ظہیر ہوں) میں ساحرہ بھابھی کا غم اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہی تھی۔ ان کی سابقہ تمام اچھی باتوں کو بھلا کر میں اس وقت صحیح معنوں میں ان کی ہمدرد اور غمگسار بنی ہوئی تھی۔ میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے عدیل بھائی سے کوئی جھگڑا نہیں کیا تھا بلکہ اس طرح شو کیا تھا جیسے انہیں میاں کے کرتوتوں کے بارے میں کوئی علم ہی نہیں۔ اسامہ کے ان کے موٹاپے پر دیے جانے والے کمنٹس نے مجھے ایک نئی سوچ دی تھی۔

میں اگلے ہی روز اسامہ کے آفس جاتے ہی ان کے گھر آ گئی تھی۔ وہ میرے خلوص اور اپنے لیے میری اتنی فکرمندی پر ہلکا سا مسکرائی تھیں ورنہ آج کل تو مسکراہٹ ان کے پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ زندہ دلی سے قہقہے لگانے والی وہ خوش باش خاتون چند دنوں میں ہی مرجھائی مرجھائی اور

برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھیں۔ میرا مشورہ انہوں نے بہت توجہ سے سنا تھا۔

''آپ تو ماشاءاللہ اتنی خوبصورت ہیں، بس ذرا سا اپنا وزن کم کرلیں تو اس ''ڈائن'' سے زیادہ ینگ اور خوبصورت نظر آئیں گی۔ آپ ان کے بچوں کی ماں ہیں، اتنی آسانی سے تو وہ ویسے بھی آپ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ بس ذرا تھوڑی سی ہمت اور کوشش کریں، یہ بازی آپ ہی جیتیں گی۔''

میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بجھے دل سے نفی میں سر ہلا رہی تھیں۔

''اگر میں خوبصورت، سلم اور کم عمر نظر آؤں گی بس تب تک ہی وہ مجھ سے محبت کریں گے۔ جس روز خوبصورتی کے اس پیمانے سے کم نظر آئی تو ان کے دل سے ہی اتر جاؤں گی۔ ایسی غرض میں لپٹی محبت مجھے نہیں چاہیے۔''

ان پر قنوطیت اور مایوسی کا شدید ترین دورہ پڑا ہوا تھا لیکن میں انہیں سمجھانے اور قائل کرنے میں مسلسل مصروف تھی۔

''کیا کریں ساحرہ بھابھی! مردوں کی قوم ہے ہی ایسی۔ ہم ان کی فطرت بدل تو نہیں سکتے۔ کمپرومائز کرنے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔ آپ ان تمام مایوسی بھرے خیالات کو اپنے ذہن سے نکالیں اور میرے ساتھ چلیں، وہاں ایروبکس یا یوگا کلاسز میں داخلہ لے لیں، وہیں سے آپ کو ڈائٹ پلان بھی مل جائے گا۔ انشاءاللہ پندرہ بیس روز میں ہی تھوڑا بہت فرق نظر آنا شروع ہو جائے گا۔ آپ کی تو ہائٹ بھی اچھی خاصی ہے۔ ذرا سا بھی وزن کم کرلیں تو بہت دبلی نہ بھی سہی لیکن خاصی سلم نظر آنے لگیں گی۔ پھر آپ جیسی حسین بیوی کو چھوڑ کر عدیل بھائی کہیں اور نظر ڈالنا ہی بھول جائیں گے۔''

میرے کافی دیر تک سمجھانے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے تھے۔ وہ میرے ساتھ بیوٹی پارلر جانے پر آمادہ ہوگئی تھیں۔ وہاں ان کا داخلہ کروا کر اور پھر واپسی میں سارا راستہ انہیں کھانے پینے میں احتیاط برتنے کا سمجھانے کے بعد میں گھر واپس آگئی تھی۔ ایک نیک کام کر کے دل کو بڑا سکون ملا تھا۔ کسی کا گھر برباد ہونے سے میں بچا رہی ہوں اور یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ میری جگہ کوئی مزہ لینے والی عورت (لڑکی) ہوتی تو بجائے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے اور کوئی صائب مشورہ دینے کے جھگڑے کو اور ہوا دیتی۔ ان کا غصہ بھڑکاتی، نتیجتاً یہ دونوں میاں بیوی باہم لڑتے جھگڑتے اور چیختے اور چلاتے نظر آتے۔ اللہ کی عطا ہے اس نے مجھے اتنا نرم دل بنایا ہے۔ ہمدردی اور رحم کے جذبات مجھ میں اتنے وافر ڈال دیئے ہیں۔

ادھر ساحرہ بھابھی کی زوردار ڈائٹنگ اور ایکسرسائز چل رہی تھیں ادھر عدیل بھائی کا اس ''ڈائن'' کے ساتھ زوردار عشق۔ کسی کسی وقت وہ مایوس ہونے بھی لگتیں تو میں ان کا حوصلہ بڑھا کر انہیں نئے سرے سے مقابلے کے لیے تیار کرتی تھی۔ میرے سمجھانے پر انہوں نے کالج گرلز والے فیشن کرنے بھی چھوڑ دیئے تھے۔ لباس بھی اس طرح کا پہننے لگی تھیں جس میں ان کا موٹاپا زیادہ نمایاں نہ ہو بلکہ وہ ایک قدرے بھرے بھرے جسم والی عورت نظر آئیں۔ میں کیونکہ اب ان کے بہت زیادہ نزدیک آچکی تھی اس لیے ایک روز بڑے اپنائیت بھرے انداز میں میں نے انہیں عدیل بھائی کو اس ''حرافہ'' کے چنگل سے نکالنے کے لیے پیر صاحب سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جب وہ اتنی کرامت والے بزرگ ہیں تو پھر یہ کام تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ انہوں نے بزرگ کا نام سن کر تنفر سے کہا تھا۔

''اتنا ان کے تعویذوں میں اثر ہوتا تو میرا میاں مجھے یوں دھوکا دے کر کسی اور طرف منہ ہی کیوں مارتا۔ سب یہ ہم جیسی بے وقوف عورتوں کو لوٹنے کے دھندے ہیں، بلاوجہ میں ممی کی باتوں میں آ گئی تھی بلکہ اب تو مجھے ایسا لگتا ہے یہ عدیل کو ان کے گھر والوں سے دور کرنے کی اللہ مجھے سزا دے رہا ہے۔ اس نے میری رسی دراز کر رکھی تھی۔ میں اسے پیر صاحب کی کرامت سمجھتی رہی میں نے ایک ماں سے اس کا بیٹا چھین لیا تھا۔ کیا اللہ مجھے سزا نہ دیتا۔ میرا اتنا چاہنے والا شوہر مجھ سے یوں بدظن اور دور ہو گیا۔ یہ سب میرے اعمال کی سزا ہے۔''

میں ان کے منہ سے یہ بات سن کر حیران رہ گئی تھی۔ اپنے سسرالیوں خاص طور پر ساس کا تو وہ نام سننا بھی پسند نہ کرتی تھیں اور کہاں آج ان ہی کا ذکر کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

''سب کے ساتھ رہنے میں کتنے فائدے ہوتے ہیں۔ ساس سسر کو اپنا بنا کر رکھا ہوتا تو آج ان سے جا کر کہتی کہ دیکھیں آپ کا بیٹا آپ کی اتنی نیک اور فرمانبردار بہو کے ہوتے ہوئے دوسری عورتوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ وہ میرا ساتھ دیتے، بیٹے کو لعنت ملامت کرتے، اسے برا بھلا کہتے۔ اب میں کس منہ سے ان سے مدد مانگنے جاؤں، کیسے جا کر کہوں کہ عدیل قریشی دوسری شادی کرنے کے چکر میں ہے۔ روکیں آپ لوگ اسے۔''

ان پر خطرناک حد تک سچ بولنے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ میں اس بدلے ہوئے لب و لہجے اور ان کے خود اپنے آپ کو ہی قصوروار قرار دینے پر مارے حیرت کے ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔

پھر آنے والے دن اپنے ساتھ کئی حیران کن باتیں لے کر آئے تھے۔ ایک مہینہ بلاناغہ ایکسرسائز اور ڈائٹنگ کرنے سے وہ اپنا وزن بہت زیادہ تو نہیں لیکن تھوڑا بہت کم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھیں۔ ان سے زیادہ میں ان کا وزن کم ہونے پر خوش تھی اور ابھی اسی خوشی میں مگن ہی تھی کہ ایک روز وہ مجھ سے الوداعی ملاقات کرنے آ گئیں۔ وہ واپس اپنے سسرال جا رہی تھیں ان کے لیے کولڈ ڈرنک نکالتے بوتل اور گلاس دونوں میرے ہاتھ سے گر پڑے تھے۔

''عدیل جانے پر راضی نہیں، کہتے ہیں اب واپس کس منہ سے جائیں گے لیکن میں نے انہیں زبردستی راضی کر لیا ہے۔ وہاں کسی کو پتا نہیں ہمارے آنے کا۔ مجھے پتا ہے وہاں سب کا رویہ میرے ساتھ کیسا ہوگا۔ سب مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیں گے لیکن اس بار میں وہاں سب کے دل جیتنے جا رہی ہوں۔ وہ مجھ سے کتنے بھی ناراض سہی میں اپنی محبت اور خدمت سے ان کے دلوں میں جگہ بنا لوں گی اور تم یہ مت سمجھنا امیمہ! کہ میں اچانک بڑی نیک پروین بن گئی ہوں۔ یہ واپس جانا بھی دراصل میری خودغرض سوچ ہی ہے۔ وہ رشتوں کی اس مضبوط زنجیر سے دور ہو گئے تھے۔ میں واپس انہیں اسی زنجیر سے باندھنے جا رہی ہوں تاکہ پھر انہیں ایسے نئے رشتے تلاش کرنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ میں شوہر کو کسی کے بھی ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے محبت کرتے تو مجھے برا لگتا تھا لیکن ساس، سسر، نندوں اور دیوروں کے ساتھ میں ان کا پیار شیئر کر لوں گی کسی دوسری عورت کے ساتھ انہیں شیئر کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

وہ سر سے لے کر پاؤں تک تبدیل ہو گئی تھیں۔ ایک بالکل بدلی ہوئی ساحرہ قریشی میرے سامنے کھڑی تھیں۔ بہت سوبر اور بہت میچور..... میں نے نیک تمناؤں اور انہیں ان کے مقصد میں کامیابی کی دعائیں دیتے ہوئے رخصت کیا تھا۔ ان کے ہونے سے دوسرا ہٹ اور اجنبی

شہر میں اپنائیت کا احساس مل جایا کرتا تھا۔ اب وہ احساس مجھے کہاں سے ملے گا، جاتے جاتے وہ مہناز کو میرے پاس رکھوا گئی تھیں۔

''کام بھی اچھا کرتی ہے اور ایمان دار بھی بہت ہے۔ پیسہ، زیور کچھ بھی سامنے رکھا ہو آنکھ اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔ تمہیں کمپنی بھی مل جائے گی اور گھر کے کاموں میں تمہاری مدد بھی ہو جایا کرے گی۔''

دراصل مہناز ان کے ہاں کا کام چھوٹ جانے پر بہت پریشان تھی۔ اس سے زیادہ اس کی ماں جو بیٹی کو ایسے ویسے کسی گھر میں کام کے لیے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی، ساحرہ بھابھی کے ہاں کا اچھا ماحول اور دن میں گھر پر کسی مرد کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہی اس نے بیٹی کو دن بھر کے لیے ان کے پاس چھوڑ رکھا تھا۔ صبح سات بجے آ کر وہ رات آٹھ بجے جایا کرتی تھی۔ خوبصورت، جوان بیٹی گھر گھر پھرنے اور ایسی ویسی نظروں سے بچ بھی گئی تھی اور آمدنی کا بھی معقول انتظام ہو گیا تھا۔ میں کون سی ایسی باختیار تھی جو اپنی مرضی سے کوئی ملازمہ رکھ سکتی۔ اسامہ سے پوچھے بغیر میں ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ خلاف توقع انہوں نے بغیر کسی بحث اور ''بجٹ آؤٹ ہو جائے گا'' وغیرہ کا ذکر کیے بغیر اسے ملازمہ رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔

☆

ساحرہ بھابھی کے علاوہ اپنی بلڈنگ میں سوائے ہائے ہیلو کے میری کسی سے ایسی کوئی خاص دوستی نہیں تھی کہ وقت بے وقت بوریت دور کرنے ان کے گھر پہنچ جاؤں چنانچہ مہناز کے آجانے پر میں نے کسی قدر دوسراہٹ محسوس کی۔ چلو کوئی بات کرنے والا تو ملا۔ پھر وہ لڑکی سمجھدار اور ذہین بھی تھی۔ باتیں بھی خاصی معقول کرتی تھی۔ جتنی تیزی سے اس کی زبان چلتی تھی اس سے بھی زیادہ تیزی سے ہاتھ پاؤں۔ بڑے سے بڑا کام وہ منٹوں میں کر کے رکھ دیا کرتی تھی۔ پہلے جو اسامہ کے آفس جاتے وقت صبح گھر پر ایمرجنسی کا نفاذ ہوا رہتا تھا اب اس کا دور دور ذکر نہیں تھا۔

وہ ٹھیک سات بجے آتی اور آتے ہی کچن میں گھس جایا کرتی تھی۔ جھٹ پٹ ناشتہ بنا کر اور ٹیبل پر لگا کر وہ میرے پاس کمرے میں آ جایا کرتی۔ میں ابھی جمائیاں لیتی، اسامہ کے کپڑے ہی استری کر رہی ہوتی تھی وہ مجھے ہٹا کر خود کپڑے استری کر دیتی اور پھر اسی پھرتی سے ان کے جوتے پالش کر کے رکھ دیتی۔

چند دنوں میں ہی وہ سارا کام اتنی اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ مجھے کسی بات پر ٹوکنے یا سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی تھی حالانکہ وہ بمشکل سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ بالکل اسامہ کی مرضی کے مطابق مشروم زوالا آملیٹ بناتی۔ اتنا اچھا اور پھولا پھولا آملیٹ تو مجھ سے بھی نہیں بنتا تھا۔ روز ناشتہ کرتے ہوئے وہ تب ہی تو ممی کے ہاتھوں کے آملیٹ کو یاد کیا کرتے تھے اور صبح صبح میرا خون جلایا کرتے تھے۔ اب صبح صبح ممی کا ذکر سننے سے میرے کان بچ گئے تھے اور بڑی محنت سے بنا بنایا خون بھی جلنے سے بچ گیا تھا۔ چائے تو وہ اتنی مزے کی بناتی تھی کہ اکثر ناشتے میں اسامہ دو کپ چائے پینے لگے تھے۔ وہ بہت اچھی طرح اور ذمہ داری سے کام کر رہی تھی۔

میں اس سے بہت خوش تھی۔ کچھ اس خوشی کی وجہ سے اور کچھ اپنی سدا کی مہربان طبیعت کی وجہ سے میں نے بے دھڑک اپنے کئی اچھے اچھے اور قیمتی جوڑے اسے دے ڈالے تھے۔ وہ تھی بھی بہت کم عمر اس لیے اسے سجنے بننے کا شوق بھی بہت تھا۔ ہر روز میرے دیئے کپڑوں میں سے کوئی اچھا اور خوبصورت سا سوٹ پہن کر اور میری ہی دی ہوئی میچنگ کی چوڑیاں اور ایئر رنگز وغیرہ پہن کر وہ خوب سج دھج کر آتی تھی۔ کبھی کوئی مہمان گھر پر

آتا تو اتنی خوبصورت اور صاف ستھری ملازمہ ملنے پر میری خوش قسمتی پر رشک کرتا تھا۔

اس نے مجھے کافی حد تک آرام طلب اور سست بنا دیا تھا۔ پہلے جو میں پھرکی کی طرح سارا دن گھر کے کاموں میں مصروف گھومتی رہتی تھی اب خاصی آرام اور سکون میں تھی لیکن یہ آرام اور سکون ہی تو مجھے درحقیقت مہنگا پڑ گیا تھا۔ ساحرہ بھابھی نے کہا تھا کہ مردوں کی ذات بڑی خبیث ہوتی ہے تو کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ ان کے شوہر نے تو پھر کچھ اپنے اسٹینڈرز اور اسٹیٹس کا خیال رکھا تھا اور ایک ایم بی اے پاس امیر گھرانے کی لڑکی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ میرے شوہر صاحب کا معیار اتنا گرا ہوا تھا کہ انہیں گھر میں کام کرنے والی ایک معمولی ملازمہ دل لگانے کے لیے معقول نظر آئی تھی۔ میرے مقابلے پر کسی کو لا ہی رہے تھے تو کم از کم وہ میرے مقابلے کی تو ہوتی۔ ایک معمولی نوکرانی کو انہوں نے میرے برابر لا کھڑا کیا تھا۔

میرا مارے رنج اور صدمے کے جو حال ہو جاتا کم تھا۔ ساحرہ بھابھی کو تو چلو ان کے اعمال کی سزا ملی تھی۔ میں تو کبھی بھولے بھٹکے بھی کسی پیر یا بابے کے پاس نہیں گئی اور سسرالیوں سے دور ہوں تو کون سا اس میں میری کسی کوشش کا دخل ہے۔ دوبارہ ان کی اسلام آباد پوسٹنگ ہو جائے تو ہم سب کے ساتھ ہی رہیں گے۔ کبھی کسی کا دل بھی نہیں دکھایا۔ ہمیشہ سب کا بھلا ہی چاہا پھر بھی میرے ساتھ یہ سب ہو رہا تھا۔

میرا دل چیخ چیخ کر رونے اور ماتم کرنے کو چاہ رہا تھا۔ میں ہمیشہ ہی سے بہت سیدھی سادی اور بھولی بھالی ہوں۔ لوگوں کی مکاریاں اور عیاریاں سمجھنی مجھے کبھی آئی ہی نہیں۔ اپنی اس سادگی کے ہاتھوں مار کھا گئی۔

شروع شروع میں اسامہ کی مہناز میں زیادہ توجہ کو میں نے محسوس ہی نہیں کیا۔ وہ مجھ سے کہنے کے بجائے اپنا ہر کام اس سے کروانے لگے تھے۔ اس کے بنائے ناشتے اور چائے کی خوب تعریفیں کی جاتیں اور وہ بھی میرے سامنے۔ میں ایسی احمق کہ ان کی تعریفوں پر خوش ہوا کرتی تھی۔ پہلی مرتبہ چونکی تو میں اس وقت جب مجھے اپنے جوتے پالش کرتے دیکھ کر انہوں نے ٹوک دیا تھا۔

''تم رہنے دو، مہناز بہت اچھی طرح جوتے چمکاتی ہے، کہاں ہے وہ بلاؤ اسے۔''

کیسا محبت سے اس کا نام لیا گیا تھا۔ مجھے آگ ہی تو لگ گئی تھی۔ پھر میرے جواب دینے سے پہلے انہوں نے خود ہی مہناز کو آواز دے کر بلایا تھا۔ وہ کچن میں تھی۔ تیزی سے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی وہ کمرے میں آئی تھی۔

''جی بھائی.....'' وہ اسامہ کو بھائی اور مجھے باجی کہا کرتی تھی۔ بھائی کہنے سے کوئی بھائی بن تھوڑی جاتا ہے۔ اس کی نیت میں فتور تھا یا نہیں لیکن بھائی صاحب کی نیت تو خراب تھی۔ میرے ہی دیئے کاٹن کے اسٹا ملکش سے ریڈ سوٹ میں وہ خطرناک حد تک حسین لگ رہی تھی۔

میں نے نگاہیں بدل کر اسے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ میں ایک فتنہ خود اپنے ہاتھوں اپنے گھر لے آئی ہوں۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا اسے ہی کہا جاتا ہے۔ ایک تو منحوس خوبصورت بلا کی ہے۔ اس پر کم بخت کا فگر اور ہائٹ بھی غضب کی ہے۔ کیا سشمیتا کا فگر اور ہائٹ ہوگی جو اس کی تھی۔ میں دل پر ہاتھ رکھے اس شعلہ ساماں اور کافر ادا حسینہ پر اپنے میاں کی مسلسل مرکوز گہری نظریں خاموشی سے دیکھ رہی تھی اور ان نگاہوں کی گہرائی دیکھ کر میرا دل اندر ہی اندر ڈوبا جا رہا تھا۔

دل چاہا اسی وقت اس منحوس کو اپنے گھر سے ہاتھ پکڑ کر نکال دوں۔ کیسا گھنا شوہر ملا تھا مجھے۔ میری ہی آنکھوں کے سامنے گھر کی نوکرانی

سے عشق فرمایا جارہا تھا اور میں احمقوں کی سردار ان کی ہر بات اور ہر کام کے لیے مہناز کو آواز دینے اور اس کی جا بے جا تعریفوں کی اصل وجہ سمجھ ہی نہیں پائی۔

''تم بہت اچھے جوتے پالش کرتی ہو مہناز! تمہاری باجی جس طرح اور کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتیں ایسے ہی جوتے چمکانے بھی انہیں کبھی نہیں آئے۔''

وہ ایک شرارتی نگاہ مجھ پر ڈال کر بے تکلفانہ انداز میں اس سے مخاطب تھے۔ وہ ان کا مذاق انجوائے کرتی ہنستے ہوئے جوتے چمکانے بیٹھ گئی تھی۔ میرا غصے کے مارے برا حال تھا۔ سخت غصے میں پیر پٹختی میں کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ باہر نکلتے ہی اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔ یہ تو میں خود ان دونوں کو موقع فراہم کر رہی ہوں لیکن اب واپس اندر جاتے ہوئے اناء آڑے آرہی تھی۔ ناچار دل پر بوجھ اور پچھتاوا لیے لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی تھی۔

وہ ان کے جوتے پالش کر چکی ہوگی۔ اب خود اپنے ہاتھوں سے انہیں جوتے پہنا رہی ہوگی۔ وہ بیڈ پر بیٹھے اپنے بالکل سامنے کارپیٹ پر بیٹھ کر جوتے پہناتی حسین دوشیزہ کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ ان کی نگاہوں سے شرما کر سر جھکائے مسکرا رہی ہوگی اور مسکراتے ہوئے اس کے گالوں میں ڈمپل بھی پڑ رہے ہوں گے۔ اور اس کے ان ڈمپلز پر وہ اپنی کل کائنات قربان کرنے کو تیار ہوں گے۔ میں اس منظر کو سوچتی خود کو بمشکل رونے سے روک رہی تھی۔ کافی دیر بعد وہ ڈائننگ روم میں آئے تھے۔

وہ ڈائننگ ٹیبل پر آکر بیٹھے تو میں لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھ کر تپ گئی تھی۔ میری ناراضی کی اس سے پہلے کب کوئی پرواہ کی گئی تھی جو آج کی جاتی اور اپنے حساب سے تو انہوں نے مجھ سے ایک مذاق کیا تھا جس پر میں خوامخواہ برا مان گئی تھی۔ میرے ہی کہنے پر آج مہناز نے ناشتے میں پوریاں اور آلو کی ترکاری بنائی تھی۔ وہ بھاگ بھاگ کر اسامہ کے لیے گرما گرم پوریاں لا رہی تھی اور وہ خوب مزے لے لے کر اس کے پکائے کھانوں کی تعریفیں کرتے کھانے میں مصروف تھے حالانکہ روزانہ ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرتے تھے لیکن آج میرے ان کے ساتھ ناشتہ نہ کرنے کا انہوں نے ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔

خوب اچھی طرح ناشتہ کر کے اور حسب معمول فرمائش کر کے مہناز سے ایک کپ چائے اور منگوا کر اور اسے مزے لے لے کر پی چکنے کے بعد وہ ایک سرسری سی نگاہ مجھ پر ڈال کر ٹیبل سے اٹھ گئے تھے۔ میں بظاہر اخبار اپنے سامنے پھیلائے بیٹھی تھی۔ وہ بریف کیس اور موبائل اٹھا کر بغیر مجھے خدا حافظ کہے ڈائننگ روم سے نکل گئے تھے حالانکہ ہمارے فلیٹ کے مین دروازے میں آٹو میٹک لاک لگا ہے۔ پیچھے دروازہ بند کرنے کے لیے کسی کے جانے کی ضرورت نہیں لیکن مہناز پھر بھی ان کے پیچھے پیچھے گئی تھی۔ میں سلگ کر رہ گئی تھی۔

''تمہاری جل ککڑی باجی کا موڈ ٹھیک ہو جائے تو انہیں ناشتہ کروا دینا۔''

ان کی شوخ سی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ جواباً مہناز کیا بولی یہ مجھے سنائی نہیں دیا تھا۔ ناشتہ تو خیر مجھے کیا کرنا تھا بہت بن چکی میں الو۔ میں نے اسی شام جب مہناز کی ماں اسے لینے آئی تو اس کے ہاتھ میں اس مہینے کی پوری تنخواہ رکھ کر کل سے کام پر نہ آنے کا کہہ دیا۔ اگرچہ ابھی

''آپ کا اس بات سے کیا تعلق ہے، اسے میں نے اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے رکھا تھا۔ رکھا بھی میں نے ہی تھا اور نکالا بھی میں نے ہی ہے پھر آپ کو اس قدر تکلیف کیوں ہو رہی ہے؟''

میں نے طنزیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا تھا۔ اس لب و لہجے میں میں ان سے پہلی مرتبہ بات کر رہی تھی اور اس بات پر یقیناً وہ بے تحاشا حیران ہو رہے تھے۔

''کوئی وجہ بھی تو ہو نکالنے کی، یوں بے وجہ کسی سے اس کی روزی چھیننا اچھی بات تو نہیں۔''

میری بدتمیزی کا جواب انہوں نے بڑے تحمل سے دیا تھا لیکن میں اس منحوس کے لیے ہمدردی کا بخار چڑھتا دیکھ کر ہی آگ بگولہ ہو گئی تھی۔

''آپ کو بڑی اس کی ماما آ رہی ہے، بڑی سگی لگتی ہے وہ آپ کی۔'' غصے میں ایک بے تکی بات میرے منہ سے نکلی تھی۔

''کیا بدتمیزی ہے امیمہ! تم ہوش میں تو ہو۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ کس سے مخاطب ہو۔'' اب وہ بھی غصے میں آ گئے تھے لیکن آج میں اس غصے سے ڈرنے والی نہیں تھی۔

''جی ہاں ہوش میں ہوں بلکہ اب ہی جا کر تو ہوش میں آئی ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت میں اپنے عزت مآب عالی جناب شوہر نامدار سے مخاطب ہوں جو ایک معمولی سی ملازمہ سے میری آنکھوں کے سامنے عشق لڑا رہے ہیں۔''

جس بات سے میں نے ساحرہ بھابھی کو منع کیا تھا خود وہی بات کرنے لگی تھی۔ دوسروں کو نصیحت کرنا بہت آسان ہوتا ہے اور خود اس پر عمل کر بہت مشکل۔

''تمہیں شرم نہیں آئی ایسی بات کرتے ہوئے، وہ چھوٹی سی بچی، کیا میں اسے اس نظر سے..... لاحول ولا قوۃ.....''

غصہ میں انہوں نے اپنا جملہ ہی نامکمل چھوڑ دیا تھا، گھور گھور کر مجھے دیکھ رہے تھے ابھی کچا چبا جائیں گے۔

''اسے بچی کی نظر سے دیکھا ہوتا تب ناں، دنیا کے سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں، دل پھینک اور نظر باز میرے تو ایک ایک کام میں سو سو عیب نظر آتے ہیں اس کے ہر کام پر واہ واہ۔ آپ کو تو میں اپنی جان بھی نکال کر دے دوں تو یہی کہیں گے کہ یہ کیا بے کار چیز دی ہے، دینی ہی تھی تو کچھ ڈھنگ کی چیز تو دیتیں۔ مجھ میں سوائے کیڑے نکالنے کے کچھ آتا ہے آپ کو اور وہ ''بچی'' بڑی عزیز از جان ہو گئی ہے۔ اس کی ہر ادا اور ہر کام لاجواب ہے۔''

میں اپنی ایم اے کی ڈگری کو بھلائے بالکل جاہل عورت کی طرح ہاتھ نچا نچا کر انہیں طعنے دے رہی تھی۔

''بہت برداشت سے کام لے رہا ہوں میں ورنہ اس بے ہودگی اور بدتمیزی پر ایک تھپڑ تمہارے منہ پر مارتا۔''

وہ بلند آواز میں چیخے تھے، میں ان کے چیخنے اور تھپڑ مارنے والی بات پر بے اختیار رو پڑی تھی۔

''ہاں ایک اسی بات کی کمی رہ گئی ہے وہ بھی پوری کر لیں۔ مفت کی نوکرانی ہاتھ لگی ہے، چاہے جو سلوک کریں اف نہیں کرے گی۔''

میں روتے ہوئے بولی تھی۔ وہ میرے رونے پر غصے سے پاؤں پٹختے اور ''کس جہنم میں پھنس گیا ہوں میں'' کہتے واپس کمرے میں چلے گئے تھے۔

مہینہ ختم ہونے میں پورے بیس دن باقی تھے لیکن میں نے پھر بھی اسے پورے مہینے کے پیسے دے دیئے تھے۔ مہناز اور اس کی ماں میرے بدلے ہوئے رویئے اور کام سے منع کرنے والی بات پر صدمے سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

بندھی بندھائی معقول آمدنی ہاتھ سے جاتے دیکھ کر ان دونوں ہی کے منہ ست گئے تھے۔ مہناز کی شکل بالکل رونے والی ہو رہی تھی، اس کی ماں میرے ہاتھ پاؤں جوڑ جوڑ کر مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ مجھے اس کی بیٹی سے کیا شکایت ہے۔ کیا وہ کام صحیح نہیں کرتی، چھٹی کرتی ہے، وقت پر نہیں آتی۔

میں اسے کیا بتاتی کام کے حوالے سے تو اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ پچھلے دو مہینے اور اس مہینے کے یہ دس دن اس نے پوری ذمہ داری اور دیانت داری سے کام کیا تھا۔ وہ شاید اسامہ کی طرف سے اس طرح کے کسی نظریئے سے متوجہ بھی نہیں تھی اور اگر بالفرض تھی بھی تو اس کم عمر اور نادان لڑکی کو بہکانے والا بھی میرا شوہر ہی تھا۔ کسی سے اس کی روزی چھینتے دل تو میرا دکھ رہا تھا لیکن ایسی ہمدردی جو میرا گھر ہی جلا کر رکھ دے..... میں بھرمائی ایسی ہمدردی اور خدمتِ خلق سے۔ ڈھونڈ لیں اب یہ ماں بیٹی کوئی اور شریف گھرانہ۔

جہاں کوئی ایسی ویسی نظر سے نہ دیکھے اور شرافت کے لحاظ سے تو خود میرا گھر ہی مشکوک ہو گیا تھا۔ جب کہ اس کی ماں کی تو شرط ہی یہی تھی کہ بیٹی کو کسی شریف گھر میں جہاں لڑکے اور مرد زیادہ تعداد میں نہ ہوں وہاں چھوڑے گی۔

کافی دیر تک میری منت سماجت کرنے کے بعد وہ دونوں بڑی مایوسی کے عالم میں مجھے خدا حافظ کہتی واپس چلی گئی تھیں۔ شکر میں نے اس فتنے سے جان تو چھڑائی۔ میں نے بڑی گہری طمانیت بھری سانس لی تھی۔

اگلے روز چھٹی کا دن تھا، مہناز ساحرہ بھابھی کے پاس چھٹی کے دن بھی آیا کرتی تھی چنانچہ میرے پاس بھی اتوار کو چھٹی نہیں کیا کرتی تھی اسامہ سے میری کل صبح سے ہی بات چیت بند تھی۔ وہ خود تو مجھ سے بات کر رہے تھے لیکن میں ان کی پوچھی گئی بات کا مختصر جواب دے کر خاموش ہو جاتی تھی۔ خود سے تو میں نے ان سے ایک لفظ بات نہیں کی تھی، وہ اس طرح ظاہر کر رہے تھے جیسے انہیں میری ناراضی کا علم ہی نہیں۔ صبح وہ دیر سے سو کر اٹھے تھے میں کچن میں ناشتہ بنا رہی تھی۔

''مہناز نہیں آئی؟''

اٹھنے کے ساتھ ہی لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں، ایک دوسرے پر سلامتی بھیجی جاتی ہے اور انہیں جاگتے ہی اس منحوس سشمیتا کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ کل سے آج تک جتنا میں برداشت کر چکی تھی وہی بہت تھا، اب مزید مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

''اسے میں نے نکال دیا ہے۔''

ایک نظر ان پر ڈال کر میں نے بظاہر پرسکون انداز میں جواب دیا۔

''نکال دیا ہے لیکن کیوں؟'' کیسی فکرمندی چھائی تھی ان کے چہرے پر، ایک معمولی ملازمہ کے لیے ہونے والی یہ انکوائری اور تشویش میری برداشت سے باہر تھی۔

''میں اب ان کے لیے جہنم ہوگئی ہوں اور ''وہ'' یقیناً جنت ہوگی ان کی۔

میں کچن سے نکل کر لاؤنج میں آ کر صوفے پر اوندھی لیٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ کچن میں میرے آملیٹ کے لیے پھینٹے گئے انڈے جوں کے توں پڑے تھے۔ ٹوسٹر میں ڈلے سلائس باہر آنے کے لیے یقیناً بے تاب ہوں گے، چولہا جلا ہوا تھا یا بند تھا۔

مجھے اس کی بالکل بھی خبر نہیں تھی۔ بھوکی پیاسی میں بلک بلک کر روئے چلی جا رہی تھی۔ ''میں بھوکی پیاسی مر جاؤں یا روتے روتے جان دے دوں انہیں کون سی میری پرواہ ہے بلکہ وہ تو شکر ادا کریں گے کہ چلو جان چھوٹ گئی۔''

میں روتے ہوئے مسلسل اسی طرح کی باتیں سوچ کر اپنا دل جلا رہی تھی۔ انہوں نے ایک بار بھی کمرے سے باہر نکل کر مجھے آ کر دیکھا تک نہیں تھا بلکہ جب سے اسی طرح کمرہ بند کیے پتا نہیں اندر کیا کر رہے تھے، کر کیا رہے ہوں گے آرام سے بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگے ہوں گے یا کمپیوٹر آن کر کے انٹرنیٹ پر مصروف ہو گئے ہوں گے۔ مجھ جیسی بے کار اور فالتو شخصیت کے بارے میں سوچنے کی انہیں ضرورت ہی کیا پڑی ہے۔ کچھ ہی دیر میں کمرے سے گانوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ مجھے رلا کر اور مارنے کی دھمکیاں دے کر اب سکون سے میوزک سے لطف اندوز ہوا جا رہا تھا۔

شہزاد رائے کا ''وہ لڑکی کتنی سندر تھی'' کی آواز میرے کانوں میں مسلسل ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

''یہ سندر لڑکی'' کون تھی جسے اتنی شدت سے یاد کیا جا رہا تھا میں اس بات سے بخوبی آگاہ تھی اور یہی بات میرے رونے میں شدت پیدا کر رہی تھی۔

''بند کرو اب یہ ڈرامہ بازی، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

کافی دیر بعد ان کی حکمیہ آواز میرے کانوں میں آئی تھی۔ درمیان میں شاید دو ڈھائی گھنٹے تو ضرور گزر رہی گئے ہوں گے۔ میں نے ان کی بات پر سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اسی طرح کشن میں منہ دیئے صوفے پر پڑی رہی تھی۔ میرا رونا ڈرامہ بازی ہے حالانکہ روتے روتے میں خود ہی کافی دیر ہوئی چپ ہو چکی تھی لیکن ڈرامہ بازی کے لفظ پر مجھے دوبارہ رونا آنے لگا تھا۔

''جب کوئی خدمت کروانی ہوتی ہے اسی وقت میری یاد آتی ہے ورنہ تو میں مر بھی جاؤں پلٹ کر پوچھا بھی نہیں جائے گا۔''

کشن میں منہ دیئے دیئے ہی میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ختم کرو اب یہ بچپنا، دیکھو دوپہر کے دو بج رہے ہیں تمہیں بھی تو بھوک لگ رہی ہوگی۔''

وہ میرے سر پر کھڑے خفگی بھرے انداز میں گویا ہوئے۔

''میری بھوک کی فکر کرنے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں اور باہر ایک سے ایک اچھا ریسٹورنٹ اور ہوٹل موجود ہے۔ ضروری ہے کیا ہر وقت خادمہ ہی سے پکوا کر کھایا جائے؟''

میں دوبارہ رونے لگی تھی وہ جواب میں کچھ بھی نہیں بولے تھے۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ان کے لاؤنج سے جاتے قدموں کی آواز سنی۔ یقیناً میری طرف سے مایوس ہو کر اب کسی ریسٹورنٹ کا رخ کیا جائے گا۔ دو چار منٹ بعد مجھے کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ گھر میں ہم دونوں

کے علاوہ تیسرا کوئی فرد تھا ہی نہیں۔ ظاہری بات ہے کچن میں وہ ہی تھے۔ زور زور سے چیزیں گرنے اور زبردست شور کی آوازیں کچن سے آرہی تھیں ایسا لگ رہا تھا کچن میں کوئی زلزلہ آ گیا ہے۔ ان کے بس کا کیا ہے، ہل کر پانی تک تو پیتے نہیں ہیں فریج کے پاس بھی کھڑے ہوں تو بھی پانی مجھ سے ہی مانگا جاتا ہے۔ دراصل ان کی عادتیں میں نے ہی خراب کی ہیں۔ اچھا ہے خود پکائیں، میری بلا سے جس شخص کو چائے بنانی نہ آتی ہو وہ کھانا کیا بنائے گا۔

''انڈوں میں نمک ڈالا ہوا ہے؟'' انہوں نے کچن سے چلا کر مجھ سے پوچھا تھا۔

''یہ مظلومیت ظاہر کرنے کا اچھا طریقہ ہے لیکن میں بھی آج ٹس سے مس نہیں ہوں گی، ڈھیٹ بنی رہوں گی۔'' میں بغیر کوئی جواب دیئے خاموش پڑی رہی تھی۔ وہ کچھ جھنجھلا کر واپس لاؤنج میں آئے تھے۔

''اب بنا تو رہا ہوں صرف اتنا ہی بتا دو کہ انڈوں میں کیا کیا چیز ڈال چکی ہو۔'' ان کے انداز میں جھنجھلاہٹ کے باوجود صلح کی خواہش نظر آ رہی تھی یعنی وہ جھگڑا ختم کرنا چاہ رہے تھے۔

''میں کیوں بتاؤں، میں تو جہنم ہوں جس میں آپ کو پھنسا دیا گیا ہے، جایئے کوئی اچھی سی جنت تلاش کر لیں۔''

زندگی میں پہلی مرتبہ تو وہ مجھے منانے کے موڈ میں اور میرے نخرے اٹھانے کو تیار ہوئے تھے تو میں اتنی جلدی کیوں مان جاتی۔ ہمیشہ میں انہیں مناتی ہوں، ان کے نخرے اٹھاتی ہوں، کیا حرج ہے اگر آج تھوڑے سے میں اپنے نخرے اٹھوا لوں۔''

''اچھا پکاؤں گا میں، تم صرف بتاتی رہو۔'' انہوں نے صلح جو اور دوستانہ انداز اختیار کیا تھا۔

''میں بتاؤں گی بھی نہیں، مجھے مارنے کی دھمکیاں دے کر اور رلوا کر اب یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں آپ کی باتوں میں آ جاؤں گی۔''

اپنے اس جملے پر مجھے چڑیا اور چڑے کی کہانی یاد آ گئی تھی میرا جملہ بھی تو کچھ کچھ ''مارا کوٹا، کونے میں ڈالا ہٹ موئے میں نہیں پکاتی'' جیسا ہی تھا۔ شکر تھا کہ میرا منہ کشن میں چھپا ہوا تھا ورنہ میرے لبوں پر آتی مسکراہٹ دیکھ کر وہ نرمی اور محبت کا چولا اتار کر حسب عادت اکڑ جاتے۔

وہ ایک مرتبہ پھر لاؤنج سے نکل گئے تھے۔ کافی دیر تک کچن سے زلزلوں سے مشابہہ آوازیں آتی رہی تھیں۔ پتا نہیں کیا کیا نقصان کر دیا گیا تھا۔ یہ سارا پھیلاوا بعد میں مجھے ہی سمیٹنا پڑے گا لیکن پھر بھی اس وقت میں اپنے اکڑنے کو انجوائے کر رہی تھی۔ یہ کہیں لکھ تو نہیں دیا گیا تھا کہ ہمیشہ وہ اکڑیں گے اور میں انہیں مناؤں گی، کبھی اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے۔

بہت دیر کے بعد وہ دوبارہ لاؤنج میں آئے تھے۔ اب کی بار میرے پاس آ کر کھڑے ہونے کے بجائے انہوں نے ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے مجھے اٹھا کر بٹھا دیا تھا۔

''اچھی امیمہ! پیاری امیمہ! کھانا کھا لو.....''

حیرت ہے میرے ساتھ ساتھ انہیں بھی اس وقت چڑیا اور چڑے کی کہانی ہی یاد آئی تھی۔ میں ہم دونوں کے پہلی مرتبہ ایک ہی فریکوئنسی پر سوچنے پر دل ہی دل میں حیران ہوئی تھی۔ اب کیونکہ ان کے بالکل سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور مسکراہٹ چھپانے کے لیے کوئی کشن بھی سامنے نہ تھا اس لیے میری بے ساختہ مسکراہٹ ان سے چھپ نہیں سکی تھی۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ خود بھی مسکرانے لگے تھے۔

کہانی مکمل ہوگئی تھی، اب مجھے جا کر کھانا کھانا ہی تھا چاہے انہوں نے کچھ بھی بنایا ہو اور کتنا ہی بدذائقہ کیوں نہ ہو۔ میں تو پھر بھی اس سے لطف اندوز ہوں گی۔ خدمت کروانے اور نخرے اٹھوانے کا خمار اتنی جلدی اتر نہیں سکتا تھا۔

''اتنی فضول سی بات کو لے کر تم نے جھگڑا کھڑا کیا، اب میرا معیار یہ ہوگیا کہ میں ایک نوکرانی پر عاشق ہوں گا۔''

میں انتہائی تیز نمک والے آملیٹ سے ''لطف اندوز'' ہو رہی تھی جب انہوں نے ایک مرتبہ پھر وہی ذکر چھیڑ دیا تھا۔

''اور میں اتنا پاگل بھی نہیں ہوں، مجھے اگر کچھ کرنا ہی ہوگا تو گھر سے باہر کیا خوبصورت لڑکیوں کی کوئی کمی ہے جو تمہارے سامنے اپنی شامت بلوانے کے لیے ایک معمولی سی ملازمہ کی طرف متوجہ ہوں گا۔ باہر کون سا تم میرے ساتھ ہوتی ہو۔ مجھے کچھ کرنا ہو تو مواقع بے شمار، تمہیں کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔''

وہ سلائس پر پنیر لگاتے ہوئے گویا خود کو ان تمام الزامات سے بری کروانا چاہ رہے تھے جو میں نے ان پر عائد کیے تھے۔ مجھے یقین نہ کرتے ہوئے بھی ان باتوں پر یقین کرنا ہی تھا۔ اگر جو وہ میرے لڑنے اور طعنے دینے کے جواب میں ڈھٹائی سے کہتے کہ

''ہاں میں اس سے محبت کرتا ہوں کر لو تمہیں جو کرنا ہے تو میں ان کا کیا بگاڑ لیتی۔ یہاں تو پھر بھی غنیمت ہے کہ وہ اس بات سے انکاری ہیں۔ شاید خود کو بھی ملازمہ کے معمولی ہونے اور اپنے اسٹیٹس اور معاشرے میں اعلیٰ ترین مقام کا خیال آ گیا ہے۔

''ہم اسلام آباد واپس کب جائیں گے؟''

اپنا بنایا ہوا ناشتہ خود ان سے ہی نہیں کھایا جا رہا تھا چنانچہ میں نے جلدی جلدی فریج سے آٹا نکال کر ان کے لیے ایک عدد پراٹھا پکایا تھا۔ گرم گرم خستہ پراٹھا اور چائے کا کپ لا کر ان کے سامنے رکھتے ہوئے میں نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ وہ میرے سوال پر متعجب سے انداز میں مجھے دیکھ رہے تھے یعنی میری بات سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''مجھے ممی اور سب لوگ بہت یاد آ رہے ہیں۔''

میرے منہ سے ممی کا ذکر اور وہ بھی اتنے پیار بھرے انداز میں سن کر نوالہ ان کے حلق میں پھنس گیا تھا۔ زور زور سے کھانستے وہ حیرت سے مجھے تکے جا رہے تھے۔ وہ جتنا ممی کے گن گاتے اور ان سے والہانہ پیار کرتے ہیں میں اتنا ہی ان سے چڑتی ہوں، اس بات سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔ حالانکہ میں نے کبھی ان کے منہ پر ممی کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا مگر وہ نا سمجھ تو نہیں جو میری ناپسندیدگی کو محسوس نہ کر سکیں۔ ان کی حیرت، بے یقینی اور تعجب پر مجھے شرمندگی تو بہت ہو رہی تھی لیکن پھر بھی میرا دل مطمئن تھا۔ جو بات ساحرہ بھابھی نے بہت دیر میں جا کر اور ٹھوکر کھا کر سمجھی تھی وہ میں نے بہت جلدی سمجھ لی ہے۔ یہ شخص جو میرا شوہر ہے یہ اس عورت کا بیٹا بھی تو ہے۔ کیا حرج ہے اگر میں ایک ماں کے ساتھ اس کا بیٹا شیئر کر لوں۔ وہ پورا کا پورا میرا ہو جائے، اسے اس کی ماں سے چھین لوں، مجھے اب ایسی کوئی خواہش نہیں، میں ممی کے ساتھ اسامہ شہریار کو خوشی خوشی شیئر کروں گی، یہ شراکت داری مجھے ہرگز بری نہیں لگے گی لیکن کسی اور عورت کے ساتھ انہیں شیئر کرنے کا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔

یہ ہنستا ہوا موسم

تقریباً ایک سال کی انتھک اور جان توڑ محنت کے بعد وہ اپنے پسندیدہ پرچے میں اپنی کہانی شائع کروانے میں کامیاب ہوئی تھی۔
سمسٹر بریک کی وجہ سے وہ، ناجیہ اور افشاں پھوپھی صاحب کے ساتھ حیدر آباد گئی ہوئی تھیں جب اسے خوشی کی یہ خبر ملی۔ اسے کوئی بھی کام کرنے کا اچانک جنون سوار ہوتا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ جنون ہمیشہ کڑھی کا ابال ثابت ہوتا تھا۔ میٹرک کے بعد سے اس جنون نے مزید ترقی کر لی تھی۔ کبھی اسے لگتا کہ میں شاعری بہت اچھی کر سکتی ہوں اور بس پھر سب چھوڑ چھاڑ دھڑا دھڑ شاعری کی ٹانگ توڑنے کی کوششیں شروع ہو جاتیں۔ زیادہ تر آزاد نظمیں کہی جاتیں کہ ان میں قافیہ، ردیف اور وزن بے وزن وغیرہ کا اتنا زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا۔ انجم باجی کے منگیتر نے امریکہ جا کر کسی ہسپانوی سے شادی کر لی تو ان کے منگیتر کی بے وفائی اور ان کے زار و قطار رونے سے متاثر ہو کر اس نے فوراً ہی یہ شعر کہا۔

وہ اگر کبھی لوٹ آئے تو پوچھنا اے صبا
جھوٹا وعدہ کر کے کیا مل گیا تجھے

اور اس شعر پر فاروق اور خرم نے دل کھول کر اس کا مذاق اڑایا تھا۔

''شعر میں بھی اپنی کام چوری ثابت کر دی نا۔ سب کام صبا کرے، خود کچھ مت کرنا۔''

فاروق کہنے کو عمر میں اس سے ایک سال چھوٹا مگر بدتمیزی اور دل جلانے میں کئی سال بڑا تھا۔ آپی، باجی تو وہ تھی ہی نہیں، دھڑلے سے اس کا نام لیا جاتا اور اسی کی دیکھا دیکھی خرم نے بھی پر پرزے نکال لیے تھے۔ ان ہی لوگوں کے مذاق سے بددل ہو کر اس نے شاعری چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ اس کا انٹرسٹ فوٹو گرافی میں پیدا ہو گیا۔ پاپا کا یاشیکا اور بھائی میاں کا Canon گلے میں لٹکائے اس نے کتنی ہی حسین و دلفریب تصاویر کھینچیں۔

ناجیہ تو اس کے ہر شوق میں ساتھ ساتھ ہوتی ہی تھی۔ دونوں منہ اندھیرے بستر سے اٹھ بیٹھتیں اور سورج طلوع ہوتے وقت کی تصویر کھینچنے کے لیے آفتاب کا انتظار شروع کر دیتیں۔ اتنی محنت اور جدوجہد کے بعد جب بھی وہ کسی تصویری مقابلے میں اپنی تصاویر بھجواتی، انعام ملنا تو درکنار اس کی تصویر مقابلے کے لیے منتخب ہی نہ ہو پاتی اور نتیجتاً وہ فاروق، خرم اور افشاں کے مذاق کا نشانہ بنتی۔

حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے

فاروق بڑی دکھ بھری شکل بنا کر کہتا تو اس کا غم و غصے سے برا حال ہو جاتا۔

اس شوق کو بھی گردشِ دوراں نے پنپنے نہ دیا تو وہ پینٹنگ کی طرف متوجہ ہوئی۔ تب وہ انٹر کر چکی تھی اور آنرز میں کون سا مضمون لیا جائے

اس مسئلے پر غور وفکر کر رہی تھی۔ اسے اچانک ہی یہ احساس ہوا تھا کہ اس میں پیدائشی طور پر ایک آرٹسٹ چھپا ہوا ہے۔ بس صرف اور صرف اپنے اس ٹیلنٹ کو دنیا والوں کے سامنے لانے کی دیر ہے، پھر صادقین، مائیکل انجلو، چغتائی، لیونارڈو وونچی اور شاکر علی وغیرہ تو اس کے آگے پانی بھرتے نظر آئیں گے۔ جب اپنی اس خوبی کا ادراک ہوا تو وہ اور ناجیہ ایک مرتبہ پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ اس فیلڈ کی بھی تو اتنی ساری جہتیں ہیں۔ خطاطی کرنی ہے، تجریدی آرٹ کی طرف جانا ہے، رئیلسٹک اسلوب میں پینٹنگ کرنی ہے۔ واٹر کلر استعمال کرنا اور آئل پینٹنگ کرنی ہے۔ وہ دونوں کافی دنوں تک اس مسئلے میں الجھی رہیں۔ پھر ناجیہ ہی کی ایک دوست کے توسط سے وہ ایک مایہ ناز مصور کے ہاں پہنچی جو باقاعدہ اپنے گھر میں نوجوان آرٹسٹوں کو پینٹنگ سکھایا کرتے تھے۔

''سنا ہے یہ آرٹسٹ وغیرہ پیتے پلاتے بھی ہیں۔''

فلک نے اپنی سنی سنائی اکیلے میں ناجیہ کے سامنے دہرائی تو وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''آہستہ بولو، اگر امی نے سن لیا تو جا چکے ہم وہاں۔ اور وہ کیا پیتے ہیں اور کیا کھاتے ہیں ہمیں اس سے کیا، تمہیں کوئی رشتے داری جوڑنی ہے۔''

ناجیہ کے ڈپٹنے پر وہ چپ ہو گئی تھی۔ ناجیہ کی دوستوں کے ساتھ ہی وہ لوگ وہاں گئی تھیں۔ ایک گھنٹہ ان لوگوں کو انتظار میں سکھا کر آخر کار وہ جلوہ افروز ہوئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے بڑے خشک اور پروفیشنل انداز میں اس کے ہاتھ میں ایک پیپر اور پنسل پکڑا کر سامنے رکھی کرسی بنانے کے لیے کہا تھا۔ دس منٹ کی کوششوں کے بعد اس نے کرسی بنا کر ان کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے اس پر ایک نگاہ ڈال کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''پیسے کمانا میرا مقصد نہیں ہے۔ میں پیدائشی آرٹسٹوں کے فن کو نکھارنے کا کام کرتا ہوں۔ یہ کوئی دو اور دو چار والا کام نہیں، نہ میں فارمولا رٹوا دوں اور آپ آرٹسٹ بن جائیں۔ آپ سے تو لائن تک سیدھی نہیں کھینچی گئی ہے، آپ پینٹنگ کیا کریں گی۔''

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

کے مصداق وہ برے برے منہ بناتی وہاں سے نکل آئی تھی۔

''اس دنیا میں فن کی قدر ہی نہیں ہے۔'' اس نے دکھی دل سے سوچا تھا۔ لائن سیدھی نہیں کھینچی یہ بھی کوئی بات ہے۔ وہ دونوں اس غم میں گھلی جا رہی تھیں۔ ناجیہ نے اسے پھر تجریدی آرٹ کی طرف توجہ دلائی تھی۔

''جیسے دل چاہے الٹی سیدھی لکیریں ڈال کر رنگ بھر دینا۔ میں نے تجریدی آرٹ کے آج تک جتنے بھی نمونے دیکھے ہیں وہ ایسے ہی لگتے ہیں جیسے کسی بچے کے ہاتھ میں پینٹ برش تھما کر کہہ دیا گیا ہو، کھیلو بیٹا! یا پھر بطخ کے پیروں پر مختلف رنگوں کا پینٹ لگا کر اسے پینٹنگ پر سے گزار دیا گیا ہو۔''

مگر اس کا دل اتنی بری طرح ٹوٹا تھا کہ پھر اس نے مڑ کر بھی فن مصوری کی طرف نہیں دیکھا اور سیدھا سیدھا اچھے بچوں کی طرح کراچی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ وہ لوگ حیدر آباد میں رہتے تھے۔ ناجیہ کو کراچی یونیورسٹی میں پڑھنے کا شوق تھا اور پاپا اور پھوپھی صاحب کے پیچھے لگ کر وہ کراچی جا کر پڑھنے کی اجازت حاصل کر چکی تھی۔ پاپا خود آئی بی اے کے پڑھے ہوئے تھے اور انہیں کراچی یونیورسٹی بالخصوص آئی بی اے کا

معیارِ تعلیم بے حد پسند تھا۔ اسی وجہ سے پھوپھی صاحب اور مما کے اعتراضات کو یکسر رد کرتے ہوئے انہوں نے ناجیہ اور فلک کو کراچی میں پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ ناجیہ ایڈمیشن لے اور فلک نہ لے، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ویسے بھی ان دنوں اپنی ناقدری کا غم منا رہی تھی۔ یوں ناجیہ اور اس نے ایک ساتھ ایڈمیشن کے لیے اپلائی کر دیا تھا۔

جامعہ کراچی میں آنرز میں داخلے کے لیے انگلش ان کی پہلی چوائس تھی اور خوبیٔ قسمت سے ان دونوں ہی کو وہاں داخلہ مل گیا تھا۔ ناجیہ کو ہاسٹل میں رہنے کا شوق تھا مگر جس طرح بے چارے ''پطرس'' کو ان کے والدین نے ہوسٹل میں نہیں رہنے دیا تھا اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک عدد ماموں جان دریافت کر کے ان کے گھر بھجوا دیا تھا بالکل اسی طرح ناجیہ اور فلک کو بھی ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ بس فرق صرف یہ تھا کہ انہیں کسی رشتے دار کے گھر رہنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا بلکہ کلفٹن میں پاپا نے جو فلیٹ خریدا ہوا تھا اور عنقریب اسے کرائے پر چڑھانے کا ارادہ رکھتے تھے وہاں ان لوگوں کی رہائش کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ یہ دونوں ہی اس بات پر بہت تلملائی تھیں۔ ہوسٹل کی لائف کا اپنا ہی چارم ہوتا ہے۔ پھر وہاں کے رنگ برنگے قصے سن سن کر ان لوگوں کا شوق تو پہلے ہی عروج پر پہنچا ہوا تھا مگر پاپا کے حکم سے سرتابی کی مجال کس میں تھی۔ یوں فلک اور ناجیہ پھوپھی صاحب کے ساتھ کراچی آ گئی تھیں۔

پھوپھی صاحب شادی کے سات سال بعد ہی بیوہ ہو گئی تھیں اور تب ہی سے وہ ان لوگوں کے پاس آ گئی تھیں۔ سب سے بڑی اسماء آپی کی انہوں نے بی اے کرتے ہی شادی کر دی تھی۔ اس کے بعد ناجیہ تھی جو فلک کی ہی ہم عمر تھی اور سب سے چھوٹا خرم جو فاروق سے ایک سال چھوٹا تھا۔ پاپا نے اپنے بچوں اور بہن کے بچوں میں کبھی فرق نہیں رکھا تھا۔ جس طرح بھائی میاں، فلک، افشاں اور فاروق انہیں عزیز تھے بالکل اسی طرح اسماء آپی، ناجیہ اور خرم بھی انہیں پیارے تھے۔ مما اور پھوپھی صاحب میں نند بھاوج والے روایتی تعلقات تو نہیں تھے مگر کبھی کبھار تو تو میں میں ہو ہی جایا کرتی تھی مگر یہ تکرار صرف ان ہی دونوں تک محدود رہتی تھی، وہ لوگ کبھی بھی اس جھگڑے میں فریق نہیں بنے تھے۔

ان لوگوں کے ساتھ پاپا نے گھر میں فالتو کھڑی سوزوکی مہران بھی کراچی بھجوا دی تھی تاکہ ان لوگوں کو یونیورسٹی آنے جانے میں دقت نہ ہو۔ پھوپھی صاحب صبح خود ان لوگوں کو چھوڑتیں اور واپسی میں لینے بھی خود آتیں۔ ان دونوں کی ڈرائیونگ پر تو انہیں ہرگز بھروسا نہیں تھا۔

یونیورسٹی میں جلد ہی ان لوگوں کی بہت سی دوست بن گئی تھیں۔ ہائے ہیلو تو سب ہی سے تھی مگر زیادہ افرحہ، یمینہ، سعدیہ، عروس اور فاطمہ سے تھی۔ یوں ان کا سات لڑکیوں کا گروپ تھا۔ ان لوگوں کے تمام شوق اور دلچسپیاں ایک سی تھیں۔

حیدر لوگوں کے گروپ کے ساتھ ان لوگوں کی شروع سے نہیں بنی تھی۔ پہلی اختلافی بات یہ ہوئی تھی کہ وہ لوگ ان کی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے۔ فلک کا موقف یہ تھا کہ پہلے روز جو جس سیٹ پر بیٹھ گیا وہ اس کی ہوئی مگر وہ بجائے وہاں سے اٹھنے کے بحث کرنے کھڑے ہو گئے تھے اور یوں ان کے گروپ کے ساتھ فلک کی خاص طور پر ان بن ہو گئی تھی۔ ان کے گروپ میں چار لڑکے اور دو لڑکیاں شامل تھیں۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا۔ وہ لوگ فرسٹ سمسٹر سے تھرڈ سمسٹر میں آ گئے۔ اس دوران ان کی دشمنی میں بھی مزید اضافہ ہی ہوا تھا۔ یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس ویک منایا گیا تو ان کے ڈرامے کی پروفیسر نے آنرز اور ماسٹرز کے تمام اسٹوڈنٹس کے درمیان ڈرامہ لکھنے کا مقابلہ کروایا۔ ''جس کا

ڈرامہ سب سے اچھا اور معیاری ہوا وہ اسٹوڈنٹس ویک میں ڈرامے والے دن اسٹیج کیا جائے گا۔'' انہوں نے کہا تھا۔

وہ امریکہ سے پی ایچ ڈی کر کے آئی تھیں اور وہاں کا طریقۂ تعلیم یہاں اپلائی کرنے کی کوششوں میں مصروف تھیں۔

''میں ٹیلنٹ ہنٹنگ کر رہی ہوں۔ اس طرح ہمارے طالب علموں کی پوشیدہ صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں گی۔ کیا پتا ان ہی میں کوئی شیکسپیئر چھپا ہوا ہو، بس بات تو صرف اسے تلاش کرنے کی ہے۔

انہوں نے انگلش ڈپارٹمنٹ کی ہر کلاس میں جا کر یہی کہا تھا۔ ان کی بات سن کر فلک کو اچانک محسوس ہوا کہ وہ اپنی اب تک کی زندگی بے کار مشاغل میں ضائع کرتی رہی ہے۔ اسے تو دراصل ایک رائٹر بننا تھا۔ یہی بات اس نے اپنی فرینڈز کے گوش گزار کی تو وہ سب بھی پر جوش انداز میں اس آئیڈیے کی حمایت کرنے لگیں۔ حیدر کے گروپ میں سے امیر حمزہ ڈرامہ لکھ رہا تھا۔ وہ ان کے گروپ کا ہونہار ممبر تھا اور مختلف اخبارات و جرائد میں پابندی سے لکھتا بھی تھا۔

لکھنے کا سوچ تو لیا تھا مگر لکھیں کس موضوع پر یہ بات خاصی پریشان کن تھی۔ وہ سب کی سب روزانہ ان کے ساتھ گھر آ جاتیں اور سر جوڑ کر خوب صلاح مشورے ہوتے مگر کسی ایک موضوع پر اتفاق رائے نہ ہو پاتا۔ ڈرامہ ڈاکٹر شاہینہ کے پاس جمع کروانے کی آخری تاریخ سر پر آ گئی تو وہ بالکل بوکھلا گئیں۔ اچانک ہی افرحہ کو ایک انوکھا خیال سوجھا۔

''کیوں نہ ہم کسی انگلش ناول کی تھیم چرا لیں، زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تھوڑا سا اسے اپنے ہاں کے مشرقی ماحول کے مطابق ڈھال لیں گے اور ہیرو ہیروئن کے نام مسلمانوں والے رکھ دیں گے، اللہ اللہ خیر صلا۔''

اس کا ذہانت سے بھرپور آئیڈیا پسند تو سب ہی کو آیا تھا مگر یہ بھی پتا تھا کہ اگر پکڑے گئے تو ڈاکٹر شاہینہ پھر جیسا سلوک کریں گی وہ عزت دار آدمی کے لیے موت سے پہلے موت ہوگی۔

''بھئی وہ کتنی بھی پڑھی لکھی اور جینیئس سہی پر انہوں نے سارا کا سارا انگلش لٹریچر تھوڑی ہضم کر رکھا ہوگا۔ ہم کسی غیر معروف رائٹر کا غیر معروف ناول تلاش کریں گے جس کے بارے میں کبھی کسی سے نہ سنا ہو اور یہ بات تو بھول ہی جاؤ کہ کوئی اسٹوڈنٹ ہماری اس حرکت کو پکڑ پائے گا۔ یہ نوٹس رٹنے اور Presecribed books بمشکل پڑھنے والے اسٹوڈنٹس اتنے پڑھاکو نہیں ہو سکتے کہ انہوں نے کسی بالکل ہی غیر معروف رائٹر کو پڑھ رکھا ہو۔ ہم کوئی شیکسپیئر، برنارڈ شا یا ٹالسٹائی کو کاپی کرنے تھوڑی جا رہے ہیں جو کوئی پکڑ لے گا۔''

ناجیہ نے بھی افرحہ کی حمایت کی تو وہ سب ہی اس مشن پر ڈٹ گئیں۔

اردو بازار اس مقصد کے لیے بہترین جگہ تھی۔ وہ سب باجماعت وہاں پہنچیں اور کافی غور و فکر کرنے کے بعد ایک بالکل ہی غیر معروف نام والے رائٹر کی کتاب خرید لی۔ اس رائٹر کا نہ کبھی نام کہیں سنا تھا اور نہ پڑھا تھا۔ اس کتاب میں پانچ کہانیاں تھیں۔ گھر آ کر ان لوگوں نے بغور اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا اور اس میں سے ایک کہانی جس میں شوہر اپنی بیوی کو کسی ان جانے قاتل سے بچانے کے لیے پولیس اور سیکرٹ سروس والوں کی مدد لے رہا ہوتا ہے مگر آخری صفحے پر جا کر پتا چلتا ہے کہ وہ خود ہی بیوی کو قتل کرنے والا تھا ان لوگوں نے پسند کی۔ اس کہانی میں تھرل، سسپنس،

عورت ذات کی مظلومیت، مردوں کی بے وفائی یعنی تمام لوازمات موجود تھے۔ اس لیے وہ لوگ اس موضوع سے سو فیصد مطمئن تھیں۔

پھر تین دن تک دن و رات لگ کر فلک نے ڈرامہ لکھا۔ اس دوران ناجیہ تو اس کے ساتھ تھی ہی مگر وہ پانچوں بھی ان ہی کے ہاں رہ رہی تھیں۔ عروسہ نے تو کلاس میں ببانگِ دہل کہہ بھی دیا تھا کہ فلک کے علاوہ کسی اور کا ڈرامہ منتخب ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے باقی لوگ بلا مقابلہ ہی شکست تسلیم کر کے ممکنہ ذلت و رسوائی سے بچ جائیں۔ اس کے لکھے ہوئے ایک ایک صفحے کا وہ سب کی سب تفصیلی پوسٹ مارٹم کرتیں اور سب کے صلاح مشورے سے فیض یاب ہوتی۔ آخر کار وہ آخری ڈیٹ سے ایک روز پہلے ڈرامے کا اسکرپٹ جمع کروانے میں کامیاب ہوئی تھی مگر جب نتائج کا اعلان ہوا اور پورے انگلش ڈپارٹمنٹ میں سے امیر حمزہ کا ڈرامہ بہترین قرار دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اسٹوڈنٹس ویک کے لیے منتخب بھی کر لیا گیا تو اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہا۔

''کتنی محنت کی تھی میں نے اور فائدہ کیا ہوا۔ مجھ سے اچھا تو وہ حمزہ ہی ہے، کتنے آرام سے بیٹھے بٹھائے پرائز جیت لیا۔''

وہ زور و شور سے روتے ہوئے بولی تھی اور اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ سب بھی رونے والی شکلیں بنا کر بیٹھ گئی تھیں۔

''جی ہاں، کافی محنت کی تھی آپ نے۔ پہلے اردو بازار گئیں، وہ بھی اتنی گرمی میں، پھر وہاں پندرہ بیس دکانوں اور آٹھ دس ردی والوں کے پاس سروے کر کے کتاب منتخب کی پھر اس کے بعد اس کتاب میں سے کہانی منتخب کی گئی اور اس کے بعد اسے پاکستانی ماحول میں ڈھال کر جوزفین اور ڈیوڈ کی جگہ شبو اور راجو کی کہانی بنایا گیا۔ کم سے کم آپ کی اس محنت کے صدقے ہی میں انہیں آپ کو انعام کا حقدار قرار دینا چاہیے تھا۔''

افشاں جو دور بیٹھی چپس اور پیپسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس کے پندرہویں دفعہ ''اتنی محنت کی تھی میں نے'' کہنے پر جل کر بولی تھی۔ اپنی دوستوں کے سامنے بہن کی اس فضول بکواس پر اسے سخت غصہ آیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح اس کا دل توڑا کرتی تھی۔ وہ فلک سے تین سال چھوٹی تھی اور اس کا ذاتی خیال تھا کہ وہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ میچور اور ذہین ہے۔ اس نے ہمیشہ اس کے ہر شوق پر اسی طرح اس کی دل شکنی کی تھی۔ وہ انڈس ویلی اسکول کے آرکیٹیکچر ڈپارٹمنٹ کی ذہین طالبہ تھی۔ اس کا B.Arch کا پہلا سال تھا۔ فلک اور ناجیہ کی دیکھا دیکھی وہ بھی کراچی آ گئی تھی۔

حیدر کا گروپ تو اس کامیابی پر آپے سے باہر ہی ہو گیا تھا۔ وہ کلاس میں داخل ہوتی تو ''روتے ہیں چھم چھم نین'' کی آواز سنائی دیتی۔

سعدیہ اور فاطمہ لڑائی جھگڑے سے ڈرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں، اور ایسے موقع پر وہی اسے بازو سے دبوچ کر کلاس سے باہر لے جاتی تھیں۔ امیر حمزہ جس کا ڈرامہ منتخب ہوا تھا وہ اتنی چھچھوری حرکتیں نہیں کر رہا تھا جتنی اس کے باقی گروپ ممبرز۔ پھر جب اس کا لکھا ڈرامہ اسٹیج پر پیش کیا گیا تو موضوع کی انفرادیت اور معاشرے کے دوغلے نظام اور دوہرے طرزِ فکر پر جس بولڈ انداز میں اس نے لکھا تھا اس پر سب ہی نے اس پر تعریفوں کے ٹوکرے برسائے تھے۔ وہ لوگ بھی آڈیٹوریم میں افسردہ شکلیں بنا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین اور وی سی نے امیر حمزہ کو تعریفی سرٹیفکیٹس کے علاوہ نقد انعام بھی دیا تھا۔ مختلف میگزینز میں تو وہ پہلے بھی لکھا ہی کرتا تھا اور انگلش ڈیپارٹمنٹ میں پہچانا بھی جاتا تھا مگر اب جس طرح اس کو اچانک ہی بے تحاشا شہرت اور پذیرائی ملی تھی وہ یقیناً اسی ڈرامے کی وجہ سے تھی۔

فلک کتنی بار حسرت سے سوچتی۔ یہ مقبولیت اور عزت مجھے بھی مل سکتی تھی اگر جو میرا ڈرامہ منتخب ہو جاتا۔ اب امیر حمزہ کو دوسرے ڈیپارٹمنٹس کے اسٹوڈنٹس بھی پہچاننے لگے تھے۔ اس کے لکھے آرٹیکلز پر ان کے ٹیچرز تک کمنٹس دیا کرتے تھے اور وہ ساتوں کی ساتوں جل بھن کر رہ جاتی تھیں۔ پڑھائی میں وہ سب کی سب اچھی تھیں۔ گو پوزیشن تو ان کے گروپ میں صرف اور صرف افرحہ ہی کی آتی تھی مگر باقی سب بھی فرسٹ ڈویژن سے نیچے کبھی نہیں گئی تھیں۔

حیدر کے گروپ سے پیچھے رہ جانے پر ان کے دل بے حد اداس تھے۔ ناجیہ وغیرہ نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے میگزین کے لیے کوئی آرٹیکل لکھے اور تب اچانک ہی اس کے ذہن میں آئیڈیا آیا تھا کہ آرٹیکل وغیرہ تو وہ نہیں لکھ سکتی لیکن کہانی نویسی میں اگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو منوا سکتی ہے۔

''میرا خیال ہے میں بنیادی طور پر ایک ناول نگار ہوں اور مجھے اسی فیلڈ میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔''

افشاں جو وہیں ڈرائنگ بورڈ پر اپنی ڈرائنگ پھیلائے کام میں مصروف تھی اس کے جملے پر بے اختیار ہنس پڑی تھی جبکہ ناجیہ نے حسب سابق اس کی حمایت کی تھی۔ وہ سب ڈائجسٹ پڑھنے کی شوقین تھیں اور اکثر سلسلے وار ناولوں کے اوپر ان لوگوں کی باقاعدہ آپس میں شرط بھی لگا کرتی تھی کہ فلاں کریکٹر فلاں کا بھائی ہوگا یا فلاں کی شادی فلاں سے ہوگی۔ اب جو کہانی لکھنے کا خیال آیا تو اس نے فوراً ہی اس پر عمل پیرا ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ ان کا پورا گروپ اس موقع پر بھی اس کی مدد کے لیے موجود تھا۔

''اچھا ہے، تمہاری کہانی چھپ جائے تو کم سے کم حیدر کے گروپ کی اتراہٹ تو کم ہوگی اور وہ امیر حمزہ صرف انگلش ڈیپارٹمنٹ میں سے منتخب ہوئے تھے جبکہ ہماری فلک بے شمار نامی گرامی رائٹرز کے ساتھ رسالے میں جگہ پائے گی۔ ایک سے ایک مشہور اور بڑی رائٹر کی تحریر چھپتی ہے اس ڈائجسٹ میں اور ان کے درمیان ہماری فلک کا نام بھی جگمگایا کرے گا۔'' یمینہ کا جوش کے مارے برا حال تھا۔

''بس کوئی اچھی سی تھیم مل جائے، باقی تو پھر میں لکھ لوں گی۔''

وہ ہر روز دوستوں کے پوچھنے پر کہ ''کچھ لکھا'' یہی جواب دیتی۔ تھک ہار کر پھر تھیم کے لیے انگلش ناولز کا سہارا لیا گیا۔ ہیرو، ہیروئن کے ناموں پر ان سب کے درمیان طویل میٹنگ ہوئی تھی۔ مختلف اسلامی ناموں والی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد نام فائنل ہوئے تھے۔ دس روز کی مسلسل محنت کے بعد کہانی مکمل ہوئی تھی۔

''ایسا کرو اپنا نام خالی ''فلک ناز'' لکھ دو۔'' ناجیہ نے سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا۔ سب ہی کو پتا تھا اسے اپنے پورے نام ''شہزادی فلک ناز'' سے سخت چڑ تھی۔ مما، پاپا نے باقی بہن بھائیوں کے اتنے معقول اور مناسب نام رکھے تھے، پتا نہیں اس سے انہوں نے کون سے جنم کا بدلہ لیا تھا۔ اپنے نام کے آگے لگے اس شہزادی کی وجہ سے اسے شروع ہی سے اپنے کلاس فیلوز کے مذاق کا نشانہ بننا پڑا تھا۔

''کاش انسان اپنا نام خود بھی رکھ سکتا۔'' وہ اکثر بڑے دکھ سے سوچا کرتی تھی۔ نائنتھ کلاس میں آکر اس نے اپنے نام کے آگے سے شہزادی ہٹانا چاہا تھا مگر پھوپھی صاحب اور پاپا نے اس کی ایک نہیں چلنے دی تھی۔

''تمہاری دادی نے کتنے پیار سے تمہارا نام رکھا تھا شہزادی فلک ناز اور تم دادی کا رکھا ہوا نام تبدیل کرو گی۔ حد ہے بدتمیزی کی۔''

اور وہ خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو گئی تھی۔ دادی کو شہزادی لگنے والی ضروری نہیں تھا کہ دوسروں کو بھی شہزادی نظر آتی اسی لیے اس کی خوب گت بنتی، خصوصاً یونیورسٹی آ کر تو اس حوالے سے اس کا خوب ریکارڈ لگا تھا۔ حیدر اور اس کے گروپ کے باقی ارکان کے بارے میں تو فلک کی رائے شروع دن سے ہی بہت خراب تھی مگر امیر حمزہ ان کے گروپ کا وہ واحد بندہ تھا جسے فلک وغیرہ قدرے غنیمت سمجھا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کی کبھی براہِ راست تکرار بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان ہی کی بلڈنگ میں ان کے بالکل سامنے والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے اور اس کے انٹریئر سندھ سے آئے فرینڈ یاسین سومرو نے وہ فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا اور وہ دونوں وہاں کا کرایہ شیئر کرتے تھے۔ وہ کراچی ہی کا رہنے والا تھا اور اس کا گھر سندھی مسلم سوسائٹی میں تھا۔

ان لوگوں کے حیرت بھرے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا کہ ان کے گھر میں جوائنٹ فیملی سسٹم ہے اور وہاں وہ توجہ سے پڑھائی نہیں کر پاتا اسی لیے فلیٹ لے لیا ہے۔

ناجیہ کو پڑھائی وغیرہ کے بہانے پر بالکل یقین نہ آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گھر پر لڑکیوں سے چیٹنگ اور آوارہ گردیوں کا موقع اتنا آزادانہ کہاں میسر آتا ہوگا۔

☆

ڈاکٹر آفاق کا دیا ہوا اسائنمنٹ پوری کلاس میں سب سے اچھا امیر حمزہ کا تھا۔ فلک نے اس سے اسائنمنٹ دیکھنے کے لیے مانگا تو اس نے بڑی فراخ دلی سے اپنی پوری فائل اس کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ فلک نے وہ فائل کسی قیمتی خزانے کی طرح فوراً لے لی تھی۔ اس میں حمزہ کے بنائے مختلف اسائنمنٹس اور نوٹس وغیرہ سب ہی کچھ موجود تھی۔ دو دن بعد واپس کرنے کی شرط پر وہ اس فائل کو گھر لے آئی تھی۔ شومئی قسمت کہ اسی روز بخار نے اسے ایسا جکڑا کہ وہ فائل دیکھنا بھی بھول گئی۔ ناجیہ وغیرہ کو بھی فائل کی بابت بتانا اسے یاد نہیں رہا۔

ایک ہفتے کے بعد وہ بستر سے اٹھنے کے قابل ہوئی اور اسے حمزہ کی فائل اور اپنا وعدہ یاد آیا تو سخت ملال ہوا۔ وہ پھوپھی صاحب سے اجازت لے کر ان کے فلیٹ میں چلی آئی۔

اسے دیکھ کر امیر حمزہ نے بڑی گرم جوشی سے مسکرا کر ویلکم کہا تھا۔ اسے لیونگ روم میں بٹھا کر وہ خود غالباً چائے، کافی لینے کچن میں چلا گیا تو اس کی نظر سامنے والے کمرے کے کھلے دروازے سے نظر آتی دیوار پر لگی مختلف تصاویر پر پڑی۔ ارمیلا، ایشوریا، جولیا رابرٹس اور کیٹ ونسلیٹ کی بڑی پیاری پیاری اور بے باک تصاویر دیوار پر آویزاں تھیں اور اسے ناجیہ کی بات سے اتفاق کرنا پڑا تھا کہ پڑھائی وغیرہ کا بہانا ہے۔ اپنے گھر میں تو وہ ارمیلا کی فلم بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کجا کہ اس کی تصویر لگانا۔

وہ کافی بنا کر لایا تو اس کی نظروں کا زاویہ محسوس کرتے ہوئے جلدی سے اٹھ کر سامنے والے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

''یہ یاسین کا بیڈ روم ہے۔''

وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر وضاحتی انداز میں بولا تو اس نے اپنی مسکراہٹ بمشکل دبائی۔ پھر اس سے فائل پہنچانے میں دیر ہونے پر معذرت اور کل ہر قیمت پر واپس کرنے کے وعدے پر وہ وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ اپنی طرف سے اس نے اخلاق نباہ دیا تھا۔ خود جا کر ایکسکیوز کر لیا اور کیا چاہیے مگر اگلے روز جب وہ اور ناجیہ ڈیپارٹمنٹ پہنچیں تو آس پاس سے گزرتے اپنے کلاس فیلوز اور بعض جونیئر اور سینئر کولیگز کی بے وجہ مسکراہٹ ان دونوں ہی کی سمجھ سے باہر تھی۔

حمزہ اور حیدر سے کوریڈور میں ملاقات ہوئی تھی اور حیدر کو نظر انداز کر کے ان دونوں ہی نے حمزہ سے دعا سلام کی تھی مگر اسے پتا نہیں تھا کہ جسے وہ بہت سیدھا اور معصوم سمجھ رہی ہے وہ اپنے باقی گروپ ممبرز کا بھی باپ ہے۔ کلاس کے پاس پہنچیں تو افرحہ وغیرہ سخت غصے کے عالم میں باہر ہی کھڑی مل گئیں۔ کلاس میں بورڈ کے پاس اسٹوڈنٹس جمع تھے۔ اسے آتا دیکھ کر سب جلدی جلدی بڑی سنجیدگی سے اپنی سیٹس کی طرف بڑھ گئے تھے۔ بلیک بورڈ پر بڑا سا سفید رنگ کا کاغذ آویزاں تھا جس پر سیاہ روشنائی سے بڑا بڑا ''شہزادی کی یاد میں'' لکھا ہوا تھا۔ اگلی لائن میں نسبتاً چھوٹے حروف میں بریکٹ کے اندر لکھا گیا تھا فیض کی روح سے معذرت کے ساتھ۔ ہیڈنگ پڑھ کر ہی وہ طیش میں آ گئی تھی۔ اپنے نام کی انفرادیت کا اس حد تک اندازہ تو اسے بہر حال تھا کہ پورے ڈیپارٹمنٹ میں اس کے علاوہ ''شہزادی'' اور کوئی نہیں تھی۔ اس سے نیچے کی نظم تو اس کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچا گئی تھی۔

مجھ کو شکوہ ہے شہزادی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئیں ساتھ میری اسائمنٹس کی کتاب
اس میں لیکچر تھا مرا، اور مرا پوئٹری کا نصاب
آ کے لے جاؤ تم ورڈز ورتھ کی شاعری
یا شیکسپیئر کے ڈرامے کی کتاب
مجھ کو لوٹا دو میری اسائمنٹس کی کتاب

یہ نظم صرف کلاس روم ہی نہیں بلکہ لیکچر ہال، لابی، سیمینار لائبریری اور نوٹس بورڈ تک پر آویزاں کی گئی تھی۔ وہ ڈیپارٹمنٹ میں بے تحاشا مشہور و معروف تو تھی نہیں کہ ہر کوئی اسے جانتا ہو مگر اس واقعہ کے بعد اکثریت اسے جاننے لگی تھی۔ اسی روز اپنے آس پاس سے گزرتے کتنے اسٹوڈنٹس کے منہ سے اس نے سنا تھا۔

''یار! یہ شہزادی کون ہے؟'' اور وہ اپنی دوستوں کے سمجھانے بجھانے پر بمشکل اپنا اشتعال کنٹرول کر پائی تھی۔

''اگر تم غصے میں آؤ گی تو نقصان تمہارا ہی ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو غصے میں ضائع کرنے کے بجائے دشمن کو پسپا کرنے کی تدبیر سوچو۔''

فاطمہ نے بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھایا تھا۔ پھر اس روز گھر آ کر وہ فائل اٹھا کر بڑے جارحانہ انداز میں جا کر امیر حمزہ کے منہ پر مار آئی تھی اس نے بڑی قسمیں کھائی تھیں کہ یہ نظم اس نے نہیں لگائی بلکہ یہ کسی اور کلاس فیلو کی شرارت ہے مگر فلک کو اس کی اس بکواس پر ہرگز یقین نہ آیا تھا۔

فلک نے اس سے فائل اس کے فلیٹ میں جا کر لی تھی اور وہاں اس وقت یاسین کے علاوہ کوئی نہیں تھا تو پھر باقی لوگوں کو کیا فرشتوں نے آ کر یہ بات بتائی تھی۔ پھر وہ جو سمجھا کرتی تھی کہ امیر حمزہ اپنے باقی گروپ ممبرز کے مقابلے میں بڑا نیک اور شریف ہے اس نے اپنے اس خیال پر نظر ثانی کر لی تھی۔ واقعی انسان کی پہچان دوستوں سے ہوتی ہے۔ اگر اس کے باقی دوست چالاک، مکار، عیار اور کمینے تھے تو وہ اچھا کیسے ہو سکتا تھا۔ پھر اس واقعہ کے بعد وہ ہر جگہ شہزادی کے نام سے پہچانی جانے لگی تھی۔ لائبریری میں داخل ہوتی تو کسی کونے سے آواز آتی۔

''باادب باملاحظہ ہوشیار شہزادی صاحبہ تشریف لا رہی ہیں۔'' یا کوریڈور سے گزرتی تو دائیں یا بائیں سے آواز آتی ''شہزادی، دی پرنسس آف کراچی یونیورسٹی۔''

اور وہ مڑ کر کسی کو کچھ کہہ اس لیے نہیں سکتی تھی کہ اتنے سارے لڑکوں میں اسے یہی نہیں پتا چلتا تھا کہ کمنٹس دیئے کس نے ہیں مگر اپنے نام اور حیدر کے گروپ سے اس کی نفرت انتہاؤں کو چھونے لگی تھی۔ یہ تمام واقعات تھے اس وقت کے جب وہ لوگ فرسٹ سمسٹر میں تھے۔ ڈرامہ لکھنا اور امیر حمزہ کا ڈرامہ منتخب ہو جانے والا واقعہ اس کے ٹھیک ایک سال بعد یعنی جب وہ لوگ آنرز کے دوسرے سال میں تھے تب پیش آیا تھا اور ماضی کے تلخ تجربات کی روشنی میں ہی ناجیہ نے اسے کہانی بھیجتے وقت اس پر اپنا نام شہزادی فلک ناز کی جگہ صرف فلک ناز لکھنے کا مشورہ اسی لیے دیا تھا۔

''اگر خالی فلک ناز لکھا تو اکثریت یقین ہی نہیں کرے گی کہ کہانی میں نے لکھی ہے۔ میں پورا نام لکھوں گی۔''

اتنی محنت وہ حیدر لوگوں کی اتراہٹ کم کرنے کے لیے ہی تو کر رہی تھی اور اگر ان لوگوں نے شک کیا کہ کہانی اس کی نہیں تو پھر۔ اسی وجہ سے اس نے اپنا مکمل نام لکھا تھا۔ اس بات کی بھنک بھی وہ حیدر لوگوں کو نہیں پڑنے دینا چاہتی تھیں۔ یہ بات صرف اور صرف ان ساتوں کے بیچ تھی۔

''جب میری کہانی پاکستان کے سب سے معیاری ماہنامہ میں چھپے گی تو ان لوگوں کو خود پتا چل جائے گا۔'' وہ اکڑ کر بولی۔

''جی جی، سورج طلوع ہوتا ہے تو سب ہی کو پتا چل جاتا ہے کہ سورج نکل آیا ہے۔ کسی کو جا کر بتانا تھوڑی پڑتا ہے کہ حضرت سورج طلوع ہو چکا ہے۔'' افشاں نے حسب دستور مذاق اڑایا تھا۔

کہانی پوسٹ کرنے وہ سب کی سب باجماعت گاڑی میں ٹھنس ٹھنسا کر گئی تھیں۔ سعدیہ گاڑی پارکنگ میں سے نکال رہی تھی جب سامنے سے آتے یاسین سے ان لوگوں کی ہائے ہیلو ہوئی تھی۔ وہ ان لوگوں کا کلاس فیلو نہیں تھا بلکہ این ای ڈی میں پڑھ رہا تھا مگر پڑوسی ہونے کے ناتے ان لوگوں کی اس سے دعا سلام تھی۔

فلک نے بڑے آرام سے ہاتھ میں اپنی پیک شدہ کہانی پکڑی ہوئی تھی۔ ناجیہ کے کہنی مارنے پر اسے سخت غصہ آیا تھا اور یاسین کے وہاں سے جاتے ہی وہ اس پر بگڑی تھی۔

''یہ کیا تم مجھے کہنیاں مار رہی تھیں؟''

''تو تمہیں کون سی عقل آ گئی، میرے ٹوکنے پر بھی لفافہ اتنے کھلم کھلا ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھیں کہ اس نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ پتا نہیں تمہیں عقل کب آئے گی۔'' وہ جواباً اس سے زیادہ غصے میں آ گئی تھی۔

''لو یاسین کا اس قصے سے کیا تعلق، وہ کوئی حیدر لوگوں کے گروپ کا ممبر ہے، اس سے کیا چھپانا۔''

وہ لاپروائی سے بولی تھی مگر ناجیہ کی بات صحیح ثابت ہوئی تھی وہ بھولا مسکین سا یاسین مخبری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور تب اس نے پہلی بار دنیا کی بے ثباتی، لوگوں کی مکاری اور اپنی سادگی پر سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ کہنے کو تو وہ فلیٹ صرف امیر حمزہ اور یاسین کا تھا مگر حیدر سمیت ان کے گروپ کے تمام لڑکے آدھے سے زیادہ مہینہ یہیں قیام وطعام فرماتے تھے۔

کتنی دیر میں جا کر یہ بات اس کی سمجھ میں آئی تھی کہ یاسین ان کے گروپ کا خفیہ ممبر تھا۔ فوری طور پر تو ان لوگوں کو شک بھی نہیں ہوا کہ حیدر لوگ اس بات سے واقف ہو چکے ہیں کہ اس نے کوئی کہانی لکھ کر کسی رسالے میں بھیجی ہے۔

مگر دو مہینے بعد جب پرچہ ہاتھ میں آنے پر اس نے ''اشاعت سے معذرت'' میں اپنا نام جگمگاتا دیکھا اور اس کے بعد حیدر لوگوں نے جو اس کا ریکارڈ لگایا تب اسے ناجیہ کی بات سے اتفاق کرنا پڑا تھا۔ کہانی بھیجنے کے بعد ان لوگوں کا خیال تھا کہ دو تین مہینے صبر سے بیٹھ کر اس کے چھپنے کا انتظار کریں گے، اس دوران وہ مزید کئی کہانیاں لکھ چکی تھی۔

ڈائجسٹ کیونکہ معیاری تھا اس لیے وہاں سینئر اور منجھی ہوئی رائٹرز کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والے بھی بہ کثرت اپنی تحریریں بھیجا کرتے تھے اور پھر خطوط میں اپنی تحریروں کے قابلِ اشاعت ہونے یا نہ ہونے کی بابت سوالات پوچھا کرتے تھے۔ لوگوں کو اس زحمت سے بچانے کے لیے رسالے کی ایڈیٹر نے ڈائجسٹ کا ایک صفحہ ''اشاعت سے معذرت'' کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ جس میں بڑے دکھ سے اطلاع دی جاتی تھی۔

''یہ خواتین وحضرات اپنی تحریروں کی اشاعت کا انتظار نہ کریں۔''

اور پھر لائن سے ان تمام ناکام ونامراد لوگوں کے نام درج ہوتے تھے۔ اس کے دشمن تو تھے ہی موقع کی تاک میں چنانچہ اگلے ہی روز اس پر کاری وار کیا گیا۔ ایک تو وہ ویسے ہی جلی بیٹھی تھی، ڈائجسٹ والوں کی ناقدری پر جتنا بھی غم مناتی کم تھا، اوپر سے وہ لوگ اسے ٹیز کرنے کا یہ نادر موقع ہاتھ سے گنوانے کے موڈ میں نہیں تھے۔

فرض کرو شہزادی نے رسالے میں بھیجی اک کہانی ہو
فرض کرو ردی کی ٹوکری میں گئی وہ کہانی ہو
فرض کرو شہزادی نے نیند میں دیکھا مکمل ناول چھپتا ہو
بے کل ہو کے من یہ چاہے کاش یہ سپنا سچا ہو

پھر در و دیوار اس کا مذاق اڑانے کو تیار تھے۔ ڈیپارٹمنٹ کا کوئی کونا ایسا نہیں تھا جہاں ان منحوسوں نے اپنی اعلیٰ پائے کی شاعری نہ کی ہو۔

'' خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو شہزادی۔''

اس سے اگلے روز بلیک بورڈ پر فیض کی اتنی خوبصورت نظم کا حشر نشر کیا گیا تھا۔ پروفیسر عثمان نے بھی کلاس میں آ کر اس نظم کو دیکھ کر بڑی مشکلوں سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ اس کا دل تو کرچی کرچی ہو کر ٹوٹ چکا تھا یہاں تک کہ ان لوگوں سے لڑنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ناجیہ بلیک

کلرکا مار کر ہاتھ میں لے کر اس نظم کے نیچے بڑے غصے میں لکھ کر آئی تھی

تری کمینگی کی انتہا چاہتی ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتی ہوں

گروپ کے باقی ممبرز نے اسے شاباشی دی تھی مگر فلک کا دل اب اس دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ اس دنیا میں فن کی قدر نہیں۔ یہ ایڈیٹر صاحبہ اپنے رشتے داروں کی کہانیاں چھاپتی ہوں گی۔ وہ دکھی دل سے اسی قسم کی باتیں سوچ رہی تھی۔ اس کی دوست اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں، تسلیاں اور دلاسے دیئے جا رہے تھے۔

اس روز یونیورسٹی سے واپسی میں بجائے سیدھے گھر جانے کے ان لوگوں نے کراچی کی خوب خاک چھانی تھی۔ ''پارک ناورز'' میں ''یاسر وحید'' کے لان پرنٹس کی نمائش لگی ہوئی تھی، وہ لوگ گھنٹوں وہاں گھومی تھیں۔ ''گلف'' سے ان لوگوں نے اوٹ پٹانگ ڈھیر ساری چیزیں خریدی تھیں۔ یمینہ نے اسے یاسر وحید کا ڈیزائن کردہ لان کا سوٹ لے کر دیا تھا تو فاطمہ نے اپنے پیسوں سے اسے بہت سارے ہیئر کلپس اور ہیئر بینڈز دلوائے تھے۔ افرحہ جس کی کنجوسی سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل تھی اس نے سب کو میکڈونلڈز سے اپنے پلے سے آئس کریم کھلائی تھی۔ غرض یہ کہ وہ سب اسے صدماتی کیفیت سے نکالنے میں بڑی مخلصانہ کوششیں کر رہی تھیں۔

سب دوستوں کا خیال تھا کہ آئندہ وہ لکھنے سے توبہ کر لے گی خصوصاً ناجیہ اور افشاں جو اس کی موڈی فطرت سے بخوبی آگاہ تھیں۔ انہیں سو فیصد یقین تھا کہ آئندہ لکھنا تو درکنار وہ لکھنے کا نام لینا بھی گوارا نہ کرے گی مگر ان سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب انہوں نے اگلے ہی روز اسے اپنی دوسری کہانی پوسٹ کرتے دیکھا۔ ان دو مہینوں میں وہ سات آٹھ کہانیاں تو لکھ ہی چکی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دھڑا دھڑ سب کی سب آگے پیچھے پوسٹ کر دیں۔ اس کا یہ شوق شاعری، پینٹنگ، کلنگ، انٹیریئر ڈیزائننگ اور فوٹو گرافی کی طرح کا شوق ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ اس بار میدان چھوڑنے کیلئے تیار نہ تھی۔

''میرے ارادوں کی پختگی کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ جن کی تحریریں چھپ رہی ہیں وہ کوئی آسمان سے نہیں اتریں۔ اگر وہ ایسا لکھ سکتی ہیں کہ جو چھپ سکے تو میں بھی ایسا لکھ کر دکھا دوں گی۔'' وہ ایک نئے عزم سے میدان عمل میں کودی تھی۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

سعدیہ نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کمر تھپتھپا کر مصرعہ سنایا تھا اور بس پھر اس نے نہ دن دیکھا نہ رات مسلسل اور انتھک محنت کو اس نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔

تھیم تو پہلے کی طرح ابھی بھی وہ سب مل کر ہی ڈھونڈتی تھیں مگر اس کے بعد کا سارا کام وہ ''ننھی سی جان'' تنہا کیا کرتی تھی۔ آدھی رات کو وہ سوتے سے افشاں کو اٹھا دیتی۔ وہ بے چاری آنکھیں ملتی ہوئی ہکا بکا اس کی شکل دیکھتی تو بڑی سنجیدگی سے پین منہ میں دبائے سوال کرتی۔

''ہابیل نے قابیل کو قتل کیا تھا یا قابیل نے ہابیل کو؟''

افشاں کا دل چاہتا کہ اس کا سر پھاڑ دے، رات کے تین بجے سوتے سے اٹھا کر اتنے بے تکے سوال کا پس منظر اسے اچھی طرح معلوم تھا۔

''یار! مجھے اپنے ہیرو کا کوئی یونیک سا نام رکھنا ہے۔ نام تو میرے ذہن میں آ گیا۔ اب کنفیوژن یہ ہے کہ کہیں میں ہیرو کا نام قاتل بھائی کے نام پر نہ رکھ دوں۔'' وہ معصومیت سے عرض کرتی۔

''ان دونوں میں سے تو جس نے بھی جس کو قتل کیا ہو مگر آپی جان! آپ ضرور میرے ہاتھوں قتل ہو جائیں گی۔'' وہ سخت طیش میں آ کر چلاتی اور پھر اپنے اور اس کے مشترکہ کمرے سے واک آؤٹ کر کے پھوپھی صاحب کے بیڈ روم میں جا کر سو جاتی۔

''لو بلاوجہ ناراض ہو رہی ہے، کل کو جب میں مشہور رائٹر بن جاؤں گی تو خود ہی ہر ایک کو اترا اترا کر بتایا کرے گی کہ شہزادی فلک ناز میری بڑی بہن ہیں۔ جی ہاں وہ ہی جن کے افسانوں کا مجموعہ پچھلے ماہ لندن سے شائع ہوا ہے۔ جی ''اسٹار پلس'' سے عنقریب ان کا لکھا ہوا ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہونے والا ہے۔ ہاں جیمز کیمرون سے ان کی بات چیت تقریباً فائنل ہو چکی ہے۔ وہ ٹائی ٹینک کی طرز پر ایک اور فلم بنا رہے ہیں، اس کی کہانی آپی جان یعنی شہزادی فلک ناز ہی لکھ کر دیں گی۔ بس آپی جان کی شرط یہ ہے کہ ہیرو ہیروئن ان کی پسند کے ہوں۔ اسی بات پر ذرا سا اختلاف ہے۔ آپی جان نام کروز کو ہیرو کے طور پر لینا چاہتی ہیں اور وہ وین ڈیم کو لینے پر مصر ہیں۔''

وہ کہانی چھوڑ چھاڑ چشمِ تصور میں خود کو ہالی ووڈ میں کھڑا پاتی۔ اچھے اچھے ڈائریکٹرز اس کی کہانیوں کو حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے نظر آ رہے تھے۔ سوچتے سوچتے ہی اکثر اسے نیند آ جایا کرتی تھی۔ ہر مہینے ''اشاعت سے معذرت'' میں سب سے اوپر اسی کا نام ہوتا تھا۔ اس بارے میں افشاں کا خیال یہ تھا کہ اس کا نام چونکہ ایڈیٹر کو حفظ ہو چکا ہے اس لیے ہر بار لسٹ تیار کرتے وقت خود بخود سب سے پہلے اسی کا نام وہ لکھ لیتی ہیں۔

''آپی جان! آپ خوش قسمت ہیں کہ بغیر چھپے بھی آپ کو ادارے کے تمام ارکان اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ ہر مہینے کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ دس مرتبہ جب وہ آپ کے افسانے اور ناول وصول کرتی ہوں گی تو ان کے دل پر کیا بیتتی ہوگی وہ خود ہی جانتی ہوں گی، پھر دل پر ہزار جبر کر کے اپنی پروفیشنل ذمہ داری نبھانے کی خاطر اسے پڑھتے ہوئے ان کا دل سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جانے کو چاہتا ہوگا جس طرح بچپن میں اکثر بچے الجبرا پڑھنے سے بھاگتے ہیں بالکل ایسے ہی وہ ان تحریروں کے نام سے کانپ جاتی ہوں گی۔''

افشاں کے دل خراش تبصروں میں مزید اضافہ فاروق اور خرم کیا کرتے تھے۔

''یار! کچھ بھی کہو، فلک کی وجہ سے ان لوگوں کو فائدہ بھی بہت ہے۔ وہ اپنے ڈائجسٹ کی سرکولیشن سے اتنا نہیں کماتے ہوں گے جتنا ہر مہینے ردی بیچ کر کمانے لگے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے ایک نیا سیکشن اسی مقصد کے لیے بنا لیا ہو جس کا نام ''ردی سیکشن'' اور باقاعدہ وہاں بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کیے ہوئے کسی بندے کو اپوائنٹ کیا ہو جو بخوبی ردّی سے متعلق تمام امور میں ڈیل کرتا ہو۔''

فاروق اور خرم ہر ہفتہ کراچی نازل ہوتے تھے اور آ کر اسی طرح کی گفتگو کر کے اس کی ہمت پست کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں۔

''ارے کل کی بات سنو، میں نے ''گلاب پان ہاؤس'' سے الائچی اور سونف والا پان خریدا، پان کھا کر جو کاغذ پھینکنے لگا تو فلک کی رائٹنگ

پر نظر پڑی اور اس کی رائٹنگ تو میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا ہوں۔ کاغذ پر سے بطخ گزری ہوئی الگ ہی پتا چل جاتی ہے۔ سچ فلک! تمہاری شہرت حیدرآباد تک اس ردّی کی بدولت پہنچ رہی ہے۔''

خرم کیوں پیچھے رہتا اس نے بڑی سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی تھی۔ پھوپھی صاحب جو بچوں کی گفتگو سے بے نیاز بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں انہوں نے بھی بمشکل اپنی مسکراہٹ بھتیجی سے چھپائی تھی۔

''اچھا اس کاغذ پر لکھا ہوا کیا تھا؟'' فاروق اور افشاں اسے مزید شہ دیتے۔ ناجیہ کی دال بھی ان تینوں کے آگے نہیں گلتی تھی اس لیے وہ بھی اس کی مدد کرنے سے قاصر ہی رہا کرتی تھی۔

''اس پر لکھا ہوا تھا کہ چودھری قطب الدین ایبک کے چھ بیٹے تھے۔ سب سے بڑے ظہیر الدین بابر، ان سے چھوٹے جلال الدین اکبر، ان سے چھوٹے ابراہیم لودھی، ان سے چھوٹے محمود غزنوی، ان سے چھوٹے اسد اللہ غالب اور سب سے چھوٹے مومن خان مومن۔ تقسیم ہند کے بعد وہ اپنی بیوی چمن آرا اور بیٹوں کے ساتھ لاہور میں آباد ہو گئے تھے۔ سب سے بڑے ظہیر الدین بابر کی شادی انہوں نے اپنی پھپھیری بہن کی بھتیجی کی بیٹی سے کی تھی اور ان کے چار بچے تھے سب سے بڑا بیٹا نسیم حجازی اس سے چھوٹی بدر النساء پھر اس سے چھوٹا.....'' فاروق اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے سے روکتے ہوئے کہتا۔

''بس کرو یار! سر میں درد شروع ہو گیا۔ یہ تم فلک کی کہانی سنا رہے ہو یا کسی کا شجرہ نسب بیان کر رہے ہو۔'' وہ ان کی کمینگی پر جتنا بھی تپتی کم تھا۔ رائٹنگ ٹیبل پر رکھی اس کی تازہ ترین کہانی کا وہ لوگ دل کھول کر مذاق اڑا رہے تھے۔ افرحہ کے مشورے پر وہ بہت بڑے کنبے کے اوپر کہانی لکھ رہی تھی جس میں ڈھیر سارے کزنز ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ افرحہ کا خیال تھا کہ ایسی کہانیاں لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں۔

''ابھی تو میں نے تعارف بھی پورا نہیں کروایا تھا۔ ابھی تو ہیرو ہیروئن کا انٹروڈکشن بھی نہیں ہوا۔ منجھلے بھیا کا اکلوتا بیٹا ہابیل اور سب سے چھوٹے بھائی کی اکلوتی بیٹی رشیدہ۔ خیال رہے کہ ہیرو ہیروئن کا اکلوتا ہونا از حد ضروری ہے۔ تعارف کے انداز سے ہی پڑھنے والے کو پتا چل جائے گا کہ سب سے ذہین اور بے حد ہینڈسم، انتہا سے زیادہ ایمان دار اور سچا بندہ ضرور ہیرو ہی ہوگا اور سب سے چھوٹے بھیا کی اکلوتی دختر رشیدہ جو ماں باپ کے مرنے کے بعد گھر والوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہی ہے۔ جب وہ کھڑے کھڑے جھٹ پٹ مولیوں کے پراٹھے اور آلو میتھی پکا کر لا رہی ہوتی ہے تو پڑھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ ہو نہ ہو یہی ہیروئن ہے۔'' خرم دانت نکالتے ہوئے کہتا۔

''ویسے تم ہیرو کے نام میں جتنی انفرادیت ڈھونڈتی ہو ہیروئن کے نہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟''

فاروق اس کے کندھے کے گرد اپنا ہاتھ پھیلاتا ہوا بڑی سنجیدگی سے دریافت کرتا اور وہ جو یہ عہد کیے بیٹھی تھی کہ دنیا والوں کے طعنوں اور حوصلہ شکن رویوں سے کبھی بھی بددل نہیں ہوگی، مستقل مزاجی سے سنجیدہ چہرہ بنائے خاموشی سے بیٹھی رہتی۔ اگر ان لوگوں کو اس کے چڑنے کا پتا چل گیا تو وہ اور زیادہ چڑایا کریں گے۔

''میرا خیال ہے آپی جان! ہیروئن کا کریکٹر اپنے آپ کو سامنے رکھ کر لکھتی ہیں۔ اسی لیے اس کا نام خوب چھانٹ کر پرانے زمانے کا رکھتی

ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہر مرتبہ ہیروئن کے کردار میں یہ خود ہی جلوہ افروز ہوتی ہیں تب ہی تو ان کی ہیروئن بے چاری بس عام سی شکل وصورت کی ہوتی ہے۔ نہ اس کی زلفیں ناگن سی ہوتی ہیں نہ رنگ شہابی نہ چہرہ کتابی نہ گالوں میں ڈمپل پڑے ہیں اور نہ ہی آنکھیں نیلی یا سبز ہوتی ہیں مگر اس عام سی شکل صورت کے باوجود اس میں کوئی بات ہوتی ہے، کچھ خاص بات جو سوائے ہیرو کے کسی کو نظر نہیں آتی۔ حاضرین نوٹ فرمایئے یہاں زور ''خاص بات'' پر ہے اور اس ''خاص بات'' کی وضاحت بے چاری مصنفہ خود بھی نہیں کر پاتیں۔ ہیرو البتہ چھ فٹ اونچا، خوب ہینڈسم، بڑی بڑی براؤن کلر کی کشادہ آنکھیں بلیک سوٹ پہنے سگریٹ پیتا ہوا اتنا ڈیشنگ لگتا ہے کہ کتنوں کے تو دل ہی دھڑکنا بھول جاتے ہیں۔''

یہ گل افشانی افشاں صاحبہ فرماتیں اور وہ اپنے آنسو پیتی بمشکل وہاں بیٹھی رہتی۔ ہر بار جب اس کی ہمت ایسے تبصروں کی وجہ سے پست ہونے لگتی تو وہ خود کو یاد دلاتی کہ ایسا صرف اسی کے ساتھ نہیں ہو رہا، اس ظالم دنیا نے ہر اچھے شاعر، مصور اور ادیب کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ کبھی بھی کسی فنکار کی قدر اس کی زندگی میں نہیں ہوئی۔ آج جو ہم بات بے بات غالب کے اشعار اپنی گفتگو میں کوڈ کرتے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ ان کے زمانے میں ان کے ساتھ کتنا برا سلوک ہوا تھا۔ بس ایسا ہی اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔

کچھ بھی تھا، وہ ایسی باتوں سے ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ وہ دنیا والوں کو بتا دے گی کہ اس میں کتنا ٹیلنٹ چھپا ہوا ہے۔ اس کی کہانیاں بھیجنے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''آپ اپنی مشقِ ستم جاری رکھیے، میں ہمت ہار کر میدان چھوڑنے والوں میں سے نہیں۔''

وہ غائبانہ ایڈیٹر کو مخاطب کرتی۔ اس کی دوستوں کا تعاون روز اول جیسا ہی تھا۔ ہر بار سب دل و جان سے اس کے ساتھ تھیم سے لے کر آخری سین تک ساتھ ساتھ ہوتیں۔ کبھی وہ اس کے ساتھ گھر آ کر کہانی پڑھا کرتیں اور کبھی وہ یونیورسٹی لے جا کر کامن روم میں ان لوگوں کو پڑھوایا کرتی تھی۔ اس نے عروس اور ناجیہ کے مشورے پر ایک نئی کہانی شروع کی تھی۔ حسب سابق سب سے پہلا اور اہم مسئلہ ہیرو کے نام کا تھا۔ سب ہی مختلف نام تجویز کر چکی تھیں مگر وہ مطمئن نہ ہو رہی تھی۔

رات سونے سے پہلے عروس نے فون کر کے کہا کہ ہیرو کا نام جبرائیل رکھ لو، اسے اور ناجیہ کو تو نام ایک دم منفرد لگا تھا۔ آج تک کبھی کسی رائٹر نے اپنے ہیرو کا نام جبرائیل نہیں رکھا۔

''پھر اس کے بڑے بھائی کا نام ہوگا اسرافیل، چھوٹے کا نام ہوگا میکائیل اور ابا کا نام ہوگا عزرائیل۔'' افشاں نے ان دونوں کی گفتگو کے بیچ میں ٹانگ اڑانا اپنا اخلاقی فرض سمجھا تھا۔

''تم جا کر الٹی سیدھی لائنیں کھینچ کر دوسروں کی چیٹنگ کر کر کے گھروں کے نقشے بناؤ، ان باتوں میں تمہارے جیسے خشک اور بور لوگوں کا کیا کام۔ جاؤ جا کر سوچو کہ ڈرائنگ روم میں کتنی کھڑکیاں کھلنی چاہیے اور پیج کتنا چوڑا ہونا چاہیے۔'' افشاں کو لتاڑ کر وہ جلدی سے کہانی لکھنے بیٹھ گئی تھی۔

''یار! میں اپنے ہیرو کا پروفیشن کیا دکھاؤں؟''

صبح گھر سے نکلتے ہوئے وہ ناجیہ اور عروس سے سوال کرتی۔ عروس کا گھر قریب ہی تھا اور وہ ان لوگوں کے ساتھ ہی یونیورسٹی جایا کرتی تھی۔

''آرمی میں دکھادو۔'' عروس مشورہ دیتی۔

''نہیں پچھلی دو کہانیوں میں بھی ہیرو آرمی میں دکھایا تھا اور دونوں ریجیکٹ ہوگئیں۔ اب مجھے آرمی میں دکھاتے ہوئے وہم آرہا ہے۔'' وہ اپنی مجبوری بیان کرتی۔

''اچھا پھر سول سروس میں۔'' ناجیہ جھٹ دوسرا آئیڈیا پیش کرتی۔

''سول سروس کے بھی تو اتنے سارے شعبے ہیں، وہ جاب کہاں کرتا ہوگا۔'' وہ اتفاق کرتے ہوئے اگلا سوال کرتی۔

''انکم ٹیکس میں دکھادو۔''

''نہیں۔''

''اچھا کسٹمز میں۔'' دوسرا مشورہ دیا جاتا۔

''بھئی نہیں ناں۔'' سب سمجھیں گے کہ میرا ہیرو رشوت خور ہے۔ ان محکموں کی ریپوٹیشن نہیں پتا تمہیں۔'' وہ پھر انکار کرتی۔

''اچھا ریلویز۔''

''نہیں اس سے غربت ٹپکتی ہے، میرا ہیرو جہاز سے نیچے کبھی نہیں اترا۔'' وہ اتراتی۔

''اچھا بابا پولیس سروس۔'' ناجیہ چڑ کر کہتی۔

''ہاں تاکہ وہ حیدر لوگ میرے ہیرو کو ٹلا ٹلا کہہ کر چھیڑیں۔''

وہ جل کر کہتی اور اسی وقت لفٹ کے پاس کھڑے حیدر، امیر حمزہ، بابر اور یاسین اسے نظر آجاتے۔ وہ لوگ بظاہر ان کی گفتگو سے انجان بنے آپس میں باتیں کر رہے تھے مگر کان درحقیقت ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو نظر انداز کرتی وہ لوگ سیڑھیوں سے نیچے اتر آئیں اور پھر یونیورسٹی پہنچنے تک ہیروکا پروفیشن ہی موضوع بحث بنا رہا۔ آخر کار بڑی مشکلوں سے ڈی ایم جی پر آکر اتفاق رائے ہوا۔

وہ ان دنوں سخت محنت کر رہی تھی۔ ایک طرف کہانیوں کی محنت اور دوسری طرف پڑھائی۔ پھوپھی صاحب جیسی سخت گیر شخصیت کے ہوتے ہوئے پڑھائی سے لاپروائی کا تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کلاس میں لیکچر نوٹ کرتے کرتے اچانک اس کا ذہن اپنی کہانی کی طرف چلا جاتا اور وہ بیٹھے بیٹھے آگے کی کہانی کا تانا بانا بننے بیٹھ جاتی۔

اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا وہ اپنی کہانی کی الجھنوں میں گم لیکچر سے لاپرواہ سی تھی، تب ہی پچھلی رو میں بیٹھی ناجیہ نے اس کی کمر پر چٹکی کاٹتے ہوئے ہاتھ نیچے کر کے ایک کاغذ پکڑایا تھا۔

''کیا بات ہے، اتنی اداس اور پریشان کیوں ہو؟''

کاغذ پر لکھی یہ تحریر پڑھ کر اسے ناجیہ کی اپنے متعلق تشویش پر بے اختیار پیار آیا تھا۔

''یار! میری ہیروئن کے ہاں ننھا مہمان آنے والا ہے اب الجھن یہ ہے کہ ہیروئن یہ بات ہیرو کو کس طرح بتائے۔ تمہیں پتا ہے نا، میری

ہیروئن تو ہمیشہ ہی شرمیلی ہوتی ہے۔''

اس نے اسی کاغذ پر دردِ دل لکھا اور اس کا گولا بنا کر پیچھے اچھال دیا۔ یہ دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ وہ مڑا تڑا کاغذ امیر حمزہ کی نوٹ بک پر جا کر گرا تھا۔ ناجیہ نے اس حرکت پر اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ وہ کلاس شروع ہونے کے بعد آیا تھا اور سر آفاق کے لیکچر سے بچنے کے لیے جلدی سے ناجیہ کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہی کاغذ دوبارہ فلک نے وصول کیا تھا۔ ناجیہ تو اب تک اپنا سر پکڑے بیٹھی تھی جبکہ وہ حیران ہوتی سوچ رہی تھی۔

''یہ ناجیہ کی رائٹنگ چینج کیسے ہوگئی۔''

''ایسا کریں جس وقت ہیرو کے آفس کے گھر آنے کا ٹائم ہو، ہیروئن کو اس وقت اون اور سلائیاں ہاتھ میں پکڑا کر نٹنگ کرنے بٹھا دیں، راکنگ چیئر پر بیٹھی ''شرمیلی'' چھوٹا سا موزہ یا ٹوپا بن رہی ہوگی جس وقت ''صاحب بہادر'' کی انٹری ہوگی اور آپ کا ہیرو اتنا جینئس تو ہوگا ہی کہ سمجھ لے کہ بیگم جون کے مہینے میں نٹنگ کرنے کیوں بیٹھی ہیں۔''

وہ تحریر پڑھتے ہوئے ناجیہ کے طرزِ تخاطب اور رائٹنگ دونوں پر ہی حیران تھی اور امیر حمزہ پیچھے بیٹھا مسلسل مسکرا رہا تھا۔ ناجیہ فلک کی ان لوگوں کے ہاتھوں بننے والی درگت کا ابھی سے سوچ کر ڈر رہی تھی۔ پیریڈ کے بعد جب یہی بات ناجیہ نے فلک کو بتائی تو اس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ تھوڑی سی شرم بھی آئی تھی۔ کیا سوچ رہا ہوگا حمزہ میں ایسی کہانیاں لکھتی ہوں، پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

''میرے گھر آئی ایک ننھی پری۔''

''تو پھول میرے گلشن کا، تو ہے چاند میرے آنگن کا''

اور

''چندا ہے تو میرا، سورج ہے تو اور میری آنکھوں کا تارا ہے تو'' کی آوازیں چوبیس گھنٹے سامنے والے فلیٹ سے آیا کرتیں اور ہر بار ناجیہ گھور کر اس کی طرف دیکھتی یہاں تک کہ پھوپھی صاحب نے بھی حیرت سے دریافت کیا تھا۔

''یہ لوگ آج کل ہر وقت یہی گانے کیوں لگائے رکھتے ہیں؟''

''حمزہ کی بہن کے ہاں بیٹی ہوئی ہے، بھانجی کی خوشی میں وہ ہر وقت یہ گانے سنتا ہے۔''

افشاں جو ساری صورت حال سے باخبر تھی اس نے بڑے آرام سے انہیں جواب دیا تو وہ گردن ہلاتی چلی گئیں۔

تو یہ تھا عوامل اور واقعات کا مختصر سا ذکر، جن کی وجہ سے فلک نے رائٹر بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب واپس ہم حال کی طرف آتے ہیں یعنی جہاں سے ہم نے اپنی داستان کا آغاز کیا تھا۔ خوب غور سے کان دھر کر سنیں کہ آخر کار ایک سال کی جہد مسلسل کے بعد فلک ناز اپنی تحریر شائع کروانے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔

امتحانوں سے فارغ ہو کر وہ لوگ پھوپھی صاحب کے ساتھ حیدر آباد آئی ہوئی تھیں۔ سمسٹر بریک کے علاوہ وہ لوگ شاذ و نادر ہی حیدر

آباد آتی تھیں۔ ہر دس پندرہ دن بعد مما یا پاپا کراچی آجایا کرتے تھے۔ پھوپھی صاحب کی ظالم و جابر شخصیت پر تو انہیں کوئی شبہ نہ تھا مگر دل کی تسلی کے لیے خود بھی جلدی جلدی چکر لگایا کرتے تھے۔ اپنا گھر ہونے کی وجہ سے جلدی جلدی آنے اور ایک آدھ دن رک جانے میں بھی کچھ حرج نہ تھا اور یوں ''بچیوں'' کی تعلیمی کارکردگی وغیرہ سے وہ لوگ مسلسل باخبر رہتے تھے۔

آخر کار فلک کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر پاپا، مما، فاروق، خرم اور پھوپھی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ فلک ناشتہ کر کے ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی جبکہ ناجیہ اور افشاں ابھی سو کر نہیں اٹھی تھیں۔ عین اسی وقت اخبار والے نے گیٹ پر بیل کر کے ڈائجسٹ اندر اچھالا تھا۔ ہر بار وہ ڈائجسٹ ہاتھ میں لے کر پہلے خوب ساری سورتیں پڑھتی تھی، اس کے بعد آخر کار ڈرتے ڈرتے پہلا صفحہ کھولتی تھی۔ گھر کے باقی افراد نے تو اسے ڈائجسٹ ہاتھ میں لے کر آتے دیکھ کر کسی قسم کے جوش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہ سین بارہا سب ہی دیکھ چکے تھے۔

آنکھیں بند کر کے اس نے جلدی جلدی درود شریف کا ورد کیا اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ رسالہ کھولا۔ ارے یہ کیا، مکمل ناول ''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا'' کے آگے شہزادی فلک ناز کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس کہانی میں اس کی ہیروئن کا نام نرگس تھا اور دوسرے یہ کہ اس میں ہیرو نے اپنے دیدوں کا کافی درست اور برمحل استعمال کیا تھا اسی لیے اس نے کہانی کا یہ عنوان تجویز کیا تھا۔ یہ اس کی اب تک کی بھیجی گئی کہانیوں میں سے پہلی کہانی تھی جس کی تھیم بھی اس نے کہیں سے نہیں چرائی تھی۔

بقول افشاں اس کہانی میں تھیم نام کی کسی چیز کا دور دور تک گزر نہیں تھا اس لیے چرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس کی چیخوں سے گھر کے در و دیوار ہل رہے تھے۔ جو سو رہے تھے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے اور جو جاگ رہے تھے وہ کانوں میں انگلیاں دیئے اللہ کی پناہ مانگتے ہوئے پوچھ رہے تھے کہ کیا صور اسرافیل پھونکا جا چکا۔ چھلانگیں لگاتی وہ خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر دے۔ برابر والی آنٹی اپنا سب کام کاج چھوڑ چھاڑ ایپرن پہنے بھاگتی ہوئی ان کے گھر آئی تھیں۔

''خیر تو ہے بھابھی! خدانخواستہ امریکہ سے تو کوئی بری خبر نہیں آئی؟'' دادی پچھلے چھ ماہ سے چچا جان کے پاس شکاگو گئی ہوئی تھیں اور وہاں ان کی حالت سخت خراب تھی۔

مما نے ان کی بات کے جواب میں ''ہمارے ایسے نصیب کہاں'' والی شکل بنائی تھی۔ پاپا اور پھوپھی صاحب کی موجودگی کے سبب وہ یہ بات منہ سے بولنے سے قاصر تھیں۔

ابھی وہ اپنی دوستوں کو فون کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ یکے بعد دیگرے سب ہی کا فون آ گیا۔ وہ سب بھی خوشی سے دیوانی ہوتی شاندار سی ٹریٹ کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ چھٹیاں ختم ہونے میں ابھی کافی دن تھے مگر اسے ایک دم کراچی جانے کی جلدی پڑ گئی تھی۔ اس نے اپنے دشمنوں کو دندان شکن جواب دے دیا تھا۔ اب ان کی پسپائی کا نظارہ بھی تو کرنا تھا۔

فاروق کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی کہانی میرٹ کی بنیاد پر شائع ہوئی ہے۔

''ضرور تم نے کچھ دے دلا کر اسے پرچے میں لگوایا ہے۔'' اس کی بات پر ناجیہ کو فلک سے زیادہ غصہ آیا تھا۔

''ارے وہ کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں، صرف اور صرف معیاری تحریریں شائع ہوتی ہیں اس ڈائجسٹ میں۔ تعلقات اور دینے دلانے والی بات وہاں نہیں ہے۔'' وہ آگ بگولا ہو کر بولی تھی۔

''ہاں! اب اپنی کہانی چھپ گئی تو وہ ایماندار، پروفیشنل اور ٹیلنٹ کی قدر کرنے والے ہو گئے۔ کل تک تو رشتے داروں کی کہانیاں چھپا کرتی تھیں۔'' خرم بھی میدان میں کودا تھا۔

''میرا خیال ہے ڈائجسٹ کی ایڈیٹر ہماری آپی جان کی مستقل مزاجی کے سامنے گھٹنے ٹیک گئی ہیں۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ شاید کہانی چھاپ دینے سے ہی ان کا پیچھا ان اعلیٰ پائے کی تحریروں سے چھوٹ جائے۔''

افشاں کیوں دل جلانے میں پیچھے رہتی۔ بہن بھائیوں سے قطع نظر گھر کے بڑوں نے اس کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی تھی۔ پاپا کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹی نے ایک بے حد شاندار اور منفرد کارنامہ سرانجام دیا ہے اور بلاشبہ وہ ان کے خاندان کی پہلی رائٹر ہے۔ ان کی دس پشتوں میں کوئی ادیب نہیں گزرا تھا۔ پاپا نے شاباشی کے طور پر اسے ہزار روپے دیئے تھے جن سے وہ لوگ رات میں جا کر آئس کریم وغیرہ کھا کر آئے تھے۔

کراچی پہنچنے پر اس کی فرینڈز نے اسے ریڈ کارپٹڈ ویلکم دیا تھا۔ خود وہ اترائی پھر رہی تھی۔ پھوپھی صاحب برتن دھونے کو کہتیں تو جواب آتا۔

''یہ ہاتھ برتن مانجھنے کے لیے نہیں بنے، یہ ایک آرٹسٹ کے ہاتھ ہیں اور ان میں صرف قلم اچھا لگتا ہے۔'' آٹا گوندھنے کو کہا جاتا تو فلک صدمے سے بے حال ہو جاتی۔

''رائٹر کی یہ قدر ہو رہی ہے اس گھر میں۔ پھوپھی صاحب رائٹرز آٹا گوندھنے اور روٹیاں تھوپنے والے کام کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔''

''ہاں رائٹرز کو بھوک تھوڑی لگتی ہے۔'' پھوپھی صاحب جل کر کہتیں یا کبھی کبھار تپ کر کہتیں۔

''تمہارے سر پر دو سینگ نہیں نکل آئے۔ جاؤ جا کر دال میں بگھار لگاؤ۔'' گھر میں ہونے والے ان روز مرہ کے معرکوں سے قطع نظر وہ بڑی سنجیدگی سے یونیورسٹی کھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سامنے والے فلیٹ پر بھی تالا لگا ہوا تھا۔ امیر حمزہ اور یاسین اپنے تمام دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ ایکسائٹمنٹ اس کی فرینڈز کو تھی۔

جس روز یونیورسٹی کھلنی تھی وہ لوگ صبح سویرے ہی یونیورسٹی پہنچ گئی تھیں۔ پورا ڈیپارٹمنٹ ویران پڑا تھا۔ اتنی صبح سوائے رینجرز اور صفائی کرنے والے عملے کے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے گھر سے بنا کر لائے ہوئے اشتہار کی کاپیاں ان تمام جگہوں پر لگائیں جہاں جہاں اس پر نظمیں لکھ کر اس کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ اشتہار سب کی باہمی مشاورت سے تیار ہوا تھا۔

''اطلاع عام

ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ماہنامہ سندیسہ کے جولائی کے شمارے میں شہزادی فلک ناز اپنی علمی، ادبی اور اعلیٰ ترین تخلیق کے ساتھ جلوہ افروز ہو چکی ہیں۔ پہلے آیئے پہلے پائیے کی بنیاد پر اپنا پرچہ آج ہی حاصل کیجئے۔ خود بھی پڑھیے اور شہزادی صاحبہ سے جلنے والوں کو بھی

پڑھوایئے۔ جلدی کیجئے اسٹاک محدود ہے۔

المشتہر:۔ محبان شہزادی فلک ناز

ڈیپارٹمنٹ میں اس اشتہار سے کھلبلی مچ گئی تھی۔ ان دوگروپوں کی تکرار اور جنگ وجدل سے سب ہی واقف تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو پہلے ہی ڈائجسٹ پڑھ چکے تھے اور جنہوں نے نہیں پڑھا تھا وہ اس اشتہار کو پڑھنے کے بعد رسالہ لینے دوڑے تھے۔

حیدر لوگوں کا ردعمل بڑا خلاف توقع تھا۔ ان لوگوں کے پاس آ کر ان سب نے باجماعت ہو کر کورس میں مبارک باد دی تھی۔ حیدر نے بڑا اپنائیت بھرا شکوہ کیا تھا۔

''اتنی خوشی کی خبر وہ بھی سوکھے منہ۔ کم سے کم آپ حیدرآباد سے ہم لوگوں کے لیے ربڑی ہی لے آتیں۔''

فلک سے ان لوگوں کا شریفانہ انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا مگر مبارک باد تو اس نے بہرحال قبول کر ہی لی تھی۔ ان سب کو ہی اب شدت سے اگلے شمارے کا انتظار تھا۔ آخر اپنے مکمل ناول کے بارے میں لوگوں کی آرا بھی تو پڑھنی تھیں۔ بڑی مشکلوں سے جوں توں کر کے مہینہ گزرا اور ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا تو وہ سب کی سب رسالے پر جھپٹ پڑیں۔

''سندیسہ کے نام سندیسے'' میں پہنچ کر ان لوگوں نے ایک ایک خط کو کئی کئی بار پڑھا مگر کسی ایک خط میں جو اس کے بارے میں رائے دی گئی ہو۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پچھلے ماہ اس کی کہانی چھپی ہی نہیں تھی۔ اسے بے اختیار رونا آنے لگا، پہلے ایڈیٹر کے ظلم وستم کا نشانہ بنی اور اب قارئین۔ وہ کس کس محاذ پر لڑے۔

''ارے یہ دیکھو، ہے نا تمہاری کہانی پر تبصرہ۔'' سعدیہ نے چیخ مار کر کہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر وہ ایک عدد خط دریافت کرنے میں کامیاب ہوئی تھی جس میں اس کی کہانی پر تبصرہ کچھ یوں کیا گیا تھا۔

''جولائی کا شمارہ اچھا تھا۔ تمام تحریریں جان دار تھیں۔ یہ شہزادی فلک ناز غالباً نئی رائٹر ہیں۔ ان کا ناول پڑھ کر دو گولی ڈسپرین پانی میں گھول کر کھائیں تو سر درد ٹھیک ہوا۔ انداز تحریر ایک دم بچکانہ اور امیچور محسوس ہوا۔ باجی آپ نئے لکھنے والوں میں صرف اچھا لکھنے والوں ہی کو جگہ دیا کیجئے۔ جس تحریر نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ میری فیورٹ رائٹر نجیب النساء کے سلسلے وار ناول کی پچیسویں قسط تھی۔ کتنی خوبصورتی سے انہوں نے حوریہ اور خرمن کو ایک کروایا ہے۔ اتنی اچھی تحریر پر دل کرتا ہے نجیب آپی کے ہاتھ چوم لوں۔ نجیب آپی آپ اسی طرح ہمارے لیے اچھے اچھے ناول لکھتی رہیں، آپ کے بغیر تو رسالے میں رونق ہی محسوس نہیں ہوتی۔''

''یہ نورتن بانو ضرور میرے ہاتھوں ضائع ہوگی۔'' وہ بری طرح پیچ وتاب کھا رہی تھی۔

''دوسروں پر تنقید کرنا اس دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔ خود سے اگر کہا جائے کہ ''کلفٹن کی سیر'' پر ایک صفحے کا مضمون لکھ دو تو بغلیں جھانکنے لگیں گی۔'' ناجیہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''اور یہ منحوس نجیب النساء اللہ کرے اس کے ہاتھ ہی ٹوٹ جائیں۔'' اس نے جاہل عورتوں کی طرح بلبلا کر بددعا دی تھی۔

''پتا نہیں مجھے کبھی بھی کوئی خوشی مکمل کیوں نہیں ملتی۔ پہلے کہانی نہ چھپنے کا غم تھا، اب اللہ اللہ کر کے چھپی ہے تو لوگوں کا ناروا سلوک میرا دل پارہ پارہ کر رہا ہے۔''

اس کے دشمن تو تھے ہی موقع کی تاک میں۔ ابھی کچھ ہی روز پہلے اسے کہانی چھپنے کی مبارک باد دے کر ان کے گھر آ کر باقاعدہ پھوپھی صاحب کے ہاتھوں کی بنی رس ملائی کھا کر جانے والے اگلے روز اس کی روتی شکل دیکھ کر گنگنائے تھے۔

''چٹھی ذرا شہزادی جی کے نام لکھ دو۔'' اور وہ زار زار روئی تھی۔

''ایسا کرتے ہیں ہم سب فلک کی کہانی پر تعریفی خط لکھ کر پوسٹ کرتے ہیں۔''

اس کی اگلی کہانی پوسٹ کرتے ہی یمینہ نے مشورہ دیا تھا۔ اس کا دیا مشورہ سب ہی کو بے حد پسند آیا تھا۔ یہ بات تو ان میں سے کسی کے بھی ذہن میں نہیں آئی تھی کہ تعریفی خطوط تو خود بھی لکھے جا سکتے ہیں۔ ابھی اگلی کہانی چھپی نہیں تھی اور وہ سب خط لکھنے بیٹھ گئی تھیں۔ ایک ایک خط تو سب نے اپنے اصل نام و پتے سے لکھا باقی خطوط فرضی ناموں اور جگہوں سے لکھے گئے۔ خطوط میں لکھا جانے والا مواد تو ظاہر ہے سب کو رائٹر صاحبہ نے تیار کر کے دیا تھا۔ ہر خط میں ''اتنی اچھی تحریر پر شہزادی آپی کے ہاتھ چومنے کا دل چاہ رہا ہے۔'' شامل تھا۔ اس کے علاوہ نجیب النساء اور نورتن بانو کی بھی خوب خوب کھنچائی کی گئی تھی۔

''آپ لوگوں کا کیا خیال ہے ایڈیٹر صاحبہ نے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری کیا چنے دے کر حاصل کی ہے۔''

کمپیوٹر پر اپنا اسائنمنٹ ٹائپ کرتی افشاں نے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر ان لوگوں کو مخاطب کیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ سب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھیں۔

''مطلب یہ کہ اتنے بڑے ڈائجسٹ کی ایڈیٹر کوئی ہماری آپ کی طرح عام سی ذہانت رکھنے والی شخصیت نہیں ہو سکتی۔ دن بھر میں کتنی تحریریں ان کی نظروں کے سامنے سے گزرتی ہوں گی۔ ان کی ذہانت کا تو وہ حال ہوگا کہ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ ان تمام خطوط میں الفاظ کی ذرا سی الٹ پھیر کے ساتھ تقریباً ایک جیسی باتیں لکھی گئی ہیں اور انداز تحریر تو ظاہر ہے ایک سا ہے ہی۔ عقل کا مقابلہ عقل سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بے وقوفانہ حرکتیں کر کے نہیں۔ نورتن بانو کو بھی لتاڑیں اور نجیب النساء کے بھی بخیے ادھیڑیں مگر ذہانت سے۔ ہر خط دوسرے خط سے مختلف ہونا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سب اپنے اپنے خط خود لکھیں۔ جو جس کے دل میں آئے وہی لکھے اور خیال رہے سارا کام بہت چالاکی سے کرنا ہے۔ باقی رسالے پر بھی تبصرہ کریں۔ سرورق، شاعری، پکوان اور انٹرویوز کے بارے میں رائے لکھیں تاکہ انہیں شک نہ ہو۔''

وہ کمپیوٹر کے کے سامنے سے اٹھ آئی تھی اور اب ان لوگوں کے پاس ہی کارپٹ پر رکھے فلور کشن پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر ان لوگوں کے سامنے مثال پیش کرنے کے لیے افشاں ہی نے ایک خط لکھا تھا جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''ستمبر کا شمارہ حسب سابق اے ون تھا۔ سرورق پر براجمان ماڈل البتہ ہمیں کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ اس کے سوٹ کا پرنٹ پردوں کا تھان لگ رہا تھا۔ آج کل یاسر وحید کے ڈیزائنز بہت ان ہیں۔ اگلے ماہ کے ٹائٹل پر ماڈل کا ڈریس اسی ڈیزائن کردہ آئس کریم کلرز والا ہونا چاہیے۔

فہرست پر نظریں دوڑائیں تو اپنی تمام ہی پسندیدہ مصنفات کے نام دیکھ دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ خاص طور پر شہزادی فلک ناز کا ناولٹ تو رسالے کی جان تھا۔ شہزادی صاحبہ کا منجھا ہوا انداز اور جملوں کی روانی اور برجستگی دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ وہ نئی رائٹر ہیں۔ شہزادی آپی! آپ نورتن بانو ٹائپ لوگوں کی ہرگز پرواہ نہ کریں۔ میں اور مجھ جیسے لاکھوں قارئین آپ کی تحریروں کے دیوانے ہیں۔ دسترخوان میں تمام ڈشز اچھی تھیں۔ چیکو کی کھیر تو خاص طور پر مجھے بہت پسند آئی۔ باقی تمام افسانے اور ناول زبردست تھے۔ سوائے نجیب النساء کے ناول ''ساحل کی ہوا'' کے۔ لگتا ہے وہ اپنے ناول کی تھیم کو نباہ نہیں پا رہیں اور حوریہ کے پاس کیا بہت فالتو خون آ گیا جو بات بات پر لال ٹماٹر اور سرخ انار ہو جاتی ہے۔ اس سے کہیں کہ جا کر فاطمید میں تھوڑا سا خون عطیہ دے آئے۔''

افشاں کا مشورہ ان سب کے ہی دل کو لگا تھا اور پھر سب ہی نے اپنے اپنے انداز میں خطوط لکھے تھے۔ افشاں صاحبہ پر آج بہن کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ اس لیے اس نے مزید کئی اچھے مشورے دیئے جنہیں سب نے بے حد سراہا تھا۔ پانچ خطوط اس کی دوستوں کے، ایک ناجیہ اور ایک افشاں کا اس کے علاوہ چار خطوط یمینہ کی بہنوں کے، تین خطوط افرحہ کی امی اور بھابیوں کے، چھ خطوط عروس کی ماما اور بہنوں کے، ایک خط سعدیہ کی ممی کا اور چار خطوط فاطمہ کی کزنز کے۔ یعنی یہ کہ کل ملا کر پچیس خطوط تو یہ ہو گئے تھے۔ مزید اس نے ایک ایک خط پھوپھی صاحب، مما، بھابھی اور اسماء سے بھی لکھوا لیا تھا۔

افشاں صاحبہ کا مشورہ یہ تھا تمام خطوط کراچی سے نہ پوسٹ کیے جائیں۔ ڈائجسٹ والے یقیناً تمام شہروں کی نمائندگی کا خیال رکھتے ہوں گے چنانچہ اس کی دوستوں کے اصلی ناموں والے خطوط کراچی سے پوسٹ کیے گئے۔ باقی خطوط میں سے آدھے اس نے بھائی میاں کے پاس رحیم یار خان پوسٹ کر دیئے تھے۔ بھابھی کو وہ فون پر سب کچھ بتا چکی تھی۔ انہوں نے وہ خطوط رحیم یار خان کے مختلف فرضی پتے ڈال کر ماہنامہ سندیسہ کے نام پوسٹ کر دیئے تھے۔ بقیہ خطوط اس نے فاروق کی بے پناہ منتیں کر کے اسے حیدر آباد اور ٹھٹھہ سے پوسٹ کرنے کو کہے تھے۔ حالانکہ وہ ٹھٹھہ اپنے ذاتی کام سے جا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے تین سو روپے رشوت لی تھی۔ افشاں کا خیال تھا کہ گئے سے گئے ان میں سے دو تین خط تو شائع ہو ہی جائیں گے اور اس کے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔

افشاں کا مشورہ واقعی کارگر ثابت ہوا تھا۔ ان لوگوں کے بھیجے گئے خطوط میں سے چار خط شائع ہو گئے تھے مگر کافی زیادہ سنسر کر کے۔ خصوصاً نجیب النساء کی شان میں کہے گئے ان لوگوں کے تبصروں کو تو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا تھا۔

اب تو وہ بڑے آرام سے مشہور مشہور رائٹرز کی تھیمز بھی چرانے لگی تھی۔ انگلش لٹریچر کی شامت تو آئی ہی تھی مگر اردو ادب پر بھی اس نے کافی سے زیادہ نظرِ کرم کی تھی۔ بانو قدسیہ، امرتا پریتم، قرۃ العین حیدر وہ ان سب کو اتنے دھڑلے سے کاپی کرتی تھی کہ اچھے اچھے اس کی ذہانت کے قائل ہو گئے تھے۔ کبھی کسی کی کہانی کا مرکزی خیال چرا لیتی، کبھی صرف دو چار سچویشنز اور پھر اسے اپنے انداز میں بڑی خوبصورتی سے انجام تک پہنچایا کرتی تھی۔ وہ اس فن میں اتنی ماہر ہو چکی تھی کہ کوئی اس پر نقالی کا الزام بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

مگر اس سب کے باوجود پڑھنے والے ابھی تک اسے ایک رائٹر کی حیثیت سے تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوئے تھے یا تو خطوط میں سرے سے اس کا ذکر ہی نہ ہوتا اور اگر ہوتا بھی تو برائیوں میں ڈوبا ہوا۔ فاروق وغیرہ کا خیال تھا کہ جس روز وہ یہاں وہاں سے کہانیاں چرانا چھوڑ کر خود لکھنا

شروع کر دے گی اسی روز لوگ بھی اسے تسلیم کر لیں گے۔

پھر اس روز ایسا واقعہ ہوا کہ وہ کہانی چرائے بغیر اپنے بل بوتے پر لکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ ہوا دراصل یہ تھا کہ اس روز پھوپھی صاحب نے رات کے کھانے میں آلو پھلی پکائی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر اس کی نظر سامنے رکھے آلو پھلی کے ڈونگے پر پڑی تو اس کا منہ بن گیا تھا۔

''پھوپھی صاحب! آپ ہم لوگوں سے کون سے جنم کا بدلہ لے رہی ہیں۔''

وہ بڑے دکھی دل سے پوچھ رہی تھی۔ پھوپھی صاحب نے اسے گھور کر دیکھا تھا، کھانے پینے کے معاملے میں نخرے انہیں بالکل پسند نہ تھے۔

''اللہ سے توبہ کرو، پیٹ بھر کر کھانے کو مل رہا ہے تو نخرے سوجھ رہے ہیں، ان سے پوچھو جو بے چارے کئی کئی وقت کے بھوکے ہوں گے۔ خدا کی نعمت کو دیکھ کر منہ بنا رہی ہو۔ اللہ کا شکر ادا کرو جو اچھا کھلا رہا ہے، پہنا رہا ہے۔''

وہ ہمیشہ کی طرح اس بات پر ناراض ہوئی تھیں۔ افشاں تو کھانے پینے کی زیادہ شوقین تھی ہی نہیں اور ناجیہ بیگم آج کل ڈائٹنگ کر رہی تھیں اس لیے ان دونوں ہی کو اس ڈش پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

''خدا کی نعمت کو کون برا کہہ رہا ہے۔ خدا کی نعمت کڑوے تیل میں پکی آلو پھلی تو نہیں ہے۔ آلو ایک الگ نعمت ہے، پھلی ایک الگ نعمت ہے اور پیاز اور سرسوں کا تیل بھی الگ الگ نعمتیں ہیں، مجھے اعتراض تو ان کے باہم اشتراک پر ہے۔ ان سب نعمتوں کو الگ الگ بھی تو پکایا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ آلوؤں کے پراٹھے بنائے جا سکتے ہیں، قیمہ یا مرغی بھر کر کٹلس بنائے جا سکتے ہیں، بھرتہ بن سکتا ہے، چاول ڈال کر طاہری بنائی جا سکتی ہے اور پھلیوں کو پاستا میں ڈالا جا سکتا ہے، اسپیگیٹیز میں ڈال سکتے ہیں، پیزا میں استعمال کر سکتے ہیں، سبزیوں کے سوپ میں ڈال سکتے ہیں اور سرسوں کے تیل کو نہانے سے تین گھنٹہ پہلے بالوں میں لگا کر بالوں کو صحت مند اور چمک دار بنایا جا سکتا ہے اور اگر کھانے پینے کی چیزوں میں اس کا استعمال اتنا ہی ضروری ہے تو اس میں پکوڑے تلے جا سکتے ہیں، بڑے تلے جا سکتے ہیں یعنی یہ کہ میں نے کسی نعمت کو برا نہیں کہا۔ اللہ تعالیٰ نے تو سبزیاں پیدا کی ہیں اب کس کو کس کے ساتھ ملا کر پکانا ہے یہ ہمارا اپنا ڈیسیشن ہو گا اور آلو پھلی سے زیادہ بکواس اس دنیا میں سبزیوں کا کوئی Combination نہیں ہو سکتا۔'' وہ مقررانہ انداز میں بڑے جوش و خروش سے بول کر خاموش ہوئی تو افشاں اور ناجیہ سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش کرتی نظر آئیں جبکہ پھوپھی صاحب خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔

''تمہیں کھانا ہے تو کھاؤ، میرا دماغ مت خراب کرو۔ ایک تو اتنی بڑی بڑی لڑکیوں کے لیے پکا کر رکھتی ہوں اس پر بھی مزاج نہیں ملتے۔''

وہ نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے دوٹوک انداز میں بولیں تو اسے پھوپھی صاحب کی ظالم و جابر شخصیت ہمیشہ سے زیادہ بری لگی۔

''دکھا دیا نا آپ نے فرق پھوپھی صاحب! اپنی بیٹی کو تو شام کی چائے کے ساتھ تلوں والی میٹھی روٹی بنا کر دی تھی اور ہم ماں باپ سے دور مجبور بہنیں یہاں آپ کے ظلم و ستم سہہ رہی ہیں۔ چلو افشاں! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے، مما ٹھیک کہتی ہیں پھوپھی صاحب سو فیصد دادی پر گئی ہیں۔ چلو میری بہن! یہ ظالم دنیا والے ہمیں جینے نہیں دیں گے۔''

پھوپھی صاحب تہجد کی نماز کے لیے اٹھیں تو وہ بیڈ پر اوندھی لیٹی دھڑا دھڑ صفحے سیاہ کر رہی تھی۔ اپنا دردِ دل صفحہ قرطاس پر منتقل کرتی وہ گردوپیش سے بے نیاز تھی۔ انہیں تو خیر اس پر کیا رحم آنا تھا، الٹا رات بھر جاگنے پر انہوں نے ڈھیر ساری صلواتیں سنائی تھیں۔

خطوط کے معاملے میں تو ابھی تک اس کی دوست بڑی وفاداری کے ساتھ نباہ رہی تھیں۔ اس کی اس بہترین ''تخلیق'' پر بھی اس کی فرینڈز تعریفی خطوط روانہ کر چکی تھیں مگر کہانی چھپنے کے اگلے ماہ جب ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا تو اس کی دوستوں کے خطوط میں سے تو ایک خط شامل تھا ہی مگر ایک خط اور بھی تھا، جس میں اس کی تحریر کی تعریف کی گئی تھی۔ یہ اس کی پہلی تعریف تھی جو کسی نے خود ہی کر دی تھی اس لیے وہ بے خود ہو رہی تھی۔ خط میں اس کی کہانی کے علاوہ کسی اور کہانی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا تھا۔

''شہزادی فلک ناز کی تحریر کو اگر اس سال کی بہترین تحریر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، خصوصاً ان کی کہانی کا آخری پیراگراف تو اچھے اچھوں کو رلوا گیا۔ خاص طور پر اختتامی شعر

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ان کی کہانی کا مرکزی خیال یعنی آلو پھلی بے حد جاندار تھا۔ کس طرح آلو پھلیاں ایک انسان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں انہوں نے ان تمام پہلوؤں کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا۔ پڑھنے والے شاید اسے ایک مزاحیہ تحریر سمجھیں مگر ہم تو اسے ایک دکھی دل کی فریاد سمجھیں گے۔ آپ سے ہماری مؤدبانہ گزارش ہے کہ جس طرح آپ کے ماہنامہ کا خاص نمبر، سالگرہ نمبر، بہار نمبر اور سال نو نمبر نکلتا ہے بالکل اسی طرح ایک ''سبزی نمبر'' بھی نکالیں اور اس نمبر میں تمام چوٹی کی مصنفات کو سبزیوں سے متعلق اپنے اپنے تجربات بیان کرنے کی دعوت دیں اور شہزادی فلک ناز اس میں بطورِ خاص ایک مکمل ناول بینگنوں کے بارے میں لکھیں۔ کب ایک انسان کا دل اس دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے، اچھا بھلا آدمی خودکشی کے مختلف آسان طریقوں کے بارے میں کیوں غور کرنے لگتا ہے، ان تمام باتوں کا وہ اس ناول میں احاطہ کریں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گی۔''

خط کا مضمون گو تعریفی تھا مگر انداز بڑا عجیب و غریب سا تھا۔ ان لوگوں نے بھیجنے والے کا نام دیکھا تو وہاں متاثرین بینگن مہران انجینئرنگ یونیورسٹی جامشورو لکھا ہوا تھا۔ رسالے کی ایڈیٹر نے اس خط کا بطورِ خاص جواب دیا تھا۔

''متاثرینِ بینگن ہم ''سبزی نمبر'' نکالنے کے لیے تیار ہیں اگر آپ وعدہ کریں کہ اس میں اپنے خط ہی کی طرح ایک شوخ و شریر سی تحریر ہمیں بھیجیں گے۔ آپ کا انداز تحریر شوخ، برجستہ اور بے حد سلیس و رواں ہے۔ آپ میں بلاشبہ افسانہ نگاری کی قدرتی صلاحیت موجود ہے۔''

خط کا جواب پڑھ کر اس کی دوست تو نارمل تھیں مگر خود فلک کو سخت غصہ آ رہا تھا۔

''مجھے تو آج تک کبھی باقاعدہ لکھنے کی دعوت نہیں دی، میں خود ہی بے شرموں کی طرح اپنی کہانیاں بھیجتی رہتی ہوں اور یہ متاثرین بینگن میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں۔'' وہ بری طرح جیلس ہو رہی تھی۔

شام میں فاروق کا فون آیا تو وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اس بھری دنیا میں کوئی بھی ہمارا نہ ہوا
غیر تو غیر سہی اپنوں کا بھی سہارا نہ ہوا

وہ دکھ بھرے انداز میں گاتی افشاں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگی تھی جبکہ پھوپھی صاحب اس اداکاری سے متاثر ہونے کے موڈ میں قطعی نہیں تھیں۔ ناجیہ کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا تھا۔ پھوپھی صاحب نے سلاد کا ڈونگا ناجیہ اور افشاں کی طرف کھسکا کر اسے تقریباً نولفٹ کروادی تھی۔

غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم
اے جانِ وفا یہ ظلم نہ کر

وہ غمزدہ انداز میں گاتی ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئی تھی۔ کسی نے بھی اسے روکنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ کھانا نہ کھا کر اکڑ تو دکھادی تھی مگر اب پیٹ میں چوہوں کی عالمی ریس اسے بے حال کر رہی تھی۔ سب کے سونے کے بعد وہ اٹھ کر چپکے سے کچن میں آگئی اور فریج کھول کر اندر جھانکا۔ پہلے ارادہ تھا کہ انڈا فرائی کر لے گی مگر انڈوں کا خالی خانہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ پھر سوچا کہ ڈبل روٹی پر پنیر لگا کر سینڈوچ بنا لیتی ہوں۔ دیکھا تو ڈبل روٹی نہیں تھی۔ ''گھر کھیر تو باہر کھیر'' کا مطلب اسے پہلی مرتبہ بالکل صحیح سے سمجھ آگیا تھا۔

کل جب پھوپھی صاحب نے چکن بریانی بنائی تھی تو برابر والی آنٹی گرما گرم پیزا کی ٹرے اٹھائے چلی آئی تھیں۔ ''پیزا بیک کیا تھا میں نے سوچا تھوڑا سا بچیوں کے لیے لے جاؤں۔''

وہ بڑے پیار سے گویا ہوئی تھیں اور آج جب بچی بھوک سے نڈھال بیٹھی تھی تو وہاں سے کچھ نہ آیا تھا۔ اسے فریج سے انڈوں اور ڈبل روٹی کے غائب ہونے میں سو فیصد پھوپھی صاحب کی چال نظر آرہی تھی۔ فریج میں سوائے پانی کی بوتلوں، چیز، مکھن اور آلو پھلیوں کے اور کچھ نہ رکھا تھا۔

''انہیں بھی بڑے اہتمام سے فریج میں رکھا ہے، ارے ایسی چیزیں تو باہر بھی چھوڑ دی جائیں تب بھی خراب نہیں ہوتیں۔''

وہ آلو پھلیوں کو سوکنوں والی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ کتنے اہتمام سے آج اس نے لکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ قراۃ العین حیدر کے ''کار جہاں دراز ہے'' میں سے اس نے بعض چیزیں چرا کر ایک کہانی لکھنے کا پلان بنایا تھا۔ خالی پیٹ کیا خاک لکھا جاتا۔ چیونگم اور کیڈ بریز سے تو پیٹ بھر نہیں سکتا تھا۔ پھر آم کے اچار کی پھانکیں کھاتے اور پیپسی کے کین میں سے ایک ایک گھونٹ پیپسی پیتے ہوئے اسے بے اختیار شفیق الرحمان یاد آگئے۔

''سر! آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا، دنیا کا سارا اچھا ادب غم کی پیداوار ہے۔''

اس نے شفیق الرحمان کی روح کو مخاطب کیا تھا، پھر اپنے محسن کے ہی انداز میں وہ ''یا غم تیرا آسرا'' کہتی ہوئی کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں آکر قلم اور کاغذ سنبھال کر وہ شروع ہو چکی تھی۔ افشاں خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی اور اس کا غم اس سے دنیائے ادب کی شاہکار تحریر تخلیق کروا رہا تھا۔ اپنی تحریر کا آغاز ہی اس نے شعر سے کیا تھا۔

اس کے دل پر بھی کڑی، سبزیاں کھانے میں گزری ہوگی
نام جس نے بھی آلو پھلیوں کا مویشیوں کا چارہ رکھا ہوگا

''دیکھ لو مائی ڈیئر سس! مجھے اور میرے تینوں دوستوں کو تمہارے ڈائجسٹ میں لکھنے کی آفر مل گئی۔''

اس اپنی عقل پر افسوس ہوا کہ مہران انجینئرنگ یونیورسٹی پڑھ کر بھی اس کا دھیان فاروق اور خرم وغیرہ کی طرف نہیں گیا تھا۔

''صرف ایک خط پر میری یہ آؤ بھگت اور پذیرائی، اگر جو میں کہانیاں لکھنی شروع کر دوں تو تم جیسے نقالوں کی تو کھڑے کھڑے چھٹی ہو جائے گی۔''

وہ اتراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ناجیہ اور افشاں سمیت اس کی تمام فرینڈز بھی فاروق کی اس حرکت کو انجوائے کر رہی تھیں۔ سب کا خیال تھا کہ اس کا بھائی ایک زندہ دل نوجوان ہے۔

ان لوگوں کے ماسٹرز مکمل ہونے میں صرف ایک سمسٹر کی دوری رہ گئی تھی۔ جب اچانک ہی ناجیہ کی شادی کا ایشو اٹھا۔ منگنی تو اس کی میٹرک کرتے ہی ان لوگوں کے مشترکہ کزن ظہیر کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ظہیر بھی بھائی میاں کی طرح آرمی میں ڈاکٹر تھا اور آج کل اس کی پوسٹنگ ان ہی کے ساتھ رحیم یار خان میں تھی۔ پھوپھی صاحب دورانِ تعلیم شادی کے حق میں نہیں تھیں مگر اس کی ساس کو اچانک ہی یہ وہم ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اب وہ اس دنیا میں کچھ ہی عرصے کی مہمان ہیں۔ پھوپھی صاحب کے برخلاف ناجیہ بڑی مطمئن تھی۔

''یار تمہارا ماسٹرز نامکمل رہ جائے گا۔ پتا نہیں بعد میں وہ لوگ تمہیں پڑھنے دیں کہ نہ پڑھنے دیں۔'' اس نے ہمدردی سے کہا تھا۔

''تو کیا ہوا، نہیں پڑھنے دیں گے تو نہ پڑھنے دیں، آنرز بھی کوئی معمولی تعلیم نہیں اور انگلش لٹریچر میں ایم اے کر کے بھی کون سا تیر مار لوں گی۔ زیادہ سے زیادہ کسی کالج میں لیکچرر لگ جاؤں گی بس۔ جب یہ طے ہے کہ لڑکی کے لیے سب سے امپورٹنٹ چیز شادی ہے تو بس پھر یہی ٹھیک ہے۔'' وہ بڑے آرام سے بول رہی تھی۔

''شوہروں کو بیویوں کی ڈگریز میں کچھ اتنا خاص انٹرسٹ نہیں ہوتا۔ کبھی تم نے کسی شوہر کو اس بات پر خوش ہوتے دیکھا ہے کہ میری بیوی رات کو سونے سے پہلے ورڈزورتھ کی شاعری سناتی ہے اور اس کے منہ سے وہ پوئم سن کر میں فطرت کے حسن میں کھو جاتا ہوں، آن واحد میں میں خود کو اسکاٹ لینڈ کے کسی پرفضا مقام پر کھڑے ہو کر نیچر کی خوبصورتی میں کھویا پاتا ہوں یا پھر یہ کہ میری بیوی کو شیکسپیئر کے اکثر ڈراموں کے بہت سے ایکٹ منہ زبانی یاد ہیں، وہ کیٹس کی بہت بڑی فین ہے اور ہم دونوں شیکسپیئر کے ڈراموں اور کیٹس کی شاعری کا اصل لطف اٹھانے عنقریب اٹلی جا رہے ہیں۔ اس کے برخلاف تمہیں ایسے شوہروں کی کثیر تعداد نظر آئے گی جو دوستوں میں فخر سے اپنی بیوی کی کلنگ کی تعریف کرتے ہیں، اس کے سگھڑاپے کے گن گاتے ہیں۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بول رہی تھی۔

''ذہین اور پڑھی لکھی بیویاں اکثر بڑے بڑے قابل مردوں کو بھی اچھی نہیں لگتیں۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

ان دنوں وہ لوگ شادی کی شاپنگ کرنے میں مصروف تھیں۔ اس روز وہ پھوپھی صاحب اور ناجیہ جیولر کے پاس گئے ہوئے تھے۔ ناجیہ کی دیکھا دیکھی اس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے گن سے ناک چھدوالی تھی مگر گھر آ کر جب پھوپھی صاحب نے اسے ناک میں نیم کا تنکا یا چاندی کی بالی ڈالنے کو کہا تو وہ بہت بدمزہ ہوئی۔

''کنواری لڑکیاں لونگ نہیں پہنتیں۔'' انہوں نے اس کے احتجاج کو یکسر رد کر دیا تھا۔

''یہ کیا بات ہوئی اب بندہ اپنے معصوم معصوم شوق پورے کرنے کے لیے بھی شادی کا انتظار کرے۔ ساڑھی نہیں پہن سکتے، ناک میں لونگ نہیں ڈال سکتے، یہ بھی کوئی زندگی ہے، بندہ اپنی خوشی سے کوئی کام بھی نہ کر پائے۔'' اسے ان فضول رسم و رواج پر سخت طیش آیا تھا مگر پھوپھی صاحب کو کون سمجھا سکتا تھا۔

''اپنی بیٹی کی تو اتنے پہلے سے منگنی بھی کر دی۔ بھتیجیوں کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں۔ پتا نہیں کون لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پھوپھی بھتیجی ایک ذات۔''

اس نے دہائی دی تھی مگر وہ کب ان باتوں سے متاثر ہوتی تھیں۔ سکون سے کھڑی سالن میں ہری مرچیں اور ہرا دھنیا ڈالتی رہی تھیں۔

ناجیہ بیگم نے یونیورسٹی جانا چھوڑ کر صدر، بہادر آباد، کلفٹن اور طارق روڈ کے چکر کاٹنے شروع کر دیے تھے۔ اس دن بھی وہ ناجیہ کے بغیر اکیلی ہی یونیورسٹی سے گھر واپس آئی تو کمپاؤنڈ میں امیر حمزہ سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے خندہ پیشانی سے سلام کیا تو فلک جواب دیتے ہوئے بولی۔

''خیریت، آج یونیورسٹی نہیں آئے۔''

''کچھ انفلوئنزا کے اثرات محسوس ہو رہے تھے اس لیے سوچا ریسٹ کر لوں۔'' وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔

''وہ فلک! مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی۔'' وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔ اس نے حیرت سے حمزہ کو دیکھا، امیر حمزہ اور کوئی بات کہنے میں ہچکچائے، اسے تعجب ہوا تھا۔

''انفیکٹ میں بہت دنوں سے تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر تم اکیلے میں ملتی ہی نہیں تھیں۔'' وہ کچھ کنفیوژ سا لگ رہا تھا۔ اس کے اسٹائل پر حیران ہوتی فلک کے ذہن میں عجیب عجیب سی باتیں آنے لگیں۔ خاص طور افرحہ اور یمینہ نے ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی امیر حمزہ کے بارے میں جو کمنٹس دیے تھے وہ اسے ایک دم یاد آ گئے تھے۔

''وہ اصل میں بات یہ ہے کہ۔'' وہ کہتے کہتے پھر چپ ہو گیا تھا۔

فلک سوالیہ شکل بنائے بنائے تھک چکی تھی اس لیے تنگ آ کر جھلائے ہوئے انداز میں بولی۔

''حمزہ! جو بھی بات ہے جلدی بولو، مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے اور میں۔''

''وہ اصل میں بات یہ ہے کہ.....''

''مزید برداشت نہیں کر سکتی۔'' سچی بات تو یہ تھی کہ اس کے دل میں بری طرح کھد بد مچی ہوئی تھی۔ آخر ایسی کیا بات ہے جو امیر حمزہ جیسا آؤٹ اسپوکن شخص ہچکچا رہا ہے۔

''تمہیں ناک میں لونگ پہننے کا بہت شوق ہے، اس کے علاوہ شاید ساڑھی پہننے کا بھی۔ ہے نا؟''

وہ سوالیہ انداز میں مخاطب ہوا تھا۔ فلک ٹھٹھک کر ایک دم رک گئی تھی۔ کل ہی تو وہ لفٹ سے نکل کر اپنے فلیٹ کے اندر گھسنے تک اسی مسئلے پر

پھوپھی صاحب سے تفصیلی بحث کر رہی تھی اور اس گفتگو یا اس کا کچھ حصہ شاید اس نے بھی سن لیا تھا۔

''اگر میں کہوں کہ تمہارا یہ شوق پورا ہو سکتا ہے، اگر تم چاہو تو۔'' وہ بڑی ہمت کر کے بولا تھا۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' وہ زبردستی خود کو انجان ظاہر کرتے ہوئے اکڑ کر بولی تھی۔

''یار! وہ میرے بھیا ہیں نا یقین کرو بہت اچھے ہیں۔ بس صرف دو مسئلے ہیں ایک تو یہ کہ ان کی ہائٹ پانچ فٹ دس انچ ہے لیکن یار دو انچ کی چھوٹائی بڑائی سے کیا فرق پڑتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ انکم ٹیکس میں جاب کرتے ہیں لیکن بائی گاڈ! میرے بھیا بہت ایماندار ہیں انہوں نے آج تک رشوت کا ایک بھی پیسہ نہیں لیا۔ سی ایس ایس کے اگزیم میں ان کی تیسری پوزیشن آئی تھی۔ بالکل تمہارے ہیرو کی طرح جینئس ہیں اور شکل صورت میں مجھ سے بھی زیادہ گڈ لکنگ۔''

وہ بڑی عاجزی اور انکساری سے بولا تھا اور فلک جواب میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ اپنی کچھ دیر پہلے کی سوچ پر اسے بری طرح ہنسی آ رہی تھی۔ حمزہ کے بات کرنے کا اسٹائل بھی بالکل ایسا تھا جیسے وہ ابھی اس سے اظہارِ عشق کرنے والا ہے۔

''کیا ہوا؟ تم ہنس کیوں رہی ہو۔'' وہ جو یہ سمجھ رہا تھا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اس کے ہنسنے پر سخت متعجب تھا۔ ''کچھ نہیں، بس ویسے ہی۔'' وہ اپنی ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں تم اپنے بھیا کا کیا ذکر کر رہے تھے۔''

اچانک اسے دھیان آیا کہ شاید امیر حمزہ نے اپنے بھیا کے متعلق کچھ کہا تھا اور وہ جو اسے ہنستا دیکھ کر قدرے پرسکون ہو چکا تھا بڑے اطمینان سے اپنی بات تفصیل سے بیان کرنے لگا۔

(اس کے ''چنگیزی'' اسٹائل سے تو اچھے اچھے پناہ مانگا کرتے تھے امیر حمزہ تو تھا کس کھیت کی مولی۔ اس لیے اس کا ڈرنا قانون فطرت کے عین مطابق تھا۔)

''یار! ہم لوگ اپنے بھیا کا رشتہ تمہارے لیے لانا چاہتے ہیں بس تمہاری رضامندی درکار ہے۔''

وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی وہ دوپٹے کا کونا منہ میں دبائے ''مجھے نہیں پتا'' کہتی ہوئی شرما کر وہاں سے بھاگ جائے گی۔ اپنے بڑوں سے سنا تھا کہ بولڈ سے بولڈ لڑکی بھی ایسے موقعوں پر شرما جاتی ہے مگر یہاں مدمقابل اسے حیران کرنے کے درپے تھا۔

''ایسے بغیر دیکھے میں کیسے رضامندی دے دوں۔'' وہ بغیر حیران ہوئے سکون سے بولی تھی۔

''تم نے میرے بھیا کو دیکھا ہوا نہیں ہے، اکثر تو مجھ سے ملنے آتے رہتے ہیں۔''

وہ صدمے سے چور لہجے میں بولا تھا۔ بیچارے بھیا شروع شروع میں چھوٹے بھائی کی محبت میں اور پھر بعد میں کسی اور ہی ''چکر'' میں ہفتے میں پانچ پانچ چکر لگایا کرتے تھے اور وہ جس کے لیے موصوف اتنے کشٹ اٹھا رہے تھے، سرے سے انہیں جاننے اور پہچاننے سے ہی انکاری تھی۔ ''اچھا میں ابھی اندر جا کر تمہیں ان کی تصویر دکھا دوں گا لیکن تم میری بات کا یقین کرو وہ واقعی بہت ہینڈسم ہیں۔ بس صرف تمہارے ہیرو کی طرح ''چھ فٹے'' نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں بلقیس ایدھی نے پالا ہے یعنی خیر سے ان کے امی ابا اور چار عدد بہن بھائی بھی موجود ہیں۔ تم اپنی ہیروئن کی طرح لکی

نہیں ہو کہ چھڑا چھانٹ ہیرو مل جائے جس کا کوئی والی وارث بھی نہ ہو۔ اگر تم نے اس رشتے کے حق میں فیصلہ دے دیا تو تمہیں ایک عدد ساس کے ساتھ ساتھ تین عدد نندوں سے بھی واسطہ پڑے گا۔ علاوہ ازیں بھیا کے پاس نہ تو لیموزین ہے نہ مرسڈیز اور نہ ہی نئے ماڈل کی کوئی اسپورٹس کار بلکہ بے چارے ایک عدد ٹویوٹا رکھتے ہیں وہ بھی انیس سو اسی کے ماڈل کی اور سیکنڈ ہینڈ۔ تم خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلو۔''

وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے سمجھ چکا تھا کہ اسے اس بات پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں اس لیے اب اپنے مخصوص انداز میں بڑی سنجیدگی سے بولا تھا۔ فلک اس کی باتیں بڑی بے توجہی سے سنتی اپنی ہی کسی سوچ میں الجھی ہوئی تھی۔

''کیا شاندار آئیڈیا ہے، ہیروئن اور اس کی سہیلیوں کی اپنی کلاس کے سب سے ذہین گروپ سے ہر وقت ٹھنی رہتی ہے۔ دونوں گروپس ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ ہیروئن کو مخالف گروپ کا ایک ممبر ضرورت سے زیادہ ہی تنگ کرتا ہے، ہر وقت اسے چھیڑتا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے، پڑھنے والے سمجھنے لگتے ہیں کہ اسی تکرار میں کہیں نہ کہیں پیار بھی چھپا ہوا ہے مگر یہیں پر وہ رائٹر کی چالاکی کے آگے ہار جاتے ہیں، ہیرو تو اسے اپنی بھابھی کے طور پر پسند کر رہا ہوتا ہے کیونکہ اس کے بھیا چپکے چپکے ہیروئن کی محبت میں عرصہ دراز میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر لاسٹ سین میں جب پڑھنے والے سمجھتے ہیں کہ بس اب ہیرو ہیروئن سے اظہار محبت کردے گا۔ اس وقت رائٹر بڑے ڈرامائی انداز میں پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کردیتی ہے اور پڑھنے والے اچانک خود کو انتہا درجے کا احمق اور الو محسوس کرتے ہیں۔ بھئی واہ کیا شاندار اسٹوری ہے۔ سسپنس، ڈرامہ، تھرل سارے لوازمات موجود ہیں۔ واہ واہ کیا شاندار تھیم ہے۔ ہیرو کا بھائی ہیروئن پر عاشق۔ زبردست۔''

آخری جملہ وہ با آواز بلند بولی تھی اور امیر حمزہ حیران آئینہ وار ہیں ہم کی عملی تفسیر بنا کھڑا اسے تک رہا تھا۔ اسے خود ہی اپنی بے خودی اور اس کے گھورنے کا احساس ہوا تو فوراً بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے، بھیج دو اپنے ممی پپا کو، مجھے ذرا جلدی ہے پھر بعد میں تفصیل سے بات کریں گے۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اچھا ادب ایسے ہی تخلیق نہیں ہو جاتا، رائٹر کو ادب کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنانا پڑتا ہے تب کہیں جا کر کوئی شاہکار تخلیق ہوتا ہے۔ اسے ابھی فوراً جا کر اس نئے آئیڈیے پر اپنی تازہ ترین کہانی شروع کرنی تھی اور پیچھے کھڑا امیر حمزہ تیز تیز لفٹ کی طرف قدم بڑھاتی اس لڑکی کو کچھ حیرت اور کچھ پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا مختلف ہونا ہی تو اسے اور اس کے بھیا دونوں کو پسند آیا تھا۔

❁.....❁

میں اور چنداماما

''این۔ای۔ڈی'' میں ایڈمیشن کے تمام مراحل سے گزرنے اور داخلے سے متعلق تمام ضروری کارروائیوں کو پورا کرتے ہی میں نے اسلام آباد کا قصد کیا تھا۔اس یاترا کی وجہ تسمیہ چنداماما تھے۔اپنے این ای ڈی میں ایڈمیشن کی خوشخبری سنانے کے لیے میں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے خوشی کا اظہار بھی کیا، مجھے مبارک باد بھی دی اور پوچھا بھی کہ میں ان سے کیا گفٹ لوں گی مگر اس خوشی میں مجھے وہ گرم جوشی نظر نہ آئی جوان کی گفتگو کا خاصا ہوا کرتی تھی۔میرے خیریت دریافت کرنے پر انہوں نے جس طرح ٹھنڈی آہ بھر کر کہا تھا۔

''ٹھیک ہیں، جی رہے ہیں۔'' وہ میرا ماتھا ٹھنکانے کے لیے کافی تھی۔ مجھے یقین ہے یہ جواب دیتے وقت انہوں نے گردن بھی ایک طرف گرائی ہوئی ہوگی اور چہرے پر بھی بڑے افسوس ناک تاثرات ہوں گے۔ان سے تو میں نے ایسا کوئی ذکر نہ کیا مگر ارادہ میں اسی وقت کر چکی تھی۔جیسے ہی ایڈمیشن کا تمام کام مکمل ہوا مجھے فوراً چنداماما کے پاس اسلام آباد جانا ہے۔

چنداماما ہم ڈھیر سارے کزنز کے اکلوتے ماموں ہیں۔ چھ بہنوں کے اکلوتے بھائی جو بڑی دعاؤں اور منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئے۔ کبھی کبھی مجھے بے چارے چنداماما پر بڑا ترس بھی آتا ہے۔ چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونا بھی کسی عذاب سے کم نہیں۔نانا جان اور نانی کو تو خیر بیٹے کا شوق تھا ہی مگر ان کی چھ کی چھ بیٹیاں بھی بھائی کے لیے بری طرح مچلا کرتی تھیں۔آخر کار قدرت نانی پر مہربان ہوگئی اور حسن منیر یعنی چنداماما اس دنیائے رنگ و بو میں تشریف لے آئے۔نانا جان بیٹے کی پیدائش کے دو سال بعد ہی چل بسے تھے مگر نانی اور تمام بہنوں نے انہیں کبھی بھی کوئی کمی محسوس نہ ہونے دی۔سب بہنوں کو بھائی سے کھیلنے اسے نہلانے اور سجانے سنوارنے کا شوق تھا۔بے چارے چنداماما کو دن میں چھ دفعہ نہلایا جاتا اور یوں سب بہنیں اپنا اپنا شوق پورا کرتیں۔ بڑے ہوئے تو مسائل بھی بڑے ہو گئے۔ایک بہن کا دل چاہتا میرا بھائی ڈاکٹر بنے تو دوسری بھائی انجینئر بنانا چاہتی تھی۔ایک سول سروس میں تو دوسری آرمی میں۔ایک پائلٹ تو ایک آرکیٹکٹ۔بے چارے چنداماما کریں تو کیا کریں۔ بڑی مشکلوں سے بہنیں اس بات پر متفق ہوئی تھیں کہ ماما کو سول سروس میں جانا چاہیے مگر یہاں نانی نے نکتہ اعتراض اٹھایا۔نانا جان کی دیرینہ خواہش کا ذکر کیا کہ وہ بیٹے کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔

خیر صاحب اس مسئلے کا حل یوں نکلا کہ ماما نے پہلے ڈی ایم سی سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی اور پھر اس کے بعد سی ایس ایس کا امتحان دیا۔ چنداماما کا سی ایس پی آفیسر بننا جہاں ان کی بہنوں کے لیے خوشی کا باعث تھا وہیں ان کے تمام بھانجے بھانجیوں کے لیے بھی باعث فخر تھا۔آج کل وہ اسلام آباد میں پوسٹڈ تھے۔سب کے دل ان کی دوری پر بے چین رہا کرتے۔ممی اور خالائیں انہیں فون کر کے اپنی بے چینی اور بے تابی کا احوال سناتیں تو وہ بڑی بے نیازی سے کہتے۔

''آپ ہی لوگوں کو شوق تھا کہ ہمارا بھائی سول سروس میں جائے، اب برداشت کریں۔''

ویسے تو چنداماما کی اپنے تمام بھانجے بھانجیوں سے دوستی تھی مگر میری بات الگ تھی۔ میرے اور ان کے درمیان ایک عجیب سی کمیونیکیشن تھی۔ وہ مجھ سے اپنی پریشانی کا اظہار نہ بھی کریں، مجھے نہ بھی بتائیں کہ وہ اداس ہیں مگر میں فوراً سمجھ جاؤں گی اور پھر ان کے پیچھے لگ کر جب تک ان سے ساری بات اگلوا نہ لوں مجھے چین نہیں آئے گا۔ یہی حال چنداماما کا تھا۔ وہ میرے کہے بغیر میری ہر بات سمجھ لیا کرتے تھے۔ ہم دونوں ماموں بھانجی سے زیادہ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ چنداماما مجھ سے پورے آٹھ سال بڑے ہیں۔

آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں اپنے ماموں کو چنداماما کیوں کہتی ہوں، بھئی اس چنداماما کی وجہ وہی مشہور بات ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو چنداماما کی کہانیاں کیوں سناتی ہیں۔ چندا چاچا یا چندا تایا کی کیوں نہیں سناتیں۔ آپ نے بھی یقیناً یہ بات سن رکھی ہوگی کیونکہ یہ بات اب ایک کلیشے بن چکی ہے سو ''چنداماما دور کے بڑے پکائیں بور کے'' سنتے سنتے ہم لوگ انہیں چنداماما کہنے لگے تھے۔

اپنے ایڈمیشن کا کام مکمل ہو جانے تک کا عرصہ میں نے کتنی مشکلوں سے گزارا، یہ میرا دل ہی جانتا ہے ورنہ دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ اڑ کر چندا ماما کے پاس پہنچ جاؤں مگر یہاں مسئلہ کیریر کا اور پروفیشن کا تھا اور پروفیشن بھی کون سا جسے اختیار کرنے کے لیے میں نے دن رات ایک کر کے محنت کی۔ این ای ڈی میں ایڈمیشن میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ انٹر میں خوب دل لگا کر پڑھا، بے انتہا محنت کی۔ پھر رزلٹ آنے سے پہلے ایک انسٹی ٹیوٹ جوائن کر لیا جہاں سے میں داخلہ ٹیسٹ کی تیاری کی۔ خوب لمبی لمبی نمازیں پڑھیں، دعائیں مانگیں۔ مجھے تسبیح ہاتھ میں لیے وظیفہ پڑھتے دیکھ کر رضا کمبخت کھڑکی سے جھانکتا۔

''اوہو اللہ میاں کو رشوت دی جا رہی ہے، اللہ میاں ایسے مطلبی لوگوں کی دعائیں قبول نہیں کرتے۔'' وہ میرا دل جلاتا۔

سب کو پتا تھا مجھے این ای ڈی میں داخلہ لینے کا کس قدر کریز ہے۔ این ای ڈی میرا جنون ہے اگر میرا ایڈمیشن نہ ہوا تو پتا نہیں کیا کر بیٹھوں گی۔ جس روز میرٹ لسٹ لگنا تھی اس سے ایک دن پہلے میری حالت غیر تھی۔ دل کی دھڑکن معمول سے کہیں تیز اور ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے برف۔ مجھ سے پریشانی میں کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا۔ ممی اور ڈیڈی نے کتنا سمجھایا ''تم نے خوب محنت کی اب نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو، اللہ جو کرے گا وہ بہتر ہوگا، کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔'' مگر کوئی نصیحت میرے اضطراب کو کم نہ کر پائی تھی۔ ہر لمحہ بس یہی دھڑکا کہ اگر میرا ایڈمیشن نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ رات میں رضا کو اپنے کمرے میں دیکھ کر مجھے کافی حیرت ہوئی تھی۔

''یہ لو میں تمہارے لیے لایا ہوں۔'' میری حیرت کے جواب میں اس نے ایک خاکی لفافہ میرے ہاتھ میں پکڑایا تھا۔ میں نے کھولا تو اس میں نیند کی گولیوں کی دو شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''میں نے سوچا کل پریشانی میں پتا نہیں تمہیں سلیپنگ پلز مل سکیں یا نہیں مل سکیں چلو میں پہلے ہی تمہارا مسئلہ حل کر دوں۔'' اس کی حرکت پر میں کھول کر رہ گئی تھی۔

''کل کا دن میرے نہیں میرے دشمنوں کے مرنے کا ہوگا، میری خوشیوں سے جلنے والوں کے سینوں پر کل سانپ لوٹیں گے انشاءاللہ۔''

اپنے دل کی کیفیت سے قطع نظر میں نے اسے بڑے اعتماد سے جواب دیا تھا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر ندا اندر داخل ہوئی تو وہ اسے آنکھ مار کر بولا۔

''یار! ندا بریانی اور زردہ کھائے کتنے دن ہو گئے۔''

ندا اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ہنس پڑی تھی جبکہ میرا غم و غصے سے برا حال تھا۔ منحوس الٹی سیدھی بکواس کر رہا ہے۔ کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔

''رضا! تم فوراً سے پیشتر یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔'' مجھ سے اس کی مسکراہٹ برداشت نہ ہو رہی تھی۔ دل تو وہ میرا جلا ہی چکا تھا اس لیے بڑے اطمینان سے باہر چلا گیا تھا۔

''پتا نہیں کتنے شیطان مرے ہوں گے تب یہ پیدا ہوا ہو گا۔ تمام تر ابلیسی صفات ہیں اس میں میرے لیے نیند کی گولیاں لایا ہے۔'' میں نے ہاتھ میں پکڑی وہ دونوں شیشیاں دور پھینک دی تھیں۔

پوری رات پریشانی میں مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ کبھی اس طرف کروٹ بدلتی کبھی اس طرف مجھے تہجد کی نماز پڑھتے دیکھ کر ڈیڈی جو روزانہ ہی تہجد کے وقت بیدار ہو جایا کرتے تھے بے اختیار ہنس پڑے پھر میرے پاس آ کر میرا ماتھا چومتے ہوئے بولے۔

''ایڈمیشن انشاء اللہ میری بیٹی کا ہو جائے گا مگر اس کے بعد بھی نماز نہیں چھوڑنی ہے۔ تہجد کی نماز تو خیر فرائض میں شامل نہیں مگر پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھنی ہے، ٹھیک ہے؟''

میں نے ان کی بات پر کچھ شرمندگی کے عالم میں گردن ہلا دی تھی۔ مجھ سے چھوٹے بہن بھائی نماز پابندی سے پڑھتے تھے مگر میں اکثر نماز میں ڈنڈی مارا کرتی تھی۔ خاص طور پر فجر اور عشاء کی نمازوں میں۔ فجر کی نماز میں سوتے سے اٹھنا مشکل لگتا تھا اور عشاء کی نماز لمبی بہت لگتی تھی۔ میں نے اسی وقت دل میں عہد کیا اب پانچوں نمازیں پابندی سے پڑھا کروں گی۔

ناشتے کی میز پر ممی کے بہت پیچھے لگنے پر میں نے ٹوسٹ حلق سے اتارا تھا۔ ڈیڈی کو آفس پہنچنے کی جلدی تھی۔

''عرشی بیٹا! تم ایسا کرنا رضا کے ساتھ جا کر لسٹ دیکھ آنا۔''

وہ بریف کیس اٹھا کر ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے بولے تھے۔ جب سے ممی نے ڈرائیور کو نکالا تھا کہیں بھی آنے جانے کی بہت پریشانی ہو گئی تھی۔ بلال ابھی صرف پندرہ سال کا تھا گو وہ ممی ڈیڈی سے چوری چھپے گاڑی چلانے لگا تھا مگر میں اس کے ساتھ یونیورسٹی بہر حال نہیں جا سکتی تھی۔ رضا کے ساتھ جانے پر میں بالکل تیار نہ تھی مگر اس وقت کوئی اور دستیاب بھی نہ تھا اور پھر ممی کے بقول۔

''وہ خود وہیں پڑھتا ہے، وہ تمہاری بہتر رہنمائی کر سکے گا۔'' اور میں ممی کو کیا بتاتی کہ وہ آپ کی لاڈلی کی کیا رہنمائی کرے گا وہ تو میرے سوئم کا زردہ بریانی کھانے کی آس میں دن گن گن کر گزار رہا ہے۔

رضا کے برابر گاڑی میں بیٹھی میں زارا کے بتائے ہوئے وظیفے کا ورد کرنا چاہتی تھی مگر اس نے فل والیوم میں ''جنون'' کو لگایا ہوا تھا۔

''بند کرو رضا اسے۔'' جب اس نے پانچویں دفعہ بھی میرے احتجاج کو کوئی اہمیت نہ دی تو میں نے غصے میں آ کر کیسٹ نکال کر گاڑی سے باہر پھینک دیا تھا۔

''یہ کیا کیا، میرے تیس روپوں کا نقصان کر دیا، اب نیا کیسٹ میں تم سے ہی وصول کروں گا۔''

اس کی دھمکیوں کو خاطر میں لائے بغیر میں اپنا وظیفہ پڑھنا شروع کر چکی تھی۔ یونیورسٹی کے مین گیٹ کے باہر لسٹ لگی ہوئی تھی اور اسٹوڈنٹس کا جم غفیر وہاں جمع تھا۔ لڑکیاں، لڑکے ان کے والدین ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ میں اور رضا بھی اتر کر اس مجمع میں شامل ہو گئے تھے۔ بسم اللہ پڑھ کر میں نے لسٹ پر نظریں دوڑانی شروع کی تھیں۔

''رضا! میرا نام نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے اپنے پیچھے کھڑے رضا سے روہانسی آواز میں کہا تھا۔ وہ مجھ سے پورے سات انچ لمبا تھا اس لیے میرے پیچھے کھڑے ہو کر بھی وہ آرام سے لسٹ دیکھ سکتا تھا۔

''جو چیز ہو گی ہی نہیں وہ نظر کیسے آئے گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

میری حالت اتنی غیر تھی کہ اسے جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ پائی۔ آنسو بس کسی بھی لمحے بہنا شروع ہونے والے تھے۔ ''یہ لو Maginfying Glass (محدب عدسہ) سے ایک دفعہ پھر چیک کر لو تا کہ شک کی کوئی گنجائش نہ رہے، میں اسی لیے یہ ساتھ لے آیا تھا۔''

وہ اپنی بلیک کلر کی جینز کی پاکٹ سے Magnifying glass نکالتے ہوئے بولا تھا۔

''ایکسکیوزمی، اگر آپ لسٹ دیکھ چکی ہیں تو پلیز ذرا سائیڈ میں ہو جائیں ہمیں بھی لسٹ دیکھنی ہے۔''

میرے دائیں جانب کھڑی تین لڑکیوں کے گروپ میں سے ایک بولی تھی۔ انہیں جگہ دینے کے لیے میں ہٹنے ہی والی تھی کہ اچانک لسٹ کے سب سے آخر میں اپنے رول نمبر پر نظر پڑی۔

''رضا رضا! دیکھو میرا نام ہے۔ رضا! میرا نام لسٹ میں آ گیا۔ رضا! دیکھو میرا ایڈمیشن ہو گیا۔''

وہ تینوں تو میری چیخ پر ڈری ہی تھیں آس پاس دوسری لسٹوں کے پاس کھڑے ہوئے کئی لوگوں نے بھی میری طرف تعجب سے دیکھا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر دوں۔ خوشی سے پاگل ہونا کسے کہتے ہیں میری سمجھ میں اس روز آیا تھا۔ رضا کے ایکسپریشنز بڑے نارمل تھے۔ واپسی میں اسے گاڑی نیپا کی طرف لے جاتے دیکھ کر میں حیرت سے بولی۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' ہمارا گھر گلشن میں ہی ہے اور جہاں سنڈے بازار لگتا ہے۔ یونیورسٹی سے گھر جاتے ہوئے ہم وہیں سے ٹرن کیا کرتے تھے۔ وہ میری بات کے جواب میں کچھ نہ بولا تھا۔

اس نے گاڑی نیپا کے راؤنڈ اباؤٹ سے موڑ کر کے ایف سی پر لا کر روکی اور بولا ''بھوک لگ رہی ہے چلو کچھ کھاتے ہیں۔'' میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی تھی۔ لنچ ٹائم ہو رہا تھا اور کے ایف سی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تعداد کراچی یونیورسٹی اور این ای ڈی کے پنچھیوں کی تھی۔ ہر میز پر سرگوشیوں میں راز و نیاز کی باتیں کرتے ہوئے جوڑے نظر آ رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ نیپا کے ایک طرف گلشن چورنگی تک اور نیپا کے دوسری

طرف حسن اسکوائر تک تمام فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹس اور آئس کریم پارلرز ان ہی ''پنچھیوں'' کی وجہ سے آباد ہیں۔ کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر رضا نے اپنی پسند کی تمام چیزوں کا آرڈر کیا اور مجھ سے بھی میری پسند پوچھی، میں نے بے دریغ زنگر برگر، چکن، عریبین رائس وغیرہ کا آرڈر دے دیا تھا۔

ہوش تو میرے اس وقت اڑے جب کاؤنٹر پر کھڑی خوش شکل لڑکی کے سامنے رضا نے مجھ سے پے منٹ کرنے کے لیے کہا۔ صورت حال ایسی تھی کہ میں انکار کر ہی نہیں سکتی تھی ناچار دل پر بھاری پتھر رکھتے ہوئے میں نے بیگ سے والٹ نکالا اور ساڑھے چار سو روپے بل ادا کیا۔

''تمہارا ایڈمیشن ہوا ہے اس خوشی میں مجھے ٹریٹ تو ملنی ہی چاہیے تھی۔'' وہ مرغ کی ٹانگ کھاتا ہوا بڑے اطمینان سے بولا تھا۔ میرا غصے سے برا حال تھا۔ اپنے پیسے خرچ ہو جانے پر جتنا بھی افسوس کرتی کم تھا۔ کل ہی تو ڈیڈی نے کپڑے بنانے کے لیے تین ہزار روپے دیئے تھے ان میں سے ساڑھے چار سو تو یہ خرچ ہو گئے۔ اسے خوب اچھی طرح پیٹ بھر کر کھاتا دیکھ کر مجھے اور بھی غصہ آ رہا تھا۔ میرے باپ کی حق حلال کی محنت کی کمائی یہ منحوس کتنے آرام سے اڑا رہا ہے۔ غصے میں آ کر میں نے بھی اندھا دھند کھانا شروع کر دیا تھا۔

گھر پہنچے تو ممی اور تمام بہن بھائیوں سمیت عفت آنٹی بھی لاؤنج میں براجمان ہم لوگوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

''کیا رہا؟'' ممی نے بے تابی سے پوچھا۔ میرا خوشی سے گلنار چہرہ دیکھ کر وہ سمجھ تو گئی تھیں مگر پھر بھی تصدیق کے لیے یہ خوشی کی خبر میرے منہ سے سننا چاہتی تھیں۔ میرے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے رضا بولا۔

''میرٹ لسٹ میں پہلا نام عرشی کا۔'' اس کے چہرے پر چھائی مکاری اور کمینگی میرا خون کھولانے کے لیے کافی تھی۔

''واقعی۔''

''ارے بھئی کمال ہو گیا۔''

''میری بیٹی ہے ہی ذہین، مجھے پتا تھا وہ کچھ نہ کچھ منفرد ضرور کرے گی۔''

''ارے بجو! آپ تو چھپی رستم نکلیں، بیٹھے بیٹھے میدان مار لیا۔''

سب کے منہ سے مختلف توصیفی کلمات نکل رہے تھے اور میں گویم مشکل والی کیفیت میں گھری کھڑی تھی۔

''سائیلنس، سائیلنس خواتین و حضرات! ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ہے۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں کہا تھا اور سب لوگ ایک دم خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

''میرٹ لسٹ میں پہلا نام تو ہے مگر نیچے سے، میرا مطلب ہے کہ اگر میرٹ لسٹ نیچے سے پڑھی جائے تو عرشیہ سلمان کا پہلا نمبر ہے۔''

کیا وہ میری خوشی غارت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری آنکھیں یک دم بھر آئی تھیں۔ اپنے ساڑھے چار سو ساڑھے چار ہزار نظر آنے لگے تھے۔ مجھ سے ٹریٹ بھی لے لی اور ڈھیر ساری بکواس بھی کر لی۔

''واقعی بجو! آپ نے نیچے سے ٹاپ کیا ہے۔ تب بھی بات تو کمال کی ہے۔ ٹاپ تو ٹاپ ہے، چاہے اوپر سے کیا جائے چاہے نیچے سے۔''

بلال شرارت سے بولا تھا۔ باقی سب بہن بھائی بھی منہ چھپا کر مسکراہٹ روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عفت آنٹی کی نظر میری روہانسی

شکل پر پڑی تو وہ فہمائشی نظروں سے رضا کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''رضا! بی ہیو یور سیلف۔''

میں اپنے آنسو سب سے چھپاتی اندر کمرے میں چلی گئی تھی مگر فوراً ہی ندا، ردا، بلال، عروس، طلحہ، فیضی، ممی اور عفت آنٹی میرے پیچھے پیچھے اندر چلے آئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب میرا موڈ بحال کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس بدتمیز کی وجہ سے میں اپنی خوشی کو ڈھنگ سے سیلیبریٹ نہیں کر پا رہی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اس پر اور اس کی بکواس پر دس دفعہ لعنت بھیجی اور خوشی خوشی ڈیڈی، چندا ماما، نانی اور اپنی تمام فرینڈز کو فون کھڑکانے بیٹھ گئی۔

ممی نے سارے محلے میں مٹھائی تقسیم کروائی، ڈیڈی رات میں ہمیں ''سی ویو'' لے گئے اور ہم نے ڈنر بھی باہر کیا۔ یوں وہ دن میری اب تک کی زندگی کا یادگار ترین دن بن گیا۔

این ای ڈی جانے کا شوق بھی مجھے رضا ہی کو دیکھ کر ہوا تھا۔ وہ وہاں کمپیوٹر انجینئرنگ کر رہا تھا۔ تھرڈ ایئر کا امتحان دے کر وہ ابھی حال ہی میں فائنل ایئر میں آیا تھا۔ وہ شروع ہی سے پڑھائی میں بہت اچھا تھا اور این ای ڈی میں ایڈمیشن کے وقت اس کا میرٹ لسٹ میں پہلا نام تھا اور اس بات پر وہ بہت اترایا بھی کرتا تھا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے لگا این۔ای۔ڈین کا اسٹیکر ہاتھوں میں این۔ای۔ڈی کی نوٹ بکس اور فائلز دیکھ دیکھ کر ہی وہاں جانا میرے خوابوں میں شامل ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں میں شروع ہی سے ہر معاملے میں رضا کی تقلید کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ جو وہ پڑھ رہا ہے میں بھی پڑھوں، جو وہ کھیل رہا ہے میں بھی کھیلوں، جو وہ کھا رہا ہے میں بھی کھاؤں، گو میں یہ بات اپنے آپ سے بھی نہیں مانتی تھی مگر بہرحال سچ یہی تھا۔ عفت آنٹی لوگوں کی فیملی شروع ہی سے ہمارے پڑوس میں آباد تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ ہمارے اتنے پرانے اور دیرینہ تعلقات تھے کہ ہمارے اکثر جاننے والے ان لوگوں کو ہمارا رشتے دار سمجھا کرتے تھے۔ ان کے اور ہمارے بیچ کوئی تکلف، کوئی غیریت نہیں تھی۔ ہم لوگ بلا تکلف ایک دوسرے کے گھر جایا آیا کرتے تھے۔ انکل کا اپنا بزنس تھا جس میں معیز بھائی ان کی مدد کرایا کرتے تھے۔ معیز بھائی اور رجاء آپی کی شادیوں میں ہم لوگ اس طرح شریک ہوئے تھے جیسے یہ ہمارے اپنے گھر کی شادی ہو۔ میری عفت آنٹی اور ثوبیہ بھابھی سے بہت بنتی تھی اور ان کا گول مٹول کیوٹ سا بیٹا موبی تو بڑا فیورٹ تھا۔ اتنے اچھے گھرانے میں رضا وقاص پتا نہیں کہاں سے آ گیا تھا۔ ہر دم میرا دل جلانے کو تیار، انتہائی بیہودہ، معیز بھائی اور رجاء آپی جتنے اچھے اور اچھی طبیعت کے مالک تھے وہ اتنا ہی بدتمیز اور جنگلی۔

انٹرویو اور میڈیکل کے مراحل سے بھی میں بخوبی گزر گئی اور ایڈمیشن فیس بھی جمع کروا دی یعنی یہ کہ میرا ایڈمیشن مکمل ہو گیا تو میں نے اپنی الماری میں سب سے چھپا کر رکھا ہوا این۔ای۔ڈی کا اسٹیکر نکالا۔ یہ اسٹیکر جب میں ایڈمیشن فارم لینے گئی تھی تب ہی بک شاپ سے خرید لیا تھا مگر دکھایا کسی کو نہیں تھی۔ خوامخواہ بعد میں مذاق نہ بنے، یہ سوچ کر میں نے سب سے چھپا لیا تھا مگر اب تو مذاق اڑنے کا سوال ہی نہیں تھا، میں بڑے فخر کے ساتھ یہ اسٹیکر اپنی گاڑی کے پیچھے لگا سکتی تھی۔

میں پورچ میں آ کر بڑے پیار سے گاڑی کے پیچھے اسٹیکر لگا رہی تھی جب رضا کی آواز سنائی دی۔

''او چھے کو ملا تیتر.....'' مگر اس کی پیٹھ میں دیکھ چکی تھی۔ وہ ٹیرس پر موبی کو گود میں لے کر ٹہل رہا تھا۔ شاید وہ بھابھی کو تنگ کر رہا ہوگا اور رضا اسے ٹیرس پر لے آیا تھا۔ ٹیرس کا دوسرے سرے تک چکر مکمل کر کے وہ واپس اس طرف آیا تو میں اپنے کام سے فارغ ہو کر ایک پیار بھری نظر گاڑی پر ڈالتے ہوئے اندر جانے ہی والی تھی کہ دوبارہ اس کی آواز آئی۔

''خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔''

اب کی دفعہ میں نے اسے فرار ہونے کا موقع نہ دیا اور لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر چلائی۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو تم۔''

وہ جو دوبارہ واپس مڑ چکا تھا پلٹا اور بڑی معصومیت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں میں موبی کو محاورے سکھا رہا ہوں۔''

میرا دل چاہ رہا تھا یہیں سے اٹھا کر کوئی وزنی پتھر اس کے سر پر مار دوں۔

''خوب سمجھتی ہوں میں تمہاری مکاریاں۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔

''بھئی اس میں اتنا برا ماننے والی کیا بات ہے، اہلِ زبان تو با محاورہ اردو بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔''

وہ موبی کے منہ میں چاکلیٹ ڈالتے ہوئے مسکرایا تھا اور یہ چالاک اور مکار مسکراہٹ مجھے کتنی زہر لگ رہی تھی یہ میں ہی جانتی تھی۔

''تمہیں سارے محاورے میری شکل دیکھ کر کیوں یاد آتے ہیں۔'' میں غصے سے چلائی تھی۔

''تمہاری شکل بابائے اردو سے ملتی ہے نا اس لیے۔'' وہ میرا دل جلاتا ہوا موبی کو لیے جھٹ کمرے میں گھس گیا تھا اور میں کتنی دیر تک مٹھیاں بھینچے کھڑی رہی تھی۔ ابلیس کہیں کا۔ صرف میرا دل جلوانا اس سے۔ مجھے پتا تھا اس روز بھی وہ جان کر خاموش کھڑا میری غیر ہوتی حالت سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا ورنہ لسٹ میں اس نے میرا نام پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

☆

اسلام آباد جانے کا تو میں پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی اور ابھی تو کلاسز شروع ہونے میں کچھ دن بھی تھے چنانچہ میں نے رختِ سفر باندھا۔ مجھے دیکھ کر ظاہر ہے چندا ماما بہت خوش ہوئے تھے۔ میں نے انہیں اپنے آنے کا پہلے سے بتایا ہوا بھی نہیں تھا۔ آج صبح مجھے جہاز میں بٹھانے کے بعد ڈیڈی نے انہیں میرے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ میری اچانک آمد پر خاصے حیران تھے۔

''بس ابھی فراغت بھی تھی اور آپ یاد بھی بہت آ رہے تھے۔'' میں نے لاپروائی سے جواب دیا اور وہ جو میرا ماتھا ٹھنکا تھا وہ کچھ بے جا تو نہیں تھا اچھا خاصا معقول بندہ جب روزانہ رات میں سونے سے پہلے پابندی سے مہدی حسن، فریدہ خانم، غلام علی اور اقبال بانو کو سننا شروع کر دے تو تشویش کی بات تو ہے۔ وہ جو پاپ گانوں اور انگلش میوزک کے شیدائی تھے اب۔

''دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں.....''

''گلوں میں رنگ بھرے.....''

اور ''چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے.....''

بڑی اداسی سے سنا کرتے تھے۔ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا اور وہ بیڈ پر نیم دراز پتا نہیں کن خیالوں میں کھوئے نظر آتے۔ میں تو آئی ہی اس مقصد کے لیے تھی اس لیے بڑی ہوشیاری سے چنداماما کی جاسوسی شروع کر دی۔ ان کے تمام ملنے والوں کا بغور جائزہ لینے لگی، ان کی روز کی ڈائری چیک کی کہ شاید کوئی فون نمبر کوئی ای میل ایڈریس کوئی ایسی شخصیت مل سکے جس پر میں شک کر سکوں۔ ان کی تمام ای میلز ان سے چھپ کر چیک کیں مگر کوئی کلیو ہاتھ نہ لگا۔

پھر ایک روز شام میں جب میں اور چنداماما واک کرنے کے لیے باہر نکلے اور عین اسی وقت سامنے والے مکان میں سے ایک خرانٹ سے بڑے میاں ہاتھ میں اپنے موٹے تازے تندرست کتے کی زنجیر تھامے باہر نکلے اور ان کے ساتھ ایک نازک البیلی حسینہ بھی برآمد ہوئی اور اسے دیکھ کر چنداماما نے جتنی ٹھنڈی اور دکھ بھری سانس لی تھی میرا مسئلہ اسی وقت حل ہو گیا تھا، جیسے ہی ساری بات سمجھ میں آئی میں نے بڑے میاں اور کتے کو نظر انداز کر کے اس گل بکاؤلی کا از سر نو جائزہ لیا۔ چنداماما غلط تو نہیں فدا ہو رہے تھے اس مہ جبیں پر۔ اس کے چہرے پر حسن کے ساتھ ساتھ سادگی اور معصومیت بھی تھی۔ سر جھکا کر وہ بڑے ڈرے ڈرے انداز میں بڑے میاں کے ساتھ چل رہی تھی۔ یہ لمبی گھٹنوں کو چھوتی ہوئی موٹی سی چٹیا، وہ مشرقی حسن کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔

''فکر مت کریں چنداماما! ابھی آپ کی بھانجی زندہ ہے۔ میں انشاءاللہ آپ کا مسئلہ حل کرا کر ہی جاؤں گی۔''

مجھے پورا یقین تھا۔ چنداماما کی اس یک طرفہ لو اسٹوری میں ولن کا کردار وہ خرانٹ ابا جان ادا کر رہے ہوں گے۔ وہ بے چاری ان کے ساتھ کتنی سہمی ہوئی تھی جیسے کسی جلاد کی قید میں ہو۔ مجھے اس کے چہرے کے قابل رحم تاثرات یاد آ رہے تھے۔

اگلے روز چنداماما کے آفس چلے جانے کے بعد میں نے دریلیٰ پر حاضری دی تو سگِ لیلیٰ نے اپنی خوفناک اور خطرناک آوازوں سے میرا استقبال کیا۔ وہ یوں بھونک رہا تھا جیسے ابھی میرا تیا پانچا کر کے رکھ دے گا۔ چوکیدار نے کتے کو ڈانٹ کر خاموش کرایا اور مجھے اندر آنے کے لیے کہا تو لان میں باغبانی کرتے خرانٹ انکل نے مجھے روک لیا۔

''کس سے ملنا ہے؟''

''کیوں ملنا ہے؟''

''میں کون ہوں؟''

''کہاں سے آئی ہوں؟''

ایسا لگ رہا تھا جیسے بارڈر کراس کرتے ہوئے بھارتی فوجیوں نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے اور اب دشمن ملک کی سرحد غیر قانونی طور پر کراس کرنے کے جرم میں مجھ سے سوال جواب ہو رہے ہیں۔

''یا اللہ یہ میں کہاں پھنس گئی۔''

میں نے بے بسی سے سوچا۔ اسی وقت ایک مہربان خاتون اندر سے برآمد ہوئیں اور مجھے اپنے ساتھ اندر لے آئیں تب میری جان بخشی ہوئی۔

''چنداماما! آپ بری جگہ پھنسے، یہ خرانٹ انکل تو واقعی ولن ہیں۔''

میں نے دل میں سوچا تھا۔ خاتون، اس زہرہ جبیں، نازنین، چاند چہرہ، ستارہ آنکھوں اور دراز زلفوں والی حسینہ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ مجھ سے بڑے پرتپاک انداز میں اور بے حد محبت سے ملیں تو میرے دل کو ایک طرف سے اطمینان ہوا چلو کم از کم والدہ تو انسانوں کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ خرانٹ انکل ریٹائرڈ بیوروکریٹ تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد سے اب اپنا سارا وقت گھر پر باغبانی کرتے ہوئے یا پھر اسٹڈی میں کتابیں پڑھتے ہوئے گزارا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کی باتوں کی آوازیں سن کر وہ خود ہی اندر سے آ گئی تھی۔ دور سے دیکھنے میں وہ جتنی خوبصورت لگی تھی قریب سے اس سے بھی کہیں زیادہ حسین تھی۔

میں نے سسرالی نگاہوں سے اس کا ہر ہر زاویہ سے بغور جائزہ لے کر اسے اے پلس دے دیا تھا۔ نام بھی اس کا بڑا پیارا تھا گل رخ۔ سائیکالوجی میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد۔ میں نے اس کے اکلوتے ہونے پر بڑے رشک سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ کتنا شوق تھا مجھے اکلوتا ہونے کا مگر اپنے سے چھوٹے چھ عدد بہن بھائی میرے اس شوق کی راہ میں عرصہ دراز سے حائل تھے۔ کسی بھی معقول قسم کے افسانے، ناول یا فلم کو اٹھا کر دیکھ لیں۔ ہیروئن امیر والدین کی اکلوتی بیٹی ہوتی ہے۔ چلو نانی بیچاری نے تو بیٹے کی آس میں خیر سے سات بچوں کو جنم دیا تھا اور پھر ہو سکتا ہے اس زمانے میں ''چابیاں'' نہ ہوتی ہوں مگر ممی اور تمام خلائیں اس طرح نانی کے نقشِ قدم پر چلی تھیں کہ ایسا لگا کرتا تھا کہ اگر سات کا ہندسہ عبور نہیں کیا تو ناک کٹ جائے گی اور اچھی خالہ تو اس معاملہ میں نانی کو بھی پیچھے چھوڑ گئی تھیں۔ ان کے ہاں پوری کرکٹ ٹیم تھی بمعہ ایک عدد ایکسٹرا کھلاڑی کے۔ چنداماما تو کئی مرتبہ بڑی سنجیدگی سے اچھی خالہ کو مشورہ دے چکے تھے۔

''آپا! ایسا کریں، بچوں کی شرٹس کے پیچھے نمبر ڈلوا دیں، ایک سے لے کر بارہ تک۔ اس طرح آپ کو بھی بچوں کو بلانے میں مشکل نہیں آئے گی جسے بھی بلانا ہوا اس کے نمبر سے پکار کر بلا لیا اور ہمیں بھی بارہ نام یاد رکھنے کے جھنجھٹ سے چھٹکارہ مل جائے گا۔''

اور ان کے اس سنجیدہ مذاق پر اچھی خالہ کے تمام بچے بھی کھی کھی کر کے ہنسنے لگتے تھے جبکہ نانی اور اچھی خالہ کا غصے سے برا حال ہو جاتا تھا۔

''کیسے میرے بچوں کو نظر لگا رہا ہے یہ، دیکھیں اماں۔''

وہ آنکھوں میں آنسو بھر لاتیں اور نانی چنداماما کی کلاس لینا شروع ہو جاتیں۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اور مجھ سے چھوٹے چھ کے چھ شیطان کے چیلے۔ جاسوسی میں تو ان سے زیادہ ماہر کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنے ہی گھر میں ڈش اور کیبل ہونے کے باوجود سارا وقت بی بی سی، نیشنل جیوگرافک، اسٹار اسپورٹس اور کبھی کبھار کروڑ پتی دیکھنے کی اجازت تھی وہ بھی ممی نے اس وجہ سے دے دی تھی۔

''اچھا پروگرام ہے اس سے جنرل نالج بڑھے گی۔''

پتا نہیں ممی کو ہم سب بہن بھائیوں خصوصاً میری معلومات بڑھانے کا اس قدر شوق کیوں تھا۔

''ہاں یہ پڑھو، اس سے معلومات بڑھے گی۔''

''ہاں یہ دیکھو اس سے انفارمیشن ملے گی۔'' گویا معلومات عامہ کا نوبل پرائز مجھے جتوا کر ہی دم لیں گی اور اگر کبھی ممی کی نظر بچا کر مووی میجک، اسٹار موویز یا کوئی اور چینل لگا لیتی تو میرا کوئی نہ کوئی چغل خور بہن بھائی اچانک وہاں آدھمکتا۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر جہاں بندے کو'' پرائیویسی'' بھی میسر نہ ہو۔

ہم پانچ دوستوں کے گروپ میں زارا ہی وہ خوش قسمت لڑکی تھی جسے اکلوتے ہونے کا شرف حاصل تھا اور اکثر ہم سب فرینڈز اسی کے گھر جمع ہوا کرتے تھے۔ اسی کے گھر جا کر ہم نے پاکستانی فلمیں ''کھلونا'' اور ''انتہا'' دیکھی تھیں۔ جنہوں نے یہ فلمیں دیکھی ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ انہیں دیکھنے کے لیے زارا کے گھر جانا کیوں ضروری تھا۔ آسکر ایوارڈ کی تقریب ہوئی تو وہ دیکھنے بھی ہم سب زارا ہی کے گھر جمع ہوئے تھے۔ اپنے گھر میں تو میں یہ پروگرام دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''ماشاء اللہ جولیا رابرٹس کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔'' فرحین کے اوپر اپنی دادی کا بڑا اثر تھا اور ان سے سیکھ سیکھ کر اس نے ہر بات میں ماشاء اللہ، جزاک اللہ، سبحان اللہ بولنا تو سیکھ لیا تھا مگر یہ الفاظ کن موقعوں پر بولے جاتے ہیں وہ اسے بالکل نہیں پتا تھا۔ ''جولیا رابرٹس'' کے لیے ماشاء اللہ بولنے پر ہم سب ہی ہاتھ پاؤں دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے تھے مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ ہم لوگوں کے ٹوکنے کے باوجود اس کی عادت نہیں چھوٹتی تھی۔

''جزاک اللہ، آج تو کیبل پر چھبیس چھبیس چینل آ رہے ہیں۔'' وہ معصومیت سے کہتی اور ہم سب سر پکڑ کر بیٹھ جاتے۔

☆

شام کی چائے پیتے ہوئے میں نے چنداماما کو بڑے سرسری انداز میں بتایا۔

''آج میں سامنے والوں کے گھر گئی تھی۔'' وہ جو اتنی دیر سے مجھے نظر انداز کیے ڈان کا اکانومی کا صفحہ کھولے بیٹھے تھے ایک دم اخبار ٹیبل پر رکھ دیا اور پوری طرح میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

''کیا کہا، سامنے والوں کے؟'' وہ بے یقینی سے پوچھ رہے تھے۔

''جی سامنے والوں کے، آپ کو اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے۔ میں بور ہو رہی تھی۔ سوچا سامنے والوں کے ہاں ہو آؤں۔ پھر وہاں ایک لڑکی بھی ہے اس لیے مجھے جا کر مزہ بھی آیا۔'' میرا انداز پھر لاپرواہ سا تھا۔

''اچھا پھر کیا ہوا، کیسے ہیں وہ لوگ؟'' وہ بے تابی سے پوچھ رہے تھے۔

مجھے پتا تھا لوگوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں وہ صرف گل رخ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں مگر میں بھی آخر ان ہی کی بھانجی تھی۔

''ہاں اچھے لوگ ہیں۔'' کہہ کر اس طرح خاموش ہو گئی جس طرح ہمارے ہاں کے سیاست دان کسی بھی بات کا گول مول جواب دے کر چپ ہو جاتے ہیں۔ وہ بے چارے براہ راست کچھ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے مگر بے چینی ان کے ہر انداز سے ہویدا تھی۔

''گل رخ بھی بہت اچھی نیچر کی ہے۔'' میں نے شعلوں کو ہوا دی تو وہ جو مایوس ہونے لگے تھے ایک دم مسکرا اٹھے تھے۔

سے پھٹ پڑے تھے۔

''بندہ بات کرنے یا کوئی بھی اور پیش رفت کرنے کی جرأت کر ہی نہیں سکتا۔ اسے کہیں اکیلے آنے جانے کی اجازت نہیں ہے، یونیورسٹی ابا کی زیرنگرانی ڈرائیور کے ساتھ جاتی ہے اور گھر سے باہر بھی ہر وقت وہ جلاّد ابا اور خطرناک کتا ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔'' وہ تو پتا نہیں کب سے بھرے بیٹھے تھے۔

''آپ کا طریقہ کار ہی غلط ہے۔ آپ کو پہلے ابا سے رسم وراہ بڑھانی چاہیے تھی۔'' میں نے اپنی رائے پیش کی تھی۔

''کیا کروں اسٹارٹ میں ہی ان کے اوپر میرا امپریشن لا ابالی اور غیر سنجیدہ بندے کا پڑ چکا ہے۔ اب سڑک پر خوشگوار موڈ میں انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اگر ان کا کتا میری گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں اسے کوئی جان کر تو مارنا نہیں چاہتا تھا اور اس وقت مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ چنگیز خان ''اس'' کے والد بزرگوار ہیں۔'' وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے۔

''لیکن ایسے کیسے کام چلے گا۔ اگر آپ ابا اور کتے سے ڈرتے رہے تو لگ چکی آپ کی نیا پار۔'' میں نے انہیں غیرت دلانے کی کوشش کی۔

''وہ ابا کی موٹی سی چھڑی دیکھی ہے جو وہ بغل میں دبائے رکھتے ہیں اور اس خبیث کی موٹی موٹی لال انگارہ آنکھیں دیکھی ہیں، اچھے بھلے بندے کا پتا پانی کر سکتی ہیں یہ دونوں چیزیں۔'' انہوں نے غم زدہ انداز میں کہا تھا۔ مجھے چنداماما کی یہ بزدلانہ باتیں ایک آنکھ نہ بھا رہی تھیں۔

''چنداماما! آپ بھول گئے کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔''

میں نے مشہور تاریخی جملہ بڑی شان سے اکڑ کر کرسی پر سے کھڑے ہو کر کہا تھا اور چنداماما میرے اسٹائل پر بے اختیار ہنس پڑے تھے۔

☆

چنداماما سے تو کچھ ہونے والا نہیں۔ اب مجھے ہی ان کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی پیش رفت کرنی تھی۔ بڑی سوچ بچار اور غور وفکر کے بعد میرے انیلیکچوئل دماغ میں ایک آئیڈیا آ ہی گیا تھا۔ اگلے روز دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر گل رخ کے گھر میں موجود تھی۔ خرانٹ انکل جن کا نام آفتاب محسن تھا قیلولہ فرما رہے تھے اور ان کا فیورٹ میکس بھی کچھ اچھے موڈ میں تھا اس لیے زیادہ غرایا نہیں تھا۔ آنٹی سے دعا سلام کر کے میں گل رخ کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ ابھی ابھی یونیورسٹی سے آئی تھی۔ میری طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرا کر بولی۔

''آؤ عرشیہ! بیٹھو۔'' میں اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جب میں اصل بات کی طرف آئی تو وہ ہونق سی شکل بنا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے عرشیہ؟'' وہ میری بات پر کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔

''کیوں نہیں ہو سکتا گل! آخر اس میں ناممکن کیا ہے۔ ساری بات تو میں آپ کو بتا چکی ہوں۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔

''تم انہیں کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھاؤ، میں تو ابھی پڑھ رہی ہوں، ابھی میرا لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے اور کتابوں سے ہٹ کر اپنے پروفیشن سے متعلق تو میری معلومات اور علم بہت ناقص ہے۔'' وہ کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔

''چنداماما! موسم کتنا ابر آلود ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے خوب زوردار بارش ہوگی۔''

میں نے پھر ان کے ارمانوں پر اوس ڈال دی تھی۔ اچانک ان کی نظر میرے چہرے کی شرارتی مسکراہٹ پر پڑی تو وہ میرا کان پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولے۔

''ابھی بتاتا ہوں تمہیں، شیطان کی نانی۔''

''اچھا میرا کان تو چھوڑیں اور ویسے میں شیطان کی نانی نہیں نواسی ہوں۔'' میں نے درد سے چیختے ہوئے کہا تھا۔ انہوں نے میرا کان چھوڑ دیا تھا۔

''آج ہی اماں کو فون کر کے بتاؤں گا یہ آپ کو شیطان کہہ رہی تھی۔'' انہوں نے دھمکی دی تھی۔

''میں نانی کو تھوڑی کہہ رہی ہوں، میں تو نانا جان کو کہہ رہی تھی اور انہیں شیطان کہنے پر تو نانی ہرگز ناراض نہیں ہوں گی۔ ہر وقت تو نانا جان مرحوم کی برائیاں ہم لوگوں سے کرتی رہتی ہیں۔''

میں نے کمال اطمینان سے کہا تھا اور یہی بات پچھلے دنوں میں نے نانی سے کہی تھی تو ان کے پتنگے لگ گئے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ کسی بات پر میں نے نانا جان کی برائیاں کرنی شروع کر دی تھیں۔ خیال تھا اس سے نانی خوش ہوں گی مگر ہماری نانی نے بھی عجیب دماغ پایا ہے۔ خود چاہے نانا جان کی شان میں کچھ بھی کہہ لیں، کوئی دوسرا ''سرتاج کو کچھ نہ کہے۔'' انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا تو میں نے منہ پھٹ انداز میں کہہ دیا تھا۔

''خود ہی نے تو ہر وقت نانا جان کی برائیاں کر کر کے ہم لوگوں کا دل ان کی طرف سے کھٹا کرایا ہے اب خود ہی برا مان رہی ہیں۔''

اور میری اس بات پر پھر جو نانی، اچھی خالہ، پیاری آنٹی اور ممی نے مل کر مجھے صلواتیں سنائی تھیں وہ ضبطِ تحریر میں لانے کے قابل نہیں۔

''صاف صاف بتاؤ، تم گل رخ کے گھر کیوں گئی تھیں؟'' چنداماما نے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رعب سے پوچھا تھا۔

''اوہو گل رخ!'' میں شوخی سے کہہ کر کھنکاری تھی۔ وہ ایک پل کو تھوڑے سے کھسیانے ہوئے پھر دوبارہ ماموؤں والا رعب و دبدبہ چہرے پر لے آئے۔

''عرشی! میں بہت سنجیدہ ہوں۔'' وہ غصے سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''اس کا اندازہ تو مجھے کراچی ہی میں ہو گیا تھا ماما دا گریٹ۔'' میں نے ان کی سنجیدگی اور غصے کو خاطر میں لائے بغیر مسخرے پن سے کہا تھا۔

''اوئے مامے! فکر نہ کر ابھی تیری بھانجی زندہ ہے۔'' میں نے سلطان راہی کے اسٹائل میں بڑھک مارنے کی کوشش کی تھی۔

''خدا کے لیے عرشی! فضول باتیں مت کرو۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولے تھے۔ ان کی سنجیدگی اور رنجیدگی نے مجھے بھی سنجیدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''چنداماما! آخر پرابلم ہے کیا؟''

''ان کے گھر ہو آئیں پھر بھی پرابلم پوچھ رہی ہو۔ وہاں یک نہ شد دو دو پرابلمز ہیں۔ ایک وہ چنگیز خان اور دوسرا وہ منحوس کتا۔'' وہ غصے

''گل! اگر آپ چنداماما کی حالت، ان کا اضطراب اور بے چینی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو کبھی انکار نہ کریں، کیا بتاؤں میرے ماما نے اتنی سی عمر میں کتنے بڑے بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ سوتیلی ماں نے ان پر بچپن میں اتنے ظلم ڈھائے، انہیں اتنی اذیتیں دیں کہ وہ آج تک ان ہی کے حصار میں ہیں۔''

نانی اگر میری یہ ہرزہ سرائیاں سن لیں تو دس جوتے ماریں گی، میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ گل رخ خاموشی سے بیٹھی میری باتیں سن رہی تھی۔

''ان کا بچپن سوتیلی ماں کے ظلم وستم اور سوتیلے بہن بھائیوں کے اذیت ناک سلوک کو برداشت کرتے ہوئے گزرا ہے۔ نانی انہیں اسکول بھی نہیں جانے دیتی تھیں۔ سارے گھر کا کام، سودا سلف لانا سب کچھ بے چارے ماما کو کرنا پڑتا تھا۔ کتنی مشکلوں سے سب سے چھپ چھپا کر انہوں نے پرائیویٹ تعلیم حاصل کی۔ نائٹ کالجوں میں پڑھا۔ اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں اخبار ڈالے، مزدوری کی، محنت کی۔ میں کہاں تک بتاؤں چنداماما کی داستانِ حیات غموں کا مجموعہ ہے۔ بچپن کے ان ہی ناسازگار حالات اور لوگوں کے برے رویوں نے انہیں نفسیاتی مریض بنا دیا ہے مگر وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ انہیں کوئی نفسیاتی بیماری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انہیں کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جا کر باقاعدہ ان کا ٹریٹمنٹ نہیں کروا سکتے۔ اس طرح ان کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ آپ گھر بظاہر میری فرینڈ بن کر آیا کریں اور باتوں باتوں میں چنداماما کا علاج بھی کر دیں۔ دیکھیں اس طرح جہاں چنداماما کا مسئلہ حل ہو جائے گا وہیں آپ کو بھی تو اپنی پڑھائی استعمال کرنے کا موقع ملے گا اور ہم سب جو دعائیں آپ کو دیں گے وہ الگ ہیں۔''

میں نے تفصیلی خطاب فرمایا تھا۔ وہ میری باتوں سے کچھ کچھ قائل نظر آنے لگی تھی۔ چنداماما کا ''دکھ بھرا بچپن'' سن کر باقاعدہ اس کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔ واقعی وہ بہت معصوم اور سیدھی سی تھی اور ہم ماموں بھانجی کچھ زیادہ ہی چالاک۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے عرشیہ! لیکن پاپا.....'' وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی تھی۔

''آپ انکل کی فکر مت کریں، وہ میں سنبھال لوں گی، آپ اپنا بتائیں۔''

میں نے اس کی الجھن رفع کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس بات پر کچھ شرمندہ سی نظر آنے لگی تھی کہ میں ایک دو ملاقاتوں میں ہی اس کے پاپا کی جلا دفطرت سے واقف ہو چکی ہوں حالانکہ وہ ناحق ہی شرمسار ہو رہی تھی۔ اس کے پاپا جس قسم کی شخصیت تھے ان سے ملنے والا کوئی بھی شخص ان کی فطرت کا اندازہ محض دو منٹ ہی میں لگا لیا کرتا ہوگا۔ میں نے اسے شش وپنج میں مبتلا دیکھ کر مزید دکھیاری شکل بنالی اور بولی۔

''ابھی تو میں نے صرف مختصر لفظوں میں آپ کو چنداماما پر گزرے حالات سنائے ہیں اگر میں تفصیل سنانے بیٹھ جاؤں تو آپ روز چینل کا پورا ڈبا خالی کر دیں گی، کیسے کیسے انہوں نے ستم اٹھائے ہیں۔''

اپنی بات کے بے تکے ہونے کا احساس مجھے تو ہو گیا تھا مگر وہ بے چاری بڑے افسوس سے سب کچھ سن رہی تھی۔

''اچھا تو وہ تمہارے سوتیلے ماموں ہیں۔'' اس نے کافی دیر بعد سوال پوچھا تھا۔

''نہیں میری ممی اور چنداماما دونوں سگے بہن بھائی ہیں، باقی سب بہن بھائی سوتیلے ہیں، ہمارے نانا نے دوسری شادی کی تھی نا۔''

میں نے مرحوم نانا جان کو بھی اس قصے میں شامل کرلیا تھا، کوئی بات نہیں یہ جھوٹ میں دو دلوں کو ملانے کے لیے بول رہی ہوں، اس پر یقیناً گناہ نہیں ملے گا۔ میں نے خود کو اطمینان دلایا تھا۔

''نانی، ممی اور چنداماما کو گھر کے پیچھے بنے اسٹور میں بند کر دیا کرتی تھیں اور کئی کئی وقت کھانا بھی نہیں دیتی تھیں۔ ممی تو جیسے جیسے بڑی ہوئیں نارمل ہوتی گئیں مگر چنداماما نے ان تمام حالات کو دل پر لے لیا۔ ان کا نہ کوئی دوست ہے نہ کوئی ہابیز (مشاغل)۔ آفس سے آکر وہ سارا وقت تنہا رہتے ہیں۔ شادی کے نام سے الرجک ہیں اور ہم میں سے کوئی کہے تو غصے میں آجاتے ہیں کہ تم لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہو۔''

میری سنجیدگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہاں سے اٹھتے وقت تک میں گل رخ کو ماما کے ''علاج'' کے لیے قائل کر چکی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں، یہاں تک کہ اپنی فرینڈز کے گھر بھی نہیں اور یہ ذمہ داری میں نے قبول کی تھی کہ اسے ہمارے گھر آنے جانے کی اجازت انکل سے میں دلواؤں گی۔

رات کو چنداماما سے کہہ کر سوئی تھی صبح مجھے جلدی اٹھا دیجیے گا۔ ان کے لاکھ پوچھنے پر بھی میں نے اپنا پلان انہیں نہیں بتایا تھا۔ وعدے کے مطابق چنداماما نے مجھے صبح سویرے جگا دیا تھا۔ وہ لان میں ایکسرسائز کر رہے تھے، جب میں سویٹر کے اوپر شال لپیٹ کر خود کو سردی سے بچانے کی تدبیر کرتے ہوئے گیٹ کی طرف جانے لگی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' وہ دور سے چلائے تھے۔

''واک کرنے۔'' میں نے شانِ بے نیازی سے جواب دیا۔

''اکیلے، اچھا رکو میں بھی آرہا ہوں۔''

''چنداماما پلیز، آپ کو نہیں پتا، میں کسی خاص مشن پر جا رہی ہوں، آپ کی موجودگی سے نقص امن کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔'' میرے جواب پر بجائے خوش ہونے کے وہ پریشان ہو گئے۔

''ارے اب کیا کرنے جا رہی ہو آفت کی پرکالہ! دیکھو مروا مت دینا۔''

ان کے شک و شبے پر مجھے غصہ تو بہت آیا مگر خیر اکلوتے ماموں ہیں جن کی شادی کا نانی، ممی، تمام خالاؤں اور ان کے ڈھر سارے بچوں کو بڑی شدتوں سے انتظار ہے۔ کیا اہلِ برطانیہ نے لیڈی ڈیانا اور پرنس چارلس کی شادی کا جشن منایا تھا جو ہم منائیں گے۔ میرا خیال ہے چنداماما کی شادی اتنی منفرد اور شاندار ہوگی کہ گینز بک میں اس شادی کا احوال ایک انوکھی شادی کے طور پر شامل کیا جائے گا۔

''گڈ مارننگ انکل!'' میں نے خرانٹ انکل میرا مطلب ہے آفتاب انکل کو مخاطب کیا۔ میکس کی زنجیر تھامے وہ اپنے گھر سے تین چار گھر آگے نکل گئے تھے۔ میرے گڈ مارننگ کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے وہ مجھے گھور کر دیکھ رہے تھے، غالباً انہیں یہ بے تکلف اندازِ تخاطب پسند نہیں آیا تھا۔ میں بظاہر خود کو بہت لاپرواہ اور پراعتماد پوز کر رہی تھی ورنہ دل تو سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا، ایک وہ خطرناک اوپر سے ان کا کتا وہ سوا

خطرناک۔

''واؤ، سو کیوٹ۔'' میں نے میکس کے سر پر ڈرتے ڈرتے ہاتھ پھیرا۔ کتوں سے مجھے کتنا ڈر لگتا تھا اور یہاں تو تھا بھی پلا پلایا یہ پہلوان کتا۔

''انکل! آپ نے اسے کہاں سے خریدا، کسی بہت اچھی نسل کا معلوم ہو رہا ہے۔ لگتا ہے بہت مہنگا خریدا ہوگا۔'' میں نے اس کی شان میں قصیدہ پڑھا تھا۔

''اسے میں نے خریدا نہیں ہے، یہ میرے ہی گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں کو میں اسپین سے خرید کر لایا تھا۔'' وہ ناک چڑھا کر فخر سے بولے تھے۔

''میں نے آج تک کی زندگی میں بڑے بڑے کتے دیکھے ہیں مگر یہ کتا تو ان سب سے بڑھ کر کتا ہے۔ کیا ہائٹ ہے کیا مضبوط جسامت ہے، کیا چال میں وقار اور خاندانی جاہ و جلال کی چمک ہے۔''

میں نے اس کی شان میں پھر زمین آسمان ایک کیے مگر وہ خوش ہونے کے بجائے منہ بنا کر بولے۔

''یہ کیا تم اسے کتا کتا کہہ رہی ہو، اس کا نام میکس ہے۔''

لو جی اب کتے کو کتا نہ کہیں تو کیا شیر کہیں۔ خیر یہاں ان سے اختلاف کرنے تو آئی ہی نہیں تھی اس لیے فوراً معذرت کر لی۔ پھر سارا وقت میں ان سے میکس کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھی۔ اپنی سادگی میں گل رخ مجھے بتا چکی تھی کہ اس کے والد محترم اگر دنیا میں کسی سے سچی محبت کرتے ہیں تو وہ میکس ہے اور اس کے بارے میں اگر ان سے گھنٹوں بات کی جائے تو وہ کر لیں گے۔ میں نے چالاکی سے یہ اہم ترین پوائنٹ نوٹ کر لیا تھا اور اس میں مجھے کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی۔ میں نے گھنٹہ بھر تک ان کے ساتھ واک کرتے ہوئے۔

''میکس کیا کھاتا ہے؟''

''میکس کیا پیتا ہے؟''

''دودھ اسے کیسا پسند ہے۔''

''اس کے لیے پانی باہر سے آتا ہے۔''

''ہر مہینے اس کا میڈیکل چیک اپ ہوتا ہے۔''

وغیرہ وغیرہ سنا تھا۔ گھر جانے تک میرا سر پلپلا ہو چکا تھا۔

تین دن متواتر ان کے ساتھ مارننگ واک کر کے ''میکس نامہ'' سننے کے بعد آخر کار میں نے اپنی اور گل رخ کی دوستی کا ذکر کر کے کہا تھا۔

''انکل! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں اور گل رخ ایک دوسرے کے گھر آ جایا کریں۔''

اور میں اب چونکہ ان کی گڈ بکس میں آ چکی تھی اس لیے انہوں نے فوراً اجازت دے دی تھی۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھے، میری تعریفیں بھی کرنے لگے تھے ان کا خیال تھا کہ میں ایک ذہین اور جوہر شناس لڑکی ہوں، میکس کی جو خوبیاں مجھے نظر آئی ہیں وہ خود ان کے علاوہ آج تک کبھی کسی

اور کو نظر نہیں آئیں۔

میں نے گل کو یہ خوش خبری سنائی تو وہ حیرت زدہ لہجے میں بولی تھی۔

''یہ تو بہت حیران کن ہے، تم واقعی جینئس ہو عرشیہ۔''

چنداماما نے پہلے دن کے بعد سے مجھے نہیں ٹوکا تھا، وہ خاموشی سے میری کارکردگی ملاحظہ کر رہے تھے۔

اگلے روز شام میں گل رخ کا ہمارے گھر آنا ہماری کامیابی کی پہلی سیڑھی تھی۔ اس ظالم جادوگر کی قید سے اس معصوم شہزادی کو چند گھنٹوں ہی کے لیے سہی چھٹکارا تو نصیب ہوا تھا۔ چنداماما پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ مارے خوشی کے وہ عجیب ہونقوں والی حرکتیں کر رہے تھے۔

''آپ یہاں آجائیں، وہاں دھوپ ہے۔''

وہ جھٹ اپنی کرسی پر سے کھڑے ہوئے تھے حالانکہ دھوپ ڈھلے خاصی دیر ہو چکی تھی اور اب لان میں بڑی خوشگوار اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس کے انکار میں کچھ کہنے سے قبل ہی وہ دوسری کرسی کی طرف بڑھے اور سائیڈ میں رکھے گملے سے ٹکرائے۔ چنداماما کی حرکتیں مجھے ''حسینہ معین'' کے ''قباچہ'' کی یاد دلا رہی تھیں۔ چلو وہ تو قباچہ تھا یہ تو حسن منیر، بے حد ہینڈسم، کوالیفائیڈ اور اعلیٰ سرکاری افسر تھے۔ یہ حرکتیں کرتے وہ اچھے تو نہیں لگ رہے تھے۔ واقعی عشق اچھے اچھوں کے دماغ میں خلل ڈال کر بندے سے عجوبہ حرکتیں کروانے لگتا ہے۔ میں ایک دم اٹھ کر لاؤنج میں اس طرح گئی تھی جیسے کوئی کام یاد آ گیا ہو، دو تین منٹ تک لاؤنج میں یونہی بیٹھے رہنے کے بعد میں نے چنداماما کو آواز لگائی تھی۔

''آپ کا فون ہے۔''

وہ اندر آئے تو میں صوفے پر سے اٹھ کر غصے میں بولی۔

''کیا کر رہے ہیں آپ چنداماما! سارا بنا بنایا امپریشن خراب کروائیں گے۔ میں نے اس کے سامنے آپ کی کتنی تعریفیں کی تھیں کہ میرے ماما بہت سوبر اور کم گو ہیں، کسی سے بھی جلدی بے تکلف نہیں ہوتے، اگر کوئی ان کے معیار پر پورا اترتا ہے تو بات کرتے ہیں ورنہ چپ بیٹھے رہتے ہیں اور آپ قباچہ اور حسنات بھائی بن رہے ہیں۔''

چنداماما کھسیا کر سر کھجاتے ہوئے بولے۔

''یار بھانجی! اچانک خوشی برداشت نہیں ہو رہی تھی، چلو اب پرامس بالکل سیریس رہوں گا۔''

''اور اس سے زیادہ بات بھی مت کیجیے گا۔ لڑکیاں ایسے مردوں کی طرف زیادہ اٹریکٹ ہوتی ہیں جو انہیں نظر انداز کریں اور جن میں اکڑ اور غرور نظر آتا ہو۔''

میں نے چنداماما کو گر کی باتیں بتائی تھیں۔ وہ میرے مشوروں پر ہنس رہے تھے۔ ہم دونوں ماموں بھانجی کی میٹنگ ختم ہوئی تو ہم واپس لان میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں چنداماما کے لیے بھی کپ میں چائے نکالنے لگی تو وہ بولے۔

''نہیں عرشی! آپ لوگ چائے پئیں، مجھے صالح کے ساتھ اسکواش کھیلنے جانا ہے۔''

ہفتے میں ایک دو بار وہ صالح بھائی کے ساتھ اسکواش کھیلنے جایا تو کرتے تھے مگر آج جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں مسکرادی تھی، چلو چندا ماما پر میری نصیحتوں کا کچھ تو اثر ہوا۔ وہ اندر سے اپنا ریکٹ اٹھا کر گھماتے ہوئے پورٹیکو کی طرف بڑھ گئے اور ہمیں وہیں سے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ دیا۔

رات کو میں اور چندا ماما نگی آنٹی، فیصل اور سعدیہ کے ساتھ چیٹنگ کر رہے تھے۔ تین سال قبل ہی نگی آنٹی کی فیملی امریکہ شفٹ ہوگئی تھی۔ پتا نہیں یہ سارے پاکستانیوں کو امریکہ اور کینیڈا کا کیا خبط سوار ہوا ہے۔ لگتا ہے کچھ عرصے بعد ساری عوام امریکہ اور کینیڈا منتقل ہو جائے گی اور پاکستان میں صرف خالی خزانے کا رونا رونے والے حکمران ہی رہ جائیں گے۔ ان لوگوں کے ساتھ چیٹنگ کرتے ہوئے مجھے اچانک ہی رضا کا خیال آیا تھا۔

''کیسا سب کے سامنے معصوم بنتا تھا، نیک، شریف اور پڑھاکو۔ ممی بھی کہہ رہی تھیں کہ آج کل اتنے شریف لڑکے کہاں ہوتے ہیں۔ ٹی وی پر بھی سوائے اسپورٹس اور منتخب اور معیاری فلموں کے کچھ نہیں دیکھتا اور انٹرنیٹ پر بھی صرف اچھی اچھی معلوماتی سائٹس پر جاتا ہے۔ ممی نے ایک دو بار اسے اسی کے گھر پر انٹرنیٹ پر اس کا کوئی اسائنمنٹ بناتے ہوئے دیکھا تھا۔ اپنے اسائنمنٹ کے لیے معلومات اکٹھی کر کے وہ مختلف چیزیں ڈاؤن لوڈ بھی کر رہا تھا۔ واہ رے ممی کی سادگی انہیں یہ نہیں پتا کی موصوف چیٹنگ کے لیے کیفے جاتے ہیں۔ گھر پر معیز بھائی کے ہوتے ہوئے وہ چیٹنگ کر سکتا ہے اور تو اور اس نے بلال کو بھی اپنی لائن پر لگا لیا تھا۔ آنے سے ایک روز پہلے میں نے بلال کو اس کے کسی دوست سے فون پر باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔

''ہاں یار! سات بجے کیفے پر ملنا ہے۔ ہاں رضا بھائی بھی وہیں ہوں گے۔ نہیں بس شاہین سے تو میں بور ہو گیا، پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔''

وہ اور بھی پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ چلو جی بی مینڈ کی کو بھی زکام ہوا۔ پندرہ سالہ بلال نیٹ پر عشق لڑانے کے قابل تو ہو گئے۔ خود تو بگڑا ہوا تھا ہی میرے بھائی کو بھی خراب کر رہا ہے۔ میں نے جل کر سوچا تھا۔ اس وقت تو چندا ماما کی پریشانی میں میں ممی سے شکایت نہیں کر سکی تھی اب ارادہ تھا کہ جاتے ہی ممی اور عفت آنٹی دونوں سے شکایت کروں گی۔ ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی بیل بجی۔ میں نے اٹھ کر فون اٹینڈ کیا تو دوسری طرف جنید جمشید تھا۔

''نہ تو آئے گی نہ ہی چین آئے گا۔''

جنید جمشید کی سریلی آواز کی لے میں ایک پل کو تو میں کھو گئی پھر جیسے ہی خیال آیا فوراً نمبر پر نظریں دوڑائیں کہ کون کر رہا ہے۔ خیال تھا کہ میری کوئی سی چھچھوری دوست یا بہن بھائی ہوگا مگر ٹیلی فون اسکرین میں لکھا نمبر ان میں سے کسی کا بھی نہیں تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا موبائل سے فون کر رہا تھا۔ میں نے بغیر کچھ کہے ریسیور واپس رکھ دیا تھا۔

''کس کا تھا؟'' نگی آنٹی کی باتوں کا جواب ٹائپ کرتے چندا ماما نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

''پتا نہیں لائن کلیئر نہیں تھی، صحیح سے آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔''

میں نے فوراً جھوٹ بولا تھا۔ ایک تو ہمارے خاندان کے مردوں میں اور کچھ ہے یا نہیں انتہا پسندی کی حد تک غیرت ضرور موجود ہے اور یہ

چنداماما تو سب سے سوا ہیں۔ ان کی انتہا پسندی کا بیّن ثبوت تو وہ مشہور واقعہ ہے جو میرا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا ہے۔ بہت سال پہلے کی بات ہے تب شاید میں آٹھ نو سال کی تھی، ایک مرتبہ چنداماما نگی آنٹی کو ان کے کوچنگ سینٹر چھوڑنے جا رہے تھے جو نانی کے گھر سے قریب ہی تھا۔ راستے میں کسی بے چارے کی کم بختی آئی اور اس نے یونہی تفریحاً نگی آنٹی کی دو چوٹیوں پر کوئی کمنٹس دے دیئے بس پھر تو چنداماما نے جب تک مار مار کر اس کی ایسی کی تیسی نہیں کر دی اس وقت تک رکے نہیں تھے۔ نگی آنٹی اور میں رو رو کر بے حال ہو گئے تھے اور یہ واقعہ اور اسی جیسے دوسرے کئی واقعات مجھ سے اس وقت بھی جھوٹ بلوا گئے تھے۔ پتا تھا نمبر تو سی ایل آئی کے ذریعے پہلے ہی ہمارے پاس آ ہی چکا ہے۔ وہ اس بے چارے کا جینا عذاب کر کے ہی دم لیں گے۔ کیا تھا بے چارہ معصوم مجھے جنید جمشید کا گانا ہی تو سنا رہا تھا اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔

☆

''پتا ہے عرشیہ! میرے ایک کزن ہیں بہت پڑھے لکھے، بہت جینئس اور کافی امیر اور اپنے اندر موجود اتنی ساری خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی زندگی سے نالاں رہتے ہیں۔ انہیں لوگوں سے شکوہ ہے۔ تقدیر سے شکایت ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ اتنا کوالیفائیڈ اور میچور شخص زندگی کی سچائیوں کا سامنا بہادری سے کرنے کے بجائے سب سے ناراض کیوں رہتا ہے۔''

گل رخ باتیں تو مجھ سے کر رہی تھی مگر کن اکھیوں سے چنداماما کی طرف اپنی باتوں کا اثر دیکھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ چنداماما تو میرے سمجھانے کے بعد گل رخ کے آنے پر اسے اچھا خاصا نظر انداز کرنے لگے تھے۔ صرف رسمی سی بات چیت کر کے وہ وہاں سے چلے جاتے تھے۔

آج چھٹی کا دن تھا اور وہ اسٹڈی میں بیٹھے Laptop (دستی کمپیوٹر) پر کچھ کام کر رہے تھے۔ گل رخ آئی تو مجھ سے بولی۔

''اس طرح تمہارے ماما کا مسئلہ کیسے حل ہوگا وہ تو ہاتھ لگتے ہی نہیں ہیں۔''

چار دن سے وہ لگاتار آ رہی تھی اور ماما سے اس کی بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ مجھے اس کی سادگی اور اپنے پروفیشن سے لگن پر بے اختیار پیار آ گیا تھا۔

''چنداماما! میں اور گل یہاں بیٹھ جائیں۔''

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسٹڈی میں آ گئی تھی۔ چنداماما نے سرسری نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر گردن ہلا دی تھی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ آخر ہیں ناں میرے ماما، ان کی شاندار ایکٹنگ پر تو مجھے بھی سچائی کا گمان ہو رہا تھا۔

''ان کے کوئی فرینڈز بھی نہیں ہیں۔ سب سے الگ تھلگ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ۔ بھئی میں تو یہ کہتی ہوں کہ جو گزر گیا سو گزر گیا۔ گیا وقت اب دوبارہ تو نہیں آئے گا۔ اس گزرے ہوئے وقت کی یادوں میں کھو کر ہم اپنا آج اور آنے والا کل کیوں خراب کریں۔ کیوں حسن! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔''

مجھ سے بات کرتے کرتے وہ اچانک چنداماما سے مخاطب ہوئی تھی۔ وہ بے چارے تو پہلے ہی اس ''داستانِ کزن'' کو اپنے کام میں مصروف ہونے کے باوجود بڑے تعجب سے سن رہے تھے۔ مزید حیرت انہیں اپنے مخاطب کیے جانے پر ہوئی تھی۔

''جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

انہوں نے مروت میں آکر یہ جواب دے تو دیا تھا مگر ان کی آنکھوں میں کچھ الجھن سی نظر آرہی تھی۔ گل رخ ان کے تاثرات کو اپنی باتوں کے مثبت اثر سے تعبیر کر کے ایک دم خوش ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید اس نے پتھر میں آتے ہی جونک لگا دی ہے۔

''اور تو اور وہ شادی کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔ بھئی اگر ایک عورت آپ کی زندگی میں بری آگئی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ دنیا کی تمام عورتیں خراب ہیں۔ اچھے برے کہاں نہیں ہوتے۔ کیا مرد سارے اچھے ہوتے ہیں۔ اچھائی برائی کو عورت اور مرد کے پیمانے میں نہیں تولا جاسکتا۔''

چنداماما اس کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے اس کی ذہنی حالت پر انہیں شبہ ہو اور وہ بے چاری جوشِ خطابت میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی۔ مجھ سے ہنسی روکنا دشوار تھا مگر ہنسی روکنی یوں ضروری تھی کہ اصلیت کھل جانے پر دونوں میں سے کسی ایک فریق نے بھی مجھے ہرگز نہیں چھوڑنا تھا۔ گل رخ کے جانے کے بعد میں کچن میں آکر رات کے کھانے کے لیے اپنا اور چنداماما کا فیوریٹ سلاد بنانے لگی تھی۔ بند گوبھی، سلاد کے پتے، گاجر، زیتون، مشروم، بھٹے کے دانے اور مرغی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو مکس کر کے ان میں مایونیز اور نمک ملا کر اپنی بنائی ہوئی یہ سلاد مجھے بھی بہت اچھی لگا کرتی تھی اور چائے کے بعد یہی وہ واحد ڈش تھی جو میں بہت اچھی بناتی تھی۔ کھانا تو خانساماں پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔

''یہ گل رخ کچھ کھسکی ہوئی سی نہیں ہے۔'' چنداماما کچن ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

میں نے بورڈ پر گاجروں کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے کرتے ہوئے ایک لمحے کو ان کی طرف دیکھا۔ وہ بغور میری طرف دیکھ رہے تھے یوں جیسے میرے چہرے کے تاثرات سے کوئی خاص بات اخذ کرنا چاہتے ہیں۔

''جی چنداماما!'' میں نے سعادت مندی سے ان کی بات کی تائید کی تو وہ اٹھ کر میرے پاس آتے ہوئے بولے۔

''کیا جی؟'' ان کا انداز خاصا مشکوک تھا۔ میں قصداً ان سے دو چار قدم پیچھے ہٹ گئی تاکہ کسی بھی ممکنہ حملے سے فوراً بچ سکوں۔ وہ جو اتنی دیر سے میرے ہر ہر ایکشن اور ایکسپریشن پر خاصی گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے ایک دم گہری سی سانس لے کر بولے۔

''اب کیا کر کے آئی ہو، صاف صاف خود ہی بتا دو۔''

''ایک تو چنداماما! آپ کا ضرورت سے زیادہ ذہین ہونا ہمیشہ مجھے نقصان پہنچاتا ہے۔ ٹھیک ہے بندے کو تھوڑا بہت جینئس ہونا چاہیے مگر اتنا زیادہ کہ اگلا بندہ اپنی کوئی بات خفیہ رکھ ہی نہ پائے۔''

میں نے خاصا چڑ کر کہا تھا۔ ظاہر ہے پھر مجھے انہیں الف سے لے کر ے تک تمام رام کہانی سنانی پڑی تھی۔ چنداماما کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرا سر پھاڑ دیں۔

''یہ تم میری مدد کر رہی ہو یا دوستی کی آڑ میں کب کی دشمنی نکال رہی ہو، نادان دوست اسے ہی کہا جاتا ہے۔ بجائے میرا کچھ اچھا امپریشن ڈالنے کے اس کے سامنے مجھے نفسیاتی مریض اور پاگل بتا رہی ہو۔'' وہ غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔

''نیکی برباد گناہ لازم۔ یہ تو وہی بات ہوگئی۔ اگر ایسا کچھ نہ کہتی تو وہ کبھی بھی ہمارے گھر نہ آتی۔ آپ کو نہیں پتا اس کے اوپر اپنے ابا جان کا

کتنا اثر ہے۔ مجھ سے دوستی کے باوجود بھی وہ یہاں آنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتی اگر میں اسے آپ کے نفسیاتی علاج کی ترغیب نہیں دیتی اور نفسیاتی بیماری تو ہمارے اردگرد کتنے لوگوں کو ہوتی ہے، ایسے لوگ پاگل تو نہیں کہلاتے۔ میں نے تو سوچا تھا اس طرح وہ روزانہ یہاں آیا کرے گی اور آپ لوگوں کو آپس میں بات چیت کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو وہ برا سا منہ بنا کر بولے۔

''اچھا اب رونے دھونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سوچا اور میں نے سمجھا۔ اگر تمہارے سوچنے اور تمہارے سمجھنے پر ہم لوگ چلنے لگے تو ہو گیا کام۔''

وہ پیر پٹختے ہوئے کچن سے چلے گئے تھے۔ چنداماما کی ناراضی میرے لیے سوہانِ روح تھی۔ بے اختیار میں وہیں کچن میں بیٹھ کر رونے لگی تھی۔

''رات کے کھانے کے لیے کیا پکا ہے؟'' چنداماما کی آواز پر میں نے روتے روتے سر اٹھایا تھا، وہ پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر اس میں جھانک رہے تھے۔

''مرغ چھولے۔'' میں نے دوپٹے سے ناک صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ رو رو کر برا حال ہو گیا تھا اور چنداماما، انہیں مجھ پر بالکل رحم نہیں آ رہا تھا۔

''چلو پھر بشیر سے کہو کھانا لگائے۔'' وہ میرے رونے کو خاطر میں لائے بغیر اپنے معمول کے انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

چنداماما! آپ کتنے برے ہیں، میں رو رہی ہوں اور آپ بجائے مجھے چپ کرانے کے کھانے کے غم میں مبتلا ہیں۔'' میں نے روتے ہوئے شکوہ کیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

''کیا شان ہے ملکہ عالیہ آپ کی۔ چٹ بھی میری پٹ بھی میری۔ واہ واہ سبحان اللہ۔ بائی داوے ہم دونوں میں سے ناراض کون تھا اور منانا کس کو تھا۔''

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرائے تھے۔ میں ایک پل کو تھوڑا سا شرمندہ ہوئی لیکن پھر فوراً ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''آپ نے مجھے ناراض کیا ہے اور اب آپ ہی منائیں گے بھی۔''

''وہ میرے مان بھرے انداز پر ہنس پڑے تھے۔ پھر کھانے کے بعد وہ مجھے باہر لے گئے تھے۔ ہم لوگوں نے لانگ ڈرائیونگ کا مزہ لیتے ہوئے ڈھیر ساری آئس کریم بھی کھائی۔ چنداماما کو میں نے یقین دلایا تھا کہ میری وجہ سے ان کا کام بگڑے گا نہیں بلکہ سنورے گا۔

☆

صبح میں اپنے اتنے دنوں کے معمول کے تحت گھر سے واک کے لیے نکلی تھی۔ اب تو یہ ہونے لگا تھا کہ میں گھر سے نکل کر ان کے گھر پر بیل کیا کرتی تھی یا پھر کبھی کبھی وہ خود ہی گیٹ پر میکس کی زنجیر تھامے میرے منتظر ہوتے تھے۔ آج بھی وہ اپنے گیٹ پر کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ روزانہ ان کی بور گفتگو ایک گھنٹہ تک سن کر میرے اوپر کیا گزرتی تھی یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ ان کی باتیں سننے کے لیے بہت سارا صبر، برداشت اور ہمت درکار تھی۔ پتا نہیں آنٹی اور گل رخ ان کو کیسے برداشت کرتی تھیں۔ مجھے تو صرف اور صرف چنداماما کی محبت یہ کڑوا گھونٹ پینے پر مجبور کر رہی تھی۔

ان کے گیٹ تک پہنچی تو اپنے پیچھے پیچھے چنداماما کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

''یا اللہ خیر اب کیا ہوگا۔'' اب جبکہ وہ آ چکے تھے میں انکل کے سامنے انہیں کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

''چنداماما بنا بنایا کام خراب کریں گے۔ کتنی محنت سے تمام حالات ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اور یہ میری محنت خاک میں ملانے چلے آئے۔ پتا بھی ہے وہ ان سے کتنا چڑتے ہیں۔''

میں چنداماما کی اس بے تکی حرکت پر جتنا بھی افسوس کرتی کم تھا۔ وہ چنداماما کے سلام کا خشک سے انداز میں جواب دے کر میرے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ چنداماما کو برداشت بھی وہ صرف میری وجہ سے کر رہے تھے ورنہ اتنے خطرناک بندے سے کسی بھی قسم کی مروت کی کوئی توقع رکھنا عبث ہے۔ چنداماما اپنے نظر انداز کیے جانے پر کسی بھی قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اتنے سکون سے واک کر رہے تھے کہ مجھے ان کے اطمینان پر رشک آنے لگا۔

''آج کل جس ٹٹ پونجیے کو دیکھو سول سروس میں چلا آ رہا ہے۔ ایک وقت تھا صرف اچھے گھرانوں کے ذہین اور قابل لوگ ہی سول سروس میں آیا کرتے تھے۔ دو چار کتابیں پڑھ کر خود کو بہت قابل سمجھتے ہیں، درحقیقت قابلیت کیا ہے صفر۔''

انہوں نے بڑے رعونت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ مجھے ان کی بات اور لہجہ دونوں ہی بہت برے لگے تھے۔ سمجھتے کیا ہیں بڑے میاں خود کو۔ ارے میرے چنداماما جیسا جینئس ٹیوب لائٹ لے کر بھی ڈھونڈیں تو نہیں ملے گا مگر چنداماما بڑے پرسکون تھے۔ پھر وہ چنداماما پر اپنی قابلیت کا رعب ڈالنے کے لیے مجھ سے ٹیگور اور ملٹن کی شاعری پر بات کرنے لگے۔ باتیں تو وہ روزانہ ہی اسی قسم کی کیا کرتے تھے مگر آج اس میں ضرورت سے زیادہ گہرائی اور فلسفیانہ رنگ چنداماما کو متاثر کرنے کے لیے شامل کیا گیا تھا۔

ادب کے معاملے میں میں خاصی بے ادب ہوں۔ انٹر میں بڑی مصیبتوں سے اردو لٹریچر اور انگلش لٹریچر ہضم کیا تھا۔ شعروں کی تشریح کرنا تو مجھے دنیا کا سب سے مشکل کام لگتا تھا اور اردو کے پیپر میں میں شعروں کی تشریح کچھ اس طرح کیا کرتی تھی کہ اگر شعر ہے۔

اے جوئے آب بڑھ کہ ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

تشریح یوں ہوتی تھی اس شعر میں حضرت علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اے جوئے آب آگے بڑھو چاہے دریا تند ہو چاہے تیز ہو اور اگر ساحل بھی تمہیں عطا کیا جائے تو اسے ہرگز قبول نہ کرنا۔ ملاحظہ کی آپ نے میری کی ہوئی تشریح۔ ہمیشہ لٹریچر ہی میری پرسنٹیج گرانے کا باعث بنتا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے آب کا مطلب تو پتا ہے۔ آب پانی کو کہتے ہیں ویسے یہ جوئے کیا ہوتا ہے؟ اور کوئی چاکلیٹ تو نہیں جو کسی کو عطا کی جا سکے، خیر مجھے کیا۔

انکل کے منہ سے صبح صبح اتنی ڈراؤنی باتیں سن کر میرا بی پی لو ہونے لگا تھا۔ دماغی کمزوری اور نقاہت محسوس ہونے لگی تھی مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب چنداماما ان کے ساتھ ٹیگور اور ملٹن پر بات کرنے لگے۔ صرف میں ہی کیا خود چنداماما کو بھی لٹریچر میں کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر اس وقت تو ان کی فراٹے سے چلتی زبان مجھے انگشت بدنداں والی کیفیت میں مبتلا کر گئی تھی۔

انکل کوانہوں نے چپ کروادیا تھااوراب مسلسل خود ہی بولے جارہے تھے، کبھی شیکسپیئر کے سانیٹ پر، کبھی اقبال کے فلسفۂ حیات پر، کبھی دانتے اور گوئٹے پر۔

''آپ اقبال اور گوئٹے میں سے بڑا شاعر کسے تسلیم کرتے ہیں؟''

بولتے بولتے انہوں نے انکل سے سوال کیا تھا پھران کے جواب میں کچھ کہنے سے قبل خود ہی دوبارہ شروع ہوگئے۔ اقبال اور گوئٹے کے بارے میں اپنی تفصیلی رائے کا اظہار کرنے کے بعد وہ غالب، اقبال اور فیض کے ادوار کا آپس میں موازنہ کرنے لگے تھے۔ میرا لوہوتابی پی مارے جوش کے ہائی ہونے لگا تھا۔ انکل کی ہونق شکل مجھے بے حد خوشی فراہم کررہی تھی۔ سمجھتے کیا ہیں یہ میرے چنداماما کو میں نے فخر سے سوچا تھا۔ فردوسی، حافظ، رومی اور سعدی میں نے تو ان میں سے بہت سے نام کبھی پہلے سنے بھی نہیں تھے اور چنداماما فارسی کے اشعار بھی اس طرح سنا رہے تھے جیسے یہ سب انہوں نے حفظ کر رکھے ہیں۔

چنداماما کی شاعری کی انتہا یہ تھی کہ اردو میں انہیں علامہ اقبال کی ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' اور حفیظ جالندھری کا ''پاک سر زمین شاد باد'' اور انگلش میں بابا بلیک شپ پوری یاد تھی اور اس وقت وہ انکل کے ساتھ ساتھ مجھے بھی سکتہ میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔

میر امّن کی باغ و بہار، رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب کا ذکر کرتے ہوئے دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کا تقابلی جائزہ پیش کرنے کے بعد وہ ادب کو چھوڑ کر کتوں کی تاریخ کی طرف آگئے تھے۔ یہاں انہوں نے تاریخ کے مشہور کتوں کا ذکر بڑی روانی سے کیا تھا اور اصحابِ کہف کے کتے سے لے کر مختلف مشہور لوگوں کے کتوں کا ذکر کرتے کرتے وہ کلنٹن کے کتے پر آکر چپ ہوئے تھے۔

ایک بیوروکریٹ دوسرے بیوروکریٹ کو کس طرح چاروں شانے چت کرتا ہے یہ نظارہ بھی آج میں نے دیکھ ہی لیا تھا۔ وہ جو اپنے سامنے کسی دوسرے کو قابل اور ذہین ماننے کو تیار ہی نہیں تھے عجیب ہونق نظروں سے چنداماما کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چنداماما اپنی ہر بات کے بعد یہ جملہ ضرور کہہ رہے تھے۔

''انکل! آپ کو تو یہ سب پتا ہی ہوگا، آفٹر آل آپ اتنے جینئس اور انٹلیکچوئل ہیں۔''

وہ بدقت تمام گردن ہلا پاتے تھے۔ چلو سیر کو سوا سیر تو ملا۔ میرا دل ان کی پسپائی پر بڑا خوش تھا۔ میں چنداماما کی اس کارکردگی پر جتنا بھی خوش ہوتی کم تھا۔ وہ جو چنداماما کو ایک لاابالی اور غیر ذمہ دار نوجوان سمجھتے تھے اب یقیناً اپنی رائے پر نظر ثانی ضرور کریں گے۔ گھر پہنچ کر میرے استفسار کے جواب میں وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے تھے۔

''ایک ہفتے سے اسی مہم پر لگا ہوا ہوں۔ لٹریچر میں انٹرسٹ نہیں تو کیا ہوا، جس طرح اسٹوڈنٹ لائف میں بہت سے سبجیکٹ ناپسند ہونے کے باوجود پڑھ لیا کرتے تھے، کیا اب اپنی دلچسپی کے بغیر کچھ پڑھ نہیں سکتے جبکہ یہ تو معاملہ بھی زندگی اور موت کا ہے۔''

مجھ سے ان کے بارے میں سن سن کر چنداماما نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ انہیں لٹریچر میں بہت زیادہ دلچسپی ہے اور ان کے بعد ان کا دوسرا پسندیدہ ترین موضوع ''کتے'' ہے۔ واقعی میرے چنداماما جینئس ہیں۔

''چنداماما! میں ابھی سے آپ کو اکیسویں، بائیسویں گریڈ کا آفیسر بنے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ آپ زندگی میں بہت ترقی کریں گے۔''
میرے کمنٹس پر انہوں نے لکھنوی انداز میں ''شکریہ، بندہ کس لائق ہے، آپ کی ذرہ نوازی ہے۔'' قسم کے جملے بولے تھے۔

''اب جیا نہ جائے، اب رہا نہ جائے
کوئی تو ہو جو آنکھوں سے اتر کر
چپکے سے دل میں بس جائے۔''

ریسیور کان سے لگاتے ہی پھر جنید جمشید کی خوبصورت آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ جب سے میں یہاں آئی تھی یہ غالباً اسی نوعیت کی دسویں کال تھی۔ ہر دفعہ فون کرنے والا میرے ہیلو کے جواب میں جنید جمشید کا کوئی نہ کوئی گانا لگا دیا کرتا تھا۔ مانا کہ میں جنید جمشید کی بہت بڑی فین ہوں۔ اس کے گانے خصوصاً ڈرائیونگ کے دوران تو میرے فیوریٹ ہوتے تھے مگر پھر بھی اس طرح فون کرنے والا کون تھا، میں تنگ آ گئی تھی۔ ہر بار میں بغیر کچھ کہے لائن ڈس کنیکٹ کر دیا کرتی تھی مگر آج میں رہ نہیں پائی تھی۔ مجھے اس ڈھیٹ اور سارے زمانے کے نکمے شخص پر بے پناہ غصہ چڑھ رہا تھا۔ خود تو فارغ ہے ہی دوسروں کو بھی اپنی طرح بے کار سمجھا ہوا ہے۔ میں نے جل کر سوچا تھا۔

''بھائی صاحب آپ کو میری پسند کا اتنا ہی خیال ہے تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ مجھے بذریعہ کوریئر سروس جنید جمشید کی تمام آڈیو کیسٹس اور تمام سی ڈیز بھجوا دیں۔ اس طرح آپ روز روز کی زحمت سے بھی بچ جائیں گے اور میں بھی جب چاہوں گی اپنی پسند کا گانا سن لیا کروں گی۔''

میں نے گہرے طنزیہ لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے ریسیور پٹخ دیا تھا۔

''منحوس، ڈھیٹ پتا نہیں کون ہے۔''

میں اس نادیدہ بندے کو خاصی دیر تک کوستی رہی تھی۔ دن میں تارے کیسے نظر آتے ہیں، چھکے کیسے چھوٹتے ہیں اور اوسان خطا ہونا اور حواس باختہ ہونا کیا ہوتا ہے یہ میری سمجھ میں اس وقت آیا جب میں نے اگلے روز جنید جمشید کی تمام آڈیو کیسٹس اور سی ڈیز سے بھرا ہوا پارسل وصول کیا۔ بھیجنے والے کا جو نام درج تھا اس نام کے کسی بندے کو میں دور دور تک نہیں جانتی تھی۔ کس سے کہوں، کیسے بتاؤں۔ میں بری طرح ڈر گئی تھی۔ اپنے اس گمنام عاشق سے مجھے خوف آ رہا تھا۔ چنداماما کو بتانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''چنداماما کا مسئلہ حل ہو اور میں یہاں سے فوراً بھاگ جاؤں۔'' میں نے ڈر کر جلدی سے سوچا تھا۔ بہر حال یہ ضرور ہوا تھا کہ اس پارسل کے بعد سے کوئی فون نہیں آیا تھا۔ ایک دو دن میں بہت ڈری پھر چنداماما اور گل رخ کے مسئلے میں لگ کر دوبارہ اس بات کی طرف سے اپنا دھیان ہٹا لیا تھا۔ گل رخ بے چاری بڑی تندہی سے چنداماما کا علاج کر رہی تھی اب تو وہ میرے بغیر اکیلے ہی چنداماما کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی رہتی تھی۔ میں انہیں پرائیویسی کا موقع فراہم کرتے ہوئے کبھی چائے بنانے اور کبھی کسی اور کام سے وہاں سے کھسک لیا کرتی تھی۔

اس روز بھی گل رخ لاؤنج میں بیٹھی چنداماما کو زندگی کی مختلف خوبصورتیوں کا احساس دلا رہی تھی۔ انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ دنیا بڑی ہی خوبصورت جگہ ہے اور ہماری زندگی بے حد قیمتی ہے۔ ہمیں اسے اچھے طریقے سے ہنستے مسکراتے گزارنا چاہیے۔

بے چارے چنداماما کے چہرے پر بڑے ہی قابل رحم تاثرات درج تھے۔ باہر اتنا اچھا موسم ہو رہا تھا۔ رم جھم برستے اس موسم میں تو اچھے خاصے خشک مزاج بندے کا بھی تھوڑا بہت رومینٹک ہونے کا دل چاہنے لگتا ہے اور چنداماما تو تھے ہی عاشق مزاج، ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ احمق ان کے چہرے پر پھیلے رنگوں کو دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ اپنی باتوں کی دھن میں اسے ان کی نظروں کی وارفتگی کا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔

میں کچن میں پائن ایپل شیک بناتے ہوئے اس سچویشن سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ مجھے ماما کی حالت زار اور گل کی بے نیازی دیکھ کر بے اختیار فرسٹ ایئر کی اردو میں پڑھا ایک شعر یاد آ گیا تھا اور یہ واحد شعر تھا جس کا مطلب بھی میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ شعر یاد آنے کی دیر تھی میرے لب کسی شرارت کا سوچ کر مسکرانے لگے تھے۔ ٹرے میں تینوں گلاس رکھ کر لاؤنج میں لاتے ہوئے میں با آواز بلند گنگنائی تھی۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

جانے نہ جانے ''گل'' ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

گل رخ نے تو میری گنگناہٹ کا کچھ خاص نوٹس نہیں لیا تھا جبکہ چنداماما نے مجھے گھور کر دیکھا تھا۔ میں ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے دوبارہ گنگنائی تھی۔

''جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے''۔ میں نے ''گل'' پر خاص طور پر کافی زور دیا تھا۔

اب کی بار گل رخ نے بھی قدرے تعجب سے میری طرف دیکھا تھا جبکہ چنداماما نے دانت پیستے ہوئے میری طرف غصے سے دیکھا تھا۔ گل رخ کے جانے کے بعد چنداماما نے میرے اوپر بگڑنا شروع کیا تو میں لاپروائی سے ہنستی رہی تھی۔

''حد ہے بیہودگی کی۔'' وہ جل کر بولے تھے۔

''اساتذہ کا کلام آپ کو بیہودگی نظر آ رہی ہے۔

کچھ پتا ہے اردو ادب کی شان ہے یہ شعر۔ پتا پتا اور بوٹا بوٹا کی کتنی خوبصورت تکرار ہے۔ کتنا ردھم ہے اس شعر میں کتنی روانی ہے۔'' میں نے اپنے نوٹس میں جو کچھ رٹا تھا وہ بولنا شروع کیا تو چنداماما نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے میرے سر پر ایک عدد چپت رسید کی تھی جو میں نے بڑی خندہ پیشانی سے وصول کی تھی۔

☆

سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک اور میری پلاننگ کے عین مطابق جا رہا تھا کہ نانی کی اچانک آمد نے مجھے اور چنداماما دونوں ہی کو بوکھلا دیا۔ اپنی آمد کی پیشگی اطلاع دیئے بغیر وہ اچانک آ کر ہمیں پریشان کر گئی تھیں۔ نانی کے آنے سے سارا بنا بنایا کھیل بگڑنے کا خدشہ تھا۔ اگر گل رخ کو یہ پتا چل گیا کہ میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا تو وہ تو بری طرح ناراض ہو جائے گی۔ میں نے سوچا کہ چنداماما کا علاج کرتے کرتے جب وہ خود ''مریض بن جائے گی پھر اسے ساری بات صاف صاف بتا دوں گی مگر یہاں تو سب کچھ چوپٹ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی گل رخ کو کوئی بہانا بنا کر آج آنے سے منع کر دوں کہ وہ چلی آئی۔ لاؤنج میں میں، چنداماما اور نانی بیٹھے ہوئے

تھے۔ وہ بے تکلفی سے گھس کر اندر آ گئی تھی۔ نانی نے گلاسز ناک کے اوپر سیٹ کرتے ہوئے اس کا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیا تھا۔ گل رخ بھی نانی کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''نانی! یہ گل رخ ہے میری اس سے بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے اور گل! یہ میری نانی ہیں۔'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل تعارف کروایا تھا۔

''ظالم'' اور ''سوتیلی'' نانی سے تعارف حاصل کر کے گل رخ نے بہت سڑا ہوا منہ بنا کر انہیں سلام کیا تھا، ایسے جیسے لٹھ ماری ہو۔

چنداماما نے میری طرف بڑے غصے سے دیکھا تھا۔ ''دیکھ لیا اپنی بے تکی حرکتوں کا نتیجہ'' وہ آنکھوں آنکھوں میں مجھ سے مخاطب تھے۔

گل رخ نانی کو نظر انداز کر کے میرے برابر میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگی تھی اور میرے دل کی دھڑکن خطرناک ہو رہی تھی۔ گل رخ حماقت کی حد تک سیدھی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ نانی کو ایسا ویسا کچھ بول دے۔ میرے منہ سے ان کے ظلم کے قصے سن سن کر وہ ان سے غائبانہ چڑنے لگی تھی۔

چنداماما گاڑی کی چابی اٹھا کر نانی سے بولے۔

''اماں! میں صالح کی طرف جا رہا ہوں۔'' غالباً وہ اپنی اولین محبت کا عبرت ناک انجام دیکھنے سے بچنے کی خاطر گھر سے فرار ہو رہے تھے۔

''زیادہ دیر مت لگا دینا، ہم کھانے پر انتظار ہی کرتے رہ جائیں، میں تمہارے لیے اپنے ہاتھوں سے چانپوں کی بریانی بنا رہی ہوں۔ باہر کچھ الٹا سیدھا کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

ان کے انداز میں ممتا بھرا تحکم موجود تھا اور گل رخ سوتیلی ماں کے التفات پر کچھ متعجب سی بیٹھی ہوئی تھی۔ چنداماما سر ہلاتے ہوئے چلے گئے تھے۔

''نانی! پتا ہے گل رخ بھی کھانا بہت اچھا پکاتی ہے۔''

میں نے ان دونوں کے درمیان خوشگوار فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نانی ''ہوں'' کر کے خاموش ہوگئی تھیں۔ یا اللہ رحم! یہ ساس بہو میں تو پہلے ہی سے پاک بھارت کشیدگی پیدا ہو رہی ہے۔ میں نے دہل کر سوچا۔

''اور بی بی! تمہارے باوا کیا کرتے ہیں۔'' جب نانی کو کسی کا نام نہیں آتا تھا تو وہ اسے بی بی اور میاں کر کے مخاطب کیا کرتی تھیں اور گل رخ کی کینہ توز نظریں تو انہیں سخت طیش دلا رہی تھیں۔

گل رخ نے بھی تپے تپے انداز میں اپنے باوا سے متعلق معلومات ان کے گوش گزار کر دی تھیں۔ میں نے اچھا خاصا پاکستانی چینل جس پر ''بلب'' لگانا سکھا رہے تھے چینج کر کے ایم ٹی وی لگا دیا۔ پتا تھا اس پر آتی بے حیائی دیکھ کر وہ میرے اوپر چڑھ دوڑیں گی اور گل رخ سے ان کا دھیان خود بخود ہٹ جائے گا۔

''یہ کیا لگایا ہے عرشی! کچھ شرم ہے آنکھوں میں کہ نہیں، حد ہے بے شرمی کی۔'' وہ غضب ناک ہوئی تھیں۔

''ہاں آپ کو تو وہی اپنے زمانے کی فلمیں اور گانے اچھے لگتے ہیں جن میں ہیرو شیروانی پہن کر سر پر جناح کیپ اور آنکھوں میں ڈھیر سارا سرمہ لگائے ہیروئن سے کم سے کم بھی دو فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوتا ہے اور ہیروئن فرشی غرارہ پہنے ''او مینا نجانے کیا ہو گیا۔'' یا اسی قسم کا کوئی اور گانا

غرارے کو پکڑ پکڑ کر گا رہی ہوتی ہے، ڈانس بھی سارا غرارے کی مدد سے ہوتا ہے۔''

گل رخ میری باتوں پر سر جھکا کر ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگی تھی جبکہ نانی گل رخ کے لحاظ میں چپ تو ہو گئی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں غصہ اور کوفت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ گل رخ سے ہٹ کر اب وہ میرے بارے میں سوچنے لگی تھیں۔

''اس لڑکی کا کیا ہوگا، پتا نہیں یونیورسٹی جا کر یہ کیا گل کھلائے گی۔''

میں ان کی نظروں میں اپنے لیے تفکر دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ گل رخ مزید دس پندرہ منٹ بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ رات تک تو انہیں گل رخ کا بالکل بھی خیال نہیں آیا تھا، پہلے وہ میرے غم میں اور اس کے بعد چاچوں کی بریانی کے غم میں مبتلا رہی تھیں۔

رات میں سونے کے لیے نانی کے برابر میں آ کر دھم سے لیٹی تو انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا تھا۔

''اور اتنے کمرے خالی ہیں، کہیں اور سو جا کر۔'' وہ ناپسندیدگی سے میری طرف دیکھ کر بولی تھیں۔

''نانی! آپ تو سچ مچ میری سوتیلی نانی لگ رہی ہیں۔'' میں لاڈ سے ان کے ہاتھ پر سر رکھ کر لیٹتے ہوئے بولی تھی۔

''کیا مطلب؟'' انہوں نے مجھے گھورا۔ میں نے ان کا سوال نظر انداز کر کے اپنی بات شروع کی۔

''نانی! آپ کو گل رخ کیسی لگی۔''

''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے سرسری سا جواب دیا تھا۔

''نانی! صرف ٹھیک نہیں بہت اچھی ہے، ایسی بہوؤں کی تو ساسیں آرزو کرتی ہیں، وہ اتنی سیدھی اور بے وقوف ہے کہ حد نہیں، آپ جیسے چاہیں اس کے ساتھ سلوک کیجئے گا وہ اف تک نہیں کرے گی۔''

میں نے اس کی تعریفوں کا سلسلہ شروع کیا تو نانی میرے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالتے ہوئے بولیں۔

''کس نے بھیجا ہے تمہیں حسن نے؟'' ان کے انداز میں پولیس آفیسرز والا تفتیشی عنصر غالب تھا۔

''نانی پلیز'' اب آپ روایتی ساسوں کی طرح اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ مت بنا لیجئے گا کہ میرے بیٹے کو پھانس لیا، اس پر ڈورے ڈالے وغیرہ وغیرہ۔ ذرا سوچیں آپ کو بھی تو نانا جان نے پسند کر کے ہی شادی کی تھی۔ اگر اس روز آپ کا دوپٹہ مہندی کے تھال میں لگی موم بتی پر نہ گرتا اور نانا جان فوراً آگے بڑھ کر آگ نہ بجھاتے تو آج آپ کے بجائے پروین خاتون ہماری نانی ہوتیں جن سے نانا جان کی نسبت طے تھی مگر وہ آپ کے آنچل کی آگ بجھاتے بجھاتے اپنے دل میں آپ کے پیار کی آگ جلا چکے تھے۔'' میری تقریر جاری تھی کہ نانی کا زوردار ہاتھ کندھے پر پڑا تھا، میں تکلیف سے بلبلا کر رہ گئی تھی۔

''بے ہودہ، بدتمیز۔'' وہ سخت غصے میں مجھے گھور رہی تھیں۔

نانی کا چہرہ ایک دم سرخ پڑ گیا تھا۔ اس طرح شرماتی ہوئی نانی کتنی پیاری لگ رہی تھیں۔ میں ہنس پڑی تھی۔ نانی اور نانا جان کی عشقیہ داستان جو بس اس مختصر دوپٹے والے واقعہ پر مشتمل تھی مجھے ہمیشہ ہی مزہ دیا کرتی تھی۔ نانی ہمیشہ ہی اس بات پر سرخ پڑ جایا کرتی تھیں۔

''ذرا سوچیں، آپ کی ساس نے بھی تو بڑے دل کا ثبوت دیا تھا اور بیٹے کی پسند کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔ آپ کیا اس بات کو لے کر اسے ریجیکٹ کر دیں گی۔''

میرا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ اپنی مرحومہ ساس سے تو نانی کو ایسی ویسی نہیں ٹھیک ٹھاک پرخاش تھی اور آج بھی کسی معاملے میں اگر ان کا اپنی ساس سے موازنہ کیا جاتا تو وہ طیش میں آجاتی تھیں۔

اگلے روز میں نانی کو لے کر گل رخ کے گھر گئی تھی۔ چنداماما کو اس بارے میں میں نے کچھ نہیں بتایا تھا وہ تو سمجھ رہے تھے کہ ان کی لواسٹوری کا دردناک انجام ہو چکا۔ میں نانی کو جان کر صبح کے وقت لے کر گئی تھی پتا تھا اس وقت گل رخ یونیورسٹی گئی ہوگی۔ اس کی ممی نانی کو اچھی لگی تھیں۔ یہ تو ہم نانی نواسی طے کر کے گئے تھے کہ ابھی رشتے کی بات نہیں کرنی، صرف نانی ان سے مل کر اور ان کے گھرانے کا جائزہ لے کر آجائیں گی۔

نانی کے تاثرات سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ انہیں گل رخ کے گھر کا ماحول اور خاص طور پر اس کی ممی بہت پسند آئی ہیں۔ میری آمد کی اطلاع پا کر انکل بھی اسٹڈی سے نکل کر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ باتیں ان کی وہی تھیں۔ آج وہ گلیلیو، آئن اسٹائن اور نیوٹن کی ارواح کو ایصالِ ثواب پہنچانے کے موڈ میں تھے۔ گھر واپس آکر میں نے نانی سے ان کی رائے جاننی چاہی تو وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

''باقی سب تو ٹھیک ہے، گھرانہ بھی معزز ہے، خاندانی لوگ ہیں، ماں بھی سلجھی ہوئی ہے مگر وہ خبطی..... بابا۔ کیا پتا بیٹی بھی ایسی ہی پاگلوں والی باتیں کرتی ہو۔''

''نانی! آپ ہی تو کہا کرتی ہیں کہ ''جیسی ماں ویسی بیٹی۔'' شادی کے وقت لڑکی کو نہیں اس کی ماں کو دیکھنا چاہیے اور اس کی ممی تو آپ کو اچھی لگی ہیں۔ پلیز نانی مان جائیں نا۔'' میں نے لجاجت سے کہا تھا۔ چنداماما کا مقدمہ مجھے ہر صورت جیتنا تھا۔

''اچھا مجھے سوچنے دو۔ شادی بیاہ کا معاملہ ہے، کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں۔ حسن سے بات کروں گی پھر تمہاری ماں اور خالاؤں سے فون پر مشورہ کروں گی اس کے بعد ہی فیصلہ ہوگا۔''

نانی نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

☆

ہوئے تم دوست جس کے
دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

گل رخ نے فون پر بڑے تپے ہوئے انداز میں مجھ سے کہا تھا۔ نانی فون پر سب سے صلاح مشورے کے بعد باقاعدہ رشتہ لے کر جا چکی تھیں اور آنٹی انکل نے سوچنے کا وقت مانگا تھا۔

''سب ڈرامے ہیں یہ سوچنے کا وقت، میرے بیٹے کو کوئی انکار کر سکتا ہے۔''

نانی واپس آکر فخریہ انداز میں بولیں تو میں اور ماما ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ اگر میں یہاں نہ آتی اور انکل سے راہ و رسم نہ بڑھاتی پھر

دیکھتیں نانی ان کے بیٹے کو انکار کیسے ہوتا ہے۔ ان خرانٹ انکل سے تو کوئی بعید نہ تھا کہ وہ یہ جان کر کہ نانی اسی بے ہودہ لڑکے کی والدہ ہیں جس نے ان کے میکس کی جان لینی چاہی تھی اسی وقت کھڑے کھڑے نانی کو اپنے گھر سے نکال دیتے۔

چنداماما بہر حال میری صلاحیتوں کے معترف تھے۔ ان کے اس تعریفی جملے ''جس کی تمہاری جیسی بھانجی ہو اسے فکر کی کیا ضرورت ہے۔'' نے میرا سیروں خون بڑھا دیا تھا۔

گل رخ ظاہر ہے آخر کار ساری بات سمجھ ہی گئی تھی اور رات میں فون کر کے اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔

''یار گل! میں کیا کرتی میرا ماما تم پر دل و جان سے فدا ہو گیا تھا اور تم ایک دم بے وقوف، میں کرتی تو کیا کرتی۔ تم دونوں کو ملوانے کے لیے یہ معصوم سا جھوٹ بولا تھا میں نے۔'' میں اس کے غصے کے جواب میں لجاجت سے بولی تھی۔

''پہلی ہی مرتبہ سب کچھ صحیح صحیح بتا دیتیں تو میں تمہیں کھا تو نہیں جاتی اور میں کتنی پاگل ہوں تمہاری مکاری میری سمجھ میں آئی ہی نہیں۔ وہ تو اس دن جب تم گل ہی نہ جانے کا ورد کر رہی تھیں تو میں ٹھٹکی تھی۔ اس عمر میں یہ حال ہے عرشیہ! تم آگے جا کر تو اچھے اچھوں کے کان کاٹا کرو گی۔''

میں اپنے بارے میں اس کے ''تعریفی الفاظ'' پر ہنس دی تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ، تمہیں میرے ماما اچھے لگتے ہیں نا؟''

میں مطلب کی بات پر آ گئی تھی۔

''تمہیں کیوں بتاؤں، ان سے کہو کچھ خود بھی کر لیں، کیا ہر کام ہی بھانجی سے کروائیں گے۔''

وہ کچھ شرماتے ہوئے بولی تھی اور میں اس کے ''ان'' سے ہی سمجھ گئی تھی ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔'' فون رکھ کر میں چنداماما کو حرف بہ حرف ساری رپورٹنگ کر دی تو وہ پتا نہیں کیا سوچ کر مسکرا دیئے تھے۔

اب چنداماما کے کمرے میں اقبال بانو، فریدہ خانم اور غلام علی کی جگہ علی حیدر کا ''چاند سا مکھڑا اترا ہے من میں'' اور منی بیگم کا ''ہاتھ دیا اس نے میرے ہاتھ میں'' کثرت سے بجنے لگا تھا۔

شکر ہے چنداماما کا مسئلہ تو حل ہوا، میں نے طمانیت سے سوچا تھا۔ نانی اور میں گل رخ کے گھر مٹھائی لے جا کر منہ میٹھا کروا کر آ گئے تھے۔ باقاعدہ رسم اگلے ماہ پوری دھوم دھام سے ہونی تھی۔ میں نے تو حقِ دوستی اور ''فرضِ بھانجی'' ادا کرتے ہوئے ان دونوں کی ملاقات کا اہتمام کروانا چاہا تھا مگر گل رخ کو شرمانے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ ''ان'' سے فون پر بات کر لیا کرتی تھی۔ پتا نہیں یہ لڑکیاں شرما کیسے لیتی ہیں۔ میں تو اپنے ''ان'' سے کبھی بھی نہ شرماؤں، ہو سکتا ہے وہ مجھ سے شرمایا کریں۔ میں نے سوچا تھا۔

ممی کا کئی بار فون آ چکا تھا کہ بہت دن رہ لیں واپس آ جاؤ۔ میری کلاسز بھی شروع ہونے والی تھیں۔ نانی تو بات پکی کر کے فوراً ہی واپس چلی گئی تھیں۔ چنداماما کا دل نہیں چاہ رہا تھا مجھے بھیجنے کو اور میں خود کون سا جانا چاہ رہی تھی۔ یہاں اتنا مزہ آ رہا تھا مگر جانا تو تھا ہی۔ فی الحال تو میں نے ممی سے دو چار دن مزید رکنے کی مہلت لے لی تھی۔

کافی دن ہو گئے تھے میں نے اپنی ای میلز چیک نہیں کی تھیں۔ فرحین، زارا اور اپنی تمام فرینڈز کے ساتھ ساتھ میں نے ندا اور بلال وغیرہ کو بھی E-Mails بھیجی تھیں۔ ان کا جواب آیا یا نہیں یہی دیکھنے کے لیے میں کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گئی۔ اپنے نام آئی ہوئی تمام E-Mails پر نظریں دوڑائیں تو زارا وغیرہ کی E-Mails تو تھیں ہی لیکن ایک عجیب و غریب Message بھی تھا۔ "Attention Miss Nedian"

میرا چونکنا بالکل فطری تھا۔ اس انوکھے پیغام پر میں نے باقی ساری ای میلز کو نظر انداز کر کے سب سے پہلے اسے ہی پڑھنے کا فیصلہ کیا۔

"Miss Nedian"

"I am Missing you, Raza Waqás"

(میں تمہاری کمی محسوس کر رہا ہوں، رضا وقاص)

میں ای میل پڑھ کر کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ رضا اور مجھے یاد کر رہا ہے۔ مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ پتا نہیں کیوں خوشی بھی ہو رہی تھی۔ اچانک میری سمجھ میں وہ گمنام کالز بھی آ گئیں اور آپ ہی آپ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ آپس کی بات ہے، اچھا تو وہ مجھے ہمیشہ ہی سے لگتا تھا بس میں یہ بات قبول نہیں کرتی تھی۔

''ہوں تو یہ قصہ ہے۔'' چنداماما میرے برابر والی چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولے تو میرے ہوش اڑ گئے۔

''رضا بہت کمینہ ہے، بہت برا ہے۔ آپ کے ساڑھے چار سو کا نقصان کر دیا تھا اور سب کے سامنے مذاق الگ اڑایا تھا۔''

وہ انگلیوں پر اس کی ایک ایک برائی جو میں نے انہیں بتائی تھی گنوا رہے تھے اور وہ جو میں کہتی تھی کہ پتا نہیں لڑکیاں شرماتی کیوں ہیں ایک دم اپنی سب کہی سنی بھلا کر سر جھکا گئی تھی۔ وہ میری حالت سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''اچھا تو این ای ڈی جانے کا اتنا کریز اس وجہ سے تھا۔'' وہ مجھے چھیڑ رہے تھے۔

''چنداماما! آپ مجھے نروس کر رہے ہیں۔'' میں ان کے کندھے پر سر رکھ کر پزل سی ہو کر بولی تھی۔

''کاش اماں یہاں ہوتیں تو اپنی نواسی کو شرماتا دیکھ کر ان کا کئی کلو خون بڑھ جاتا۔ جاتے وقت بھی مجھ سے کہہ رہی تھیں پتا نہیں اس لڑکی سے تو دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔'' وہ نانی کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے بولے تھے۔

''چلو اب تم کراچی کی تیاری پکڑو۔ پیچھے پیچھے میں بھی آ رہا ہوں۔ میری بھانجی نے میرا اتنا ساتھ دیا ہے تو آخر میرا بھی فرض بنتا ہے اس کی مدد کروں۔'' وہ میری پونی کھینچتے ہوئے بولے تھے۔

''میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ نہ تو میرے سسر خبطی ہیں اور نہ ہی انہوں نے کوئی کتا پال رکھا ہے۔''

بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا اور چنداماما کے بلند و بالا قہقہے نے مجھے غور کرنے پر مجبور کیا کہ میں نے کہا کیا ہے تو میں سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگی تھی۔ ان کے قہقہے نے سیڑھیوں تک میرا پیچھا کیا تھا۔

❁.....❁

کچھ پاگل پاگل سے

ہنی کی کراچی آمد میرے لیے ایک بڑا ہی خوشگوار سرپرائز تھی۔ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے وہ اچانک ہی آ گئی تھیں حالانکہ پرسوں رات تو میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اور نیٹ پر چیٹنگ تو ہماری تقریباً ہر دوسرے روز ہو ہی جایا کرتی تھی مگر انہوں نے اپنے آنے کا سرسری سا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔

''پہلے سے بتا دیتی تو سرپرائز کہاں رہتا۔''

ہنی اور میں خالہ بھانجی سے زیادہ ایک دوسرے کی پکی دوست تھیں۔ ان کی عمر اور رشتے کی بڑائی کا جو واحد احترام میں کرتی وہ میرا انہیں ''آپ'' کہنا تھا۔ اس ''آپ'' کے سوا ہمارے درمیان کوئی ادب احترام اور کوئی تکلفات حائل نہیں تھے۔

ہماری اس درجہ بے تکلفی، قربت، دوستی کی بنیادی وجہ ہمارے مزاجوں کی انتہا سے زیادہ ہم آہنگی تھی۔ مثلاً بہت زیادہ باتونی میں بھی تھی اور ہنی بھی۔، فاسٹ فوڈز مجھے بھی بڑے مرغوب تھے اور ہنی کو بھی، فلمیں دیکھنے کا انتہا سے زیادہ شوق مجھے بھی تھا اور ہنی کو بھی، کچن کے کاموں سے میری بھی جان جاتی تھی اور ہنی کی بھی، گھومنے پھرنے اور ہلا گلا کرنے میں مجھے بھی مزا آتا تھا اور ہنی کو بھی، شاپنگ کرنے اور بازاروں میں مارے مارے پھرنے کی رسیا میں بھی تھی اور ہنی بھی، تیز آواز میں گانے سننا میں بھی پسند کرتی تھی اور ہنی بھی، فاسٹ ڈرائیونگ میں مجھے بھی مزا آتا تھا اور ہنی کو بھی۔ اس کے علاوہ بھی ہمارے بے شمار شوق اور دلچسپیاں ایک جیسی ہی تھیں۔

ہنی کا موٹو ''زندگی زندہ دلی کا نام ہے'' تھا اور مجھے ان کے اس نظریہ سے پورا پورا اتفاق تھا۔

ہنی کی کراچی آمد کئی سالوں بعد ہوئی تھی۔ کئی سالوں بعد یوں کہ میں خود اتنی جلدی جلدی اسلام آباد اپنی ننھیال چلی جایا کرتی تھی کہ پھر وہاں سے کسی کی آمد کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ نانی کے گھر جلدی جلدی جانے کی سب سے بڑی وجہ تو خود ہنی تھی اور ویسے میری اپنی نانی سے بھی کافی بنتی تھی۔ نانی میرے لاڈ بہت اٹھاتی تھیں، اس لیے وہاں جانے میں مزا آتا ہی تھا۔ دادی کہتی تھیں، مجھے بگاڑنے میں سو فیصد ہاتھ میرے ننھیال والوں کا ہے۔ پتا نہیں مجھ جیسی معصوم اور سیدھی ''بچی'' انہیں بگڑی ہوئی کہاں سے نظر آتی تھی۔ ہاں تو میں کیا بات کر رہی تھی۔ یاد آیا ہنی کی آمد کے بارے میں۔ (عادت سے مجبور ہوں نا، مختصر بات نہیں کی جاتی)

ہنی خاص طور پر ہم لوگوں سے ملنے نہیں بلکہ اپنے ہیڈ آفس کسی کام کے سلسلے میں آئی تھیں۔ یہ کام کتنے روز تک چلنا تھا ابھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ ویسے اندازہ یہی تھا کہ مہینہ، ڈیڑھ مہینہ تو لازمی کراچی میں رکیں گی۔

آنے کے بعد سب سے ملنے ملانے اور تحفے تحائف کا تبادلہ کرنے کے بعد ہنی اپنے آفس روانہ ہوئیں تو کہیں گھومنے پھرنے کے لیے

نکلنے والا میرا پروگرام اپنی موت آپ مر گیا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ اب تو دوپہر ہو چکی ہے، وہ آفس کل سے جائیں گی مگر وائے افسوس۔ میں اسی غم میں منہ لٹکا کر بیٹھی تھی کہ ہنی سے ڈھنگ سے باتیں نہیں کر پائی اور یہ کہ وہ تو روز ہی اس طرح صبح سے شام تک آفس میں مصروف رہا کریں گی پھر ہمیں گپیں مارنے کا ٹائم تو مل جائے گا مگر گھومنا پھرنا، شاپنگ، موج مستی ہلا گلا، ان سب کا کیا ہوگا۔

میں یونہی منہ لٹکائے بیٹھی تھی کہ میری نگاہ اپنی والدہ ماجدہ کے فکرمند چہرے پر پڑی۔

''خیر تو ہے امی جان! یہ اتنے حسین چہرے پر تفکر کی اتنی موٹی موٹی لکیریں کیوں؟'' میں بوقت ضرورت امی کے ساتھ ''جان'' کا اضافہ کر لیا کرتی تھی۔ اس وقت یہ اضافہ یوں ہوا تھا کہ کچن میں بریانی اور چپلی کباب بننے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور میں ان تیاریوں سے باعزت بری ہو جانا چاہتی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' انہوں نے بے زاری سے میرے سوال کا جواب دیا اور تو اور مجھے کچن میں جانے کا نادر شاہی حکم بھی نہیں سنایا۔ امی اور مجھے کچن میں نہ دھکیلیں، یعنی مسئلہ واقعی گھمبیر تھا۔ کچن سے بچنے کا باعزت طریقہ پڑھائی میں مصروف ہو جانا ہوا کرتا تھا سو میں اسی میں مصروف ہو گئی۔ اگر یہاں وہاں پھرتے یا ٹی وی دیکھتے ہوئے جو کہیں دادی دیکھ لیتیں تو کام چوری پر ایک طویل لیکچر بلاوجہ مجھے سننا پڑ جاتا۔ ایسے ہر موقع پر جب مجھے کچن سے جان چھڑانی ہوتی، میرا مستقبل بعید میں کبھی نہ کبھی ہونے والا کوئی غیر اعلانیہ ٹیسٹ میری مدد کر دیا کرتا تھا۔

''میڈیکل کی مشکل پڑھائی ہے کوئی مذاق نہیں۔'' مجھے پڑھتے دیکھ کر امی تو امی دادی جیسی مطلق العنان شخصیت بھی خاموشی اختیار کر لیا کرتی تھیں۔

ہنی کی واپسی شام سات بجے ہوئی۔ مجھے ان سے باتیں کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ دادی اور امی ان سے باتوں میں مصروف تھیں۔ ابا اور میں اپنی باری کے انتظار میں خاموش بیٹھے تھے۔ دادی کو اسلام آباد اور راولپنڈی کے نجانے کن کن رشتہ داروں کی خیر و عافیت کی فکر تھی تو امی کو نانی اور دونوں ماموؤں کی تفصیلی خیریت معلوم کرنی تھی۔ ابھی دادی اور ابا یہاں موجود تھے، اگر وہ نہ ہوتے تو امی، ماموؤں سے بھی پہلے ماموں کی ''خیریت'' خالصتاً نندوں والے طنزیہ لہجے میں ضرور دریافت کرتیں۔ باوجود اس کے کہ ہنی امی کو ان کے مطلب کے جواب نہ دیتیں۔ انہیں اپنی بھابیوں میں کوئی خاص برائیاں نظر نہیں آتی تھیں جبکہ امی اور بڑی خالہ کو وہ اول درجہ کی چالاک اور میسنیاں لگا کرتی تھیں۔ ان کے بھائیوں کو قابو میں کر لیا۔ بھائی عید کے عید سلام دعا کے علاوہ بہنوں کی خیریت تک نہیں پوچھتے۔ ویسے اسی قسم کی شکایتیں پھپھو کو امی سے بھی تھیں بلکہ ہنی کا میری منگنی پر پہلا تبصرہ بھی یہی تھا کہ پھپھو مجھے اپنی بہو بنا کر ضرور امی سے سارے پرانے حساب کتاب کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

ابا اپنی باری کا انتظار کرتے کرتے اس خالص خواتینی گفتگو سے بیزار ہو کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اذان کے ساتھ ہی دادی بھی فوراً وہاں سے اٹھیں۔ وہ عشاء کی اذان کے ساتھ ہی فوراً نماز ادا کر لیا کرتی تھیں کہ اس کے بعد پھر انہیں پورے دو ڈھائی گھنٹے جم کر ٹی وی کے سامنے بیٹھنا اور ڈرامے دیکھنا ہوتا تھا۔ بقول امی کے اس عمر میں بھی مصلے پر ان کا زیادہ دل نہیں لگتا تھا۔ رات آٹھ بجے سے تقریباً گیارہ بجے تک کا ٹائم ہمارے ٹی وی لاؤنج میں اسٹار پلس کا ٹائم ہوا کرتا تھا۔ اگر کسی کو اس چینل پر کوئی اعتراض تھا اور وہ امی، ابا، ڈاکٹر چاچو اور خود دادی کیطرح اپنے کمروں میں ٹی وی

رکھتا تھا تو اپنی مرضی کے چینلز اپنے کمرے میں جا کر دیکھ سکتا تھا اور اگر میری طرح کا غریب مسکین تھا تو یا تو امی ابا کے بیڈ روم میں جا کر ٹی وی دیکھ لے یا پھر صبر شکر کر کے کس کی ساس نے کس کی بہو سے کیا کہا اور کس کی نند نے کس کی بھابھی سے کیا سنا قسم کے ڈرامے برداشت کرے۔

دادی کے جاتے ہی امی ہنی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''تم نے آخر کیا سوچا ہے ہانی! ہنی اپنے اصل نام ہانیہ بانو سے گھر میں بہت کم پکاری جاتی تھیں۔ انہیں تمام قریبی احباب ہانی کہتے تھے سوائے میرے جس نے بچپن ہی میں ہانی کے بجائے انہیں ہنی کہنا پسند کیا تھا اور پھر میری دیکھا دیکھی میرے تینوں چھوٹے بھائیوں نے بھی انہیں ہنی ہی کہنا شروع کر دیا تھا۔

''کس بارے میں اپیا! ہنی کو بھی اسٹار پلس پر چلنے والے انڈین سوپس بہت پسند تھے اور وہ اس وقت اسی نوعیت کا کوئی ڈرامہ دیکھنے میں محو تھیں۔

مجھ میں اور ہنی میں واحد اختلافی چیز یہی تھی۔ خود ان کا تو یہ حال تھا کہ اگر کسی وجہ سے کسی ڈرامہ کی کوئی قسط نہیں دیکھ پاتیں تو رات میں جاگ کر یا اگلے روز دوپہر میں جب وہ دوبارہ آتا تب دیکھا کرتیں۔

''تمہاری شادی کی بات کر رہی ہوں میں، آخر کب تک ایسے ہی پھرتی رہو گی۔ امی کو کتنی فکر ہے تمہاری شادی کی۔ اب اگر اللہ نے اچھی شکل دے دی ہے اور اچھے رشتے آئے چلے جا رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کچھ ہوش کے ناخن لو، تمہارے ساتھ کی سب لڑکیاں کب کی بیاہی گئیں۔ خود تمہاری سب دوست عرصہ ہوا اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ مجھے شینا ملی تھی تھوڑے دن پہلے ایک پارٹی میں، غضب خدا کا، تمہاری بچپن کی دوست چار بچوں کی ماں بن گئی اور.....''

''اب اگر اس کے سسرال میں فیملی پلاننگ کا نظریہ ابھی تک متعارف نہیں ہوا تو اس میں بھی کیا میرا قصور ہے؟''

ہنی نے امی کی بات کاٹ کر معصومیت سے پوچھا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آئی اور امی نے جھٹ مجھے گھور کر دیکھا۔ ''تم کیا یہاں بڑوں کے بیچ بیٹھ کر دانت نکال رہی ہو، جا کر کچن میں سلاد بناؤ، کام کی نہ کاج کی۔ کام کی بات آتے ہی کتابیں کھل جاتی ہیں اور جیسے ہی کام ختم ہوا کتابیں بھی بند۔''

امی نے ہنی پر آتا غصہ مجھ پر اتارا۔ امی اپنی مرضی اور موقع محل کے لحاظ سے میری چھوٹائی بڑائی میں تبدیلی کرتی رہتی تھیں۔ کبھی میں بہت چھوٹی ہو جاتی اور کبھی بہت بڑی۔

''بچی نہیں رہی ہو اب تم، تمہاری عمر میں میں تمہاری ماں بن چکی تھی۔''

(اگر نانی نے سولہ سال کی عمر میں بیٹی بیاہ دی اور سترہویں سال میں میں پیدا ہو گئی تو اس میں بھی میرا قصور تھا۔ ویسے ہماری نانی بھی عجب ہیں یا بہت جلدی کرتی ہیں یا بہت دیر۔ اگر وہ سولہ اور بتیس کا اوسط نکال لیتیں تو بیٹیوں کی شادی کی صحیح عمر نکل آتی پھر مجھے سولہ سال کی شادی اور سترہ سال میں ماں بننے کا طعنہ بھی نہ سننا پڑتا مگر کیا کریں، نانی کا حساب ہے ہی کمزور۔) میری چھوٹائی بڑائی میں تبدیلی والے اس من مانے اصول کی جیتی جاگتی مثال میری چھ ماہ قبل ہونے والی منگنی ہے۔ خیر اس منگنی کا قصہ میں ابھی کچھ دیر بعد آپ کو سناتی ہوں ذرا ہنی اور امی کی گفتگو کا باقی حصہ تو سن لوں۔

''کچھ خبر ہے تمہیں، شینا کی بڑی بیٹی چھٹی کلاس میں پڑھ رہی ہے۔ چھٹی کلاس کی بچی دس گیارہ سال کی تو لازمی ہوگی۔ دس سال کی بھی اگر اس کی بیٹی ہے تو اس کا مطلب ہے اس کی شادی کو کتنے سال ہو گئے ہوں گے؟''

پورے گیارہ سال ہوئے ہیں اپیا! اب ایسا اسلامی جمہوریہ پاکستان میں تو ہو نہیں سکتا کہ دس سال کی بیٹی ہو اور شادی کو آٹھ سال ہوئے ہوں۔''

ہنی اس وقت جان بوجھ کر امی کو زچ کر رہی تھیں۔ اپنی شادی کی بات پر وہ یونہی سامنے والے کو غصہ دلا کر بات ختم کروا دیا کرتی تھیں۔

''ہانی! میں بہت سیریس ہوں اور تمہارے یہ بیہودہ اور تھرڈ کلاس مذاق سننے کے موڈ میں قطعاً نہیں ہوں۔'' امی نے غضب ناک نگاہوں سے ہنی کو گھورا۔

''میں بھی سیریس ہوں اپیا! اور یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ شینا کی کس بات پر آپ کو اعتراض ہے۔ اس غریب کے چار بچوں پر، اس کی بڑی بیٹی کے دس سال کے ہونے پر یا چھٹی کلاس میں پڑھنے پر؟ اب پڑھے لکھے ماں باپ کی بیٹی ہے، کیا اسکول کا منہ بھی نہ دیکھے معصوم؟''

امی کے چہرے سے صاف ظاہر تھا وہ ہنی کا سر پھاڑ دینے کی اپنی سوچ کو کس مشکل سے عملی جامہ پہنانے سے روک رہی تھیں۔ میں کچن کے دروازے کے پاس کھڑی اس گفتگو کو انجوائے کر رہی تھی۔ امی غصے میں وہاں سے اٹھیں اور ہنی فوراً ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو کر ''یہ بچہ تمہارا ہی ہے گوپال!''، ''میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں رام۔'' قسم کا کوئی ڈائیلاگ سننے لگیں۔

''ان کمبختوں کے ہر دوسرے ڈرامے میں ساس بہو کے جھگڑے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ بچوں ہی کا ہوتا ہے۔''

یہ جملہ میرا نہیں امی کا تھا اور اکثر بہت جل کر اور چڑ کر دادی کو سنایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر چاچو کے بعد امی ہمارے گھر میں انڈین سوپس کی سب سے بڑی دشمن تھیں۔ دادی جتنی ان ڈراموں کی شائق تھیں، بہو اور چھوٹا بیٹا اتنے ہی بیزار۔

کھانے پر ہنی کی وجہ سے بریانی، چپلی کباب، قیمہ شملہ مرچ، فریش سلاد اور کیریمل کسٹرڈ کا اہتمام تھا۔ دیسی کھانوں میں بریانی میری اور ہنی کی فیورٹ تھی۔ ہنی، دادی اور خاص طور پر ڈاکٹر چاچو کی موجودگی کی وجہ سے تکلف برت رہی تھیں جبکہ میں بریانی پر ٹوٹ پڑی تھی۔ امی نے ہنی سے کچھ منہ پھلا رکھا تھا اور وہ ایسی معصوم بنی بیٹھی تھیں جیسے ان کی ناراضی نظر ہی نہ آتی ہو۔

''ہنی! آپ شادی سے اتنا بھاگتی کیوں ہیں؟''

ہم دونوں کھانے کے بعد واک کرنے گھر سے باہر نکل آئے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان سنجیدہ موضوعات پر گفتگو ذرا کم ہی ہوا کرتی تھی مگر اس وقت میں نے واقعی ان سے یہ سوال سنجیدگی ہی سے پوچھا تھا۔

''شادی..... بے کار کی دردسری، خوامخواہ ایک لنگور کو اپنے سر پر سوار کر لو۔ آپ کو کیا کھانا ہے، کیا پہننا ہے اور کب سونا اور کب جاگنا ہے، اتنے بنیادی حقوق پر بھی ایک دوسرے فرد کی اجارہ داری ہو جائے۔ لاحول ولا قوۃ۔ پتا نہیں لڑکیوں کو شادی میں کیا چارم نظر آتا ہے۔ یہ شینا ہی کو دیکھ لو۔ ہمارے کالج کی سب سے نازک اندام لڑکی ہوا کرتی تھی، کیا فیشن چل رہا ہے، کون سے کلرز ان ہیں اور میک اپ کے کیا ٹرینڈز چل رہے ہیں سب ہم

اس سے سیکھتے تھے اور اب دیکھو اسے، موٹی بھینس جیسی تو ہوگئی ہے۔ چھپکلی کی دم جیسے بال ہیں پر انہیں کٹوا نہیں سکتی کہ میاؤں (میاں) کو کٹے بال پسند نہیں۔ ٹراؤزر اور چوڑی دار پاجامے پسند ہونے کے باوجود نہیں پہن سکتی کہ سرتاج انہیں ناپسند کرتے ہیں۔ لے دے کر سر بچوں نے پوری کر دی ہے۔ اس سے کبھی ملوں تو آدھے گھنٹے بات کر کے ہی میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ اس آدھے گھنٹے میں کچھ دیر میاں جی کے دکھڑے روئے جاتے ہیں کچھ دیر بچوں کی بیماریوں اور پڑھائی کے دکھڑے و مسائل سنائے جاتے ہیں اور باقی وقت ساس نندوں کی غیبتیں، اللہ معاف کرے۔"

ہنی کے منہ سے اس قسم کی باتیں پہلے بھی میں بے شمار دفعہ سن چکی تھی بلکہ جب تک میری منگنی نہیں ہوئی تھی مجھ پر ہنی کی ان باتوں کا کافی اثر بھی ہو جایا کرتا تھا مگر اب میری سوچ ذرا تبدیل ہوگئی تھی۔ میں ہنی سے مختلف انداز میں سوچنے لگی تھی۔ اگر شادی ایسا لڈو ہے جسے کھا کر بھی پچھتایا جاتا ہے اور نہ کھا کر بھی تو کھا کر ہی پچھتا لیا جائے۔ کم از کم یہ curiosity (تجسس) تو نہیں رہے گی کہ اس لڈو کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟

"پھر بھی ہنی! میرا دل چاہتا ہے، آپ شادی کریں۔ دلہن بن کر عام سی شکل کی لڑکیاں اتنی خوبصورت لگتی ہیں پھر آپ تو نجانے کیا غضب ڈھائیں گی۔"

میں نے تصور میں ہنی کو دلہن کے روپ میں دیکھتے ہوئے اپنی معصومانہ سی "بھانجیانہ" خواہش کا اظہار کیا۔

"میری چندا! میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کر دیتی مگر مسئلہ یہ ہے کہ فریڈرک شادی کر چکا ہے اور اس کے سوا میں کسی اور سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"ہائیں، فریڈرک..... یہ فریڈرک کون ہے؟" میں ایک پل کے لیے کچھ سمجھ ہی نہیں پائی جبکہ ہنی بڑی سنجیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"ہاں یار! فریڈرک..... ڈنمارک کا کراؤن پرنس۔ ایڈیٹ نے میری ڈونلڈسن سے شادی کر لی۔ سوچو اگر وہ آسٹریلیا کی میری ڈونلڈسن کو شادی کے لیے پسند کر سکتا تھا تو پاکستان کی ہانیہ بانو کو کیوں نہیں۔"

"ہنی! آپ بھی نا بس۔" میں ان کی شرارت پر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"یار نگی! سونے سے پہلے ایک دفعہ پھر بریانی کھائیں گے۔ کھانے کے وقت تیرے چاچو کی وجہ سے خوامخواہ مجھے بن بن کر پر تکلف طریقے سے کھانا پڑا تھا۔ اتنی مزے کی بریانی اپیا نے بنائی ہے، میں ایک پلیٹ اور کھاؤں گی۔"

جب ہم دونوں ساتھ ملتے تو اسی طرح رات میں جاگ کر باتیں کرنے کے دوران کھانے پینے کا شغل بھی کرتے تھے اور کچھ نہ ہوتا تو چپس، پاپ کورن اور ڈرائی فروٹس تو ہوتے ہی تھے۔

"نگی! مجھے تیرے بگ شو (Big show) سے ملنے کی بہت بے چینی ہے۔ کافی سال پہلے دیکھا تھا، اس وقت تو شاید وہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ اب تو بہت بدل گیا ہوگا؟"

ہم پیپسی کی ڈیڑھ لیٹر والی بوتل سامنے رکھ کر بیٹھے تھے۔ بریانی کھائی جا چکی تھی اور اب پیپسی پی جا رہی تھی۔ پکے شرابیوں اور نشیوں کی

طرح جیسے ہی گلاس خالی ہوتا ہم اس میں مزید پیپسی انڈیل لیتے۔ میرے خوشگوار موڈ کا ستیاناس کرنے کو نجانے ہنی کو اس وقت وہ کیوں یاد آ گیا تھا۔

''کچھ خاص نہیں، تب بھی موٹا تھا اب بھی موٹا ہے اور مل آپ بالکل لیجئے گا۔ موصوف ہر دوسرے دن یہاں پائے جاتے ہیں۔''

میں نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ موصوف ہر دوسرے دن یہاں کیوں پائے جاتے تھے یہ ہنی نے اس لیے نہیں پوچھا تھا کیونکہ یہ بات وہ پہلے سے جانتی تھیں۔ ایک تو آپ کی زبردستی اٹھا کر منگنی کر دی جائے، اوپر سے جس سے کی جائے وہ آپ کو کچھ خاص گھاس بھی نہ ڈالتا ہو تو دل پر کیا گزر سکتی ہے اس کا اندازہ وہی لڑکیاں لگا سکتی ہیں جنہیں اس صورتِ حال سے واسطہ پڑا ہو۔

میں بے چاری اچھی بھلی ہمیشہ کی طرح اپنی چھٹیاں انجوائے کرنے نانی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میڈیکل کالج میں داخلہ ہو جانے کی خوشی بھی اس بار شامل تھی اس لیے وہاں ہمیشہ سے بھی زیادہ انجوائے کیا۔ یہاں میرے پیچھے کیا کھچڑی پکی اور کب پکی مجھے بالکل پتا نہیں چلا۔ پتا تو اس وقت چلا جب میں اسلام آباد ہنی کے ساتھ خوب گھوم پھر کر، موج مستی کر کے کراچی واپس لوٹی اور اپنی بات طے کر دیے جانے کی اطلاع سنی۔ مجھ سے پوچھنے کی زحمت تو کیا کی جاتی بس ایک رسمی سی اطلاع دے دی تھی امی نے۔ گویا میرے اعتراض یا انکار کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب میری چیخ و پکار اور احتجاج کو امی نے کوئی اہمیت نہیں دی تو میں نے اسلام آباد نانی کو فون کھڑکایا۔

''آپ کی بیٹی اور داماد نے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ ابھی میں ڈھنگ سے اپنی میڈیکل کالج میں داخلے کی خوشی بھی نہیں منا پائی ہوں اور انہوں نے میری ساری خوشی ہی لے کر برباد کر دی۔'' میں نے روتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے کیا صدیقی کا۔'' نانی نے غصے سے کہا۔ جب وہ ابا پر کسی وجہ سے خفا ہوتیں تو انہیں ساجد کے بجائے صدیقی ہی کہا کرتی تھیں۔ نانی نے ابا سے کب اور کیا کہا مجھے نہیں معلوم، ہاں البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس رات ابا نے مجھے دادی کے کمرے میں بلوا لیا۔ وہاں دادی اور امی کے علاوہ ڈاکٹر چاچو بھی موجود تھے۔

''ہم نے سنا ہے ہماری بیٹی کو اس رشتے پر اعتراض ہے؟''

بعد میں امی سے چاہے جتنی بھی ڈانٹ پڑتی کہ ابا کے سامنے اتنی بے شرمی سے اپنی شادی، منگنی کی بات کیوں کی مگر میں اس پل بے ساختہ روہانسی آواز میں بول پڑی۔

''ابا! آپ نے دیکھا ہے علی کو، اتنا تو وہ پیٹو ہے، آپ کی نازوں پلی بیٹی تو روٹیاں تھوپ تھوپ کر ہی ختم ہو جائے گی۔''

کھانے سے اسے عشق تھا۔ لگتا تھا وہ زندہ ہی کھانے کے لیے ہے۔ پڑھنے اور کھانے کے سوا اسے زندگی میں کوئی تیسرا کام نہیں تھا۔

''میری نازوں پلی بیٹی کو روٹیاں کیوں تھوپنی پڑیں گی۔ پھپھو کے گھر کا کک کیا ہوا؟ ابا نے محظوظ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

ڈاکٹر چاچو بیٹھے مسکرا رہے تھے جبکہ دادی اور امی مجھے گھور رہی تھیں۔ ڈاکٹر چاچو کا وہ فیوریٹ تھا اس لیے ان سے اس معاملے میں مدد کی کوئی توقع نہیں تھی۔

''ابا! وہ اتنا موٹا بھی تو ہے، پورا کا پورا بگ شو (Big show)۔'' میں ٹھنکی۔

''یہ کیا بلا ہے؟'' دادی نے مجھے گھورتے ہوئے ابا سے پوچھا جو باقاعدہ قہقہہ لگا کر ہنس رہے تھے۔

''ایک ریسلر کا نام ہے اماں۔'' ڈاکٹر چاچو نے ان کی مشکل آسان کی۔

ابا کے سامنے جتنی بودی اور بے ڈھنگی دلیلیں میں نے اس منگنی کی مخالفت میں پیش کی تھیں ان کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ اسی اتوار کو باضابطہ طور پر منگنی کی رسم ادا کر دی جائے۔ منگنی کی رسم بھی اتنے ہی دقیانوسی طریقے سے انجام دی گئی تھی۔ یہاں پھپھو اور انکل نے آ کر مجھے انگوٹھی پہنا دی اور وہاں امی ابا نے جا کر علی کو انگوٹھی پہنا دی۔ اب لکیر پیٹنے اور غم منانے کا کیا فائدہ تھا۔ منگنی میری ہونا تھی سو ہو چکی تھی۔ میں نے اس رشتے کے ساتھ سمجھوتا کر ہی لیا۔ میری دوستوں کے تبصروں نے اس سلسلے میں میری کافی مدد کی تھی۔ ان سب کا کہنا تھا کہ وہ خاصا گڈ لکنگ ہے۔ بس تھوڑا سا اوور ویٹ ہے۔ اگر وہ اپنا وزن کم کر لے تو باقی سب ٹھیک ہے۔

اس جیسے موٹے بھالو کو میرے جیسی نازک اور پیاری سی لڑکی مل رہی تھی اسے تو میرے آگے پیچھے پھرنا چاہیے تھا مگر یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ رہی تھی۔ بطور کزنز ہماری کوئی بہت شاندار قسم کی دوستی نہیں تھی، باوجود اس کے کہ وہ ہر دوسرے روز ہمارے گھر میں موجود ہوا کرتا تھا۔ اس کا ہمارے گھر اتنی کثرت سے آنا اس کے دونوں عشقوں کی وجہ سے تھا۔ جی ہاں، اس کے دو ہی عشق تھے۔ ایک بے تحاشا کھانا اور ایک بے تحاشا پڑھنا اور یہاں اس کے یہ دونوں عشق امی اور ڈاکٹر چاچو کے ذریعے پورے ہوتے تھے۔ ہماری امی کو پتا نہیں وہ کیوں اتنا پسند تھا۔ اسے پکا پکا کر کھلا کر بلکہ ٹھنسوا کر بڑی خوش ہوا کرتی تھیں، اس پیٹو کی شکل دیکھتے ہی لہجے میں شہد گھول کر۔

''بیٹا! نہاری پکا رہی ہوں، کھا کر جانا۔'' جیسا کوئی جملہ کہتیں اور ''بیٹا'' بغیر کسی تکلف کے واقعی خوب پیٹ بھر کر اور نہاری کی ڈھیر ساری تعریفیں کرتے ہوئے کھانا کھا کر ہی جاتا۔ ڈاکٹر چاچو سے وہ پڑھائی میں بہت مدد لیا کرتا تھا۔ کبھی اسے ان سے کوئی ریفرنس بک درکار ہوتی اور کبھی کلاس میں ٹیچر کی کوئی بات پلے نہیں پڑتی تو ان سے آ کر سمجھ لی جاتی۔ وہ ڈی ایم سی میں مجھ سے دو سال سینئر تھا۔ منگنی ہو جانے کے بعد بھی اس کی آمد ان ہی دو وجوہات کے تحت ہوتی تھی۔ منگنی سے پہلے تک تو یہ سب ٹھیک تھا مگر منگنی کے بعد تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا نا۔ ہم کزنز تھے، ہمارے ایک دوسرے کو فون کرنے پر، ملنے پر پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپنی دوستوں سے سنا تھا کہ لڑکے اپنی منگیتروں کو منگنی کی رات یا اس کے اگلے روز لازمی فون کرتے ہیں۔ یہاں تو اتنا قریبی رشتہ تھا، وہ فون کے بجائے خود بنفسِ نفیس آ جاتا تو کوئی اعتراض نہ کرتا اور موصوف اگلے روز آئے بھی تھے مگر مجھے سے ملنے نہیں، ڈاکٹر چاچو سے اناٹومی کی ایک کتاب لینے۔ اس بدتمیز کو میرے سوا ہمارے گھر میں سب کچھ نظر آتا تھا۔ امی اور ڈاکٹر چاچو تو تھے ہی اس کے پسندیدہ ترین، باقی میرے بھائیوں سے بھی اس کی بے تکلفی تھی اور مجھ سے پہلے جیسی سرسری سی گفتگو۔

''کیسی ہو؟''

''پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''

کتنے فضول اور ''غیر منگیترانہ'' سوالات تھے نا یہ، جو صاف لگتا تھا میری شکل دیکھ کر اخلاقاً پوچھ لیے گئے ہیں۔ اس کی ان حرکتوں پر میرا اتنا دل نہ جلا کرتا اگر آسیہ ہمارے گروپ میں شامل نہ ہوئی ہوتی۔ ہم پانچ دوست سینٹ جوزف سے ایک ساتھ انٹر کر کے ڈی ایم سی میں آئی تھیں۔ انٹر

تک ہم چھ تھے مگر بے چاری حلیمہ کا ہمارے ساتھ داخلہ نہ ہو سکا تو ہم پانچ رہ گئے۔ ہم پانچ کو دوبارہ چھ بیلا نے ہمارے گروپ میں زبردستی آسیہ کو شامل کروا کر کیا تھا۔ وہ بیلا کے ڈیڈی کے بزنس پارٹنر کی اکلوتی بیٹی تھی اور نئی نئی گلاسکو سے پاکستان آئی تھی۔

بیلا کے ڈیڈی نے آسیہ سے بہت اچھی دوستی رکھنے اور اس کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی تھی اور اسی تاکید نے ہم سب کو اس اتراتی شکل کو برداشت کرنے پر مجبور کیا ہوا تھا۔ جب بھی اسے گروپ سے الگ کرنے کی بات ہونے لگتی بیلا ہم سب کے ہاتھ پاؤں جوڑنے بیٹھ جاتی۔ بہت دنوں تک تو وہ اپنے گلاسکو کے قصے سنا سنا کر ہی ہمارا دماغ خراب کرتی رہی پھر اچانک ہی اس کا ہماری کلاس کے سب سے ہینڈسم اور سب سے ذہین لڑکے عثمان سے افیئر چلنے لگا۔ یہ افیئر اتنا زبردست اور اتنا زوردار تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی شہرت پورے کالج میں پھیل گئی۔ ہماری کلاس کی تقریباً تمام لڑکیاں (ظاہری بات ہے) آسیہ سے جیلس ہوتی تھیں۔ کلاس کے سب سے شاندار لڑکے کو اس نے اپنی اداؤں کے جال میں پھنسا لیا تھا اور باقی سب بے چاریاں دیکھتی ہی رہ گئی تھیں۔

''پوز بہت ہیں، ایسی کوئی حسین بھی نہیں، عثمان کا ٹیسٹ ہی سڑا ہوا ہے۔''

یہ ہمارے گروپ کی ثنا کا بیان تھا جسے عثمان کی چوائس سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ ان محترمہ نے کلاس کے سب سے ہینڈسم اور چارمنگ لڑکے کو اپنے قابو میں کیا تھا تو انہیں باقی سب لڑکیوں سے بالعموم اور ہمارے گروپ سے (میرے علاوہ) بالخصوص خطرہ بھی لاحق رہا کرتا تھا۔ اپنے اسی خطرے کو دور کرنے اور ہم سب کو یہ باور کراتے رہنے کے لیے کہ اس ''مفتوحہ زمین'' پر کوئی اور جھنڈا گاڑنے کی کوشش نہ فرمائے، وہ اس قسم کی باتیں کیا کرتی۔

''کل تم لوگوں کے بہنوئی نے فون پر دو گھنٹے مجھ سے باتیں کیں۔ ریسیور پکڑے پکڑے میرا ہاتھ دکھ گیا۔'' بہنوئی کہہ دینے سے کون سا ''متاثرینِ عثمان'' نے سدھر جانا اور اسے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنا چھوڑ دینا تھا۔ بہنوئی والے رشتے کی ناکامی پر اس نے عثمان کو ہم سب کا بھائی بنا دیا اور پھر گفتگو کچھ یوں ہونے لگی۔

''تمہارے بھائی کتنے خوش قسمت ہیں انہیں مجھ جیسی خوبصورت لڑکی اتنے آرام سے مل گئی ہے۔''

سکینہ جو ہمارے گروپ کی سب سے منہ پھٹ لڑکی تھی اس نے چڑ کر ایک بار آسیہ سے بول دیا۔

''ہمارا دماغ خراب نہیں ہو گیا جو اتنے ہینڈسم لڑکے کو اپنا بھائی بنا لیں۔ تم اسے ہمارا کلاس فیلو ہی رہنے دو۔''

اس بات کے بعد اسے سکینہ سے سب سے زیادہ خطرہ لاحق رہنے لگا تھا۔ ثنا نے آسیہ کے بارے میں ایک اور دلچسپ بات بھی بتائی تھی۔

''صبح میں تم لوگوں سے پہلے آ گئی تھی، آسیہ کوریڈور میں ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑی ہوئی تو سلام دعا کرتے ہی وہ مجھ سے کہنے لگی۔

''یار ثنا! پلیز مائنڈ مت کرنا، میں اس وقت یہاں عثمان سے بہت ضروری بات کرنے کے لیے کھڑی ہوں۔ وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھے گا تو یہاں آتے ہوئے ہچکچائے گا۔

''He is very shy yaar''

ثنا نے آسیہ کے اتراتے ہوئے لہجے کی ہو بہو نقل اتاری۔ ثنا کے بتانے کے بعد ہم سب نے اس چیز کو خاص طور پر نوٹ کرنا شروع کیا تو پتا چلا کوریڈور میں ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہونا اس کا عثمان کو اپنے پاس بلانے کا اشارہ ہوا کرتا تھا جب وہ کلاس کے دیگر لڑکوں کے ہجوم میں گھرا ہوا ہوتا اور اتنے سارے لڑکوں میں گھس کر وہ اسے بلا نہیں پاتی۔ ہم نے غور کیا تو پتا چلا ادھر وہ ستون کے پاس پہنچتی ہے اور ادھر وہ دم ہلاتا سیدھا اس کے پاس۔ کیا نشانی بنائی تھی محترمہ نے۔ عثمان جب ایک ہی سیکنڈ میں ''غلام کے لیے کیا حکم ہے ملکہ عالیہ!'' جیسے انداز میں اس کے پاس پہنچتا تو میں بے ساختہ آسیہ کا اپنے ساتھ موازنہ کرتی۔ یہ تو صرف چکر چلا رہی ہے جبکہ میری تو باقاعدہ منگنی ہوئی ہے اور میرے منگیتر صاحب ستون، دیوار، کھڑکیاں، سیڑھیاں ان سب کو تو چھوڑیں اگر میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر (جب وہ سلامت تھا) اس کے Roof پہ Parapet wall (فصیل) سے لٹک کر بھی کھڑی ہو جاتی اور وہ اس وقت امی کے ہاتھوں کی پکی نہاری کھا رہا ہوتا تو کہتا۔

''پہلے نہاری کھالوں پھر آ کر تمہاری بات سنتا ہوں۔''

اس سے اگر نہاری اور مجھ میں سے کسی ایک کو چننے کو کہا جاتا تو وہ نہاری کو چنتا۔ میرے منگیتر کو مجھ سے زیادہ نہاری، پائے، حلیم اور بریانی سے پیار تھا۔ کیا یہ بات دل جلانے والی نہیں تھی؟ کالج میں میں عثمان کو غلاموں کی طرح آسیہ کے آگے پیچھے پھرتے اور اسے ''تمہارے بہنوئی کہہ رہے تھے، تمہارے بھائی نے یہ کہا'' کہتے سنتی اور گھر پر اس موٹو کو خود کو نظر انداز کرتے دیکھتی۔ میں ان باتوں پر ہی جلی بیٹھی تھی کہ ابھی پچھلے مہینہ جو عید آ کر گزری تھی اس نے میری رہی سہی سب امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ عید کی صبح میں اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی، جب روحیل کمرے کے دروازے سے مجھے چھیڑتا ہوا گیا۔

''جلدی سے نیچے آ جائیں بجو! بگ شو (Big show) اپنی منگیتر سے عید ملنے تشریف لا چکے ہیں، ہاتھ میں ایک پیکٹ بھی ہے، لگتا ہے آپ کے لیے کوئی گفٹ آیا ہے۔''

میں جلدی جلدی اپنی تیاری مکمل کر کے بھاگتی دوڑتی نیچے آئی تو وہاں سوائے گھر کے افراد کے کوئی نہ تھا۔

''ابھی کوئی آیا تھا کیا؟ میں نے امی کے ساتھ کچن میں آتے ہوئے معصومیت سے بن کر پوچھا۔

''ہاں، علی سب کو سلام کرنے آیا تھا۔ عید کے دن بڑوں کو جا کر سلام کرنا، ان سے دعائیں لینا، اب تو ساری پرانی روایتیں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ چلو ہماری فیملی کے بچوں میں اس چیز کا شعور ہے یہی غنیمت ہے۔''

میرے تلوؤں سے لگی اور سر پر بجھی۔ لعنت ہے مجھ پر جو اس غوری میزائل کے لیے بھاگتے دوڑتے اتنی تیاریاں کر کے نیچے آئی تھی۔ وہ منحوس تو اپنی نانی، ماموؤں اور ممانی کو سلام کرنے اور ان سے دعائیں لینے آیا تھا اور وہ پیکٹ؟ اپنی کسی گرل فرینڈ کے لیے خریدا ہوگا۔ اس موٹے بھالو کی کون لڑکی گرل فرینڈ بنے گی۔ خیر اس دنیا میں بدذوق لڑکیوں کی کون سی کمی ہے۔ اس کی مثال کالج کی وہ بہت سی لڑکیاں ہیں جن سے موصوف کی گاڑھی چھنتی ہے۔

عید والے اس واقعہ کے بعد میں نے بھی میک ڈونلڈ کے اس بگ میک پر ہزار دفعہ لعنت بھیجی اور اپنی زندگی میں مگن ہوگئی۔ میں کوئی ایسی گئی گزری تھی جو اس کے آگے پیچھے پھروں، بھاڑ میں جائے۔ اب وہ گھر آتا تو میں اسے اس سے بھی زیادہ نظر انداز کرتی۔ کالج میں سامنا ہوتا تو پاس سے ایسے گزر جاتی جیسے دیکھا تک نہ ہو اور اگر کبھی اس کی فون کال ریسیو کرتی تو اس کے ''میں علی بول رہا ہوں'' کہتے ہی اسے ہولڈ کروا کر ڈاکٹر چاچو، دادی یا امی کو بلا کر لے آتی۔ چھ مہینے کی ہماری منگنی میں نجانے میں کتنی ہزار بار اس پر لعنت بھیج چکی تھی اور نجانے اپنا کتنے لیٹر خون جلا چکی تھی۔

صبح ناشتے کے وقت ایک غدر مچا تھا۔ روز صبح ہمارے گھر ایسا ہی بھونچال آیا ہوتا تھا۔ جب تک کہ رومیل اپنے کالج اور بہروز اور مبشر اپنے اسکول نہ چلے جاتے یہ طوفان یونہی سب کچھ ہلائے رکھتا۔ ٹی وی بھی ناشتے کے دوران دیکھا جاتا کہ ابا اور ڈاکٹر چاچو ناشتے کے دوران اخبار کی سرخیوں پر نظریں دوڑانے کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر خبریں سننا بھی پسند کیا کرتے تھے۔ لوگوں کے شور میں ٹی وی کا شور بھی مل جاتا تو واقعی گھر میدان جنگ لگنے لگتا تھا۔

''ساس بھی کبھی بہو تھی'' کی ''تلسی'' چاندنی چوک سے ہار گئیں۔'' ٹی وی پر یہ خبر سنتے ہی دادی کا موڈ آف ہوگیا۔

''یہ کون ذاتِ شریف ہے؟''

ڈاکٹر چاچو نے دادی کے لٹکے منہ کو تعجب سے دیکھ کر مجھ سے پوچھا۔ میں دادی ہی کی بدولت بغیر کسی خواہش کے اسٹار پلس کے تمام ڈراموں کی مکمل معلومات رکھا کرتی تھی اس لیے ڈاکٹر چاچو کے استفسار کا فوراً جواب دے دیا۔ ہنی بھی اس خبر کو کافی غور سے سن رہی تھیں لیکن ان کے چہرے پر دادی جیسا غم والم نہیں پھیلا تھا۔ مجھے پتا تھا ان تمام سوپس میں ہنی کو ہیروئنز سے نہیں بلکہ نیگیٹو کرداروں سے ہمدردی ہوا کرتی تھی۔ ان کی عجیب سی سوچ تھی۔ ہر فلم، ہر ڈرامہ اور ہر کہانی میں انہیں مثبت کردار سے زیادہ منفی کردار پر پیار آیا کرتا تھا۔ مثلاً آپ اگرا کبری، اصغری جیسے مشہور و معروف کرداروں ہی کو لے لیں تو انہیں اکبری بہت سویٹ اور بڑی کیوٹ لگتی اور اصغری وہ گھنی، میسنی، مکار اور نجانے کیا کیا لگا کرتی تھی۔

''جیت جاتی بے چاری، وہاں کی عورتوں کی بھلائی کے لیے ہی کچھ کام کر لیتی۔'' دادی ناشتہ چھوڑ چھاڑ فی الحال یہ غم منانے میں مصروف تھیں۔

''ہانی! تمہیں اپنی کچھ فکر ہے کہ نہیں، اب تو تم سے چودہ سال چھوٹی تمہاری بھانجی تک کی منگنی ہوگئی ہے۔'' امی نے رات والا موضوع ایک بار پھر شروع کیا۔

سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد اب ناشتے کی میز پر امی، ہنی اور میں ہی رہ گئے تھے۔ مجھے آج کالج کچھ دیر سے جانا تھا، ہنی آفس جانے کے لیے بالکل تیار تھیں مگر امی نے سب کے جاتے ہی جو یہ موضوع پھر سے چھیڑا تو انہیں رکنا پڑا۔

''اپیا! آپ کو کیا ہوگیا ہے، آپ مجھے اتنا بے خبر سمجھتی ہیں کہ میں اپنی لاڈلی بھانجی کی منگنی تک سے لاعلم ہوں گی یا آپ کو میری یادداشت پر کچھ شبہ ہے؟ کل ثینا کی شادی اور اس کے بچوں کے بارے میں مجھے معلومات فراہم کر رہی تھیں آج نگی کے بارے میں۔ یقین کریں میرا حافظہ بفضلِ تعالیٰ بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ پتا ہے ہمارے آفس میں جو اکاؤنٹس منیجر ہیں وہ اس بات پر کیا کہتے ہیں۔''

انہوں نے کوئی گل افشانی شروع کی ہی تھی کہ امی نے انہیں ناراضی سے چپ کرا دیا۔

''نہیں سننے مجھے تمہارے اکاؤنٹس منیجر، کمپیوٹر آپریٹر، ایم ڈی اور پیون کے قصے۔ ساری زندگی کیا یہی قصے سناتی رہو گی ہمیں کہ تمہارے ایم ڈی ڈریسنگ کتنی عمدہ کرتے ہیں اور تمہارا پیون چائے کتنی بری بناتا ہے۔ اب میں تمہارے منہ سے تمہاری ساس نندوں کی برائیاں اور تمہارے میاں کی شکایتیں کہ تمہاری اتنی محنت کے باوجود اسے تمہارے ہاتھ کا پکا کھانا پسند نہیں آتا جیسے قصے سننا چاہتی ہوں۔''

امی بہت سنجیدہ اور غصے میں تھیں مگر ان کی غصے سے کی گئی اس بات نے مجھے اور ہنی دونوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہنی خوب کھلکھلا کر ہنسی تھیں جبکہ میں امی کے غصے کے پیش نظر سر جھکا کر مسکراہٹ ضبط کر رہی تھی۔

''اپیا! میں آپ کو اپنا سچا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتی تھی۔ آج پتا چلا، آپ میرے مستقبل کے کتنے ''سہانے سپنے'' دیکھا کرتی ہیں۔ ایک تو میں کسی لنگور کے لیے کھانا پکاؤں، وہ بھی بہت محنت کر کے، اوپر سے وہ اس میں مین میخ نکالے، سر نہ پھاڑ دوں میں ایسے خبیث کا۔ اول تو ایسا وقت میری زندگی میں کبھی آنا نہیں ہے اور اگر آیا تو میں مظلوم عورتوں کی طرح آپ سے شکایتیں کروں گی؟ اس ایڈیٹ کا دماغ نہ ٹھکانے لگا دوں گی دو سیکنڈ میں۔''

ہنی امی کو افسوس بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اٹھیں اور اپنا بیگ کاندھے پر ڈالا۔

''بخشو بی اپیا! ہنی لنڈوری ہی بھلی۔'' انہوں نے اپنی اردو دانی کا ثبوت دیتے ہوئے امی کے قہر و غضب کو مزید بڑھایا۔

''تم سے بات کرنا پتھر سے سر پھوڑنے کے مترادف ہے۔ اچھا کیا جو میں نے نگی کے انٹر کرتے ہی منگنی کر دی ورنہ تم سے اتنا دوستانہ اور یارانہ اسے بھی تمہارے جیسا بنا دیتا۔ کاش امی نے بھی تمہاری میٹرک، انٹر کے دوران منگنی اور پھر جھٹ پٹ شادی کر دی ہوتی، اس وقت اب کی طرح خود سر تو نہ ہوتیں۔''

ہنی نے مزید رکنا اور اس گفتگو کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ پہلے ہی آفس کے لیے لیٹ ہو رہی تھیں۔

''اللہ حافظ اپیا! بائے نگی!'' وہ ہم دونوں کو ہاتھ ہلاتی ڈائننگ روم سے باہر نکل گئیں۔

''دیکھا تم نے اسے، کس طرح بات ٹال کر چلی گئی۔ اس سے شادی کی بات کی جا سکتی ہے؟ اور ادھر تمہاری نانی نے فون پر مجھے حکم سنایا ہے کہ میں اسے شادی کے لیے راضی کروں اور اس کے لیے ایک عدد مناسب سا رشتہ بھی تلاش کروں۔ رشتے کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں، پر اس سے کون مغز ماری کرے۔ میرے بھیجے میں اتنا دم نہیں کہ اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سن سکوں۔ امی کو کتنی فکر ہے اس کی شادی کی، اس احمق کو کوئی احساس ہی نہیں۔ آج اگر رشتے مل بھی رہے ہیں تو چند سالوں بعد تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ پتا نہیں کیا سوچے بیٹھی ہے۔''

امی واقعی اس وقت کافی پریشان لگ رہی تھیں۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔ اپنی چھوٹی بہن کا اگر وہ گھر بسا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں تو یہ ایک جائز خواہش تھی۔

''واقعی ہنی کو شادی کر لینی چاہیے۔ آفٹر آل شادی کوئی اتنی بری چیز بھی نہیں جس سے ہنی اس قدر چڑیں۔'' میں نے دل میں سوچا۔

''ایک طرف ہانی نے پریشان کر رکھا ہے تو دوسری طرف تمہارے ابا نے۔ انہیں اپنے لاڈلے بھیا کی شادی کی فکر ہے۔ کہہ رہے تھے'' کیا بڑھاپے میں شادی کرے گا، اس کے بچوں کی اسکول فیس اس کی پینشن میں سے جایا کرے گی؟''

امی برتن سمیٹتی میز پر سے اٹھیں۔

''سارے کے سارے پاگل اور خبطی ہماری ہی فیملی میں پیدا ہونے تھے۔'' امی بڑبڑاتے ہوئے کچن میں چلی گئیں۔

''سارے کے سارے پاگل اور سارے کے سارے خبطی۔'' میں نے امی کی کہی بات کچھ سوچتے ہوئے دہرائی۔ میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال ابھرا۔

''پاگل ہنی، پاگل ڈاکٹر چاچو۔ ایک پاگل پاگل سا کپل۔ ایک پاگل پاگل سی فیملی۔ واؤ، زبردست۔'' میں اپنے اس شاندار آئیڈیے پر اچھل ہی تو پڑی تھی۔

''ہم میں سے کسی کے ذہن میں یہ خیال کبھی کیوں نہیں آیا۔ ہنی اتنی خوبصورت، اتنی ایجوکیٹڈ۔ ڈاکٹر چاچو اتنے ہینڈسم، اتنے قابل اور ماہر ڈاکٹر۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کتنے سجتے۔ واقعی چاند سورج کی جوڑی۔''

میں جوش و خروش میں ڈوبی یہ سب سوچے ہی چلی جا رہی تھی کہ میری غلط فہمیوں کے غبارے سے یہ سوچ کر فوراً ہی ہوا نکل گئی کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔ اگر ہنی کو شادی کے لیے راضی کرنا ناممکنات میں سے تھا تو ڈاکٹر چاچو بھی خاصی ٹیڑھی کھیر تھے۔ ان کے ساتھ ہنی والا یہ مسئلہ تو نہیں تھا کہ وہ سرے سے شادی ہی کے خلاف تھے اور شادی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ شادی کرنا چاہتے تھے مگر اپنی پسند کی لڑکی سے اور اس کا ملنا کچھ سہل نہ تھا۔ اپنی من پسند لڑکی کی تلاش میں وہ اپنی شادی لیٹ کیے چلے جا رہے تھے۔

امی کبھی کبھار جل کر دادی کو یہ سنا دیا کرتی تھیں کہ اب بیٹے کے لیے لڑکی نہیں بلکہ عورت تلاش کریں۔ دادی کو یہ سن کر آگ لگ جاتی تھی۔ وہ ابھی تک ابا کو بوڑھا ماننے کو تیار نہ تھیں تو ڈاکٹر چاچو تو واقعی خیر سے ابھی جوان جہان بلکہ نوجوان تھے۔ (''نوجوان'' دادی کی نگاہوں میں) انہیں تو سولہ سال کی لڑکی بھی مل سکتی تھی۔

ویسے امی ساس کو چڑانے کے لیے دیور کے متعلق جو کمنٹس دیا کرتی تھیں ان میں زیادہ سچائی نہیں تھی۔ دادی کی کم عمر لڑکی مل جانے والی بات سے میں سو فیصد متفق تھی۔ خود میری کتنی ہی کلاس فیلوز اور سہیلیاں باقاعدہ ڈاکٹر چاچو پر عاشق تھیں۔ اگر کسی دن یہ پتا چل جاتا کہ آج وہ مجھے کالج پک کرنے آئیں گے تو میرا پورا گروپ میرے ساتھ کالج کے گیٹ کے پاس باجماعت کھڑا ان کی آمد کا انتظار کیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر چاچو بھتیجی کی دوست سمجھ کر ان سب سے ''بیٹا'' کر کے بات کرتے، وہ بے چارے کو کیا پتا تھا کہ جنہیں بھولا، معصوم اور بچہ سمجھ کر وہ بیٹا کہہ رہے ہیں وہ میری چاچی بننے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔

بیلا اور سکینہ نے تو بڑی کمینگی سے کئی بار مجھ سے یہ تک کہا تھا کہ جب ڈاکٹر چاچو کی بیوی کا چناؤ ہونے لگے تو اپنی ممکنہ چاچیوں کی فہرست میں میں ان دونوں کا نام بھی ضرور شامل کر لوں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ چاچیوں کا چناؤ کرنے کا ہمیں موقع ہی نہیں مل پاتا تھا۔ شروع میں تو ڈاکٹر چاچو نے خود اپنی شادی کے لیے سختی سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ابھی وہ مزید تعلیم حاصل کرنا اور اپنا کیریئر بنانا چاہتے ہیں مگر پھر جب وہ لندن سے اسپیشلائزیشن کر کے آ گئے اور ان کا کیریئر بھی ان کی حسبِ خواہش بن چکا تب دادی اور دونوں پھوپھیوں نے اس گھر کی دوسری بہو کی تلاش شروع

کی۔اب ان کا اتنا قابل لائق فائق ڈاکٹر بیٹا تھا اس کی ہونے والی بیوی کو اسی کی طرح قابل ڈاکٹر تو ضرور ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ محاورتاً نہیں، حقیقتاً ان سب نے جوتیاں گھسنی شروع کیں۔ان کی پسند کے مطابق لڑکی ملنا اس لیے ناممکن تھا کہ ایک لڑکی جو بہت حسین بھی ہو، اچھی فیملی سے بھی ہو، اس نے صرف ایم بی بی ایس ہی نہ کیا ہو بلکہ کسی خاص شعبے میں اسپیشلائزیشن بھی کر چکی ہو اور عمر اس کی بیس اکیس سال سے زیادہ نہ ہو آخر کہاں مل سکتی تھی۔ابھی ان کی یہ تلاش جاری تھی کہ ابا کو اس بات کی بھنک پڑ گئی۔وہ ماں اور بہنوں پر خوب خفا ہوئے۔

''اب آپ لوگوں میں سے کوئی گھر گھر منہ اٹھا کر نہیں جائے گا۔لڑکیاں دیکھنے کے اور دس طریقے ہیں۔شادی بیاہ کی کسی تقریب میں، کسی میلاد یا سالگرہ میں یا اور کسی بھی طرح کی پارٹی میں لڑکیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔''

امی کہتی تھیں یہ ماں بہنیں بھائی کی شادی ہونے نہیں دیں گی۔بیس سال کی انہیں پوسٹ گریجویشن کی ہوئی ڈاکٹر چاہیے تھی۔کوئی عقل کی بات بھی تھی؟ مگر تب کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ ماں بہنوں سے زیادہ اپنی شادی میں رکاوٹ تو خود ڈاکٹر چاچو ہیں۔یہ سب کو اس وقت پتا چلا جب دادی اور پھوپھیوں کا بالآخر ایک لڑکی پر اتفاق ہو گیا۔وہ پھپھو کے پڑوس میں رہتی تھی۔دبلی پتلی، حسین سی گائناکولوجسٹ۔جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ جیسے ابھی ابھی میڈیکل کالج سے پاس آؤٹ کر کے نکلی ہے۔ابا کی نصیحت اور دھمکی پر کان دھرتے کسی نے بھی اس کے گھر والوں سے رشتے کی بات نہیں کی تھی۔وہ لوگ ابھی یہ جانتے ہی نہیں تھے کہ ان کی بیٹی کو اس حوالے سے پسند کیا جا رہا ہے۔سب یہ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر چاچو بھی ایک بار اسے دیکھ لیں پھر رشتے کی بات چلائی جائے۔

پھپھو نے زبردستی اپنے گھر پر ایک گیٹ ٹوگیدر کا اہتمام کیا اور وہاں اس کی پوری فیملی کو بھی مدعو کیا۔وہاں انہوں نے ان دونوں ڈاکٹرز کا آپس میں تعارف کروایا اور انہیں باہم گفتگو کا موقع بھی فراہم کیا۔وہ اتنی حسین تھی کہ کوئی احمق ہی اس سے شادی سے انکار کر سکتا تھا اور ہمارے چاچو محترم نے اپنی حماقت کا بڑے آرام سے اعلان کر دیا تھا۔

''وہ انڈین فلموں کی شوقین ہے۔''

چاچو نے یہ بات اس طرح بتائی گویا کہنا چاہتے ہوں ''وہ شراب کی شوقین ہے۔''

''میں نے اس سے اس کی ہابیز پوچھیں تو پتا چلا اس کی واحد ہابی انڈین فلمیں دیکھنا ہے۔وہ شاہ رخ خان کی ہر ہر فلم پانچ پانچ بار دیکھ چکی ہے۔'' ڈاکٹر چاچو نے اس رات گھر آ کر دادی کے استفسار پر یہ جواب دیا تو سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔وہ انڈین فلموں کو سخت ناپسند کرتے تھے سوائے ان پرانی موویز کے جو کلاسکس میں شمار کی جاتی ہیں، ان کے لیے انڈین فلموں کا نام لیا جانا بھی گالی تھا مگر اس بات کو بنیاد بنا کر وہ کسی لڑکی سے شادی سے انکار کر دیں گے ایسا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''وہ شاہ رخ خان اور مادھوری کی بہت بڑی فین ہے۔'' ڈاکٹر چاچو بول رہے تھے گویا وہ بے چاری کسی بہت بڑے گناہ کی مرتکب ہو گئی ہو۔

''اگر انڈین فلمیں دیکھنا قابلِ گردن زدنی جرم ہے تو اس جرم کا سب سے زیادہ ارتکاب خود ان کی والدہ محترمہ فرماتی ہیں۔''

یہ میں نے نہیں، امی نے کہا تھا۔اتنی خوبصورت، قابل اور اچھی فیملی کی لڑکی انہوں نے اس کے انڈین فلموں کو پسند کرنے کے جرم میں

ناپسند کردی تھی۔ کوئی تک تھی بھلا۔ اتنی مشکلوں سے تو دادی اور پھوپھیوں کا ایک لڑکی پر اتفاق ہو سکا تھا۔ گھر میں سب چاچو پر خاصے خفا ہوئے تھے پر انہیں اس خفگی سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ابا کے ناراض ہونے پر انہوں نے اپنی پسند صاف صاف بتا دی تھی۔ وہ دادی اور پھوپھیوں کی طرح اس مکتبہ فکر سے تعلق نہیں رکھتے تھے کہ ڈاکٹر کی بیوی کو ڈاکٹر ہی ہونا چاہیے۔ انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ان کی ہونے والی بیوی ڈاکٹر ہو یا نہ ہو بس اسے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا چاہیے تھا، چاہے اس کی فیلڈ جو بھی ہو۔ انہیں لڑکی کے بے تحاشا حسین ہونے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ قبول صورت لڑکی بھی چل سکتی تھی اگر اس میں وہ تمام اوصاف موجود ہوں جو وہ اپنی ہونے والی بیوی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور وہ اوصاف کیا تھے؟

سگھڑاپا، کھانا پکانے میں ماہر، گھریلو، سوشل، ماڈرن، مشرقی؟

ہرگز نہیں، ان تمام باتوں میں سے انہوں نے کسی بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ انہیں بس ایک ایسی لڑکی چاہیے تھی جو اچھی کتابوں، اچھی فلموں اور اچھے میوزک کی شیدائی ہو۔ جو کتابوں، فلموں اور میوزک کے معاملے میں بہت اعلیٰ درجہ کا ذوق رکھتی ہو۔ انڈین فلمیں دیکھنے والی، انڈین آرٹسٹوں کی باتیں کرنے والی لڑکیوں سے انہیں بیر تھا۔ خود ان کا کتابوں، فلموں اور میوزک میں بہت عمدہ ٹیسٹ تھا۔ اوٹ پٹانگ کتابیں، بے سرے گانے اور حقائق سے کوسوں دور تک کوئی تعلق نہ رکھنے والی فلمیں (یہ سب ڈاکٹر چاچو کی آراء تھیں اور میرا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں) وہ ان سب سے ہمیشہ دور رہے تھے۔ مطالعے کے وہ بے حد شوقین تھے۔ ہر موضوع پر وہ بے تحاشا پڑھتے تھے۔ ایک ڈاکٹر جو غالب کے نسبتاً غیر معروف اشعار اور شیکسپیئر کی مختلف لائنز روانی سے اپنی گفتگو میں شامل کرتا ہو، تھی نا ذرا مختلف سی بات۔ ایک ایسی لڑکی جو اچھی کتابوں کا بھی شوق رکھتی ہو، کلاسیکل میوزک میں بھی دلچسپی رکھتی ہو اور کلاسکس میں شمار کی جانے والی معیاری فلموں سے بھی شغف رکھتی ہو اس کا ملنا ناممکن تو نہیں پر مشکل ضرور تھا۔

ایسی یقیناً بہت سی لڑکیاں ہوں گی۔ پر چاچو کی قسمت، ہمارے جاننے والوں میں، رشتہ داروں میں یہاں تک کہ خود چاچو کی کولیگز میں ایسی کوئی لڑکی موجود نہیں تھی۔ کسی کو کتابوں کا شوق ہوتا تو فلموں اور میوزک کے میدان میں وہ انڈین فلموں کا نام لے کر فوراً اپنے نمبر کٹوا لیتی اور کسی کا فلموں میں ذوق اچھا ہوتا تو کتابیں پڑھنے سے اسے سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہوتی۔ عجیب مصیبت تھی۔ دادی اور دونوں پھپھو بہت ہی جلد ہار مان کر بیٹھ گئیں اور ڈاکٹر چاچو کو یہ اجازت دے دی کہ وہ کہ وہ اپنی مرضی کی لڑکی خود تلاش کر لیں کہ ایسا ''گوہرِ نایاب'' انہیں کہیں دستیاب نہیں ہو سکا۔ ابا ڈاکٹر چاچو کی اس فرمائش کو پاگلانہ اور احمقانہ قرار دیتے تھے۔

دادی کہتی تھیں ''یہ ان دونوں بھائیوں کا مشترکہ شوق انہیں اپنے باپ سے وراثت میں ملا ہے۔ کسی زمانے میں ابا بھی ڈاکٹر چاچو کی طرح کتابوں، فلموں اور میوزک میں اتنی ہی دلچسپی اور اتنا ہی اعلیٰ قسم کا ذوق رکھا کرتے تھے۔'' امی کا اس بات پر منہ بن جاتا تھا۔ ''کسی زمانے'' کا لفظ استعمال کیے جانے کا صاف مطلب یہ تھا کہ امی نے آ کر ان کے انٹلکچوئل بیٹے کو کسی کام کا نہیں رہنے دیا۔

''ابی مرحوم کو کہاں سے یہ وراثت بیٹوں میں منتقل ہوئی، ہم نے کتاب تو چھوڑ کبھی اخبار پڑھتے تک نہیں دیکھا تھا۔'' امی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتیں۔

ویسے یہ سچ تھا کہ ابا کو میں نے کبھی کوئی کتاب پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں انہیں ایسا شوق کب رہا تھا اب تو وہ صرف اخبار ہی پڑھا

کرتے تھے اور اس دوران بھی امی مختلف گھریلو اور خاندانی مسئلے مسائل ان کے گوش گزار کیے جاتی تھیں۔ ڈاکٹر چاچو کو تا حال اپنی پسند کی لڑکی نہیں مل سکی تھی، اس لیے ابھی تک ان کی شادی کا معاملہ جوں کا توں اٹکا ہوا تھا اور ان کی شادی مسلسل لیٹ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جو دادی اور ابا کو خاصا فکر مند کر دیا کرتی تھی۔

''پتا نہیں اس سے راگ بھیرویں سنا کرے گا یا ستار اور ہارمونیم بجوایا کرے گا۔'' کلاسیکل میوزک سے شغف رکھنے والی چاچو کی خواہش پر امی جل کر تبصرہ کیا کرتیں۔ چاچو کے پاس مشرقی مغربی اور دیگر ہر طرح کے کلاسیکل میوزک کی سی ڈیز، کیسٹس وغیرہ کا زبردست کلکشن تھا۔ یہی حال فلموں کا بھی تھا اور کتابیں..... وہ تو ان کی اسٹڈی میں ایک سے بڑھ کر ایک بھری پڑی تھیں۔ چاچو کہتے تھے، وہ دوسرے لوگوں سے ان کی ذہنی سطح اور معیار کے مطابق گفتگو کر سکتے ہیں پر اپنی بیوی کو وہ سو فیصد اپنی ہی ذہنی سطح کا دیکھنا چاہتے ہیں۔

اپنے اتنے شاندار اور نادر و نایاب خیالات رکھنے والے چاچو کے لیے میں ہنی کا انتخاب کر رہی تھی۔ ڈاکٹر چاچو انڈین سوپس اور انڈین فلموں سے نالاں اور ہنی ان کی عاشق، کون کون سی فلمیں ریلیز ہو چکیں اور کون سی ریلیز ہونے والی ہیں ان سب کی اپ ٹو ڈیٹ معلومات رکھنے والی۔ کتابیں پڑھنے میں انہیں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اپنی فیلڈ سے ہٹ کر دوسرے کسی موضوع پر کتابیں پڑھنے کا انہیں کبھی شوق نہیں رہا تھا بلکہ وہ تو اخبار بھی بحالتِ مجبوری صرف حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنے کے لیے دیکھ لیا کرتی تھیں۔ واقعی وہ ''دیکھتی'' تھیں، پڑھتی نہیں تھیں اور رہا میوزک..... تو وہ تمام پاپ گلوکار جو چاہے دیسی ہوں یا بدیسی، انہیں محبوب تھے، جنہیں چاچو بے سرا کہا کرتے تھے۔ ذاتی پسند و ناپسند میں دونوں ایک دوسرے کی ضد اور اپنی اپنی ذات میں بقول امی کے پاگل اور خبطی سے۔ میں ان دونوں پاگلوں کو باہم ایک کر دینے کے خواب دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر چاچو میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو کسی بھی لڑکی کے آئیڈیل میں ہو سکتی ہیں سوائے اس کتابوں، فلموں اور میوزک والے کریز کے۔ ہنی سے میری محبت کا یہ واضح ثبوت تھا کہ میں ان کے لیے ایک شاندار بندہ پسند کر رہی تھی۔ رہے چاچو تو ہنی ان کے لیے بہت اچھی بیوی ثابت ہو سکتی تھیں۔ یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ اچھی کتابوں، اچھی فلموں اچھے میوزک سے شغف رکھنے والی اچھی بیوی بھی ثابت ہوگی؟ پھر ہنی امی ہی کی بہن تھیں۔ جب بقول دادی کے امی نے ابا کے فلموں، کتابوں اور میوزک کے اعلیٰ درجہ کے تمام شوق چھڑوا دیئے تو ہنی بھی چند سالوں بعد چاچو کو ایسا ہی بنا دیں گی۔

اپنی پاگل پاگل سی ہنی کے لیے مجھے اپنے پاگل پاگل سے چاچو بھا گئے تھے اور اب تھوڑا سا پاگل پن شوکر کے مجھے یہ پرفیکٹ قسم کا پاگل کپل بنوانا تھا۔ اپنے ذہن میں آتے اس منفرد اور شاندار خیال کو خیالوں کی دنیا سے نکال کر حقیقت تک پہنچانا انتہائی مشکل اور جان جوکھوں کا کام تھا مگر مجھے اسے کرنا تو تھا ہی۔

☆

ہنی روحیل، بہروز اور مبشر کے ساتھ بیٹھی ہمارے گھر آنے والے اردو اخبار کا ہفتہ وار میگزین کھولے ہوئے تھیں۔ وہ چاروں مل کر اس میں دیئے کسی پیر یا عامل صاحب کے اشتہار اور اس میں شامل لوگوں کے خطوط کا مذاق اڑا رہے تھے۔

''شاہ جی! میں نے بیٹی کی شادی کے لیے آپ سے نقش بنوایا تھا، بیٹی کی شادی آپ کی دعاؤں سے بخیریت ہو گئی ہے اب نقش کا کیا کروں؟''

''پیر صاحب! میں نے بیٹے کی کینیڈا میں ملازمت کے لیے آپ سے نقش لیا تھا۔ بیٹے کی ایک ماہ پہلے وہاں مستقل ملازمت ہوگئی، اب نقش کا کیا کرنا ہے؟''

''شاہ صاحب! میں نے اولادِ نرینہ کے حصول کے لیے آپ سے نقش حاصل کیا تھا، اللہ نے مجھے بیٹا دے دیا ہے۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟''

ہنی با آواز بلند سوالات پڑھ رہی تھیں اور روحیل وغیرہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

''بیٹی! آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے اور نقش اپنے پاس سنبھال کر رکھیے۔''

ہنی آخری والے خط کا جواب پڑھتے ہوئے خود بھی ہنسنا شروع ہوگئیں۔

''لگتا ہے یہ سارے خط پیر صاحب نے خود لکھے ہیں۔ ہر خط مسئلہ حل ہونے کے بعد لکھا گیا ہے اور مسئلے سارے وہ ہیں جو اس وقت ہمارے معاشرے کے سب سے بڑے مسئلے ہیں۔ بیٹی کی شادی، بیٹے کی نوکری، کیسے کیسے یہ پیر اور بابے سادہ لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ پیر صاحب! اب میں کیا کروں؟ واہ ری معصومیت۔ کیوں نگی! تم کیا کہتی ہو اس بارے میں؟''

ہنی نے مجھے بھی شاملِ گفتگو کرنا چاہا، میں لاؤنج میں ان لوگوں سے ذرا ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھی اور ان چاروں کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھی۔ کل سے اب تک میں ایک ہی مسئلے میں الجھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر چاچو کی توجہ ہنی کی جانب کس طرح مبذول کروانی تھی، یہ تو کافی غور و فکر کے بعد میرے زرخیز ذہن نے سوچ لیا تھا مگر ہنی! ان کے ساتھ کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ہنی کی بات کا جواب دینے کے بجائے فون کی طرف نگاہ کی جس کی گھنٹی بڑے زور و شور سے بجنا شروع ہوئی تھی۔

''ہیلو۔'' میں نے ریسیور اٹھایا۔

''میں علی بول رہا ہوں، ڈاکٹر ماموں ہیں؟''

آج وہ ''علی بول رہا ہوں'' کے بعد چپ نہیں ہوا تھا۔ مجھ سے پہلے اس نے جس سے بات کرنی تھی اس کا نام لے دیا تھا۔

''کمینہ نہ ہو تو۔'' میں نے ریسیور کو گھورا اور روحیل سے بولی۔

''روحیل! جاؤ ڈاکٹر چاچو کو بتا کر آؤ، ان کے بھانجے کا فون ہے۔'' پھر میں ریسیور سائیڈ میں پٹختے ہوئے وہیں کھڑے ہو کر خاصے زور سے بولی۔

''اتنے امیر ابا ہیں، بیٹے کو کتابیں نہیں خرید کر دیتے، بیچارے کو یہاں وہاں سے مانگنی پڑتی ہیں۔''

ظاہر ہے ڈاکٹر چاچو سے کوئی کتاب مانگنے ہی کے لیے فون کیا گیا ہوگا۔ ہنی میری تپی ہوئی شکل دیکھ کر ہنس رہی تھیں جب کہ میں اسے یہ جملہ سنا کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

''ابھی تک موڈ خراب ہے میری چندا کا۔'' ہنی کافی دیر بعد کمرے میں آئی تھیں۔

میں اس منحوس کے فون کو کب کا بھول بھی چکی تھی، کمرے میں آتے ہی میں نے ایک مرتبہ پھر ہنی اور ڈاکٹر چاچو کی شادی کس طرح ہو، سوچنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں شاید میری خاموشی اور سنجیدگی سے ایسا لگا تھا کہ میرا موڈ ابھی بھی اس موٹے آلو کی وجہ سے خراب ہے۔ میرے پاس اتنا فالتو خون نہیں تھا جسے میں اس کے بارے میں سوچ سوچ کر جلاتی۔

''یار نگی! میں ایسا کرتی ہوں، تیرا یہ مسئلہ پیر صاحب ہی کی خدمت میں پیش کر دیتی ہوں۔'' شاہ صاحب! میری پیاری بھانجی کا بدتمیز منگیتر اسے گھاس نہیں ڈالتا۔ نہ نہ..... آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ وہ بے چاری کوئی گائے یا بکری ہے۔ ویسے آپ چاہیں تو اسے معصوم گائے، بے زبان گائے یا اللہ میاں کی گائے سمجھ سکتے ہیں۔ ایسا نقش عطا فرمایئے کہ محبوب (منگیتر) اس معصوم کے قدموں میں آ کر بیٹھ جائے۔''

ہنی کے مسخرے پن پر مجھے بے ساختہ ہنسی آنے لگی تھی مگر میں نے بڑی مشکلوں سے اس کا گلا گھونٹا۔ چونکہ اچانک ہی ایک آئیڈیا میرے ذہن میں آ گیا تھا اور کل سے جو میں ہر آئیڈیے کو بوگس اور ناقابلِ عمل قرار دیئے چلی جا رہی تھی، اس وقت علی کے فون نے میرا وہ مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دیا تھا۔ اپنے ذہن میں ایک مکمل شیطانی منصوبے کے آنے کی دیر تھی میں نے غور و فکر میں ڈوبے اپنے منہ پر خاصی اداسی طاری کی اور قصداً اسے دائیں جانب گرا دیا۔

''Big show کے لیے اتنی اداسی، چہ چہ..... کیا ہو گیا میری بھانجی کے ٹیسٹ کو۔'' ہنی کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

''ہنی! میں اس وقت بہت غصے میں ہوں، آپ مجھ سے بات مت کریں۔''

''ارے وہ تم سے بات نہیں کرتا تو تم بھی اسے نظر انداز کیا کرو۔ کیا ضرورت ہے اسے اہمیت دینے کی، دفع کرو۔'' انہوں نے بیڈ پر میرے قریب بیٹھتے ہوئے جھٹ پٹ حل پیش کر دیا۔

''ہنی! آپ کی کبھی کسی سے منگنی ہوئی ہوتی اور وہ آپ کو اگنور کرتا پھر میں آپ سے پوچھتی ''دفع کرو'' دفع کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ جب اک لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ اتنے قریبی رشتے میں بندھتی ہے پھر اس کی کیا فیلنگز ہوتی ہیں، آپ کیسے سمجھ سکتی ہیں۔'' میں نے چڑچڑے پن سے انہیں جواب دیا۔

''ایک لڑکی اور اس کی فیلنگز۔'' انہوں نے مجھے بغور دیکھا پھر شرارت سے ایک آنکھ دبا کر خالص فلمی لہجے میں بولیں۔

''نگی! کہیں تمہیں اس سے پیار تو نہیں ہو گیا؟''

میں نے اپنی مسکراہٹ کو بڑی مشکلوں سے ضبط کر کے چہرے پر غصے اور ناراضی سے بھرپور تاثرات سجا لیے۔

''رہنے دیں ہنی! آپ کے ساتھ اس موضوع پر بات کرنا واقعی بے کار ہے۔ آپ میری فیلنگز کو ہرگز ہرگز نہیں سمجھ سکتیں۔ اصل میں آپ کا قصور نہیں ہے۔ آپ ابھی کسی کے ساتھ ایسے رشتے میں بندھی ہی نہیں ہیں۔ کیسے جان سکتی ہیں آپ کہ کوئی لڑکی اپنے منگیتر یا ہونے والے شوہر کے حوالے سے کیا کیا کچھ سوچتی ہے اور اس سے کیا کیا کچھ چاہتی ہے۔''

میں نے بظاہر سادہ سے لہجے میں ان پر ایک بے رحمانہ تبصرہ کیا۔ اپنے ان بے رحمانہ اور ظالمانہ جملوں پر میں نے خود کو دل ہی دل میں

ڈھیر ساری شاباش دی۔ ہنی کے چہرے پر سے ایک پل کو مسکراہٹ واقعی غائب ہوئی تھی۔ میں نے انہیں یہ بات کہی ہی اتنے منہ پھٹ انداز سے تھی کہ وہ اپنی ازلی شوخی ایک پل کے لیے بھلا کر سنجیدہ ہوئیں مگر پھر اگلے لمحہ وہ دوبارہ ویسے ہی من موجی موڈ میں آ گئیں۔

''اچھا چلو موڈ ٹھیک کرو، سونی پر مادھوری کی بہت اچھی فلم آ رہی ہے، چلو وہ دیکھتے ہیں۔'' انہوں نے ٹی وی آن کر دیا۔ دادی کے ساتھ ہنی کے بڑے خوشگوار تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ ان کے آ جانے سے دادی کو اپنے ساتھ اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھنے والی ایک ہستی میسر آ گئی تھی۔ وہ دونوں گہری سہیلیوں کی طرح ساس اور بہو کے مسئلے مسائل سے اٹے تمام احمقانہ ڈرامے بڑے ذوق وشوق سے دیکھا کرتی تھیں اور ہنی پر آتے اس پیار ہی کی بدولت دادی نے اپنی جانب سے غیر معمولی مہمان نوازی کی انتہا کرتے ہوئے اپنے کمرے میں رکھا ٹی وی میرے کمرے میں رکھوا دیا تھا۔ جب تک ہنی یہاں تھیں یہ ٹی وی یہیں رہنا تھا۔ ہنی نے تکلفاً منع بھی کیا تو دادی نے ''میں تو ٹی وی لاؤنج ہی میں دیکھ لیتی ہوں یہ بیکار کمرے میں پڑا رہتا ہے'' کہہ کر ان کے انکار کو رد کر دیا۔

ہنی کے سوا یہ سلوک کسی اور کے ساتھ ہوا ہوتا تو میں جل بھن کر کباب ہو جاتی۔ میں کبھی کچھ کہتی تو انہیں لگتا کہ مجھے بوڑھی دادی کے کمرے میں رکھا ٹی وی اور دوسری سہولیات کھٹکتی ہیں۔ ایک تو یہ اچھا سلوک ہنی کے ساتھ ہو رہا تھا اوپر سے خوشی کی بات یہ تھی کہ مستقبل کی ساس بہو کے درمیان پہلے ہی سے خوشگوار تعلقات قائم ہو رہے تھے۔ جب یہ رشتہ دادی کے سامنے پیش ہو گا تو کیونکہ ہنی ان کی بہو کی چھوٹی بہن ہیں یہ کہہ کر دادی اسے مسترد نہیں کر پائیں گی۔ مجھے اپنے خیالی پلاؤ پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ ابھی یہ سب کتنی دور کی باتیں تھیں نا۔

☆

''آیئے ڈاکٹر نگار۔'' میں ڈاکٹر چاچو کے کمرے میں آئی تو انہوں نے شوخی اور شرارت سے میرا استقبال کیا۔

ہم دوستوں نے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو جانے سے پہلے ہی ایک دوسرے کو ڈاکٹر ثنا، ڈاکٹر بیلا، ڈاکٹر حرا اور ڈاکٹر نگار وغیرہ وغیرہ کہنا شروع کر دیا تھا اور کوئی ابھی ہمیں ڈاکٹر نہیں مان رہا تو چلو ہم خود تو آپس میں ایک دوسرے کو عزت دے لیں۔ یہ طرزِ تخاطب ایک بار ڈاکٹر چاچو کے کانوں میں پڑ گیا تھا اور تب سے وہ مجھے اس نام سے چھیڑنے لگے تھے۔ کیا ہوا جو ڈاکٹر صاحبہ کو ابھی سوائے بی پی چیک کرنے کے جو میڈیکل کالج میں داخلے سے بہت پہلے ہی ڈاکٹر چاچو سے سیکھا تھا اور کچھ نہیں آتا تھا، تھی تو میں مستقبل کی ڈاکٹر ہی نا۔

''ڈاکٹر چاچو! مجھے آپ سے ایک کام تھا۔'' میں ان کے پاس آ گئی۔

وہ اس وقت عابدہ پروین کو سن رہے تھے اور ہاتھ میں ان کے اسلامک آرکیٹیکچر پر کوئی کتاب تھی۔ میرے ذہن میں اس منظر کو دیکھ کر ہنی آنے لگیں جن سے ابھی ابھی میں شاہ رخ اور ریتھک کی اس سال ریلیز ہونے والی تمام موویز کی تفصیلات سن کر آئی تھی۔ ڈاکٹر چاچو کتاب بند کر کے پوری طرح میری طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

''اگر آپ اپنے پاس رکھی موویز کی وی سی ڈیز میں سے مجھے ایک دو دے دیں تو۔''

''یہ میرے کان کیا سن رہے ہیں؟'' انہوں نے حیرت سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میرے ''ذوق'' کا انہیں بہت اچھی طرح اندازہ تھا۔

''مجھے اپنے لیے نہیں ہنی کے لیے چاہیے۔ وہ بے چاری یہاں آ کر اتنی بور ہو رہی ہیں۔ اب ان کے مطلب کی موویز تو صرف آپ ہی کے پاس مل سکتی ہیں۔''

میں نے اپنی شکل پر ڈھیر ساری معصومیت اور مجبوری طاری کی۔ ڈاکٹر چاچو اپنی دنیا میں مگن رہنے والے انسان تھے۔ انہیں ہنی کے بارے میں سوائے اس بات کے کہ وہ ان کی بھابھی کی چھوٹی بہن ہیں اور کچھ نہیں معلوم تھا پھر وہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کئی سال ملک سے باہر رہے تھے اس لیے وہ ہنی کے بارے میں اور ہنی ان کے بارے میں کچھ خاص نہیں جانتے تھے۔ میں ان دونوں سے ان دونوں کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ دیتی اس پر انہیں فوراً یقین آ جانا تھا۔

''اچھا یہ آواز تمہارے کمرے سے آ رہی ہے۔'' چاچو نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جی ''آنند'' ہے۔ ہنی دیکھ رہی ہیں اس لیے تو میں آپ کے پاس آ گئی کہ ان بے چاری کو بوریت دور کرنے کے لیے کئی دفعہ کی دیکھی ہوئی فلم پھر دیکھنی پڑ رہی ہے۔''

''آنند'' چاچو کے معیار کے حساب سے اچھی فلموں میں شامل کی جاتی تھی یا نہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں تھا مگر اتنا ضرور کسی میگزین میں پڑھا تھا کہ اس فلم کا شمار کلاسکس میں ہوتا ہے۔ ہنی کو بڑی مشکلوں سے یہی فلم لگائے رکھنے پر یہ کہہ کر آمادہ کیا تھا۔

''ہنی! ''کل ہو نہ ہو، آنند'' ہی کا توری میک ہے۔ پلیز یہی چینل لگا رہنے دیں۔''

وہاں وہ فلم لگوا کر اور وہ بھی ذرا اونچی آواز میں میں چاچو کے کمرے میں آئی اور آتے ہی اس بات نے مجھے تقویت پہنچائی کہ چاچو کا کمرہ جو میرے کمرے کے بالکل برابر میں تھا وہاں فلم کا ایک ایک ڈائیلاگ صاف سنائی دے رہا تھا۔

''لے لو جو مووی تمہیں چاہیے۔'' وہ مجھے ساتھ لے کر اپنے مووِیز کے عظیم الشان ذخیرے والے شیلف کے پاس آ گئے۔ اس شیلف پر ڈھیر ساری وی سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز موجود تھیں۔ اب اس انتخاب میں سے مجھے کس کا انتخاب کرنا چاہیے تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''کس طرح کی موویز پسند ہیں انہیں؟''

''ہر وہ مووی جس میں ریتھک موجود ہو۔'' ڈاکٹر چاچو کے استفسار پر میں نے دل میں کہا۔

''وہ انگلش اور اردو دونوں فلمیں شوق سے دیکھتی ہیں؟''

''پتا نہیں۔'' میرے جواب میں احمقانہ کیا بات تھی جو چاچو مسکرائے تھے۔ چلو اگر میں احمق اور بدذوق ثابت ہو بھی رہی تھی تب بھی خیر تھی۔ بس ہنی کو ایسا ثابت نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے تمام وی سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز پر سنجیدگی سے نگاہیں دوڑانی شروع کیں۔

''Lawrence of Arabia Gone with the Wind Roman Holiday Great Barefoot The hours escape Ten commandments The Devils''

''امر پریم، مغلِ اعظم، آہ، صدمہ، پاکیزہ'' پتا نہیں کون کون سی موویز تھیں۔ سارے نام میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ان سب

میں سے میں نے صرف ''مغلِ اعظم'' اور ''The hours'' کے نام سن رکھے تھے۔ ''مغلِ اعظم'' اور دلیپ کمار اور ''جب پیار کیا تو ڈرنا کیا'' والے گانے کی وجہ سے اور ''The Hours'' نکول کڈمین کے آسکر ایوارڈ کی وجہ سے۔

ڈاکٹر چاچو نے میری نگاہیں ''The hours'' پر جمی دیکھیں تو پتا نہیں ورجینا وولف کا نام لے کر مجھے کیا کیا مشکل باتیں بتانے لگے۔ نجانے یہ ورجینا وولف تھی کون؟ سب میرے سر پر سے گزرا تھا۔

''The hours'' ہنی نے دیکھی ہوئی ہے، وہ مجھ سے اس کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔''

سنا ہے پچھلے وقتوں میں جھوٹ بولنے والوں کے منہ ٹیڑھے ہو جایا کرتے تھے۔ شکر ہے اب ایسا نہیں ہوتا۔ میرا جواب سن کر چاچو مسکراتے ہوئے بولے۔

''یہ فلم سب لوگوں کے لیے نہیں ہے، یہ صرف ان ہی لوگوں کو اچھی لگ سکتی ہے جو ادبی ذوق رکھتے ہیں۔''

شکر تھا یہ ''ذوق'' میرے پاس نہیں تھا۔ یہ کون سی قسم کی فلم تھی جسے دیکھنے سے پہلے Mrs.Dalloway اور The hours نام کی کتابیں پڑھنا ضروری تھیں۔ فلم دیکھنا گویا سی ایس ایس کے ایگزامز کی تیاری کرنا تھا۔ میں نے ذرا سے غور و فکر کے بعد ''Barefoot'' اور ''آہ'' اٹھا لیں۔

''ڈاکٹر چاچو! آپ کے پاس میوزک کا بھی اتنا اچھا کلیکشن ہے جیسا میوزک میں سنتی ہوں اسے تو ہنی بے سرا کہتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک دو سی ڈیز لے جاؤں؟''

''ہاں لے جاؤ، ویسے اگر وہ اپنی پسند سے خود آ کر لیتیں تو زیادہ بہتر تھا۔''

''ہنی ذرا تکلف کرتی ہیں ڈاکٹر چاچو! آپ کے انتخاب سے متاثر ہیں مگر خود لینے نہیں آئیں گی۔''

ڈاکٹر چاچو نے میرے جواب پر بات سمجھ لینے والے انداز میں سر ہلایا تو میں نے جلدی جلدی بغیر کچھ پڑھے میوزک کی تین سی ڈیز اٹھائیں اور پھر واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

''کہاں چلی گئی تھیں؟'' ہنی ٹی وی اسکرین کی طرف اکتائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''اتنی فضول فلم ہے، ایک سین شروع ہوتا ہے تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا اور یہ راجیش کھنہ، اس سے کہیں اچھا تو شاہ رخ لگا ہے ''کل ہو نہ ہو'' میں.....'' میں نے ہنی کی نگاہوں سے چھپا کر وی سی ڈیز اور سی ڈیز جلدی سے الماری میں رکھیں اور پھر ٹی وی بند کر کے ہم دونوں لڈو کھیلنے لگے۔ اس فلم سے بہتر لڈو کھیلنا لگ رہا تھا ہنی کو۔ یا اللہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی کیسے؟ میں نے کراہتے ہوئے سوچا۔

☆

میں اسٹور میں کوئی کتاب ڈھونڈنے نہیں گھسی تھی۔ مجھے تو وہاں صفائی کے لیے بھیجا گیا بلکہ دھکیلا گیا تھا۔ وہاں جانا حکمِ حاکم تھا اور میں بے چاری حکم ماننے پر مجبور۔ میری چھٹی کا بہترین مصرف امی کو یہ نظر آیا تھا کہ مجھ معصوم سے اسٹور کی صفائی کروالی جائے۔

''کباڑ خانہ بنا کر رکھا ہوا ہے، اگر وہ اسٹور روم ہے تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہاں پاؤں رکھنے کی جگہ بھی نہ چھوڑی جائے۔''

اسٹور تو اسٹور ہی ہوتا ہے، ڈرائینگ روم تو نہیں۔ پتا نہیں ہمارے اسٹور کا معائنہ کرنے کس کی ''تشریف'' آنے والی تھی جو وہاں کی صفائی از حد ضروری تھی۔ امی کا صفائی ستھرائی کا یہ جنون اور کسی کی تو نہیں اکثر میری ہی مصیبت لے آیا کرتا تھا۔ ہماری امی کو آپ ''جالا اسپیشلسٹ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ جالے صاف کرنے میں انہوں نے واقعی پی ایچ ڈی کر رکھا ہے۔ ایسی ایسی جگہوں پر وہ گھستی اور جالے برآمد کر لاتی ہیں جہاں عام آدمی کی نگاہ پہنچ بھی نہیں سکتی۔ حالانکہ ابا نے گھر میں تین تین ماسیاں رکھی ہوئی ہیں، ان میں ایک تو صبح سے شام تک کے لیے رکھی ہوئی ہے پھر اوپر کے اور گھر سے باہر کے کام کرنے کے لیے ایک لڑکا الگ ہے۔ ان سب کے باوجود امی کی تشفی اپنے ہاتھوں ہی سے صفائی کر کے ہوتی تھی۔ دادی تک کو ان کے صفائی کے جنون سے ہول اٹھتے تھے۔

''جن کونوں میں میں گھستی ہوں وہاں کوئی نوکر گھس سکتا ہے؟۔ اگر میں تھوڑے دنوں کے لیے بھی کہیں چلی جاؤں تو گھر میں کیڑے پڑ جائیں گے۔''

میں نے پڑھائی کا بہانہ بناتے ہوئے اس کام سے بچنے کی کوشش کی تو امی نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور یوں مجھے اسٹور میں آتے ہی بنی۔ وہیں صفائی کے دوران مجھے بہت ساری کتابیں بڑے خستہ حالوں میں بے ترتیبی سے ایک کے اوپر ایک رکھی ملیں۔ اس کا مطلب ہے دادی ابا کے کتابوں کے شوق کے بارے میں صحیح بتاتی تھیں۔ وہ ابا کی کتابیں تھیں اور بڑے دکھ بھرے لہجے میں مجھ سے کہہ رہی تھیں۔

''دیکھو ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو'' بعضوں نے نیرہ نور کی طرز پر ''کبھی ہم بھی پڑھے جاتے تھے، شیلفوں میں بسائے جاتے تھے۔'' بھی گایا۔

میں نے ڈاکٹر چاچو کی کتابوں کا مستقبل سوچا۔ یار بے ضرر سا ہی تو شوق ہے چاچو کا ہنسی سے کہوں گی اس معاملے میں امی کی بہن ہونے کا ثبوت مت دیجئے گا۔

ان کتابوں کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک دوسری بات اور آئی تو میں نے ان میں سے ایک نسبتاً اچھی حالت میں موجود کتاب اٹھالی۔ وہ تھامس ہارڈی کی Jude the obscure تھی۔ میں اس رائٹر کے بارے میں سرے سے کچھ نہیں جانتی تھی پر یہ ابا کا کلیکشن تھا، یقیناً اچھی ہی کتاب ہوگی۔ میں اس ناول کو صفائی کے بعد اپنے ساتھ اٹھا لائی تھی۔

ڈاکٹر چاچو لنچ کرنے گھر آیا کرتے تھے مگر یہ آمد قدرے تاخیر سے ہوتی تھی اور ہم گھر کے افراد لنچ کر چکے ہوتے تھے اور جنہیں قیلولہ فرمانا ہوتا تھا وہ سو بھی چکے ہوتے تھے۔ چاچو کی پریکٹس بہت اچھی چل رہی تھی۔ تین ساڑھے تین بجے لنچ کے لیے گھر آ کر اور آدھ پون گھنٹے بعد واپس چلے جانے کے بعد پھر وہ رات دس بجے گھر لوٹا کرتے تھے۔ دس بجے بھی وہ ابا کے بے انتہا ناراض ہونے پر آنے لگے تھے ورنہ پہلے تو رات کے بارہ بجے تک ان کا پتا نہیں ہوتا تھا۔ ابا نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں پیسے کے پیچھے اس طرح بھاگنے کی کہ اپنی صحت تک برباد کر ڈالو، تمہارے دوسرے کولیگز ایسا کرتے ہیں تو انہیں کرنے دو، تمہارے پاس تمہارے اپنے لیے اور تمہارے گھر والوں کے لیے وقت نہ ہو تو پھر فائدہ ایسی محنت اور خواری کا؟''

امی چاچو کو لنچ دینے کے لیے جاگی ہوئی تھیں۔

''امی آپ لیٹ جائیں، ڈاکٹر چاچو کو کھانا میں دے دوں گی۔''

میرے نیک پروین اور اچھی بیٹی بننے والی اس ادا پر امی نے کافی حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر سر ہلاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں لاؤنج میں بے چینی سے ڈاکٹر چاچو کا انتظار کر رہی تھی۔ ہارڈی کا ناول میں نے سینٹر ٹیبل پر الٹا کر کے اس انداز سے رکھ دیا تھا جیسے کوئی پڑھتے پڑھتے کسی کام سے اٹھ گیا ہو۔

''السلام علیکم ڈاکٹر چاچو!'' اللہ اللہ کر کے ان کی آمد ہو ہی گئی تھی۔

''آپ ہاتھ منہ دھولیں، میں آپ کے لیے کھانا یہیں لے آتی ہوں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے میرے سلام کا جواب دیا تو میں نے جھٹ یہ بات کہی۔

میں کھانے کی ٹرے لے کر لاؤنج میں آئی تو وہ فریش ہو کر آ چکے تھے اور اب صوفے پر بیٹھے تھے۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا میگزین انہوں نے اٹھا کر دیکھنا شروع کیا ہوا تھا۔

''ایک تو چاچو بھی ناں بس..... سائیڈ میں رکھا میگزین انہیں نظر آ گیا، آنکھوں کے عین سامنے رکھی کتاب دکھائی نہیں دے رہی۔''

''کیا پکا لیا؟'' انہوں نے کھانے کی خوشبو کو انجوائے کرتے ہوئے ڈشوں کے ڈھکن اٹھانے شروع کیے۔

''کوفتے، واہ بھئی مزہ آ گیا۔ بھابھی بیگم کے ہاتھوں کے کوفتے بھوک نہ بھی ہو تو بھی کھانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔''

''چاچو! کوفتوں کے باؤل سے نگاہیں ہٹا کر پلیز سامنے بھی تو دیکھیں۔'' کوفتوں کی قصیدہ خوانی ہوتے دیکھ کر میرا دل فریادی ہو رہا تھا۔ خود سے میں اس بارے میں کوئی بات شروع کرنا نہیں چاہتی تھی اور چاچو تھے کہ انہیں اس ایک ناول کے سوا وہاں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

''ارے یہ کیا ہے، ہارڈی کا ناول؟ یہ کون پڑھ رہا ہے؟ آخر کار میری مشکل آسان ہو ہی گئی تھی۔ نوالہ منہ میں لے جاتا ان کا ہاتھ مارے حیرت کے اپنی جگہ ہی رک گیا تھا۔ ان کا حیرت سے گنگ ہو جانا اپنی جگہ بجا تھا، اس گھر میں ان کے علاوہ کتابوں کا شوقین کون پیدا ہو گیا تھا؟

''یہ ناول؟'' میں نے حیران نظر آنے کی بھرپور ایکٹنگ کی، ایسے جیسے میں نے بھی اسے ابھی ہی دیکھا ہو۔

''ہاں یاد آیا، یہ بنی پڑھ رہی تھیں نا رات میں یہاں بیٹھ کر۔ اصل میں لائٹ مجھے ڈسٹرب کر رہی تھی اور بنی کو رات کو کچھ پڑھے بغیر نیند نہیں آتی۔ اس لیے وہ کتاب لے کر یہاں آ گئی تھیں۔'' (اگر کہیں اداکاری کا مقابلہ ہو تو میرا خیال ہے میں اس میں اول پوزیشن حاصل کر لوں گی۔)

ڈاکٹر چاچو کو یہ جواب دیتے ہوئے میرے ذہن میں بنی آ رہی تھیں جنہوں نے رات میرے ساتھ ''اسپائڈر مین'' دیکھی تھی اور جو یقیناً میری ہی طرح تھامس ہارڈی نام کے ان صاحب سے ناواقف ہی ہوں گی۔

1895ء میں چھپا تھا، یہ ناول ہارڈی کا آخری ناول ہے، تب مغرب کی قدریں اب سے بہت مختلف تھیں اسی لیے اس زمانے میں اس ناول پر بہت تنقید ہوئی تھی، بہت شور مچا تھا، کافی برا بھلا کہا گیا تھا اور اس بے تحاشا تنقید کا اثر تھا کہ ہارڈی نے آئندہ فکشن لکھنے سے انکار کر دیا تھا۔''

چاچو روانی سے بولتے بولتے چپ ہوئے پھر میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

''رہنے دو، میں غلط جگہ، غلط بات کرنا شروع ہو گیا۔''

چاچو سے غلط جگہ، غلط بات ہونے لگی تھی تو کیا ہوا کم از کم میں نے صحیح جگہ، صحیح بات کر دی تھی۔ پرسوں رات جو میں ہنی کا نام لے کر فلمیں اور گانے ان سے لائی تھی انہوں نے ہی ہنی کا امیج چاچو کی نگاہوں میں زبردست بنا دیا تھا۔ مزید اب یہ ناول، اس نے تو اس امیج کو چار چاند لگا دیئے ہوں گے اور پھر سب کچھ اتنی ہوشیاری سے کہ اس میں مکاری کا گمان تک نہ ہو۔ فلموں اور میوزک کی وی سی ڈیز اور سی ڈیز کا چاچو پر اچھا اثر پڑا، یہ میں نے یوں جان لیا تھا کہ ہنی کو آئے ہفتہ دس دن ہو چکے تھے اور ان تمام دنوں میں چاچو نے ان سے سلام دعا اور انتہائی رسمی قسم کی خیریت سے آگے بڑھ کر کوئی بات نہیں کی تھی۔ ان دونوں کی ملاقات بھی اکثر صرف ناشتے اور ڈنر کی ٹیبل پر ہوا کرتی تھی۔ مگر کل رات کھانے کے دوران چاچو نے ہنی سے ''آپ ٹھیک ہیں، خیریت سے ہیں۔'' سے ہٹ کر ان کی جاب کے حوالے سے کافی تفصیلی گفتگو کی تھی۔ یہ ایک شعبہ ایسا تھا جس میں ہنی کی قابلیت میں کچھ شبہ نہیں تھا۔ انہوں نے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کر رکھا تھا اور ایک بہت ہی بڑے ادارے میں کافی اونچی پوسٹ پر فائز تھیں۔ ڈھیر سارے لوگ تو ان کے ماتحت کام کرتے اور ان کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ چاچو ان کی جاب اور پوسٹ سے خاصے امپریس نظر آئے تھے مگر اس سے پہلے جن بے شمار لڑکیوں سے انہوں نے شادی سے انکار کیا تھا گھاس تو وہ بے چاریاں بھی نہیں کھودا کرتی تھیں اور نہ ہی ان میں سے کسی نے چنے دے کر ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ جاب سے ہٹ کر جب وہ ہنی سے فلموں، کتابوں اور میوزک والے موضوعات پر گفتگو کریں گے، پھر کیا ہوگا؟ چاچو کی توجہ میں نے ہنی کی طرف مبذول تو کروا دی تھی مگر آنے والے وقت کا سوچ کر پریشان بھی ہو رہی تھی۔

☆

ہنی اور میں بیوٹی سیلون آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی لکس پر بہت توجہ دیتی تھیں۔ ہیئر اسٹائل، میک اپ، لباس، جیولری وہ ہر چیز کا بہت دھیان رکھتی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے دنوں بعد وہ اپنے بالوں کا رنگ اور ان کی کٹنگ کا انداز تبدیل کرواتی رہتی تھیں اور سب سے بڑی خوبی کی بات یہ تھی کہ یہ تمام تبدیلیاں ان پر ہمیشہ اچھی لگا کرتی تھیں۔ آج وہ اپنے اسٹیپس میں کٹے بالوں کو شارٹ کروانے اور ان میں اسٹریکنگ کروانے آئی تھیں۔ مجھے تو ابھی صرف اتنی اجازت تھی کہ میں بالوں کی ٹرمنگ کروالوں یا پھر کلینزنگ کروالوں، باقی تھریڈنگ، ویکسنگ سب ابھی مجھ پر حرام تھیں۔

''جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں میڈیکل کالج پہنچے ہوئے، ابھی سے یہ سب کچھ شروع کیا تو شکل پر ''پکا پن'' آجائے گا، ساری معصومیت ختم ہو جائے گی۔ ہر کام عمر کے ساتھ اچھا لگتا ہے۔''

یہ ہماری امی کا فرمان تھا، بتایا تھا نا میں نے امی موقع محل کے حساب سے میری چھوٹائی بڑائی میں تبدیلی کرتی رہتی تھیں۔

تازہ تازہ ہربل فیشل لینے اور بالوں کو خوب صورت سا اسٹائل دلوانے کے بعد جب ہنی میرے ساتھ سیلون سے باہر نکلیں تو کچھ اترا کر پوچھنے لگیں۔

''کیسی لگ رہی ہوں میں نگی؟'' میں اتنی دیر سے ان کی خوب صورتی اور نزاکت پر غور کرتی انہیں دل میں سراہے جا رہی تھی مگر زبان سے

ارادہ رکھتے تھے کہ میں نے انہیں اپنے ایک اسائنمنٹ سے متعلق کام کا حوالہ دے کر کچھ دیر رکنے کو کہہ دیا۔

''ہٹاؤ اس کتاب وتاب کو، میں تب تک ٹی وی دیکھ لیتی ہوں۔'' وہ ٹی وی آن کر کے میرے سارے پروگرام کو چوپٹ کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

''کچھ بھی نہیں آرہا ٹی وی پر، سارے چینلز خراب آرہے ہیں اور اسٹار پلس تو سرے سے لگ ہی نہیں رہا۔''

''یا اللہ، کہیں ہنی اٹھ کر چیک نہ کرلیں۔'' میں نے دعا مانگی۔ شکر تھا انہیں میری زبان پر اعتبار تھا، میرے جھوٹ کو سچ مان کر وہ واقعی مشتاق احمد یوسفی کی ''زرگزشت'' جو میں نے انہیں اسٹور والے خزانے ہی میں سے لاکر دی تھی دیکھنے لگیں۔ ڈاکٹر چاچو کے آنے کا ٹائم ہو چکا تھا پر وہ ابھی آئے نہیں تھے۔

''اتنا اچھا میں نے ماحول ترتیب دیا ہے وہ بھی بڑی مشکلوں سے۔ چاچو! پلیز جلدی آجائیں۔''

ہنی لاؤنج میں ایک کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی ہیں۔ بیک گراؤنڈ میں غلام علی کی غزلیں دھیمے سروں میں بج رہی ہیں۔ یہ غزلیں میں نے لاؤنج کے برابر والے کمرے میں لگائی تھیں اور ہنی یہ سمجھ رہی تھیں کہ شاید انہیں ابا سن رہے ہیں، کچھ بولی نہیں تھیں۔ یہ ایک پرفیکٹ سچویشن تھی، اب بس انتظار ڈاکٹر چاچو کا تھا۔

آخر کار ٹیرس پر سے میں نے ان کی گاڑی آتے دیکھ ہی لی۔ میں لاؤنج میں دانستہ چھ سات منٹ بعد آئی۔ ڈاکٹر چاچو ہنی کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں ہنی کو بھی دیکھ رہی تھیں اور اس کتاب کو بھی۔ ''شاباش ویل، ڈن۔'' میں نے خود کو تھپکی دی۔ سلام دعا اور خیر وعافیت یقیناً ان کے درمیان ہو چکی تھی کیونکہ اب چاچو ان سے کسی اور موضوع پر بات کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر چاچو! ہم لوگ تو کھانا کھا چکے، اگر آپ کہیں تو آپ کے لیے یہیں کھانا لے آؤں؟''

میں اتنے رومینٹک سین کو اتنی جلدی ختم نہیں کروانا چاہتی تھی۔

''کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں، ہاں اگر تمہارا مہمان نوازی کا موڈ ہے تو ایک کپ چائے پلا دو۔''

''ہنی! آپ کے لیے بھی لے آؤں؟'' چائے کی تو وہ ازحد شوقین تھیں، گہری نیند سے اٹھا کر بھی اگر انہیں چائے کا پوچھا جاتا وہ تب بھی انکار نہ کرتیں۔

پہلی مرتبہ میں کچن میں بڑی خوشی خوشی گئی۔ تین کپ چائے لے کر میں لاؤنج میں آئی۔ میں اس خوبصورت سچویشن میں ہڈی بننا نہیں چاہتی تھی مگر ہنی سے ڈر بھی تو لگتا تھا، اگر ان کے منہ سے کچھ الٹا سیدھا نکل گیا تو میری ساری محنت برباد ہو جائے گی۔ ڈاکٹر چاچو کے بارے میں تو پتا تھا وہ ہنی سے اس طرح کے کوئی سوال وجواب نہیں کریں گے جیسے کسی بھی ان محترمہ سے کرتے جو انہیں شادی کے لیے کچھ اچھی لگا کرتیں، عموماً ان کے سوالات ایسے ہوتے تھے۔

''آپ شاہ رخ کو زیادہ بڑا مانتی ہیں یار۔ تھک کو؟''

اس وقت میں کچھ اور بولنے کے موڈ میں تھی۔

''اچھی تو لگ رہی ہیں ہنی! پر کیا فائدہ اس خوبصورتی کا؟ آپ کے پاس آپ کی اس خوبصورت سی تبدیلی کو سراہنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ میں آپ کی طرح بے تحاشا خوبصورت نہیں پھر بھی جب کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی رنگ یا کوئی لباس مجھ پر اچھا لگ رہا ہے تو دل چاہتا ہے علی میری تعریف کرے اور جب وہ تعریف نہیں کرتا تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ آپ کا کبھی دل نہیں چاہا ہنی کہ ''کوئی'' آپ کو سراہے، آپ کی خوبصورتی کی تعریف کرے؟ مجھے حیرت ہوتی ہے آپ پر، عورتیں اپنی تعریفیں سننے ہی کے لیے تو اتنا بناؤ سنگھار کرتی ہیں اور آپ؟ آپ کی تعریف بہت سے بہت میں کردوں گی، امی کردیں گی، کل آفس میں آپ کی فیمیل کولیگز کردیں گی کہ مرد کولیگز کو آپ نے زیادہ بے تکلف نہیں کیا ہوا۔''

میں نے بظاہر بہت سادہ اور عام سے انداز میں ان کی بات کا جواب دیا اور پھر ان کا جواب جاننے کی کوشش کیے بغیر گاڑی کی طرف بڑھی۔ ہنی ایک پل کو وہیں کھڑی رہ گئی تھیں۔ میں پچھلے کئی دنوں سے ان کی دکھتی رگ پر اسی طرح ہاتھ رکھا کرتی تھی۔ وقتاً فوقتاً باتوں باتوں میں بڑے دل دکھانے والے انداز میں اس طرح کی باتیں ان سے کہتی۔ ان کے سامنے جان بوجھ کر علی کا ذکر چھیڑتی، وہ مجھے نظر انداز کیوں کرتا ہے، مجھے کبھی کوئی گفٹ کیوں نہیں دیتا، کبھی کوئی فون کال کیوں نہیں کرتا جیسی باتیں کرتی اور جب وہ میرا مذاق اڑاتے ہوئے غیر سنجیدگی سے کوئی تبصرہ کرنے لگتیں تو میں انہیں۔

''آپ کیسے سمجھ سکتی ہیں ان احساسات کو، آپ کو کیا پتا ان فیلنگز کا، نہ آپ کسی کی منگیتر ہیں نہ بیوی، آپ کیسے جان سکتی ہیں اس رشتے کے حوالے سے پیدا ہونے والی کیفیت کو، کبھی کسی نے آپ سے کمٹمنٹ کی ہوتی یا کبھی آپ نے کسی سے محبت کی ہوتی پھر آپ محبت اور کمٹمنٹ کے معنی سمجھ سکتی تھیں۔'' جیسے جملے کہتی اور وہ بظاہر ہنستے ہوئے میرے ان جملوں کا کوئی غیر سنجیدہ سا ہی جواب دے دیا کرتی تھیں پر میں ان کی آنکھوں میں پھیلی ناگواری، سبکی کا احساس دیکھ لیا کرتی تھی۔ میں ان سے یہ بات اتنے منہ پھٹ اور بدلحاظ انداز میں کہتی تھی ایسے جیسے وہ اس قابل ہی نہیں کہ کوئی ان سے محبت کرسکے اور میرا یہ دل دکھانے والا انداز بڑا کاری اور کامیاب وار کر رہا تھا ان کے دل پر۔

جو کام نانی اور امی کی ڈانٹ ڈپٹ، غصہ، ناراضی، خفگی اور برہمی نہیں کر پائی تھی وہ کام میرا غیر محسوس سا دل دکھانے والا طنز'' آپ اس قابل ہی نہیں کہ کوئی آپ سے محبت کرے۔'' بڑی کامیابی سے کر رہا تھا۔

نانی اور امی کو وہ زچ کیا کرتی تھیں اور میں انہیں زچ کر رہی تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ وہ بے چاری کھل کر اپنے غصے اور ناگواری کا اظہار تک نہیں کرسکتی تھیں۔ ان سے چودہ سال چھوٹی ان کی بھانجی انہیں یہ بتایا کرتی تھی کہ کوئی کمی تو یقیناً ان میں ہے تب ہی تو کبھی کسی نے ان سے محبت نہیں کی۔ ورنہ شادیاں تو بہت سے لوگ نہیں کرتے مگر ان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسا ضرور آیا ہوتا ہے جس نے انہیں ان کے بہت خاص اور بہت حسین ہونے کا احساس دلایا ہوتا ہے، جس نے ان سے محبت کی ہوتی ہے۔

☆

''ہنی! بس آپ دس منٹ انتظار کریں مجھے کمپیوٹر پر تھوڑا سا کام ہے، میں یہ گئی اور یہ آئی۔ آپ تب تک یہ بک دیکھ لیں، بہت مزے کی ہے۔ جہاں پر میں بک مارک لگایا ہے یہ صفحہ تو ضرور ہی پڑھیں، ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائیں گی۔'' ہنی اور میں روز کی طرح واک کے لیے جانے کا

''روشن آراء بیگم، بڑے غلام علی، مہدی حسن وغیرہ پتا نہیں کس طرح کے لوگ انہیں پسند کرتے ہوں گے، آپ کا کیا خیال ہے؟''

''سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں اب کتابیں پڑھنا تو نری حماقت اور وقت کی بربادی ہے، یہ دور تو انٹرنیٹ کا دور ہے۔''

ہنی کا امیج میں نے ان کی نگاہوں میں اتنا زبردست بنا دیا تھا کہ وہ شک وشبہ میں مبتلا ہو کر انہیں چیک کرنے کو ایسی کوئی بات کر ہی نہیں سکتے تھے پر ہنی اگر کچھ بے تکا بول جاتیں پھر؟

''Jude کے اوپر اتنا شور نہ مچتا اور اتنی بے تحاشا تنقید نہ ہوتی تو ہارڈی یقیناً مزید کئی ناولز لکھتا۔'' میں نے اندر آتے ہوئے سنا۔

ہنی حیران پریشان نگاہوں سے ڈاکٹر چاچو کو دیکھ رہی تھیں۔ چاچو کو ان کے جوابات کی ضرورت نہیں تھی وہ اس وقت خود ہی بولنے اور ہارڈی کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچانے کے موڈ میں تھے۔

''کردار نگاری اور منظر نگاری میں ہارڈی کا جواب نہیں۔ اس کے کردار زندہ، جیتے جاگتے انسان نظر آتے ہیں جن میں اچھائیاں بھی ہیں، برائیاں بھی، خیر اور شر دونوں پہلو ان میں پائے جاتے ہیں اور ان کے جذبات، ان کی سوچیں، ان کے رویے سب کتنے حقیقت سے قریب ہوتے ہیں چاہے وہ

Michael کا The mayor of Casterbridge، ''Jude Gawlev'' کا ''Jude the obscure'' ہو یا Henchard ہو یا ''Tess of the dUrbervilles'' کی ''Tess'' ہو، سب حقیقی کردار نظر آتے ہیں۔ حالانکہ بہت سے لوگ اس کی اتنی بے تحاشا منظر نگاری کو یہ کہہ کر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ قاری کہانی میں آگے کیا ہوا، جاننا چاہتا ہے مناظر کی خوبصورتی نہیں مگر میری رائے میں یہ ہارڈی کی بہت بڑی خوبی ہے۔ وہ جہاں خود ہے، جو کچھ اپنے قاری کو دکھانا اور محسوس کروانا چاہتا ہے وہ وہاں قاری کو لے جاتا ہے، اسے بھی وہی قدرتی حسن نظر آنے لگتا ہے جو مصنف کی آنکھ نے دیکھا اور اپنے قاری کو دکھانا چاہا تھا۔''

''یہ محترم ہارڈی ہیں کون؟ اور ان کے متعلق مجھے کیوں بتایا جا رہا ہے؟'' ہنی ان ہی نگاہوں سے ڈاکٹر چاچو کو دیکھ رہی تھیں۔ قبل اس کے کہ چاچو ان نگاہوں کو دیکھ پاتے میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان دونوں کو چائے پیش کر دی۔

چائے پینے کے دوران میں نے گفتگو کو دوبارہ ہارڈی کی طرف جانے نہیں دیا تھا۔ چائے پی کر چاچو اپنے کمرے میں چلے گئے اور ہم دونوں واک کرنے نکل آئے۔

''یار! تیرے چاچو کچھ کھسکے ہوئے سے نہیں ہیں، شاید اتنا زیادہ پڑھ لینے کے بعد لوگ ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔''

''اللہ نہ کرے، بلاوجہ آپ میرے جینئس چاچو کو کھسکا ہوا کیوں کہہ رہی ہیں؟'' میں نے جھٹ برا ماننے والا انداز اختیار کیا اور ہنی کو قدرے ناراضی سے دیکھا۔ مجھے برا مانتا دیکھ ہنی نے اس بارے میں مزید کچھ نہ کہا۔

''آپ پر یہ پنک کلر کتنا اچھا لگ رہا ہے ہنی! مگر کیا فائدہ۔'' میں ایک درد بھری ٹھنڈی آہ بھری اور پھر قصداً مکمل خاموشی سے واک کرتے رہے۔

''آپ کو کیا پتا، آپ کیسے سمجھ سکتی ہیں، آپ کبھی کسی کو اچھی لگی ہیں؟'' جیسی باتیں میں ہنی سے اتنی کثرت سے کرنے لگی تھی کہ اب وہ

جواب میں کچھ کہنے کے بجائے بالکل خاموش ہو جایا کرتی تھیں۔ میں ڈاکٹر چاچو اور ہنی دونوں کو ساتھ ساتھ کتنی کامیابی سے لے کر چل رہی تھی۔ اپنے زرخیز دماغ کو میں نے داد و تحسین سے نوازا۔ وہاں سے پروپوزل آ جائے اور یہاں سے پروپوزل قبول کر لیا جائے، یہی میرا مشن تھا۔

گھر واپس آ کر ابھی ہم دونوں اپنے کمرے میں آئے ہی تھے، ڈاکٹر چاچو نے دروازے پر دستک دی۔

''یہ کتاب میں نے ابھی ختم کی ہے، سوچا آپ کو بھی پڑھنے کے لیے دے دوں، اگر آپ نے ابھی نہیں پڑھی تو ضرور پڑھیں، اچھی کتاب ہے۔'' وہ میڈیلین البرائٹ کی ''MADAM SECRETARY'' تھی۔ کتاب ہنی کو دے کر چاچو واپس چلے گئے تھے۔

''تمہارے چاچو کو یہ وہم کب سے ہو گیا کہ مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے؟'' ہنی نے تعجب سے مجھے دیکھا۔

''آپ کو نہیں ہے تو کیا ہوا، خود ڈاکٹر چاچو کو تو ہے نا۔ آپ کو یہ کتاب انہوں نے مہمان نوازی کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے دی ہے۔ اگرچہ کہ اپنی کتابوں کے معاملے میں وہ کافی حساس بلکہ بدتمیزی کی حد تک روڈ ہیں، ہر کسی کو دیتے نہیں ہیں۔ آپ کے ساتھ یہ غیر معمولی سلوک شاید امی کی بہن اور میری خالہ سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔''

میں نے ''غیر معمولی'' کے لفظ پر جان بوجھ کر خاص زور دیا تھا۔ ہنی نے چونک کر مجھے دیکھا، میں انجان بنی بالوں میں برش چلا رہی تھی۔

''سب مہمانوں کے ساتھ وہ اتنے خوش اخلاق اور مہمان نواز نہیں ہوتے۔ پچھلے مہینے ابا اور ڈاکٹر چاچو کی ایک کزن امریکہ سے آئی تھیں۔ پورے دو مہینے وہ ہمارے گھر میں رہیں اور جاتے وقت ڈاکٹر چاچو سے اس بات پر بہت ناراض ہو کر گئیں کہ انہوں نے انہیں بالکل بھی وقت نہیں دیا۔''

میں نے بستر پر آ کر لیٹتے ہوئے قدرے لاپرواہ اور بے نیاز سے لہجے میں جملہ کہا اور پھر کروٹ بدل کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

جس غیر معمولی خوش اخلاقی کا احساس میں ہنی کو دلوانا چاہ رہی تھی، چاچو نے اگلے ہی روز اس کو مزید کنفرم کر دیا تھا۔

میں نے بالکل آخری لمحوں میں ہنی اور ڈاکٹر چاچو کے ساتھ جانے سے معذرت کر لی تھی۔

''ثنا کا فون آیا تھا ابھی۔ کل ڈاکٹر عزیز کا ٹیسٹ ہے، میں دو دن سے کالج جا نہیں رہی تھی، مجھے پتا ہی نہیں تھا۔'' میرے اتنے شاندار اور بروقت بہانے نے جو کہ میں نے پہلے ہی سے سوچا ہوا تھا ہنی کے تمام اعتراضات کو بیک جنبشِ قلم رد کر دیا۔

''میں اکیلی جاؤں، کیسا لگے گا نگی!'' انہوں نے ہچکچاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''کیسا لگے گا کیا۔ یہ دعوت دی تو بنیادی طور پر ڈاکٹر چاچو نے آپ ہی کو تھی، مجھے تو یونہی اخلاقاً شامل کر لیا تھا۔ مہمان تو آپ ہیں نا ہمارے گھر پر اور چاچو شامِ غزل کے ٹکٹس آپ ہی کی وجہ سے لائے ہیں۔ مجھ سے اور امی سے دو تین روز پہلے کہہ رہے تھے کہ ہانیہ ہمارے گھر مہمان ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی انہیں کہیں پر بھی لے کر نہیں گیا۔''

ایک بات جو چاچو نے سرے سے کبھی نہ مجھ سے، نہ امی سے کہی ہی نہیں تھی وہ میں نے ہنی کے سامنے انتہائی معصومیت اور سادگی سے کہی۔ ویسے چاچو نے یہ بات کہی نہیں تو کیا ہوا، لائے تو واقعی وہ یہ ٹکٹس ہنی ہی کی وجہ سے تھے۔ گھر والے اور خود ہنی اس پر چونکیں اس لیے وہ دو کے

بجائے تین ٹکٹس لے آئے تھے۔

''پی سی میں ایک شام فیض کے نام منائی جارہی ہے۔ ثینا ثانی اور نیرہ نور فیض کی غزلیں اور نظمیں گائیں گی۔ میں نے وہاں کے ٹکٹس منگوائے ہیں۔ ہانیہ! آپ چلیں گی، نگار تم چلو گی؟''

ڈاکٹر چاچو نے رات کھانے کے دوران مجھ سے اور ہنی سے یہ بات کہی۔ میں تو واقعی طفیلی ہی تھی۔ چاچو جانتے تھے کہ غزلوں کا اور میرا سرے سے کوئی واسطہ نہیں پھر بھی مجبوراً انہیں سب کی حیرتوں کا منہ بند رکھنے کے لیے مجھے بھی شامل کرنا پڑا تھا۔ اس وقت میں نے بڑے زور و شور سے گردن ہلا کر اقرار کیا تھا اور آج جب جانے کے لیے ڈاکٹر چاچو اور ہنی تیار بھی ہو چکے تھے اور خود میں بھی کپڑے بدل چکی تھی تب بڑی مجبوری والی شکل بنا کر یہ عذر پیش کر دیا تھا۔ ہنی چاچو کے ساتھ اکیلے جاتے ہوئے ہچکچا رہی تھیں۔ یہ ہچکچاہٹ اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ وہ جانا تو چاہتی ہیں۔

تھی نا حیرت کی بات۔ ہنی اور غزلیں سننے کے لیے جانا..... واقعی اس دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے یعنی امید کی جا سکتی تھی کہ ہنی آنے والے وقت میں ایک لنگور، سوری ڈاکٹر چاچو کے لیے اور بھی کافی کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گی۔ ابا نے مداخلت کر کے اس پروگرام کو کینسل ہونے سے روک دیا تھا۔

''نگی نہیں جارہی تو تم لوگ کیوں اپنا پروگرام خراب کر رہے ہو، جب پروگرام بنایا ہے تو جاؤ۔''

ابا کے اصرار نے ہنی کو جانے پر آمادہ کر دیا اور چاچو کے چہرے پر سے اس فکر کو بھی دور کر دیا کہ کہیں ہنی جانے سے معذرت نہ کر لیں۔

ان دونوں کو تنہا بھیجنے کا میرا منصوبہ تو کامیاب ہو گیا تھا مگر اب یہ فکر بھی ہلکان کیے دے رہی تھی کہ ہنی وہاں کلاسیکل میوزک کی شان میں کچھ الٹا سیدھا نہ بول دیں یا میوزک پر اپنی انتہائی گھٹیا (چاچو کے حساب سے) معلومات نہ ان کے گوش گزار کر دیں۔ کلاسیکل پر ہنی کی معلومات صفر تھیں اور اس کے بارے میں ان کے خیالات ضبطِ تحریر میں لائے جانے کے لائق نہیں اور جو اگر چاچو کو ان کی کسی بات سے یہ شک ہو گیا کہ فلموں، کتابوں اور میوزک کے معاملوں میں وہ کس ''قسم'' کا ذوق رکھتی ہیں تو میری اتنے دنوں کی محنت پر پانی پھر جائے گا۔

میں بار بار گھڑی دیکھے جارہی تھی۔ ''اللہ میاں سب ٹھیک رہے ہنی اپنا منہ بند رکھ کر سارا پروگرام انجوائے کریں اور ان دونوں کے درمیان ذرا بے تکلفانہ ماحول میں ذاتی نوعیت کی گفتگو بھی ہو جائے۔'' ایسی باتیں جو میری موجودگی میں قطعاً ممکن نہیں تھیں اور نہ ہی گھر پر کبھی ہو سکتی تھیں۔''

کافی دیر ہو چکی تھی، میرے حساب سے اب ان دونوں کو گھر واپس آ جانا چاہیے تھا۔ سر پر یہ فکر مسلسل سوار تھی کہ کہیں سارا بنا بنایا کھیل خراب نہ ہو جائے۔ اسی فکر میں مبتلا ہو کر میں نے ہنی کو ان کے موبائل پر کال کرنے کا فیصلہ کیا۔ پتا تو چلے وہ دونوں اس وقت کہاں ہیں اور آیا سب کچھ ٹھیک ہے یا نہیں۔

میں نے ہنی کا موبائل نمبر ملایا اور جیسے ہی انہوں نے کال ریسیو کی، میں ان کے کچھ بولنے سے پہلے حسبِ عادت اتھلا کر بولی۔

''میں آپ کی سویٹ ہارٹ بول رہی ہوں۔''

''جی بولیے۔'' دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز نے میرے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے، چودہ طبق روشن کر دیے، حواس مختل کر دیے اور شرمندگی کے مارے میری یہ حالت کر دی کہ میں چند لمحے تو کچھ کہہ بھی نہیں پائی۔

''آئم سوری، مجھ سے شاید رانگ نمبر.....'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہنا چاہا پر دوسری جانب سے برجستہ میری بات کاٹ دی گئی۔

''یہ سو فیصد رائٹ نمبر ہے۔'' یہ آواز تو کچھ جانی پہچانی سی تھی۔

''ع.....لل.....ی ی۔'' میں نے اس کے نام کے کئی ٹکڑے کر دیئے۔ ہنی کے موبائل پر یہ موٹا آلو کیا کر رہا تھا۔ بوکھلاہٹ میں اور تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں میں نے بس جلدی سے لائن کاٹ دی۔

''یہ کیا بکواس کر دی میں نے اس کمینے سے۔ پتا نہیں اس اسٹوپڈ نے کیا سوچا ہوگا۔ کہیں بلاوجہ موصوف کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔'' ابھی میں فون کے پاس کھڑی خود پر تاؤ کھاتی یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی بیل بجی۔

''تم نے فون کیوں بند کر دیا تھا نگی!''

''میں سمجھی شاید کہیں اور لائن مل گئی۔'' میں نے ہنی سے بہانہ بنایا۔

''میرے دوپٹے پر سالن گر گیا تھا، میں ریسٹ روم میں اسے صاف کرنے گئی تھی، اس لیے کال علی نے ریسیو کر لی۔ ہم لوگ اس وقت ڈنر کر رہے ہیں نا۔''

ہنی اور ڈاکٹر چاچو کو تنہائی مہیا کرنے کے لیے تو میں ان کے ساتھ نہیں گئی تھی اور یہ بگ شو وہاں کیا کر رہا تھا۔ واقعی پیٹو ہے، کمینہ، جہاں کھانے پینے کی بات آئی یہ وہاں آ موجود ہوا۔

''تم نے فون کیسے کیا تھا، کوئی بات ہے کیا؟' ہنی نے مجھے جلنے بھننے سے روکا۔

''نہیں.....یونہی.....میں سوچ رہی تھی کہ کافی دیر ہوگئی، ابھی تک آپ لوگ واپس کیوں نہیں آئے، بس اس لیے۔''

ہنی سے بات ختم کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ علی سے کچھ دیر پہلے جو انتہائی بیہودہ بکواس میں نے کر دی تھی اب رہ رہ کر اس پر غصہ آئے چلا جا رہا تھا۔

''واقعی تم نے علی سے یہ بولا تھا۔' ہنی کا ہنستے ہنستے برا حال تھا۔

''مجھے کیا پتا تھا وہ منحوس کال ریسیو کرے گا آپ کے موبائل پر، آپ ہی کو کال ریسیو کرنی چاہیے تھی۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''مگر ریسیو کر لی تمہارے بگ شو نے۔ واہ مزا آ گیا۔ علی نے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ تب ہی تو میں جب واپس آئی تو وہ بلاوجہ مسکرا رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ پاگل وانگل ہے جو خوامخواہ مسکرائے جا رہا ہے، اب معلوم ہوا وہ کس بات کو انجوائے کر رہا تھا۔''

ہنی کے ''انجوائے'' کے لفظ نے مجھے مزید آگ لگائی تھی۔ میں کوئی ظلِ الٰہی کے دربار کی مسخری تھی جس کی باتوں کو وہ انجوائے کرے لیکن اب غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، غلطی تو بہر حال میری ہی تھی۔ دوسری طرف کی آواز سنے بغیر مجھے کچھ بولنا نہیں چاہیے تھا۔ میں نے دل میں پکا ارادہ کیا کہ آئندہ ہنی کے موبائل پر ان کے ہیلو کہنے سے پہلے کچھ بھی نہیں بولا کروں گی۔

''آپ لوگوں کی شامِ غزل کیسی رہی؟'' اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آ گئی تھی۔

''بہت زبردست۔'' میں نے سر سے پاؤں تک ہنی کو بغور دیکھا۔

''ہنی! آپ کو غزلیں سننے میں مزا آیا؟''

''یار! وہاں کا ماحول بہت اچھا تھا۔ لوگ بھی سارے بڑے ڈیسنٹ قسم کے آئے ہوئے تھے اور غزلیں کوئی اتنی بری چیز بھی نہیں ہوتیں پھر نیرہ نور کی آواز کے تو کیا کہنے۔ شاعری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی پر اس کی آواز واقعی بہت سریلی ہے۔''

میں جان بوجھ کر معنی خیز نگاہوں سے ہنی کو دیکھتے انہیں کنفیوژ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''پروگرام ختم ہونے کے بعد ہم وہاں سے نکل رہے تھے تب علی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں آیا ہوا تھا۔ فہد نے اسے بھی ڈنر کرنے کی دعوت دی تو وہ بھی ہمارے ساتھ ڈنر کرنے آ گیا۔'' آج ڈاکٹر چاچو ''تمہارے چاچو'' اور ''تیرے چاچو'' کے بجائے فہد کہلائے جا رہے تھے۔ بڑا نیک شگون تھا۔

''تمہارے چاچو نے اب تک شادی کیوں نہیں کی نگی!'' ہم دونوں سونے کے لیے لیٹ چکے تھے جب میری سماعتوں سے ہنی کا یہ سوال ٹکرایا۔

یہ سوال کرتے وقت شاید انہیں فہد کہنا مناسب نہیں لگا تھا اس لیے ایک بار پھر تمہارے چاچو کا لقب استعمال کیا۔

''ان کے ساتھ بھی آپ والا مسئلہ ہے ہنی! انہیں ایسی بیوی چاہیے جو ان کی ذاتیات میں مداخلت نہ کرے۔ مثلاً یہ کہ جس وقت وہ کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں یا اپنی پسند کی کوئی مووی دیکھ رہے ہوں تو وہ ان کے سر پر سوار ہونے کے بجائے خود بھی اپنی پسند کا کوئی کام کرے۔ اب میاں بیوی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ چوبیس گھنٹے ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار رہا جائے۔ ہر انسان کو اپنی مرضی کے حساب سے زندگی گزارنے کا حق حاصل ہونا چاہیے، شادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ یہی ہے ڈاکٹر چاچو کی سوچ۔''

لوہا گرم تھا، میں نے ڈاکٹر چاچو کے شادی نہ کرنے کی وجہ ہنی کی پسندیدہ ترین وجہ ہی بتائی۔ وہ بھی تو ایک لنگور کو سر پر سوار نہ کرنے کی خاطر شادی سے انکار کیا کرتی تھیں۔

''اب تو آپ مانتی ہیں ہنی! ڈاکٹر چاچو آپ کے ساتھ کتنی زیادہ مہمان نوازی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بلاوجہ پرسوں انہیں کھسکا ہوا کہہ رہی تھیں۔''

میں نے خاص قسم کی معصومیت کا مظاہرہ کر کے ڈاکٹر چاچو کے غیر معمولی سلوک کو بظاہر مہمان نوازی کا نام لے کر بھی اس میں کافی غیر معمولی پن برقرار رکھا اور اس پر ہنی کو مزید سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتی خود اطمینان سے کروٹ بدل کر سو گئی۔

☆

بڑے ہمیشہ اپنے سے چھوٹوں کو کم عقل سمجھتے ہیں جیسے ڈاکٹر چاچو اور ہنی۔ دونوں کی نگاہوں میں میں ابھی بچی اور بے وقوف ہوں اور اسی بچی نے کتنے مزے سے ان دونوں پاگل پاگل سے لوگوں کو ایک دوسرے کو توجہ دینے، اہمیت دینے اور ایک دوسرے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری نیت صاف تھی نا اس لیے منزل تو آسان ہونی ہی تھی۔

میں ثنا کے گھر سے واپس آئی تو لان میں کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے ڈاکٹر چاچو اور ہنی کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ سوچا، اب جب ہنی ڈاکٹر چاچو کی طرف اس حد تک متوجہ ہو چکی تھیں تو مجھے یہ خطرہ بھی نہیں رہا تھا کہ وہ کتابوں، فلموں اور میوزک پر ایسی کوئی بے تکی بات ان سے کریں گی جو سب کیے کرائے کو برباد کر دے۔ ان کے ساتھ غزلوں کا پروگرام اٹینڈ کر کے، ان کے منہ سے کتابوں کی باتیں کثرت سے سن کر ہنی جیسی سمجھ دار خاتون اتنا تو سمجھ ہی گئی تھیں کہ ان تمام چیزوں کے بارے میں ڈاکٹر چاچو کی سوچ کس قسم کی ہے۔ ڈاکٹر چاچو اس وقت ان سے MOZART, BEETHOVEN, CHOPIN, LISZT جیسے نامور PIANISTS کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ بتا رہے تھے کہ دو سال پہلے VIENNA صرف اس لیے گھومنے گئے تھے کہ وہ MOZART اور BEETHOVEN کا شہر ہے اور وہاں جا کر وہ اس کلاسیکل میوزک کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ محسوس کرنا چاہتے تھے۔ ہنی کتنے صبر و سکون سے یہ ساری باتیں سن رہی تھیں جبکہ ان کی بلا بھی نہیں جانتی ہو گی کہ MOZART تھا کون؟ وہ کہتی تھیں کہ کبھی کسی کو اپنے سر پر اس طرح سوار نہیں کروں گی کہ سوؤں، جاگوں، کھاؤں، پیوں سب ان کی مرضی سے۔ سر پر تو انہوں نے ایک بندے کو سوار کر ہی لیا تھا تب تو اتنے اطمینان سے بیٹھ کر وہ باتیں سن رہی تھیں جن سے انہیں دور دور تک کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اپنے منصوبے کی کامیابی پر جتنا بھی مسکراتی اور سرشار ہوتی کم تھا۔ اب اس رشتے کی بات کسی نہ کسی طرح مجھے ابا کے کان میں ڈالنی تھی۔

میں اپنی سوچوں پر مسکراتی اور اپنے منصوبے کی کامیابی پر گنگناتی سیڑھی پر قدم رکھ ہی رہی تھی کہ لان سے آتی ڈاکٹر چاچو کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی آواز میں چونکانے والا کچھ نہیں تھا۔ چونکی بلکہ ٹھٹکی اور بوکھلائی تو میں ان کے جملے پر تھی۔

''میں آپ سے فرنچ میوزیشنز اور اٹالین میوزیشنز کے فرق کی جو بات کر رہا ہوں اسے آپ نے ان سی ڈیز میں ضرور نوٹ کیا ہو گا جو نگار مجھ سے لے کر گئی تھی۔ سنی تھیں آپ نے وہ سی ڈیز؟'' میری گنگناہٹ، مسکراہٹ سب اڑن چھو ہو گئی تھی۔

''کون سی سی ڈیز؟'' میں نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ہنی کا متحیر سا استفسار سنا۔

''نگار لے کر گئی تھی نا مجھ سے آپ کے لیے۔''

''میرے لیے، کب؟'' میں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی لاؤنج میں آئی اور وہاں سے سیدھی اپنے کمرے میں۔ اپنے جس منصوبے کی کامیابی کا ابھی چند لمحے پہلے جشن منا رہی تھی اس کا بھانڈا اتنی بری طرح پھوٹا تھا کہ میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

کاش اس روز چاچو کے سامنے ہنی کا امپریشن جمانے کو میوزک والی سی ڈیز نہ لائی ہوتی۔ چاچو جیسے بھلکڑ مہینہ بھر پرانی اس بات کو اس وقت یاد کریں گے ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

کمرے میں منہ چھپا کر لیٹی میں ڈاکٹر چاچو اور ہنی کے ہاتھوں اپنی متوقع شامت کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جب بات کھلے گی تو ایک ایک بات کھلے گی۔ زرگزشت، Hardy، غلام علی، آنندا، Bare foot، شامِ غزل، میری ہر بات ان دونوں کے حساب سے تو میں نے سیدھا سیدھا انہیں بے وقوف بنایا تھا اور اس پر میرا کیا حشر ہونے والا تھا۔ ذرا دیر کو اپنی ذہانت اور چالاکی پر غرور کیا تھا اور اللہ نے اس غرور کی فوراً سزا بھی دے دی۔ میں رات تک کمرے میں چھپی رہی، ہنی کمرے میں ابھی تک نہیں آئی تھیں اور اس چیز نے مجھے مزید پریشان کر دیا تھا۔

''ڈاکٹر چاچو آپ کو بلا رہے ہیں بجو!'' بہروز کے اس پیغام نے میرے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ ڈاکٹر چاچو نے کبھی بھی مجھ پر غصہ نہیں کیا تھا اور آج شاید انہوں نے مجھ پر بہت زیادہ ناراض ہونا تھا۔

''جی ڈاکٹر چاچو۔'' کب تک چھپ کر بیٹھ سکتی تھی، مجھے ان کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔

''آیئے آیئے، تشریف لایئے۔ آپ ہی کا انتظار تھا۔'' ڈاکٹر چاچو نے طنزیہ لہجے اور نگاہوں کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ وہ اس وقت اپنی اسٹڈی میں تھے اور ان کے برابر والی کرسی پر ہنی بھی بیٹھی تھیں۔ خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورتی ہوئی۔ ہنی اور ڈاکٹر چاچو کو ناراض کرنے کے لیے تو میں نے یہ سب نہیں کیا تھا مگر اب اپنی صفائی کس طرح پیش کروں۔

''سنا ہے آپ بہت بڑی ہوگئی ہیں، اتنی بڑی کہ اپنے بڑوں کے ساتھ انتہائی بیہودہ مذاق بڑی آسانی سے کر لیتی ہیں بغیر کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے۔'' وہ کرسی سے اٹھ کر میرے سامنے آ کر کھڑے ہوگئے۔

''آپ کی پیاری ہنی کو رات میں کچھ پڑھے بغیر نیند نہیں آتی اور پڑھتی وہ لاؤنج میں آ کر اور پھر اپنی کتاب ''اتفاقاً'' اکثر بھول بھی جاتی ہیں۔''

''ڈاکٹر چاچو..... وہ..... میں..... پلیز۔'' میں منمناتے اور گھگھیاتے اپنی نیک نیتی ثابت کرنا چاہتی تھی پر ڈر کے مارے منہ سے کوئی معقول بات نکل نہیں پا رہی تھی۔

''اپنے بڑوں کو اتنی مہارت سے بے وقوف بنا لیتی ہیں آپ! آپ کی اس اسمارٹ نیس پر آپ کو سلیوٹ کروں یا اکیس توپوں کی سلامی پیش کروں۔''

''ڈاکٹر چاچو! میں مانتی ہوں میں نے جھوٹ بولے لیکن سچی، میری نیت بالکل بری نہیں تھی۔ میں صرف یہ چاہتی تھی.....''

''آپ چاہتی تھیں.....؟ یعنی اب ہم وہ کیا کریں گے جو آپ چاہا کریں گی۔'' ڈاکٹر چاچو نے طنزیہ انداز میں میری بات کاٹی پھر گردن موڑ کر ہنی سے بولے۔

''سنا آپ نے ہانیہ! ہمیں کیا کرنا ہے، اب اس کا فیصلہ زرنگار ساجد صدیقی کیا کریں گی۔''

میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ وہ دونوں غصے سے گھورتے ہوئے مجھے اپنی صفائی کا موقع دے ہی نہیں رہے تھے۔

''اب آپ یہاں سے تشریف لے جا سکتی ہیں اور آئندہ اگر آپ ''کچھ چاہیں'' یا آپ کا کسی کو بے وقوف بنانے کو جی چاہے تو کوشش کیجیے گا وہ آپ کا ہم عمر اور ہم مرتبہ ہو۔''

انہوں نے دروازے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے مجھے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میں مایوس اور غم زدہ اسٹڈی سے نکل آئی۔

''ہنی! آپ تو میری فرینڈ ہیں، پلیز آپ تو میری بات سنیں۔''

وہ سونے کے لیے کمرے میں آئیں تو میں ملتجی انداز میں ان کے ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''دوستی کا یہ مطلب نہیں ہوتا نگی! کہ انسان رشتوں کا احترام بھول جائے۔''

''نانی اور امی کی طرح میری بھی یہ خواہش تھی کہ آپ شادی کرلیں۔ ڈاکٹر چاچو ہر لحاظ سے آپ کے لیے بہترین لگے تھے مجھے۔ میری بس اتنی سی خواہش تھی کہ آپ کی ڈاکٹر چاچو سے شادی ہو جائے۔ آپ خالہ کے ساتھ ساتھ میری چاچی بھی بن جائیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے ہی ساتھ آ کر رہنے لگیں۔''

ہنی کے لیے میری وضاحتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔

☆

اگلے روز میری سالگرہ تھی اور یہ سالگرہ یقیناً میری اب تک کی زندگی کی سب سے بری سالگرہ تھی۔ ہنی مجھ سے خفا، ڈاکٹر چاچو مجھ سے ناراض اور جو میرا خواب تھا ان دونوں کو ایک کروا دینے کا وہ ریزہ ریزہ۔ کیا خاک اچھی لگتی اپنی سالگرہ۔ اب تو سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ ہنی اور ڈاکٹر چاچو وہ میرا خوابوں میں دیکھا جانے والا پاگل پاگل سا کپل بنائیں گے۔ باقی تمام لوگوں نے مجھے وش کیا تھا سوائے ہنی اور ڈاکٹر چاچو کے۔

میں اداسی سے بھرا دل لیے کالج آئی تو وہاں آسیہ میرا دل جلانے کو موجود تھی۔

''دیکھو آج نگار کو کیا گفٹ ملتا ہے علی سے۔'' اس وقت اس نے یہ ذکر کیوں نکالا تھا میں کیا ہمارا پورا گروپ جانتا تھا۔ پندرہ بیس روز پہلے گزری اپنی سالگرہ کا ذکرِ خیر کرنے کے لیے۔

''میری سالگرہ پر تمہارے ''بھائی'' مجھے کالج سے میری پسند کے ہوٹل میں لنچ کرانے لے گئے تھے اور وہیں پر گفٹ میں یہ گولڈ کی چین بھی دی تھی۔''

اس کی سالگرہ کا قصہ اتنا قدیم نہیں ہوا تھا جو ہم میں سے کوئی اسے بھول گیا ہوتا مگر اس اوچھی لڑکی کو تو موقع چاہیے ہوتا تھا اپنا اوچھا پن شو کرنے کا۔

''اصل میں آسیہ! ہماری منگنی ہو چکی ہے نا، پھر ہمیں گھر والوں سے چھپ کر باہر ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ علی کو جو گفٹ بھی دینا ہوگا وہ مجھے گھر پر آ کر دے گا۔''

میں نے بظاہر بہت مسکراتے ہوئے دوستانہ اور ہلکے پھلکے لہجے میں ایسی بات کہی جس نے ظاہر ہے اسے آگ لگا دینی تھی۔ میری صاف گوئی پر اس کا منہ بن گیا تھا مگر وہ مجھے فوراً کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔ آسیہ کو تو اپنی حاضر جوابی سے چپ کروا دیا تھا مگر میں جانتی تھی کہ گفٹ تو بہت دور رہا وہ موٹو مجھے ہیپی برتھ ڈے تک نہیں بولے گا۔

''جس بجھے دل سے کالج گئی تھی اس سے بھی زیادہ بجھے دل سے گھر واپس لوٹی تھی۔ حالانکہ موسم برسات کا تھا۔ ساون کا موسم پتا نہیں کن لوگوں کا دل خوش کرتا ہے مجھے یہ بارش نری زہر لگ رہی تھی۔

گھر میں داخل ہوئی تو وہاں غیر معمولی چہل پہل اور ہنگامہ تھا۔ دادی، امی، روحیل، بہروز اور مبشر سب بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔ اور تو اور میں کیچڑ میں لتھڑے جوتے لیے اندر آ گئی تو امی نے مجھے کچھ نہ کہا یہاں تک کہ گھورا بھی نہیں۔

''یاالٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟'' ماجرا جاننے کے لیے مجھے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا تھا، امی کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ انہوں نے میرے پوچھنے سے پہلے ہی خوشی کی بات مجھے بھی بتا ڈالی۔

''فہد ہانی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ہانی کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔ ابھی ابھی ہم نے اسلام آباد تمہاری نانی کو فون کیا تھا، بس ساری رسمی سی کارروائی ہے۔ دولہا دلہن تو راضی ہیں اور باقی کسی کے اعتراض کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ دولہا دلہن بڑی مشکلوں سے راضی ہوئے ہیں اور ان کے کسی بھی لمحہ بدک جانے کا خدشہ اپنی جگہ موجود ہے۔ لہٰذا طے کیا جا رہا ہے کہ ان کے بدکنے سے پہلے پہلے سب کچھ جھٹ پٹ کر ڈالا جائے۔''

خوشی کی غیر متوقع خبر پر پہلے پہل غیر یقینی سی کیفیت ہوتی ہے ناں؟ سو یہی میرے ساتھ ہوا تھا مگر جیسے ہی اس بے یقینی سے نکلی بے اختیار چھلانگیں مارتی، نعرے لگاتی اچھلنے کودنے لگی۔

''یاہو۔'' میری محنت رنگ لے آئی تھی۔ کل کتنا ڈرامہ کر رہے تھے دونوں میرے سامنے۔ میرا جھوٹ پکڑا گیا اور ساری بات کھلی تب ہی دونوں ادب و آداب سے نکل کر ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کا واضح اظہار کر پائے یعنی ذریعہ تو میں ہی بنی۔ تو آخر پاگل ڈاکٹر چاچو اور پاگل ہنی ایک ہونے کو آمادہ ہو ہی گئے تھے۔ میں یونہی اچھلتی کودتی ہنی کے پاس پہنچی۔

''بڑی اکڑ دکھا رہی تھیں کل، پسند تو دل و جان سے آ چکے تھے میرے ڈاکٹر چاچو.....'' ہنی کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

''او ہو شرمایا جا رہا ہے۔''

''نگی!'' ہنی نے مصنوعی خفگی سے مجھے گھورا۔

''ہنی! اب آپ اپنا پسندیدہ پھل سیب پہلی فرصت میں کھانا چھوڑ دیجیے ورنہ ڈاکٹر صاحب آپ سے دور ہو جائیں گے۔''

میرے پلان میں کچھ نقائص تھے بھی تو کیا ہوا انجام کار نتیجہ تو میری خواہش کے مطابق ہی نکلا تھا۔ بے تحاشا خوشی ایسی تھی کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہنی میری ایکسائٹمنٹ پر مسکرا رہی تھیں۔

''تو اب مس ہانیہ بانو ایک عدد لنگور کو اپنے سر پر سوار کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہیں۔'' میں انہیں چھیڑنے کے زبردست موڈ میں تھی۔ اتنی آسانی سے ان کا پیچھا چھوڑ دینے والی تو میں ہرگز نہیں تھی۔

''ہنی! اب آپ کی باتیں میرے سر میں درد کیا کریں گی۔ آپ کے پسندیدہ ٹاپکس میاں کے دکھڑے، بچوں کی بیماریاں اور ساس نندوں کی چغلیاں ہوا کریں گے لیکن آپ ساس نندوں کی غیبتیں مجھ سے کیسے کریں گی میں تو خود آپ کے سسرالیوں سے ہو جاؤں گی۔''

ہنی نے اپنی بے ساختہ ہنسی چھپاتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا۔

''اچھا اب تم زیادہ پھیلو مت، مجھے نماز پڑھنی ہے تم چلتی پھرتی نظر آؤ یہاں سے۔''

بڑے ہونے کا رعب دکھاتی وہ وضو کرنے باتھ روم میں گھسیں تو میں اپنی چھیڑ چھاڑ کچھ دیر کے لیے موقوف کرتی کمرے سے نکل آئی۔

''میرا مقصد نیک تھا اس لیے سب کچھ خود بخود ہی ٹھیک ہو گیا تھا ورنہ ان دو پاگلوں کو جنہیں بڑے بڑے شادی کے لیے تیار نہیں کر پائے تھے میں کیونکر کر پاتی۔ میرا دل خوشی سے ناچنے، گانے اور جھومنے کو چاہ رہا تھا۔ میں سیڑھیاں پھلانگتی بڑی لے میں با آوازِ بلند گلوکاری کر رہی تھی۔ بھوک بھی ایک دم ہی بہت زبردست لگنے لگی تھی اور یہ بھی یاد آنے لگا تھا کہ اس رم جھم برستے موسم میں امی لنچ کے لیے قیمہ بھرے پراٹھوں کا اہتمام کر رہی ہیں۔ ذہن میں قیمہ بھرے پراٹھے تھے، دل میں خوشی تھی اور ہونٹوں پر نغمہ تھا۔

آئے موسم رنگیلے سہانے

جیا نا ہی مانے

تو چھٹی لے کے آجا بالما ہو.....

تو چھٹی لے کے آجا بالما

پھر میں کسی پہاڑ نما چیز سے بہت زور سے ٹکرائی تھی۔ ایک پل کو تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ لڑکھڑانے کے بعد خود کو گرنے سے بچاتی، آنکھیں کھول کر سامنے دیکھنے میں کامیاب ہوئی تو جو شخصیت نظر آئی اس وقت نہ اس کی توقع تھی اور نہ اس کی آمد کی کوئی ضرورت۔

''مجھے سریلی بیگم بننے کی ضرورت کیا تھی اور اس منحوس کو منہ اٹھا کر سیدھا اندر گھس آنے کی۔'' میں نے کلس کر سوچا۔

پیچھے صوفوں پر بیٹھے روحیل اور بہروز محظوظ نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں اپنی ہنسی بمشکل روک رہے تھے اور ہنسی تو اپنی وہ کمینہ بھی روک رہا تھا۔ اسے ہنسی روکتا دیکھ کر مجھے مزید طیش آیا تھا۔

''ہٹو سامنے سے۔'' جب تک وہ پہاڑ سامنے سے نہ ہٹ جاتا میں آگے کیسے جا سکتی تھی۔ وہ سامنے سے میرے کہنے سے نہیں بلکہ امی کے آواز دینے سے ہٹا تھا۔ وہ اسے پیار سے آواز دے رہی تھیں۔

''آجاؤ بیٹا! گرم گرم پراٹھے ہیں، بس فوراً شروع ہو جاؤ۔''

وہ ''جی اچھا ممانی!'' کہتا پلٹا تو میں روحیل اور بہروز کے پاس آ گئی۔

''بجو! رنگیلے موسم میں بالما آئے تو ہیں مگر آپ سے ملنے نہیں، قیمہ بھرے پراٹھوں سے ملنے۔''

''میں نے بڑی بہن ہونے کا رعب دکھاتے ان دونوں کو گھور کر دیکھا۔ علی ہاتھ دھو کر آ چکا تھا اور اب میرے، روحیل اور بہروز کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا پراٹھوں سے شغل فرما رہا تھا۔

''آجاؤ تم لوگ بھی۔''

اس نے ہمیں ہمارے ہی گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ ابھی تو اس گھر کا داماد بنا بھی نہیں ہے اور کیسا حق جتا کر یہاں بیٹھ کر ٹھونستا ہے منحوس، امی اسے گرم گرم پراٹھے لا کر دے رہی تھیں۔

روحیل اور بہروز اس کے ساتھ شریک تو ہو گئے تھے مگر ان بے چاروں کی کہاں پہنچ تھی اس تک۔ بہروز ڈیڑھ پراٹھا کھا کر بس کر چکا تھا اور

روحیل دو پراٹھے کھا کر اور وہ ہاتھی ایک، دو، تین، ساڑھے تین۔ مجھے گنتی کرتے کرتے گھبراہٹ ہونے لگی۔

''نگار! تم بھی آ جاؤ، کیوں خوامخواہ نظر لگا رہی ہو۔''

''تم میری فکر مت کرو، میں کھالوں گی، آخر یہ میرے ''ابا'' کا گھر ہے۔''

نظر لگانے والی بات نے مجھے چڑایا تو میں نے اسے شرمندہ کرنے کو ابا کے لفظ پر خاصا زور ڈال کر جوابی حملہ کیا۔

وہ میری بات کا نوٹس لیے بغیر اطمینان سے پراٹھا کھاتا رہا۔ روحیل اور بہروز اس کے پاس ہی بیٹھ کر اب آم کھا رہے تھے۔ وہ نمکین کھا کر تو فارغ ہو لے پھر میٹھے کی طرف آئے گا، اس کا مجھے یقین تھا۔

گیٹ پر بیل ہوئی تو میں دونوں بھائیوں کو آموں کے ساتھ مصروف دیکھ کر خود گیٹ پر آ گئی۔ بارش ذرا ہلکی تو ہوئی تھی مگر پوری طرح رکی نہیں تھی۔ میں نے گیٹ کھولا۔

''ڈاکٹر زرنگار ساجد صدیقی یہیں رہتی ہیں؟'' سامنے کسی کوریئر سروس کا آدمی کھڑا تھا۔

''جی میں ہی ہوں۔''

''یہ آپ کے لیے آیا ہے۔'' میں ان پھولوں اور اس ڈبے کو جس میں میرے حساب سے شاید کیک ہونا چاہیے تھا تعجب سے دیکھتی یہ سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر نگار تو مجھے میری دوست اور کبھی کبھار چاچو کہتے ہیں۔ دوست ساری آج کالج میں وِش کر چکیں، گفٹس دے چکیں پھر کیا چاچو نے بھجوایا ہے یہ..... میں نے دستخط کرنے کے بعد اپنے لیے آنے والی چیزیں وصول کیں اور گیٹ بند کر کے جلدی سے پھولوں کے ساتھ لگا کارڈ کھولا۔

Happy Birthday to my sweet heart.

Big Show

میں بارش سے بچنے کے لیے لاؤنج کی سیڑھیوں میں آ گئی تھی اور وہیں کھڑے ہو کر میں نے کارڈ پڑھا تھا۔ شیشے کے اس پار مجھے Big show بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ پراٹھے کھا چکنے کے بعد اب آموں کے ساتھ انصاف کرتا ہوا۔ اسے یہ کیسے پتا چلا میں اسے بگ شو (Big show) کہتی ہوں؟ اگر اس نے سویٹ ہارٹ نہ لکھا ہوتا تو میں اپنے بھائیوں پر شک کرتی کہ ضرور یہ ان میں سے کسی کی شرارت ہے مگر سویٹ ہارٹ والی بات صرف ہنی کو پتا تھی اور وہ بہرحال یہ حرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ میرا گفٹ جو انہوں نے آج مجھے دینا تھا میں ابھی کمرے میں رکھا ہوا دیکھ آئی تھی۔ اس کا مطلب ہے یہ واقعی اس نے بھیجا ہے۔

میں لاؤنج میں آئی۔ روحیل، بہروز اور دادی جو ابھی ابھی وہاں آ کر بیٹھی تھیں تینوں نے ایک ساتھ مجھے دیکھا جبکہ وہ آم کاٹنے اور کھانے میں مصروف رہا۔

''اوہو، پھول، کس نے بھیجے ہیں یہ پھول۔'' پھولوں کا یہ بڑا سارا گلدستہ چھپنے والی چیز ہی نہیں تھا۔

''کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے۔'' چاچو کی صحبت کا اثر، مجھے غالب بروقت یاد آئے۔

میں نے بگ شو(Big Show) کی طرف بغور دیکھا۔ وہ بے نیازی کی بھرپور اداکاری کرتا آموں کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ مگن ہوگیا تھا۔

''بھیجا ہے کسی نے۔'' میں نے یوں کہا گویا اسے چڑانا چاہتی ہوں۔

دادی ہماری ماسی بشیراں کے ساتھ بات کررہی تھیں۔ انہوں نے میری بات سنی نہیں تھی ورنہ گھورتیں ضرور۔ میں اٹھلاتی اور اتراتی اپنے کمرے میں آگئی۔ پھول تو دیکھ ہی چکی تھی اب ڈبا کھول کر کیک دیکھ رہی تھی۔ ہارٹ شیپ کا اسٹرابیری کیک اور اس پر بھی لکھا ہوا۔ پیٹو نے تحفے میں دیا بھی تو کیک ہی۔ کھانے پینے والا بندہ تحفے میں کھانے پینے ہی کی چیز دے سکتا تھا۔ میں یہ کیک گھر میں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرسکتی تھی کہ اس پر خاصا بولڈ اور غیر سنسر شدہ جملہ تحریر تھا۔ ویسے میں ہر چیز اپنے بھائیوں کے ساتھ مل بانٹ کر کھاتی ہوں اور پھر اسٹرابیری کیک تو روحیل کو پسند بھی بہت ہے مگر آخر کو میں ایک مشرقی لڑکی ہوں بھائیوں کے ساتھ یہ کیک شیئر کرتے کیا مجھے لاج نہیں آئے گی؟ ''سوری روحیل، بہروز اور مبشر! بجو کو یہ کیک اکیلے ہی کھانا پڑے گا۔''

''ارے یہ کیا ہے بھئی؟'' ہنی کو کمرے میں نہ پاکر میں یہ سمجھی تھی کہ وہ نیچے جاچکی ہیں جب کہ وہ تو بالکونی میں تھیں اور اب ایک دم ہی اندر آگئی تھیں۔

ہنی کی خیر ہے انہیں کیک اور کارڈ دکھا لینے میں کچھ مضائقہ نہیں تھا اور اگر ہوتا تب بھی وہ کون سا رک جاتیں۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی تیزی سے آگے آئیں۔ پہلے کیک کو دیکھا، پھر مجھے، پھر دوبارہ کیک کو اس کے بعد پھولوں پر نظر پڑی تو جھٹ انہیں اٹھا لیا۔ میں اترائی ہوئی مسکراہٹ لیے انہیں کارڈ پڑھتا دیکھ رہی تھی۔

''سویٹ ہارٹ (Big show)'' وہ کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔ ''بہت مبارک ہو نگی! تیرے (Big show) نے آخر منگیتر ہونے کا حق ادا کر ہی دیا۔ ناحق دل برا کرتی تھیں۔ دیکھو اس بے چارے کو تمہارا کتنا خیال ہے۔''

''ہنی! اسے یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ میں اسے بگ شو Big show کہتی ہوں؟'' ہنی سے یہ کہتے وقت میرے ذہن میں اپنے بھائیوں کی شکلیں آئیں۔ ضرور یہ ان تینوں میں سے کسی کی کارستانی ہے۔ چھوڑوں گی تو اسے میں ہرگز نہیں، ان تینوں میں سے یہ جس کسی کی بھی حرکت ہوگی۔

''ہاں واقعی سوچنے کی بات ہے اسے کیسے معلوم ہوگیا؟'' ہنی نے کیک کے اوپر لگی سرخ سرخ اسٹرابریز میں سے ایک اٹھا کر منہ میں رکھی۔ مجھے ان کے جملے اور معصومیت سے آنکھیں پٹپٹانے، دونوں نے ایک دم ہی چونکایا۔

''ہنی؟'' مجھے یقین کرنے میں تامل تھا۔ ''آپ نے؟''

انہوں نے دوسری اسٹرابیری اٹھا کر سرعت سے منہ میں رکھی اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے مجھ سے بولیں۔

''ہاں میں نے بتایا تھا اسے کہ نگی تمہیں پیار سے بگ شو Big show کہتی ہے۔ تمہارے ''Big show'' سے میری دوستی فون پر اس وقت ہوگئی تھی جب تمہارا رشتہ طے کرکے منگنی کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے ہی اسے کراچی فون کیا تھا۔ اپنی لاڈلی بھانجی کے ہونے والے منگیتر

کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات تو مجھے حاصل کرنی ہی چاہیے تھیں۔ بس پھر ہماری دوستی ہوگئی۔ ہم کبھی کبھار نیٹ پر چیٹنگ بھی کرنے لگے۔''

ہنی اور یہ غداری؟ مجھے امید نہیں تھی۔ وہ میری ہر بات اسے بتاتی تھیں۔ انہیں غصہ دلانے کو جو جو باتیں میں جان بوجھ کر کہا کرتی تھی وہ سب بھی ''جب علی میری تعریف نہیں کرتا تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔'' مجھے اپنا کہا ایک جملہ یاد آیا۔

میں نے ہنی کو گھورا وہ دروازہ کھول کر کھڑی مجھے شریر نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جب میں اپنے تئیں ہنی کو بے وقوف بنا رہی تھی تب وہ میری تمام باتیں من وعن اس تک پہنچا رہی تھیں۔

''ہم دونوں میں سے کس نے کس کو بے وقوف بنایا پتا نہیں چل رہا تھا۔ ہاں اتنا ضرور سمجھ میں آ رہا تھا کہ بڑے واقعی بڑے ہوتے ہیں۔ خود کو چالاک اور ذہین سمجھ کر جب ہم اپنے بڑوں کو Under Estimate کرتے ہیں وہیں مار کھاتے ہیں۔

''ہنی! میں آپ کو چھوڑوں گی تو ہرگز نہیں۔ اس موٹے بھالو کو کتنی خوش فہمیوں میں مبتلا کروایا ہے آپ نے۔''

میں دھمکی آمیز لہجے میں بولتی تیزی سے ان کی طرف بڑھی اور وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ ہنی آگے تھیں اور میں ان کے پیچھے اور شاید چالاکی میں مجھے ہمیشہ ہنی سے پیچھے ہی رہنا تھا۔ انہیں سیڑھیاں اترتا دیکھ کر میں ہار مانتے ہوئے رک گئی۔ غصے سے زیادہ مجھے ہنی کی چالاکیوں پر ہنسی آنے لگی تھی۔

''ساون کا جو موسم مجھے بہت برا لگ رہا تھا، اسی موسم نے دل کو ایسا خوش کیا تھا کہ اس پر پیار آنے لگا تھا۔ ویسے موسم کے اس اچھے لگنے کا تعلق اپنے ''قصے'' سے زیادہ ہنی اور ڈاکٹر چاچو سے تھا۔ میرا دل ہنی اور ڈاکٹر چاچو کے لیے بے انتہا خوش تھا۔ اپنے ''قصے'' پر فی الحال میری زیادہ توجہ نہیں تھی۔ میں ہنی اور ڈاکٹر چاچو کے بارے میں سوچ رہی تھی، وہ دونوں ایک ساتھ کتنے اچھے لگیں گے۔

''ہنی Weds ڈاکٹر چاچو.....'' میں نے زیرِ لب کہا اور پھر مسکرا دی۔ یہ تو لو میرج تھی مگر اسے ارینج میں نے کیا تھا۔ کون کہتا ہے ارینج لو نہیں ہو سکتا۔ کم از کم میں نے تو یہ بات غلط ثابت کر کے دکھا دی۔ یہ ارینج لو ہی ہوا تھا اور اسے ارینج کیا تھا میں نے، زرنگار ساجد صدیقی نے۔ جب دو محبت کرنے والوں کے درمیان ایک تیسرا فرد آ کر نفرت ڈلوا سکتا ہے تو دو محبت نہ کرنے والوں کے درمیان ایک تیسرا فرد آ کر محبت کیوں نہیں ڈلوا سکتا؟ اور جہاں تک ہنی اور ڈاکٹر چاچو کی ذاتی پسند ناپسند میں اختلاف کا سوال ہے تو جس جگہ محبت ہو وہاں اس چیز کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ کچھ بعید نہیں کہ آنے والے برسوں میں ہنی ڈاکٹر چاچو کے ساتھ بیٹھ کر کلاسیکل میوزک انجوائے کرتی، دقیق ادبی کتب کا مطالعہ کرتی دکھائی دیں اور ڈاکٹر چاچو ہنی کے ساتھ بیٹھ کر انڈین سوپس اور انڈین موویز کو دیکھتے اور ان پر تبصرہ کرتے نظر آئیں۔ محبت دراصل اسی شیئرنگ کا نام ہے اگر کیمیائی زبان میں بات کریں تو محبت Covalent Bond کی طرح ہوتی ہے Covalent Bond میں Electrons شیئر کیے جاتے ہیں اور Love Bond میں ایک دوسرے کے سکھ، دکھ، پسند، ناپسند سب کچھ شیئر کیا جاتا ہے۔

''کبھی کبھی میں کچھ اچھی باتیں نہیں کر جاتی؟''

آپ اپنے دام میں

''انسان اور سب کچھ ہو بس اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نہ ہو۔''

اپنی بیس سالہ زندگانی میں میں نجانے کتنی کروڑ مرتبہ یہ بات سوچ چکا ہوں۔ اکلوتا ہونا کسی سزا، کسی امتحان اور کسی آزمائش سے کم نہیں۔ ہو سکتا ہے بہت سے اکلوتے میری اس سوچ سے اتفاق نہ کریں۔ ان کے ہاں اکلوتا ہونے کا سلسلہ نسل در نسل نہیں چلا آ رہا ہوگا۔ وہ اپنے والدین کی اور ان کے والدین اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نہیں ہوں گے۔ وہ دو عدد معزز بزرگ خواتین جنہیں عرفِ عام میں نانی اور دادی کہا جاتا ہے سے محروم ہوں گے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا یہ ضروری تھا کہ میری طرح میرے امی اور ابو بھی اپنے اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوتے۔ اگر مجھے اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہونا ہی تھا تو کم از کم میرے دو چار تایا، چچا، خالہ، ماموں اور ان سب کے زیادہ نہ سہی ایک ایک دو دو بچے ہی ہوتے، پھر نانو اور دادی اماں کی توجہ چوبیس گھنٹے مجھ پر ہی تو مرکوز نہ رہتی۔

یہ دونوں معزز خواتین جو آپس میں دیورانی جٹھانی ہیں ان کے ہاتھوں میرا کیا حشر ہوتا ہے اور کیسی درگت بنتی ہے یہ میں آپ کو مفصل بتاؤں تو آپ کو مجھ پر جی بھر کر ترس آئے۔

میرے امی ابو آپس میں چچازاد، تایازاد کزنز ہیں۔ میرے نانا جی میرے دادا جان کے بڑے بھائی تھے۔ امی شادی سے پہلے بھی اسی گھر میں رہتی تھیں اور شادی کے بعد بھی۔ یہ گھر میری نانی کا بھی ہے اور دادی کا بھی اور ان دو عظیم اور قابلِ احترام ہستیوں کے یکجا ہونے ہی نے میری زندگی کو مشکل بلکہ مشکل ترین بنایا ہوا ہے۔ بیس سالوں سے میں ایک آزمائشوں بھری زندگی جی رہا ہوں۔ نانو اور دادی اماں کا بس چلے تو مجھے کبھی گھر سے باہر ہی نہ نکلنے دیں۔

''باہر مت جاؤ، دھوپ بہت تیز ہے۔''

''ہوا دیکھو کتنی ٹھنڈی چل رہی ہے، گرم کپڑے پہنے بغیر باہر نہ نکلنا۔''

''بارش ہونے والی ہے گھر پر ہی رہو۔''

میں جیسے ایک نازک اندام حسینہ تھا جسے سردی، گرمی، دھوپ، ہوا، بارش سب موسموں سے بچا کر رکھنا تھا۔ لاڈ پیار ایک حد میں ہو تو بندہ اس پر خوش بھی ہو۔ یہاں تو میرے لیے زندگی گزارنا ہی دشوار کر دیا تھا ان نازنخروں نے، ماضی میں خود پر بیتے درد و الم کی زیادہ تفصیلات کیا بتاؤں۔

ذرا آج صبح ہی کا واقعہ سن لیجیے، آپ خود ہی میری مشکلات اور مصائب کو ٹھیک ٹھیک جان جائیں گے۔ ساڑھے دس بجے کا ذکر ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ، میری صبح نو سے دس کے درمیان اور منہ اندھیرے والی صبح یعنی صبح کاذب نو اور ساڑھے نو کے درمیان ہوتی ہے۔ میری صبح صبح تھی مگر اس کا کیا

کیجیے کہ کالج کے لیے روز کی طرح لیٹ ہو چکا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر جلدی جلدی ناشتے کے دو چار لقمے لے کر کالج کی طرف دوڑ لگانا چاہتا تھا مگر ڈائننگ ٹیبل پر میرے دائیں طرف بیٹھی نانو اور بائیں طرف بیٹھی دادی اماں مجھے اٹھنے دیتیں تو اٹھتا نا۔

''صبح صبح نہانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس موسم میں احتیاط کرنی چاہیے، خدانخواستہ نزلہ زکام ہو گیا پھر؟''

نانو کی حفظ آواز سنتا میں اپنے سامنے گھی میں تر بتر ان تین بھاری بھرکم پراٹھوں اور گھی ہی میں تلے ان دو دیسی انڈوں کو بے چارگی سے تک رہا تھا۔ یہ مجھ جیسے فٹ اور اسمارٹ رہنے کی خواہش رکھنے والے نوجوان کا ناشتہ تھا اور یہ مجھے ہر حال میں تناول فرمانا تھا۔ امی جو مجھے ایک سیب، ایک ابلے انڈے، ایک پیالی کارن فلیکس اور چائے کا ایک کپ دینے کے بعد روزانہ ''بھوکے'' پیٹ کالج بھیج رہی تھیں ان کی دادی اماں کے ساتھ نانو نے بھی کافی طویل کلاس لی تھی۔

''اتنی مشکل پڑھائی اور اس پر سے ڈھنگ کا کھانا، ناشتہ بھی نہ ملے بچے کو۔''

دادی اماں..... آخر کو ساس ٹھہریں، انہیں اکثر امی سے شکایت رہا کرتی تھی مگر جب بات میری آتی تو نانو بھی دادی اماں کی ہم نوا بن جایا کرتی تھیں۔ میرا جم جانا، خود کو فٹ رکھنے کی کوششوں میں ہلکان ہونا، ایکسر سائز، جوگنگ سب کا ستیاناس اور بیٹا غرق کرنے کو مجھے گھی میں ڈوبی ''مقوی'' غذائیں کھلائی جا رہی تھیں۔ گھی اور چکنائی کے نقصانات، کولیسٹرول اور وزن کے بڑھنے کی مشکلات اور پھر ان کے انتہائی مضر اثرات ہائی بلڈ پریشر یہاں تک کہ ہارٹ اٹیک کے خطرے تلک کے بارے میں میں نے دبے لفظوں میں کئی بار بولنا چاہا پر مجھ طوطی کی آواز نقار خانے میں سننا کس نے تھی۔

''چپ بیٹھو، تم کل کے بچے کیا جانو گے کہ کس چیز میں کتنی غذائیت ہے۔ یہ احتیاط و حتیاط سب چالیس سال کے بعد کی جاتی ہے۔ تمہاری عمر ابھی کھانے پینے اور صحت بنانے کی ہے۔ اس عمر کا کھایا پیا ہی بڑھاپے میں کام آتا ہے۔ تمہاری عمر میں تمہارے دادا جان ناشتے میں پانچ پراٹھے اور پانچ ہی دیسی انڈوں کا آملیٹ اتنے شوق اور مزے سے کھا لیا کرتے تھے۔''

اب اگر دادا جان کسی پہلوان کی اولاد تھے اور ان کا ہاضمہ بھی قابلِ رشک تھا تو اس میں مجھ بے چارے کی کیا خطا؟ میں معصوم ڈاکٹر انور حسین جیسے فٹ اور اسمارٹ انسان کا بیٹا ہوں جو زندہ رہنے کے لیے کھاتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کے گھر میں یہ سب ہو کیا رہا ہے؟

''یہ کیا ہے نانو؟'' میں پراٹھوں اور انڈوں سے نمٹ کر جیسے تیسے فارغ ہوا تو پتا چلا ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔

''چکن سینڈوچز بنائے ہیں، کالج کی کینٹین سے الٹی سیدھی چیزیں کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

نانو اپنے ایک ہاتھ میں لنچ باکس اور دوسرے میں منرل واٹر کی بوتل لیے کھڑی تھیں۔ یہ تماشا ہمارے گھر میں روز ہوتا ہے۔ روز لنچ باکس میں ''غذائیت'' سے بھرپور کھانے کی چیزوں اور پانی کی ایک عدد بوتل کے ساتھ مجھے گھر سے روانہ کیا جاتا ہے۔ باہر کا پانی پینا مجھے منع ہے۔ مگر لے جانا یہ سب کچھ مجھے بغیر کسی چوں چرا کے ہوتا تھا کہ انکار کی صورت میں نتائج انتہائی خوفناک اور خطرناک نکلتے تھے۔ میں ان آنسوؤں سے کیونکر جیت

سکتا تھا؟ ادھر دادی اماں کی آنکھوں میں آنسو آتے، نانو کی شکل رونے جیسی بنتی ادھر میں سب احتجاج اور انکار بھول کر پسپائی اختیار کرتا۔

''نانو! تین تین صحت مند پراٹھوں اور دیسی انڈوں کے بعد لنچ؟ اتنا ہیوی ناشتہ کرنے کے بعد کوئی ہاتھی ہی لنچ کر سکتا ہے۔''

میں ہاروں گا، جانتا تھا پھر بھی ایک ناکام کوشش کرنے لگا۔

''خبردار جو اپنے آپ کو خود ہی ٹوکا ہو تو، خوامخواہ اپنے کھائے پیئے کو خود ہی نظر نہ لگاؤ۔ ویسے بھی کل جب سے نرگس تمہارے قد کاٹھ کو ٹوک کر گئی ہے مجھے برے برے وہم آ رہے ہیں۔ بدذات نہ ماشاءاللہ بولی نہ کچھ اور ایسا منہ بھر کر ''قیس تو خاندان کے سب لڑکوں میں سب سے لمبا چوڑا ہے'' بول دیا۔ دادی اماں نے مجھے گھورا۔

''نرگس کی بات پر مجھے بھی ہول اٹھے تھے بھابھی!'' منے'' کو نظر لگتی بھی تو اتنی جلدی ہے۔''

نانو نے دادی اماں کی بات سے جیسے ہی اتفاق کیا میں اک جھٹکے سے کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب قبل اس کے کہ نرگس آنٹی کی لگائی نظر اتارنے کے لیے کچن سے مرچیں لائی جائیں میں جلد از جلد گھر سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ نظر اتارے جانے والا یہ تماشا بلاناغہ اور بلا مبالغہ روز ہوا کرتا ہے۔ ہر روز ہمارے خاندان میں سے، دوست احباب میں سے، پڑوسیوں میں سے کوئی نہ کوئی ایک آ کر مجھے نظر لگا جاتا ہے۔ (میں مسٹر یونیورس جو ٹھہرا۔)

میں ٹیبل سے اٹھ کر سیدھا ڈائننگ روم سے متصل لاؤنج میں امی کے پاس چلا آیا۔ وہ اتنی دیر سے میری بے بسی اور بے چارگی یقیناً دیکھ رہی تھیں مگر نانو اور دادی اماں کے آگے اختلاف رائے کا مطلب یہ تھا گویا دو دو سپر پاورز سے بیک وقت لڑائی مول لی جائے۔ امی صوفے پر بیٹھی سجدہ اور حیا کو پڑھانے میں مصروف تھیں۔

''جل تو جلال تو۔'' میں دل ہی دل میں نظر اتارے جانے سے بچنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

''امی! میں جا رہا ہوں۔''

''اللہ حافظ بیٹا۔'' امی نے مجھے جواب دینے کے بعد دور ہی سے مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔

اگر میرے کلاس فیلوز میں سے کسی کو پتا چل جائے کہ قیس انور حسین جو کالج کا ایک مقبول اسٹوڈنٹ ہے وہ اپنے بیگ میں لنچ باکس اور پانی کی بوتل رکھ کر کالج لاتا ہے تو وہ پتا نہیں میرا کتنا مذاق اڑائیں گے۔ ابھی تک تو یہ بات صرف میرے قریب ترین چار دوستوں تک ہی تھی اور وہ اکیلے میں یعنی جب صرف ہم پانچ ہوتے چاہے میرا جتنا مذاق اڑا لیتے، جتنی پھبتیاں کستے پر دوسرے کلاس فیلوز کے سامنے کبھی اس بات کا ذکر تک نہیں کرتے تھے، پھر بھی میں ڈرتا تھا۔

''سجدہ! دکھاؤ بیٹا سوال کتنا حل کر لیا تم نے۔''

امی مجھے فارغ کر کے دوبارہ اپنے پاس بیٹھی حیا اور سجدہ کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ 4th اور 5th کلاسز میں پڑھنے والی یہ دونوں بچیاں ہمارے دائیں طرف والے پڑوسی جاوید انکل کی بیٹیاں تھیں۔ یہاں چھ سو گز کے مکان میں ہم پانچ افراد رہا کرتے تھے اور ان کے ہاں اتنے ہی

مکان میں پانچ بھائی بمعہ اپنی آل اولاد کے رہا کرتے تھے۔ خیر سے ہر بھائی کے آٹھ آٹھ، نو نو بچے تھے اور جاوید انکل نے تو اپنے باقی چاروں بھائیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ان کے بارہ نہیں شاید تیرہ بچے تھے۔ شاید اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کبھی اگر جاوید انکل سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنے بارہ کے بارہ بچوں کے درست نام معہ اس بات کے کہ وہ کس کالج، کس اسکول اور کس کلاس میں پڑھتے ہیں بتا دیں تو میرا دعویٰ ہے کہ وہ کافی سوچ بچار کے بعد شروع کے پانچ چھ کے بارے میں تو بتا دیں گے مگر آخر والوں کی جماعتیں و درس گاہیں بہت سوچنے پر بھی انہیں شاید ہی یاد آسکیں۔

یقین کریں یہ مبالغہ آرائی نہیں۔ مجھے ایک بار یہ اتفاق ہو چکا ہے اسی لیے یہ بات اتنے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ جاوید انکل کو حیا اور سجدہ کے اسکول کا نام تو بہت سوچنے پر بھی یاد نہیں آیا تھا۔ ویسے آپس کی بات ہے اگر اکلوتا ہونا برا ہے تو بہت سارے بلکہ ڈھیر سارے بہن بھائیوں کا ہونا بھی برا ہی ہے۔

جاوید انکل کا گھر ''بیگ ہاؤس'' کہلاتا ہے۔ میرے حساب سے تو اس کا نام کباڑ ہاؤس، جنجال پورہ یا مچھلی گھر ہونا چاہیے تھا۔ اس گھر میں وہ چالیس پینتالیس افراد سماتے کیسے تھے میں نہیں جانتا، ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس جنجال پورے کی یہ دو معصوم بچیاں اپنے گھر میں والدین کی طرف سے توجہ میں کمی کے سبب ہمارے گھر بہت زیادہ آتی جاتی تھیں۔ امی میری سدا کی رحم دل اور ہمدرد خاتون، انہیں جی بھر کر والدین کی جانب سے عدم توجہ کا شکار ان بچیوں پر رحم آتا، وہ انہیں خوب پیار کرتیں، نتیجتاً وہ دونوں اپنے اسکول اور پڑھائی کے مسئلے مسائل لیے اکثر امی ہی سے رجوع کرنے لگیں۔

ویسے بچوں کی اس ریل پیل کے باوجود جاوید انکل اور آنٹی سلمیٰ نے اپنی بیٹیوں کے نام خوب سوچ بچار کر کے رکھے تھے۔ ایمان، سجدہ، حیا۔ چھوٹی دونوں بہنوں کے ساتھ کبھی کبھار بڑی بہن صاحبہ ایمان جاوید کی آمد بھی ہمارے گھر میں شروع ہوئی تو میں چڑ گیا۔

''آنٹی! فلاں ریسپی، آنٹی! فلاں کڑھائی، آنٹی! فلاں ٹانکا۔''

ان بہنوں نے تو میری امی کا پیچھا ہی پکڑ لیا۔ جب دیکھو گھر میں موجود ہیں۔ مگر یہ چڑ اور یہ اعتراض فقط اس وقت تک رہا تھا جب تک کہ میں نے سجدہ اور حیا کی ''باجی'' کو دیکھا نہیں تھا۔ خاتون کافی سخت پردہ کرتی تھیں۔ گھر سے باہر بھی ذرا کم کم ہی دکھتی تھیں۔ اب اپنے گھر آنے جانے پر جو میں نے تھوڑی جھلک دیکھی تو وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ ''باجی'' بہت زیادہ خوبصورت تھیں۔ خوبصورت لڑکیوں کے بارے میں معلومات ہر باذوق نوجوان رکھا کرتا ہے۔ یہ ایمان واقعی کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتی تھی۔

خیر صاحب ''بیگ ہاؤس'' اور اس کے مکینوں کا ذکر مزید کر کے میں آپ کو بور ہرگز نہیں کرنا چاہتا۔ یہ ساری باتیں تو یونہی برسبیلِ تذکرہ شروع ہو گئی تھیں، میں تو دراصل اپنی بات کر رہا تھا۔ مرچوں اور مجھ میں جو مقابلہ جاری تھا میں اس کا ذکر کر رہا تھا۔ مرچیں کچن سے پہلے نکلیں گی یا گھر سے میں۔ تو جناب امی سے دعائیں لے کر میں جلدی سے مڑا۔ درمیان میں کہیں بھی رکے بغیر میرا سیدھا پورچ میں پہنچنے کا ارادہ تھا لیکن برا ہو اس فون کی بیل کا، اس منحوس کو بھی اسی وقت بجنا تھا۔

''دیکھنا بیٹا! کس کا فون ہے؟''

امی نے توجہ اپنی شاگردوں ہی پر مرکوز رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں نے فون کو گھورتے ہوئے ریسیور اٹھایا اور عجلت بھرے انداز

میں ''ہیلو'' کہا۔

''منے! آپ نے پانی کی بوتل رکھ لی بیگ میں اور دیکھیں آج ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے، سویٹر پہننا مت بھولیے گا۔''

یہ ایک باریک اور کھنکتی ہوئی خوبصورت زنانہ آواز تھی مگر یہ مجھے خوبصورت کس طرح لگ سکتی تھی۔ میرا پارہ ایک دم ہی ہائی ہونے لگا۔ یہ بے ہودہ لڑکی میرا موڈ خراب کرنے کو صبح صبح پھر نازل ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے جواب میں کچھ کہہ پاتا اندر کہیں سے نانو کی پاٹ دار آواز آئی۔

''منے! باہر ٹھنڈ ہے سویٹر پہن کر جانا۔'' اتنی تیز اور کراری آواز جسے سن کر مردہ بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ غصے کے مارے میرا کیا حال ہو رہا تھا میں بتا ہی نہیں سکتا، اوپر سے ریسیور سے آتی اس کے کھلکھلانے کی آوازیں، وہ نانو کی بات کو کس قدر انجوائے کر رہی ہوگی۔ اپنی سہیلیوں کے درمیان بیٹھ کر وہ میرا کس قدر مذاق اڑائے گی۔ ریسیور بہت زور سے پٹخ دینے کے باوجود میرا غصہ اپنی جگہ قائم تھا، یہ آواز کس کی تھی میں نہیں جانتا، ہاں مگر یہ آواز آج میں نے پہلی بار نہیں سنی تھی۔

پچھلے پندرہ دنوں سے اس لڑکی نے فون کر کر کے مجھے عاجز کر رکھا تھا۔ یقین کریں میں بدذوق نہیں ہوں، مجھ معصوم کے سینے میں بھی ایک دل دھڑکتا ہے جو ابو کے خوف اور دہشت کے باوجود بھی ہر خوبصورت حسینہ کے قرب کے لیے ہمکتا ہے۔ میری کسی پیش قدمی کے بغیر کوئی لڑکی از خود میری طرف آئے، مجھے فون کرے، نیٹ پر چیٹنگ شیٹنگ کرے، ای میلز بھیجے تو سو بسم اللہ۔

مگر خوبصورت آواز والی ایک لڑکی فون کر کر کے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھے، جن باتوں کو میں اپنے واقف کار لڑکوں تک سے چھپائے رکھنا چاہتا ہوں ان کا مزے لے لے کر ذکر کرے، مجھے چڑائے، میرا مذاق اڑائے تو کیا دل چاہے گا میرا؟ میرے ہاتھ میں ایک ریوالور ہو اور سامنے یہ بے ہودہ لڑکی۔ پتا نہیں یہ تھی کون اور اسے میرے بارے میں یہ ساری باتیں یہاں تک کہ میرا ''نک نیم'' تک کس طرح معلوم تھا۔

میرا نک نیم منا ہے۔ دیکھیں میں یہ بات دکھے دل سے آپ کو بتا رہا ہوں۔ اتنا واہیات نک نیم میرا رکھا کس نے تھا میں آج تک نہیں جان پایا۔ اگر جان لیتا تو اس شخص کو ہرگز نہ چھوڑتا۔ چند مستند راوی روایت کرتے ہیں کہ میری پیدائش کے بعد دادا، دادی، نانا، نانی، امی اور ابو سمیت کل چھ افراد میرا نام رکھنے کے امیدوار تھے۔ ہر ایک اپنا تجویز کردہ نام رکھنے پر مصر تھا سو پیدائش کے ایک ماہ بعد تک میرا نام فریقین کے کسی ایک نام پر متفق نہ ہونے کے سبب رکھا نہیں جا سکا تھا۔ اس دوران نجانے کس نے مجھے منا کہنا شروع کر دیا اور میرا اصل نام کہیں پیچھے رہ گیا۔ پھر جوں جوں میں بڑا ہوا امی اور ابو نے تو مجھے میرے اصل نام سے پکارنا شروع کر دیا مگر نانو اور دادی اماں نہیں مانیں۔ اسکول کے دنوں میں میرے کسی دوست کا فون آتا تو نانو یا دادی اماں ریسیور ہاتھ میں لیے ہوئے ہی اپنی زوردار کراری سی آواز میں مجھے پکارتیں۔

''منے! تمہارے دوست کا فون ہے۔''

نتیجہ ظاہر ہے حسب توقع ہی نکلتا۔ کلاس میں منا کہہ کہہ کر مجھے خوب رگیدا جاتا۔ وہ تو کالج میں آ کر میں نے نانو اور دادی اماں کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے تب کہیں جا کر میری التجاؤں کا اتنا اثر ہوا تھا کہ وہ کسی آئے گئے اور دوستوں اور رشتے داروں کے سامنے مجھے منا کہنے سے احتراز برتنے لگی تھیں مگر یہ کون تھی جو میرے اتنے خفیہ قسم کے بچپن کے گھریلو نام تک سے آگاہ تھی۔

پندرہ دن قبل اس بے ہودہ لڑکی کی فون کال میں نے پہلی مرتبہ ریسیو کی تھی۔ ڈھٹائی تو ملاحظہ فرمایئے، کسی لڑکے کو کوئی لڑکی فون کرے اور وہ بھی اس کے موبائل پر نہیں بلکہ گھر کے نمبر پر۔

''آپ منے بول رہے ہیں؟''

میرے ہیلو کا جواب ایک مترنم سوالیہ آواز نے دیا تھا۔ میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ اپنی کسی دھن میں ٹی وی پر چینل بدلتے بے دھیانی سے ریسیور اٹھانے والا میں ہکا بکا رہ گیا۔ ایک لڑکی کے منہ سے اپنے لیے یہ نام سن کر ظاہر ہے غصہ بھی بہت آیا۔

''میں قیس بول رہا ہوں، قیس انور حسین، آپ کون ہیں؟''

میں نے قدرے غصیلے انداز میں اپنا تعارف کروایا۔

''میں لیلیٰ ہوں۔'' مجھے لائن کے دوسری طرف دبی دبی سی ہنسی سنائی دی۔

''کیسا اتفاق ہے، آپ قیس ہیں میں لیلیٰ ہوں۔ ویسے آپ کے بارے میں تو سنا تھا کہ آپ صحرا میں اکیلے رہتے ہیں پھر شہر میں آمد کیسے ہوئی اور شہر میں آتے ہی قیس کا نام منا کیسے پڑ گیا؟'' اس لڑکی کی آواز بے شک بہت خوبصورت تھی مگر یہ خوبصورت مترنم سی آواز، باتیں اتنی بے ہودہ کر رہی تھی کہ میں اس آواز پر ہزار جان سے فدا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

غصے سے میرا دماغ کھولنے لگا تھا مگر اپنے غصے پر قابو رکھتے ہوئے اسے پہچان لینے اور اس کی آواز شناخت کر لینے کی خاطر نرمی سے پوچھنے لگا۔

''معاف کیجئے گا میں آپ کو پہچان نہیں پایا، آپ کہاں سے بات کر رہی ہیں؟''

''منہ سے۔'' کمال اطمینان سے اس دو لفظی جواب سے مجھے نوازا گیا اور اس جواب کے ملتے ہی مجھے کامل یقین ہو گیا کہ وہ جو کوئی بھی تھی ڈھیٹ ابنِ ڈھیٹ اور بدتمیز ابنِ بدتمیز ہر حال میں تھی۔

''آپ اپنی انگلیوں کو زحمت دے کر کوئی اور نمبر ٹرائی کیجئے اور پھر اپنے اسی منہ سے کسی فارغ اور بے کار آدمی کا بھیجا کھایئے، میرے پاس ان فضولیات کے لیے وقت نہیں ہے۔''

میں نے غصے سے بولتے ریسیور پٹخا۔ اگر وہ بار بار مجھے منا کہہ کہہ کر چڑاتی نہیں تو اتنے ''زہد و تقویٰ'' کا مظاہرہ ہرگز نہ کرتا۔ جس نمبر سے ابھی اس لڑکی نے کال کی تھی میں نے وہ بغور دیکھا۔ وہ ایک موبائل نمبر تھا جو میرے کسی بھی جاننے والے کا ہرگز نہیں تھا۔ جو میرے اتنے گھریلو نام سے آگاہ تھی وہ کوئی انجان لڑکی تو ہو نہیں سکتی تھی۔ میں نے تیز رفتاری سے ذہن دوڑا کر اپنی تمام کزنز اور کلاس فیلوز کو کھنگالنا شروع کر دیا۔

میں اس فون کال پر لعنت بھیج کر اسے بھولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ جو کوئی بھی تھی بڑی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ اس نے میرا پیچھا پکڑ لیا تھا۔

''منے صاحب! میں نے سنا ہے آپ دانتوں کے ڈاکٹر بن رہے ہیں۔'' اگلے روز وہ بے ہودہ لڑکی پھر فون پر موجود تھی۔ ''میں ڈینٹل

سرجن بن رہا ہوں جسے عام طور پر ڈینٹسٹ کہا جاتا ہے۔ آپ کی اطلاع کے لیے اس پڑھائی کو بی ڈی ایس بیچلر آف ڈینٹل سرجری کہا جاتا ہے۔''

''دانتوں کا ڈاکٹر کہیں یا ڈینٹل سرجن، بات تو ایک ہی ہے۔ منے کو کسی بھی نام سے پکاریں رہے گا تو منا ہی۔''

نہ زندہ ہوا شیکسپیئر ورنہ اس لڑکی کو اس بے ہودگی کا مزہ وہی چکھاتا مگر میں آخر اس کے منہ لگ کیوں رہا ہوں، مجھے خود پر تاؤ آیا۔ ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ میری مردانہ انا ایک دم ہی بیدار ہوگئی۔

''لعنت ہے میری مردانگی پر، ایک لڑکی کی تیز زبان سے ڈر رہا ہوں۔''

ادھر میری مردانگی مجھے اس لڑکی کو کرارے کرارے سے جواب دینے کو مچل رہی تھی ادھر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ابو، امی، دادی اماں، اور نانو مجھ ہی کو بغور دیکھ رہے تھے۔

یہ فون ہمارے رات کے کھانے کے وقت آیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے اشخاص خصوصیت کے ساتھ ابو کی گہری نظروں نے میرے جوش کو ٹھنڈا کر کے خوف تلے ایک دم ہی دبا دیا۔

ان کا اکلوتا بیٹا جسے وہ پڑھا لکھا کر نجانے کتنا لائق اور کتنا قابل بنا دینا چاہتے تھے وہ بیس سال کی عمر میں طالب علمی کے دوران جبکہ ابھی وہ ان ہی کی دی ہوئی پاکٹ منی پر گزارا کرتا ہے، ان ہی کی خرید کردہ گاڑی میں ان ہی کے پیسوں کا پٹرول ڈال کر سارے شہر میں گاڑی دوڑائے پھرتا ہے، وہ عشق اور عاشقی جیسی خرافات میں پڑ گیا ہے۔ اگر نانو اور دادی اماں کا مجھ سے پیار بے تحاشا تھا تو ابو کے مجھ پر شکوک و شبہات بے انتہا۔ ان حالات میں میرے لیے بہتر یہی تھا کہ اس پٹاخہ کے منہ نہ لگوں۔ میں نے چمکار پچکار کر اپنی مردانہ انا کو تھپکی دے کر سلانا چاہا۔

''خاتون! آپ جو کوئی بھی ہیں، براہِ مہربانی آئندہ مجھے فون کرنے کی زحمت مت کیجئے گا۔''

''میں اس طرح کا لڑکا نہیں ہوں، بس یہی کہنے کی کسر رہ گئی وہ یہ بھی کہہ ڈالو۔''

میری مردانگی نے مجھ پر ہزار بار لعنت بھیجی۔ دوسری طرف میرے مہذب لہجے کے جواب میں وہ یوں چلائی گویا میں نے اسے کوئی بہت برا لفظ کہہ دیا ہو۔

''خاتون؟ آپ مجھے خاتون کہہ رہے ہیں، میرے خاتون بننے میں ابھی کم از کم بھی بیس پچیس سال کا عرصہ درکار ہے۔''

''درست فرمایا، ابھی تو آپ ارتقائی مراحل سے گزر رہی ہیں، سائنس دانوں کا ایک گروپ اس نظریہ پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔'' میں دانت پیستا ہوا طنزیہ بولا۔

''مرد بندر اور عورتیں بندریا۔'' میں نے دل میں اپنی تصحیح کی۔ دوسری طرف سے جلترنگ بجاتی ہنسی یوں سنائی دی جیسے میں نے اسے ملکۂ حسن کے خطاب سے نواز دیا ہو۔

''کس کا فون ہے قیس؟ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

والد بزرگوار کی جاہ و جلال سے بھری کڑک آواز پر میں نے جھٹ ریسیور پٹخا اور سعادت مندی سے نظریں نیچی کیے ڈائننگ ٹیبل پر واپس آ گیا۔

''کس کا فون تھا؟'' انہوں نے تفتیشی انداز میں سرتا پاؤں مجھے بغور دیکھا۔

''وہ نوفل کو، کہہ رہا تھا کہ کل جو ٹیسٹ ہونے والا ہے اس کی.....''

''اچھا ٹھیک ہے، کھانا کھاؤ۔'' انہوں نے میری بات درمیان سے کاٹ دی تھی۔ انہیں میری وضاحت پر یقین آ گیا۔ میں اس پر شکر کا سانس لیتا کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا مگر یہ مصیبت صرف آج کے لیے نہ تھی کہ میں اس کے ٹل جانے پر مطمئن ہو جاتا۔

اگلے روز، پھر اس سے اگلے روز اور پھر اس سے بھی اگلے روز۔ گویا یہ کہانی روز کی ہو گئی۔ ڈھٹائی کی آخری حد یہ تھی کہ اگر میرے سوا گھر کا دوسرا کوئی فرد فون اٹھاتا تو بھی وہ مجھے بلوا لیا کرتی۔ اتفاق سے ابھی تک ابو نے اس کی کال اٹینڈ نہیں کی تھی ورنہ کب کی میری پیشی ہو چکی ہوتی۔ اور تو اور اب اس کی ای میلز بھی آنا شروع ہو گئی تھیں۔

اس کی تیسری فون کال پر جو ناز و نے ریسیو کی تھی جب میں نے آ کر ریسیور کان سے لگا کر ہیلو کہا تو ایک دم ہی لگا جیسے کوئی بٹن دبایا گیا ہے اور فوراً ہی میرے کانوں میں کسی لڑکی کی سریلی سی آواز گونجی۔

''اچھی نانو، پیاری نانو، مانو بات ہماری

منے کو لکھنا پڑھنا ہے

دانتوں کا ڈاکٹر بننا ہے

نانو تلو میں پکاؤ

منے کو صحت مند بناؤ۔''

''نمبر تو میرے پاس آ چکا ہے، کرتا ہوں میں تم لوگوں کا کوئی انتظام۔''

میں غصے سے بے قابو ہو کر چیخا مگر میری چیخ کے جواب میں بھی وہی جنگل بجتا رہا۔ جیسے ہی ختم ہوا دوبارہ شروع، ریسیور زور سے پٹختے پٹختے میں رک گیا۔ ریسیور پٹخوں یا ٹیلی فون سیٹ کو اٹھا کر پھینکوں نقصان تو سراسر اپنا ہی ہے، اس سے اس بے ہودہ لڑکی کا تو کچھ بگڑنا تھا نہیں۔ دس پندرہ منٹ بعد جب مجھے اپنا غصہ قدرے کم ہوتا محسوس ہوا تو میں نے کچھ سوچ کر اسی موبائل نمبر کو ڈائل کیا جس سے ابھی مجھے کال کی گئی تھی۔

''ہیلو.....'' دوسری طرف سے ایک بھاری بھرکم، خرانٹ قسم کی مردانہ آواز نے میرا استقبال کیا۔ میں خود کچھ چکرایا، کچھ سٹپٹایا مگر پھر اپنی ہمت جمع کر کے آواز کو رعب دار بنا کر بولا۔

''آپ کے نمبر سے فون کر کر کے مجھے تنگ کیا جا رہا ہے۔''

''میاں! ہوش میں تو ہو؟''

وہ بڑے میاں یوں غصے میں آئے جیسے میں نے انہیں گالی دے دی ہو۔ وہ صرف مجھ ہی کو کیا میرے آباؤ اجداد تک کو کھری کھری سنا دینے پر آمادہ نظر آئے تو مجھے فوراً ہی لائن کاٹنی پڑ گئی۔ یہ لڑکی میری توقع سے کہیں زیادہ چالاک تھی۔ میں نے چیک کیا تو پتا چلا اس کی اب تک کی ہر

کال الگ الگ موبائل نمبرز سے کی گئی تھیں۔

''پیاری ماں دعا کرو منا جلد بڑا ہو جائے۔''

''منے کو چاہیے میری پوری توجہ''

''ابھی تو منا صرف بیس سال کا ہے۔''

ٹی وی پر چلنے والے مختلف اشتہارات اپنی بے سری آواز میں ریکارڈ کر کے ہر روز مجھے سنائے جا رہے تھے، حسبِ سابق ہر بار کسی نئے موبائل نمبر سے اور بغیر کسی اضافی گفتگو کے۔

میں ان دنوں غصے سے پیچ تاب کھا رہا تھا۔ بس نہ چلتا تھا کہ کہیں سے یہ لڑکی مجھے مل جائے اور میں اس لڑکی کی گردن دبا ڈالوں۔ ان دنوں نانو اور دادی اماں کے چاؤ چونچلے ہمیشہ سے بھی زیادہ طیش دلانے لگے تھے۔ اپنے اکلوتے ہونے پر غصے اور بے بسی کے ملے جلے جذبات کا ہر وقت شکار رہنے لگا تھا اور آج پندرہویں دن صبح صبح کے وقت جبکہ میں اس بے ہودہ لڑکی کو بھلائے نانو اور دادی اماں کے ناشتوں اور لنچ وغیرہ سے نمٹنے میں مصروف تھا تب وہ فون پر پھر موجود تھی۔

آج کئی دنوں کے بعد ایسا ہوا تھا جب میرے لیے ریکارڈ شدہ پیغام نہیں بجا تھا۔ میں سارا دن یہ سوچ سوچ کر اپنا خون جلاتا رہا تھا کہ جس وقت اس کا فون آیا عین اسی وقت اس کی بے ہودگی پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے نانو نے مجھے سویٹر پہننے کی نصیحت کیوں کی۔ اوائل دسمبر سے فروری کے وسط تک یا تو بوڑھے اور بیمار افراد سویٹر پہنتے ہیں یا پھر شیر خوار بچے۔ میری عمر کے لڑکے باہر آدھی آستینوں اور بغیر آستینوں کی شرٹس اور ٹی شرٹس، برمودہ شارٹس کے ساتھ پہنے مزے سے گھوم رہے ہیں اور نانو مجھے پوری آستینوں کی قمیص کے اوپر سویٹر بھی پہنوا رہی ہیں۔ صبح کی اس بات پر خراب میرا موڈ رات تک خراب ہی رہا۔

☆

رات کے کھانے کے بعد امی، دادی اماں اور نانو خاندان کی مختلف خواتین کا ''ذکرِ خیر'' کرتی ان کے گناہ بخشوانے میں مصروف تھیں۔ یہ خواتین، دوسری خواتین کو ڈسکس کرنے کی اتنی شوقین کیوں ہوتی ہیں؟ کس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے، سے انہیں اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟

ابو اس گفتگو سے لاتعلق ٹی وی دیکھنے اور کافی پینے میں مگن تھے۔ میں کافی کے گھونٹ لیتا اس انتظار میں تھا کہ کب والدِ بزرگوار اٹھ کر اپنے کمرے میں جائیں اور میں گھر سے باہر یار دوستوں کی طرف نکلوں۔

ابھی میں اس انتظار ہی میں تھا کہ فون کی بیل بجی۔ کسی سولہ سالہ دوشیزہ کی طرح میرا دل اس بیل پر تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ابو کے اٹھنے سے پہلے میں تیز رفتاری سے اٹھا اور جھپٹ لینے والے انداز میں ریسیور اٹھا لیا۔

''منے صاحب! آپ سویٹر پہنے بغیر کالج کیوں گئے؟ مجھے سارا وقت فکر رہی۔''

میں دانت پیستا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے اچانک ہی ایک زوردار چھینک آئی۔

''دیکھا ہو گیا نا زکام، میں نے صبح کہا بھی تھا سویٹر پہن کر جاؤ پر بوڑھی نانی کی سنتا کون ہے۔''

پیچھے صوفے پر بیٹھی نانو میری چھینک پر ہول گئی تھیں۔ ہر نارمل انسان کو چھینک آتی ہے پر میری تو چھینک بھی ایک بہت بڑا اور گھمبیر مسئلہ ہوا کرتی تھی۔ ایک سے دوسری بار چھینک لوں تو جھٹ جوشاندہ قسم کی چیزوں سے میری تواضع شروع ہو جاتی تھی۔ میں ہمیشہ ہی ان باتوں پر چڑتا تھا۔ یہاں غصے اور کوفت سے میرا برا حال تھا اور وہاں لائن کے دوسری جانب وہ خوب زور سے کھلکھلائی تھی۔

''خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ جایئے منے صاحب! ایک کپ جوشاندہ پی کر دو تین لحاف لپیٹ کر لیٹ جائیں، خدانخواستہ ٹھنڈ بیٹھ گئی تو۔''

''سوری یہ رانگ نمبر ہے۔''

کہتے ہوئے میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ نانو کو کچھ کہنا بے کار تھا۔ خون کے گھونٹ پیتا اپنے کمرے میں آ گیا۔ ابو کے بیٹھے ہونے کا لحاظ نہ ہوتا تو آج میں اس لڑکی کو اس کے لڑکی ہونے کی پرواہ کیے بغیر بہت کچھ کہہ دیتا۔ کیا پابندیوں اور خوف میں جکڑی زندگی ہے مجھ بے چارے کی۔ لڑکیوں کی طرح ڈر ڈر کر اور سنبھل کر چلنا پڑتا ہے۔

☆

''منے بھائی جان! آپ کا فون ہے۔''

یہ ناز وصاحبہ تھیں۔ جوگرز کے تسمے باندھتا میں غصے میں گھوما۔ ہماری یہ ملازمہ صاحبہ عمر میں مجھ سے چار پانچ سال بڑی ہی ہوں گی پر احتراماً مجھے منے بھائی جان کہا کرتی تھیں۔ چونکہ وہ اور اس کا باپ شروع ہی سے ہمارے پاس ملازم تھے لہٰذا ناز وصاحبہ کا بچپن ہمارے ہی ہاں گزرا تھا۔ نانو اور دادی اماں سے سن سن کر ہی اس نے مجھے منے بھائی جان کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے کبھی اس کا یہ کہنا برا نہیں لگا تھا پر اب جب وہ بولتی جی چاہتا اس کا سر پھاڑ دوں اور وہ.....۔

''عادت پڑ گئی ہے۔'' کہہ کر میری ڈانٹ کا معصومیت سے جواب دے دیا کرتی تھی۔

''کتنی بار کہا ہے تم سے، خالی بھائی کہا کرو۔ یہ آگے پیچھے کسی بھی قسم کے دم چھلے لگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اسے جھاڑ پلاتا میں کمرے سے نکل کر فون کی طرف آ گیا تھا۔

''تم لوگوں کو میز آتے جا رہے ہیں، میری سالگرہ یاد آ گئی۔''

بغیر سلام دعا اور ہائے ہیلو کے میں خوشگوار سے لہجے میں بولا۔

''آج میرے منے کی سالگرہ ہے۔''

میرا جملہ مکمل بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ میرے کانوں میں یہ فلمی گیت گونجا۔ میرے ہونٹوں پر سے فوراً ہی مسکراہٹ رخصت ہوئی۔ دانت

پیتے اور مٹھیاں بھینچتے میں اپنی سالگرہ کی بے ہودہ ترین مبارک باد وصول کر رہا تھا۔

''میرا منا ہوا بیس سال کا، لنچ باکس لے کے نکلا میرا منا، لنچ باکس۔''

بس اب حد ہو چکی تھی۔ کوئی قیس انور حسین کا مذاق اڑائے اس پر جملے کسے؟ آس پاس کسی کو نہ پا کر میں نے اردو اور انگریزی میں ملا جلا کر دو چار سخت قسم کی گالیوں سے مشابہ الفاظ بک کر لائن کاٹ دی۔

غصے میں بکتا جھکتا کالج روانگی کے لیے گھر سے نکلنے لگا تو سامنے والے ریاض انکل کے گیٹ پر ناز و کھڑی نظر آئی۔ جتنی دیر میں میں نے گاڑی باہر نکالی ان کا گیٹ کھل چکا تھا۔ گیٹ کھولنے والی ہستی نشو کی تھی، ریاض انکل کی دوسرے نمبر کی بیٹی۔ اصلی نام نوشین تھا مگر گھر اور گھر سے باہر ہر جگہ نشو کہلائی جاتی تھی۔ فیشن کے پیچھے اندھا دھند بھاگتی تھی۔ زیادہ کپڑوں سے اسے الجھن ہوتی تھی یا غالباً یہ نظریہ پیشِ نظر رہتا تھا کہ ایک غریب اور پسماندہ ملک کی شہری ہونے کے سبب یہ اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ بچت جس جگہ اور جتنی ہو سکے کر لینی چاہیے۔

والدہ صاحبہ کا یہ حال کہ بیڈ شیٹ کے برابر کی چادر سر سے پاؤں تک لپیٹ کر پھرتی تھیں اور جسے حقیقت میں پردے کی ضرورت تھی وہ آستینوں اور کندھے پر کپڑے کی جگہ ڈوریوں سے کام چلا لیا کرتی تھی۔ گلوں کی آگے اور پیچھے سے گہرائی بھی ہم لڑکوں کے لیے قابلِ توجہ اور لڑکیوں کے لیے قابلِ اعتراض ہوا کرتی تھی۔ ہاں تو میں ناز و صاحبہ کی بات کر رہا تھا جو ریاض انکل کے گیٹ پر کھڑی تھیں، ناز و اور نشو دونوں نے میری طرف دیکھا تھا۔ ناز و بیگم نے تو باقاعدہ ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ بھی کیا مگر میں نے جواباً گردن ہلانے کی بھی زحمت نہ کی۔ وجہ اس کی یہ نہیں کہ میں ملازمین کو کم تر سمجھتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے اس کی اس نئی ملازمت سے شدید اختلاف تھا۔ وہ باپ بیٹی ہمارے کل وقتی ملازم تھے اور جس وقت کی ہم اسے تنخواہ دیتے تھے اس وقت میں سے وقت نکال کر ہمارے کاموں میں ڈنڈی مار کر وہ ریاض انکل کے گھر بھی کام کرنے جانے لگی تھی اور یہ سلسلہ گزشتہ دو تین ماہ سے جاری تھا۔ میرے اعتراض کے جواب میں امی کی رحم دلی تھی۔

''مجھ سے اجازت مانگ رہی تھی مجھے منع کرنا اچھا نہیں لگا۔ کچھ اضافی پیسے ہی بے چاری کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ دوسروں کا بھلا سوچو تو اپنا بھی بھلا ہوتا ہے۔''

امی کا اور میرا اسی مشہور لطیفے جیسا حال تھا جس میں ماں بچے کو سمجھاتی ہے کہ

''بیٹا ہم اس دنیا میں دوسروں کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔'' اور بیٹا تعجب سے پوچھتا ہے کہ ''پھر دوسرے کس لیے آئے ہیں؟''

☆

ہم سب کا آج کاشف کے گھر رات بھر رکنے اور جاگنے کا پروگرام تھا۔ مقصد اس اجتماع اور شب بیداری کا ساتھ بیٹھ کر پڑھائی کرنا تھی۔ (سچی سے) اس بار ہم سب کا مصمم ارادہ تھا کہ شروع سال سے لگ کر پڑھائی کریں گے (یہ عہد و پیمان ہر تعلیمی سال کے آغاز پر خود سے ضرور ہوتے تھے مگر عمل درآمد کے وقت پتا نہیں کیوں گڑبڑ ہو جاتی تھی۔) کتابیں کھولنے اور پڑھائی شروع کرنے سے پہلے میں اپنے دوستوں کے سامنے اپنا تازہ ترین مسئلہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لڑکی کو مزا چکھانے کو شاید میرے دوستوں کے پاس کچھ ڈھنگ کے مشورے اور تجاویز ہوں۔

''اوئے ہوئے ہمارے شہزادے کو لڑکیاں چھیڑ رہی ہیں۔ قیس مجھے تیری قسمت پر رشک آ رہا ہے۔'' میرا دکھڑا سنتے ہی زلفی چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ لیے بولا۔

''توبہ ہے، کیسا وقت آ گیا ہے۔ پہلے لڑکے لڑکیوں کے پیچھے پڑتے تھے اب لڑکیاں خود لڑکوں کے گلے پڑ رہی ہیں۔'' نانی دادی کی صحبت میں رہتا تو میں ہوں پر ان کی طرح توبہ توبہ کیسا زمانہ آ گیا اور کیسا وقت آ گیا جیسے فقرے بولنے کی پکی عادت کاشف کی تھی۔ نوفل، کاشف اور زلفی تو میری طرف متوجہ تھے مگر مومن چہرے کے آگے کوئی ہفتہ وار میگزین پھیلائے اس میں محو تھا۔

''اس کمینے کو دیکھو دوست کی پریشانی کا کوئی احساس ہی نہیں ہے، مگن ہے اپنے میگزین میں۔''

میں با آوازِ بلند زلفی سے بولا۔ ان دنوں میں بہت زود رنج اور حساس ہو رہا تھا اسی لیے مومن کی عدم دلچسپی بے تحاشا کھٹک رہی تھی۔

''تم لوگوں سے ایک پہیلی پوچھوں؟''

مومن نے میری ناراضی و شکوہ بھری آواز ظاہر ہے سن لی تھی مگر اس کے لیے میگزین میں پڑھی گئی پہیلیاں مجھ سے زیادہ لائق توجہ تھیں۔ ''یہاں میں اپنے مسئلے میں الجھا ہوں اور اسے پہیلیوں کی پڑی ہے۔'' میں بری طرح چڑا۔

''دو پہاڑ ہیں، ان کے بیچ میں ایک دریا ہے۔ ان پہاڑوں میں سے پہلے والے پہاڑ کے پیچھے ایک گنجا آدمی بیٹھا ہے۔ دوسرے پہاڑ کے پیچھے کچھ پرندے اڑ رہے ہیں۔ پہلے والے پہاڑ کے پیچھے بیٹھا آدمی بال کٹوا رہا ہے، بتاؤ اس کا مطلب کیا ہوا؟''

مومن اسمِ بامسمیٰ ہرگز نہ تھا۔ ماں باپ کے رکھے اس نام کی لاج وہ ذرا کم کم ہی رکھا کرتا تھا۔ اس وقت وہ کون سی مومنانہ حرکت کرنے کے موڈ میں تھا ہم سب سمجھ چکے تھے۔ اتنی دیر سے یہ میگزین پڑھے جانے کا ڈرامہ کس خوشی میں ہو رہا تھا ہم سب جان چکے تھے۔ ہم سب کے چہروں پر دبی دبی سی مسکراہٹ ابھر رہی تھی جسے زلفی کے خوف سے ہم سب بمشکل کنٹرول کر رہے تھے جبکہ مومن صاحب مجسم شرافت بنے اور چہرے پر سنجیدگی لیے ہم سب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زیادہ غور سے زلفی کی طرف جو کچا چبا جانے والی نظروں سے مومن کو گھور رہا تھا۔

''چلو یہ پہیلی نہیں بوجھ پا رہے تو میں دوسری پوچھ لیتا ہوں۔ ایک گنجا جب سوئمنگ پول سے نہا کر نکلا تو وہ پورا گیلا ہو چکا تھا مگر اس کے بال گیلے نہیں ہوئے تھے۔ بتاؤ کیوں؟''

وہ معصومیت سے بولا۔ ہم تینوں سے ہنسی روکنا محال تھا۔ زلفی دانت پیستا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ چکا تھا۔

''ٹھہر جا سالے گنجے کے بالوں کے گیلا نہ ہونے کی وجہ میں تجھے بتاتا ہوں۔'' وہ آستینیں چڑھاتا مومن کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ مومن نے میرے پیچھے چھپنے کی کوشش کی مگر میں ہاتھ جھاڑتا فوراً آگے سے ہٹ گیا۔

''یارو بچاؤ، کیسے دوست ہو، دوست کی مدد کو نہیں آ رہے۔'' مجھے ہر جھنڈی دکھاتے دیکھ کر اس نے باقیوں کو دہائی دی۔

''خود نمٹو، پنگا لیا کیوں؟''

دبلا پتلا مومن پہلوان نما زلفی سے اپنے بچاؤ کی کوششوں میں مصروف تھا مگر زلفی اسے بخشنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس بے چارے

کے بال گزشتہ ایک ڈیڑھ سال کے اندر اندر اتنی تیزی سے گرے تھے کہ اب اسے با آسانی اور بغیر کسی تکلف کے گنجا کہا جا سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے انتہائی سنگین مسئلہ تھا۔ ایک تو وہ پہلے ہی انکل انکل جیسا نظر آتا تھا، لے دے کر کسر بالوں نے پوری کر دی تھی۔

مومن کہتا تھا کہ جو چند لٹیں بالوں کی اس کے سر پر رہ گئی ہیں اگر وہ بھی نہ ہوں تو وہ بڑے آرام سے بزرگ شہریوں میں شمار ہونے لگے گا۔ پھر اسے کتنے فائدے حاصل ہوں گے، کہاں کہاں اس کا ٹکٹ آدھا لگے گا، کہاں کہاں اسے قطار میں نہیں لگنا پڑے گا اور کہاں کہاں اس کا داخلہ مفت ہو جائے گا۔

وہ زلفی سے پٹتا تھا پر اسے چھیڑنا بند نہیں کرتا تھا۔ مومن کچھ بھی کہتا ہو پر زلفی سے ہم سب کو ہمدردی تھی۔ لڑکیاں پہلے زلفی انکل کو کچھ خاص گھاس نہیں ڈالتی تھیں، بالوں نے رہی سہی آس بھی ختم کر دی تھی۔ ان دنوں فرسٹ ایئر کی نوخیز کلی جیسی ایک مہ جبین سے اسے پہلی بار سچا عشق ہوا تھا (گویا اس سے پہلے ساٹھ ستر جھوٹے عشق ہوئے تھے) اور وہ حسین، نازنین ہمارے گنجو دوست پر ایک نگاہ تک ڈالنے کی روادار نہ تھی۔

کاشف کے کمرے میں اس وقت ایک ادھم مچا ہوا تھا۔ مومن چھلاوے کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر اور زلفی جو پہلے ہی دو چار ہاتھ تو اسے جڑ ہی چکا تھا اس کی ٹھیک ٹھاک دھلائی کرنے کی نیت سے اس کے پیچھے۔ اس بھاگ دوڑ اور دھینگا مشتی میں کاشف بے چارے کی آواز کون سنتا، جو کبھی کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی بھاگ دوڑ کرتے اپنے دوستوں کی طرف۔

''بس کرو تم لوگ۔'' چند منٹوں میں اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس کی دھاڑ ایسی تھی کہ گنجو اور پتلو دونوں فوراً رک گئے۔

''بابا سے ڈانٹ پڑوانی ہے کیا مجھے؟ مانا کہ وہ قیس کے ابو کی طرح غصے کے تیز نہیں مگر ان بے ہودہ آوازوں اور چیخ و پکار پر تو کسی ٹھنڈے مزاج کے آدمی تک کو غصہ آ سکتا ہے۔ ذرا وقت دیکھو رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔''

اس ڈانٹ کا اثر یہ ہوا کہ مومن صاحب جو خود کو بچانے کی کوشش میں رائٹنگ ٹیبل پر چڑھ کر کھڑے تھے انسان کے بچوں کی طرح نیچے اتر آئے۔

زلفی مومن کو کینہ توز نگاہوں سے گھورتا ہوا کہنے لگا۔

''اسے کچھ نہیں کہہ رہے جو کمینگی شروع کرتا ہے۔ خبیث نے سارے لطیفے اور ساری پہیلیاں گنجوں کے بارے میں یاد کر رکھی ہیں۔''

کاشف کے سمجھانے پر زلفی غصے سے بولا۔

''تم لوگ بس آپس میں فضول باتوں پر جھگڑتے رہنا اور میں جو اپنا اتنا اہم مسئلہ بیان کر رہا ہوں اسے تو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جا رہی۔''

میں نے دوستوں سے شکوہ کیا۔

''تمہارا مسئلہ سرے سے مسئلہ ہی نہیں ہے۔''

مومن کو چونکہ اب گنجوں کے متعلق سوچنے سے فرصت مل چکی تھی اسی لیے اس نے پہلی بار میرے مسئلے پر لب کشائی کی۔ ''یہ مسئلہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟'' میرا انداز مکمل طور پر لڑنے والا تھا۔

جس چیز نے مجھے اتنا چڑا کر رکھا ہوا ہے، اتنا عاجز کیا ہوا ہے وہ اسے مسئلہ ہی ماننے سے انکار کر دے۔

''بھئی سیدھی سی بات ہے اگر کوئی لڑکی خود تم سے فری ہو رہی ہے، تمہیں فون کر رہی ہے تو تمہارا کیا جاتا ہے۔ تم بھی انجوائے کرو۔''

''انجوائے کرو؟ وہ میرے ابا حضور کی شک و شبہ اور جاہ و جلال سے بھری لال انگارہ آنکھیں دیکھی ہیں۔ تم میں سے کوئی بے وقت ملنے آ جائے تو تفتیش شروع ہو جاتی ہے۔ کیوں آیا تھا، کس لیے آیا تھا۔ کسی لڑکی کا نام سن لیا تو میری کھال ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ ہونہہ تمہارا کیا جاتا ہے، انجوائے کرو۔''

میں نے چڑ چڑے پن سے جواب دیتے اسی کے لہجے کی نقل بھی اتاری۔ ''خیر آپ نہ اتنے ولی ہیں اور نہ والد بزرگوار سے ایسے ڈرنے والے، تمام تر روک ٹوک اور تفتیشی پروگرام کے باوجود اپنے لیے خفیہ راستے نکال ہی لیتے ہیں۔ سچ بات کچھ یوں ہے برخوردار! کہ محترمہ ہمارے میاں مجنوں سے پیار محبت کی پینگیں بڑھانے کے لیے نہیں بلکہ اس کا مذاق اڑانے کے لیے فون کرتی ہیں اور یہی اصل سبب ہے آپ کے اس سے چڑنے کا۔''

نوفل اتنی دیر میں پہلی مرتبہ کچھ بولا بھی تو ایسا جو میرا دل جلا کر رکھ دے۔ وہ سیدھی اور صاف بات کیا کرتا تھا۔

نوفل کا منہ پھٹ پن مجھے بہت برا لگا تھا گو دل سے میں تسلیم کر رہا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ ابو کے تمام تر خوف اور دہشت کے باوجود میں اس لڑکی کی کالز کو کھلے دل سے خوش آمدید کہتا اگر وہ میرا مذاق اڑانے، مجھ پر جملے کسنے اور میری دکھتی رگ کو چھیڑنے کی کوشش نہ کرتی تو۔

''تمہیں میری مشکل کا حل بتانا ہے تو بتاؤ۔ اپنی یہ سچ گوئی اور حق پرستی کسی اور وقت کے لیے اٹھا کر رکھو۔'' میں نے ذرا اکڑ دکھاتے ہوئے ناراضی کا اظہار کیا۔

''ہاں بھئی حل بتانا ہے تو بتاؤ۔ یہاں اس باحیا، پاک دامن اور شریف نوجوان کی عزت خطرے میں پڑی ہے اور تمہیں صاف گوئی اور حق پرستی سوجھ رہی ہے۔'' زلفی کی شکل دیکھ کر مجھے پہلے ہی پتا چل چکا تھا کہ اس کی زبان میں کھجلی ہو رہی ہے۔

''ہائے اللہ نہیں! اگر دنیا والوں کو پتا چل گیا تو تمہاری کتنی بدنامی ہوگی، یہ ظالم دنیا والے تو تمہیں جیتے جی مار ڈالیں گے۔''

ایک مشہور فلمی اداکارہ کے انداز میں فرضی دوپٹے کا پلو منہ میں لے جاتے اور سانس دھونکنی کی طرح جلاتے ہوئے مومن بولا۔

''مومن! بری بات ہے، قیس بیزار بیٹھا ہے تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں۔'' زلفی نے خباثت سے ہنستے اسے شاعرانہ ڈانٹ پلائی۔

''لعنت ہے مجھ پر ہزار بار لعنت ہے جو تم جیسے خبیثوں اور کمینوں کو اپنا دوست سمجھ کر اپنی پریشانی بتائی۔'' میں غصے سے لال پیلا ہوتا فوراً ہی کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا ہو گیا ہے یار! دوستوں کے مذاق کا برا مان رہے ہو؟ بیٹھو آرام سے اور تم سب میں سے بھی اب کوئی فضول بکواس نہیں کرے گا۔''

کاشف نے مجھے پیار سے چمکارتے اور ان دونوں کو غصے سے گھورتے ماحول کی کشیدگی کو جلدی سے ختم کیا۔ وہ ہم پانچوں میں سب سے زیادہ صلح جو اور معاملہ فہم بلکہ بقول ابو کے میرا ڈھنگ کا واحد دوست تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے، میں اپنا مذاق اڑائے جانے پر چڑتا ہوں مگر ہم میں سے ایسا کون ہے جو اپنا مذاق بنتا دیکھ کر غصے میں نہ آئے۔ نانو اور

دادی اماں کے زبردستی کے لاڈ پیار نے یہ دن دکھایا ہے۔ لے کر ایک لڑکی کے ہاتھوں میرا تماشا بنوا دیا۔'' دوستوں کے آگے سچ بولنے میں ایسا کچھ مضائقہ بھی نہیں تھا۔

''اسے تمہارا ای میل ایڈریس کیسے پتا چلا؟''

اس قسم کے احمقانہ سوالات زلفی صاحب ہی کر سکتے تھے۔

''ابے موٹے دماغ میں بھیجہ ہے کہ نہیں۔ بالوں کے ساتھ ساتھ کیا عقل کو بھی رخصت کر دیا ہے، جو اس کے گھر کا فون نمبر، اس کے گھر کی اور اس کی ذاتی زندگی کی ہر بات یہاں تک کہ اس کا ''نک نیم'' تک جانتی ہے اس کے لیے ای میل ایڈریس معلوم کر لینا کون سا مشکل کام ہے؟'' نوفل نے زلفی کو گھرکا۔

''نک نیم'' کے لفظ سے مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری دم پر پاؤں رکھ دیا ہو مگر بات چونکہ میرے ہی حق میں ہو رہی تھی اس لیے احتجاج کا ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ میں اپنی شکل اور اپنے درد والم کا بالکل ٹھیک ٹھاک اندازہ دوستوں کو کروانے کے لیے کاشف کا کمپیوٹر آن کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ چاروں میرے گرد جمع تھے۔ ان دل جلانے والی ای میلز کو پڑھنے کے لیے بے قرار تھے جو میں انہیں پڑھوانا چاہتا تھا۔ میں Hot mail اور Yahoo دونوں جگہ Sign in ہو چکا تھا۔ پہلے کی تمام میلز میں Delete کر چکا تھا مگر جو تازہ بہ تازہ آج ہی پہنچی تھیں وہ سب ایک شان سے میرے Inbox میں موجود تھیں۔

''منے کا بچپن۔'' یہ پہلی میل کا سبجیکٹ تھا۔ تفصیلات بھی سبجیکٹ سے کچھ کم نہ تھیں۔

مجھے غصے میں کرسی پر سے اٹھتا دیکھ کر کاشف نے ڈپٹ کر دوبارہ بٹھایا۔ مجھے بٹھا کر کاشف خود ہی دوسری میل کھولنے لگا۔

''لگتا ہے خاتون ٹی وی بہت ذوق وشوق سے دیکھتی ہیں۔'' بولتے بولتے جواس کی اس دوسری میل میں موجود مواد پر نگاہ پڑی تو اپنی رائے میں ذرا ترمیم کرتا جھٹ بولا۔

''شعر وشاعری کا بھی کافی شوق ہے محترمہ کو۔''

لاکھ پردوں میں چھپائے منا خود کو، بھید اس کے کھولتی ہے

یہ لڑکی سچ بولتی ہے!

شاعرانہ بکواس سے مزین یہ ایک طویل مضمون کا عنوان تھا جسے جلی حروف میں انڈر لائن کر کے ٹائپ کیا گیا تھا۔ نیچے مضمون بے حد طویل بے حد طویل تھا اور ہم سب دوست اسے ایک ساتھ مل کر پڑھ رہے تھے۔

''منے کی شان میں یوں تو دیوان کے دیوان کہے جا سکتے ہیں پھر بھی کوشش کر رہی ہوں کہ کم لفظوں میں منے کو بھرپور انداز میں خراجِ تحسین پیش کر سکوں۔''

منے کی شان میں پہلی نظم حاضرِ خدمت ہے جس کا عنوان بھی ''منا'' ہی ہے۔

''منا''

یہ بستہ، یہ ٹفن، یہ پانی لیے منا
یہ دادی اماں کا بگاڑا منا
یہ نانو کی آنکھ کا تارا منا
یہ منا اگر مل بھی جائے تو کیا؟
لٹا دو اسے، سلا دو یہ منا
مرے سامنے سے ہٹا دو یہ منا
تمہارا ہے نانو تم ہی سنبھالو یہ منا
یہ منا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

''ارے یہ ساحر کی نظم کا کیسا بیڑا غرق کیا ہے اس لڑکی نے۔'' عاشق مزاج اور شعروشاعری کا شوقین زلفی چلایا۔ کم بخت کو میرے بیڑا غرق ہونے پر نہیں کسی ساحر کے بیڑے کے غرق ہونے کا غم لاحق ہو رہا تھا۔

''چپ بیٹھو، پڑھنے دو آگے کیا لکھا ہے۔'' نوفل نے پیچھے سے زلفی کو ایک دھموکا جڑا۔

''باؤلا ہونا منے کا ٹفن کی تلاش میں''

ہے ہے منے کا لنچ لے گیا کون
ہے ہے منے کو جُل دے گیا کون
ہاتھوں سے اگر کسی نے اٹھایا نہیں ہے
ہوا بن کر تو لنچ اڑا نہیں ہے
کاشف تو دکھا کدھر گیا لنچ
مومن تو بتا کدھر گیا لنچ

''یہ تو قیس کے ساتھ ساتھ ہم سب کو بھی جانتی ہے۔''

زلفی پھر بولا اور پھر اس نے نوفل کا ہاتھ کھایا۔ میں مونیٹر کے ساتھ گاہے گاہے اپنے دوستوں کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی مگر آنکھوں میں ہنسی صاف نظر آ رہی تھی۔ یہ نئی میل چونکہ میں نے بھی ابھی ابھی ہی پڑھی تھی اس لیے میرا منہ غصے سے مزید پھول چکا تھا۔ نظریں میری پھر سے غیظ وغضب کے عالم میں مونیٹر کو گھور رہی تھیں۔

''ابھی کچھ سال لگیں گے''

ابھی کچھ سال لگیں گے

نانو، دادو سے لاڈ اٹھواتے منے کے بڑا ہونے میں

ابھی کچھ سال لگیں گے

کالج لنچ لے جانا چھوڑنے میں، بن سویٹر کے گھر

سے نکلنے میں

ابھی کچھ سال لگیں گے

منے کے بڑا ہونے میں

ابھی کچھ سال لگیں گے

''اور اب آخر میں کچھ متفرق اشعار اور مصرعے۔''

یہ کارنامہ بھی منا کبھی دکھائے ہمیں
کہ لنچ و پانی بنا کالج جاتا نظر آئے ہمیں
کمرۂ امتحان میں منا تھا اداس بیٹھا
کہتا تھا پیپرز سر پہ آئے آوارہ گردی میں سال گزرا
یہ پڑھائی کا دکھاوا، یہ نوٹس یہ کتابیں
ابا جان کو چکما دینے کے لیے ہیں

''اسے تو تیرا کچا چٹھا سب معلوم ہے قیس!''

مومن میری ناراضی سے ڈرے بغیر برملا بولا۔

غم و غصے سے پاگل ہوتا میں دانت کچکچا رہا تھا۔ ''یہ لڑکی ایک بار میرے سامنے آجائے۔'' چاروں دوست جن سے کچھ دیر قبل میں بری طرح بدظن ہو رہا تھا وہ سب حقِ دوستی ادا کرتے ہنسی مذاق اور غیر سنجیدگی برطرف کرتے مکمل سنجیدگی بلکہ کسی قدر غصے سے اس میل کو گھورنے لگے تھے۔

ایک منا ہے دوست ہمارا
سنتا اس کا حال
دادی کی آنکھ کا تارا ہے وہ
نانی کا چندا لال

''ورق تمام ہوا اور منے کی مدح باقی ہے۔'' نوفل نے ایک دم ہی کسی کو بھی آگے پڑھنے کا موقع دیئے بغیر مونیٹر کو ایک زوردار مکا مارا۔ کاشف نے اسے گھورا جو جوشِ جذبات میں یہ بھول چکا تھا کہ یہ اس کے نہیں کاشف کے باپ کی کمائی سے خریدا گیا ہے۔

''کسی کی اتنی جرأت، ہمارے دوست کا مذاق اڑائے۔ قیس تم مجھے اس کا نمبر دو جس سے وہ تمہیں کال کرتی ہے۔ نکلواتا ہوں میں اس کا سارا کچا چٹھا۔ اپنی ایڈوانس اردو کا مظاہرہ بہت کرلیا موصوفہ نے، اب ان محترمہ کو سبق سکھائے جانے کا وقت آچکا ہے۔'' نوفل مکمل جلال میں آچکا تھا۔

''کون سا نمبر دوں؟ ان بیس دنوں میں وہ مجھے بیس مرتبہ کال کرچکی ہے اور ہر بار الگ الگ موبائل نمبروں سے۔'' میں جواباً چڑ کر بولا۔

نوفل میری مدد کرنے کے فل موڈ میں تھا مگر میں غصے اور خوف میں پاؤں پر کلہاڑی نہیں بلکہ کلہاڑی پر پاؤں مار چکا تھا۔ جس طرح انٹرنیٹ پر ''سرفنگ'' اور ''سرچنگ'' کے بعد History ابا جان کے تفتیشی خوف کے پیشِ نظر Delete کرنے کی پکی عادت تھی ایسے ہی کسی لڑکی کی فون کال اٹینڈ کرنے کے بعد نمبر میموری سے Delete کرنے کی۔ غصہ، عقل کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ غصے اور جھنجھلاہٹ میں ابو کے خوف سے اس ایڈیٹ لڑکی کی فون کالز کے نمبر Delete کرتے وقت کبھی دھیان ہی نہ آیا کہ اس ثبوت کو مٹا ڈالا تو اس کا کھوج لگاؤں گا کس طرح؟ شرمندگی سے سر جھکا کر میں نے اپنی حماقت دوستوں کے گوش گزار کی تو وہ سب ساتھ مل کر مجھ پر چلانے لگے۔

''احمق کی دُم! یہ کیا حرکت کی۔''

''اب کیسے پتا چلے گا اس کا۔''

میں پہلے ہی اپنی بے وقوفی پر شرم اور خجالت میں مبتلا ہو رہا تھا ان سب کی لعن طعن کے بعد شکل مزید رونے والی بن گئی۔ کافی دیر تک وہ سب مل کر مجھے احمقِ اعظم قرار دیتے رہے پھر کاشف ہی کو میری حالت پر رحم آیا۔

''اب بس بھی کرو۔ نمبرز ہی تو مٹے ہیں کوئی دنیا تو ختم نہیں ہوگئی، وہ جب روز فون کرتی ہے تو نمبرز تو دوبارہ جمع کیے جاسکتے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات اسے ڈھونڈنے کا یہی ایک واحد طریقہ نہیں۔ صاف ظاہر ہے وہ قیس کی کوئی قریبی جاننے والی ہے۔ قیس تم گھر پر اکیلے بیٹھ کر حالتِ سکون میں اپنی تمام کزنز تمام پڑوسنوں اور تمام انکلز کی بیٹیوں کے نام اور ان کے حوالے سے اپنے یک لفظی خیالات یعنی چالاک، سیدھی، بھولی، معصوم، لڑاکا، بے وقوف وغیرہ وغیرہ ایک کاغذ پر لکھ ڈالو۔ پھر ہم سب مل کر اس لسٹ میں سے مشکوک لڑکیوں کی ایک الگ فہرست تیار کریں گے اور ہاں یہ یاد رہے کہ اس لسٹ میں ہماری تمام کلاس فیلوز کو شامل کرنا مت بھولنا۔ کسی بھی معاملے کی تفتیش کا بنیادی اور پہلا اصول یہی ہے کہ ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے۔''

''واہ واہ سبحان اللہ، کیا شاندار مشورہ دیا ہے کاشف احمد آپ نے، پہلے سوچو پھر لسٹ بناؤ، پھر اس لسٹ میں سے ایک دوسری لسٹ بناؤ۔ آپ سے پانچ سالہ منصوبہ بنانے کو کہا تھا یا کوئی معقول حل بتانے کو۔ اس عرصہ میں تو وہ اسٹوپڈ نجانے میرے یار کی کتنی درگت بنا چکی ہوگی۔'' نوفل نے طنزیہ لب ولہجہ میں واہ واہ کہتے پہلے تالیاں بجائیں اور پھر اسی طنزیہ لہجے میں یہ جملے کہے۔

تم لوگ کھڑے ہو کر سوچ بچار کرو، میں فوری عمل کا قائل ہوں۔'' زلفی ہم سب کو بحث مباحثہ میں الجھا چھوڑ کر کمپیوٹر کی طرف بڑھا۔

''کیا کر رہے ہو تم؟'' ہم سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

''اس کی بدتمیزی کا جواب بدتمیزی سے دے رہا ہوں۔ بڑا خود کو شعر و سخن کا چیمپین سمجھتی ہے۔ ابھی زلفی کی شاعری نہیں دیکھی۔'' میرے روکنے کے باوجود وہ کرسی سنبھال کر کمپیوٹر کے آگے جم چکا تھا۔

''اکبر الہ آبادی نے ایسی لڑکیوں کے متعلق کافی کچھ کہا ہے، مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔''

''اکبر الہ آبادی نے یقیناً کافی کچھ کہا ہوگا مگر میرے پیارے، راج دلارے، آنکھوں کے تارے زلفی غصہ جانے دو۔ اگر اس کے بے ہودہ ای میلز کے جواب دینے کا مسئلہ ہوتا تو یہ کام تو کب کا میں خود ہی کر ڈالتا۔ وہ مجھے چڑانا چاہتی ہے، تپانا چاہتی ہے، اسے جواب دوں گا یعنی اسے یہ بتاؤں گا کہ میں بہت چڑ رہا ہوں؟ اس کی خواہش کے عین مطابق چڑ کر میں اسے تسکین دوں کہ وہ مجھے چڑانے اور تپانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔''

زلفی میرے سمجھانے پر کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھ گیا تھا۔ اب ہم پانچوں دوست کارپٹ پر آڑے ترچھے لیٹے خاموشی سے کوئی معقول طریقہ سوچنے میں گم تھے۔

''پیارے دوستو! اس موقع پر آج کے لیے اتنا غور و فکر کافی ہے۔ یوں بھی ایک ہی بات پر بہت دیر تک سوچنے سے ذہن الجھ جاتا ہے۔ ویسے تو آج یہاں پڑھنے کی خاطر جمع ہوا گیا ہے پر اس بارہ بجاتی رنجیدہ و غصیلی شکل کے ساتھ قیس صاحب نے خاک پڑھائی کرنی ہے۔ لہٰذا مابدولت یہ طے کر رہے ہیں کہ اس موضوع اور پڑھائی دونوں کو کچھ دیر کے لیے موقوف کر کے ٹی وی دیکھ لیا جائے۔''

مومن جیسے پڑھائی کے چور سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی تھی۔ کاشف کے گھورنے کے باوجود اس نے ٹی وی آن کر دیا تھا۔

''آواز ہلکی کر خبیث۔'' کاشف نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ جھپٹا۔

ایک چینل سے زبردست قسم کا پروگرام آ رہا تھا۔

''لاحول ولا قوۃ۔'' ظاہر ہے یہ بیان ہمارے سب سے نیک اور پارسا دوست مولوی کاشف احمد کا ہی تھا۔ وہ حسیناؤں کے مختصر بلکہ مختصر ترین لباس کو دیکھ کر اپنا ایمان خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے ہم سب کے لیے چائے بنانے چلا گیا جبکہ ہم چاروں ایک مرتبہ پھر میرا کی احمقانہ سنجیدگی، شاندار انگریزی، ثانیہ کے مولویوں کے خلاف اعلانِ جہاد اور ملیکہ کی کھلی ڈلی باتوں کے مزے لینے لگے۔ ان واہیات ای میلز اور پھر اپنی حماقت کے سبب جو میرا موڈ خراب تھا وہ اس ''ایکٹوٹی'' کے بعد از خود ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔

☆

آج میرا فراغت کا دن تھا اس لیے ذرا بے فکری سے لمبی تان کو سوتے رہنے کے بعد صبح ساڑھے گیارہ بجے اٹھا، نہا دھو کر کمرے سے باہر نکلا تو شامتِ اعمال پہلی ملاقات والد صاحب سے ہو گئی۔ یا اللہ یہ اس وقت گھر پر کیا کر رہے ہیں؟ میں اندر ہی اندر دہلا پر کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے انہیں باادب سلام عرض کیا۔ سلام کا جواب دیتے انہوں نے خوب گھور کر سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں گویا ہوئے۔

''اتنی جلدی کیا تھی اٹھنے کی، کچھ دیر اور سو لیتے۔''

''جی بس وہ نیند بھر گئی تھی۔''

عاجزانہ لہجے میں میں سر جھکا کر بولا۔ ڈھٹائی اور بے شرمی کا مظاہرہ کس طرح کیا جاتا ہے یہ ابھی پرسوں رات ہی تو میں نے مومن کی پسندیدہ اداکارہ سے سیکھا تھا۔ میری عاجزی اور نیازمندی نے انہیں طنز اور طعنوں سے براہِ راست غصے کی طرف آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اکلوتی اولاد وہ بھی نا ہنجار، نالائق، ایک انڈہ وہ بھی گندا جیسے نامناسب اور قابلِ اعتراض الفاظ وہ اپنے فقروں میں استعمال کر رہے تھے۔

''کیا ہو گیا ہے انور! ایک ہی بیٹا ہے کیوں ہر وقت بے چارے کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ مجال ہے جو کبھی شفقت اور محبت سے بیٹے سے بات کی ہو۔'' دادی اماں نے تند لہجے میں بیٹے کی خبر لی۔ ''اب آئے گا مزا۔''

''اکلوتا بیٹا ہے تو کیا سر پر بٹھالوں، پہلے ہی آپ لوگوں کی دی شہ پر قابو سے باہر ہوا جا رہا ہے۔''

''صبح صبح میرے نواسے کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تو بچے نے ناشتہ بھی نہیں کیا اور تم شروع ہو گئے۔'' نانو ابو پر بگڑیں۔

''یہ صبح صبح ہے؟ بڑی امی دوپہر کے بارہ بج رہے ہیں۔'' ابو، دادی اماں اور نانو کو آپس میں الجھتا چھوڑ کر میں ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا جہاں امی میرے لیے میری پسند کا گرما گرم ناشتہ لیے موجود تھیں۔ میں اپنے آگے رکھے بہترین ناشتے سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔

''آج فراغت ملی ہے تو اچھے بچوں کی طرح دل لگا کر اور خوب جم کر پڑھائی کرنی چاہیے۔''

اس نیک خیال پر عمل درآمد کرتے میں ٹائم ٹیبل بنانے لگا، دن بھر کیا کیا پڑھنا ہے اور کتنی کتنی دیر پڑھنا ہے ابھی یہ کام بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ امی کی خالہ زاد بہن حبیبہ خالہ اور ان کی بیٹی حورالعین ہمارے گھر تشریف لے آئیں۔ حورالعین جسے سب پیار سے حور کہتے تھے اور بالکل بجا کہتے تھے اس کے ساتھ میرا تعلق ذرا قدیم ہے۔

نوعمری کے زمانے کی پہلی محبت جسے اب میں Puppy love قرار دے کر مسکرا دیتا ہوں۔ تیرہ سال کی عمر میں جب مجھے خود سے تین سال بڑی اپنی کزن اچانک ہی بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ تب لگتا تھا کہ اگر حور مجھے نہ ملی تو میں زہر کھا کر خودکشی کر لوں گا۔ وہ پڑھائی میں بڑی اچھی تھی اور میں نالائق۔ پڑھائی کے ساتھ وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیا کرتی تھی۔ وہ ان دنوں فرسٹ ایئر پری میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی جب میں اس سے مدد لینے اس کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ اس کا گھر ہمارے گھر سے قریب تھا اور میں اپنی اسپورٹس بائی سائیکل ہوا کے دوش پر اڑاتا ہر دوسرے روز اس کے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ میں اس کے عشق میں گوڈوں گوڈوں ڈوب چکا تھا اور وہ تھی کہ کچھ سمجھتی ہی نہ تھی۔

تب ایک روز ہمت کر کے میں نے ایک سرخ گلاب کا پھول (جو اسی کے لان سے توڑا تھا) اس کی طرف بڑھا کر اسے ''حور! آئی لو یو'' بول دیا تھا۔ اس کا ردِعمل بڑا ہتک آمیز تھا۔ پہلے وہ حیران ہوئی پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

''منے! پہلے بڑے تو ہو جاؤ۔''

''میں بڑا ہو چکا ہوں، پورے تیرہ سال اور چار ماہ کا۔''

''حوروں کا وعدہ کیا ہی مسلمانوں سے گیا ہے، ظاہر ہے جو نیک اعمال کرے گا حور اسی کو ملے گی۔''

وہ کھلکھلاتے ہوئے شرارتی انداز میں بولی۔ ایسی پٹاخہ لڑکیاں جن کے پاس ہر بات کا گھڑا گھڑایا جواب موجود ہو مجھے ذرا نہیں بھاتیں۔ حور سے گو اب میرے دوستانہ مراسم تھے مگر اس وقت میں اس سے کچھ چڑ بھی رہا تھا اور کچھ مشکوک بھی ہونے لگا تھا۔

ابھی دل ہی دل میں حور سے چڑتے اور مشکوک ہوتے کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ حور کے بڑے بھائی صاحب جنید ظہیر بھی ہمارے گھر تشریف لے آئے۔ یہ جنید ظہیر ذرا پڑھاکو قسم کے پروفیسر ٹائپ بندے ہیں۔ ان کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا سب کچھ Mathematics ہے۔ وہ Calculus (کیلکولس) کے مختلف فارمولوں پر غور کرتے رات کو سوتے اور صبح جیومیٹری کے کسی پیچیدہ مسئلے کا حل دریافت کرتے اٹھتے ہیں۔ خیر سے ایم فل کر چکے ہیں NED میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور عنقریب ان کا پی ایچ ڈی کے لیے امریکی روانگی کا ارادہ ہے۔

میرا ذاتی نظریہ ہے کہ بندہ بس اتنی تعلیم حاصل کر لے کہ معاشرے میں باعزت زندگی گزار سکے۔ اچھا کھا کما سکے۔ اب یہ کیا کہ کوئی ایک مضمون پکڑ لو اور پھر ریسرچ کے نام پر ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے ہی پڑ جاؤ اور یہ Phd کرتے کرتے تو مجھے لگتا ہے اچھا خاصا نارمل بندہ بھی یقیناً پاگل ہی ہو جایا کرتا ہوگا۔

میں جنید کے لیے جس بھی قسم کے خیالات رکھتا پر وہ ابو کا بہت فیوریٹ ہے۔ محنتی، ذہین، قابل، جینئس۔ وہ اسے نجانے کون کون سے خطابات سے نوازتے ایک طنزیہ نگاہ مجھ پر ضرور ڈالا کرتے ہیں۔

میرے ساتھ ساتھ امی، نانو اور دادی اماں نے بھی جنید کو قدرے تعجب سے دیکھا۔ کتابوں میں کھویا رہنے والا وہ بندہ اپنے گھر والوں سے بمشکل ملا کرتا تھا۔ ایک طویل عرصہ بعد کل شام وہ ہمارے گھر آئے تھے۔ غالباً اپنی امریکہ روانگی کے حوالے سے اسے ابو سے کوئی کام تھا۔ امی نے انہیں کھانے پر روک لیا تھا، رات کھانے کے بعد وہ ہمارے گھر سے گئے تو مجھے یقین تھا کہ اب دو تین سال سے پہلے ان کی شکل دوبارہ نظر نہیں آئے گی مگر حیرانی اور تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ اگلے ہی دن یعنی آج پھر ہمارے گھر پر موجود تھے۔

میری چھٹی حس نے مجھے اطلاع دی کہ پروفیسر صاحب کی یہ روز روز کی آمد بے مقصد نہیں ہو سکتی ابھی میں غور خوض کر بھی نہ پایا تھا کہ حبیبہ خالہ وغیرہ کے چلے جانے کے بعد رات کھانے پر امی نے یہ عقدہ حل کیا کہ حبیبہ خالہ اور حور دراصل آج جنید کے لیے ہماری پڑوسن ایمان جاوید کے ساتھ رشتے کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھیں۔ وہ امی کے ساتھ ان کے گھر جنید کا رشتہ لے جانا چاہتی تھیں۔ کل ہمارے گھر آمد پر جنید صاحب کو امی سے دہلی بریانی، سندھی بریانی، بمبئی بریانی اور حیدر آبادی بریانی کی تراکیب پوچھتی ایمان جاوید اس قدر بھائی تھی کہ انہوں نے اگلے ہی روز اپنی والدہ اور بہن کو ہمارے گھر روانہ کر دیا تھا۔ Zerro اور Infinity کے چکروں میں ہمہ وقت الجھے رہنے والے پروفیسر صاحب ''ایسی'' سرگرمیوں میں بھی انوالو ہو سکتے ہیں۔

میں حیرت سے گنگ تھا۔ کل ہمارے گھر اتنا طویل قیام امی کے اصرار کے سبب نہیں بلکہ کسی اور ہی وجہ سے تھا۔ بظاہر کھوئے کھوئے دنیا جہان سے بے نیاز نظر آنے والے یہ پروفیسر صاحب اندر سے خاصے حسن پرست اور عاشق مزاج ثابت ہوئے تھے جہاں تک ایمان کے لیے جنید

''ہاں واقعی بہت بڑے ہو چکے، پر جتنے بھی بڑے ہو جاؤ مجھ سے ہمیشہ تین سال چھوٹے رہو گے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' میں اس کی مذاق اڑاتی نگاہوں کے باوجود جرأت سے بولا۔

''اس سے بہت فرق پڑتا ہے اور چلو اگر میں یہ مان بھی لوں کہ اس سے فرق نہیں پڑتا تب بھی میرا آئیڈیل کوئی نکما، نالائق اور ڈفر لڑکا تو ہرگز نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر بنوں گی اور کسی ڈاکٹر ہی سے شادی کروں گی اور پڑھائی میں تم جتنے نکمے ہو اسے دیکھ کر یہ سوچا ہی نہیں جا سکتا کہ تم کبھی ڈاکٹر بن سکو گے۔''

اپنی پہلی پہلی معصومانہ سی عاشقی میں عزتِ سادات گنوا کر میں اپنا سا منہ لے کر وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ حورالعین نے میرے اظہارِ محبت کی جیسی دھجیاں بکھیری تھیں اس پر میں کئی دنوں تک سوگوار اور مغموم رہا تھا۔ ایک طویل عرصہ تک میں اپنی محبت کی ناقدری اور اپنی ذلت و رسوائی پر اس سے سخت ناراض بھی رہا تھا۔

''سمجھتی کیا ہے خود کو؟ مجھے نکما، نالائق کہتی ہے۔''

ابو کی ڈانٹ ڈپٹ مجھے پڑھائی لکھائی کے معاملے میں اتنا نہیں سدھار سکی تھی جتنا ایک لڑکی کے توہین آمیز جملوں نے میری مردانہ غیرت کو للکارا تھا۔ تب یہ جنون سا دل میں بھر گیا تھا کہ اب میں اسے کسی قابل بن کر ہی دکھاؤں گا۔ ڈاکٹر بننا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ یہاں تک کہ ایم بی بی ایس کی جگہ بی ڈی ایس کرنے کا فیصلہ بھی صرف اسے نیچا دکھانے کو، اس کے غرور کا سر جھکانے کو کیا تھا۔ وہ بی ڈی ایس کر سکتی ہے تو کیا میں نہیں؟ خیر یہ قصہ ہے جب کا کہ قیس نادان تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں میں واقعی بچہ تھا۔ ذرا بڑا ہوا اور آنکھیں کھلیں تو پتا چلا میرے اردگرد ''حوروں'' اور ''پریوں'' کا ایک جہان آباد ہے اور ان حوروں کے آگے یہ ''حور'' تو کچھ بھی نہیں۔ تب اپنے Puppy Love پر ہنستے میں نے حور کے خلاف دل میں بھرا سارا بغض و عناد نکال دیا تھا۔

ہم ایک ہی کالج میں تھے وہ سینئر، میں جونیئر۔ میری اس سے خود ساختہ ناراضی ختم ہوئی تو خود بخود ہی ہم اچھے دوست بن گئے۔ دوستی اور رشتہ داری کی لاج رکھتے ہوئے وہ اپنی کتابوں اور نوٹس سے مجھے فیض یاب ہونے کا پورا پورا موقع فراہم کیا کرتی تھی۔ حور نے کبھی بچپن کے اس واقعہ کا حوالہ نہ دیا تھا مجھے لگتا تھا شاید وہ اس پرانی بات کو بھول ہی چکی ہے۔ یہ اس کا کالج میں آخری سال بلکہ چند آخری ماہ تھے، وہ عنقریب وہاں سے پاس آؤٹ کر جانے والی تھی۔

''آؤ منے میاں! اور سناؤ کیسے ہو؟ ابھی میں نانو سے تمہارا ہی پوچھ رہی تھی۔'' وہ مجھے دیکھ کر شرارتی سے انداز میں مسکرائی۔ امی، نانو اور حبیبہ خالہ اس کی بات پر مسکرائی تھیں جبکہ منے میاں کا لفظ سنتے ہی میرا موڈ آف ہو گیا تھا۔ سوچتے، غور کرتے میں بظاہر مسکرایا، ایسی بھرپور مسکراہٹ جو اسے میرے چڑنے کا پتا ہی نہ دے سکے۔

''سنا ہے حور! کسی ڈاکٹر مسلم کو ملنے والی ہے۔'' دوستانہ انداز میں مسکراتے میں نے لفظ حور اسی انداز میں کہا جیسے ابھی اس نے منے میاں کہا تھا۔

کے رشتے کا سوال تھا تو اس پر مجھے کوئی اعتراض تھا نہ پریشانی۔ وہ شروع شروع کی بات تھی جب میں ''باجی'' کے حسن سے متاثر ہو گیا تھا۔ اب ان پردہ نشین باجی سے میں بری طرح بور ہو چکا تھا۔

اپنے ہی گھر کے کچن، لاؤنج یا ڈائننگ روم میں میں ان کی موجودگی میں کسی ضرورت کے تحت چلا جاتا تو جھٹ ادھر ادھر منہ چھپانے کی یوں کوشش کرتیں جیسے میں کوئی اچکا اور لفنگا تھا اور امی بعد میں ''پتا بھی ہے وہ پردہ کرتی ہے پھر اس طرح منہ اٹھا کر کیوں گھسے۔'' کہہ کر مجھے ڈانٹا کرتیں۔

اپنے ہی گھر میں بندہ آزادی سے گھوم پھر بھی نہ سکے۔ صرف باجی ہی سے کیا میں اب پڑوس مقیم اس پوری فیملی ہی سے بری طرح چڑنے لگا تھا۔ یہ فیملی ہمارے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی جیسی ثابت ہو رہی تھی۔ ابتداء میں پڑھائی کے بہانے ہمارے گھر میں داخل ہو کر ان لوگوں نے آہستہ آہستہ اپنے قدم یہاں جما لیے تھے۔

چھوٹی بہنوں کے بعد دبے پاؤں بڑی بہن صاحبہ کی آمد شروع ہوئی۔ سلائی، کٹائی، بُنائی، پکائی سیکھنے کے لیے۔ جب پوتیوں نے ہمارے گھر کی تمام خواتین کے دلوں میں گھر کر لیا تو دادی صاحبہ کی ہمارے گھر بے تکلف آمد و رفت شروع ہوئی۔ پوری کی پوری فیملی کنجوس مکھی چوس اور مفت خوری تھی۔ کنجوس دادی کو پڑوس ہی میں مفت کا ای این ٹی اسپیشلسٹ اور ڈینٹسٹ ہاتھ لگ گیا تو انہیں مزے آ گئے۔

میرے گھر کی تینوں خواتین اس خاندان کی والہ و شیدا تھیں، میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسی کیا ترکیب لڑاؤں جس سے اس فیملی کا ہمارے گھر میں بے تحاشا آمد و رفت اور مفت خوری کا سلسلہ اختتام پذیر ہو۔ سو اپنے گھر صبح شام بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہونے والی ایک حسینہ کا رشتہ اپنے کزن سے طے ہو جانے پر مجھے کیا پریشانی لاحق ہو سکتی تھی۔ ہاں البتہ میں اس بات پر ضرور حیران ہو رہا تھا کہ کہاں جنید جیسا عالم فاضل اور کتابی کیڑا ٹائپ بندہ اور کہاں کشیدہ کاری اور گھر داری کی شوقین میری پڑوسن جن کا علمی و تعلیمی ریکارڈ خاصا زبوں حالی کا شکار تھا۔ میں اس زبوں حالی سے کافی عرصے سے آگاہ تھا۔ یہ آگاہی دراصل مجھے اس روز حاصل ہوئی تھی جب ایک روز دونوں چھوٹی بہنوں کے ساتھ ساتھ امی بڑی بہن صاحبہ کو بھی پڑھاتی نظر آئی تھیں۔ وہ آئیں تو امی سے کچھ پکانا سیکھنے کے لیے تھیں مگر امی نے انہیں پڑھنے بٹھا لیا تھا۔

''بیٹا! تم تکلف بہت کرتی ہو۔ تم لوگوں کو پڑھانے میں میرا بالکل وقت ضائع نہیں ہوتا۔ جس وقت میں سجدہ اور حیا کو پڑھاتی ہوں تم بھی کچھ پوچھنا یا سمجھنا ہو تو بے جھجک آ جایا کرو۔''

''آنٹی! آپ کو تکلیف ہو گی، زحمت ہو گی۔'' جیسے وہ فقرے کچھ دیر بولتی رہی لیکن امی کے پرزور اور پرخلوص اصرار پر اسے اپنے گھر سے اپنی کتابیں اور رجسٹرز وغیرہ اٹھا کر لانے ہی پڑے۔ میں برابر والے کمرے میں بیٹھا کمپیوٹر پر اپنا کام بھی کر رہا تھا اور اس طرف کا یہ منظر بھی درمیانی کھڑکی کھلی ہونے کے سبب دیکھا جا رہا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب میں ''باجی'' کے حسن سے شدید متاثر تھا اور اس وقت تک مجھے اپنے گھر پر غیر محسوس انداز میں قابض ہوتی اس فیملی سے کوئی پرخاش نہ ہوئی تھی۔ امی کچھ دیر اس سے اس کے بی اے کے مضامین پر گفتگو کرتی رہیں۔ پھر کتابیں کھولی گئیں، امی اسے ہسٹری پڑھا رہی تھیں۔ میں جہاں اپنی امی کی قابلیت اور علم سے بے تحاشا متاثر اور خوش ہو رہا تھا وہیں یہ دیکھ کر شدید حیران بھی ہو رہا تھا کہ کچھ منٹ پہلے

اچھی خاصی چاق و چوبند اور فریش نظر آنے والی ''باجی'' فقط دس پندرہ منٹ کی پڑھائی کے بعد ہی بے حد تھکی ہوئی نظر آنے لگی تھیں۔ آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ہر اگلے سیکنڈ منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکی جا رہی تھی۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے تاریخی پس منظر بیان کرتے امی جرمنی کی تاریخ، ہٹلر کے مظالم، نازیوں کی دہشت گردی سے ہوتے ہوتے آئن اسٹائن تک پہنچیں کہ کس طرح نازیوں کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے اس نے اپنا ملک جرمنی چھوڑ دیا تھا۔ وہ آزادیٔ ضمیر کا قائل تھا۔ اس کا نظریہ اضافیت، کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا مگر اپنے ہی ملک میں اس کی وہ قدر نہ ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔ اسے غداری کے طعنے دیے گئے، اس کے ساتھ تعصب برتا گیا۔

امی بڑے خوبصورت لب و لہجے میں اسے مفید معلومات فراہم کر رہی تھیں جب محترمہ نے جمائی روکتے نیند میں ڈوبی آواز میں پوچھا۔

''آنٹی! یہ آئن اسٹائن کیا کوئی رائٹر یا سوشل ورکر ہیں؟''

اس معصومانہ سوال کے بعد امی کا غالباً اپنا سر پیٹنے کو دل چاہا ہوگا اور رہا میں تو مجھے اسی ایک جملے سے اس بیوٹی کوئن کے پاس برین کی غیر موجودگی کی اطلاع مل گئی تھی۔

پوچھتے ہیں وہ کہ ''آئن اسٹائن'' کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

میں نے اگلے روز آئن اسٹائن کی اس ''عزت افزائی'' کا تذکرہ اپنے دوستوں سے کیا تو زلفی نے اس پر شعری تبصرہ برملا کیا تھا۔ مزید کچھ دیر اور باجی کو پڑھانے کی کوشش بمشکل جاری رکھنے کے بعد امی ان کی ''ذہنی سطح'' کے آگے جلد ہی ہار مان گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد جب میں کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھ کر کچن میں پانی پینے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ دیر قبل جو خاتون کتابیں اور نوٹس سامنے پھیلائے لمبی لمبی جمائیاں لے رہی تھیں، آنکھیں جن کی نیند کے بوجھ سے بند ہوئی جاتی تھیں اب بالکل فریش اور چاق و چوبند امی سے یخنی پلاؤ، زعفرانی پلاؤ، موتی پلاؤ اور خدا جانے کون کون سی قسموں کے پلاؤ پکانا سیکھ رہی تھیں۔

یہ نظارہ دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ محترمہ دھکے و کے کھاتی بے اے پارٹ ون تک تو جیسے تیسے پہنچ گئی ہیں مگر آگے ان تلوں میں تیل نہیں، اس پہلی اور آخری کوشش کے بعد امی نے آئندہ کبھی باجی کو پڑھانے کی ہمت نہ کی۔ اپنی طرح کی پڑھائی سے جی چرانے والی تمام لڑکیوں کی طرح باجی خیر سے شادی کی از حد شوقین تھیں۔ اس کا اندازہ مجھے ایک روز ان کے گھر جانے پر ہوا جہاں وہ میری آمد سے بے خبر اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ لان میں بیٹھی گپ شپ کر رہی تھیں۔

''ایمان کا تو لگتا ہے بی اے سے پہلے ہی بیاہ کا پروگرام ہے۔''

''تمہارے منہ میں گھی شکر، ہائے کاش ایسا ہو جائے۔ سچی یہ پڑھائی وڑھائی ہم سے تو نہیں ہوتی اور پھر زیادہ پڑھ لکھ کر ہم لڑکیوں نے کون سا منشی گیری کرنی ہے۔ میاں جی اور بچوں کو سنبھالنے کے لیے انٹر تک کی تعلیم بہت کافی ہے۔'' اپنی سہیلی کی بات کا جواب باجی نے بہت حسرت اور شدت سے دیا تھا۔ ماضی قریب کے ان واقعات کا چشم دید گواہ ہونے کے سبب میں یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ جو آئن اسٹائن کے لیے سوشل ورکر اور

رائٹر کے الفاظ استعمال کرے وہ بھی فعل حال، ہیں کے ساتھ اور جو پڑھائی لکھائی کو وبالِ جان سمجھتی ہو اس کی اور پروفیسر صاحب کی نبھے گی کیسے؟ ان محترمہ کے تو سر کے کئی فٹ اوپر سے گزر جایا کریں گی ہمارے پروفیسر صاحب کی ریاضی کے اصولوں اور قاعدوں پر مشتمل پیچیدہ پیچیدہ باتیں۔

خیر کسی کی منگنی کسی کے بھی ساتھ ہو مجھے اس سے کیا غرض لیکن نہیں جناب مجھے اس سے غرض ہے ناں۔ وجہ وہی میری والدہ ماجدہ، دادی اماں اور نانو اور ان تینوں کا پڑوسیوں کی طرف ضرورت سے بڑھا التفات۔ منگنی برابر والے گھر میں تھی اور آفت ہمارے گھر میں آئی ہوئی تھی۔ ہماری گاڑی پیٹرول سے نہیں پانی سے چلتی تھی اور میں مفت کا ڈرائیور خدمت کو حاضر تھا۔ بچیوں کے بھائی کام کو سنتے کہاں تھے اور رہے ان کے چاچے مامے تو وہ مصروف، بہت رہتے تھے، فارغ اور بے کار تو بس ایک میں ہی تھا سارے جہان میں۔

امی کی ان تاویلوں میں جتنا جل کڑھ سکتا تھا جلتا اور کڑھتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے اپنے گھر میں کوئی تقریب ہونے والی ہے۔ ادھر دادی جان نے مظلومیت بھرے لہجے میں ذکر کیا کہ ان کے گھر کا لان چھوٹا بھی ہے اور اس کی حالت بھی ایسی نہیں کہ وہاں کوئی تقریب منعقد کی جا سکے، ادھر دادی اماں اور نانو نے جھٹ انہیں تقریب کے انعقاد کے لیے اپنا لان پیش کر دیا۔ اس پیشکش سے انکار کیوں ہوتا یہ ذکر کیا ہی اسی لیے گیا تھا۔ امی، دادی اماں اور نانو کی مہربانیوں کے سبب وہ مشہورِ زمانہ منگنی کی تقریب ہمارے لان میں منعقد کی گئی۔

اس ساری صورتِ حال سے میں کس قدر خار کھا رہا تھا بیان سے باہر ہے۔ اس ایسٹ انڈیا کمپنی کو کس طرح اپنے گھر سے مار بھگاؤں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تین چار دن اسی آفت و ہنگامے کی نذر ہو گئے۔ منگنی تو چٹ ہو ہی گئی تھی، تازہ ترین اطلاعات یہ تھیں کہ بیاہ بھی پٹ ہو جائے گا یعنی جنید کی امریکہ روانگی سے قبل۔ ان دنوں ڈگری کلاسز کے امتحانات کا سیزن چل رہا تھا اور میری پڑوسن، دنوا دنوا میں گنوں کا مجسم اشتہار بنی امتحانات کا نہیں شادی کا دن گن گن کر بے چینی سے انتظار کرتی نظر آ رہی تھیں۔

جب شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں وہ ان کی دادی جان اور تازہ ترین انٹری، ان کی والدہ محترمہ اکثر و بیشتر ہمارے ہی گھر میں پائی جاتی تھیں تو پھر یہ ''انتظاری'' کیفیت میری زیرک نگاہوں سے کیونکر مخفی رہ سکتی تھی۔

☆

پڑوس میں ہونے والی منگنی کی دردسری سے نجات ملی تو آج میرا اپنے کئی روز سے التواء میں پڑے کام نمٹانے کا ارادہ تھا جن میں سرفہرست اردو بازار سے کچھ کتابوں وغیرہ کی خریداری کے لیے جانا تھا۔ سیٹی پر اپنے ایک پسندیدہ گانے۔

''آوارگی میں حد سے گزر جانا چاہیے۔''

کی دھن بجاتا میں تولیے سے سر رگڑتا ہوا باتھ روم سے نکلا۔ گیلا تولیہ کرسی پر اچھال کر ابھی میں نے بال بنانے کے لیے برش اٹھایا ہی تھا کہ ادھ کھلے دروازے سے ناز و بیگم نے اندر جھانکا۔ ''مُن'' آدھا لفظ بولتے ہی اس نے زبان دانتوں تلے دبائی پھر تیزی سے بولی۔

''بھائی! آپ اردو بازار جا رہے ہیں؟''

''ہاں تو پھر؟''

میں صبح ناشتے کے وقت امی کو اپنے آج دن بھر کے تمام معمولات سے آگاہ کر رہا تھا تب شاید اس نے میرے اردو بازار جانے کا سن لیا ہوگا۔

''انہیں کچھ کتابیں بہت ضروری چاہئیں، آس پاس کی دکانوں پر نہیں مل رہیں، پریشان ہو رہی تھیں بے چاری، میں نے سوچا آپ کتابیں لینے ہی تو جا رہے ہیں اگر ان بے چاری کی کتابیں بھی۔'' بے چاری کا لفظ جملے میں کئی مرتبہ بے دریغ استعمال کرتے اپنی بات مکمل کر لینے کے بعد اب ناز وصاحبہ مٹھی میں دبا ایک کاغذ کھولتی..... میری طرف بڑھائے کھڑی تھیں۔

''یہ کیا ہے؟'' میرا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔

''یہ کتابوں کی لسٹ ہے بھائی! نشو باجی سے میں نے کہا کہ قیس بھائی آپ کی کتابیں بھی لے آئیں گے۔''

اس ڈرے ڈرے معصومانہ انداز پر میرا دل چاہا اس کا سر پھاڑ دوں۔

''مجھ سے پوچھے بغیر آپ نے وعدہ بھی کر لیا اور لسٹ بھی لیے چلی آئیں۔ سمجھ کیا رکھا ہے تم نے مجھے، کون ہوں میں؟ نوکر ہوں تمہارا یا تمہاری نشو باجی کا۔'' غصے سے چلاتے میری اچانک ہی جو اس کے ہاتھ میں موجود کاغذ کی فہرست پر نگاہ پڑی تو میں یک لخت ہی خاموش ہو گیا۔

''مقدمہ شعر و شاعری، موازنہ انیس و دبیر، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری۔''

''اپنی ایڈوانس اردو کا مظاہرہ بہت کر لیا محترمہ نے۔''

''بڑا خود کو شعر و سخن کا چیمپئن سمجھتی ہے۔'' میری سماعتوں میں نوفل اور زلفی کی آوازیں گونجیں۔

''لاؤ یہ لسٹ مجھے دے دو۔ نشو باجی سے کہنا فکر نہ کریں، میں ساری کتابیں لا دوں گا۔''

ناز و جو میرے چیخنے چلانے پر بری طرح ڈر کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ میرے ایک دم ہی پینترا بدلنے پر ہکا بکا رہ گئی۔ کہاں چیخ و پکار اور کہاں یہ شہد میں ڈوبا لہجہ؟

میں نے اس کے ہاتھ سے لسٹ لے کر اسے کمرے سے رخصت کیا اور اب اس لسٹ کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ یہ ناز و کی بچی، مارِ آستین، گھر کی بھیدی۔ میرے گھر کی اتنی خفیہ اور نجی باتیں باہر کس طرح پہنچ رہی تھیں مجھے سمجھ میں آ رہا تھا۔ اپنی بے تحاشا اور بے وقوفانہ حد تک سوچے سمجھے بغیر بولنے کی عادت یہ جاہل کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتی تھی۔ اپنی بے وقوفی میں وہ میرے بارے میں اپنی نشو باجی کو کس طرح لحہ لحہ کی خبریں پہنچا رہی تھی اس کا جیتا جاگتا ثبوت تو یہ لسٹ تھی۔

میں اردو بازار ابھی گیا بھی نہیں اور سارے محلے کو اس کی خبر ہو گئی۔ تو یہ سب یوں تھا کہ اس چالاک لڑکی کو میرے آنے جانے کے اوقات اور باقی سب کچھ اس گھر کی بھیدی کے ذریعے پتا چل رہا تھا۔ یہ ایڈوانس اردو کی طالبہ نشو بیگم، انہیں میں نے سبق نہ سکھایا تو قیس انور حسین نام نہیں۔ فقط چھ روز پہلے میں حور پر مشکوک ہو رہا تھا۔ وہ تو اس منگنی کے بکھیڑے نے فرصت نہ دی وگرنہ اب تک میں اپنے شکوک کو کنفرم کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی عملی قدم بھی ضروری اٹھا چکا ہوتا۔

ابھی میں کھڑا اس لسٹ کو گھور ہی رہا تھا کہ میرا موبائل بجا۔ میں نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو مولوی کاشف کالنگ لکھا نظر آیا۔ غصے میں تو

میں بھی بچتا بچاتا دادی محترمہ کے کمرے تک بالآخر پہنچ گیا۔ یہ کمرہ چونکہ گھر کے بالکل شروع کے حصے میں ہے اس لیے مجھے زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑی تھی۔ ایک تو یہ دادی جان سنتی اس قدر اونچا تھیں، میں بولتا کچھ تھا اور وہ سمجھتی کچھ تھیں۔

ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہی تھا میں گلا کھنکار کر اندر داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ ان کے کمرے میں صوفے پر سر جوڑ کر بیٹھی ایمان، سجدہ اور حیا پر میری نظر پڑی۔ ان کی دادی بیڈ پر کمبل سر تک اوڑھے غالباً سو رہی تھیں اور وہ تینوں کمرے کے دوسرے کونے میں دھرے صوفے پر براجمان تھیں۔ ان تینوں کی میری طرف پیٹھ تھی۔ قبل اس کے کہ شائستگی و تہذیب کا مظاہرہ کرتا، میں انہیں اپنی موجودگی سے آگاہ کرپاتا میرے کانوں میں باجی صاحبہ کی آواز گونجی جو بہت بدلی ہوئی اور بہت باریک سی تھی۔

''ہیلو جی مجھے قیس صاحب سے بات کرنی ہے۔''

میں جہاں تھا وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ زمین آسمان سب اپنی جگہ سے ہلتے محسوس ہو رہے تھے۔ جو میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور جو میرے کان سن رہے تھے اس پر یقین کرتے ابھی بھی تامل ہو رہا تھا۔ اگر جو کاشف کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں واقعی مشکوک لڑکیوں کی کوئی فہرست تیار کرتا بھی تو ان ''باجی جان'' کو کبھی اس میں شامل نہ کرتا۔

میری مجرم تو یہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ شکر ہوا جو جوش اور غصے میں آکر میں حوریا نشو سے کچھ کہہ نہیں بیٹھا ورنہ میرے متعلق جو کچھ انہیں نہیں معلوم وہ سب آبیل مجھے مار اور آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مصداق میں خود اپنے منہ سے انہیں بتا کر اپنے لیے ایک نئی مصیبت مول لے بیٹھتا۔

باجی کے ہاتھ میں موبائل تھا اور بچیوں کے ہاتھ میں چھوٹا سا کیسٹ پلیئر، گھر سے فون یقیناً نازو نے اٹھایا تھا۔ آواز جس مہارت سے بدلی گئی تھی وہ میں اور امی نہ پہچان پاتے تو نازو جیسی عقل سے پیدل کے پہچان لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس نے ضرور ہولڈ کرنے کو کہا تھا اور اب انہیں ہولڈ کروا کر میرے کمرے میں گئی ہوگی جہاں میں غصے میں پنکھا اے سی سب کھلا چھوڑ آیا تھا۔ میں ان تینوں بہنوں کے عین پیچھے کھڑا انہیں اپنا ہی انتظار کرتا دیکھ رہا تھا۔

''انگلی Play پر رکھو جیسے ہی وہ ہیلو کہے فوراً دبانا۔'' یہ ہدایت باجی صاحبہ نے کی تھی۔

''آگیا، آگیا۔'' وہ یقیناً نازو کے واپس فون کے قریب آنے کی آواز کو میرے قدموں کی آواز سمجھ کر جوش سے بولی۔ میں بے آواز چلتا ہوا آہستہ آہستہ ان تینوں کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ نازو ابھی ان سے کچھ کہہ بھی نہیں پائی ہوگی کہ میں ہیلو بولا۔

سجدہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جلدی سے Play کو دبا دیا مگر موبائل کان سے لگائے باجی اتنی عقل رکھتی تھیں کہ اپنے سامنے سے ابھرتی آواز اور موبائل سے آتی آواز میں فرق کرسکیں۔ اپنی بہنوں کی طرف گھمائی گردن انہوں نے سیدھی کی تو نظریں میرے جوتوں سے ٹکرائیں۔ اب دھک سے رہ جانے کی باری ان کی تھی۔ سر اٹھا کر دیکھنے پر انہیں میں نظر آیا۔ میں جس کی اس وقت اپنے گھر موجودگی کی یقیناً انہیں توقع تھی نہ امید۔ گھبراہٹ بوکھلاہٹ، پریشانی، شرمندگی، ندامت، اس جیسے تمام تاثرات اس وقت ان کے چہرے پر ابھرے، بھولی بچیاں بھی مجھے دیکھ چکی تھیں۔

گڑبڑا کر سجدہ نے جلدی سے منے کی شان میں بجتے کسی گیت کا گلا گھونٹا۔

اس وقت میں تھا ہی چنانچہ لٹھ مار انداز میں ''ہیلو'' کہا۔

''آپ کے بیٹے نے پاپا کہا۔'' کچھ اٹھلاتے ہوئے شوخ انداز میں وہ بولا۔

''کیا بکواس ہے یہ؟'' ٹی وی پر چلنے والے اشتہارات سے جتنی خار میں کھانے لگا تھا، ایسے میں یہ جملہ مجھے جلا کر راکھ کر گیا۔

''یار! ناراض کیوں ہوتا ہے۔ میں تو تیرا موڈ ٹھیک کرنے کو مذاق کر رہا تھا۔ دراصل تو اس وقت میں نے بڑے ضروری کام سے تجھے فون کیا ہے۔''

میں نے جواب میں صرف ''ہوں'' کہنے پر اکتفا کیا تو وہ پر جوش سے انداز میں جلدی سے بولا۔

''قیس! میرے یار تو جلدی سے میری طرف چلا آ۔ تیری مجرم کو تیرے سامنے لانے کی ایک بڑی زبردست ترکیب میرے ذہن میں ابھی ابھی آئی ہے۔''

''تمہاری ترکیبیں اور تمہاری لانگ ٹرم پلاننگز سب بوگس ہیں، میں ان کے بغیر ہی اصلی مجرم تک پہنچ چکا ہوں۔ تم بیٹھ کر ترکیبیں سوچو میں اس بے ہودہ لڑکی کی بے ہودگیوں کا انجام کرنے جا رہا ہوں۔'' اس کا جواب سنے بغیر میں نے فون بند کر دیا۔ میرا انتقامی جذبہ اپنے عروج پر تھا۔

''قیس! تم سے صبح سے کہہ رہی ہوں بیگ صاحب کی امی کو دیکھ آؤ۔ کتنی مرتبہ فون کر کے تمہارا پوچھ چکی ہیں۔ پتا نہیں کس اناڑی ڈاکٹر سے داڑھ نکلوا کر آئی ہیں، تکلیف ہے کہ بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔'' امی میرے کمرے میں آ کر ذرا خفگی سے اور کچھ حکمیہ انداز میں بولیں۔

''اناڑی ڈاکٹر نے داڑھ صحیح نہیں نکالی اور میں تو جیسے بہت ماہر اور قابل ہوں۔ پیسے بچ جائیں کسی طرح۔ پڑوس میں چند بے وقوف رہتے ہیں۔ ان بے وقوفوں میں سے ایک آ کر مفت دیکھ بھی لے گا، دوا بھی بتا دے گا بلکہ اگر اس کے گھر پر پڑی ہوئی تو مفت دے بھی دے گا۔'' میں نے چڑ کر امی کو جواب دیا۔

''بری بات ہے بیٹا! دوسروں کے کام آؤ تو۔''

''جی مجھے آپ کا سکھایا سبق یاد ہے۔ ہم اس دنیا میں دوسروں کی خدمت کے لیے آئے ہیں اور دوسرے ہم سے خدمت لینے کے لیے۔''

ناراضی سے بولتا میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھ نیم حکیم اور اناڑی کے حوالے اگر وہ اپنی بتیسی کرنا ہی چاہ رہی ہیں تو میرا کیا جاتا ہے۔

اپنے گیٹ سے نکل کر میں سیدھا برابر والے گیٹ میں گھسا۔ اس مچھلی بازار کا گیٹ ہمہ وقت چوپٹ کھلا رہتا ہے۔ دن دہاڑے چوریاں ہو رہی ہیں، ڈاکے پڑ رہے ہیں، شہر کے ان سب حالات سے اس جنجال پورے کے مکینوں کو کوئی سروکار نہ تھا۔

جتنے گھر میں افراد ہیں اتنے ہی افراد ہر وقت مہمانوں کی صورت میں اس گھر میں موجود رہتے تھے۔ اس رش اور بھگدڑ میں آپ کون ہیں، کس لیے آئے ہیں اور کس سے ملنے آئے ہیں یہ جاننے کی کسی کے پاس فرصت نہیں ہوتی۔ یہاں آنے والے اپنی مدد آپ کے تحت اپنی مطلوبہ شخصیات کو باقاعدہ ڈھونڈ کر پھر ان سے شرف ملاقات حاصل کیا کرتے ہیں۔

''چلنے دیتیں، اتنا اچھا گانا تھا۔'' میں بے فکری اور بے نیازی سے بولتا صوفے کے سامنے رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میری خوش قسمتی کہ میں اپنی مجرمہ کو رنگے ہاتھوں پکڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جو میں نے سوچا نہیں تھا وہ ہو چکا تھا۔ مجھے ستانے، پریشان کرنے والے اور میرا مذاق اڑانے والی یہ گستاخ اور بدتمیز باجی اپنی اصلیت اس طرح ظاہر ہو جانے پر شرم سے پانی پانی ہو رہی تھیں۔

''آ، آپ۔'' بمشکل باجی کے منہ سے آپ کا لفظ بہت اٹکتے ہوئے نکلا۔

''جی میں۔ میں نے سوچا مجھ سے بات کرنے کے لیے آپ کو اس قدر تردّد کرنا پڑتا ہے میں خود جا کر بہ نفسِ نفیس مل لیتا ہوں۔ بائی دا وے میں قیس ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر میں قیس ہوں تو آپ لیلیٰ ہیں اور یہ بھی کہ ابھی آپ ارتقائی مراحل طے کر رہی ہیں اور ابھی آپ کے خاتون بننے میں بیس پچیس سال کا عرصہ درکار ہے۔''

جسے یہ گمان اور یہ خوش فہمی تھی کہ وہ کبھی پکڑی نہیں جا سکتی اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا اور شرمندہ ہوتے دیکھنا ایک بڑا ہی دلفریب اور خوشگوار منظر تھا۔

''سجدہ! حیا! یہ تمہارے فرقان انکل کا موبائل نہیں مل رہا۔ بے چارے جانے کے لیے کھڑے ہیں۔ سارا ڈرائنگ روم اور لاؤنج چھان مارا۔ ذرا تم دونوں میرے ساتھ ڈھونڈواؤ۔'' باہر سے ہی بولتی آنٹی سلمیٰ اچانک ہی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''ارے قیس تم؟'' بچیوں سے مخاطب ہوتے ان کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں نے اٹھ کر انہیں باادب سلام عرض کیا اور اپنی آمد کی وجہ یعنی دادی جان کی داڑھ کے معائنے کا ذکر کیا۔ اس دوران کسی فرقان انکل کا موبائل باجی جان کے ہاتھوں سے چھوٹی بہنوں کی طرف منتقل ہو چکا تھا۔ اپنی والدہ کی نگاہوں سے بچتے دونوں چھوٹی بہنیں کیسٹ پلیئر اور کسی بے چارے فرقان انکل کا موبائل لیے کمرے سے کھسک لی تھیں۔ رہ گئیں ایمان باجی جان، تو وہ التجا کرتی بہت عاجزانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں ان کی والدہ محترمہ اور دادی جان کے سامنے ان کا پول نہ کھول دوں، میں نے آنٹی سلمیٰ سے خیر و عافیت پر مشتمل مختصر گفتگو کی، انہوں نے دادی جان کو سوتے سے جگایا تو ان کی داڑھ کا تفصیلی معائنہ کیا اور پھر بغیر افشائے راز کیے میں دادی جان اور آنٹی سلمیٰ سے رخصت لیتا اپنے گھر لوٹ آیا۔

اپنی دشمن کو میں نے معاف نہیں کیا تھا۔ اس سے بدلہ تو مجھے ہر حال میں لینا تھا مگر یہ نانیوں، دادیوں اور امیوں سے شکایتیں لگانے والا کام تو نرا واہیات اور زنانہ خصوصیات کا حامل تھا۔ اب یہی دیکھ لیں۔ اس وقت میری دشمن، کہیں میں اس کے یا اپنے گھر والوں میں سے کسی کو کچھ بتا نہ دوں، کے خوف کا شکار اپنے گھر پر دہشت سے یقیناً اندر ہی اندر دہل رہی تھی۔ عین اس وقت میں ایک منصوبے کو حتمی شکل دے لینے کے بعد پورچ سے اپنی گاڑی باہر نکال رہا تھا۔

''تمہارے منہ میں گھی شکر، ہائے کاش ایسا ہو جائے، سچی یہ پڑھائی وڑھائی ہم سے تو نہیں ہوتی۔''

باجی جان کے حسرتوں میں ڈوبے ان جملوں کو دہراتا میں گاڑی چلا رہا تھا۔ میرا رخ روڈ پار کر کے اگلے بلاک میں واقع حبیبہ خالہ کے گھر کی طرف تھا۔

☆

''علم روشنی ہے، جہالت تاریکی ہے۔''

''علم وہ دولت ہے جسے کوئی چرا نہیں سکتا۔''

''دولت نہیں، علم حاصل کرو۔''

''تم مجھے پڑھی لکھی مائیں دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔''

''ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔''

''مرد کی تعلیم صرف اسی کو نفع دیتی ہے جبکہ عورت کی تعلیم ایک پوری نسل کو سنوار دیتی ہے۔''

''عورت کی تعلیم کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔''

''آبادی کے پچاس فیصد حصے کو تعلیم سے محروم رکھ کر آپ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے۔''

چھٹی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک علم کی اہمیت، علم ہی کامیابی کی کنجی ہے، علم سب کے لیے، علم کا حصول ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے وغیرہ وغیرہ جیسے مضامین کے اردو کے پیپرز سے عین پہلے جو شاندار رٹے لگائے تھے شکر تھا کہ وہ حافظے میں محفوظ تھے اور بروقت اور صحیح موقع پر کام آ گئے تھے۔ جنید ظہیر کرسی پر بیٹھے تھے اور میں ان کے کمرے میں ان کے بالکل سامنے کھڑا ایک ماہر مقرر کی طرح جوشیلے انداز میں بول رہا تھا۔ عورتوں کی تعلیم، ان کے حقوق، ان کے مسائل، ان کی آزادی، انہیں مردوں کے ساتھ برابری کا درجہ دینا وغیرہ پر جو میں نے جوشیلے جملے کہے تھے اگر وہ آنٹی عاصمہ جہانگیر کے قبیل کی کوئی حقوقِ نسواں کی علمبردار آنٹی سن لیتیں تو مجھے شاباش کہہ کر میری پیٹھ ضرور تھپتھپاتیں۔ یہاں مجھے داد دینے کو فقط جنید ظہیر موجود تھے۔

وہ خاموشی سے میری بات سن رہے تھے اور میں شہنشاہِ جذبات بنا جذباتی اور قدرے رُندھی آواز میں انہیں بتا رہا تھا، ان کے جیسا علم کا متوالا، علم کا پیاسا، علم کا سودائی، علم کا شیدائی جو علم کا اجالا گھر گھر اپنوں اور غیروں کی تخصیص کے بغیر پہنچانے کو اپنا نصب العین بنا چکا تھا جو گاؤں گاؤں، بستی بستی، قریہ قریہ علم کا نور بکھیر دینے کا عزم کر چکا تھا خود اس کی اپنی ہونے والی نصف بہتر اس کی جانب سے شادی کی جلدی مچائے جانے کے سبب اپنے امتحان نہ دے پائے، شادی کے بکھیڑوں میں پڑ کر بعد میں اپنا حصولِ علم کا شوق پورا نہ کر پائے۔ چراغ تلے اندھیرا اس کو نہیں تو پھر کس کو کہتے ہیں۔

ایک لڑکی جو اردو ادب میں ایم اے، ایم فل بلکہ پی ایچ ڈی کرنے کے خواب دیکھا کرتی ہے وہ دورانِ تعلیم حصولِ علم کا سلسلہ منقطع کر کے شادی کی زنجیروں میں جکڑ کر گھر بٹھا دی جائے؟ جو اس خوف اور خدشے کے پیشِ نظر کچھ کہہ نہیں پا رہی کہ اس کی جانب سے شادی آگے بڑھا دینے کی بات کہیں اس کے ہونے والے شوہر صاحب اور سسرالیوں کو ناگوار نہ گزر جائے لیکن کیا اس کی خاموش فریاد کو علم کا یہ سچا عاشق سمجھ نہیں سکتا۔ ''عاشق، سودائی اور شیدائی'' میں خاص زور ڈال کر بول رہا تھا۔ ''کیا اس بے چاری کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ اسے حصولِ علم سے جو اس کا پہلا اور سچا عشق ہے روک کر اس نگر بھیج دیا جائے جہاں اس سے اردو ادب پر تو کیا اردو زبان ہی میں بات کرنے والے خال خال نصیب ہوا کریں گے۔'' رومال سے بلاوجہ اپنی آنکھیں رگڑتے ایک گھنٹے اور تیرہ منٹ پر مشتمل اپنی تقریر دل پذیر کا جذباتی انداز میں میں نے اختتام کیا

اور بغور پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا تو وہ سر پا ندامت و پشیمانی سر جھکا کر بیٹھے نظر آئے۔

''تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ انجانے میں میں ایک علم کی تلاش و جستجو میں سرگرداں لڑکی کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کرنے چلا تھا۔ صرف اپنا بھلا سوچ رہا تھا کہ مجھے امریکہ میں اکیلے نہیں رہنا پڑے گا۔ اس کا نہیں سوچا جسے حصولِ علم کی اتنی لگن ہے۔ ان سے کہنا قیس! وہ ہرگز فکر نہ کریں جب تک وہ ایم اے نہیں کر لیتیں کوئی شادی کا نام بھی نہیں لے گا۔ نہیں بلکہ تم رہنے دو۔ میں خود انہیں جا کر یہ اعتماد دلا کر آؤں گا۔ پہلے بے خبر تھا مگر اب جبکہ سب جان چکا ہوں تو تم دیکھنا قیس! علم سے اتنی عقیدت اور محبت رکھنے والی اس لڑکی کو میں اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی سطح تک خود لے کر جاؤں گا۔''

پروفیسر صاحب نے شرمندہ لہجے میں بات کا آغاز کرنے کے بعد جوش، عزم اور غیر متزلزل ارادے پر مشتمل لفظوں کے ساتھ اپنی بات ختم کی جبکہ میں ''علم، عقیدت'' اور ''محبت'' کے لفظوں پر بمشکل لب بھینچ کر اپنی مسکراہٹ چھپا رہا تھا۔ میری چشمِ تصور میں کسی کی لمبی لمبی جمائیاں اور نیند سے بند ہوتی آنکھیں آ رہی تھیں۔

☆

''آپ بے فکر ہو کر اپنی پڑھائی جاری رکھیں۔ آپ کے ایم اے کر لینے سے پہلے ہماری شادی کی بات کسی نے کی تو اسے میں خود دیکھ لوں گا۔ میں ڈاکٹریٹ کر آؤں، آپ یہاں ایم اے کر لیں شادی اس کے بعد بھی تو ہو سکتی ہے۔ اتنی افراتفری مچانے کی آخر تک ہی کیا ہے؟''

یہ جنید ظہیر تھے جو امریکہ روانگی سے قبل ایئر پورٹ پر اپنی منگیتر سے بڑے مخلصانہ و دوستانہ انداز میں یہ وعدے کر رہے تھے۔ انہیں رخصت کرنے سب کے ساتھ میں ایئر پورٹ قصداً ہی چلا آیا تھا، سُن گُن لینے والے انداز میں وہیں پر ہی موجود تھا اور ان سچے پکے وعدوں پر جیسی بے چارگی و بے بسی کے تاثرات میری دشمن کے چہرے پر پھیلے تھے انہیں دیکھ کر کلیجے میں ٹھنڈ سی پڑ گئی تھی۔

سامنے اس سے رخصت لیتا بندہ اس کے علم کے متوالے ہونے کے گُن گا رہا تھا، اسے آج کل کی فیشن زدہ و دیگر خرافات میں مبتلا لڑکیوں سے مختلف بتا رہا تھا، علم و ادب سے سچا عشق رکھنے پر اسے تعریفیں کر کر کے ساتویں آسمان پر پہنچانے کی کوششیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ کہتی بھی تو آخر کیا؟ صرف جھوٹی برائیاں ہی نہیں جھوٹی تعریفیں بھی بندے کا بیڑا غرق کر سکتی ہیں۔

کچھ بے بسی، کچھ بے چارگی، کچھ جھنجھلاہٹ اور کچھ ہونے والے اس عظیم احسان کے پیچھے کس کا نادیدہ ہاتھ کارفرما تھا وہ تخریبی ذہانت رکھنے والی لڑکی ظاہری بات ہے یہ بات جانتی تھی مگر بے بسی سی بے بسی تھی۔ وہ میرے خلاف کچھ کہنے کی کیا منہ کھولنے کی بھی ہمت نہ کر سکتی تھی۔

☆

اور پھر کچھ یوں ہوا عزیزو کہ 1957ء کی جنگِ آزادی لڑنے کے بعد بھی میرے اور آپ کے آباؤ اجداد جو کمپنی بہادر یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے ملک سے مار بھگانے میں ناکام ہو گئے تھے۔ میں ان کے مقابلے میں خوش قسمت ٹھہرا کہ بغیر لڑے کمپنی بہادر کی سی خصوصیات رکھنے والے ایک گھرانے کو اپنے گھر سے بھگانے میں کامیاب ہو کر ایک نئی تاریخ رقم کر گیا۔ میں تو صرف اپنی دشمن کو اس کی گستاخیوں کی سزا دینا چاہتا تھا

مگر اپنی دشمن کو دعائیں دینے کو جی چاہتا ہے جس نے میرا مذاق مسلسل اڑا کر اور پھر رنگے ہاتھوں پکڑے جا کر میرا دوسرا مسئلہ یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی سے چھٹکارا و نجات با آسانی حل کروا دیا۔ ان دنوں حالات کچھ یوں ہیں کہ امی کو پڑوسیوں کی مفت سلائی، کڑھائی سکھانے اور پڑھانے سے فرصت مل گئی ہے اور ان کی پوری توجہ اپنے اکلوتے بیٹے پر مرکوز ہو گئی ہے۔ نانو اور دادی اماں کو اپنا گھر اور گھر کا ساز و سامان مفت خورے پڑوسیوں کو دینے سے نجات حاصل ہو گئی ہے۔ ابو اور مجھے وقت بے وقت کسی بچی کے ذریعے بلوا کر مفت علاج معالجے کے مزے لیے جانے بھی تقریباً تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔

دادی اماں، نانو اور امی ان دنوں اکثر اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتی نظر آتی ہیں کہ پڑوس سے ''بچیوں'' نے آنا جانا کیوں بند کر دیا۔ ایمان تو چلو ''پڑھائی'' میں مصروف ہے، چھوٹی بچیوں، ان کی دادی جان اور ''نیوانٹری'' ان کی والدہ صاحبہ کو کیا ہوا۔

میں کہ ٹھہرا نیک خصلت، شریف و باکردار نوجوان، یہ سوچ کر لبوں پر قفل لگائے رکھتا ہوں کہ آج میں کسی کا پردہ رکھوں گا تو کل اللہ میرا پردہ رکھے گا۔

چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ وہ تینوں بہنیں اب ہمارے گھر میں تو کیا گرد و نواح میں بھی شاذ و نادر ہی دکھا کرتی ہیں۔ ویسے پڑوسیوں کی زیادہ نہیں مگر اڑتی اڑتی خبر تو میں رکھتا ہوں۔ کہاں شادی کی تیاریاں تھی اور سسرالیوں و میاں جی کا دل جیتنے کے لیے میری امی سے نئی نئی ڈشز پکانی سیکھی جا رہی تھی۔ اور کہاں اب سر پر امتحانات کی تلوار ہے۔ بی اے کے بعد ایم اے کا عذاب ہے، دن کے چوبیس گھنٹے کتابیں ہیں، نوٹس ہیں، رٹے ہیں، سریلے گیتوں کے بجائے مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب خطبۂ الہ آباد، اردو ادب میں قصے و داستان گوئی کی تاریخ، دلی و لکھنؤ کے شعراء کا تقابلی جائزہ وغیرہ نیند بھگا بھگا کر رٹے جاتے ہیں۔

میں ان دل خوش کن مناظر کو دیکھ تو نہیں پاتا پر دیکھے بغیر بھی کتابوں سر دیئے، جمائیاں روک روک کر نیند بھگاتی باجی جان کا تصور میں با آسانی کر سکتا ہوں۔ میں نے ایک لڑکی سے انتقام لیا، آپ کو شاید میری یہ حرکت مردانہ وقار کے خلاف لگی ہو، لیکن ٹھہریں، یہ تو سوچیں کہ میرے اس انتقام میں بھی دراصل میری دشمن ہی کا مفاد پوشیدہ ہے۔ شعر و شاعری کا شوق رکھنے والی ایک اچھی خاصی ذہین لڑکی اپنی ذہانتوں کا تخریبی انداز میں استعمال کر رہی تھی۔ پڑھانے پر بضد میری امی جان سے قصداً وہ بے وقوفانہ باتیں اسی غرض سے کی گئی تھیں کہ وہ آئندہ انہیں پڑھانے سے کان پکڑ کر توبہ کر لیں۔ استاد سے استادی۔ میری بھولی ماں کے ساتھ مکاری و عیاری۔ ایک ذہین لڑکی کی تخریبی ذہانت کو میں نے تعمیر کی طرف لگا دیا، جنید ظہیر کی آنے والی نسل کے لیے ایک پڑھی لکھی ماں کا بندوبست کروا دیا، ویسے پڑھی لکھی کے لفظ سے یاد آیا ہفتہ دس دن پہلے کی بات ہے میں کالج جانے کے لیے گاڑی گیٹ سے نکال رہا تھا جب اپنی کالج وین کا انتظار کرتی ''باجی جان'' سے میرا سامنا ہوا تھا۔ وین کا انتظار بھی ہو رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑی کسی کتاب میں سے رٹے بھی لگائے جا رہے تھے۔ آنکھیں ویسی ہی سرخ اور نیند سے بھری نظر آ رہی تھیں، مجھ پر نظر پڑی تو محترمہ نے بہت غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ تب ان ہی کے پسندیدہ شغل یعنی اشتہارات پر ہاتھ صاف کرنے پر عمل کرتے میں ان کی طرف دیکھے بغیر لاپروائی و بے نیازی سے اس آواز میں جو ان تک پہنچ جائے، گنگنایا تھا۔

''ہر بندہ پڑھانا ہے۔

سنگ اپنا فرض نبھانا ہے۔

ایک ہی مقصد، ایک ہی نعرہ۔

پڑھا لکھا بیگ ہاؤس ہمارا۔''

ہاں ایک ضروری بات تو میں بتانا ہی بھول گیا وہ جہاں سے میں نے اپنے قصے کا آغاز کیا تھا یعنی دادی اماں اور نانو کے مجھے ننھے بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے انداز اور شرمندگی، خجالت و جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتے بے جا اور تکلیف دہ ناز نخرے تو جناب اس تکلیف دہ حد تک بڑھے غیر معقول و نامناسب لاڈوں سے مجھے اسی روز نجات حاصل ہوگئی تھی جس روز میں نے اپنی مجرمہ کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے بتایا تھا ان کے فون کرنے پر نازو نے انہیں ہولڈ کروایا تھا اور پھر کسی کے آنے کو میرا آنا سمجھ کر باجی اور ان کی بہنوں نے جلدی سے منے کی شان میں کوئی گستاخانہ گیت چلایا تھا تو ہوا کچھ یوں تھا کہ وہ آنے والی شخصیت دادی اماں کی تھی جنہیں میری عدم موجودگی کے سبب نازو بلا لائی تھی کہ میرے لیے آنے والا فون سن لیں اور نام و پیغام نوٹ کر لیں۔

میں نے اس گیت پر ان لمحات میں کچھ خاص توجہ نہ دی تھی۔ یقیناً وہ اتنا ہی بے ہودہ و گھٹیا ہوگا جتنے اس سے قبل کے گیت ہوا کرتے تھے مگر اس رات میں نے دادی اماں کو نانو سے اس بات پر جھگڑتے سن لیا تھا کہ ''منا'' اب بڑا ہو گیا ہے۔ انہیں آئے گئے کے سامنے اس کی عزت کا پاس رکھنا چاہیے۔ نجانے کون لڑکی ہے جو ان کے منے کا اتنی بدتمیزی و گستاخی سے مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ اس انجانی لڑکی کو غائبانہ بے تحاشا صلواتیں سنا رہی تھیں جو ان کے لاڈلے پوتے کا اس طرح مذاق اڑا رہی تھیں۔

اس روز کے بعد سے میری دنیا ہی بدل گئی۔ لنچ باکس اور پانی کی بوتلوں سے مجھے نجات مل گئی۔ دادی اماں اور نانو کے پیار میں معقولیت اور سمجھاؤ آ گیا۔ اپنی دشمن سے چاہے مجھے جتنی بھی پرخاش ہو پر اس لڑکی کو یہ کریڈٹ میں بہر حال دوں گا کہ دادی اماں و نانو کے آگے میری التجائیں، صدائیں اور فریادیں وہ کام نہ کر پائیں جو اس لڑکی کے مذاق اڑانے نے کر ڈالا۔ خیر اس کے اس احسان کا بدلہ میں بھی اسے بے پڑھی لکھی لڑکی کو پڑھا لکھا بنانے میں عملی تعاون و خدمات انجام دے کر اتار ہی چکا ہوں۔

جنید ظہیر کے ڈاکٹریٹ کر کے پاکستان لوٹ آنے تک باجی صاحبہ ایم اے پاس ہو جائیں گی یا بی اے فیل رہیں گی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ وہ وقت آنے دیں پھر میں آپ کو اس کا بھی تفصیلی احوال ضرور سناؤں گا۔ تب تک کے لیے مجھے اجازت دیں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

ہی اندر اس نام پر وہ جس طرح پیچ و تاب کھاتا تھا اتنا ہی اسے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا پٹپٹا کر دیکھا کرتے تھے۔ ویسے سچ بات ہے ہماری اس سے دشمنی اور خار سے وہ لاعلم تھا۔

ہم اس سے کس قدر چڑتے بلکہ خار کھاتے ہیں یہ اس کے فرشتوں کو بھی پتا نہ ہوگا۔ میں اور بلال جڑواں بھائی بہن ہیں۔ ہمیشہ سے ایک ہی اسکول، ایک ہی کلاس اور مشترکہ دوست۔ شرارتیں اور ہنگامے کیا ہماری تو لڑائیاں بھی مشترکہ ہوا کرتی تھیں۔ اگر کسی سے میری لڑائی ہوگئی ہے تو بلال کی اس سے خود بخود لڑائی ہو جائے گی۔ جویریہ جواد اور بلال جواد ہم ایک ٹیم تھے۔ ہمارا ایکا، ہمارا اتحاد مثالی تھا مگر ہمارے اس اتحاد اس یگانگت کے سب سے بڑے دشمن ہمارے اپنے ہی گھر میں موجود تھے یعنی ہمارے بھائی میاں۔ ہمارے آٹھ سال بڑے بھائی جنہیں اپنے ان معصوم چھوٹے بھائی بہن سے دنیا زمانے کی تمام شکایتیں تھیں۔

میں بلال اور اس کے دوستوں کے ساتھ رہ رہ کر آوارہ لڑکوں والی زبان بولتی ہوں، جو طور طریقے، سبھاؤ، نزاکت میری عمر کی لڑکیوں میں ہونی چاہیے وہ مجھ میں مفقود ہے، بلال میرے اور میری سہیلیوں کے درمیان گھس گھس کر بیٹھتا ہے لڑکیوں میں بیٹھ بیٹھ کر اس میں زنانہ پن آ جائے گا۔ ہر وقت کا ہنگامہ اور دھما چوکڑی مچائے رکھنے کے سبب ہم دونوں اپنی پڑھائی سے لاپرواہ رہتے ہیں جبکہ یہ ہمارا ایف ایس سی پری انجینئرنگ کا دوسرا سال ہے، ہمارے کیریئر کا اہم ترین سال۔ مگر ہم دونوں زندگی کے کسی بھی معاملے میں سیریس ہیں ہی نہیں۔ پتا نہیں اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ہم دونوں کو کتنا سیریس دیکھنا چاہتے تھے۔ شاید اپنے فیورٹ پیلو کی طرح سیریس جو کئی کئی مہینوں بعد مسکرایا کرتا تھا۔ عجیب افلاطونی، پروفیسرانہ پن بلکہ ہونق پن ہر وقت اس کے چہرے پر چھایا رہتا تھا۔ خود کو نیوٹن یا آئن اسٹائن سمجھتا وہ ہر وقت کائنات کے سربستہ رازوں کی دریافت میں مگن رہا کرتا تھا۔

بچپن میں ہم محلے کے سارے بچے بارش کو انجوائے کرتے اپنی اپنی چھتوں اور لانز میں نہا رہے ہوتے اور وہ اندر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا آسمان کو ہونق پن سے دیکھتا بارش کے ہونے کی وجوہات تلاش کر رہا ہوتا تھا۔ بارش میں تو وہ مامے بوائے کبھی بچپن میں بھی نہایا ہی نہیں تھا۔ ممی منع جو کرتی تھیں کہ پیلو کو ٹھنڈ بیٹھ جائے گی، زکام ہو جائے گا۔ بچپن میں ''ممی منع کرتی ہیں۔'' ہر بات پر اس کا تکیہ کلام ہوتا تھا۔ بڑے ہونے پر ''ممی منع کرتی ہیں'' تو ختم ہو گیا تھا مگر افلاطونی ہونق پن اپنی جگہ برقرار تھا۔

دیکھیں اس سے مجھے کوئی پرخاش نہ ہوتی، مجھے اس کے ہونق پن سے بھی کچھ لینا دینا نہ ہوتا اگر ممی اور بھائی میاں مجھے اور بلال کو چوبیس گھنٹے اس جیسا بننے کی نصیحتیں نہ کیا کرتے۔ ایک تو وہ لگتا برا تھا اوپر سے حرکتیں بھی ایسی کرتا کہ بندے کا خون کھول جائے۔ میں اور بلال اچھے خاصے فزکس، کیمسٹری اور میتھس کی ٹیوشن کے لیے کوچنگ سینٹر جا رہے تھے کہ بھائی میاں کو نجانے اچانک ہی کوچنگ سینٹرز کے ماحول اور وہاں کے تعلیمی طریقۂ کار سے شکایتیں پیدا ہو گئیں۔

''بھائی میاں! فرسٹ ایئر میں بھی تو ہم لوگ کوچنگ سینٹر ہی گئے تھے۔'' بلال بھائی میاں کے آگے منمنایا تھا۔

ہم دونوں بھائی بہن پر امی، ابا کا اتنا رعب نہ تھا جتنا بھائی میاں کا۔ ہم دونوں کو وہ شیر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ پیٹھ پیچھے ہم انہیں چنگیز خان کہا کرتے تھے۔

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

روحیل رضوان عرف پیلو سے ہم بھائی بہن کی دشمنی قدیم تھی۔ ایک شخص کا ہر وقت نام لے لے کر اور ہمہ وقت اس کی مثالیں دے دے کر آپ کو چڑایا جائے تو بندہ دشمنی نہ پالے تو کیا دوستی پالے؟ اور مثالیں بھی کس کی اس پیلو کی؟ پورا کا پورا اماماز بوائے۔

وہ تو لگتا تھا نہاتا، کھاتا اور سوتا بھی اپنی ممی سے پوچھ کر تھا۔ کم از کم مجھے اور بلال کو تو اس عجوبے جیسا بننے کا ہرگز کوئی شوق نہ تھا مگر کیا کیجیے کہ ہماری امی اور بھائی میاں کا وہ ہمیشہ سے فیورٹ رہا ہے۔ پتا نہیں ان دونوں کو اس منحنی سے اس قدر عشق کیوں تھا۔ بچپن سے اس کی تعریفیں اور اس جیسا بننے کی نصیحتیں سنتے سنتے ہم بھائی بہن کے کان پک چکے ہیں۔ یہ ہمارا دائیں طرف والا برابر کا مکان پیلو صاحب کا تھا سو ان کے ہر کارنامے کی اطلاع ان کی شوباز ممی کی زبانی ہماری والدہ ماجدہ تک بروقت اور سب سے پہلے پہنچا کرتی تھی۔

''پیلو کلاس میں فرسٹ آیا ہے، اس نے اسکول میں ٹاپ کیا ہے۔'' چلو جی شامت ہماری آ گئی۔ اب اگر سب بچے فرسٹ آنے لگیں گے 13th, 12th, 11th, 10th رینک کن بچوں کا آئے گا؟ اور کلاس میں پہلی پوزیشن لے لینا کیا ذہانت کی علامت ہوتا ہے؟ ہر وقت کتابوں میں سر دے کر اور رٹے مار مار کر تو کوئی بھی فرسٹ آ سکتا ہے۔ وہ نہ ہمارا کلاس فیلو کبھی رہا تھا اور نہ ہمارا اسکول بھی کبھی ایک رہا تھا۔ وہ ہم سے دو کلاسز سینئر تھا مگر اس کی مثالیں دیئے جانا اور اس جیسا بننے کی نصیحتیں کیے جانا جیسے امی اور بھائی میاں کا پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا۔ ان سب باتوں سے ہمیں کوئی پرابلم نہ ہوتی اگر ہماری امی اور بڑے بھائی صاحب اس گھونچو کی مثالیں دے دے کر ہمیں چڑایا نہ کرتے۔ جب سے انجینئرنگ یونیورسٹی میں پہنچا تھا اس کی اماں نے اسے پیلو کے بجائے روحیل کہنا شروع کر دیا تھا مگر اس کا کیا کیجیے کہ قرب وجوار میں وہ پیلو کے نام سے اس قدر شہرت پا چکا تھا کہ اب اس کے اپنے گھر والوں کے سوا باہر والے سب اس کو پیلو ہی کے نام سے جانا کرتے تھے۔ خاص کر اس کے رشتے دار اور پڑوسی۔ پچھلے دنوں تو مزے کی سچویشن ہوئی تھی جب ان کے گھر کی تزئین و آرائش کا کچھ کام ہو رہا تھا۔ ٹھیکیدار ان کا پرانا جاننے والا تھا اور اس سے سن کر تمام مزدور اسے بڑے احترام سے پیلو صاحب کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ ایک بار تو چھت پہ واک کرتے میری اور بلال کی ہنسی چھوٹ گئی جب ان کے گیٹ پر کارپنٹر نے بیل بجا کر اس کی چھوٹی بہن سے کہا۔

''پیلو صاحب ہیں؟''

اس نام پہ پیلو کی شکل دیکھنے والی تھی۔ صاف نظر آتا تھا اپنی اماں کے بچپن کے رکھے اس مشہور زمانہ اور زبانِ زدِ عام نام سے وہ کس قدر چڑتا ہے۔ تب سے تو ہم بھائی بہن نے جیسے ضد باندھ لی تھی۔ اس سے جب ملاقات ہوتی اسے پیلو ہی کے نام سے مخاطب کرتے۔

ہماری امی کو حفظ مراتب کا بڑا خیال رہتا ہے۔ سو اس کی دو سال کی بڑائی کے احترام کے پیشِ نظر ہم اسے پیلو بھائی کہا کرتے تھے اور اندر

''ہاں بہت اچھی پرسنٹیج لائے ہو فرسٹ ایئر میں جو فخریہ اس کا ذکر ہو رہا ہے۔'' %B64 گریڈ کوئی برا تو نہیں ہوتا، اچھا خاصا ہی ہوتا ہے جبکہ ہم دونوں ہی کا آگے انجینئرنگ کی طرف جانے کا کوئی ارادہ بھی نہ تھا تو پھر اس پرسنٹیج میں کیا برائی تھی؟ ہاں اس میں برائی ہی برائی تھی اگر اس کا موازنہ %88 مارکس +A گریڈ کے ساتھ کیا جاتا۔ جب پیلو انٹر میں %88 لا سکتا ہے تو ہم دونوں کیوں نہیں؟

ایک تو بڑے پن کا ایسا خوفناک اور خونخوار رعب قائم کر رکھا تھا بھائی میاں نے ورنہ کہہ تو میں بھی سکتی تھی کہ۔

''بھائی میاں! %88 تو آپ کے بھی نہیں آئے تھے۔'' ہاں +A گریڈ ضرور تھا مگر %88 تو نہیں۔ پھر ہم معصوم چھوٹے بھائی بہن ہی پر ستم کیوں؟

''یہ کوچنگ سینٹرز ڈیٹنگ پوائنٹس بن کر رہ گئے ہیں، کوئی پڑھائی وڑھائی نہیں ہوتی اب ان میں۔''

ہم دونوں کو نظر انداز کر کے وہ امی سے مخاطب ہوئے جو ٹی وی پر کوئی کوکنگ شو دیکھ رہی تھیں۔ زلفیں بکھرائے شیف صاحبہ کوئی عجوبہ سے ڈش پکا رہی تھیں۔ ساتھ کوئی کالر بھی تھیں۔

''اچھا میری امی سے بھی بات کر لیں۔''

''آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔''

''میری پھوپھی کو (ویو) Wave کر دیں۔''

''ہاں انہوں نے Wave کر دیا تو پھوپھی اماں کی زندگی سنور جائے گی۔''

بلال نے بھائی میاں پر آتا غصہ کوکنگ شو کی شیف اور کالر پر نکالا۔ بھائی میاں کو سنجیدہ موڈ میں دیکھ کر امی نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر توجہ ان پر مبذول کی۔

''روحیل سے ملاقات ہو گئی تو میں اور سنجیدہ ہوا ورنہ تو میں خود بہت دنوں سے یہی دیکھ رہا ہوں کہ دونوں صبح کالج گئے۔ واپس آ کر ہنگامہ، اچھل کود، شام میں کوچنگ سینٹر، وہاں سے آ کے بستے بند رات میں ٹی وی، کمپیوٹر، موبائل، مجال ہے جو دونوں میں سے کسی کو کبھی میں نے رات میں پڑھتے دیکھا ہو۔ روحیل سے آج میری ملاقات ہوئی ان دونوں کی فکر میں ہی کوچنگ سینٹرز کے ماحول اور وہاں کے تعلیمی طریقۂ کار پہ بات ہونے لگی تو وہ مجھ سے اتفاق کرتا کہنے لگا۔

''یہ تمام کوچنگ سینٹرز ایک جیسے ہیں۔ اسٹوڈنٹس کو آج جو پڑھا رہے ہیں اس کا Next day ٹیسٹ لیں، تب تو بچہ گھر جا کر پڑھے گا، یہ تو تفریح ہو گئی کہ گئے کلاس لی، لیکچر نوٹ کیا، گھر آ کر سب بند کر کے رکھ دیا۔''

ہمارے خلاف کہیں کوئی بات ہو رہی ہو اور وہاں پیلو نہ ہو ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بھائی میاں کو کوچنگ سینٹرز کے خلاف بھڑکانے اور ہمارے لیے مصیبت لانے والا ہمارے دیرینہ دشمن کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ بڑے ہونے کے بعد سے جب سے وہ پیلو کے نام سے مخاطب کیے جانے کو پسند نہیں کرتا تھا تب سے اپنے فیورٹ کو بھائی میاں بڑی لگاوٹ اور محبت سے روحیل کہنے لگے تھے۔

شکر تھا امی، ابا اسے آج بھی پیلو ہی کہا کرتے تھے۔ میں تو اس کی شادی ہو جائے، بچے ہو جائیں تب بھی اسے پیلو ہی کہا کروں گی۔

''یہ پیلو کا بچہ!'' بلال نے دانت کچکچائے۔

''بلال جواد اور جویریہ جواد کے خلاف کہیں کوئی سازش ہو اور وہاں پیلو صاحب نہ موجود ہوں ایسا ہو سکتا ہے؟''

بھائی میاں کے اٹھنے کے بعد بلال غصے سے بولا۔

''بجائے احسان مند ہونے کے، شکر گزاری کے بدتمیزی کر رہے ہو۔ وہ اپنی پڑھائی کے اتنے قیمتی وقت میں سے تم لوگوں کے لیے وقت نکالے گا، آج کل کوئی یوں بے لوثی سے کسی کے کام آتا ہے۔'' بلال کو تنبیہی نگاہوں سے دیکھنے اور جھاڑ پلانے کے بعد امی دوبارہ ''خالہ کو Wave کر دیں۔''

''چچی کو پپی برتھ ڈے بول دیں۔'' سننے لگی تھیں۔

بلال منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ بری طرح کھول تو میں بھی رہی تھی مگر بلال کی طرح منہ پھلا کر وہاں سے اٹھ نہیں سکتی تھی۔ تمیز اور تہذیب سکھائے جانے کے معاملے میں امی بیٹے اور بیٹی میں بڑا مثالی فرق رکھتی تھیں۔

''یہ نخرے لڑکیوں میں اچھے نہیں لگتے، کل کو اگلے گھر جانا ہے۔ یہاں ماں، باپ، بھائی کی بات برداشت نہیں ہو رہی، وہاں جب بہت کچھ جھیلنا پڑے گا پھر پتا چلے گا۔ تب ماں کی نصیحتیں یاد آئیں گی۔''

اگلے گھر کا خوفناک نقشہ مجھے دن میں کئی کئی بار دکھایا جاتا تھا۔ بلال کی طرح پیر پٹختی میں واک آؤٹ نہ کر سکتی تھی سو سیل فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بھائی میاں کے خطرناک لیکچر اور شاہی فرمان کے دوران کئی دوستوں کے میسجز آ گئے تھے۔ اب باری باری سب کو reply کر رہی تھی۔ زرمین نے نظم بھیجی تھی اسے کوئی اچھی سی نظم بھیجنی تھی، سعدیہ نے بش پر لطیفہ بھیجا تھا اسے بش، کرزئی یا پھر اوباما پر کوئی لطیفہ بھیجنا تھا اور سدرہ نے دوستی پر فلسفیانہ سا میسج بھیجا تھا اسے کوئی ایسا ہی اعلیٰ پائے کا میسج بھیجنا تھا۔ Inbox میں سہیلیوں کو بھیجنے کے لیے مناسب Messages تلاش کر رہی تھی کہ امی نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر مجھے دوبارہ گھورا۔

''رکھو اس عذاب کو، چوبیس گھنٹے گلے کا ہار بنا رہتا ہے۔ جا کر رات کے کھانے کے لیے سلاد بناؤ۔''

''وہ کال نہیں کرتا تو کیا ہوا، میں کر لوں گی، جلدی کس بات کی ہے، بات ختم ہو گئی تو فون رکھ دوں گی، الگ الگ کال کرنے کے لیے سم کیوں بدلوں؟''

برا ہو اس ایڈ کو بھی ابھی آنا تھا۔ موبائل امی کو عذاب لگتا تھا اور میرے اور بلال کے ہاتھوں میں اسے دیکھ کر تو وہ ہمیشہ چڑتی تھیں۔ میں بغیر چوں چرا کے فوراً صوفے پر سے اٹھ گئی تھی۔ اب اس سے پہلے کہ اگلا ایڈ اٹھلاتی بل کھاتی ماڈل کے ''بس ایک نیا کنکشن چاہیے'' کا آتا، میرا کچن میں گھس جانا ہی بہتر تھا ورنہ امی کے ان بے ہودہ اشتہارات پر آتا سارا غصہ مجھ پر ہی نکلنا تھا۔

سلاد رائتہ بنا کر فارغ ہوئی تو کھانا لگانا، کھانا، برتن سمیٹنا، سب کو چائے بنا کر پلانا ان سارے کاموں میں کافی دیر لگ گئی۔ ابا نے امی کو

ہمیشہ ان کی مدد کے لیے صبح سے رات تک کے لیے ماسی رکھ کر دی تھی جو جھاڑو، پوچھے، ڈسٹنگ وغیرہ کے لیے آنے والی ماسی کے علاوہ ہوتی تھی مگر امی کو پھر بھی اپنی اکلوتی بیٹی کو ماسی بنانے کا از حد شوق تھا۔ اکثر تو ان مہارانی ثریا صاحبہ کو کھانا اور چائے بھی میں پیش کیا کرتی تھی کہ امی کو" بے چاری صبح سے کام کر کر کے تھک گئی ہے۔" کہتے اس پر ترس بہت آتا تھا۔

سب کاموں سے جان چھوٹی تب ہی میں بلال کے کمرے میں آ پائی وہ اپنا غصہ دور کرنے کے لیے نیٹ اور موبائل دونوں پر بیک وقت دوستوں سے چیٹ کر رہا تھا مگر منہ ہنوز پھولا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر بھی اس کے منہ کے زاویے درست نہ ہوئے تھے۔

"مجھے بھرم دکھانے کی نہیں ہو رہی ہے۔ خود تو گھر سے باہر مزے سے دوستوں میں بیٹھ کر آ گئے اب بھی آرام سے چیٹ شیٹ ہو رہی ہے اور میں جب سے کچن میں سڑ رہی ہوں۔ تمہاری طرح اپنا غصہ بھی نہیں نکال سکتی کہ جو یہ جواد نے اگلے گھر جانا ہے۔" اس کے بگڑے منہ پر میں فوراً بگڑی تھی۔ "اگلے گھر" پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔ اس گھسے پٹے لفظ پر اب چڑنے سے بھی زیادہ ہم دونوں ہنسا کرتے تھے۔ اس نے گود میں پڑا Lays کا بڑا والا پیکٹ اور پیپسی کی چھوٹی بوتل میری طرف اچھالی۔ چپس کا پیکٹ آدھا خالی تھا اور پیپسی کی بوتل بھی آدھی خالی تھی۔ اس نے باہر دوستوں کے ساتھ چپس اور پیپسی کھائے تھے اور دونوں چیزیں آدھی میرے لیے بچا کر لے آیا تھا۔ وہ باہر دوستوں میں بیٹھ کر جو کچھ بھی کھاتا چاہے وہ ایک معمولی چیونگم یا ٹافی ہی کیوں نہ ہوتی وہ اس چیونگم کو بھی توڑ کر آدھا کھاتا اور باقی کی آدھی ریپر میں لپیٹ کر میرے لیے لے آتا۔ مجھے اپنے سات منٹ بڑے بھائی پر بے اختیار بہت پیار آیا تھا، دھڑا دھڑ چپس کھاتے میں نے اس کے گلے میں بازو حمائل کر دیے تھے۔

"دور ہٹ کر بیٹھو موٹی! دیکھ رہی ہو میں کتنا امپورٹنٹ کام کر رہا ہوں۔"

اس نے اپنی گود میں رکھے لیپ ٹاپ اور ہاتھ میں پکڑے سیل فون کی جانب اشارہ کیا۔ ہم دونوں میں قدرے صحت مند میں اور بانس کی طرح سوکھا اور لمبا وہ تھا۔ اول میں موٹی تھی نہیں، دوسرے بلال پر اس پل پیار آ رہا تھا اس لیے حسب عادت موٹی کہنے پر بگڑی نہیں بلکہ چپس کا پیکٹ خالی کرتے ہوئے اس سے بولی۔

"بلال! اب کیا ہوگا؟ چنگیز خان تو اپنا فیصلہ سنا چکے۔"

"مجھے لگتا ہے جب ہم دونوں پیدا ہوئے تھے بھائی میاں نے اسی دن عہد کر لیا تھا کہ انہیں گینز بک میں دنیا کے سب سے ظالم بڑے بھائی کی حیثیت میں اپنا نام درج کروانا ہے۔" وہ کھٹ کھٹ Keys پریس کرتا بولا۔

"میں تمہیں بتا رہی ہوں میں نے اس پیلو کے بچے سے نہیں پڑھنا، اب ہمارے اوپر اتنا برا وقت آ گیا ہے کہ ہمیں پیلو سے پڑھنا پڑے گا۔"

میں نے اٹھ کر چپس کا خالی ریپر کھڑکی سے اچھال کر پیلو کی بالکونی میں پھینکا۔ بلال کے کمرے کے عین سامنے والا کمرہ اس منحوس کا تھا اور میں اکثر مختلف کھانے پینے کی چیزوں کے خالی ریپرز اس کی بالکونی میں اچھال دیا کرتی تھی۔

"اچھا خاصا ہم کو چنگ سینٹر جا رہے ہیں۔ پاس ہونے کے لیے، اچھے مارکس لانے کے لیے جتنا پڑھنا چاہیے پڑھ ہی رہے ہیں پھر خدا جانے بھائی میاں پر یہ ہمیں پیلو جیسا بنانے کا کیا جنون سوار ہوا ہے؟"

''اس منحوس کو بھی تو دیکھو، خدمتِ خلق کا اتنا شوق ہے کہیں اور جائے، جن پہ احسان کیا جا رہا ہے وہ احسان اٹھانے کے لیے تیار بھی تو ہوں۔''

بلال اس نئے ایشو پر بلاشبہ مجھ سے زیادہ غصے میں تھا۔

''صبح بتاتا ہوں اس عبدالستار ایدھی کے سچے جانشین کو۔''

صبح پیلو کی گاڑی کے تمام ٹائر پنکچر تھے، اب پیلو صاحب یونیورسٹی جائیں تو کیسے جائیں؟ بلال میرے اٹھنے سے بھی پہلے یہ کارروائی کر کے آچکا تھا۔ کارروائی کر کے آنے کے بعد اس نے مجھے اٹھایا تھا۔ ہم دونوں کالج کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ صبح جاتے ہوئے بلال کو ابا اور مجھے بھائی میاں کالج ڈراپ کر دیا کرتے تھے کہ ہمارے کالجز ان کے دفاتر کے راستے میں پڑتے تھے۔ واپسی میں بلال بس سے آجاتا تھا جبکہ میں نے واپسی کے لیے وین لگوائی ہوئی تھی۔ ہم لوگ اپنے گیٹ سے نکل رہے تھے اور برابر والے گیٹ سے.....

''ممی! اب میں یونیورسٹی ٹائم پر کیسے پہنچوں گا۔''

''بس میں جاؤں گا تو میری کلاس مس ہو جائے گی۔''

''بس میں مت جاؤ بیٹا! آج گرمی بھی بہت ہے، رکشہ پہ چلے جاؤ۔'' کی پیلو اور اس کی مما کی آوازیں آرہی تھیں۔

''ہاں بس میں وہ نازک حسینہ کہاں بیٹھ سکیں گی۔'' بلال بڑبڑایا۔ گیٹ سے باہر نکل کر ہم لوگوں کی پیلو اور ان کی اماں سے ملاقات ہو گئی تھی۔ صبح صبح اس ہونق کو دیکھ لیا تھا پتا نہیں اب سارا دن کیسا گزرنا تھا۔

اس کی گاڑی کی پنکچر سن کر بھائی میاں نے جھٹ اسے اس کی یونیورسٹی ڈراپ کرنے کی آفر کی تھی۔ اس آفر کو قبول کرتا وہ ہماری گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ جتنی دیر وہ گاڑی میں بیٹھا رہا میں منہ سے خاموش بیٹھی رہی۔ بھائی میاں کی اس سے لگاوٹ بھری باتوں پر اندر ہی اندر کھولتی رہی، ہم سے بات کرتے کیسے انگارے چباتے ہیں اور اس منحوس سے بات کرتے کیسا شہد ٹپک رہا ہے ایک ایک لفظ سے۔

''تم دونوں کی تو کوئی کارستانی نہیں ہے نا روحیل کی گاڑی کے پیچھے؟''

اسے یونیورسٹی ڈراپ کرنے کے بعد بھائی میاں مجھ سے بولے۔ یہاں تو چلو ہماری کارستانی تھی مگر جہاں ہم نے کچھ نہ کیا ہوتا بھائی میاں تو وہاں بھی ہم دونوں ہی پر شک کیا کرتے تھے۔

''بھائی میاں! آپ نے مجھے اور بلال کو کیا پاکستان سمجھ کر ٹریٹ کرنا شروع کر دیا ہے؟ دنیا میں جہاں کہیں بھی کچھ ہوا ہو، ہم ہی نے کیا ہوتا ہے۔ اب آپ یہ مت کہہ دیجیے گا کہ اجمل قصاب میرا اور بلال کا مشترکہ دوست ہے، بش پر جوتا پھینکنے والا عراقی صحافی ہمارا واقف کار تھا اور پرناب مکھرجی اپنی کال سے بلال اور میرے کہنے پر مکر گیا تھا۔ ٹھیک ہے بش، کرزئی، اوباما ان سب سے ہماری دعا سلام ہے مگر یہ بھی کیا کہ دنیا میں جہاں کہیں کچھ ہو آپ فٹ سے الزام اپنے معصوم چھوٹے بھائی بہن کے سر ڈال دیں۔''

میری طویل تقریر بے مثال تھی مگر بھائی میاں اس سے ذرا متاثر نہ ہوئے تھے۔

کئی کامیاب شادیاں کرا چکی تھیں۔

''امی! ابا سے کہیں نا، وہ بھائی میاں سے کہیں گے۔ مجھے بڑا شوق ہے لڑکے والا بن کے لڑکیوں کے گھر جانے کا، خوب اچھا سارا ریفریشمنٹ، وی آئی پی ٹریٹمنٹ۔''

''اللہ نہ کرے جو میں گھر گھر لڑکیاں جھانکتی پھروں، لوگوں کے دل دکھاؤں بد دعائیں سمیٹوں۔ شعیب نے اپنی پسند بتا دی تو بہت اچھا ہے ورنہ جاننے والوں میں سے کسی لڑکی کا انتخاب کروں گی۔''

امی میری بات کے جواب میں قدرے سنجیدگی سے بولیں۔

''کیوں امی! آپ کو آنٹی حسن آرا کی طرح لمبی، گوری، دبلی پتلی، پڑھی لکھی، کم عمر، امیر بہو نہیں چاہیے؟''

بلال نے چاول اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے امی کو چھیڑا۔ امی یہ کام گھر پہ ہی کرتی تھیں، انہوں نے ہمارے گھر کے گراؤنڈ فلور پر ایک بڑے سے کمرے کو باقاعدہ اپنے آفس جیسی شکل دے رکھی تھی۔ وہ کسی سے لیتی کچھ نہ تھیں مگر ان کا رشتے کرانے کا سارا کام بڑا منظم طور طریقے سے ہوتا تھا۔

آنٹی حسن آرا کا قصہ بھی اپنی جگہ خوب مزے دار تھا۔ وہ چھوٹی خالہ کی نند کی خاص سہیلی تھیں۔ بقول امی کے جیسی چھوٹی خالہ کی نند تھیں ویسی ہی شاندار ان کی سہیلی تھیں۔ ان کے چار بیٹے تھے، بیٹے اور وہ بھی چار۔ پہلے تو وہ اسی بات پر زمین پر پاؤں نہ رکھتی تھیں پھر سارے بیٹے اچھا پڑھ لکھ بھی گئے تھے، بڑے دو کی جاب بھی اچھی جگہوں پر ہو گئی تھیں، غرور کا بہت سامان تھا ان کے پاس۔ انہیں اپنے سب سے بڑے بیٹے کے لیے جو خیر سے ایم بی اے تھا، بینک میں جاب کر رہا تھا لڑکی کی تلاش تھی۔ پچھلے دو سالوں سے وہ لڑکیاں دیکھ رہی تھیں اور کوئی لڑکی ان کی بہو بننے کے معیار پر پوری نہ اتر پا رہی تھی۔ چھوٹی خالہ کی نند انہیں امی کے پاس لے آئی تھیں کہ شاید ان کی مطلوبہ خوبیوں کی حامل لڑکی امی انہیں تلاش کر کے دے سکیں۔ امی نے تو وہ خصوصیات سن کر ان کے چلے جانے کے بعد اگلے کئی گھنٹے انہیں غائبانہ باتیں سنائی تھیں۔ اگر وہ چھوٹی خالہ کی نند کے حوالے سے اور ان کے ساتھ نہ آئی ہوتیں تو امی نے انہیں ان کے منہ پر خوب ٹھیک ٹھاک سنانا تھیں۔

آنٹی حسن آرا کی ہونے والی بہو میں کیا کیا خصوصیات ہونی چاہئیں۔ آپ بھی سن لیں۔

بے تحاشا گوری، بہت لمبے گھنے بال، دبلی پتلی نازک، ساڑھے پانچ فٹ سے کچھ نکلتا قد، عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ ہو، تعلیم کم از کم ماسٹرز ہو۔ کسی اونچے اسٹیٹس والے سائنس کے Subject میں کوئی پروفیشنل ڈگری ہو تو بہت ہی اچھا ہے، گھر اچھے علاقے میں ہو، ابا، بھائی اچھی پوسٹوں پر ہوں، سگھڑ ہو، پاکستانی کھانوں کے ساتھ چائنیز، تھائی، جاپانی کھانے بنانا بھی جانتی ہو، اضافی خوبیاں جو انہیں چاہیے تھیں وہ یہ تھیں کہ دبلی پتلی نازک تو ہو ساتھ ہی اس کے شادی کے بعد میں موٹا ہونے کا کوئی امکان نہ ہو، اس کے لیے لڑکی کی ماں اور شادی شدہ بہنوں کا بغور جائزہ لیا جانا تھا۔

دوسری اضافی شرط یہ تھی کہ لڑکی کسی کونوینٹ اسکول کی پڑھی ہوئی ہو، شاندار انگریزی بولتی ہو، انگریزی میں گٹ پٹ کرے گی تب ہی تو

''خوب سمجھتا ہوں میں تم دونوں کی معصومیت کو۔ جب تم دونوں کے چہرے پر ضرورت سے زیادہ معصومیت آجائے تو سمجھ جاؤ کوئی نئی شرارت بلکہ بدتمیزی تشکیل پا رہی ہے۔'' انہوں نے گاڑی میرے کالج کی سڑک پر ڈالی۔

''خیر..... آج شام سے روحیل تم دونوں کو پڑھانے آرہا ہے۔ کوئی شکایت نہ سنوں میں تم دونوں کی۔''

سارے فساد کی جڑ یہی بات تو تھی کہ وہ منحوس آ کیوں رہا تھا، اسے کس نے کہا تھا اس خدمتِ خلق کے لیے۔

آج کے خودغرض دور میں جبکہ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے کوئی کسی کے لیے یوں اپنا وقت برباد نہیں کرتا۔ تم دونوں کو روحیل کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ میں نے تو اس سے یونہی تم دونوں کی اسٹڈیز کی طرف سے اپنی فکر اور کوچنگ سینٹرز کی پڑھائی پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا اور اس نے انتہائی خلوص سے تم دونوں کو روز شام میں کچھ وقت پڑھا دینے کی پیش کش کر دی تھی۔ اس کی اپنی انتہائی مشکل پڑھائی، اتنا ٹف شیڈول پھر یہ آفر۔ میں تو اس کے خلوص پر حیران رہ گیا تھا۔ اس زمانے میں ایسے مخلص لوگ اب ہیں کہاں؟''

امی ہی کی طرح بھائی میاں نے بھی احسان کی گٹھڑی اٹھا کر ہم دونوں کے سر پر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے ہم دونوں پر جتنا رعب ڈال رکھا تھا، ایسے میں کسی اور معاملے پر تو میں بول بھی سکتی تھی، پڑھائی کے معاملے میں ہرگز نہیں۔ بھائی میاں کا بس نہ چلتا تھا ہم دونوں کو پڑھا پڑھا کر پیلو جیسا ہی ہونق بنا دیں۔ بھائی میاں کے سامنے تو دال گلتی نہ تھی مگر کالج سے گھر واپسی کے بعد دوپہر کا کھانا کھاتے میں نے امی سے بڑی سنجیدگی سے بھائی میاں کی شادی کی بات کی تھی۔ بھائی میاں کی شادی ہو جائے تو کچھ تو ان کی توجہ ہم دونوں چھوٹے بھائی بہن پر سے ہٹے گی۔ اچھی خاصی جاب کر رہے تھے، اچھی سیلری، سیٹلڈ لائف پھر شادی میں کیا مضائقہ تھا؟

''میرا تو کب سے ارمان ہے مگر وہ راضی بھی تو ہو نا۔ جب شادی کی بات کرو منع کر دیتا ہے۔ بھئی یا اپنی پسند بتا دو یا ہماری پسند سے شادی کر لو مگر نہیں ابھی چند سال شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ بیچلر لائف کے مزے لینے ہیں، عجیب نرالی منطق ہے۔''

''آپ سارے زمانے کی شادیاں کراتی ہیں اپنے بیٹے کی نہیں کرا پا رہیں امی! سو سیڈ۔''

بلال اسی وقت کالج سے آیا تھا اور وہ بغیر یونیفارم بدلے، بغیر منہ ہاتھ دھوئے کھانے کی میز پر بیٹھ گیا تھا۔

''ماں! پیاری ماں روٹی کھلا دے ماں، تیرا لال بھوکا پیاسا گھر آیا ہے، یوں گھور کر نہ دیکھ ماں، پیار سے دیکھ اپنے لال کو۔''

امی نے ابھی صرف اسے گھورا ہی تھا، منہ سے کچھ کہا نہ تھا کہ وہ فلمی ٹون میں جھٹ بولا بلکہ پلیٹ میں خوب سارے مٹر قیمے کا سالن ڈال کے وہ کھانا شروع کر چکا تھا۔ بلال کی اپنی لن ترانیاں تھیں مگر میں تو امی سے سنجیدگی سے بھائی میاں کی شادی کی بات کر رہی تھی۔ ہم دونوں پر انہوں نے جتنی توجہ مرکوز کر رکھی تھی اس کے خاتمے کا سبب شادی ہی بن سکتی تھی۔ خالہ امی بڑی پھوپھو سے جب ملاقات ہوتی شادی کے بعد اپنے بیٹوں کے بدل جانے، زن مرید، بیوی کا غلام، ماں باپ بھائی بہن کو پوچھتا تک نہیں کے قصے سننے کو ملا کرتے تھے۔

ہم بھائی بہن تینوں بڑے ہو چکے تھے، امی کی گھریلو اب اتنی زیادہ مصروفیات نہ تھیں لہٰذا گزشتہ چند سالوں سے انہوں نے فی سبیل اللہ رشتے کرانے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ ان کا حلقۂ احباب تھا بھی وسیع۔ اپنے جاننے والوں اور جاننے والوں کے جاننے والوں کے ہاں وہ اب تک

ان کے آفیسر بیٹے کے ساتھ چلتی اچھی لگے گی۔

''بس بہن! زیادہ کوئی فرمائش نہیں میری، زیادہ نہیں چاہتی میں سیدھی سادی سی عورت ہوں، سیدھی سادی ہی سی بہو اپنے گھر کے لیے لانا چاہتی ہوں۔''

امی ان کی شرائط پر اتنا خار میں نہ آئی تھیں جتنا اس ''سیدھی سادی'' عورت اور ''زیادہ کوئی فرمائشیں نہیں'' پر آئی تھیں۔ یوں امی کسی کی شکل صورت کو کچھ کہتی نہ تھیں مگر ان کے جانے کے بعد امی نے ان کو برا بھلا کہتے کافی کچھ کہا تھا۔

''خود کو کبھی آئینے میں نہیں دیکھتیں، ماں باپ نے نام حسن آرا رکھ دیا حسن چاہے کہیں دکھائی نہ دے، نام حسن آرا۔''

بہرحال کچھ بھی ہو آنٹی حسن آرا نے ہمارے گھر میں ہم بہن بھائیوں کے لیے اچھی خاصی تفریح کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ ہمارے وقتاً فوقتاً ہونے والے اس ہنسی مذاق پر بھائی میاں جیسے جلاد تک مسکرا دیا کرتے تھے۔ آنٹی حسن آرا کی ایک مشہور زمانہ ڈائری بھی تھی جس میں وہ رشتے کرانے والیوں سے حاصل کردہ مختلف لڑکیوں کے گھروں کے فون نمبرز نوٹ کیا کرتی تھیں۔ ہر فون نمبر کے ساتھ اس لڑکی کی چیدہ چیدہ خصوصیات بھی لکھی ہوتیں، جن لڑکیوں کے گھروں پر وہ ہو آتیں اور لازمی بات ہے لڑکی کو ناپسند بھی کر آتیں اس فون نمبر کو سرخ قلم سے کاٹ دیتیں۔ ان دو سالوں کی پیہم جدوجہد اور مشقت کے نتیجے میں ان کی ڈائری تقریباً بھر چکی تھی۔ آدھی سے زیادہ سرخ روشنائی سے قلم زد ہوئی اور باقی بچی ان کی توجہ کی منتظر۔ درجن بھر لڑکیاں تو اب تک امی بھی انہیں بتا چکی تھیں مگر کوئی ان کے مطلوبہ معیار پر پوری نہ اتر رہی تھی۔ بلال نے آنٹی حسن آرا کا قصہ شروع کر دیا تھا اور میری بات بیچ میں ہی رہ گئی تھی۔ بھائی میاں کی شادی کی بات اب کسی اور وقت امی سے اکیلے ہی میں ہو سکتی تھی۔

☆

''چلیے جناب! وہ ماماز بوائے ہمیں پڑھانے کے لیے تشریف لا چکے ہیں۔''

بلال نے آ کر مجھے اطلاع دی، میں اس وقت موبائل پر F.M سنتی ذرا کمر ٹکا کر ستا رہی تھی۔ ابھی ابھی تو ہم دونوں کوچنگ سینٹر سے واپس آئے تھے۔ بلال دانت پیس رہا تھا، مٹھیاں بھینچتے وہ کافی غصے میں تھا۔

''بری بات ہے بلال! اس طرح نہیں کہتے۔ اس بے لوث خدمت پر ہمیں محترم پیلو صاحب کا مشکور اور احسان مند ہونا چاہیے۔ اس خود غرض زمانے میں اب ایسے لوگ ملتے کہاں ہیں؟''

میں نے کچھ امی اور کچھ بھائی میاں کا لہجہ و الفاظ مستعار لے کر طنزیہ انداز میں اپنی بھڑاس نکالی۔ کوچنگ سینٹر سے آنے کے بعد کا ہمارا یہ وقت اپنے اپنے انداز میں ریلیکس کرنے کا ہوتا تھا، بلال عموماً اپنے دوستوں کی طرف نکل جاتا تھا جبکہ میں ٹی وی یا کمپیوٹر سنبھال لیتی تھی۔ پر ہمارے ریلیکس کرنے کا یہ ٹائم اس منحوس سے برداشت نہ ہو سکا تھا۔

بچپن سے ہی وہ ہماری ہر تفریح، ہر خوشی کا دشمن ہو رہا تھا۔ چاہے اپنے ہونق پن کی وجہ سے کرتا انجانے میں تھا مگر بچپن میں بھی اس احمق کی وجہ سے میں نے اور بلال نے بھائی میاں سے بہت ڈانٹیں کھائی تھیں۔ اپنے چغد پنے کی وجہ سے وہ وہ بات جو ہم محلے کے بچوں نے اپنے اپنے گھر

والوں سے چھپا کر کی ہوتی تھی بیچ چوراہے میں اس کا بھانڈا بھائی میاں کے آگے ہی پھوڑا کرتا تھا، خود تو کبھی کسی تفریح ہنگامے میں حصہ نہ لیتا تھا مگر ہمارے مزے کا بھی سارا مزہ بھائی میاں کے آگے ساری داستان بیان کر کے کرکرا کر کے رکھ دیا کرتا تھا۔

If you obey all the rules you miss all the fun ہمارا موٹو تھا اور اس آئن اسٹائن کے جانشین کا Fun سے لینا دینا کیا تھا۔ وہ تو ٹائم ٹیبل کے حساب سے گھڑی ملا کر ہر کام کرتا تھا۔ بھوک لگی ہے یا نہیں، وقت ہو گیا تو کھانا کھالو، نیند آ رہی ہے یا نہیں ٹائم ہو گیا ہے تو سو جاؤ۔ بلال تو چڑ کر کبھی کبھی اسے مسٹر ٹائم ٹیبل کہا کرتا تھا۔ اب ایک مرتبہ اس نے پھر ہمارے مزے کا مزا کرکرا کرنے والی اپنی پرانی حرکت دہرائی تھی۔ بھائی میاں سے کوچنگ سینٹرز کے خلاف زہر اگل کے اور پھر ہمیں خود بنفسِ نفیس آ کر پڑھانے کی اپنی خدمات پیش کر کے۔ منحوس وقت کا بھی اس قدر پابند تھا کہ گھڑی ملا لو۔

''اس خبیث کو اس خدمتِ خلق کا ایسا مزہ چکھاؤں گی۔ ایک ہفتے میں نہ بھگا دوں تو میرا نام جویریہ جواد نہیں۔''

میں نے شدید طیش کے عالم میں منہ پر ہاتھ پھیرا۔

ہم دونوں اسٹڈی میں آ گئے جہاں وہ رائٹنگ ٹیبل کے آگے ہم دونوں کا منتظر بیٹھا تھا۔ بلال سے اس کی ملاقات ہو چکی تھی، اسے یہاں لا کر بٹھایا ہی بلال نے تھا جبکہ مجھ سے اب ملاقات ہو رہی تھی۔ میں بغیر سلام دعا کے خاصی رکھائی سے میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہو جویریہ؟ گلاسز آنکھوں پر سیٹ کرتے اس نے مسکرا کر بہت سوبر بنتے ہوئے یوں پوچھا جیسے مجھ سے کئی سال بڑا ہو۔

''اللہ کا شکر ہے پیلو بھائی! آپ کیسے ہیں؟'' اس کے مصنوعی طاری کردہ مدبرانہ انداز کے جواب میں میں نے بظاہر مسکرا کر کہا۔ پیلو کہے جانے پر اس نے پہلو بدلا مگر اپنی ناگواری چہرے سے ظاہر نہ ہونے دی اور بظاہر مسکراتا فوراً پڑھائی کی بات پر آ گیا۔ وہ اس نام سے چڑتا ہے اپنی یہ چڑ وہ لوگوں پہ ظاہر نہ کرتا تھا۔ پر میرے اور بلال جیسے زیرک و ذہین لوگوں سے یہ چڑ مخفی رہ سکتی تھی؟

''چلو اب بکس نکالو تم دونوں، شعیب بھائی بتا رہے تھے تم دونوں کو آج کل اسٹڈیز میں کافی پرابلمز ہیں۔''

''اب آپ آ گئے ہیں ناں پیلو بھائی! اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے بظاہر بڑی لگاوٹ سے کہا۔ ہمارا بزرگ اور استاد بننے کی جو ناکام کوشش یہ افلاطون کر رہا تھا اس کوشش کی ایسی کی تیسی تو میں چند دنوں میں کر کے رکھ دوں گی۔ اس کا تو میں نے پکا فیصلہ کیا تھا۔

بلال نے فزکس، کیمسٹری اور میتھس کی کتابیں اس کے سامنے رکھ دی تھیں۔

''ہم ہفتے کے دن بانٹ لیتے ہیں، کس دن فزکس، کس دن میتھس اور کس دن کیمسٹری پڑھیں گے۔ اور ویسے تو خیر میں تم دونوں کو صرف یہی تین Subject پڑھانے آ رہا ہوں لیکن اگر کبھی تم لوگوں کو اپنے کمپلسری سبجیکٹس میں بھی کوئی پرابلم ہو تو پوچھ سکتے ہو۔ اس کے علاوہ بھی کبھی کچھ پوچھنا ہو تو پوچھ سکتے ہو۔'' ہم دونوں نے چہرے پر شکر گزاری کے تاثرات یوں سجائے جیسے اس بے مثال آفر پر تشکر سے سرشار ہو گئے ہوں۔

(ہفتے کے دن بانٹ لیتے ہیں، منحوس کہیں کے، ایک ہفتے بھی اگر اسے میں نے یہاں آنے دیا تو بڑی بات ہے۔) وہ ہمیں بڑی جانفشانی

سے فزکس پڑھانا شروع کر چکا تھا۔

''Time بھی ایک Dimension (ڈائمنشن) ہے۔'' آئن اسٹائن کے فرمودات بڑی جانفشانی سے وہ ہمیں سمجھا رہا تھا۔

''پیلو بھائی! آئن اسٹائن نے اپنی پہلی بیوی کو کیوں چھوڑا تھا؟'' فزکس کی موٹی موٹی خطرناک اصطلاحات کے درمیان میرے اس سوال نے پیلو تو پیلو بلال کو بھی ایک پل کے لیے ہکا بکا کر دیا تھا۔ جمائیاں لے لے کر اس کی بک بک سنتے بلال کے چہرے پر یک دم ہی مسکراہٹ بکھری تھی جسے اس نے سر نیچے جھکا کر فوراً ہی کنٹرول کیا تھا۔ قلم روک کر عینک کے پیچھے چھپی زبردستی طاری کردہ بڑے پن والی نگاہوں سے اس نے مجھے بغور دیکھا۔

''آپ نے ابھی تو کہا تھا پیلو بھائی! کچھ بھی پوچھ سکتے ہیں۔ میں اصل میں آئن اسٹائن کی نفسیاتی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں، کوئی تو وجہ ہوگی انسان کی پرسنل لائف میں جو وہ اتنی ہونق پنے کی باتیں کرتا ہوگا۔''

میں نے کمال معصومیت اور سادگی سے پوچھا۔ ہنسی ضبط کرتے بلال کی حالت غیر تھی جبکہ میں انتہا درجہ سنجیدہ۔ ''ویسے میں نے ایک جگہ پڑھا تھا اس کی پہلی بیوی تیز مزاج اور جھگڑالو ہوگئی تھی اسی وجہ سے تنگ آ کر آئن اسٹائن نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ ویسے مجھے اس بات کی سچائی پر شبہ ہے۔ تیز مزاج نہیں ہوئی تھی وہ بے چاری پاگل ہوگئی ہوگی۔ صحبت کا اثر خیر آپ پڑھائیں..... کیا پڑھا رہے تھے؟''

میں نے معصومیت کے تمام عالمی ریکارڈ توڑتے اسے پھر کتاب، رجسٹر اور کیلکولیٹر کی طرف متوجہ کرایا۔ چہرے پر پھیلتی ناگواری کو چھپاتے اس نے ہمیں پھر پڑھانا شروع کر دیا تھا مگر اس کا ارتکاز میں توڑ چکی تھی۔ وہ کیا بول رہا تھا، کیا پڑھا رہا تھا، کیا سمجھا رہا تھا سب کا خطرناک اور خوفناک تاثر ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا۔

رات کھانا کھاتے بھائی میاں ہم دونوں سے ''ہم نے آج پیلو سے کیا کیا پڑھا؟'' کی روداد سننا چاہ رہے تھے اپنے مخصوص چنگیزی انداز میں۔ اچھی بھلی امی کے ہاتھوں کی مزے دار دہلی والی نہاری اور نان اس خوفناک سوال جواب میں بدمزہ معلوم ہونے لگی تھی۔

''بھائی میاں! اپنے معصوم بھائی بہن کو کھانا کھانے تو دیں۔'' بلال منمنایا تھا مگر بھائی میاں اس کی منمناہٹ نظر انداز کر کے تفصیل سنتے ہمیں یہ باور کرانا چاہ رہے تھے کہ ہمیں پیلو صاحب سے انتہائی شرافت سے پڑھنا ہے اور روزانہ وہ ہماری پڑھائی کی تفصیلات یونہی پولیس والے تفتیشی انداز میں ہم سے پوچھا کریں گے۔ اسی دوران ابا کے موبائل پر کوئی کال آنے لگی تھی۔

ابا نے نوالہ منہ میں ڈالتے میز پر پاس رکھا موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا اور پھر کچھ خوف کچھ بے بسی سے امی کی طرف۔ ان خوفناک نگاہوں ہی سے ہم سمجھ گئے تھے کہ یہ صالح چچا کا فون تھا۔ ابا کے بچپن کے سب سے عزیز دوست جو بہ سلسلۂ روزگار عرصہ دراز سے سعودیہ میں مقیم تھے۔ ان کی فون کالز سے ابا کے ڈرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ بے چارے کال انتہائی فرصت سے کیا کرتے تھے۔ خیر خیریت اور ابتدائی گفتگو کے بعد ان کے یہ پوچھنے پر کہ کیا ہو رہا تھا اگر انہیں یہ تک بتا دیا جائے کہ ہم کہیں جا رہے ہیں یا مصروف ہیں وہ تب بھی بات کیے جاتے، بیچ بیچ میں تسلی دینے کے لیے یہ ضرور کہتے۔

''زیادہ لمبی بات نہیں کریں گے، تم کہیں جا رہے تھے نا۔''

بات تب بھی ہمیشہ ڈیڑھ دو گھنٹہ ہی کیا کرتے۔ کسی وقت شدید مصروفیت کے سبب ابا موبائل پر ان کی کال کو Avoid کرتے، سیل سائیلنٹ پر کر دیتے یا ان کی کال آ جانے کے خوف سے پہلے ہی آف کر رکھا ہوتا تو وہ Ptcl پر فون کر ڈالتے اور Ptcl پر آنے والی کال ہمیشہ سیل پہ آنے والی کال سے دگنی لمبائی والی ہوتی تھی۔ بلال اکثر مذاق میں ابا کو اس وقت جب وہ صالح چچا کی کال اٹھانے کو Aviod کر رہے ہوتے کہا کرتا۔

''ابا! اٹھا لیں، نہیں تو صالح چچا Ptcl پہ فون کریں گے اور اگر آپ نے اس پر بھی کال ریسیو نہ کی تو وہ گھر آ جائیں گے۔''

ابا نے کافی بیلیں ہونے دیں مگر کال تو آخر کار انہیں ریسیو کرنی ہی تھی ورنہ انہیں کھانے کی میز سے اٹھ کے Ptcl پہ آنے والی کال ریسیو کرنے تو جانا ہی پڑتا۔

صالح چچا وہاں تنہا رہ رہے تھے، وہ اپنا اکیلا پن مٹانے کے لیے اتنی لمبی کالز کیا کرتے تھے مگر جسے کال کرتے وہ بے چارا ان کی کال اٹینڈ کرنے کے بعد دنیا کا کوئی کام کرنے کے لائق نہ رہتا تھا۔ وہ دو گھنٹے تک صرف اپنی کہتے تھے اور انتہائی بے تکی کہتے تھے۔

''تم سناؤ کیسے ہو؟''

ابا نے قصداً نوالہ زور زور سے چبایا۔ ہم سب ہنسی دبا رہے تھے چونکہ جانتے تھے نوالے چبانے کی یہ آوازیں صالح چچا پر مطلق اثر نہیں ڈالنے والی، انہیں جتنی لمبی گفتگو کرنی ہے وہ ہر حال میں کریں گے۔ ابا کو بھوک شدت کی لگ رہی تھی۔ آج آفس میں انہوں نے لنچ بھی نہ کیا تھا اور کھانے میں تھی بھی ان کی فیورٹ دلی کی تہاری مگر کھانے اور ان کی راہ میں ظالم سماج تھے صالح چچا۔

''ہاں کھانا کھا رہا ہوں، تہاری بنائی ہے تمہاری بھابھی نے، بھئی تمہاری بھابھی کھانا بناتی ہی اتنا مزے دار ہیں ہاتھ ہی نہیں رکتا۔ لو بات کرو گے بھابھی سے؟''

امی اشاروں سے منع کر رہی تھیں مگر ابا نے صالح چچا کا جواب موصول ہونے سے قبل ہی موبائل امی کو تھما دیا تھا۔ ہم ٹین ایجرز کی زبان میں صالح چچا ''پکاؤ آدمی'' تھے، بندے کا بھیجہ پلپلا کر کے رکھ دیا کرتے تھے۔ ساری گفتگو میں کام کی بات ایک بھی نہیں ہوتی تھی۔ ابا امی کو پھنسا چکے تھے، ہم سب ہنسی ضبط کرتے ابا اور امی کو دیکھ رہے تھے۔ موبائل امی کو تھما کر ابا سکون سے کھانا کھانے لگے تھے اور امی اب صالح چچا سے اپنا بھیجہ پکوا رہی تھیں۔ بھائی میاں مجھ سے اور بلال سے کیے جانے والے اپنے سوالات کو بھلائے اب بتیسی کی نمائش کرتے آواز مدہم رکھتے ہنس رہے تھے۔ ابا نے جس طرح اپنی جان چھڑا کر موبائل امی کو سونپا تھا۔ امی اس سے بری طرح تپ رہی تھیں مزید کسر بھائی میاں کی ہنسی نے پوری کر دی تھی۔

صالح چچا مخاطب کو تو بولنے کا زیادہ موقع دیا نہیں کرتے تھے سو امی ابھی تک صرف ہوں، ہاں، اچھا اور نہیں ہی کر رہی تھیں۔ بھائی میاں کے دانتوں کی نمائش پر انہوں نے پہلے غصے سے ابا کو اور پھر انہیں دیکھا۔

''ہاں شعیب کئی دنوں سے آپ کو یاد کر رہا تھا، کہہ رہا تھا صالح چچا کا اتنے دنوں سے فون نہیں آیا ان سے بات کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ یہ

''آپ کو نہیں پتا؟'' اس کی تپی ہوئی شکل کا مزہ لیتے میں نے افسوس سے گردن ہلائی۔

''ابنِ یونس مصری نے، میرا تو یہ ماننا ہے کہ بندہ جو چیز بھی پڑھے یا پڑھائے اس کے متعلق تمام تر معلومات اسے حاصل ہوں۔''

میرا لہجہ اسے مکمل طور پر شرمندہ کرنے والا تھا۔ جواب چونکہ اسے واقعی نہیں معلوم تھا اس لیے چہرے پر کھسیاہٹ اور ناگواری پھیل گئی تھی جسے وہ چھپا رہا تھا۔ آج دن تو کیمسٹری پڑھنے کا تھا، میتھس کا یہ سوال تو اس نے ہمیں ہوم ورک کے طور پر دیا تھا اور چونکہ ہم نے اسے Solve کرنا نہ چاہا تھا لہٰذا کیمسٹری پڑھانے سے پہلے اس نے ہمیں وہ سمجھایا تھا۔ اب وہ بڑی عرق ریزی سے ہمیں کیمسٹری پڑھا رہا تھا۔

''پیلو بھائی! کلورین کس نے دریافت کی تھی؟'' وہ کلورین کا Iron کے ساتھ Reaction سمجھا رہا تھا اور میں نے پھر اس کا ارتکاز توڑا تھا۔

''آپ کو واقعی نہیں پتا پیلو بھائی؟'' بلال نے مصنوعی حیرت کو حقیقی ظاہر کرنے کے چکر میں آنکھیں ضرورت سے زیادہ پھاڑیں۔

''تم بتاؤ جویریہ! یہ جویریہ ہے نا، اسے سب پتا ہوتا ہے پیلو بھائی!''

''سوئیڈن کے کیمیادان شیلے نے۔'' میں نے رُوطوطے کی طرح فٹ جواب دیا۔ اپنا ارتکاز توڑے جانے پر اس کی کوفت زدہ شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

وہ اپنی کوفت اور ناگواری بمشکل چھپا رہا تھا۔ پھر میں اپنے سوال جواب سے اسے سارا وقت یونہی زچ کرتی رہی۔ اپنے رٹے مارے فضول اور بے تکے سوال اس سے پوچھتی، جن کے جواب اسے ظاہری بات ہے معلوم نہ تھے۔

''انسان نے Iron کا استعمال کب شروع کیا؟''

''نہیں پتا پیلو بھائی؟ 1200 ق م میں۔''

''Oxygen کس زبان کا لفظ ہے؟''

''اف اللہ! یہ بھی نہیں پتا؟ یونانی زبان کا۔''

پڑھائی کا ایک گھنٹہ پورا ہونے تک اس کی شکل دیکھنے والی تھی۔ چہرے پر پھیلی کھسیاہٹ، ناگواری، غصہ جسے وہ ہزار جتن کر کر کے ہم دونوں سے چھپا رہا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں اور بلال ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے کافی دیر تک ہنستے رہے تھے۔ امید تو یہ تھی کہ میری آج کی بدتمیزی کے بعد اب وہ کل سے نہیں آئے گا مگر جناب وہ ڈھیٹ اگلی شام پھر موجود تھا، ہمارا ماسٹر صاحب بنا، چہرے پر مدبرانہ انداز میں گلاسز سیٹ کرتا۔

آج فزکس کا دن تھا اور وہ بغیر ادھر ادھر کی کسی اضافی گفتگو کے فزکس پڑھانا شروع کر چکا تھا۔

''روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بات سب سے پہلے البیرونی نے بتائی تھی۔'' روشنی کی رفتار پر بات کرتے اس نے میرے پوچھنے سے قبل خود غیر متعلقہ سوال کا جواب دے دیا۔

لیں بات کریں شعیب سے۔''

امی بھی آخر ہماری امی تھیں، انہوں نے اپنے برابر بیٹھے استاد یعنی ابا کا داؤ بھائی میاں پر چلا دیا۔ چلو کوئی تو ہو بھائی میاں کی بھی ٹانگ کھینچنے والا۔ میں نے اور بلال نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں اور بلال تو بچوں میں آتے تھے اور فی الحال ہم پانچ افراد کے سوا میز پر اور کوئی موجود نہ تھا۔ سو مرتے کیا نہ کرتے۔ بھائی میاں ہی کو اب دو ڈھائی گھنٹے صالح چچا سے باتیں کرنا سوری، ان کی باتیں سننا تھیں۔ پھر جناب ہم کھانا کھا کے اٹھ چکے تھے اور بھائی میاں موبائل کان سے لگائے، رونے والی شکل بنائے ہوں، ہاں اور اچھا کہتے اپنے سامنے رکھی نہاری اور نانوں کو حسرتوں سے دیکھتے رہے تھے۔

صالح چچا کا مسئلہ یہ تھا کہ انہیں صرف ایک سامع درکار ہوتا تھا وہ ابا ہوں، امی ہوں یا بھائی میاں چنداں فرق نہ پڑتا تھا انہیں۔ وہ اخلاقاً مخاطب کی خیر خیریت پوچھتے مگر جواب سننے کی زحمت گوارا نہ کرتے مثلاً انہوں نے ابا سے بھابھی اور بچوں کی خیریت پوچھی۔

''اور بھابھی، بچے سب ٹھیک ہیں؟''

ابھی ابا بے چارے جواب دینے کے لیے منہ کھول ہی رہے ہوتے کہ وہ اپنی کسی بیماری کا احوال، کسی کولیگ کی برائی یا کسی پڑوسی کا قصہ بیان کرنا شروع کر دیتے۔ ان کا دوست فون پہ بات کر رہا ہے تو اس کے بیوی اور بچے بھی ٹھیک ہی ہوں گے۔ دورانِ گفتگو پھر کچھ خیال آتا کہ دوست سے اس کے بچوں کے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں، تب سوال کرتے۔

''اور شعیب کی جاب ٹھیک چل رہی ہے؟ جویریہ اور بلال کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

ابا پھر جواب دینے کے لیے منہ کھولتے مگر صالح چچا کا۔

''یزدانی بڑا خبیث آدمی ہے، ویسے میرے ساتھ بیٹھے گا، کھائے گا، پیئے گا اور پیٹھ پیچھے میرے خلاف سازشیں کرے گا۔'' جیسا کوئی تازہ قصہ شروع ہو جاتا۔

سوال پوچھ کے انہوں نے اخلاقی تقاضہ نبھا دیا، جواب انہیں سننے کی ضرورت کیا ہے۔ سب ٹھیک ہی چل رہا ہوگا، بہر حال جو بھی ہو۔ امی کے بھائی میاں کے ساتھ سلوک نے ہم دونوں بھائی بہن کے کلیجوں میں ٹھنڈ ڈال دی تھی۔ ظالم کا گریبان پکڑنے والا کوئی تو تھا۔

☆

''پیلو بھائی! Logarithm کا استعمال سب سے پہلے کس مسلمان Mathematician نے شروع کیا تھا؟''

Log کے ذریعے سوال حل کرتے پیلو نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

بڑا علامہ بنتا ہے ذرا اس کا جواب تو بتائے۔'' آج جو جو چیزیں اس نے پڑھائی تھیں ان سے متعلق کافی سارے غیر متعلقہ اور مخاطب کو تپا کر رکھ دینے والے سوال اور ان کے جواب جنرل نالج کی ایک بک سے رٹ کر آئی تھی۔ آج میرا ارادہ اس افلاطون کو ان غیر متعلقہ سوالات کے ذریعے چڑانے کا تھا۔

''سورج زمین سے 9 کروڑ 30 لاکھ میل کی دوری پر ہے۔''

وہ ایک Numerical میں سورج اور زمین سے متعلق چند گیسوں کا ذکر کرتے فوراً بولا، ساتھ فاتحانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''اچھا تو یہ بات ہے بچو! ابھی یہ مسکراہٹ کھسیاہٹ میں نہ بدل دوں تو نام بدل دینا۔''

وہ اب ایک اور Numerical حل کرتے کہہ رہا تھا۔

''Milky way یعنی کہکشاں گلیلیو نے دریافت کی تھی۔''

''پیلو بھائی! کیا ہماری کہکشاں کے علاوہ اور بھی کہکشائیں ہیں؟'' میں نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں ہزاروں ہیں اور ہر ایک میں لاکھوں ستارے ہیں۔''

''لیکن میں تو ہماری کہکشاں آپی کی بات کر رہی تھی۔'' میں نے دانتوں کی نمائش کرتے اس کی بڑی بہن کا نام لیا۔

''آپ بھی نا پیلو بھائی! اب اگر میں آپ سے پوچھوں ثریا یا پروین کسے کہتے ہیں؟ تو کہیں گے چھ ستاروں کے جھرمٹ کو جبکہ.....''

''جبکہ ثریا ہماری اور پروین آپ کی ماسی کو کہتے ہیں۔''

بلال نے میری بات کاٹ کر خود مکمل کر دی۔ ہم دونوں قہقہہ لگا کر یوں ہنس رہے تھے جیسے بہت عظیم مذاق کیا ہو اور وہ پہلو بدلتا اپنا غصہ ضبط کر رہا تھا۔ اس کے رٹا مار کر آئے تمام سوالوں کا میں نے نہ صرف یہ کہ بیڑا غرق کر دیا تھا بلکہ پڑھائی کا سارا ماحول بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔

''تمہیں میٹر کو سینٹی میٹر میں کنورٹ کرنا بھی نہیں آتا جو یہ؟ میں نے Numerical غلط کر کے اس کے سامنے رکھا تھا۔

''یہ تو روزمرہ استعمال کی بات ہے، تم بازار کپڑا خریدنے جاتی ہو تو میٹر کے حساب سے کپڑا نہیں خریدتیں؟'' اس نے مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

''اب تو سارا مہنگا کپڑا گز کے حساب سے بکتا ہے پیلو بھائی! یہ میٹر ویٹر تو کب کا لد گیا۔ آپ ربی سینٹر جا کر دیکھ لیں سارا مہنگا اور اچھا کپڑا گز میں بکتا ہے اور آپ کو تو پتا ہی ہے امی ابا مجھے یعنی اپنی اکلوتی بیٹی کو کبھی کوئی سستی چیز دلاتے ہی نہیں ہیں۔''

میں نے فخریہ گردن اکڑائی۔

امی نے ثریا کے ہاتھ پیلو کے لیے چائے اور کٹلس بھجوائے تھے۔ اسے دیکھتے ہی میں اور بلال سنجیدہ شکلیں بنا کر بیٹھ گئے تھے۔ شکل بھولی تھی مگر تھی ایک نمبر کی چغل خور یہ ہماری ثریا بیگم۔ خیر سے اپنے بچپن کے دنوں سے ہمارے گھر آ رہی تھیں۔ لگ بھگ بھائی میاں ہی کی عمر کی تھی۔

شادی سے پہلے اپنی اماں کے ساتھ ہمارے گھر آتی تھی اور اب شادی کے بعد بھی ہمارے ہی پاس پورا دن کام کرتی تھی۔ پڑھ پڑھا کر اس امید پر فارغ ہوئے کہ آج جتنا تنگ کیا ہے خیر سے اتنی بدتمیزی کے بعد کل سے پیلو صاحب اپنی خدمتِ خلق سے کان پکڑ کر توبہ کر لیں گے۔

اسٹڈی سے نکل کر لاؤنج میں آئے تو امی اور ثریا ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

''شعیب تو پتا نہیں کب آئے گا، تمہیں جلدی ہے یہ بلال چھوڑ آئے گا تمہیں۔'' 21 ویں گریڈ کی ثریا صاحبہ کو ہماری امی اکثر و بیشتر بذریعہ

کاران کے گھر چھڑوایا کرتی تھیں۔

''نہیں بلال کے ساتھ میں نہیں جارہی۔ یہ تو لگتا ہے کہیں آگ بجھانے جارہا ہے۔ میں انکل آجائیں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' اس نے بلال کی تیز رفتار ڈرائیونگ کو آگ بجھانے کے لیے جاتی فائر بریگیڈ سے تشبیہہ دی تو امی کے ساتھ مجھے بھی ہنسی آگئی۔ بلال سے اس کی ایک سیکنڈ نہ بنتی تھی۔

''مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تم حسینہ کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھانے کا۔''

ہمارے اس بحث مباحثے کے دوران گیٹ پہ بیل بجی تھی۔ ثریا نے امی کے کہنے پر جا کے گیٹ کھولا۔ واپس آئی تو ساتھ آنٹی حسن آرا تھیں۔ چونکہ چھوٹی خالہ کی نند کا حوالہ تھا اس لیے امی کے آفس کے بجائے وہ انہیں لاؤنج ہی میں لے آئی تھی۔ امی نے بڑے تپاک سے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا مگر وہ امی کا ہاتھ جھٹکتی غصے میں بھری سامنے والے صوفے پر جا بیٹھیں۔

''کیا ہوا بہن؟'' امی ان کی بداخلاقی نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''کیسے کیسے بدتمیز لوگوں کے آپ مجھے نمبر دے دیتی ہیں طلعت؟''

انہوں نے امی کو ناراضی سے دیکھا۔ میرے اور بلال کے ساتھ ساتھ ثریا بھی ایک نظر حیران پریشان کھڑی امی کو اور ایک نظر غصے سے بھری آنٹی حسن آرا کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ مسز خان جن کا فون نمبر آپ نے مجھے پچھلے مہینے دیا تھا۔ میں پچھلے مہینے ان کے گھر سے آنے کے بعد ڈائری میں ان کا نمبر کاٹنا بھول گی۔ اب نمبر کٹا ہوا نہیں تھا میں سمجھی شاید یہاں اب تک گئی نہیں ہوں، میں نے وہاں پھر فون کرلیا۔'' آنٹی حسن آرا نے دونوں کان پکڑ کر استغفار پڑھی۔

''لڑکی کی ماں، یہ گز بھر کی زبان، توبہ اس قدر بدتمیز، میری آواز اور نام سن کر پہچان گئی کہ میں اس کے گھر جا چکی ہوں، پھر اس میں اتنا لڑنے اور باتیں سنانے کی کوئی بات تھی؟ میں نے یہ سمجھ کر کہ ان سے آج پہلی بار بات ہو رہی ہے اپنے معمول کے سوال دہرائے کہ بھئی۔

''آپ کی بیٹی گوری ہے؟'' فٹ سے بدتمیز، زبان دراز عورت کیا بولتی ہے۔

''افریقن دیکھے ہیں؟ بالکل ویسی ہے میری بیٹی۔ کبھی ملو تو میرے بجائے اوباما کی بیٹی سمجھو گی۔''

آنٹی حسن آرا نے لڑکی کی والدہ مسز خان کے الفاظ دہرائے پھر امی کی طرف دیکھتے مزید بولیں۔

''اس قدر بداخلاق، بدتمیز عورت۔ میں نے صرف اتنا ہی تو پوچھا تھا کہ کیا آپ کی بیٹی گوری ہے، کوئی گالی تو نہیں دے دی تھی۔ صرف اتنے پر بس نہیں کیا زبان دراز عورت نے، آگے سے کیا سناتی ہے۔

''حسن آرا صاحبہ! گورے رنگ کے بجائے گوری سیرت والی لڑکی تلاش کریں آپ۔''

اپنی مظلومیت بھری داستان پر آنٹی حسن آرا کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر چکی تھیں۔ MBA کیے، شاندار جاب والے بیٹے کی ماں کو کسی لڑکی کی ماں نے باتیں سنا دی تھیں، دکھ سا دکھ تھا۔

''پھر آپ نے کیا کہا آنٹی؟'' بلال نے مزہ لینے والے انداز میں پوچھا۔

''ہر کوئی اپنے بیٹے کے لیے خوبصورت سے خوب صورت لڑکی ڈھونڈتا ہے میں نے ڈھونڈی تو کیا گناہ کیا۔ واہ..... یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی سب خوبصورت بہوئیں لائیں اور مجھے سیرت کی نصیحت کی جائے۔ سیرت کا میں نے کیا کرنا ہے۔''

آنسو بہاتی وہ کیا بول رہی تھیں انہیں خود نہیں پتا تھا۔ ثریا سر جھکائے دانت نکال رہی تھی جبکہ میں اور بلال سنجیدہ چہرے کے ساتھ آنٹی حسن آراء کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

''بالکل آنٹی! سیرت کا آپ نے کیا اچار ڈالنا ہے۔''

امی نے بلال کو غصے سے گھورا تھا مگر آنٹی حسن آراء رومال سے آنکھیں اور ناک رگڑتی اپنے ہی شاندار فرمودات میں مشغول تھیں۔

''وہ میری جٹھانی، میں نے آپ کو ان سے ملوایا تھا ناں؟''

انہوں نے امی سے تصدیق چاہی پھر امی کے جواب سے پہلے ہی آگے بولیں۔

''کیسی گوری بھولائی ہیں وہ، اور بال یہ گھٹنوں سے بھی نیچے آ رہے ہوتے ہیں۔ مانو چودھویں کا چاند، اوپر سے ڈاکٹر اور جہیز کتنا بھر کر لائی ہے۔ انہیں کسی نے کچھ نہ کہا مجھے سب سیرت سیرت کی نصیحتیں کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے بھی تو ارمان ہیں گوری بہو کے۔''

آنسو بہاتے انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ وہ ہم سب کو ہنسی کا سامان بہم کر رہی ہیں۔ ہم تینوں تو الگ امی تک لب بھینچے اپنی مسکراہٹ ضبط کر رہی تھیں۔ نجانے کون جی دار خاتون تھیں یہ مسز خان، مجھے پتا تھا امی آنٹی حسن آراء کے جاتے ہی انہیں شاباشی بھرا فون ضرور کریں گی۔ نجانے کن کن دکھے ہوئے دلوں والی ماؤں اور ان کی بیٹیوں کی آہوں کا بدلہ آج انہوں نے آنٹی حسن آراء سے لے لیا تھا۔

مجھے یقین کامل تھا امی نے مسز خان کو ان کی بہادری و جی داری پر بے تحاشا تعریف و ستائش سے نوازنا تھا مسز خان کی بدتمیزی کا قصہ روتے دھوتے سنا لینے کے بعد آنسو صاف کرتی آنٹی حسن آراء کھڑی ہوئیں۔

''دو چار لڑکیاں اور بتائیں۔'' انہوں نے ناراضی بھرے لہجے میں امی سے فرمائش کی۔

''بہت گوری ناں آنٹی؟'' بلال نے پھر مزہ لیا۔

''ہاں، خوب گوری ہو۔'' وہ بلال کے مذاق اڑاتے انداز کو سمجھے بغیر سنجیدگی سے بولیں۔

''بس ایسی لڑکی بتا دیں کہ میری جٹھانی دیکھیں تو دیکھتی رہ جائیں۔ ان کے کالے، موٹے بیٹے کو ایسی حور مل سکتی ہے تو میرا بیٹا تو لاکھوں میں ایک ہے۔''

''لیکن آنٹی! رنگ تو وجاہت بھائی کا بھی خاصا سانولا ہے۔''

امی بلال کو مسلسل گھور رہی تھیں۔ بڑوں اور وہ بھی عورتوں کی باتوں میں گھسنے پر۔

''نہیں کوئی ایسا بھی سانولا نہیں وجاہت اور پھر مردوں کی شکل صورت کون دیکھتا ہے۔ بس جلدی سے دو چار خوبصورت اور بہت گوری

لڑکیوں کے گھروں کے فون نمبرز دے دیں۔"

بلال کو قدرے برا ماننے والے انداز میں جواب دے کر فارغ کرنے کے بعد انہوں نے امی سے پھر فرمائش کی۔

"ابھی تو اور لڑکیوں کے نمبرز نہیں ہیں، آپ چند دنوں بعد کانٹیکٹ کیجئے گا۔"

امی نے انہیں ٹالا، جس رفتار سے وہ دھڑا دھڑ لڑکیوں کو ٹھکراتی آ رہی تھیں اس سے امی کو پہلے بھی ان لڑکیوں اور ان کے گھر والوں کی آہوں اور بددعاؤں کا خوف لاحق رہا کرتا تھا۔ اب تو شاید ان کا آئندہ آنٹی حسن آراء کو کوئی نمبر دینے کا ارادہ ہی نہ تھا۔ بلال کہیں سے اٹھا کر ریڈ پین لے آیا تھا۔

"آنٹی! یہ پین رکھ لیں، جیسے ہی کسی کو فرسٹ نائم فون کریں اسی وقت اس نمبر کو کاٹ دیں تاکہ آئندہ اس طرح کی عزت افزائی سے..... میرا مطلب ہے ایسے بدتمیز لوگوں سے بچ سکیں۔"

آنٹی حسن آراء کے چلے جانے کے بعد بلال کی امی کے ہاتھوں خیر نہیں تھی۔ امی سمیت ہم سب نے مسز خان کے ہاتھوں ان کی عزت افزائی کو کس قدر انجوائے کیا ہے اس سے بے خبر آنٹی حسن آراء ہمارے گھر سے رخصت ہو گئی تھیں۔

☆

بھائی میاں اپنا ویکلی لیکچر مجھے اور بلال کو دے رہے تھے۔ وہی پڑھائی کو سنجیدگی سے لو" پیلو اپنا قیمتی وقت نکال کر جو تم لوگوں کو پڑھانے آ رہا ہے اس کی قدر کرو، اس سے زیادہ سے زیادہ پڑھنے اور سیکھنے کی کوشش کرو۔"

"بھائی میاں! مجھے بھی پتا ہے میں نے پڑھنا ہے۔ پڑھوں گی تو اچھے مارکس آئیں گے۔ میں فرح ڈوگر تو ہوں نہیں کہ سفر کو "تے" کروا کر بھی میڈیکل کالج میں پہنچ سکوں۔"

میں نے جمائی روکتے شدید بوریت کے عالم میں بھائی میاں سے کہا۔

"بھائی میاں! میں ایک بات سوچ رہا تھا۔ یہ اوباما کی بیٹیاں اگر پاکستان میں ہوتیں تب تو بڑے ہونے پر انہیں رشتوں کا بڑا مسئلہ ہو جاتا۔" بلال نے ایک ہفتے پہلے کا آنٹی حسن آراء کا قصہ پھر سے دہرا کر اس بورنگ لیکچر کا رخ تبدیل کرنا چاہا۔

"یہ فضول باتیں مجھے نہیں سننا۔ میں تم دونوں سے صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ روحیل جو تم دونوں کو پڑھانے آ رہا ہے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاؤ، اس سے زیادہ سے زیادہ سیکھو۔"

"کیا؟ ہونق پن؟" میں نے کہا تو آہستہ سے تھا مگر بھائی میاں نے سن لیا تھا انہوں نے غصے سے مجھے گھور کر دیکھا تھا۔

"عالم پناہ! میری بہن کی جان بخش دیں، بچی ہے، نادان ہے، جانتی نہیں کہ کس شخصیت کے سامنے کس شخصیت کی شان میں گستاخی کر گئی ہے۔ بجائے مستقبل قریب کے انجینئر روحیل رضوان کے انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کی قدردان ہونے کے فضول ریمارکس دے رہی ہے یہ اس کے متعلق۔ اب ذرا آپ ہی بتائیں آج کل کے دور میں اب ایسے مخلص اور ہمدرد لوگ کہاں؟"

بھائی میاں کا پروموشن ہوا تھا، سیلری بڑھی تھی، وہ قدرے خوشگوار موڈ میں تھے، ہمیشہ کی طرح انگارے نہیں چبا رہے تھے تب ہی تو بلال نے اتنا کچھ بول دینے کی جرأت کی تھی۔ واقعی موڈ خوشگوار تھا چنگیز خان کا، تب ہی بجائے غصے سے لال پیلے ہونے کے وہ مسکرائے تھے۔

''تم دونوں کے بھلے کو کہتا ہوں، بڑا بھائی ہوں تمہارا، کیا مجھے محبت نہیں ہے تم دونوں سے؟ اگر ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہوں تو تمہاری بہتری کے لیے۔''

اس اظہارِ محبت پر بلال بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کرتا غش کھا کے کارپٹ پر گر پڑا تھا جبکہ میں نے اس ایکٹنگ کو اوور ایکٹنگ میں بدلتے ''ہائے میرا بھائی'' کہتے اسے زور زور سے جھنجھوڑنا شروع کر دیا تھا۔

''ہائے میرا سات منٹ بڑا اجڑواں بھائی! سوکھا سڑا، بانس کی طرح لمبا ہے تو کیا ہوا، ہے تو میرا بھائی۔ میری طرح خوبصورت نہیں، ذہین نہیں تو کیا ہوا، ہے تو میرا بھائی۔''

بلال کو جھنجھوڑتے میری اوور ایکٹنگ جاری تھی۔ بھائی میاں مسکراہٹ لبوں پہ روکتے بظاہر سر جھٹک کر وہاں سے جانے لگے تو بلال فوراً لیٹے لیٹے ہی آنکھیں کھول کے بولا۔

''بھائی میاں! We want treat کسی بھی شاندار ہوٹل میں ہمیں شاندار ڈنر کرا کے لائیں اور آج ہی لائیں۔'' بھائی میاں سر اثبات میں ہلاتے لاؤنج سے چلے گئے تھے۔

''روحیل صاحب آ گئے ہیں۔''

اسی ثریا نے آ کر ہم دونوں کو اطلاع دی۔ جب وہ اپنے بچپن سے ہمارے گھر آ رہی تھی تو ظاہر ہے وہ بھی پیلو سے بچپن ہی سے واقف تھی۔ پہلے وہ بھی اسے ہم لوگوں کی طرح پیلو ہی کہا کرتی تھی مگر اب جب سے پیلو کی اماں نے اسے ایک بار آڑے ہاتھوں لیا تھا اپنے بیٹے کا یہ نام لینے پر تب سے وہ اسے روحیل صاحب کہنے لگی تھی۔ میں نے خود کو ایک ہفتے کا ٹائم دیا تھا اور یہاں تو ایک کیا ڈیڑھ دو ہفتے ہونے کو آ گئے تھے اور وہ منحوس اسی شد و مد سے روز اپنے مقررہ وقت پر نازل ہو رہا تھا۔

بلال کچھ کم، میں بہت زیادہ، ہم دونوں روز اسے جی بھر کر ستاتے، تپاتے، غصہ دلاتے، لگتا اب کل سے یہ ہمارے گھر آنے کا نام بھی نہیں لے گا مگر اگلے روز جب دیکھتے وہ لبوں پر ''استادانہ مسکراہٹ'' سجائے اسٹڈی میں ہمارا منتظر بیٹھا ہوتا۔

یہ آئن اسٹائن کا بچہ ہونق ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد ڈھیٹ بھی تھا۔ ہم دونوں اسٹڈی میں اٹھ کر آ گئے تھے۔ میں کوئی بھی اوٹ پٹانگ غیر متعلقہ سوال کر سکتی ہوں اس لیے اب وہ بڑی بھرپور تیاری کے ساتھ آتا تھا۔

وہ ہمیں Transition Elements پڑھا رہا تھا اور ہر دھات کے متعلق کیمیائی زبان کے استعمال کے ساتھ وہ بڑی تفصیل سے کون سی دھات کب دریافت ہوئی، کس کا استعمال کب شروع ہوا بتاتا جا رہا تھا۔ ساتھ فاتحانہ نگاہوں سے مجھے بھی یوں دیکھتا جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو فزکس اور کیمسٹری کے ساتھ تمہیں ہسٹری پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے ناں، لو پڑھو ہسٹری۔

''پیلو بھائی! آپ نے بڈھا گجر دیکھ لی؟''

ثریا کے ہاتھ کی بنائی چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

''ویسے ہی پوچھ رہی ہوں، اچھی فلم ہے اس لیے۔''

''نہیں میں نے نہیں دیکھی۔'' سنجیدگی سے جواب دیتے وہ پھر تانبے سے متعلق Chemical equations رجسٹر پر لکھنے لگا۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

''پیلو!'' بلال نے بہت لہک کر شعر پڑھا تھا اور اس کا شعر ختم ہوتے ہی میں نے ''پیلو'' کہا تھا۔ اس نے فوراً گھور کر مجھے دیکھا تھا۔

''پیلو میرا مطلب ہے پیلو بھائی! میں آپ کو مخاطب کر رہی تھی۔ آپ سے ایک بات پوچھنے کے لیے۔ میں یہ پوچھ رہی تھی کہ آپ اس شعر کا مطلب سمجھا دیں۔ آپ نے کہا تھا نا ہم دوسرے Subjects کی بات بھی پوچھ سکتے ہیں۔'' سمجھ تو ظاہر ہے وہ سب گیا تھا مگر غصہ ضبط کرتا شعر کا مطلب سمجھانے لگا تھا۔

چڑے گا، ناراض ہوگا، غصہ بھی آئے گا مگر منحوس اپنی خدمتِ خلق سے تائب پھر بھی نہ ہوگا۔ اب تو مجھے شک ہونے لگا تھا کہ کہیں ہمارے گھر میں تیل یا کوئی اور خزانے تو دفن نہیں۔ ہماری بدتمیزیوں کے باوجود اس شدّ و مد سے آنے کے پیچھے کچھ تو تھا۔ کچھ تو تھا جس کی پردہ داری تھی۔

''اچھا اب میں آپ سے جلدی جلدی کچھ سوالات پوچھتا ہوں ان کے جواب دیجیے گا۔

سرہانے میر کے آہستہ بولنا کیوں ضروری تھا؟

ٹہنی پہ کسی شجر کی بلبل کیوں اداس بیٹھا تھا؟

نرگس ہزاروں سال تک کیوں روتی رہی تھی؟

اسد نے لڑکپن میں مجنوں پہ سنگ کیوں اٹھایا تھا؟

عندلیب کو کس کے ساتھ مل کے آہ و زاریاں کرنی تھیں؟

پتا پتا، بوٹا بوٹا کس کا حال جانتا ہے؟

بلال نے نجانے کتنے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنی بات مکمل کی۔

''میرا خیال ہے آج تم لوگوں کا مزید پڑھنے کا موڈ نہیں۔'' جواباً سنجیدگی سے بولتا وہ کتابیں بند کرنے لگا تھا۔

''لیکن ہمارا تو روز ہی پڑھنے کا موڈ نہیں ہوتا۔'' میں نے معصومانہ انداز میں کہا۔

''اب باقی پڑھائی کل کریں گے۔'' وہ کرسی پر سے اٹھنے لگا۔

''آپ کل بھی آئیں گے؟'' بولتے کے ساتھ ہی میں زبان کنٹرول کی۔ ایسے ڈائریکلی ہم کبھی اسے کچھ نہیں کہا کرتے تھے۔

''میرا مطلب ہے کل تو سنڈے ہے نا پیلو بھائی!''

''کل سنڈے نہیں، سیٹرڈے ہے اور ان شاءاللہ میں کل بھی آؤں گا۔ اب تم دونوں بھائی بہن آپس میں نرگس وعندلیب پر غور کرو۔ ہوسکتا ہے نرگس کو فلموں میں اپنی پسند کا رول نہ مل رہا ہو وہ اس لیے رو رہی ہو اور عندلیب آہ وزاری کے لیے شان یا سعود کا انتظار کر رہی ہو اور جہاں تک میرا خیال ہے اسد بچپن سے ہی بری صحبت میں پڑ گیا تھا۔ گلی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا تب ہی تو لوگوں کے پتھر وتھر مارنے لگا تھا اور میر صاحب کو چونکہ بے خوابی کا مرض لاحق تھا بڑی مشکلوں سے انہیں نیند آتی تھی تو ان کی نیند ٹوٹ جانے کے خیال سے ان کے سرہانے آہستہ بولنا ضروری تھا۔''

ہم دونوں ہونق بنے اس کو دیکھ رہے تھے۔

''اور ہاں جویریہ! ہماری بالکونی میں خالی ریپر پھینکتی ہو، پڑوسیوں کے بھی بہت حقوق ہوتے ہیں کبھی تو بھرا ہوا ریپر بھی پھینک دیا کرو۔''

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

وہ شعر سناتا، مجھے شرمندہ کرتا کب کا اسٹڈی سے جا چکا تھا۔ میں اور بلال ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ باؤلا اتنا باؤلا بھی نہ تھا، وہ ہونق اتنا ہونق بھی نہ تھا۔ ہمیں ہمارے منہ پر کوئی لاجواب کر جائے، کوئی ہمارے سیر کے جواب میں سوا سیر ثابت ہو جائے۔ ایسا کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ وہ ماما زبوائے ممی کے پردوں سے باہر نکل کر کب اتنا ہوشیار ہوا تھا کہ ہمیں لاجواب کر جائے ہمیں پڑوس میں رہتے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ وہ پیلو کا بچہ اتنا حاضر جواب بھی ہوسکتا تھا کہ ہماری بولتی بند کروا جائے میں اور بلال پیچ وتاب بھی کھا رہے تھے اور شدید حیرت کی لپیٹ میں بھی تھے۔

اس رات میں بلال کے کمرے میں تھی۔ ہم دونوں Walls کی Feast کھاتے پیلو کی آج کی حاضر جوابی ہی کو ڈسکس کر رہے تھے۔ میں عادتاً خالی ریپر اس کی بالکونی کی طرف اچھالتے اچھالتے رک گئی تھی، عین اسی وقت وہ منحوس اپنے کمرے کی کھڑکی میں آ کر کھڑا ہوا تھا، موبائل پر غالباً اپنے کسی دوست سے بات کرتا وہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''بالکل مجھے کب انکار ہے اس بات کی سچائی سے۔ ہم جاتے ہیں وہاں ایک بہانے سے۔ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔''

بولتے بولتے اس کی ہم دونوں پر نظر پڑی تو خوشگوار انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے ہم دونوں کو ہاتھ ہلایا۔ مجھے اس کی ریپر والی بات پہ غصہ تھا اس لیے بغیر ہاتھ ہلائے کھڑکی سے ہٹ گئی جبکہ بلال نے جواباً اسے ہاتھ ہلایا تھا۔ میں بلال کے کمرے سے نکل کر لاونج میں آئی تھی۔ وہاں سے امی ابا کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

''نجمہ کھل کے تو نہیں بولیں۔'' امی نے پیلو کی ممی نجمہ آنٹی کا ذکر کیا۔

''وہ صرف بات میرے کان میں ڈالنا چاہ رہی تھیں، ظاہر ہے ابھی تو پیلو کی انجینئرنگ کے بھی دو سال باقی ہیں اور جویریہ کی پڑھائی ختم ہونے میں بھی چار پانچ سال تو لگیں گے ہی۔''

بلال کس وقت میرے ساتھ وہاں آ کر کھڑا ہو گیا تھا مجھے پتا ہی نہیں چلا تھا میں تو ہونق بنی امی کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اچھا لڑکا ہے، ذہین، قابل، گھرانہ بھی ہمارا دیکھا بھالا ہے جب جویریہ کا رشتہ طے کرنے کا وقت آئے گا تو ان شاءاللہ اس کے متعلق

ضرور سوچیں گے۔''

میرا دماغ تو بھک سے اڑ گیا تھا۔اس پیلو کے بچے کی یہ جرأت! بلال دانت نکالتا اپنے قہقہے کا گلا گھونٹ رہا تھا۔امی ابا پر تو بس چل نہیں سکتا تھا سو غصے سے کھولتے میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔طیش کے مارے میرا برا حال تھا۔بس نہیں چل رہا تھا جا کر اس منحوس انسان کا سر پھاڑ آؤں۔بلال میرے ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑاتا میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے میرے کمرے میں لے آیا تھا۔

''اگر مستقبل قریب میں یہ رشتہ طے پا گیا تو تم کیا کہلاؤ گی جویریہ؟ مسز پیلو۔'' وہ پیٹ پکڑ کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوتا بیڈ پر گرا تھا۔میں کشنز تکیے سب اٹھاتی اسے مارنے کے ارادے سے اس کی طرف لپکی تھی۔وہ اپنے بچاؤ کے لیے تیار ہوتا سیدھا ہوا مگر زبان بند نہ کی۔

بنا ہے پیلو جویریہ کے لیے ماسٹر صاحب
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

''تم تو صرف اس سے پڑھنے پر پیچ وتاب کھا رہی تھیں یہاں تو اسے تمہارے سر کا تاج بنایا جا رہا ہے۔ویسے بھائی میاں اور امی کی بات غلط تھی، وہ بے غرضی سے اور بے مقصد نہیں بلکہ بڑا عظیم مقصد لے کر آتا ہے یہاں۔''

میں نے کئی کشنز دھڑا دھڑ اس کی طرف پھینکے، وہ ادھر سے ادھر بھاگتا میرا ہر وار بچا گیا۔بلال کے ہنسنے اور مذاق اڑانے پر مجھے مزید طیش آ رہا تھا۔وہ منحوس اتنے دنوں سے یہاں میری وجہ سے آ رہا تھا۔

اتنی استقامت کا مظاہرہ میرے دل میں گھر کرنے کے لیے کیا جا رہا تھا۔

''تم مسز پیلو بن کر کیسی لگو گی جویریہ؟ یاد رکھنا تم نے کیا عہد کر رکھا ہے یہی کہ اس کی شادی ہو جائے تم تب بھی اسے پیلو ہی کہو گی۔''

ہنس ہنس کر بے حال ہوتا بلال آگے آگے تھا اور غصے سے بھری ہانپتی کانپتی میں اس کے پیچھے۔

بلال سے تو بعد میں بھی نمٹا جا سکتا ہے پہلے مجھے جا کر اس منحوس انسان کی خبر لے کے آنی چاہیے جو رومیو بننے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا۔جس قدر غصے سے میرا برا حال تھا ایسے میں تشفی اس خبیث کو کھری کھری سنا کر ہی مل سکتی تھی۔بلال کا پیچھا چھوڑ کے میں ایک دم ہی کمرے سے باہر جانے لگی۔

''ارے کہاں چلیں بہنا؟''

''اس ہیرو سے نمٹنے، سمجھتا کیا ہے منحوس خود کو۔'' میں پیر پٹختی کمرے سے نکلنے لگی۔

''واپس بھی اسی کروڈفر سے آنا، اسے منحوس اور خبیث کے القاب سے نوازتی۔یہ نہ ہو واپسی میں دوپٹے کا کونا مروڑتی روحیل یہ کہہ رہے تھے اور روحیل وہ کہہ رہے تھے، کہتی آؤ۔''

اس نے قہقہہ لگاتے مجھے پیچھے سے پکارا۔میں نے گھور کر بلال کو دیکھا، اس سے تو میں آ کے پوچھوں گی پہلے اس پیلو کے بچے کی طبیعت صاف کر آؤں۔غصے سے بھری میں ایک وقت میں دو دو سیڑھیاں اتر رہی تھی۔روحیل رضوان عرف پیلو کے گھر جاتی میں ایک بات تو ضرور سوچ رہی تھی

کہ بھائی میاں اور امی کی یہ بات غلط ثابت ہوگئی کہ مسٹر ٹائم ٹیبل اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کے بہت بے غرضی اور بے لوثی سے خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہمیں پڑھانے آرہے تھے۔ واقعی دنیا مطلبی ہے اور یہاں کوئی کسی کو بے مقصد کچھ نہیں دیتا، اپنا وقت اور علم بھی نہیں۔ ہائے مطلبی دنیا۔

❁.....❁

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/مولف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو ملک کے معروف پبلشرز ''علم و عرفان پبلشرز'' کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک..... کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجئے اور کتاب لیجئے.....

خواتین کے لیے سنہری موقع..... سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق.....

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں.....

عمیرہ احمد	ماہا ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنول نازی	نگہت عبداللہ	رفعت سراج	نبیلہ عزیز	نگہت سیما	میمونہ خورشید علی
اقراء صغیر احمد	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔اے۔راحت	اعتبار ساجد	شیما مجید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحق حقی	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایس۔ایم۔ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور ilmoirfanpublishers@yahoo.com

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں

وہ تینوں علیا کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں جب علی بن بلائے مہمان کی طرح اچانک نازل ہو گیا۔

''تمیز نہیں ہے تمہیں اس طرح بغیر ناک کیے کسی کے کمرے میں آنا انتہا درجے کی جہالت ہے۔''

زرین جو علیا کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی فکر مند تھی علی کی بے وقت کی آمد پر بری طرح چڑ گئی تھی۔

''سوری.....'' اس نے خلاف عادت فوراً معذرت کی تھی۔

''ویسے یہ میری پیاری اپیا منہ بسورے کیوں بیٹھی ہیں؟'' وہ ان تینوں کے درمیان گردن لٹکائے بیٹھی ہوئی علیا کی طرف اشارہ کر کے بولا تو وہ کاٹ کھانے والے انداز میں چلائی۔

''تم سے مطلب.....؟ میری مرضی میں جیسے چاہے بیٹھوں۔''

علی سے تو وہ ویسے بھی سخت چڑی ہوئی تھی۔ کل رات ہی تو اس نے اور دانش نے مل کر اس کے بنائے ہوئے لوکی کے کبابوں کا دل کھول کر مذاق اڑایا تھا۔ کتنی محنت سے اور بڑا دل لگا کر اس نے رات کے کھانے میں لوکی کے کباب بنائے تھے۔

''ارے آج پھر ''بینا کا دسترخوان'' کچن میں موجود ہے، لگتا ہے آج پھر ہمارے صبر کا امتحان لیا جانے والا ہے۔'' دانش پانی پینے کچن میں آیا تو کچن ٹیبل پر رکھی کتاب دیکھ کر بڑبڑایا مگر یہ بڑبڑاہٹ اتنی بلند تھی کہ کوکنگ رینج کے پاس کھڑی علیا بھی سن لے۔ دانش سے اس کی یوں بھی ذرا کم ہی بنتی تھی۔ ایک تو وہ غصے کی تیز تھی اور دوسرے دانش بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ۔

''کون تمہارے ہاتھ پاؤں جوڑ رہا ہے کہ میرا پکایا ہوا کھاؤ۔'' وہ غرّائی تھی۔

''میں اپنے لیے کب فکر مند ہو رہا ہوں۔ اصل فکر تو مجھے جنت اور اس کے گھر والوں کی صحت کی ہے۔''

جنت ان کے گھر کام کرنے والی ماسی کا نام تھا۔

''سچی بات تو یہ ہے مائی ڈیئر کزن کہ اگر کتابیں پڑھ کر کھانا پکانا آجایا کرتا تو تمہاری طرح کی تمام پھوہڑ لڑکیاں اپنے اپنے شوہروں کے دلوں پر راج کر رہی ہوتیں۔''

اور پھر صرف اس پر ہی اکتفا نہیں تھا، کھانے کی میز پر بیٹھ کر اس نے علی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ٹھیک ہے کباب زیادہ اچھے نہیں بنے تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ لوکی میں دوسری سبزیوں کے مقابلے میں نمک مرچ ذرا کم ڈلتا ہے۔ تھوڑے سے مسالے تیز ہو گئے تھے اور تو کوئی خرابی نہیں تھی مگر وہ دونوں مل کر کباب ہاتھوں میں اٹھا کر حیرت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''واقعی یہ لوکی کے کباب ہیں؟ کیا لوکیوں پر اتنا برا وقت آچکا ہے۔ ویسے یہ لوکی کالے رنگ کی کب سے ہونے لگی؟''

داجی اور طیب انکل کھانے کی میز پر موجود نہیں تھے اسی لیے ان دونوں کا حوصلہ اور بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس لیے اس وقت وہ علی کی شکل دیکھتے ہی آگ بگولہ ہوگئی تھی۔ چلو دانش تو تھا ہی سدا کا بدتمیز مگر یہ علی بڑی بہن کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے ذرا شرم نہ آئی تھی۔

''کیا کام ہے تمہیں، جلدی سے پھوٹو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' شیریں نے علیا کے تیور بھانپتے ہوئے فوراً کہا تھا۔

''وہ شیریں آپی! مجھے دراصل آپ لوگوں سے تھوڑی سی ہیلپ چاہیے تھی۔'' وہ سر کھجاتے ہوئے مصالحانہ انداز میں بولا تھا۔

''اصل میں آج ہم لوگوں کی نیٹ پریکٹس ہے، کل فائنل ہے نا ہم لوگوں کا۔ آپ لوگوں کو تو پتا ہی ہے آپ کا بھائی ٹیم کا کیپٹن ہے اور اگر کیپٹن ہی نیٹ پریکٹس کے وقت موجود نہ ہو تو ٹیم کا مورال کون بڑھائے گا۔''

اس کی شکل پر ڈھیر ساری معصومیت اور اپنائیت چھلکنے لگی تھی۔ علیا کو اس کی معصوم شکل دیکھ دیکھ کر غصہ چڑھ رہا تھا جبکہ زرین کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ بات تو سب ہی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ طاہرہ آنٹی بچوں کی پڑھائی کے معاملے میں جتنی سخت اور ظالم تھیں ان سے یہ توقع رکھی ہی نہیں جاسکتی تھی کہ وہ علی کے ٹیوشن پڑھنے کے ٹائم پر اسے کرکٹ کھیلنے کی اجازت دے دیتیں۔ کرکٹ کھیلنے کی اجازت بھی اسے داجی کی وجہ سے ملی ہوئی تھی جن کا خیال تھا کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کود بھی بچوں کی صحت کے لیے ضروری ہوتے ہیں ورنہ طاہرہ آنٹی کا بس چلتا تو وہ چوبیس گھنٹے علی کو کتابوں میں کھویا ہوا دیکھنا پسند کرتیں۔ جب سے وہ نائنتھ کلاس میں آیا تھا پڑھائی کے معاملے میں سختیاں اور بھی بڑھ گئی تھیں۔

''میٹرک اور انٹر کے چار سال کیریئر کے اہم ترین سال ہوتے ہیں۔ جنہیں کچھ بننا ہوتا ہے وہ ان چار سالوں میں دن رات ایک کر دیتے ہیں پڑھائی میں۔'' صبح شام یہ جملے علی کی سماعتوں کی نذر کیے جاتے۔

''میری پیاری بہنو! میں آپ لوگوں کی مدد کا طالب ہوں۔ مما تو کھانے کے بعد سونے لیٹ جائیں گی، آپ لوگ کچھ ایسا چکر نہیں چلا سکتیں کہ سر آج نہ آئیں۔ اگر وہ نہیں آئے تو میرا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔'' وہ باقاعدہ منت پر اتر آیا تھا۔

''کیا آپ لوگوں کا G-4 گروپ اتنا بے بس ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔''

وہ ان لوگوں کو خاموش بیٹھا دیکھ کر جذباتی بلیک میلنگ پر اتر آیا۔ ان لوگوں کا گروپ G-4 گروپ کہلاتا تھا اور یہ نام زرین کا تجویز کردہ تھا۔ G-4 دراصل Genius-4 کا مخفف تھا۔

''ٹھیک ہے ہم تمہاری مدد کے لیے تیار ہیں لیکن اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا۔'' جویریہ نے فوراً کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی پر عمل کیا تھا۔

''جو آپ لوگ چاہیں گی میں کروں گا۔ بس پلیز میری مشکل آسان کروا دیں، میرا آج جانا بہت ضروری ہے۔''

اس کا منت بھرا انداز دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی علی ہے جو پرسوں شیریں کی فرینڈز کی آمد کے موقع پر سموسے لا کر دینے سے صاف انکار کر چکا تھا۔ اس کا ہمیشہ یہی انداز ہوا کرتا تھا مطلب کے وقت ہاتھ پاؤں جوڑنے کھڑا ہو جاتا اور مطلب پورا ہوتے ہی تم کون ہم کون۔ اس کی طوطا چشمی اور مطلب پرستی ان سب کی ہی جان جلاتی تھی۔

''ٹھیک ہے، لیکن اس بار ہم تمہارے وعدوں پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس لیے کہ اس سلسلے میں تمہارا ریکارڈ خاصا خراب ہے۔ ایک پاؤ املی، دو لیٹر گلوکی ونیلا آئس کریم اور آدھ درجن آلوؤں والے سموسے، بس یہ ہے ہم لوگوں کی ڈیمانڈ۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک ہے، تمہارا کام ہو جائے گا۔''

زرین نے جلدی سے سوچتے ہوئے ان چاروں کی پسندیدہ چیزوں کے نام لیے تھے۔ اس کا فرمائشی پروگرام سن کر وہ اچھل پڑا تھا۔

''رحم کریں مجھ پر، اتنے پیسے کہاں ہیں میرے پاس۔''

''اچھا بیٹا ہمیں چلا رہے ہو، کل داجی نے علامہ اقبال کے شعر کا دوسرا مصرع صحیح سنانے پر تین سو روپے کسے دیئے تھے۔'' جویریہ نے ابرو اچکا کر کہا۔

داجی بچوں کا ادبی اور علمی ذوق بڑھانے کے لیے اکثر بیٹھے بیٹھے اس طرح کے سوال پوچھا کرتے تھے۔ کبھی کسی مشہور شعر کا ایک مصرع سنا کر کہتے کہ جو دوسرا مصرع سنائے گا اسے انعام ملے گا۔

کبھی ''شاہد نے زاہد کو سو روپے ادھار دیئے، زاہد نے اگلے ماہ ان میں سے تینتیس روپے لوٹا دیئے لیکن پندرہ روز بعد اسے دوبارہ پیسوں کی ضرورت پڑی تو اس نے شاہد سے تہتر روپے مزید ادھار لیے۔ ایک سیکنڈ میں جواب دو کہ زاہد نے کل کتنے روپے ادھار لیے ہوئے ہیں۔''

وہ چاروں شعر و شاعری اور حساب کتاب دونوں ہی سے پناہ مانگتی تھیں۔ اشعار ان کے سروں کے کئی فٹ اوپر سے گزر جایا کرتے تھے اور حساب کتاب کا یہ عالم تھا کہ کبھی طاہرہ آنٹی، شگفتہ آنٹی یا دلہن چچی کے بغیر بازار چلی جاتیں تو اس فکر میں کہ کہیں دکان دار چکمہ نہ دے دے فوراً بیگز میں سے کیلکولیٹر نکل آتا تھا۔ اب چاہے دکان دار انہیں جلدی جلدی کیلکولیٹر پر ہاتھ مارتا دیکھ کر زیرِ لب مسکرا رہا ہے ان کی بلا سے۔ کوئی حرام کا پیسہ تو آ نہیں رہا تھا جو بندہ آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چاروں کبھی بھی انعام کی حقدار قرار نہیں پائی تھیں۔ زیادہ تر علی، دانش، دلہن چچی، چاچو یا اسد بھائی ہی انعام جیت لیا کرتے تھے۔ علی ان لوگوں کی یادداشت پر جز بز ہو رہا تھا دوسروں کی ٹوہ میں رہنا تو کوئی ان لوگوں سے سیکھے۔ حالانکہ جب داجی نے پیسے دیئے یہ لوگ تھیں بھی نہیں، پھر بھی پتا نہیں کہاں سے دیکھ لیے پیسے۔

''تمہیں منظور نہیں تو کوئی بات نہیں۔'' اسے سوچ میں دیکھ کر شیریں کندھے اچکا کر بولی۔

''نہیں نہیں مجھے منظور ہے۔'' وہ غصہ دباتے ہوئے نرمی سے بولا تھا۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ گدھے بلکہ گدھیوں کو باپ بنا لیا جائے۔

''جاؤ پھر کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ ہمیں ہمارا سامان لا دو اور پھر بے فکر ہو کر اپنی پریکٹس کرنے چلے جاؤ۔ ہم لوگ سب سنبھال لیں گے۔''

جویریہ نے بڑی بہنوں والے رعب سے کہا تھا۔ علیا اس تمام گفتگو کے دوران خاموش رہی تھی۔ علی کے کمرے سے نکلتے ہی وہ ان لوگوں پر بگڑی تھی۔

''کیا ضرورت ہے اس بدتمیز کو منہ لگانے کی۔ کل اس نے دانش کے ساتھ مل کر میرا کتنا دل جلایا تھا۔ اب کیسی معصوم شکل بنائے کھڑا تھا۔''

اسے رہ رہ کر اپنا کل کا مذاق اڑایا جانا یاد آ رہا تھا۔

''مما کو پتا چل گیا تو خوامخواہ ڈانٹ الگ پڑ جائے گی۔'' وہ ان لوگوں کو طاہرہ آنٹی کا نام لے کر ڈرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تھی۔

''کل کی بات تو تم رہنے ہی دو۔ تمہاری خاطر مروت میں ایک کباب کھا لیا تھا۔ رات بھر عجیب حالت رہی۔ دلہن چچی نے آج سارے کباب تھیلی میں بھر کر جنت کو دیے ہیں۔ یہ تو اماں ابا کا گھر ہے تو سب خاموش رہے سسرال میں اپنے عجوبے پکاؤ گی تو ساس ایسی ایسی سنائے گی کہ دانش کی باتیں سہنی مذاق محسوس ہوں گی۔''

جویریہ کبھی کبھی اس طرح کلمۂ حق بلند کر کے علیا کا دل جلایا کرتی تھی۔

''تم لوگوں کا جو دل چاہے کرو۔ میں کسی پروگرام میں شریک نہیں ہو رہی۔'' وہ جویریہ کے کمنٹس پر چڑ کر جلے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔ آپس میں ہی لڑنے لگیں۔ یار! سوچو کتنا مزہ آئے گا علی سے اتنی ساری چیزیں بھی بٹوریں گے اور اس کے سر کے ساتھ کیا کرنا ہے وہ بھی میرے ذہن میں آ گیا ہے اور یقین کرو، بڑا مزے دار آئیڈیا آیا ہے۔'' ان کے گروپ میں ترکیبیں سوچنے کا کام زرین کرتی تھی۔ سو اس نے فوراً ہی اپنی ذمہ داری پوری کر دی تھی۔ علیا اس کی بات کے جواب میں کچھ کہے بغیر ہنوز ناراض شکل لیے بیٹھی تھی۔

''غدار کی سزا موت ہے۔'' جویریہ نے اسے G-4 گروپ کے آئین کا ایک نکتہ یاد دلایا۔ جواباً وہ ناک سکوڑے خاموش رہی تھی۔

''سوچنے کا وقت نہیں ہے جلدی جواب دو، تم ہمارے ساتھ ہو یا نہیں۔ کوئی درمیانی حالت قابلِ قبول نہیں۔ اگر ہمارے ساتھ ہو تو بغیر چون و چرا ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ ورنہ.....''

شیریں نے پچھلے دنوں امریکی صدر کی تقریر ذرا زیادہ ہی غور و فکر سے دیکھ لی تھی۔ اسی لیے آج کل ہر بات میں اسی نوعیت کے جملے بولے جانے لگے تھے۔ ناچار اسے ان لوگوں کی بات ماننی ہی پڑی تھی۔ جتنی دیر میں علی ساری چیزیں لایا زرین سارا پروگرام ان لوگوں کے گوش گزار کر چکی تھی۔

''السلام وعلیکم!'' علی کے سر جو دانش کے دوست بھی تھے انہیں شیریں نے پرخلوص انداز میں سلام کیا تھا۔ ایسی جگہ جہاں بہت زیادہ معصومیت ظاہر کرنی ہوتی تھی شیریں کو آگے کیا جاتا تھا۔ اپنی بھولی بھالی شکل کا وہ خوب فائدہ اٹھایا کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت اور سادگی دیکھ کر کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ حسبِ پروگرام سر کی آمد پر گیٹ شیریں ہی نے کھولا تھا۔ وہ اس کے سلام کا جواب دیتا اندر آنے لگا تو شیریں جھٹ سے بولی۔

''سر! آج علی نہیں پڑھے گا۔ وہ ہماری دادی جان کی چھوٹی بہن کا انتقال ہو گیا ہے۔ پریشانی میں خیال نہیں رہا ورنہ آپ کو فون کر کے ہی منع کر دیتے۔ خوامخواہ آپ کا چکر لگا۔''

آنکھوں میں آنسو لیے وہ آہستہ آواز میں بولی تو سر کا دل ایک دم پسیج گیا۔

''نہیں نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے آپ لوگ بہت زیادہ پریشان ہوں گے۔'' وہ اس کی افسردہ شکل بڑے دکھ سے دیکھ رہا تھا۔ (شاید یہ لوگ ان سے بہت زیادہ پیار کرتے ہوں گے تب ہی بے چاری اتنی غمزدہ لگ رہی ہے۔)

سر نے بائیک اسٹارٹ کی تو شیریں ٹیرس پر سے جھانکتی زرین، علیا اور جویریہ کو انگلیوں سے وکٹری دکھاتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

سموسے تو ان لوگوں نے اسی وقت گرما گرم کھا لیے تھے۔ طاہرہ آنٹی سو کر اٹھیں تو از خود ہی سمجھ لیا کہ آج جواد نے چھٹی کر لی ہے۔ علی کی غیر موجودگی کے بارے میں البتہ انہوں نے زرین سے پوچھا تھا۔

''اس کے سر تو آئے نہیں تھے۔ دوپہر میں ایک گھنٹہ کیمسٹری پڑھ کر پھر وہ کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔''

انہوں نے بغیر کوئی اعتراض کیے گردن ہلا دی تو ان چاروں نے سکون کا سانس لیا مگر یہ سکون عارضی ثابت ہوا تھا۔ رات میں جب خوب نمک مرچ لگا لگا کر املی کھاتے ہوئے HBO پر My best friend's wedding دیکھی جا رہی تھی اس وقت علی دندناتا ہوا ان لوگوں کے کمرے میں گھسا تھا۔

''سر! اپنی امی کے ساتھ ابھی ابھی تشریف لائے ہیں۔'' وہ غصے سے بولا تھا۔

''ہائے اللہ وہ امی کو لے آئے۔ مجھے دوپہر کو ہی شک ہو رہا تھا میری طرف دیکھ بھی تو کیسی میٹھی میٹھی نظروں سے رہے تھے۔'' شیریں دوپٹے سے آنکھیں اور ناک صاف کرتے ہوئے اٹھلائی تھی۔

''بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔'' علی جل کر بولا تھا۔ ''پتا نہیں ان سے کیا کہا تھا کہ وہ اپنی امی کو لے آئے ہیں۔ پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے کس کے انتقال کی تعزیت کرنے آئے ہیں۔ جلدی جائیں، اب بیٹھی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہیں''

وہ اپنی متوقع ڈانٹ پھٹکار اور ان لوگوں کے بوگس پلان پر تپ رہا تھا۔ ہوائیاں تو ان لوگوں کی بھی اڑ گئی تھیں۔ جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کرتی شیریں اور جویریہ ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی تھیں تاکہ سچویشن کنٹرول کر سکیں۔

''بہت افسوس ہوا مجھے تو جب جواد نے بتایا میں اسی وقت سے آنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ خوشی میں انسان شریک ہو نہ ہو، غم میں تو ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہی چاہیے۔'' وہ دادی جان سے مخاطب تھیں جو انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں دادی جان اور دانش موجود تھے۔ حیرت تو دانش کے چہرے پر بھی چھائی ہوئی تھی مگر ان دونوں کو اندر آتا دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گیا کہ ضرور اس کے پیچھے انہیں لوگوں کی کوئی کارستانی ہے۔

''ویسے انہیں ہوا کیا تھا؟ کیا پہلے سے بیمار تھیں؟'' ان کے اپنائیت بھرے استفسار پر دادی انہیں یوں دیکھنے لگیں جیسے ان کی دماغی حالت پر شک کر رہی ہوں۔

''بیمار و یمار کیا آنٹی! اچھی بھلی بیٹھی پان لگا رہی تھیں کہ ہارٹ فیل ہو گیا، وہیں تخت پر ہی دم توڑ دیا۔ سب کہہ رہے تھے کہ چھوٹی اماں کا پانوں سے عشق اتنا شدید تھا کہ اس حال میں دم دیا کہ پاندان سرہانے، پان ایک ہاتھ میں اور سروتا دوسرے ہاتھ میں۔''

شریں دادی جان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی جلدی جلدی بولنا شروع ہو گئی تھی۔ اب جلدی میں بات سنبھالنے کی دھن میں اگر اوٹ پٹانگ باتیں منہ سے نکل رہی تھیں تب بھی خیر تھی۔

''دادی جان نے تو ان کے ہاتھوں کا لگا وہ پان بڑی احتیاط سے سنبھال کر اپنے پاس ہی رکھ لیا ہے۔''

دانش سنجیدگی سے بولا تو ان دونوں کے ساتھ ساتھ دادی جان اور جواد نے بھی چونک کر اسے دیکھا تھا جبکہ اس کی امی بڑے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''ظاہر ہے، اس میں سے بہن کے ہاتھوں کی خوشبو آ رہی ہوگی، صبر بھی آتے آتے ہی آئے گا۔'' وہ بے چاری پرانے وقتوں کی سیدھی سادی خاتون تھیں۔ جواد البتہ ان لوگوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے پاگلوں کو دیکھا جاتا ہے۔ مرنے والی سے زیادہ وہاں پان موضوع بحث بنے ہوئے تھے۔

''پان بھی تو وہ ایسے ویسے نہیں کھاتی تھیں، بڑی پہچان تھی انہیں پانوں کی۔ بنگلہ دیش سے آتے تھے ان کے لیے پان اور چھالیہ انڈیا سے۔ چھالیہ کھانے میں بھی ان کا یہ انداز ہوا کرتا تھا کہ اوپر اوپر کا کھوپرے والا پورشن کھایا کرتی تھیں باقی پھینک دیا کرتی تھیں۔''

دانش دادی اماں کی چھوٹی بہن کی یاد میں بڑے دکھ بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔ پانوں کی وہ خود بھی شوقین معلوم ہو رہی تھیں اسی لیے گفتگو کا رخ خود بخود پانوں ہی کی طرف مڑ گیا تھا۔ دنیا میں سب سے پہلے پان کی کاشت کس ملک میں ہوئی؟ کتھا کس نے ایجاد کیا اور چونا کس کی دریافت ہے۔ وہاں کافی دیر تک یہی باتیں ہوتی رہی تھیں۔

رخصت ہوتے وقت جواد دانش کے پاس آ کر سرگوشی میں کچھ بولا جس کے جواب میں دانش نے ہنستے ہوئے کچھ کہا تھا۔ بات کے اختتام پر وہ دونوں ہنس پڑے تھے۔ بات تو سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ دانش نے اسے صحیح بات بتا دی ہے۔

''جس گھر کے بڑوں کا یہ حال ہوگا وہاں کے بچے تو جو نہ کریں کم ہے۔'' دادی جان ان لوگوں پر برس رہی تھیں۔ ''کیا عزت رہ جاتی ان کی نظر میں ہم لوگوں کی اگر انہیں پتا چل جاتا کہ اس گھر کی لڑکیاں اتنی بے لگام اور بے ہودہ ہیں۔

تھوڑی دیر تو وہ چاروں سر جھکائے ڈانٹ پھٹکار سنتی رہیں مگر کب تک۔ دانش وہیں بیٹھا اس سچویشن کا مزہ لے رہا تھا یہی بات ان لوگوں کو مزید تپا رہی تھی۔

''آپ لوگ اتنی بے جا روک ٹوک کرتے ہی کیوں ہیں کہ بچے پھر اپنے لیے چور دروازے تلاش کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ بھئی اب ایک بچہ پڑھائی میں اچھا ہے۔ ہمیشہ اے اور اے پلس لاتا ہے تمام مضامین میں۔ اس پر اگر زبردستی کتابوں کو لادنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ ایسے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جائے گا۔ کم سے کم میں تو ایسی پڑھائی کو نہیں مانتی، کیوں داجی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔''

زرین نے خبرنامہ دیکھتے داجی کو شاملِ گفتگو کیا تھا۔ طاہرہ آنٹی خون آشام نگاہوں سے ان چاروں کو گھور رہی تھیں۔

''تمہاری تو میں ماں کو فون کرتی ہوں کہ بلاؤ اپنی صاحبزادی کو روز کوئی نہ کوئی نیا تماشا کھڑا کر کے رکھتی ہے۔ گھر کی باقی لڑکیوں کو بھی بگاڑ رہی ہے۔ پہلے ہی یہ کون سی تمیز دار تھیں، تمہارے ساتھ نے مزید چار چاند لگائے ہیں۔''

اپنے بارے میں اتنے برے ریمارکس پر وہ فوراً ہی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تھی۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ علی کو ڈانٹ نہیں پڑی تھی۔ طاہرہ آنٹی کو داجی نے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا تھا۔

''تم زیادہ ہی روک ٹوک کرتی ہو بچوں پر، میں خود علی کو موقع دیکھ کر سمجھا دوں گا۔

انہوں نے ان لوگوں کے جاتے ہی طاہرہ آنٹی سے کہا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اس گھر میں ان لوگوں کا سب سے اسٹرونگ ووٹ داجی کا تھا۔ وہ ان لوگوں کے سب سے بڑے حمایتی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان چاروں ہی کی وجہ سے اس گھر میں تمام تر رونق ہے۔ داداجی بولتے بولتے ان لوگوں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے انہیں داجی کہنا شروع کر دیا تھا اور ان لوگوں کی دیکھا دیکھی زرین بھی انہیں داجی ہی کہتی تھی۔

اسے اپنی ننھیال میں رہتے چار سال ہو گئے تھے۔ امی ابو اور دونوں چھوٹے بھائی ناروے میں رہتے تھے۔ امی کا اسے مستقل یہاں چھوڑنے کا ارادہ نہیں تھا، وہ تو بس یہ چاہتی تھیں کہ بیٹی چند ماہ کراچی میں رہ کر پاکستانی کلچر وغیرہ اچھی طرح سمجھ جائے مگر اس کا یہاں ایسا دل لگا کہ واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ تب ان چاروں نے فرسٹ ایئر میں ایک ساتھ ایڈمیشن لے لیا تھا اور انہیں دونوں G-4 بھی تشکیل پا چکا تھا۔ اب وہ صرف چھٹیوں ہی میں اوسلو امی ابو سے ملنے جایا کرتی تھی۔

''چھوڑو بھی تم، دادی جان کی باتوں کو دل سے لگانے کی کوئی ضرورت نہیں، انہیں بس عادت ہے ہم لوگوں کی برائیاں کرنے کی۔'' جویریہ بڑے دردمندانہ انداز میں زرین کو سمجھا رہی تھی جو اس وقت سے مسلسل منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

''خود کو تو کبھی توفیق ہوئی نہیں کہ مرحومہ بہن کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی یا کوئی نذر نیاز کروالیں، ہم نے اگر ان کی پندرہ سال قبل انتقال کی گئی بہن کا ذکر تازہ کر دیا تو گناہ گار ٹھہرے۔ بھئی سب نے ان کی مغفرت اور درجات کی بلندی ہی کے لیے دعا کی ناں، اس میں برائی کیا ہے اور ویسے بھی وہ ان کی بہن تھیں تو ضرور ان ہی جیسی ہوں گی۔ ویسے تو کوئی مشکل ہی سے مرحومہ کو اچھے لفظوں میں یاد کرتا ہوگا۔''

پوتیوں میں دادی جان کے سب سے برے تعلقات شیریں کے ساتھ تھے اسی لیے وہ جلے کٹے انداز میں بول رہی تھی۔ جب سے انہوں نے اس کے پارلر جانے پر پابندی لگائی تھی وہ ان سے سخت ناراض تھی۔ ''یہ بھی کوئی بات ہے، آئی بروز نہ بنواؤ گناہ ہوتا ہے، بال نہ کٹواؤ، اب گنتی کے چار بال ہیں سر پر زبردستی چوٹی رکھنے کا فائدہ بندہ کوئی اچھا سا کٹ ہی کروالے۔ کم از کم کچھ ماڈرن لک ہی آجائے گا۔''

''ہاں اور کیا شیریں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، بس تم اپنا موڈ ٹھیک کرلو۔'' جویریہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''تم لوگوں کی بے سروپا حرکتوں کی وجہ سے میرا مسئلہ درمیان میں ہی رہ گیا۔ اب بھی کسی کو توفیق نہیں ہو رہی کہ پوچھ ہی لے ''علیا پیاری تم اتنی اداس کیوں ہو۔''

علیا نے شکوہ کیا تو زرین سمیت وہ سب ایک دم ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ یہ تو ان کے گروپ کا سب سے اہم اصول تھا کہ کسی ایک کی پریشانی ان سب کی پریشانی تھی اور دوپہر میں وہ لوگ اسی وجہ سے تو علیا کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھی تھیں۔ دو تین روز سے ہی وہ انہیں بہت چپ چپ اور پریشان لگ رہی تھی۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور معمول کی شرارتوں میں بھی شامل نہیں ہو رہی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں ان لوگوں کا فکرمند ہونا لازمی تھا اور ابھی وہ وجہ دریافت کر ہی رہی تھیں کہ علی کی آمد نے سارا معاملہ ہی چوپٹ کر دیا تھا۔ سب کی توجہ خود پر مرکوز دیکھ کر علیا صاحبہ نے مزید دکھیاری شکل بنالی تھی۔ کافی دیر کی منت سماجت کے بعد اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا تھا۔

''G-4 کی عزت خاک میں ملنے والی ہے۔ میں فیل ہونے جارہی ہوں اور اس بار مجھے فیل ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔''

مسئلہ پریشان کن تو تھا مگر حیران کن نہیں۔ علیا کو دنیا کے ہر کام سے دلچسپی تھی سوائے پڑھائی کے۔ دانش تو اکثر طاہرہ آنٹی سے کہتا تھا۔

''آپ کے ڈنڈوں کی بدولت یہ بی ایس سی تک پہنچ گئی ہے ورنہ میرے حساب سے اس کا میٹرک سے آگے جانا مشکل تھا۔''

طاہرہ آنٹی گائنا کولوجسٹ تھیں۔ ان کا اپنا میٹرنٹی ہوم تھا۔ کتنا ارمان تھا انہیں کہ ان کے تینوں بچوں میں سے کوئی ایک ڈاکٹر بن جائے۔ جویریہ پڑھائی میں اچھی تھی مگر اس کا رجحان کمپیوٹر کی طرف تھا، علی کو میتھس میں بہت انٹرسٹ تھا یقیناً اس کا جھکاؤ انجینئرنگ کی طرف تھا، لے دے کر علیا ہی بچی تھی اور وہ اتنی نالائق ثابت ہوئی تھی کہ انٹر میں اتنے نمبر بھی نہیں لا پائی تھی کہ انٹرٹیسٹ میں بھی بیٹھ سکے۔ بی ایس سی میں داخلے کے وقت اسے سینٹ جوزف میں ایڈمیشن بھی حامد انکل کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مل سکا تھا۔ چار و ناچار وہ صبر کر گئی تھیں مگر یہ بات تو وہ یقیناً کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ ان کا کوئی بچہ سپلی لگوائے۔ پڑھائی کے معاملے میں جتنی دھمکیاں اور ڈانٹیں علیا نے سنی تھیں اتنی اس گھر کے کسی بچے نے نہیں سنی تھیں۔ ان کی ڈانٹ کے خوف سے کالج پابندی سے جاتی، تمام کلاسز اٹینڈ کرتی، شام میں کوچنگ سینٹر جاتی مگر فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔

''اب ضروری تو نہیں کہ اس گھر کے تمام بچے خوب عالم فاضل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلائیں۔ بھئی کسی کسی کا رجحان نہیں بھی ہوتا پڑھائی کی طرف اور ویسے بھی ذہانت ڈگریز کی محتاج نہیں ہوتی۔ شیکسپیئر کون سا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ ایڈیسن نے کون سا آکسفورڈ یا ہاورڈ سے ڈگری لی ہوئی تھی۔''

اپنے حق میں اس کے پاس اس قسم کے دلائل کا انبار تھا جنہیں وہ وقتاً فوقتاً اہلِ خانہ کے گوش گزار کرتی رہا کرتی تھی مگر ان کی سمجھ میں بات ہی نہیں آتی تھی۔ اس کی پڑھائی سے بیزاری کی سب سے بڑی گواہ یہ تینوں ہی تھیں۔ انٹر تک جب وہ سب ایک ہی کالج میں ساتھ ساتھ پڑھتی تھیں، ان لوگوں کو اس کی کتنی زیادہ مدد کرنی پڑتی تھی۔ فرسٹ ایئر میں فزکس کے پریکٹیکل کے وقت ایکسٹرنل کی نظروں سے بچ بچا کر اس کے ریڈنگ زرین نے لی تھی اور گراف جویریہ نے بنا کر دیا تھا۔ سیکنڈ ایئر کے امتحانوں میں جب اس کی کیمسٹری کی بالکل بھی تیاری نہیں ہو پا رہی تھی تو ان تینوں نے مل کر اسے اہم سوالات نکال کر دیئے تھے کہ یہی رٹ لو کم از کم پاسنگ مارکس تو آ ہی جائیں گے۔ تب بھی جس روز پیپر تھا اس کی حالت غیر تھی۔ رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔ زیادہ خوف اس بات کا تھا کہ اگر فیل ہوگئی تو مما قتل کر دیں گی۔

''کاش ہماری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو جائے۔'' پیپر دینے کے لیے سینٹر جاتے ہوئے راستے میں اس نے حسرت بھرے انداز میں کہا تو ڈرائیور نے بھی گردن گھما کر اسے بغور دیکھا تھا۔

''پاگل ہو رہی ہو، جو منہ میں آرہا ہے بکے جارہی ہو۔''

جویریہ نے اسے ڈانٹا تو وہ بے وقوفانہ انداز میں بولی۔ ''زیادہ شدید نہیں بس ہلکی پھلکی چوٹیں آئیں۔ آج کا پیپر دینے سے بھی جان چھوٹ جائے گی اور دادی جان، مما اور شگفتہ آنٹی ہم لوگوں کی خوب ناز برداری کریں گی۔''

ایکسیڈنٹ تو خیر ان لوگوں کا نہیں ہوا تھا مگر تب ہی ان تینوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ طاہرہ آنٹی کے ڈنڈے اور جوتے بھی آگے زیادہ دیر

کرب و بلا۔ اس نے صندل کا تختہ لگایا اس نے بیر کے چیلوں میں چھپایا۔ کسی نے بعد سنگ مرمر کا مقبرہ بنایا۔ کسی نے مرمر کے گور گڑھایا پایا۔ کسی کے مزار مطلا، منقش، رنگا رنگ ہے۔ کسی کی مانند سینۂ جاہل گور تنگ ہے۔''

''ذرا اس کی تشریح فرمائیں گی آپ آنسہ شیریں طیب صاحبہ! آپ کی اردو دانی کے تو ہم یوں بھی قائل ہیں۔'' پیراگراف پڑھ کر سنانے کے بعد وہ طنزیہ انداز میں بولی تھی۔

''اچھا چلیں اسے رہنے دیں ذرا اس شعر کا مطلب ہی سمجھا دیں۔''

کیا کیا الجھتا ہے تری زلفوں کی تار سے
بخیہ طلب ہے سینۂ صد چاک شانہ کیا

شیریں نے کچھ شرمندگی کے عالم میں گردن نفی میں ہلا دی تھی۔

''بھئی جیسی اردو ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں، ڈراموں اور فلموں میں سنتے ہیں وہی ہو تو مشکل کیا ہے۔ سارا مسئلہ تو یہ ہے کہ جو الفاظ کبھی کہیں سنے پڑھے نہیں وہ سمجھنے پڑ رہے ہیں اور فائدہ؟ جب یہ الفاظ عام بول چال اور لکھنے لکھانے میں کام نہیں آنے تو ضرورت انہیں سمجھنے کی۔'' وہ مقررانہ انداز میں بولی تھی۔

''لیکن داجی کہتے ہیں آج کل اخبارات میں چھپنے والی اردو بالکل بھی معیاری نہیں ہوتی اور فلموں اور ڈراموں کو تو خیر تم رہنے ہی دو۔ کتنی گھٹیا اردو بولی جاتی ہے۔ خاص کر فلموں میں تو بہت ہی تھرڈ کلاس الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔'' جویریہ نے سنجیدگی سے کہا تو علیا سر پیٹنے والے انداز میں بولی۔

''ہم لوگ یہاں اردو پر تو بحث کرنے بیٹھے نہیں تھے۔ مجھے نہیں لگتا تم لوگ میری کوئی مدد کر پاؤ گی۔ یہاں علمی بحثیں چھڑی رہی گی اور وہاں امتحان سر پر آ جائیں گے۔'' وہ جل کر بولی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے تمہاری سب باتیں ٹھیک ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تم چاہتی کیا ہو؟'' زرین نے اہم ترین نکتہ اٹھایا تھا۔

''یہ کیا ہے نا تم نے عقل مندی کا سوال۔'' وہ خوش ہو کر بولی تھی۔

''زرین پلیز میری بہن! کوئی ترکیب سوچو۔ ایسی ترکیب کہ میری امتحان دینے سے بھی جان چھوٹ جائے اور مما ناراض بھی نہ ہوں۔'' وہ زرین کا ہاتھ پکڑ کر ملتجیانہ انداز میں بولی تھی۔

''کیا؟'' وہ تینوں چلائی تھیں۔ ''تم امتحان ہی نہیں دینا چاہتیں؟''

''ہاں تو اور اتنی دیر سے کیا سمجھا رہی ہوں، بھئی تم سب اچھی اچھی بھاری بھرکم پڑھائیاں کر تو رہی ہو۔ ایک میرے نہ پڑھنے سے قیامت تو نہیں آ جائے گی۔'' وہ اطمینان سے بولی تھی۔

دو تین روز تو وہ لوگ اسے مختلف طریقوں سے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ تعلیم کی اہمیت وغیرہ پر لمبی لمبی تقریریں ہوئیں مگر نتیجہ وہی

تک علیا بیگم کو چلنے نہیں دیں گے۔

انٹر کے بعد زرین نے ایس ایم سی میں ایڈمیشن لے لیا تھا اور تب ہی سے وہ طاہرہ آنٹی کی بہت پسندیدہ بن گئی تھی۔ چلو اپنی بیٹی نہ سہی نند کی بیٹی ہی سہی، گھر کا کوئی ایک بچہ تو ڈاکٹر بن جائے۔ انہوں نے صبر کرلیا تھا۔ شیریں کراچی اسکول آف آرٹ میں گرافکس کے شعبے میں تھی۔ اس شعبے کی جتنی ڈیمانڈ اور اسکوپ ہے اسی حساب سے سب نے اسے خوب سراہا تھا۔ جویریہ کراچی یونیورسٹی سے بی سی ایس کررہی تھی۔ جویریہ اور علیا جڑواں تھیں۔ شکل وصورت میں بہت زیادہ مشابہت کے باوجود ان میں اتنا فرق بہرحال تھا کہ لوگ انہیں آسانی سے پہچان لیا کرتے تھے۔ لمبے قد، براؤن آنکھوں اور کرلی بالوں والی جویریہ تھی اور نسبتاً چھوٹے قد، کالی آنکھوں، لمبے سلکی بالوں اور بے تحاشا گوری رنگت والی علیا تھی۔

''یار! تم ہمت کرو، چلو ہم لوگ تمہیں پانچ سال کے پیپرز میں سے امپارٹنٹ نکال کردے دیں گے۔ تم رٹے مار لینا۔'' کتنی دیر سے وہ سب اسے سمجھا رہی تھیں۔

''بس تم خود کو کمپوز کرو۔ کوئی نہیں تم فیل ویل ہو رہیں، اس سے پہلے تمہیں انٹر میں بھی یہی لگ رہا تھا اور بی ایس سی پارٹ ون میں بھی تم یہی کہہ رہی تھیں۔''

مگر وہ سختی سے اپنے موقف پر جمی ہوئی تھی۔

''تب کی بات اور تھی۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کتاب کھولتے ہی ایک کے دو نظر آنے لگیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں کیمسٹری کے نوٹس کھولوں تو دل گھبرانے لگتا ہے، بک ہاتھ میں لوں تو چکر آنے شروع ہوجاتے ہیں اور اردو کا تو پوچھو ہی مت۔ سر درد سے پھٹنے لگتا ہے، ہاتھ پاؤں میں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔'' وہ تفصیلاً اپنی ساری کیفیت بتا رہی تھی۔

''میرا بس چلے تو یہ منحوس کیمسٹری جس نے ایجاد کی تھی اس کا گلا دبا دوں اور اردو۔'' اس نے دانت کچکچائے تھے۔ ''یہ شاعروں کو اتنے زیادہ عشق کس خوشی میں ہوتے تھے اور اگر ان کے محبوب کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑی جیسے ہیں اور قد بوٹا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔'' وہ تپے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

''اچھا اور باقی سبجیکٹس؟'' جویریہ نے پوچھا تو وہ ذرا سا سر جھکا کر شرمندگی سے بولی۔

''باقی سب سبجیکٹس کی بھی کوئی خاص تیاری نہیں مگر کیمسٹری اور اردو میں تو سپلی لازمی ہے۔ کیمسٹری میں نہ تو کوئی Equation یاد ہو پا رہی ہے نہ Derivations اور فارمولے۔'' اس کے جواب پر شیریں فوراً بولی تھی۔

''چلو کیمسٹری کو جانے دو لیکن اردو میں اگر سپلی لگی تو پھر تو واقعی طاہرہ آنٹی کے بقول تمہیں چلو بھر پانی میں ڈبکی لگا ہی لینی چاہیے۔ اگر بندہ اپنی قومی زبان میں فیل ہوجائے تو اس سے بڑی شرمناک بات اور کیا ہوسکتی ہے۔''

شیریں کے شرم دلانے والے انداز پر وہ بری طرح چڑ کر ایک دم اٹھی اور رائٹنگ ٹیبل سے اردو کی کتاب اٹھاتے ہوئے بولی۔

''انجامِ شاہ و گدا دو گز کفن اور تختہ و تابوت سے سوا نہیں۔ کسی نے ادھر سایا محمودی کو دیا یا تحریر کربلا کسی کو گزی گاڑھا میسر ہوا، بہ صد

ڈھاک کے تین پات۔ جب اگلا بندہ کچھ سمجھنے یا سننے پر آمادہ ہی نہ ہو تو سب سمجھانا اور قائل کرنا بے کار ہے۔

''سیدھی سی بات ہے میں آگے پڑھنا ہی نہیں چاہتی، فیل ہو کر ذلیل ہونے سے بہتر ہے کہ عزت سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔''

وہ سنجیدگی سے دوٹوک انداز میں بولی تو ان لوگوں نے بھی مزید سمجھانے بجھانے کا ارادہ فی الفور ملتوی کر دیا اور تمام تر حقائق کی روشنی میں یہی فیصلہ کیا گیا کہ علیا کی مدد کی جائے۔ زرین رات کو دیر تک لیٹی اسی بارے میں سوچتی رہی تھی۔ ایسا کیا ہو کہ علیا امتحان بھی نہ دے اور طاہرہ آنٹی کو کوئی اعتراض بھی نہ ہو، مزید یہ کہ آئندہ کے لیے بھی اس کی پڑھائی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے۔ سوچتے سوچتے اچانک اس کے ذہن میں ایک شاندار آئیڈیا آیا تھا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''علیا! اٹھو، میرے پاس تمہارے مسئلے کا بڑا زبردست اور رنگا رنگ حل نکل آیا ہے۔''

اپنے برابر سوئی ہوئی علیا کو اس نے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا تھا۔ وہ نیند میں ہونے کے باوجود ایک دم پرجوش ہو گئی تھی۔

''جلدی بتاؤ۔'' وہ بے تابی سے بولی تو زرین بیڈ پر سے اترتے ہوئے کہنے لگی۔

''ایک ساتھ سب کو بتاؤں گی، چلو ان لوگوں کے کمرے میں چلیں۔''

وہ دونوں سوتے سے اس طرح اٹھائے جانے پر پہلے تو ناراض ہوئیں مگر جیسے ہی پتا چلا کہ زرین ترکیب سوچ چکی ہے جو کہ بقول اس کے نہایت عالیشان اور معرکتہ الآرا ہے وہ سارا غصہ بھول بھال اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''جلدی سے بتاؤ۔'' تینوں ہم آواز ہو کر بولی تھیں۔

''شادی۔'' وہ ایک لفظ بول کر خاموش ہو گئی تو تینوں بے چینی سے بولیں۔

''صحیح سے پوری بات بتاؤ، شادی کیا؟''

''ارے احمقو! علیا کی شادی اور کس کی، اس مسئلے کا یہی حل ہے کہ امتحانوں سے پہلے پہلے اس کی شادی ہو جائے۔ شادی کے بعد ویسے بھی اکثر شوہر اور سسرال والے اپنی تمام وعدوں سے مکر جاتے ہیں اور لڑکی کو ادھوری تعلیم مکمل نہیں کرنے دیتے۔ اس لیے ابھی اگر انہوں نے طاہرہ آنٹی سے ایسا کوئی وعدہ کر بھی لیا تو بے فکر رہو، وہ کبھی ایفا نہیں ہوگا۔''

اس کے اطمینان سے کہنے پر جویریہ نے اچنبھے سے پوچھا تھا۔ ''یہ انہوں نے کون ہیں؟''

''بھئی اس کے ہونے والے سسرالی۔'' وہاں انداز ہنوز قابلِ رشک حد تک اطمینان لیے ہوئے تھا۔

''اور یہ سسرالی کیا اچانک آسمان سے ٹپکیں گے؟''

علیا کا سارا جوش و خروش ختم ہو گیا تھا۔ اتنی فضول ترکیب جس کے پورا ہونے کے دور دور تک کوئی آثار نہیں تھے۔ پچھلے دنوں ایک پروپوزل آیا بھی تھا تو شیریں کے لیے اور جسے بغیر چھان بین کے ہی مسترد کر دیا گیا تھا ''ابھی بچی پڑھ رہی ہے۔'' ایسے میں اس کا رشتہ آنا اور پھر قبول بھی کر لیا جانا ناممکنات میں سے تھا۔

''اب آسمان سے ٹپکیں گے یا زمین سے اگیں گے یہ سب مجھے نہیں پتا میرا کام ترکیب بتانا تھا سو وہ میں نے پورا کر دیا۔ تھوڑا سا تم لوگ بھی اپنے اپنے دماغوں کو استعمال میں لے آؤ۔'' وہ ان لوگوں کے سڑے ہوئے منہ دیکھ کر ناراضی سے بولی تھی۔

''یار! کوئی اور ترکیب سوچ لو پلیز۔'' علیا التجائیہ انداز میں بولی تو زرین سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

''اس کے علاوہ اور کوئی معقول ترکیب ذہن میں نہیں آ رہی۔ ہاں ایک ترکیب تھی تمہاری بیماری کی ایکٹنگ کرنے کی مگر اپنی ڈاکٹر مما کے سامنے تمہاری یہ ایکٹنگ کامیاب نہیں ہو پائے گی بلکہ بھانڈا پھوٹ جانے پر فیل ہونے والی ذلت سے بھی زیادہ شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔''

وہ دوٹوک انداز میں بولی تو دل ہی دل میں سب ہی نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

''لیکن شادی ہو جانا کون سا اپنے ہاتھ میں ہے اور چلو فرض کر لو کہ کہیں سے کوئی رشتہ آ جاتا ہے تب بھی مما تو کبھی نہیں مانیں گی۔ رشتہ اگر زیادہ ہی اچھا لگ گیا تو بہت سے بہت منگنی کر دیں گی یعنی امتحانوں سے جان تو تب بھی نہیں چھوٹے گی۔'' جویریہ نے بڑا اہم نکتہ اٹھایا تھا۔

Divide and rule (لڑاؤ اور حکومت کرو) کا سنہری اصول انگریزوں نے اسی دن کے لیے ایجاد کیا تھا۔ نانی تو ویسے بھی لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں نہیں ہیں۔ شگفتہ آنٹی بھی طاہرہ آنٹی جتنی کٹر نہیں ہیں تعلیم کے معاملے میں۔ اگر ہم کوشش کریں تو اس ایشو پر گھر کی خواتین کو تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک بار نانی کو شیشے میں اتار لیا تو بس کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔ طاہرہ آنٹی کے تمام اعتراضات کو بہ یک جنبش قلم مسترد کر دے گی ہماری گھر کی سپریم کورٹ۔''

زرین نے سمجھانے والے انداز میں اپنی بات کی وضاحت کی تھی۔

''آگے تک کی پلاننگ ہوئی چلی جا رہی ہے، میں پوچھتی ہوں یہ رشتہ آئے گا کہاں سے؟'' علیا کلس کر بولی تھی۔

کافی دیر بحث و تکرار کے بعد بھی جب کوئی نتیجہ ہاتھ نہیں آیا تو آخر کار انہوں نے یہی طے کیا کہ سب اپنے اپنے طور پر غور کریں اور کل رات ہونے والی میٹنگ میں سب اپنے اپنے آئیڈیاز پیش کریں گے پھر جس کا سب سے معقول آئیڈیا ہوا اس کو شرف قبولیت بخش کر فوراً عملی اقدامات کیے جائیں گے۔

☆

صبح ناشتے کی میز پر طاہرہ آنٹی نے اورنج جوس پیتی علیا کو ٹوکا۔

''ڈھنگ سے پورا ناشتہ کرو۔ خالی ایک گلاس جوس سے کوئی پیٹ بھرتا ہے۔ امتحان سر پر ہیں صحیح سے کھاؤ گی نہیں تو پڑھا کیا خاک جائے گا۔'' سال کے چھ مہینے علیا ڈائٹنگ پر رہا کرتی تھی۔

''مما! میں نے ایک ہفتے میں چار پاؤنڈ وزن بڑھایا ہے اسی لیے احتیاط کر رہی ہوں۔'' طاہرہ آنٹی کے سامنے وہ بے چاری ہمیشہ بھیگی بلی بن جایا کرتی تھی۔

''ربش۔'' وہ جواباً بڑبڑائی تھیں۔ ''بجائے ان فضولیات میں پڑنے کے پڑھائی پر توجہ دے لو اور یہ تمہاری امتحان کی تیاری کیسی ہو رہی ہے؟''

ان کا اگلا سوال خاصا دل دہلا دینے والا تھا۔ اس کی ہونق شکل دیکھ کر ان تینوں ہی کو رحم آ گیا تھا۔

''تیاری تو اس کی ہمیشہ ہی اے ون ہوتی ہے، افسوس صرف اتنا ہے کہ پہلے بورڈ والوں کو اور اب یونیورسٹی والوں کو اس سے پتا نہیں کیا دشمنی ہے کہ ہر بار بے چاری کی پوزیشن آتے آتے رہ جاتی ہے۔''

دانش نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کے جواب دینے سے پہلے ہی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

''بالکل پرفیکٹ تیاری چاہیے مجھے امتحانوں کی، فرسٹ ڈویژن کی تو خیر میں نے آس نہیں لگائی کیونکہ فرسٹ ڈویژن لانے والی شکلیں ایسی نہیں ہوتیں مگر سیکنڈ ڈویژن مجھے ہر قیمت پر چاہیے۔'' دانش کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر وہ سخت لہجے میں علیا کو دھمکیاں دیتی ٹیبل سے اٹھ گئی تھیں۔

''یہ تو واقعی قتل ہو جائے گی طاہرہ آنٹی کے ہاتھوں۔'' شیریں نے زرین کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

ناشتے کی میز پر ہونے والی اس خطرناک گفتگو نے ان لوگوں کو ترکیبیں سوچنے کے معاملے میں مزید متحرک کر دیا تھا۔ رات میں جب میٹنگ شروع ہوئی تو جویریہ سب سے پہلے بولی۔

''سب نے کیا کیا ترکیبیں سوچی ہیں یہ بتانے سے پہلے میں ایک خاص پوائنٹ کی طرف سب کی توجہ مبذول کروانا چاہتی ہوں۔''

''ارشاد ارشاد۔'' سب نے کورس میں اجازت دی تھی۔

''سب سے پہلے ہمیں اپنا ووٹ بینک مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر میں یہ بات شیریں اور زرین سے کہنا چاہتی ہوں جو آئے روز دادی جان سے جھگڑے مول لیتی رہتی ہیں۔ داجی تو ہیں ہی ہماری طرف، اگر دادی جان، شگفتہ آنٹی، چاچو، پاپا اور طیب انکل بھی ہماری طرف آ جائیں تو مخالفین کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ جائے گی۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے دادی جان کے ساتھ تعلقات خوشگوار بنائے جائیں۔'' اس کا مشورہ سب ہی کو پسند آیا تھا۔

''اب اگر دادی جان تمہیں کالج سے آتے ہی فوراً نہانے کا حکم دیں تو تم بحث نہیں کرو گی۔'' اب کے مخاطب زرین تھی۔ سدا کی وہمی اور صفائی پسند دادی جان کو اس کا کالج سے آ کر بغیر نہائے کھانے کی میز پر بیٹھنا سخت کھلتا تھا۔

''پتا نہیں کتنے مردوں کی چیر پھاڑ کر کے آئی ہو، جاؤ پہلے نہا کر آؤ۔''

اتنی شدید بھوک کے عالم میں یہ حکم اسے بہت ناگوار گزرتا تھا اور تقریباً روزانہ ہی اس ایشو پر ان دونوں کے درمیان بحث و تکرار ہوتی تھی۔ اس کے کمرے میں رکھی انسانی جسم کے مختلف حصوں کی ہڈیوں سے تو انہیں بے پناہ گھن آتی تھی۔ دانش انہیں گھن دلانے کے لیے اور نئی سے نئی باتیں لاتا۔

''دادی جان ان نیم حکیموں کے حوالے ڈائریکٹ انسانی جانیں تو کی نہیں جا سکتیں۔ پتا ہے آپ کو یہ لوگ چھپکلیوں، سانپوں، خرگوشوں اور چوہوں وغیرہ پر پہلے تجربات کرتے ہیں۔'' اور چوہوں کا نام سنتے ہی انہیں ابکائیاں آنی شروع ہو جاتیں۔

''ٹھیک ہے یار! اپنی علیا کی خاطر دن میں تین چار بار نہانا بھی سہہ لیں گے۔'' اس نے مجبوراً ہامی بھری تھی۔

''اچھا بھئی اب سب اپنی اپنی ترکیبیں سنائیں۔ سب سے پہلے علیا کی باری ہے۔'' زرین کی بات سنتے ہی وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''میں جتنی پریشان ہوں تم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس وقت میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا۔ کوئی ترکیب، کوئی حل نہیں سوجھ رہا، مما کا خوف دوسری ہر بات پر غالب ہے۔'' اس کے مایوسی بھرے انداز پر تاسف کا اظہار کرتی وہ لوگ شیریں کی طرف متوجہ ہوئی۔

''بھئی میرے ذہن میں تو صرف اک ہی بات آئی ہے اور وہ یہ کہ اخبار میں ضرورتِ رشتہ کا اشتہار دے دیا جائے۔'' اپنی بات مکمل کر کے ان لوگوں کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کیے بغیر وہ ہاتھ میں تہہ کیا ہوا ایک کاغذ کھول کر دکھانے لگی۔

''یہ دیکھو میں نے اشتہار ترتیب بھی دے لیا ہے۔'' کاغذ ان لوگوں کو دکھاتے ہوئے وہ خود ہی پڑھ کر سنانے لگی۔

''ایک لڑکی عمر 19 سال، رنگ گورا بلکہ بے تحاشا گورا، قد بوٹا یعنی پانچ فٹ، تعلیم؟ لکھ پڑھ لیتی ہے۔ سیاں جی کو چٹھی لکھ لیا کرے گی اور دھوبی کا حساب کتاب بھی معقول انداز میں کر لے گی۔ بل کھاتی سیاہ گھنی زلفیں، ناک ستواں، آنکھیں ہرنی جیسی کے لیے ارجنٹ ہم پلہ رشتہ درکار ہے۔ یہاں ارجنٹ سے مراد واقعی ارجنٹ ہے۔ وہ تمام حضرات جن کی نانیوں، دادیوں، اماؤں، یا اباؤں کو اپنا آخری وقت قریب نظر آ رہا ہو اور اپنے لاڈلے پوتے، نواسے یا بیٹے کے سر پر اپنی زندگی میں سہرا دیکھنا چاہتے ہوں فوری رجوع کریں کیونکہ اس اکیسویں صدی کی سنڈریلا کی دو تین ماہ کے اندر اندر شادی ہونا ضروری ہے ورنہ بے چاری عالمِ بالا پہنچا دی جائے گی۔

نوٹ! مائیں اور بہنیں جو اپنے بیٹوں یا بھائیوں کے لیے چاندسی بہو بھابی ڈھونڈ رہی ہیں کے لیے نادر موقع ہے کیونکہ لڑکی پھیکا شلجم یعنی پوری کی پوری چاند کا ٹکڑا ہے۔''

علیا کے علاوہ وہ سب بری طرح ہنس رہی تھیں۔ جویریہ تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے ان تینوں کو ہنستا ہوا دیکھتی رہی پھر ایک دم غصے سے اٹھی اور بغیر کچھ کہے دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگی تو وہ لوگ ہنسی کو بریک لگا کر جلدی سے اسے منانے اٹھیں۔

''نہیں سن رہی میں تم لوگوں کی کوئی بات، میری زندگی اور موت کا سوال ہے اور تم لوگوں کو ہری ہری سوجھ رہی ہے۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے چلائی تھی۔

''یار! ہم لوگ تو سنجیدہ ہی تھے یہ شیریں صاحبہ ہی کو بے وقت کا مذاق سوجھا تھا۔'' زرین اسے مناتے ہوئے بولی تو شیریں کندھے اچکا کر بولی۔

''اب کوئی اور آئیڈیا آ ہی نہیں رہا تھا تو میں کیا کرتی۔ اگر تم لوگوں سے یہ کہتی کہ کچھ سمجھ نہیں آیا تو بھی صلواتیں سننی پڑتیں اس لیے جو ایک بات ذہن میں آ رہی تھی بتا دی۔ اس کے علاوہ تو مجھے نہیں پتا رشتہ کیسے ملے گا وہ بھی فوراً۔

''پھر تم لوگ مجھ سے بھی ناراض ہو گی، اس لیے میں پہلے ہی بتا دوں۔ میرا آئیڈیا بھی شیریں سے ملتا جلتا ہی ہے۔ اس نے اخبار میں اشتہار والی بات سوچی تھی میں نے یہ سوچا تھا کہ آج کل شادیوں سے متعلق اتنی ساری نئی نئی ویب سائٹس بن گئی ہیں تو کیوں نہ ایسا کریں ان میں سے تین چار میں علیا کا نام رجسٹر کروا دیں۔ میرے پاس ایسی پانچ سائٹس کے بارے میں معلومات ہیں جہاں آپ اپنے تمام کوائف اور مطلوبہ شریکِ حیات کے متعلق اپنی ڈیمانڈ بتا کر اپنا نام وہاں رجسٹر کروا سکتے ہیں۔''

وہ ڈرتے ڈرتے ایک نظر سب کے چہروں پر ڈالتے ہوئے بولی تھی۔ انٹرنیٹ میں اسے جتنی دلچسپی تھی اس لحاظ سے وہ یہی مشورہ دے سکتی تھی۔

''تم دونوں کے مشورے انتہائی فضول ہیں۔ تم سے بہتر تو میں ہوں کم از کم میں نے ایسی بات تو سوچی ہے جو مشکل سہی پر ناممکن ہرگز نہیں ہے۔'' زرین ان دونوں کی طرف ملامتی نظریں ڈالتے ہوئے بولی تھی۔

''مجھے تم سے ہی امید تھی زرین! ان دونوں کے خیال سے تو ہم یہاں ہنسی مذاق کرنے جمع ہوئے تھے۔'' علیا نے شیریں کو بطور خاص غصے سے دیکھا تھا۔ ''اچھا اب جلدی سے بتاؤ نا۔'' وہ بے قراری سے بولی۔ تھوڑی دیر کا ڈرامائی وقفہ زرین نے سب کے تجسس کو بھڑکانے کے لیے دیا تھا۔

''میں نے جو بات سوچی ہے اس کا پس منظر یہ خیال تھا کہ انسان کوئی بھی کام سب سے پہلے اپنے گھر سے شروع کرتا ہے۔ بھئی میں باہر سے رشتہ کیوں ڈھونڈوں جبکہ میرے اپنے گھر میں خیر سے دو عدد خوبرو، ذہین قابل اور برسرِ روزگار لڑکے موجود ہیں۔''

''تمہاری مراد اسد بھائی اور دانش سے ہے۔'' شیریں نے احمقوں کی طرح سوال پوچھا تھا۔

''خاصا اسٹوپڈ کوئسچن ہے، خیر جانے دو۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟'' وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔

''مجھے پتا ہے تم لوگوں کو میری بات بڑی عجیب سی اور ناقابلِ عمل لگ رہی ہوگی مگر میری سوئیٹ کزنز یہی ایک آخری راستہ ہے ہمارے پاس۔ اب اتنی جلدی کہیں سے کوئی لڑکا ڈھونڈنا وہ بھی ایسا جو طاہرہ آنٹی اور انکل کے معیار پر پورا اترے بہت ہی مشکل بات ہے۔'' کچھ دیر تک ان لوگوں کے تاثرات کا بنظرِ غائر جائزہ لینے کے بعد وہ بولی تھی۔

''دانش کا تو خیر تم نام ہی نہ لو، ذلیل آدمی، صبح ناشتے کی میز پر کیسا میرا مذاق اڑا رہا تھا اور اسد بھائی کا بھی تو کچھ کہہ نہیں سکتے ہو سکتا ہے وہ پہلے سے کسی کو پسند کرتے ہوں۔''

علیا کی بات پر شیریں کی بہنوں والی غیرت جو اکثر سوئی رہتی تھی یکا یک جاگ اٹھی۔

''یہ تم میرے بھائی کو گالیاں کس خوشی میں دے رہی ہو۔''

''ہاں بڑا اچھا ہے تمہارا بھائی خود کو بڑا عالم فاضل سمجھتا ہے، ذرا سا انجینئرنگ کے فائنل ایئر میں فرسٹ پوزیشن کیا آگئی خود کو نیوٹن اور آئن اسٹائن کے جتنا غیر معمولی جینئس سمجھنے لگے ہیں۔ چھچھوروں کی طرح کنووکیشن کے دن کی گولڈ میڈل لیتے وقت کی تصویر کمرے میں انلارج کروا کر اس زاویہ سے لگائی ہے کہ اندر آنے والے کسی بھی شخص کی سب سے پہلی نظر اس پر پڑے۔''

دانش سے جتنی خار وہ کھاتی تھی شاید ہی کوئی دوسرا اس سے اتنا چڑتا ہو۔

''دوسروں میں پھوٹ ڈلواتے ڈلواتے ہم میں خود ہی پھوٹ پڑ گئی۔ یہ G-4 میں میرا بھائی اور میری بہن قسم کے الفاظ کب سے استعمال ہونے لگے۔'' ان دونوں کا لڑائی کا موڈ دیکھ کر زرین نے بڑی آپاؤں کی طرح جھاڑ پلائی تھی۔ دانش کے ساتھ ساتھ اس وقت علیا شیریں سے بھی ناراض تھی۔ آخر اشتہار لکھ کر اس نے اس کا مذاق اڑانے کی بیہودہ کوشش جو کی تھی۔

''ہم سب یہاں اپنی پڑھائی کا انتہائی قیمتی وقت تمہاری خاطر قربان کر کے تمہارا ہی مسئلہ حل کر رہے ہیں لہٰذا تم یہ چھوئی موئی والا انداز ترک کر کے ذرا تحمل سے سب کی باتیں سنو۔ ہر وقت ناک پر دھرا یہ غصہ تمہارے کسی کام نہیں آئے گا۔ ذرا سا کسی کا مذاق برداشت کرنے کا حوصلہ بھی نہیں ہے تم میں۔''

جویریہ نے اسے بڑی سختی سے ڈانٹا تھا۔ اسے فارغ کر کے وہ زرین سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں اسد بھائی اور دانش کے بارے میں۔''

''میں یہ کہہ رہی تھی کہ شیریں کی اسد بھائی سے اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے، وہ انہیں ٹٹولے، میرے دانش کے ساتھ تم لوگوں کے مقابلے میں خاصے بہتر تعلقات ہی میں اسے کریدتی ہوں۔ کیا پتا جواب ہمارے حسبِ منشاء نکل آئے۔ آخر ناولوں اور افسانوں میں یہی تو ہوتا ہے۔ بہت سارے کزنز ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ بظاہر آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں جیسے دانش اور علیا یا پھر ذرا سنجیدہ اور بڑے بھائیوں والا انداز رکھتے ہیں جیسے اسد بھائی مگر اندر ہی اندر اپنی شوخ و شریر نٹ کھٹ سی کزن پر مرتے ہیں۔ پھر ایک دن ہیرو کی مرضی جاننے کے بعد گھر کے بڑوں کی بند کمرے میں خفیہ میٹنگ ہوتی ہے۔ کزن پارٹی کو اس خفیہ اجلاس کی رپورٹ حاصل کرنے کی بے قراری ہوتی ہے۔ ہیرو سب کچھ جاننے کے باوجود معصوم اور انجان بنا اپنی بے خبر خود میں مگن کزن کو چپکے چپکے میٹھی نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے۔ منگنی کا دن آجاتا ہے ہیروئن کو نہیں پتا ہوتا کہ آج دیگر کزنز کے ساتھ ساتھ اس کی بھی منگنی ہے۔ دراصل گھر کے بڑوں نے سب بچوں کے رشتے اسی روز طے کر کے ایک ہی دن منگنی کرنے کا فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ شام میں جب ہیروئن ڈھیر ساری موتیے کی کلیاں اور گلاب کے پھول بڑی سی تھالی میں بھر کر لے جا رہی ہوتی ہے عین اس وقت اس کے ہاتھوں سے تھالی گرتی ہے جب ہیرو سامنے آتا ہے۔ سارے پھول ہیرو کے قدموں میں بکھر جاتے ہیں اور۔''

''اور گھنی مونچھوں تلے اس کے لب ذرا سا مسکراتے ہیں۔ بس آگے کیا ہوتا ہے ہمیں بھی معلوم ہے۔''

شیریں نے اسے بے زاری سے ٹوک دیا تھا۔ زرین کی بے وقت کی راگنی ان میں سے کسی کو بھی پسند نہیں آئی تھی۔ اتنے اہم ایشو پر بات ہو رہی ہے اور محترمہ پتا نہیں کہاں نکل گئیں۔

''نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔ نہیں سننا چاہ رہیں تم لوگ تو مجھے بھی سنانے کا کوئی شوق نہیں۔ ویسے میں صرف یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ کیا پتا اسد بھائی یا دانش میں سے کوئی ایک اپنی علیا پر چپکے چپکے مرتا ہو۔ بھئی معجزے اسی دنیا میں ہوتے ہیں۔''

ان لوگوں کے چہروں پر لکھا ناممکن پڑھتے ہوئے وہ اپنی بات میں زور پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تھی۔

''معجزے ولیوں، بزرگوں اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کے ساتھ پیش آتے ہیں زرین شہزاد صاحبہ!'' جویریہ طنزیہ انداز میں بولی تھی۔

''خیر کوشش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔'' شیریں نے جویریہ سے کہا تو علیا نے بھی کچھ سوچتے ہوئے گردن اقرار میں ہلا دی تھی۔

''بس اب تم دانش کے ساتھ ذرا لڑنا جھگڑنا کم کر دو۔'' زرین اور شیریں نے اسے سمجھایا تھا۔

☆

''اچھا یہ بتائیں آپ کیسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ بہت خوبصورت یا بہت پڑھی لکھی یا بہت گھریلو اور مشرقی قسم کی۔'' وہ انگلیوں پر گنواتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

وہ اس کے بچکانہ انداز میں خوش ہونے پر مسلسل مسکرا رہے تھے۔

''بتائیں نا!'' انہیں چپ دیکھ کر اس نے اصرار کیا تھا۔

''شیریں! اچھا ہوا یہ بات تم نے مجھ سے خود ہی کر لی۔ دراصل میں خود بھی کافی دنوں سے تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ پندرہ بیس روز پہلے ممی اور ڈیڈی بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھ چکے ہیں اور دادی جان کا تو تمہیں پتا ہے۔ پچھلے دو سالوں سے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ اب تم لوگ دس گھر جھانکو، اچھی بھلی لڑکیوں میں عیب نکال کر گناہ گار بنو، بس یہی سب سوچ کر تم لوگوں کو اس زحمت سے بچانے کے لیے تمہاری ہونے والی بھابھی تو میں منتخب کر چکا ہوں اس لیے میں نے تم سے بات کرنے کا سوچا تھا اور دیکھو دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میری چھوٹی سویٹ سی بہن نے بھائی کے کہے بنا ہی سارا مسئلہ حل کر دیا۔''

اس کے ارمانوں پر اوس پڑ چکی تھی۔ ''یہ اسد بھائی بظاہر کتنے شریف لگتے ہیں اور اندر سے پورے ہیں۔ چپکے چپکے لڑکی بھی پسند کر لی۔ ویسے لگتا ہے کسی لڑکی کو آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں ہوں گے۔'' وہ ان کے کسی دوست کی بہن تھی۔ شیریں غیر دلچسپی سے ساری تفصیلات سن رہی تھی۔

''ہوں بڑی سیدھی اور معصوم ہے۔'' وہ اسد بھائی کی اس کی شان میں کی گئی تعریفوں پر جل کر سوچ رہی تھی۔ ''اتنی تو سیدھی ہیں محترمہ کہ بھائی کے دوست کو پھنسا لیا۔ ہاں اتنا ہینڈسم اور کوالیفائیڈ بندہ کسے برا لگتا ہے۔''

اب وہ صرف اور صرف نند بن کر سوچ رہی تھی۔ علیا کی بات دوسری تھی۔ اس کے ساتھ شاید وہ نندوں والا سلوک نہ کرتی مگر وہ سیدھی اور بھولی حسینہ، نہ میں نے ناک میں دم کر کے رکھا تو میرا نام شیریں طیب نہیں۔

اسد بھائی سے وعدہ کر کے کہ وہ ان کی پسند کے بارے میں آج ہی ممی کو بتا دے گی کمرے سے نکل آئی تھی۔

''کیسا رہا؟''

''کیا کہا اسد بھائی نے؟''

''یقیناً یہی کہا ہوگا ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ سب بھانت بھانت کی بولیاں بول رہی تھیں جبکہ وہ غمزدہ انداز میں دونوں ہاتھ لٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔

''شیریں! کیا ہوا ہے تم اتنی چپ کیوں ہو؟'' اس کی خاموشی سے وہ سب دہل گئی تھیں۔

''مجھے معاف کر دینا علیا!'' وہ شرمندگی سے سر جھکا کر بولی تھی۔ ''معجزے اسی دنیا میں ہوتے ہیں مگر تم شاید وہ خوش قسمت نہیں جس کے ساتھ کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔''

اس کے مایوسی بھرے انداز پر وہ سب بھی گردنیں لٹکا کر ارد گرد بیٹھ گئی تھیں۔ کافی دیر تک ان میں سے کوئی بھی نہیں بولا تھا۔

اگلے روز شیریں کو اسد بھائی سے بات کرنی تھی، اس کی گفتگو کے نتیجے میں اگر کوئی مثبت بات سامنے آجاتی تو پھر زرین کو دانش سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی علیا مجبوراً گدھے کو باپ بنا تو رہی تھی مگر وہ سب ہی جانتی تھیں کہ دانش سے اس کی دشمنی خاصی شدید نوعیت کی ہے۔ شام میں آفس سے آنے کے بعد کچھ دیر ستا کر اسد بھائی جم چلے جایا کرتے تھے۔ شیریں نے مناسب یہی سمجھا جب وہ جم سے آجائیں پھر موقع دیکھ کر بات کی جائے۔

''میں اندر آجاؤں اسد بھائی؟'' ان کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ چوکھٹ کے پاس کھڑی ہو کر پوچھ رہی تھی۔ وہ کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے۔ اس کی آواز پر گردن موڑ کر خوش دلی سے بولے۔

''آؤ شیریں، کہو کوئی کام ہے؟''

''کیوں کیا میں آپ کے پاس ہمیشہ کسی کام سے ہی آتی ہوں۔'' وہ بیٹھتے ہوئے برا مان کر بولی تھی۔ جواباً وہ مسکرا دیئے تھے۔

''نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا بھئی آخر میری بہن صاحبہ G-4 گروپ کی انتہائی سینئر اور ذمہ دار عہدیدار ہیں، اتنی بھاری ذمہ داریاں کندھوں پر ہیں کہ فارغ وقت کم ہی ملتا ہے۔''

وہ اکثر اسی طرح ان کے گروپ کا نام لے کر ان لوگوں کو چھیڑا کرتے تھے۔

''کیا کر رہے ہیں؟'' اسے اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے دشواری ہو رہی تھی۔ وہ اتنا زیادہ بھائیوں والا انداز رکھتے تھے کہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کسی کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

''اپنی Mails چیک کر رہا ہوں۔'' وہ دوبارہ مونیٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے تھے۔

''اسد بھائی! کتنے سالوں سے ہمارے گھر میں کوئی شادی نہیں ہوئی۔ اب دیکھیں چاچو کی شادی کو بھی چھ سات سال تو ہو ہی گئے ہیں اور بشریٰ باجی کی شادی کو بھی پانچ سال ہو گئے ہیں۔'' انہوں نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب ہمارے گھر میں ایک عدد بھابھی آجانی چاہیے۔'' اس نے خود کو دل ہی دل میں ڈانٹا تھا۔

''لعنت ہے تجھ پر شیریں اتنی سی بات نہیں بولی جا رہی۔ بھئی آخر بہنوں کو بھائیوں کی شادی کا ارمان ہوتا ہی ہے۔''

''بالکل صحیح، میں خود کہتا ہوں آجانی چاہیے۔'' ان کا جواب خاصا غیر متوقع تھا۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ پتا نہیں کتنی دیر کی بحث و تکرار کے بعد کہیں جا کر وہ آمادہ ہوں گے۔

''یعنی آپ راضی ہیں۔'' اس نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

''ہاں!'' خاصا مطمئن انداز تھا۔ وہ خوشی کے مارے ایک دم بیڈ سے اچھل کر ان کے پاس آگئی تھی۔

''تھینک یو اسد بھائی! اف مجھے کتنی ایکسائٹمنٹ ہو رہی ہے۔ آپ کی شادی میں کتنا مزہ آئے گا۔'' ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہ خوشی سے بولی تو وہ بھی مسکرا دیئے تھے۔

''وہ ایک محترمہ ہیں مریم نام کی، جو مسز اسد طیب ہونے کا اعزاز حاصل کریں گی۔'' کچھ دیر بعد وہ خود ہی بولنا شروع ہوگئی تھی۔

رات گئے تک ان سب پر مایوسی سوار ہو رہی تھی۔

''یار! ہم لوگ تو اس طرح ہمت ہار کر بیٹھ گئے ہیں جیسے دنیا ہی ختم ہوگئی ہو۔'' جویریہ کی بات پر باقی سب نے اداسی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی دانش سے بات ہونا باقی ہے اور فرض کرو کہ وہ بھی کسی اور کو پسند کرتا ہے تب بھی دنیا میں لڑکے ختم تو نہیں ہو گئے۔'' وہ سب کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اور یکھو جب دنیاوی اسباب کے لحاظ سے آپ کو ایسا لگنے لگے کہ کوئی راستہ نہیں بچا تب بھی ایک راستہ تو ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

''میرا مطلب دعا سے ہے۔ ہم سب اپنے اپنے طور پر جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے مگر اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی تو مدد مانگنی چاہیے۔ یہ دیکھو میں اسٹڈی سے داجی کی ''اعمال قرآنی'' اٹھا کر لے آئی ہوں۔ اس میں یقیناً شادی کے لیے بھی کوئی نہ کوئی وظیفہ دیا ہوا ہوگا۔''

وہ کتاب ان لوگوں کے سامنے کرتے ہوئے بولی تھی۔ ان سب میں سب سے زیادہ جویریہ کا مذہب کی طرف رجحان تھا۔ بات بات پر نفلیں مانا کرتی تھی۔

''جویریہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' علیا کو خود بھی آج کل اللہ تعالیٰ بہت یاد آ رہا تھا۔ زرین اور شیریں کے مایوس چہروں پر بھی امید کی کرن لہرائی تھی۔ وہ کتاب ہاتھ میں لیے ان تینوں کے درمیان بیٹھ گئی تھی۔ جلدی جلدی صفحے پلٹتے ہوئے شادی کا وظیفہ ڈھونڈا جا رہا تھا۔

''لڑکیوں کی شادی میں تاخیر ہو رہی ہو تو بعد نماز تہجد ان اسمائے مبارکہ کا ورد کرنے کے بعد خوب گڑگڑا کر بارگاہِ خداوندی میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے دعا کریں۔ دعا کرتے ہوئے جتنی رقت طاری کی جائے اتنا اچھا ہے۔ انشاءاللہ جلد نصیب کھلیں گے۔''

شیریں نے با آواز بلند پڑھا تو وہ سب بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے تفصیل پڑھنے لگیں۔

''تہجد کے وقت؟'' علیا بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

''یار! کوئی اور آسان سا وظیفہ ڈھونڈ دو۔ میرا فجر میں اٹھنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ تہجد میں کیسے اٹھوں گی۔'' وہ منمنائی تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں کوئی اور وظیفہ ڈھونڈنے کی، دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے وہ۔ دیکھو صرف اکیس دن تو پڑھنا ہے، چٹکی بجاتے گزر جائیں گے اکیس دن۔'' جویریہ اسے سمجھا رہی تھی۔

''نیک کام میں دیر کیسی، آج سے ہی وظیفہ شروع کر دو۔'' ان تینوں نے اسے سمجھایا تھا۔

☆

الارم علیا کے سر پر بج رہا تھا اور وہ بے ہوش پڑی تھی۔ زرین کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کتنی آوازیں دینے کے بعد کہیں جا کر محترمہ جاگی

تھیں۔ اسے اٹھا کر زرین کی دوبارہ آنکھ لگ گئی۔ سوتے میں کروٹ بدلی تو اس کے ہاتھ پر ہاتھ پڑا تھا۔

''اٹھیے مہارانی صاحبہ۔'' وہ اس کے سر پر چلا رہی تھی۔ اب کی بار اسے واش روم میں دھکیلنے کے بعد بھی وہ نہیں سوئی تھی۔ جب تک کہ وہ جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے کھڑی نہیں ہوگئی زرین جاگتی رہی۔

وہ پابندی سے وظیفہ پڑھ رہی تھی۔ دانش سے الجھنا بھی چھوڑا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسے لڑنے کے لیے اکساتا لیکن وہ نظر انداز کر دیتی۔ زرین اور شیریں کی دادی جان کے ساتھ معمول کی جھڑپیں نہیں ہو رہی تھیں۔ کالج سے آ کر وہ سب سے پہلے نہاتی پھر کوئی اور کام کرتی۔ یہاں تک کہ اس روز جب دوپہر کے کھانے کے وقت دادی جان نے شیریں کا دل جلایا شیریں تب بھی خاموش رہی تھی اور اپنی چپ سے سب کو حیران کر گئی تھی۔

''یہ کیا دلہن چچی آپ نے آج پھر میٹھے میں کچھ نہیں بنایا۔'' اسے کھانے کے بعد سویٹ ڈش بے حد مرغوب تھی۔ اور کچھ نہ ہوتا تو کھجور یا گڑ تک سے کام چلا لیا کرتی تھی۔

''ہاں ہاں دلہن، میٹھا تو تمہیں ضرور بنانا چاہیے تھا۔ بڑی کمائیاں جو کر کے لائی ہیں صاحبزادی۔''

دادی جان کو ''کمائیوں'' کے طعنے دینے کا بہت شوق تھا۔ کمانے کا طعنہ دے کر وہ ہمیشہ اس کی غیرت کو للکارا کرتی تھیں۔

''کچھ کما کر لائی ہو جو اتنے نخرے دکھا رہی ہو۔'' وہ کہتیں تو جواباً چڑ کر کہتی۔

''آپ عورتوں کی ایسی ہی باتوں نے تو مردوں کو ساتویں آسمان پر چڑھا رکھا ہے۔ مطلب یہ کہ جو کما کر لا رہا ہے وہ سر پر جوتے بھی مارے تو کھا لو۔''

حقوقِ نسواں اس کا پسندیدہ موضوع تھا مگر اور سب کے ساتھ ساتھ خود دادی جان کی حیرت کی بھی انتہا نہ رہی جب وہ جواب میں کچھ بولے بغیر صبر شکر کر کے پانی پی کر ٹیبل سے اٹھ گئی تھی۔

☆

''زرین کہاں ہے؟'' دانش دروازے پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔

''وہ دلہن چچی کے ساتھ طارق روڈ گئی ہے، کوئی کام ہے تو مجھے بتا دو۔'' علیا نے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں رہنے دو اسی سے کام تھا۔'' وہ واپس مڑا تو پیچھے سے اس کی آواز آئی۔

''چائے بنوانی ہے؟'' دانش نے پورے شہر میں جس قدر دوستیاں پال رکھی تھیں اس حساب سے یہی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس کی زرین سے دوستی کا سبب بھی یہی تھا اس کے دوست بلا ناغہ تشریف لاتے اور وہ بغیر تیوری پر بل لائے نہ صرف یہ کہ چائے بنا دیتی بلکہ اکثر شامی کباب، سموسے یا رول وغیرہ بھی فرائی کر کے دے دیا کرتی۔ اپنے باقی گروپ ممبران کے برخلاف وہ کوکنگ میں خاصی ماہر تھی اور کچن کے کام کرنا اسے کبھی بھی برا نہیں لگتا تھا۔

''میں بنا دیتی ہوں۔''

''تم؟'' وہ آنکھوں میں استعجاب لیے اسے دیکھتا رہا تھا جبکہ وہ جلدی سے کچن میں گھس گئی تھی۔ آج تو دوست بھی ایک آدھ نہیں پوری پلٹن تھی۔ اس کے ڈھیر سارے دوستوں کے لیے چائے کے ساتھ ساتھ خوب سارے لوازمات بڑے قرینے سے ٹرالی میں سجا کر اس نے علی کے ہاتھ بھجوا دیے تھے۔

شام میں ان لوگوں کو اپنی کارکردگی کے بارے میں بتایا تو سب نے شاباش دی تھی۔

اسی روز ان لوگوں نے زرین کو دادی جان کے کمرے میں بھیجا تھا۔

''ذرا انہیں اور ممی کو ہموار تو کرو، تم ویسے بھی ہم چاروں میں چھوٹی ہو، تمہارے کہنے پر انہیں شک بھی نہیں ہوگا کہ اپنے بارے میں بات کر رہی ہے۔ یہی سوچیں گی کہ تم ہم لوگوں کے لیے ان سے بات کر رہی ہو۔'' شیریں نے تجویز دی تھی۔

''لائیں نانی! میں آپ کے سر میں تیل لگا دوں۔'' وہ ان کے پاس بیٹھی لگاوٹ سے کہہ رہی تھی۔

''خیال آ گیا تمہیں بوڑھی نانی کا۔'' انہوں نے حسب عادت طنز کیا تھا۔ شگفتہ آنٹی بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

''کس نے کہا آپ بوڑھی ہوگئیں، میری فرینڈز تو کہتی ہیں کہ تمہاری نانی کتنی ینگ لگتی ہیں، تم لوگوں سے زیادہ فریش اسکن ہے ان کی۔'' ایسی بات جو اس کی دوستوں نے کبھی بھی نہیں کی تھی کہہ کر اس نے انہیں مکھن لگانے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ حسب توقع تھا، اپنی عمر کے بارے میں تمام خواتین اتنی ہی حساس ہوتی ہیں۔ ان کا موڈ کافی بہتر ہوگیا تھا۔ اس سے تیل لگواتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگی تھیں۔

''کیا؟ آپ کی شادی تیرہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی۔''

ہزار دفعہ کی سنی ہوئی بات پر وہ یوں حیران ہو رہی تھی جیسے آج پہلی مرتبہ یہ بات اس کے علم میں آئی ہو۔ ''واقعی آپ دادی سے بارہ سال چھوٹی ہیں۔''

اس کی حیرانی پر شگفتہ آنٹی نے بھی تعجب سے سر اٹھا کر بغور اسے دیکھا تو وہ کچھ کھسیانی سی ہوگئی جبکہ نانی اس کے اتنی زیادہ دلچسپی لینے پر مزید تفصیلات سنانے لگی تھیں۔

''ارے تم لوگوں کی طرح نہیں تھا ہمارا زمانہ، آج کل کی پچیس سال کی لڑکیاں بچیاں بنی گھومتی ہیں۔ مائیں نہ کوئی سلیقہ سکھاتی ہیں نہ سینا پرونا، موئی پڑھائیاں ہی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ مائیں بھی ''ابھی بچی ہے'' کہہ کر جان چھڑا لیتی ہیں۔ ہم تو پچیس سال کی عمر میں بچپن، جوانی سب گزار کر سمجھو بڑھاپے میں داخل ہوگئے تھے اور یہ تم اپنے دادی کو کم نہ سمجھو اب جتنے نرم خو ہیں۔ پہلے اتنے ہی تنک مزاج، بات بات پر مزاج بگڑ جاتا تھا۔''

وہ اپنے پسندیدہ موضوع پر بولنے کی قدرت رکھتی تھیں۔

''نانی! آپ کے خیال میں لڑکیوں کی شادی کی صحیح عمر کیا ہے؟'' وہ مطلب کی بات کی طرف بڑی ہوشیاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔

''میری پوچھو تو سترہ اٹھارہ سال میں لڑکی کو رخصت کر دینا چاہیے۔'' وہ فوراً بولی تھیں۔

''نانی کے حساب سے تو میں بھی لیٹ ہوگئی ہوں۔'' اس نے فوراً سوچا تھا۔

''صحیح کہہ رہی ہیں آپ، بچیاں جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائیں اتنا اچھا ہے۔'' وہ پکا سا منہ بنا کر دادی اماؤں کی طرح بولی تھی۔ شگفتہ آنٹی کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

''میں نے تو ایک جگہ حدیث بھی پڑھی ہے کہ والدین کو اپنے بچوں کی شادی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ اب دیکھیں لڑکوں کا تو یہ مسئلہ ہے کہ کمانے لگیں، صحیح سیٹ ہو جائیں ورنہ کون اپنی بیٹی دے گا لیکن لڑکیوں کے ساتھ تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں پھر خوامخواہ دیر کیوں کی جائے۔ کالجوں یونیورسٹیوں کے دھکے کھا کھا کر شکلوں پر پھٹکار پڑ جاتی ہے اور کچھ نہیں تو آنکھوں پر دو دو من کی عینکیں لگ جائیں گی۔ حال سے بے حال حلیہ بگڑا ہوا، آنکھوں کے نیچے حلقے، نہ چہرے پر شگفتگی نہ تازگی، چلی آ رہی ہیں۔ پوچھو تو کوئی ڈاکٹر ہے، کوئی ایم اے، کوئی ایم ایس سی، کوئی انجینئر، کوئی سی اے پھر اتنا پڑھ جائیں تو ہم پلہ رشتہ ڈھونڈنا الگ دردسری۔ اب اگر لڑکی ایم اے پاس ہے تو ماں باپ کسی پی ایچ ڈی کیے ہوئے بندے کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں اور آج کل یہی تو فرق ہے۔ پہلے بس اچھا شریف کھاتا کماتا لڑکا دیکھا اور بیٹی بیاہ دی اب تو جی پہلے ڈگریز دیکھی جاتی ہیں پھر بات آگے بڑھتی ہے۔'' اس نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی تھی۔

انہوں نے تو خود اپنی دونوں بیٹیاں بھی کم عمری میں بیاہ دی تھیں۔ لڑکیوں کا زیادہ پڑھنا انہیں پسند نہیں تھا مگر نئے زمانے کے نئے انداز دیکھ کر خاموشی سادھے رکھتی تھیں۔ اپنے مطلب کی بات اس سے سن کر انہیں حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک وہاں اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ خود شگفتہ آنٹی کا موقف بھی یہ تھا کہ اگر دورانِ تعلیم بہت اچھا رشتہ آ جائے تو اسے قبول کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

☆

''یہ مٹھائی کہاں سے آئی؟'' کچن میں رکھا مٹھائی کا ڈبا دیکھ کر زرین نے دلہن چچی سے پوچھا تھا۔

''سمیرا کی منگنی کی مٹھائی ہے۔'' وہ کیک بیک کرنے کی تیاری کر رہی تھیں، انڈے توڑ توڑ کر سفیدی اور زردی الگ الگ پیالوں میں نکال رہی تھیں۔

''اچھا تو سمیرا بیگم کی منگنی ہوگئی۔''

سمیرا ان کے برابر والے گھر میں رہتی تھی اور اپنی بے پناہ اوچھی حرکتوں کے سبب ان چاروں کی انتہائی ناپسندیدہ شخصیات میں شمار ہوتی تھی۔ ابا ان کے دبئی میں کمار ہے تھے اور اماں بیٹیاں یہاں ان کی محنت کی کمائی لٹا رہی تھیں۔

''آنا نا تم دیکھنے ڈیڈی نے سونی کا نیا سی ڈی پلیئر بھجوایا ہے۔''

''بھائی نے مجھے سالگرہ پر گولڈ کی چین دی ہے یہ دیکھو۔''

''یہ سوٹ میں بریزے سے لائی تھی، زیادہ مہنگا نہیں ہے، اب اس مہنگائی میں چھ سات ہزار روپے کی ویلیو ہی کیا ہے۔''

''ڈیڈی کہہ رہے تھے پیسوں کی پرواہ مت کرو، جتنے کا بھی ہے ''پینٹیم فور'' خرید لو، میں چاہتا ہوں میرے بچوں کے پاس بالکل نئے ماڈل

کا کمپیوٹر ہو۔'' ہر ملاقات میں وہ اسی نوعیت کی گفتگو کیا کرتی تھی۔ اس کی سوچ کپڑوں جوتوں اور کاسمیٹکس سے آگے جاتی ہی نہیں تھی، کافی سالوں تک ٹام کروز کا پوسٹر اپنے بیڈروم میں لگائے رکھنے کے بعد اب اس نے اس کی جگہ ریتھک کا پوسٹر لگالیا تھا۔

وہ کمرے میں آئی تو چونکانے والے انداز میں سمیرا کی منگنی کی خبر ان لوگوں کے گوش گزار کی۔

''بڑی نئی خبر ہے۔'' علیا جل کر بولی تھی۔

''خود لے کر آئی تھیں محترمہ مٹھائی، جس لڑکی کو دیکھو اس کی منگنی اور شادی ہو رہی ہے، ایسا لگتا ہے کسی نے ہم لوگوں پر تو بندش کرا رکھی ہے۔'' وہ چڑ چڑے انداز میں بولی تو رائٹنگ ٹیبل پر کتاب پڑھتی ہوئی شیریں ایک دم گردن گھما کر بولی۔

''ہم لوگوں پر نہیں صرف تم پر، تمہارے علاوہ فی الحال ہم تینوں میں سے کسی کا بھی آئندہ چار پانچ سال تک شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''صحیح بات ہے، ہم سب ابھی سنجیدگی سے صرف پڑھائی کی طرف توجہ رکھنا چاہتے ہیں۔'' جویریہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''ویسے ہوئی کہاں اس کی منگنی؟'' زرین کو تجسس ہوا تھا۔

''بالکل غیر ہیں لڑکے والے، کسی فنکشن میں دیکھ کر موصوف نے خاتون کو پسند کرلیا، کہہ رہی تھی جھٹ پٹ منگنی ہوئی ہے۔ شادی بھی دو تین مہینوں کے اندر اندر ہو جائے گی۔ ہم نے تو ہر جتن کرلیا، دعائیں بھی کرلیں لیکن فائدہ کچھ نہیں ہوا۔'' وہ بڑے ماتمی انداز میں بول رہی تھی۔

رات میں سمیرا ان لوگوں سے ملنے آئی تو ان لوگوں نے یہی سوچا کہ جو لڑکی اپنے کپڑوں جوتوں اور جیولری کی نمائش کرتے نہیں تھکتی، منگنی ہو جانے پر تو وہ جتنا چھچھورا پن نہ دکھا دے کم ہے، غالب امکان یہی تھا کہ چونکہ صبح زرین، شیریں اور جویریہ سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی تو اب انہیں اپنی منگنی کا آنکھوں دیکھا حال سنانے تشریف لائی ہیں۔

''بھائی ابھی ابھی تصویریں ڈویلپ کروا کر لائے تھے۔ میں نے سوچا تم لوگوں کو اپنی منگنی کی تصویریں ہی دکھا دوں۔ اصل میں ہم نے صرف خاندان کے قریبی لوگوں کو انوائیٹ کیا تھا، ممی کہہ رہی تھیں خوامخواہ لوگ نظر لگا دیتے ہیں اس لیے زیادہ لوگوں کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تو ویسے ہی جس کو دیکھو ہم سے جلتا ہے، پتا نہیں لوگ دوسروں کی خوشیوں سے جلتے کیوں ہیں۔''

ان سب میں سے یہ جملے سب سے زیادہ علیا کو کھل رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ براہِ راست اسے ہی کہہ رہی ہے۔ وہ البم کھول کر ان لوگوں کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

''یہ میری ساس، یہ نند، یہ دیور، یہ جٹھانی۔'' وہ مختلف لوگوں کی طرف اشارے کرتے ہوئے بڑے میٹھے لہجے میں بتا رہی تھی۔

''بے چاری۔'' ساس کا ذکر ہونے پر علیا، شیریں کے کان میں بولی تھی۔ ''جس کے نصیب میں اتنی خطرناک بہو لکھی ہو، اس سے زیادہ بد قسمت اور کون ہو سکتا ہے۔''

''کیا ہوا تم کچھ کہہ رہی ہو؟'' سمیرا نے اسے کان میں کھسر پھسر کرتے دیکھ کر پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی سیدھی ہو گئی۔

''اور یہ وہ ہیں۔'' کچھ شرماتے ہوئے ''وہ'' کی رونمائی ہوئی تھی۔

علیا کے کلیجے میں ایک دم ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ ''اس اول جلول سے منگنی ہونے پر صرف سمیرا ہی خوش ہو سکتی ہے۔'' اس نے خود سے کہا تھا۔ عجیب ہونق سا بال اڑے اڑے سے ہر تصویر میں منہ کھلا ہوا، اچھا خاصا باؤلا لگ رہا تھا۔

''لگتا ہے پیدائش کے بعد اس کے حفاظتی ٹیکے نہیں لگے۔'' جویریہ کی سرگوشی علیا کے لیے تھی مگر سن زرین نے بھی لی تھی۔ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے میں اسے خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔ علیا تو تھی ہی ایسی اس سے نہ غصہ کنٹرول ہوتا تھا نہ ہنسی۔

''ارے وہ نہیں ہوتے اسپیشل بچے ویسا لگ رہا ہے۔'' زرین شیریں کے کان میں بولی تھی۔

''بہت ہینڈسم ہیں تمہارے منگیتر، سوڈیشنگ، بس اب تم رےتھک کا پوسٹر ہٹا کر ان کی تصویر لگا لو۔''

سمیرا ان لوگوں کے تاثرات سے بھانپ گئی تھی کہ یقیناً اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے اسی لیے چہرے کے زاویے بگڑنا شروع ہو گئے تھے۔

''رےتھک کا ہٹا کر کیوں اس کے برابر میں اور نیچے لکھ دو Beauty and the beast'' علیا کی سرگوشی مکمل تو نہیں لیکن beast تو اس کے کانوں تک پہنچ ہی گیا تھا۔ منہ پھول گیا تھا۔ اب وہ بڑے غصے سے ''سسرال سے منگنی پر گولڈ کے پانچ سیٹ آئے اور منگنی کی انگوٹھی De beers کی تھی'' بتا رہی تھی مگر آتے وقت والا جوش و خروش ختم ہو چکا تھا۔ البم ختم ہوتے ہی وہ ان لوگوں کے بہت روکنے پر بھی نہیں رکی تھی۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ لوگ کافی دیر تک تبصرہ کرتی رہی تھیں۔ علیا کا جو صبح سے موڈ آف ہوا ہوا تھا وہ بھی بتدریج بہتر ہو رہا تھا۔

☆

زرین لان میں ٹہل ٹہل کر رٹے لگا رہی تھی۔ کل اس کا ٹیسٹ تھا۔ علیا بھی وہیں لان میں ہی موجود تھی۔ پورچ میں گاڑی رکی تو ان دونوں ہی نے مڑ کر دیکھا تھا۔ گاڑی کا دروازہ بند کرتا ہوا دانش ان ہی لوگوں کے پاس آ گیا تھا۔

''امتحان اس کے قریب ہیں اور رٹے تم لگا رہی ہو۔''

وہ لان چیئر پر علیا کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ میگزین کھولے ماڈل کے مختلف ہیئر اسٹائلز پر غور کر رہی تھی۔

''ارے ہاں یاد آیا، کل میرے کپڑے استری کر کے کمرے میں کس نے رکھے تھے؟''

''میں نے۔'' وہ بڑے سکون سے بولی تھی۔

''تم نے؟'' وہاں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

''ہاں بھئی، اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ میں اپنے کپڑے استری کرنے گئی۔ آئرن اسٹینڈ پر تمہارے کپڑے رکھے نظر آئے تو میں نے وہ بھی پریس کر دیے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

زرین نے ٹہلتے ٹہلتے دور سے ہی اسے ''ویل ڈن'' اور ''کیری آن'' کے اشارے کیے تھے۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف حیرت سے دیکھنے کے بعد کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کندھے اچکا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''داجی! ایک بہت ہی اچھا شعر یاد آ رہا ہے، سناؤں۔'' کھانے کی میز پر گھر کے تمام افراد موجود تھے جب دانش نے داجی کو مخاطب کیا تھا۔

''ارشاد ارشاد۔'' ان کے جواب دینے سے پہلے چاچو اور علی ایک ساتھ بولے تھے۔

''عرض کیا ہے۔'' وہ ایک نظر علیا پر بطورِ خاص ڈالتے ہوئے بولا۔

آج کل ان کو بہت ہے مری خاطر منظور
یا مری یا مرے دشمن کی قضا آئی ہے!

''واہ واہ سبحان اللہ مکرر۔'' علی مسخرے پن سے بولا تھا مگر وہ چاروں اور خاص طور پر علیا اس کی معنی خیز نظروں سے ایک دم بوکھلا گئی تھیں حالانکہ اپنے طور پر وہ لوگ بڑی چالاکی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ زرین نے ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں کی تھی مگر وہ بھی چالاکی میں ان کا استاد تھا۔

''اب کیا ہوگا؟ دانش کو شک ہو گیا ہے۔'' علیا کی پریشانی دیدنی تھی۔

''کچھ نہیں ہوتا تم پریشان مت ہو، اسے صرف یہی شک ہوا ہے نا کہ کچھ گڑبڑ ہے، اصل بات تو اس کے فرشتے بھی نہیں جان سکتے۔ اب اگر اس کا خود کوئی انٹرسٹ ہوا تو تمہارے رویے کے بدل جانے پر وہ بہت خوش ہوگا ورنہ یہی سوچتا رہے گا کہ تمہیں ضرور اس سے کوئی کام ہے لیکن کیا کام ہے یہ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔'' زرین نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی تھی۔

''لیکن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ دیکھو اب تم اس سے کچھ مت کہنا، مجھے بہت شرمندگی ہوگی اگر اسے اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی کہ میں اتنی نیک پروین کیوں بن رہی تھی۔'' وہ ہاتھ مسلتے ہوئے پریشانی سے بول رہی تھی۔

''لیکن اب دانش ہی تو امید کی آخری کرن ہے، اس سے بات نہیں کروں گی تو مسئلہ حل کیسے ہوگا۔''

''جو بھی ہو بس میری انا مجھے دانش کے سامنے نیچا پڑنے کی اجازت نہیں دے رہی۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولی تو جویریہ طنزیہ انداز میں فوراً بولی۔

''تمہاری انا یقیناً اس وقت ماؤنٹ ایورسٹ سر کر لے گی جب مما سب گھر والوں کے سامنے تمہاری مارک شیٹ ہاتھ میں لیے اردو میں پندرہ یا بیس اور کیمسٹری میں تو شاید زیرو نمبر لانے پر گرج چمک کے ساتھ برس رہی ہوں گی اور ویسے اردو اور کیمسٹری تمہارا ذاتی خیال ہے۔ میرے حساب سے تو اس فہرست میں بوٹنی اور زولوجی کو بھی شامل کر لو۔''

اس کے منہ سے یہ دل خراش اور ہولناک نقشہ سن کر وہ ایک دم رونے لگی تھی۔

''بری بات ہے جویریہ! دیکھو تم نے اسے رلا دیا۔'' وہ دونوں اسے چپ کرانے کے جتن کرتی ہوئی جویریہ سے الجھیں۔

''یہ اس کی اپنی حرکتیں ہیں، ان خرافات سے بہتر تھا محترمہ سنجیدگی سے پڑھائی میں دل لگا لیتیں۔ تم لوگ پُرامید ہو تو ہو مجھے نہیں لگتا کہ اچانک کوئی جادو کی چھڑی گھومے گی اور علیا حامد کی شادی خانہ آبادی ہو جائے گی۔''

جویریہ پر پھر حق گوئی کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ اسے چھوڑ کر وہ لوگ علیا کو سمجھانے اور دلاسا دینے بیٹھ گئی تھیں۔

چپ چپ تو وہ جویریہ کی باتوں کے بعد سے ہی تھی مگر اگلے روز کالج سے آنے کے بعد جب اس نے نہ تو دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر نہ رات

کا تو سب ہی کو تشویش ہوئی تھی، طاہرہ آنٹی کے استفسار پر اس نے طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا بہانہ کر دیا تھا۔

''علیا کیا ہوا؟'' وہ تینوں اس کے اردگرد بیٹھ گئی تھیں۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے کتابوں کا انبار، بہت سے نوٹس، کیلکولیٹر، لیکچر کا پلندہ۔ اس کے سامنے رکھی کتابوں کی پہاڑی دیکھ کر تو وہ لوگ بھی ڈر گئی تھیں۔

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

اس کے سامنے اردو کے نوٹس کھلے ہوئے تھے۔ کھوئے کھوئے انداز میں اس نے ان لوگوں کی بات کے جواب میں یہ شعر پڑھا تھا۔ شعر کے معنی و مطلب سے زیادہ وہ اس کے شعر پڑھنے پر ہول گئی تھیں۔

''سنو تم کیا خودکشی کرنے والی ہو؟'' جویریہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

''ہاں مما کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے تو مرنا ہی بہتر ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

''ڈیٹ شیٹ آ گئی، پہلا پیپر آج سے ٹھیک ڈیڑھ مہینہ بعد اردو کا ہے، اس کے دو دن بعد کیمسٹری پھر چار دن کا گیپ اور بوٹنی۔''

بتاتے بتاتے وہ زاروقطار رونے لگی تھی۔ وظیفہ ختم کیے بھی اسے چھ سات روز ہو گئے تھے۔ کتنی پابندی سے اس نے اکیس روز تہجد کے وقت عبادت کی تھی مگر شاید اس کے ستارے ہی گردش میں تھے۔

''سمیرا کا بہت مذاق اڑا رہے تھے کہ اس کا منگیتر ''اسپیشل منگیتر'' ہے، اسے حفاظتی ٹیکوں کا کورس نہیں کروایا اس کی اماں نے۔ پولیو ڈراپس اور وٹامن اے کے قطرے نہیں پلوائے گئے اور یہاں تو ایسا نہ ویسا۔ چلو مخچو ہی سہی وہ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔''

وہ بری طرح رو رہی تھی۔ اس روز سمیرا کے منگیتر کی شان میں کیے گئے تبصروں کو وہ روتے ہوئے جتنے دل گرفتہ انداز میں دہرا رہی تھی ان لوگوں سے ہنسی رک نہیں رہی تھی۔

''میں نے سوچا، جب کوئی فائدہ ہی نہیں تو یہ جو ڈیڑھ مہینہ باقی ہے اس میں پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن اگر کسی وقت میں خودکشی جیسے انتہائی اقدام پر مجبور ہو جاؤں تو میرے مرنے کے بعد مما کو یہ ضرور بتا دینا کہ آپ کی بیٹی صرف اور صرف آپ کے ظلم و ستم کی وجہ سے اس دنیا سے منہ موڑ گئی۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆

اگلے روز جب ایک نئے دن کا سورج طلوع ہوا تو ان میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آزمائشوں کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ نیا سورج نئی خوشیوں کا پیامبر بن کر طلوع ہوا ہے۔ وہ صبح بڑی عام سی صبح تھی۔ وہی روزانہ والی بھاگ دوڑ۔ شیریں کو اپنا کلف لگا وائٹ دوپٹہ نہیں مل رہا، زرین اپنا جنرل ڈھونڈ رہی ہے، جویریہ اپنا فیس واش ختم کر دینے پر شیریں سے الجھ رہی ہے اور علیا یونیفارم پہنے طاہرہ آنٹی کے سوال جواب سے

نمٹ رہی ہے۔

''تمہاری کلاسز کب سے آف ہو رہی ہیں؟''

صرف کیمسٹری کا سلیبس رہ گیا ہے، اسی کی ایکسٹرا کلاسز ہو رہی ہیں اور زولوجی کے پریکٹیکلز تھوڑے سے رہ گئے تھے۔ میم کہہ رہی تھیں ایک ہفتہ میں ختم کرا دیں گی۔'' وہی اس کا ڈرا سہما انداز۔ پڑھائی سے متعلق گفتگو ہونے پر سر کا جھک جانا لازمی امر ہوا کرتا تھا سو سر جھکا ہوا ہی تھا۔

علیا کو ایک گریس فل سی خاتون کے ساتھ لنگڑاتے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے شیریں نے دیکھا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھی تھی اور اب نہا کر بالکونی میں کھڑی بال سکھا رہی تھی۔

''جلدی آؤ، دیکھو تو علیا پتا نہیں کس کے ساتھ آئی ہے۔'' اس نے کمرے کی طرف منہ کر کے جویریہ کو آواز دی تو وہ بھاگم بھاگ فوراً باہر نکلی تھی۔

''کون ہیں یہ خاتون اور یہ علیا کو کیا ہوا لنگڑا کر کیوں چل رہی ہے، ارے وہ دیکھو ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر وہ بندہ بھی ہمارے ہی گھر میں گھس رہا ہے، اف کتنا ہینڈسم ہے، دیکھو تو ہائٹ کیا زبردست ہے۔''

جویریہ اس طرح بول رہی تھی جیسے شیریں تو شاید آنکھیں بند کر کے کھڑی ہے، اس کی باتوں کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے وہ تیز رفتاری سے دوڑ لگاتی کمرے سے کوریڈور، کوریڈور سے سیڑھیوں اور سیڑھیوں سے ڈرائنگ روم تک پہنچی تھی۔ جویریہ اس کی تیز رفتاری دیکھتی رہ گئی تھی۔ اپنا یہاں کھڑا رہنا اسے انتہائی فضول لگا تو وہ خود بھی سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتر آئی تھی۔ انڈین اسٹائل کی کاٹن کی ساڑھی پہنے وہ خاصی متاثر کن شخصیت کی مالک تھیں۔ سنہری فریم کے نازک سے گلاسز، بات کرنے کا دھیما اور شائستہ انداز، جویریہ اندر جانے کے بجائے لاؤنج سے ہی اندر ہونے والی گفتگو سے فیض یاب ہونے لگی تھی۔ شیریں بھی وہیں کھڑی تھی۔ ڈرائنگ روم میں دادی جان کے علاوہ شگفتہ آنٹی اور داجی بھی موجود تھے۔

''جی میں بی اے کی اسٹوڈنٹس کو انگلش پڑھاتی ہوں۔''

وہ داجی کی کسی بات کے جواب میں بولی تھیں۔ صاحبزادے مسلسل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔

''یار یہ ہیں کون؟ یہ ماجرا کیا ہے؟''

''میں خود سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' شیریں نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا تھا۔

''جہاں تک میں سمجھی ہوں ان کی گاڑی سے علیا کا کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔'' ادھر ان دونوں کی گفتگو جاری تھی ادھر وہ لوگ داجی کے بہت اصرار پر بھی معذرت کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔

''دیکھیں کوئی تکلف نہیں ہے، ہمارا اپنا ہی گھر ہے۔ انشاء اللہ پھر آئیں گے تو صرف چائے کیا آپ لوگوں کے ساتھ کھانا بھی کھائیں گے۔''

خاتون پرس کندھے پر ڈال کر دادی جان سے بولی تھیں۔ سب کو خدا حافظ کر کے انہوں نے علیا کو بڑی محبت سے گلے لگا کر پیار کیا تھا۔

''احتیاط کرنا بیٹا! دو چار بیڈ ریسٹ کرو گی تو چوٹ جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔''

ان کے لہجے میں جتنی مٹھاس گھلی ہوئی تھی وہ ان دونوں کو چونکانے کے لیے کافی تھی۔ صاحبزادے نے بھی دادی سے ہاتھ ملانے کے بعد نکلنے سے پہلے ایک سرسری سی نظر صوفے پر بیٹھی علیا پر ڈالی تھی مگر وہ سرسری نظر خاصی گہرائی لیے ہوئی تھی۔

''لگتا ہے علیا کی دعائیں قبول ہوگئیں۔''

شیریں بڑبڑائی تھی۔ ادھر وہ لوگ رخصت ہو رہے تھے ادھر زرین گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے اندر کی صورتحال سے وہ بے خبر تھی۔ جوان لوگوں کا بغور جائزہ لیتی، عام سے انداز میں سلام کرتی وہ لاؤنج میں گھسی تو ان لوگوں کو کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پورچ کی طرف دیکھتے پا کر ٹھٹھک کر رک گئی۔

''کیا ہوا ہے تم لوگوں کو؟''

اسے جواب دیئے بغیر وہ دونوں ڈرائنگ روم کی طرف دوڑی تھیں۔ ان لوگوں کی حرکتوں پر حیران ہوتی وہ بھی پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں آ گئی تھی۔ علیا شلوار اوپر کیے اپنی چوٹ کا معائنہ کر رہی تھی۔ ابھی وہ لوگ کچھ پوچھ بھی نہیں پائی تھیں کہ دادی جان وغیرہ بھی وہیں آ گئیں۔

''کہاں چوٹ لگی ہے؟ دکھاؤ مجھے۔'' دادی جان کو تشویش ہو رہی تھی، گھٹنے پر کی گئی ڈریسنگ کا وہ بڑا تفصیلی جائزہ لے رہی تھیں۔

''آنکھیں کھول کر نہیں چلا جاتا تم سے، سامنے سے گاڑی آ رہی ہے اور یہ روڈ کو لان سمجھ کر چہل قدمی فرما رہی ہیں۔''

''میری غلطی نہیں تھی دادی جان! وہ موصوف ہی ضرورت سے زیادہ جلدی میں تھے۔'' وہ ان کے ڈانٹنے پر چڑ کر بولی تھی۔

''ہاں تب ہی تو اماں بیٹا جلدی سے ڈاکٹر کے ہاں بھی لے گئے اور پھر گھر چھوڑنے بھی آ گئے۔'' شگفتہ آنٹی نے بھی لب کشائی کی تھی۔

طاہرہ آنٹی کی بھی اسی وقت آمد ہوگئی، پھر تو ان لوگوں کو علیا صاحبہ کافی دیر تک ہاتھ ہی نہیں لگیں۔ انہوں نے جب تک ایکسرے وغیرہ کروا کر تسلی نہیں کر لی سکون سے نہیں بیٹھیں۔

''وہ خاتون بھی اور ان کے لاڈلے سپوت بھی علیا پر خاصے مہربان لگ رہے تھے۔ لگتا ہے دعاؤں کے قبول ہونے کا وقت آ چکا ہے۔'' شیریں ان دونوں سے بولی تھی۔

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ یوں ہی انسانی ہمدردی میں یا اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کے سبب اتنی ملنساری اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے ہوں۔''

''میں نے یہ بال دھوپ میں براؤن نہیں کیے۔''

''جی ہاں معلوم ہے ہمیں، آپ نے بال ڈائی کروا کر براؤن کیے ہیں۔'' جویریہ جواباً فوراً بولی تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''لگا لو شرط جتنے کی چاہو، موصوف علیا پر عاشق ہو چکے ہیں، آخر ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں، شیریں طیب اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہے۔''

اس کے دعوؤں کی صداقت کا فیصلہ آنے والے وقت کو کرنا تھا اسی لیے وہ دونوں مزید بحث کیے بغیر خاموش ہوگئیں۔ البتہ انہوں نے اپنی ان آراء سے علیا کو بے خبر ہی رکھا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو خوامخواہ بے چاری کا دل ٹوٹ جائے گا (جو پہلے ہی پے در پے صدمات کا بوجھ اٹھا کر چکنا چور ہو چکا تھا۔)

علیا سے تمام تفصیل سنی تو پتا چلا خاتون اسی کے کالج میں پڑھاتی تھیں۔ علیا شکلاً ان کو پہلے سے جانتی تھی مگر چونکہ وہ ان لوگوں کی کلاس کو نہیں پڑھاتی تھیں اس لیے زیادہ واقفیت نہیں تھی۔

پریکٹیکل ہوا نہیں تھا، وہ وین والے کا انتظار کرنے کے بجائے پبلک بس سے گھر آجانے کا سوچتی ہوئی کالج سے نکلی تھی جب سامنے سے آتی تیز رفتار گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ خود کو بچانے کے چکر میں اس کا پیر بری طرح مڑا تھا اور وہ اوندھے منہ روڈ پر گر گئی تھی۔ گاڑی کو ایک دم بریک لگا کر روکتے ہوئے وہ موصوف اتر کر اس کے پاس آگئے تھے اور پھر ابھی معذرت کر ہی رہے تھے کہ ان کی اماں بھی کالج سے برآمد ہوگئی تھیں۔ روڈ پر گرنے کی شرمندگی کی وجہ سے وہ فوراً ہی خود کھڑی ہوگئی تھی۔ گھٹنے میں سے اٹھنے والی ٹیسیں ناقابلِ برداشت تھیں۔ پھر وہ خاتون اسے جلدی سے گاڑی میں بٹھا کر قریب ترین کلینک لے گئی تھیں۔ بیٹے صاحب بھی فرماں برداری سے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ وہاں سے بینڈیج کروا کر وہ اسے گھر چھوڑنے آئے تھے۔

''بہت افسانوی سچویشن ہوئی ہے تمہارے ساتھ۔'' ان تینوں نے ہم آواز ہو کر تبصرہ کیا تھا۔

اور پھر شیریں کا یہ دعویٰ کہ وہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہے سچ ثابت ہوگیا تھا۔ اگلے روز ان کا فون آیا تھا اور انہوں نے علیا سے خیریت پوچھنے کے بعد دادی جان سے بھی بات کی تھی۔ ان کے فون کا سنتے ہی وہ لوگ الرٹ ہوگئی تھیں۔ زرین نے فون سنتے وقت دادی جان کے تاثرات ملاحظہ کیے تھے اور شیریں اور جویریہ نے ان دونوں کی گفتگو ان ہی کی زبانی اپنے کمرے میں بیٹھ کر سنی تھی۔

وہاں سے باقاعدہ رشتہ آجانا علیا کے لیے ایسا تھا جیسے اسے ہفتِ اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

''میں نے اتنے سچے دل سے وظیفہ پڑھا تھا کیا اللہ تعالیٰ کو مجھ پر رحم نہ آتا۔'' وہ اتراتے ہوئے بولی تھی۔

''اور یہ وظیفہ بتایا کس نے تھا؟'' جویریہ نے آنکھیں نکالی تھیں۔

''اور اس سے بھی پہلے اس سب کے پیچھے ماسٹر مائنڈ کون تھا؟ کس نے شادی والی ترکیب سوچی تھی۔'' زرین نے ہاتھ نچائے تھے۔

''اور سب سے بڑی بات یہ کہ دادی جان کو بچیوں کی شادی کے لیے کس نے ہموار کروایا تھا۔ اب تو انہوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے ورنہ تو صاف انکار کر دیتیں کہ ابھی بچی پڑھ رہی ہے۔'' اسے اپنا ایک اور کارنامہ یاد آیا تھا۔

گھر میں اس رشتے کے حوالے سے دو گروپ بن گئے تھے۔ ایک گروپ دادی جان کی سربراہی میں تشکیل پا چکا تھا جبکہ دوسرا گروپ طاہرہ آنٹی کا تھا۔ دادی جان ان کا کوئی اعتراض سننے کی روادار نہ تھیں۔ اپنے طور پر تمام چھان بین اور اطمینان کروا لینے کے بعد انہوں نے استخارہ بھی کر لیا تھا اور اب مکمل طور پر اس رشتے کے حق میں تھیں۔ اتفاق سے موصوف احسن معین کی جاب اوسلو میں تھی اسی لیے زرین کے ابو کے ذریعے ان کے چال چلن اور جاب وغیرہ کے بارے میں مکمل چھان بین کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔

''بچیاں جتنی جلد اپنے گھروں کی ہو جائیں اتنا اچھا ہے۔ اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے اور کیا چاہتی ہو، پڑھا لکھا قابل داماد، اچھی جاب، صورت شکل بھی لاکھوں میں ایک، ماں باپ، بہن بھائی سب پڑھے لکھے، رکھ رکھاؤ والے، کھاتے پیتے، تمہاری بیٹی کے جتنے نخرے ہیں وہ سب بھی

آرام سے سہہ لیں گے۔''

دادی جان کا لہجہ دوٹوک اور سو فیصد ساسوں والا حکمیہ لہجہ تھا۔ زرین کا جملہ شاید انہیں بہت ہی پسند آ گیا تھا اسی لیے ہر بحث میں جملہ ضرور بولا جاتا تھا۔ طاہرہ آنٹی کی حمایت کرنے والے بھی رشتے کی خوبیوں کے معترف تو بہر حال تھے۔ سب یہ چاہ رہے تھے کہ بات منگنی یا بہت سے بہت نکاح پر آ کر ٹھہر جائے مگر وہاں مسئلہ یہ تھا کہ احسن کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اسے واپس جانا تھا، اس کا تو چلو یہ تھا کہ چار پانچ مہینے بعد چھٹیاں لے کر دوبارہ آ جاتا مگر اس کی بہن جو کینیڈا سے آئی ہوئی تھی اس کا اتنی جلدی دوبارہ آنا ممکن نہیں تھا اور وہاں اکلوتی بہن کی بھائی کی شادی میں موجودگی بہت ضروری تھی۔ دوبارہ دو تین سال سے پہلے اس کا آنا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

دادی جان اور طاہرہ آنٹی کے درمیان جاری اس سرد جنگ اور کھینچا تانی کا فیصلہ آخر کار داجی نے کر دیا تھا۔ ظاہر ہے ان کا فیصلہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا تھا اور چونکہ یہ فیصلہ دادی جان کے حق میں ہوا تھا اس لیے ان چاروں بالخصوص علیا کی خوشی دیدنی تھی۔

''اف میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی میری دعائیں اس طرح قبول ہو جائیں گی۔ پتا ہے میں نے اکیس روز اللہ تعالیٰ سے خوب گڑگڑا کر یہی دعا کی تھی کہ ایسی جگہ سے رشتہ آ جائے جن کی یا تو نانی دادی مرنے والی ہوں یا پھر بھائی یا بہن میں سے کوئی فوراً باہر جانے والا ہو یا پھر وہ خود فوراً کہیں باہر جانے والے ہوں اور دیکھو اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی۔'' اس کے بتانے پر وہ لوگ بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔

''ویسے میں نے ایک بار داجی سے سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو فرمائشوں کی لسٹ دینے کے بجائے جامع دعائیں مانگنی چاہییں۔ تمہیں چاہیے تھا کہ یہ دعا مانگتیں کہ یا اللہ میری شادی خیر و عافیت کے ساتھ جلد ہو جائے۔''

جویریہ نے سمجھانا اپنا فرض سمجھا تھا۔ وہ اس کی نصیحت ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال کر اچھل اچھل کر خوشی کا اظہار کرتی رہی تھی۔

ہو میں تو بھول چلی بابل کا دیس
پیا کا گھر پیارا لگے.....
مہندی سے لکھ دو ری ہاتھوں پہ سکھیو
میرے سانوریا کا نام، میرے سانوریا کا نام

وہ ایک کے بعد ایک گانا لہک لہک کر گا رہی تھی جب دانش اور علی نے کمرے میں جھانکا تھا۔ ان لوگوں نے اسے اشارے کیے تھے مگر محترمہ کو خوشی میں کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ دونوں اندر آ چکے تھے اور اب کھڑے اس کی گلوکاری سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اچانک گاتے گاتے اس کی خود ہی نظر سامنے کھڑے دانش اور علی پر پڑی تو بے ساختہ ''چلو بھر پانی'' اور ''زمین پھٹنے'' والے محاورے یاد آئے تھے۔

''ویسے ایک بات ہے زرین! یہ علیا کی ہونے والی ساس کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ اول تو ساس ہی خطرناک بلا کا نام ہوتا ہے اور وہ بھی پڑھی لکھی ساس۔ او مائی گاڈ ان کی تو چالیں بھی اس کی سمجھ میں مشکل سے آیا کریں گی۔ یہ ان کی انگلش کے پیچ و خم میں ہی الجھی رہ جائے گی اور وہ چالاکی سے اپنا کام کر جائیں گی۔''

دانش اس کی شرمندہ شکل پر ایک نگاہ ڈال کر بڑی سنجیدگی سے زرین سے مخاطب ہوا تھا۔

''اور بڑے بھائی! یہ بھی تو سوچیں کہ ہماری آپی تو نہ اردو لٹریچر میں اچھی ہیں نہ انگلش لٹریچر میں۔ آخر انہیں امپریس کرنے کے لیے یہ باتیں کیا کریں گی۔ اب وہ عام سی ساس تو ہیں نہیں جو ڈالڈا کے دسترخوان میں سے اتفاقاً کچھ اچھا پک جانے پر خوش ہو جائیں، وہ تو بہو کے منہ سے شیکسپیئر، شیلے، کیٹس کا ذکر سن کر ہی خوش ہو سکتی ہیں اور ہماری آپی کا تو یہ حال ہے کہ انہیں شیکسپیئر کے حوالے سے صرف اتنا معلوم ہے کہ ''دنیا ایک اسٹیج ہے۔'' ایسے میں یہ بے چاری کریں تو کیا کریں۔'' علی مذاق اڑانے میں کیوں پیچھے رہتا۔

''علی!'' جویریہ نے تنبیہی انداز میں آنکھیں دکھائی تھیں مگر وہاں پرواہ کسے تھی۔

''ارے یہ بھی کوئی پرابلم ہے، سیدھی سی بات ہے شیکسپیئر کا نام لے کر جو دل چاہے بول دیا کرنا، ویسے بھی اکثر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ جو جو کچھ آنجہانی نے کہا بھی نہیں وہ سب اس سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ ساس حیران ہوں تو نروس ہوئے بغیر کہنا۔

''آنٹی! آپ اتنی پڑھی لکھی ہو کر بھی نہیں جانتیں کہ یہ بات شیکسپیئر نے ایک روز لنچ کرتے ہوئے کہی تھی، ایک دن جب وہ نہانے جا رہا تھا تب کہی تھی یا سونے سے پہلے ایک دن اس نے اپنی بیوی سے یہ بات کہی تھی۔''

دانش بڑے مخلصانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔ اچانک ملنے والی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ وہ ان لوگوں کے مذاق کا بھی برا نہیں مان رہی تھی۔ یہ خیال کتنا جاں فزا اور طمانیت بخش تھا کہ اب اس کی اس منحوس پڑھائی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے گی۔ اتنی اچانک رشتہ طے ہو جانا وہ بھی اتنے ہینڈسم بندے سے اور اس سے بڑھ کر کیا چاہیے تھا۔ ان لوگوں نے اس سے ٹریٹ مانگی تھی اور وہ بھی خوشی خوشی فوراً مان گئی تھی۔

''بس یار! میرا ہزار روپے سے اوپر بل نہیں بننا چاہیے۔''

گھر سے باہر نکلتے ہوئے اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر یاددہانی کروائی تھی۔ جب وہ لوگ گاڑی میں بیٹھنے لگیں۔ خوب بن ٹھن کر علی اور چاچو کے دونوں سپوت بھی نازل ہو گئے۔ انہیں گاڑی میں بیٹھتا دیکھ کر علیا چلائی تھی۔

''تم لوگ کہاں گھس رہے ہو۔''

''اکیلے اکیلے دعوت اڑانے جا رہی ہیں۔ بچوں کو گھر پر چھوڑ کر۔ ارے ہم بچوں نے کھانا ہی کتنا ہوتا ہے، کیا ہو جاتا جو ہمیں بھی انوائیٹ کر لیتیں کہ میرے منے بھائیوں میں شادی کی خوشی میں تم لوگوں کو کھانا کھلانے لے جا رہی ہوں مگر نہیں صاحب چلو ہم بن بلائے مہمان بن جاتے ہیں۔''

وہ مکاری سے آنکھیں نچا کر بولا تھا۔ دانت پیستے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ چاچو کے لاڈلوں کو وہ بدتمیز ساتھ ہی اس لیے لایا تھا کہ ادھر وہ منع کرے گی ادھر وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع ہو جائیں گے اور دنیا والوں کی ہمدردیاں تو آنکھوں میں آنسو لیے معصوم بچوں کے ساتھ ہی ہوں گی۔ کسی اور کو کیا کہتی اس کی اپنی سگھیاں ریستوران میں بیٹھی سارے عہد و پیمان بھلائے دھڑا دھڑ ویٹر کو آرڈر دے رہی تھی۔ ''فرائیڈ رائس، چکن ہانڈی، جلفریزی، فروٹ سلاد، روغنی نان، بہاری کباب، وہ دل پر ہاتھ رکھے ان ندیدوں کو دیکھ رہی تھی۔

☆

''تم ذرا سر جھکا کر شرافت سے بیٹھو۔ نانی بہت ناراض ہو رہی ہیں، تمہیں آنکھیں مٹکاتا دیکھ کر ابھی مجھے بلا کر کہہ رہی تھی کہ اسے کہو آنکھیں بند کر کے اور سر جھکا کر بیٹھے۔''

دلہن بنی علیا کے برابر بیٹھتے ہوئے زرین نے سرگوشی کی تھی۔ اس کی زبانی دادی جان کا پیغام سن کر وہ جلدی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ جب سے اس کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی طاہرہ آنٹی، دادی جان، شگفتہ آنٹی اور دلہن چچی رونے دھونے کے کافی سارے سیشنز کر چکی تھیں۔ ایک دو بار تو وہ تینوں بھی اس کی متوقع جدائی کا سوچ کر ان لوگوں کے ساتھ اس کارِ خیر میں شریک ہو چکی تھیں مگر وہ مجال ہے جو ایک مرتبہ بھی روئی ہو۔

''میری دعائیں قبول ہوئی ہیں، میں رو دھو کر ناشکری کیوں بنوں۔''

کل رات ان تینوں کو روتا دیکھ کر اپنے نہ رونے کی اس نے خاصی معقول وجہ بتائی تھی۔ جتنی آناً فاناً اس کی شادی ہو رہی تھی۔ ساری تیاری بھاگتے دوڑتے ہی ہوئی تھی مگر اس بھاگ دوڑ میں بھی ان تینوں نے مایوں، مہندی، شادی اور ولیمے کے فنکشنز میں پہننے کے لیے ایک جیسے کپڑے اور وہ بھی خوب اسٹائلش بنوائے تھے۔

''شادی ہونے پر اتنی پر جوش میں نے کوئی لڑکی نہیں دیکھی آج تک۔'' دو تین روز پہلے دانش نے خوشی خوشی اپنے جہیز کی مختلف چیزیں دیکھتی ہوئی علیا سے کہا تھا۔

''کہیں یہ خوشی امتحان سے جان چھوٹ جانے کی تو نہیں؟''

اس بات پر اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا مگر چہرے پر سنجیدگی اور غصہ طاری کر کے اس نے اسے جھٹلانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ اس نے یقین کیا تھا یا نہیں یہ سوال خاصا قابلِ غور تھا۔

علیا کے رخصت ہو جانے سے ان لوگوں کا کورم ٹوٹ گیا تھا۔ G-4 کا ایک انتہائی اہم رکن کم ہو گیا تھا۔ وہ لوگ اسے بہت مس کر رہی تھیں۔ اپنی پچھلے دنوں کی جانے والی تمام حرکتوں پر بھی اب وہ لوگ دل کھول کر ہنستی تھیں۔ کبھی جویریہ داجی کی اعمالِ قرآنی اٹھالانے پر ہنستی، کبھی زرین تائی اور شگفتہ آنٹی کی برین واشنگ کرنے پر کھلکھلاتی۔ شیریں ضرورتِ رشتہ کے اشتہار اور اسد بھائی سے کی جانے والی باتوں پر مسکرا دیتی۔ علیا کی شادی کے ساتھ ہی اسد بھائی کا بھی مریم کے ساتھ رشتہ طے ہو گیا تھا۔ سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک اور ان لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو گیا تھا۔ اب راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ علیا کی وجہ سے پڑھائی کے معمولات جو تھوڑے بہت ڈسٹرب ہو گئے تھے وہ لوگ انہیں بحال کر کے بڑی شد و مد سے اپنی اپنی اسٹڈیز میں الجھی ہوئی تھیں۔ جب ایک انہونی بات ہوئی تھی، بلکہ بات کیا باتیں۔

اس رات جویریہ کمپیوٹر پر اپنا اسائنمنٹ ٹائپ کر رہی تھی، شیریں زرین کو آرٹ اسکول میں عنقریب ہونے والی Exhibition اور اس میں اپنے کیے ہوئے کام کی تفصیلات بتا رہی تھی جب شگفتہ آنٹی کا بلاوا شیریں کے لیے آیا تھا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی تو زرین بھی کتاب کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ کافی دیر تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی، اپنے اپنے کاموں میں مصروف ان دونوں نے ہی اس بات کو زیادہ محسوس نہیں کیا تھا۔ قریباً گھنٹہ بھر بعد وہ واپس آئی تو آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ وہاں سے روتی ہوئی ہی آئی ہے۔

''کیا ہے؟ شگفتہ آنٹی نے کسی بات پر ڈانٹا ہے کیا؟'' وہ دونوں سب کام وام چھوڑ چھاڑ کر اس کے پاس آئی تھیں۔

''نادر شاہی حکم سن کر آ رہی ہوں ممی اور دادی جان کا۔ وہ چھوٹے ماموں کے عدنان کے ساتھ میرا رشتہ طے کر رہی ہیں۔'' وہ بولتے بولتے رو پڑی تھی۔

''کیا رشتہ؟'' وہ دونوں چلائی تھیں۔

''ہاں ہاں رشتہ، وہاں سب بیٹھے ہوئے تھے دادی جان، ممی، طاہرہ آنٹی۔ میرے منع کرنے پر دادی جان اور ممی دونوں نے ڈانٹنا شروع کر دیا کہ منہ پھٹ اور بدتمیز ہو گئی ہے۔ علیا کی مثالیں دی گئی کہ کیسے بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ حالانکہ اس کے امتحان سر پر تھے لیکن اس نے پھر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور میں صرف منگنی ہونے پر واویلا کر رہی ہوں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی تھی۔

''بہت تم نے دادی جان کی برین واشنگ کی تھی نا کہ بچیاں جتنی جلد اپنے گھروں کی ہو جائیں اتنا اچھا ہے۔ یہ کیوں بھول گئی تھیں کہ اتفاق سے بچیوں کے دائرے میں ہم لوگ بھی آتے ہیں۔ ممی صاف صاف کہہ رہی تھیں کہ پڑھائی کو وبالِ جان بنانے کی ضرورت نہیں۔ شادی اگلے سال عدنان کی ٹریننگ کمپلیٹ ہو جانے پر ہو گی اور میری پڑھائی، میرا کیریئر وہ جائے جہنم میں۔''

وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ وہ دونوں اسے چپ کرانے یا دلاسا دینے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھیں۔ عجیب سکتے کی سی کیفیت میں دونوں منہ پھاڑے اسے روتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

''اور تمہیں مجھ سے بہت ہمدردی محسوس ہو رہی ہے مگر دل ہی دل میں خوش بھی ہو گی کہ تم تو بچی ہوئی ہو مگر بے فکر رہو تمہارا بندوبست دانش کے ساتھ کرنے کا اہتمام ہو رہا ہے۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے جویریہ سے بولی تھی۔ لہجہ مکمل طور پر طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کیا بکواس ہے یہ۔'' جویریہ غصے سے چلائی تھی۔

''یہ بکواس نہیں ہے، کر چکیں تم کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز اور لے چکیں آئی ٹی میں خوب ساری ڈگریاں۔ اب بیٹھ کر سالن بھونا کرنا اور سیاں جی کی ناز برداری کرنا۔ ویسے بھی بچیاں جتنی جلد اپنے گھر کی ہو جائیں اتنا اچھا ہوتا ہے۔''

وہ مسلسل طنز کے تیر برسا رہی تھی۔

''میرے ساتھ کوئی زبردستی کر کے دیکھے، میں اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔'' جویریہ شدید ترین اشتعال کے زیر اثر چلائی تھی۔

پھر اس کے بعد ان تینوں نے آپس میں کوئی بھی بات نہیں کی تھی۔ ساری رات شیریں کی سسکیاں ان دونوں کو دکھی کرتی رہی تھیں۔ جویریہ کا خود بھی دل انجانے وسوسوں میں مبتلا تھا۔ کہنا آسان ہے کرنا مشکل، گھر کے بڑوں سے براہِ راست ٹکر لینا اتنا سہل نہیں تھا۔

علیا کی شادی کے بعد سے وہ تینوں ایک ہی کمرے میں سونے لگی تھیں۔ زرین کا کمرہ اسٹڈی روم کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا۔

صبح سو کر اٹھیں تو تینوں کے سر بھاری بھاری اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ سب کے سوال جواب سے بچنے کے لیے بجھے دل سے ناشتہ کر کے وہ لوگ واپس کمرے میں آ کر ادھر ادھر پڑ گئی تھیں۔ شیریں اور جویریہ اپنے اپنے غموں کے ساتھ اور زرین مسلسل کوئی ''ترکیب'' سوچنے میں

مصروف۔ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آتی ہوئی علیا کو زرین نے مسکرا کر جبکہ شیریں اور جویریہ نے گھور کر دیکھا تھا۔

''ساری مصیبت اس منحوس ہی کی تو لائی ہوئی ہے۔'' وہ دونوں اسے وعلیکم کہنے کھڑی بھی نہیں ہوئی تھیں۔

''آؤ علیا! اکیلی آئی ہو، احسن بھائی نہیں آئے؟''

زرین نے اسے گرمجوشی سے گلے لگایا تھا مگر نا اسے اپنی بات کا کوئی جواب ملا تھا اور نہ ہی وہ گلے لگنے کے بعد واپس ہٹی تھی۔ اچانک زرین کو محسوس ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ اپنے کندھے پر نمی محسوس کر کے وہ پریشان ہوگئی تھی۔

''تم رو کیوں رہی ہو، کیا بات ہوئی ہے، ارے جلدی بولو میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔''

وہ اپنے کندھے پر رکھے اس کے سر کو ہٹاتے ہوئے فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔ شیریں اور جویریہ نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے بیڈ پر گر کر رونے لگی تھی۔ اب تو وہ دونوں بھی اپنی اپنی ناراضی بالائے طاق رکھ کر اس کے پاس پہنچی تھیں۔ پانچ دس منٹ تک روتے رہنے کے بعد جب وہ خود ہی چپ ہوگئی اور دوپٹے سے آنسو صاف کرتی ہوئی اٹھ کر بیٹھی تو ان لوگوں کے کچھ پوچھنے سے پہلے خود ہی بولی۔

''شادی ہی میرے مسئلے کا واحد حل تھی۔ شادی ہو جانے کے نتیجے میں میں پڑھائی اور امتحان سے چھٹکارا پانے والی تھی۔ اس لیے کہ شادی کے بعد سسرال والے اور شوہر لڑکی کو تعلیم جاری نہیں رکھنے دیتے۔''

وہ عجیب پاگلوں جیسی باتیں کر رہی تھی۔ وہ لوگ اس کی باتوں کا مقصد جاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''مگر میرے سسرال والے ایسے نہیں ہیں اور شوہر تو ایسے ہرگز بھی نہیں ہیں۔ انہیں عین امتحانوں کے دنوں میں شادی ہونے پر بھی خاصا اعتراض تھا مگر اپنی بہن کی وجہ سے مجبور ہو گئے تھے۔ میں آرام سے پیپرز دے لوں، پریکٹیکلز وغیرہ سے فارغ ہو جاؤں پھر وہ مجھے اپنے پاس ناروے بلوائیں گے۔ ہم کہیں ہنی مون پر نہیں جا رہے اس لیے کہ میری پڑھائی کا پہلے ہی شادی کی وجہ سے کافی حرج ہو چکا ہے۔ آگے ان کا ارادہ مجھے اور کیمسٹری میں ماسٹرز کروانے کا ہے کہ ان کی خواہش ہے کہ ان کی بیوی خوب پڑھی لکھی اور ان کے جتنی لائق فائق ہو۔ میرے یہ کہنے پر کہ میں اگلے سال پیپرز دے لوں گی انہوں نے مجھے سختی سے ڈانٹ دیا ہے اور آج یہاں اسی لیے لائے ہیں کہ میں اپنے نوٹس اور کتابیں وغیرہ لے سکوں۔ امتحان شروع ہونے میں صرف دو دن جو رہ گئے ہیں۔''

بڑا کاٹ دار تھا اس کا لہجہ، وہ تینوں ابھی رات والے صدمے سے ہی نہیں سنبھلی تھیں کہ اب یہ افتاد آن پڑی تھی۔

''پہلے صرف مما کی ڈانٹ اور گھر والوں کے سامنے ذلیل ہونے کا خوف تھا۔ اب شوہر کی پھٹکار اور سسرال میں فیل ہو جانے کے نتیجے میں ہونے والی ذلت کا تصور بھی شامل ہو گیا ہے۔ وہاں سارے خاندان میں بہو کے امتحان دینے کی دھوم ہے۔ ساس نے کہا ہے کہ میری بہو کی فرسٹ ڈویژن آئی تو میں اسے پرل کا سیٹ گفٹ کروں گی اور احسن کو اتنے دنوں میں شک ہو گیا ہے کہ میں پڑھائی سے بھاگتی ہوں، لہٰذا انہوں نے مما سے بھی زیادہ خطرناک انداز میں دھمکیاں دینی شروع کر دی ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ اگر فیل ہوئی تو اپنے پاس بلواؤں گا نہیں۔ جس دن

B.Sc پاس کرلوگی اسی دن اپنے پاس بلوالوں گا۔''

احسن کا جملہ دہراتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔

''اس سے تو میں شادی سے پہلے اچھی تھی۔ زرین سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ بڑی عالی شان ترکیب سوچی تھی۔'' وہ اپنے اوپر الزام رکھے جانے پر کبیدہ خاطر تو ہوئی مگر جان سے پیاری دوست اور کزن کی دلجوئی بھی ضروری تھی۔ اس لیے اطمینان دلانے والے انداز میں بولی۔

''تم پریشان مت ہو، مجھے سوچنے دو، کوئی نہ کوئی تدبیر نکل آئے گی۔''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی وہ تینوں ایک ساتھ اس پر حملہ آور ہوگئی تھیں۔

''ایسی کی تیسی تمہاری ترکیبوں کی۔''

''اس شیطانی دماغ نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔''

ارے میری بات تو سنو علیا! سچ میرے ذہن میں احسن بھائی کو رام کرنے کی ترکیب آگئی ہے۔''

''اب اس کی کسی بکواس پر کان مت دھرنا۔''

''بچیاں جتنی جلدی اپنے گھر کی ہوجائیں اتنا اچھا ہوتا ہے، ہے نا۔ آج اسے چھوڑنا مت۔''

وہاں بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کمرہ مچھلی بازار کا نمونہ پیش کررہا تھا۔ شور سن کر سب سے پہلے علی بھاگتا ہوا آیا تھا۔

''آج کی تازہ خبر، G-4 میں پھوٹ پڑگئی۔ تمام ارکان تکیوں، کشنز، کتابوں اور کاپیوں سمیت ایک دوسرے پر حملہ آور ہوچکے ہیں، لگتا ہے اب G-4 ج، G-4 ش اور G-4 ص تشکیل پاکر ہی رہیں گے۔'' وہ سب کو اطلاع دینے بھاگا تھا۔

من و سلویٰ

دورِ حاضر کی مقبول ترین مصنفہ **عمیرہ احمد** کا بہت خوبصورت اور طویل ناول..... من وسلویٰ..... جس کا بنیادی موضوع رزقِ حلال ہے۔ من وسلویٰ جو بنی اسرائیل کے لیے آسمان سے اتارا گیا اور رزقِ حلال جو اُمت محمدیؐ کے لیے عطا کیا گیا، لیکن نہ بنی اسرائیل من وسلویٰ سے مطمئن تھی اور نہ ہم رزقِ حلال پر قانع..... انہیں انواع واقسام کے زمینی کھانوں کی طلب تھی اور ہمیں کم وقت میں زیادہ کی..... رزقِ حلال کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

چلو توڑو قسم اقرار کریں

بڑے خوشگوار موڈ کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے لاؤنج میں مریم سے سامنا ہو گیا۔

''آپی! عمر بھائی آ گئے ہیں۔'' انتہائی جوش و خروش سے یہ جملہ یوں بولا گیا گویا کہنا چاہ رہی ہو'' آپی! پرنس چارلس آ گئے ہیں۔''

بلا کی ایکسائٹمنٹ اور خوشی اس کے چہرے پر نظر آ رہی تھی اور میرا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا جبکہ وہ اپنی دھن میں مگن میرے تاثرات سے بے خبر بولنے میں مصروف تھی'' ہم لوگ تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ دیکھیں ذرا، کتنے چالاک ہیں، اپنے آنے کا پہلے سے بتایا بھی نہیں۔ کہنے لگے تم لوگوں کو سرپرائز دینے کے لیے اس طرح آیا ہوں۔''

اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر میں نے کچن کا رخ کیا۔ آوازوں سے لگ رہا تھا کہ تمام خواتین یہیں موجود ہیں۔ کچن کے دروازے سے اندر کا جائزہ لیا تو وہاں ایمرجنسی کا نفاذ تھا۔ ہر کوئی مصروف، کسی کے پاس بات کرنے کی فرصت نہیں تھی اور تو اور دادی بھی اپنے جوڑوں کا درد اور دیگر تمام بیماریاں بھلائے بڑی تندہی سے لاڈلے پوتے کی آمد پر شاندار ضیافت کے اہتمام میں لگی ہوئی تھیں۔ میرے سلام کا جواب بھی بڑے سرسری انداز میں دیا گیا۔

میں بڑے آف موڈ کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔ دوپٹہ، بیگ اور سینڈلز اچھال کر دور پھینکیں۔

''یہ عمر کا بچہ آ کیسے گیا، کہاں تو سب کہہ کہہ کر تھک گئے تھے اور موصوف آ کر نہیں دے رہے تھے یا اچانک نازل ہو گئے۔'' کھولتے دماغ کے ساتھ میں ہاتھ منہ دھوئے بغیر ہی بستر پر لیٹ گئی۔

''اب طے یہ کرنا ہے کہ مجھے اس سے کس طرح ملنا چاہیے، دوستانہ تعلقات تو ہمارے کبھی رہے نہیں ہیں۔ اسے بالکل اگنور کر دوں یا سرسری سے انداز میں مل کر رسمی سی باتیں کر لوں۔'' میں لیٹے لیٹے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے لگی۔

اس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ماضی کے بہت سے واقعات یاد آنے لگے جو ہرگز بھی خوشگوار نہیں تھے مگر وہ آخری بات اس کے لیے تو میں اس خبیث کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ دراصل میں بڑی کینہ پرور اور منتقم مزاج واقع ہوئی ہوں، کوئی میری انسلٹ کرے، مجھے کوئی نقصان پہنچائے یا دکھ دے میں اسے کبھی معاف نہیں کرتی بلکہ اس کے خلاف دل میں کینہ پالے رکھتی ہوں اور یہ عمر فاروقی، یہ تو میرا پیدائشی اور جانی دشمن ہے۔ حالانکہ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اسے مجھ سے کس بات کی پرخاش تھی۔ میرا انتقامی جذبہ تو محض جوابی قسم کا تھا۔ اس دشمنی کا آغاز تو اس کمینے نے شاید میری پیدائش کے روز ہی کر دیا تھا مگر میں نے ہی یہ بات بہت بعد میں سمجھی۔

میں جب اس دنیا میں آئی تو وہ اس وقت چار سال کا تھا۔ گھر کا اکلوتا اور لاڈلا بچہ، دادی کی آنکھ کا تارا، اپنے ماں باپ کا پیارا اور میرے مما

ممی کو ہی شاید کچھ میری حالت پر رحم آیا تو بولیں۔ ''کیوں بچی کو ڈانٹ رہی ہو صوفیہ! ابھی چھوٹی ہے، بڑی ہوگی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''خاک ٹھیک ہو جائے گی۔ پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں۔ دن رات ایک کر کے اسے پڑھایا تھا مگر نتیجہ وہی، انتہائی کوڑھ مغز لڑکی ہے۔ یہ عمر بھی تو ہے، حالانکہ گھر میں کوئی اسے اتنی توجہ سے پڑھاتا بھی نہیں مگر پھر بھی دیکھ لیں، کاش جتنی محنت اس پر کی ہے عمر پر کرتی کچھ دل کو خوشی تو ہوتی۔'' مما کے الفاظ میں جھکے سر کے ساتھ بڑے غمزدہ انداز میں سن رہی تھی اور وہ سامنے دانت نکالے یوں کھڑا تھا گویا مجھے ڈانٹ کھاتا دیکھ کر اسے کتنی بڑی خوشی ملی ہے۔

سب گھر والوں نے عمر کو ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی تحائف دیئے تھے۔ دادی نے اسے پورے دو سو روپے دیئے تھے جبکہ مجھے صرف ممی ڈیڈی نے باربی ڈول گفٹ کی تھی، باقی کسی نے کچھ نہ دیا تھا۔ اس روز میں اپنے کمرے میں جا کر خوب روئی تھی۔

''کیا ہوا، تم رو کیوں رہی ہو؟'' تھوڑی ہی دیر بعد وہ میرے سر پر کھڑا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ آئس کریم کھاتا چہرے پر خباثت سجائے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔

''دادی نے مجھے دو سو روپے دیئے تھے، میں نے ان سے برگر اور بروسٹ کھایا، اب آئس کریم کھا رہا ہوں۔ باقی پیسوں کا سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کھاؤں؟ تم بتاؤ ناں۔'' اور اس وقت وہ مجھے زندگی میں پہلی دفعہ نہایت برا لگا تھا۔

خوب زبان نکال نکال کر کون چاٹ رہا تھا اور میں رونا دھونا بھول کر ندیدوں کی طرح کون کی طرف دیکھ رہی تھی مگر اس خبیث نے جھوٹے منہ بھی کھانے کی آفر نہ کی۔

''پتا ہے چھوٹی ممی نے مجھے گفٹ میں واک مین دیا ہے۔'' وہ مما کو چھوٹی ممی کہتا تھا ''تمہیں انہوں نے کیا دیا؟'' لہجہ مکاری سے بھرپور تھا۔

''تمہارا سر دیا ہے، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' میں غصے سے پھنکاری تھی اور بس پھر وہیں سے ہماری دشمنی کا آغاز ہو گیا تھا بلکہ ہماری نہیں میری۔ وہ تو میرا پیدائشی دشمن تھا۔ میری ہی سمجھ میں یہ ساری بات ذرا دیر سے آئی۔

مجھے لگتا وہ صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے اتنا پڑھا کو بنتا ہے ورنہ اسے پڑھنے وڑھنے کا کوئی خاص شوق نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں اس کی طرح بہت جینئس نہیں تھی مگر مما اٹھتے بیٹھتے میری کوڑھ مغزی اور جہالت کے قصے سب کو سنانا اپنا فرض سمجھتی تھیں اور میری اس سے دشمنی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر بات میں میرا اس کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا اور پھر تا دیر میرے اوپر اظہارِ افسوس ہوتا اور میرے مستقبل سے مایوسی کا اظہار کیا جاتا۔ ایسے موقعوں پر اس کے چہرے پر موجود تاثرات میرا خون کھولانے کو کافی ہوتے تھے۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ میرے اپنے ہی گھر میں میری حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ کاش میں ممی کے ہاں ہی پیدا ہو جاتی۔ کم از کم میرے سگے ماں باپ سے تو وہی دونوں مجھے زیادہ پیار کر لیتے ہیں۔ میرے ماں باپ تو اس مقولے پر سختی سے عمل پیرا تھے کہ اولاد کو کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نگاہ سے مگر یہاں تو نوالہ بھی سونے کا نہ تھا۔

اس خبیث کو پتا نہیں کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے سبزیاں پسند نہیں ہیں۔ اس لیے روز صبح اسکول جاتے ہوئے کہتا۔

پاپا کا راج دلارا، چار سال تک وہ بلا شرکت غیرے سب کی چاہتیں اور محبتیں سمیٹتا رہا۔

ہوسکتا ہے وہ مجھ سے اس بات پر خار کھاتا ہو کہ میں نے اس کی سلطنت اور اس کا اقتدار چھیننے کی کوشش کیوں کی ہے۔ حالانکہ یہ اس کی غلط فہمی ہی ہوسکتی تھی، مجھے تو اس کے آگے کبھی کسی قابل سمجھا ہی نہیں گیا۔ صرف اور صرف اس کی وجہ سے ہمیشہ میرا استحصال کیا گیا۔

اپنے ماں باپ کے تو سب ہی لاڈلے ہوتے ہیں اور وہ تو تھا بھی اکلوتا سو وہ ممی اور ڈیڈی کا لاڈلا تھا لیکن میرے مما پاپا نے ہمیشہ مجھ پر اسے ترجیح دے کر میرے جذبات کو مجروح کیا اور دادی انہیں تو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ جبکہ میں انہیں کبھی اچھی لگی ہی نہیں۔ بے ڈھنگی، بدتمیز اور بدتہذیب اور اسی قسم کے دیگر کئی القاب میں نے بچپن سے ان کے منہ سے اپنے لیے سنے اور میری مما، انہوں نے کبھی اس بات کا برا نہیں مانا کہ دادی ان کی لاڈلی کو ایسے القاب سے کیوں نوازتی ہیں۔

آج بھی سوچتی ہوں تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ کہاں کہاں اس کمینے کی وجہ سے میرے اپنوں نے مجھے نظر انداز کیا۔ بہت بچپنے کی باتیں تو مجھے یاد نہیں لیکن پوری امید ہے کہ اس وقت بھی میرے ساتھ کئی زیادتیاں ہوئی ہوں گی۔

اپنے ساتھ ہونے والا پہلا برا سلوک جو مجھے یاد ہے وہ یہ تھا کہ میں اس وقت تھرڈ اسٹینڈرڈ میں تھی۔ میرا اور عمر کا اسکول ایک ہی تھا۔ اس روز ہمارا رزلٹ آنا تھا۔ گھر سے ممی، ڈیڈی، مما اور پاپا آئے تھے۔ عمر نے اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھتے ہوئے نہ صرف اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لی تھی بلکہ پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کا نام اناؤنس ہو رہا تھا۔ فرسٹ پوزیشن عمر فاروقی، بیسٹ اسٹوڈنٹ آف دا ایئر۔ عمر فاروقی، موسٹ ریگولر اسٹوڈنٹ عمر فاروقی، بیسٹ ڈبیٹر عمر فاروقی اور پتا نہیں کیا کیا۔ اس کی برابر والی چیئر پر ٹرافیوں، شیلڈز اور سرٹیفکیٹس کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ سب لوگ رشک بھری نظروں سے ممی اور ڈیڈی کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یہ اتنا قابل اور ذہین لڑکا ان کا بیٹا ہے۔

میں بھی خوب زور و شور سے تالیاں پیٹ رہی تھی اور خوش ہوتی ہر ایک کو بتا رہی تھی کہ یہ عمر فاروقی میرا فرسٹ کزن ہے۔ ہمارے پرنسپل صاحب نے بھی بطور خاص ممی ڈیڈی کو مبارک باد دی تھی اور کہا تھا کہ ان کا بیٹا نہایت ہی ہونہار اور لائق ہے۔

گھر پہنچے تو دادی بڑی بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ''اماں آپ کے لاڈلے نے حسب سابق اس بار بھی میدان مار لیا ہے۔'' پاپا خوشی سے بھرپور آواز میں دادی کو بتانے لگے تو دادی ''میرا چاند، میرا لعل'' قسم کے الفاظ کہتی اسے کلیجے سے لگائے خوب پیار کرنے لگیں۔

''تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو، جاؤ جا کر یونیفارم چینج کرو۔'' مما نے بڑے غصیلے انداز میں کہا۔ میں ان کے لہجے پر ابھی ڈھنگ سے حیران بھی نہ ہو پائی تھی کہ دادی میری طرف متوجہ ہوئیں اور بولیں۔

''کیوں بھئی، تمہارا کیا رہا۔''

''دکھاؤ دادی کو اپنا کارنامہ۔'' مما جل کر بولیں اور رپورٹ کارڈ میرے ہاتھ سے چھین کر دادی کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔

''دیکھیں آپ بھی پوتی کی ذہانت، صرف ڈرائنگ میں ''A'' اور انگلش میں ''A'' باقی سب میں ''C'' اور ''D'' گریڈ لے کر کتنے فخر سے گردن تانے کھڑی ہیں جیسے ابھی ہم سب ان کو پھولوں کے ہار پہنائیں گے۔'' مما پھٹ پڑیں اور میرا سر شرم سے جھک گیا۔

''دادی! آج پیاز کریلے پکایئے گا۔'' اور دادی پوتے کے منہ سے اپنی پسندیدہ ڈش کا نام سن کر خوشی سے نہال ہو جاتیں۔ خوب دل لگا کر اپنے ہاتھوں سے پیاز کریلے پکا کر رکھتیں۔ پتا نہیں ان کے ساتھ کیا کیا سلوک کرتیں کہ وہ خوب کڑوے پکتے۔ ''کریلے کڑوے ہی نہ ہوں تو وہ کریلے ہی کیا ہوئے۔'' اس بارے میں ان کا مقولہ تھا۔

کھانے کی میز پر بیٹھ کر میں دیکھتی تو کریلے میرا منہ چڑا رہے ہوتے۔

''میں نہیں کھاؤں گی یہ اتنے کڑوے کریلے۔'' میں منہ پھلا کر کہتی۔

''دیکھ رہی ہو صوفیہ! لڑکی کے لچھن۔'' دادی مما سے مخاطب ہوتیں اور مما کڑے تیوروں سے مجھے گھورنے لگتیں۔ میں چپ چاپ آنسو پیتے وہ کریلے حلق سے اتارنے لگتی۔ کبھی کبھار ایسے کسی موقع پر ممی کو میرے اوپر ترس آ جاتا تو وہ کہتیں۔

''آؤ تابی! میں تمہیں پراٹھا پکا دوں۔'' میرے کچھ کہنے سے پہلے دادی انہیں ٹوک دیتیں۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اس کا دماغ خراب کرنے کی۔ پہلے ہی یہ بہت بدتمیز ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے بچوں کی تربیت کا۔ ہم نہیں سکھائیں گے تو کون سکھائے گا۔'' گویا میری اچھی بری تمام تربیت کا انحصار میرے کریلے کھانے پر تھا۔

دراصل ایسے ہی کسی موقع پر میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ'' آپ خود بھی تو مرغی کا گوشت نہیں کھاتیں، یہ نخرے میں نے آپ سے ہی سیکھے ہیں۔'' بس اس دن سے دادی نے یہ بات پلو سے باندھ لی تھی کہ میں بہت بدتمیز، بے ہودہ اور بدلحاظ ہوں۔ چنانچہ میری تربیت کی جانب فوراً توجہ دینی چاہیے وگرنہ بعد میں پچھتانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا اور وہ جس نے فرمائش کر کے کریلے پکوائے ہوتے وہ بڑے آرام سے دو چار ہی نوالے لیتا۔ سب کی توجہ تو میری جانب ہوتی، کوئی اسے دیکھتا بھی نہیں۔

''یہ عمر بھی تو ہے، دیکھو کتنے آرام سے ہر چیز کھا لیتا ہے، تم کہیں کی نوابزادی ہو، لڑکیوں میں یہ نخرے بازی بالکل اچھی نہیں۔'' دادی مزید میرا دل جلاتیں اور وہ شیطانی مسکراہٹ چہرے پر سجائے چپ چاپ بیٹھا رہتا۔

دوپہر کے وقت گھر میں خواتین اور ہم بچے ہی ہوتے اسی لیے روزانہ اسی قسم کے عجوبے کھانے کو ملتے۔ کبھی آلو پھلی، کبھی کدو، کبھی ٹینڈے، کبھی کریلے۔ کیونکہ خواتین ساری سبزی خور تھیں اور مرد گوشت خور لہٰذا شام میں اچھا کھانا پکتا تو میں پیٹ بھر کر کھانا کھاتی مگر شکایت کس سے کرتی؟ یہاں تو سب ہی میرے دشمن تھے اور وہ ایڈیٹ دادی سے ان کے کریلوں کی خوب تعریفیں کر کے اپنے کمرے میں چلا جاتا اور پھر وہاں بیٹھ کر بروسٹ یا سینڈوچز وغیرہ جو اس نے پہلے سے لا کر رکھے ہوئے ہوتے تھے مجھے دکھا دکھا کر کھاتا۔

میرا اور اس کا کمرہ آمنے سامنے تھا۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ جان بوجھ کر کھول کر بیٹھ جاتا اور خوب مزے لے کر میری پسندیدہ چیزیں مجھے دکھا دکھا کر کھاتا اور میں اسے گالیاں دیتی رہ جاتی۔ مما تو میری پاکٹ منی کے بارے میں بھی مجھ سے اتنی سخت باز پرس کرتی تھیں کہ میں چاہتے ہوئے بھی اس کی طرح اپنے لیے ایسا کوئی انتظام نہیں کر سکتی تھی۔ اسے تو ڈیڈی کے علاوہ دادی بھی الگ سے پاکٹ منی دیتی تھیں۔ سوتیلی تو صرف میں ہی تھی۔

اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں اس کے فرمائشی پروگرام کے تحت آلو پھلی کھا کر کمرے میں پڑی جل رہی تھی۔ بھوک سے برا حال تھا۔ وہ اتنی بدذائقہ پھلیاں، وہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے گائے بھینسوں کا چارہ کھالیا ہو۔

اسی وقت میری نظر سامنے پڑی۔ وہ بڑے سے سائز کا پیزا خوب منہ پھاڑ پھاڑ کر کھا رہا تھا۔ سائڈوں سے گرتی چیز (پنیر) دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ دو کین پیپسی کے سامنے رکھے، ایک نوالہ پیزے کا اور ایک سپ پیپسی کا وہ اردگرد سے بے نیاز نظر آنے کی مکمل کوشش کر رہا تھا۔

''بچو جی! آج تمہیں رنگے ہاتھوں نہ پکڑوایا تو میرا نام تاباں نہیں۔'' میں غصے میں کھولتی اور خود پر افسوس کرتی کہ اس کی یہ مکاری اتنے دنوں سے برداشت کر ہی کیوں رہی تھی اپنے کمرے سے نکلی اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی مما کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔

''کیا بات ہے؟'' انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''جلدی سے آئیں، آپ کو آپ کے لاڈلے کی شرافت کا نظارہ کرانا ہے۔'' میں نے انہیں باقاعدہ ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ حیران سی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہیں لے کر جیسے ہی میں اس کے کمرے میں پہنچی تو اندر کا منظر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ جائے نماز بچھائے، سر پر ٹوپی جمائے دعا مانگنے میں مصروف تھا۔

مما کبھی اسے دیکھتیں کبھی مجھے، جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''مما یہ مکاری کر رہا ہے، ابھی ابھی یہ یہاں بیٹھا ہوا پیزا کھا رہا تھا۔'' میں غصے سے پاگل ہونے لگی۔ وہ دعا مانگنے کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرتا اٹھ کھڑا ہوا اور جائے نماز لپیٹتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولا۔

''کیا ہوا چھوٹی ممی! کیا بات ہے؟''

''مجھے خود نہیں معلوم، یہ تابی مجھے اٹھا کر لائی ہے۔'' مما کو شاید اب کچھ غصہ آنا شروع ہو گیا تھا اس لیے بڑی بے زاری سے بولیں۔

میں ان دونوں کی گفت وشنید سے بے نیاز فوراً آگے بڑھی اور بیڈ کے نیچے جھک کر دیکھا۔ اس کے بعد کمپیوٹر کی ٹیبل کے نیچے، پھر ڈسٹ بن کے اندر اور اس کے بعد اس کے وارڈ روب کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ مما کی تیز چیخ سنائی دی۔

''کیا بدتمیزی ہے تابی! کیوں تم یہ فضول حرکتیں کر رہی ہو؟''

''میں فضول حرکتیں نہیں کر رہی ہوں، یہ ابھی مجھے جلا کر اور دکھا کر پیزا اور پیپسی کھا پی رہا تھا۔'' میں نے نفرت سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

''ہونہہ، دادی آج آپ کے ہاتھ کی پکی آلو پھلی کھاؤں گا۔'' میں نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔ مما خاموش کھڑی مجھے گھور رہی تھیں۔

''آپ لوگ اسے بڑا معصوم سمجھتے ہیں ناں، مجھ سے پوچھیں یہ کتنا بڑا مینا ہے۔'' میری آواز غم وغصے سے پھٹ پڑی۔

''ٹھیک کہتی ہیں تمہاری دادی، تمہاری تربیت میں ہم سے واقعی بہت کوتاہی ہوئی ہے۔ تمہیں تو بڑے چھوٹے سے بات کرنے کی تمیز بھی ختم ہو گئی ہے۔ آلینے دو آج اپنے پاپا کو، تمہاری شکایت کروں گی۔'' مما نے پاپا کا ڈراوا دیا جو کارگر ثابت ہوا اور میرا سارا جوش اور غصہ فوراً سرد پڑ گیا۔ مما اب اس سے مخاطب تھیں۔

''عمر! تم اس کی اوٹ پٹانگ باتوں پر توجہ مت دینا۔ بالکل ہی بے ہودہ ہوگئی ہے یہ اور تم اب کچھ دیر آرام بھی کرلو۔ رات کو اتنی دیر تک جاگ کر پڑھتے رہتے ہو۔ تھوڑا بہت ریسٹ بھی ضروری ہوتا ہے۔'' بڑے پیار سے اس کا سر تھپتھپاتے مما کمرے سے چلی گئیں۔

اور وہ دنیا زمانے کی خباثت چہرے پر سجائے بالکونی کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پیزا کی پلیٹ اور پیپسی اٹھا کر واپس اندر آیا تو میں مما کو آواز دیتی رہ گئی۔ کیا فائدہ وہ پھر مجھے ہی جھوٹا ٹھہرائیں گی۔

''آؤ تم بھی تھوڑا سا چکھ لو۔'' دوبارہ بستر پر بیٹھ کر کھانے میں مصروف ہوتے ہوئے اس نے مجھے بھی کھانے کی آفر کی تو میں اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر اپنے کمرے میں واپس آگئی اور خوب روئی۔ ایک تو بھوک لگ رہی تھی اوپر سے مما کے سامنے جھوٹی پڑی تھی۔ شام میں وہ میرے کمرے میں کھڑا تھا، میں اسے نظر انداز کیے اپنا ہوم ورک کرتی رہی۔

''تابی! میری یہ ڈائیگرام بنادو۔'' بڑے ہی دوستانہ لہجے میں مجھے مخاطب کیا گیا۔

''کبھی نہیں عمر! تم دفع ہوجاؤ یہاں سے کمینے۔'' میں نے دانت پیسے۔ دادی کے بہت مرتبہ ٹوکنے پر بھی میں اسے بھیا، بھائی جان یا بھائی وغیرہ نہیں کہتی تھی۔ یہ ہے اس قابل کہ اسے اتنے قابلِ احترام ناموں سے پکارا جائے؟

''سوچ لو ویسے آج تم میتھس کے پیریڈ میں کھڑی ہوئی کیوں تھیں؟'' اس کے لہجے میں موجود دھمکی نے میرا اشتعال لمحوں میں ختم کردیا۔ آج ٹیسٹ خراب ہونے پر ٹیچر نے مجھے سارے پیریڈ کھڑا رکھا تھا اور اس خبیث نے یہ نظارہ پتا نہیں کیسے دیکھ لیا تھا۔

''لاؤ دو۔'' میں نے فوراً پسپائی اختیار کی۔ اس نے جلدی سے اپنا فزکس کا جرنل میرے ہاتھ میں پکڑایا اور بولا۔

''مجھے معلوم تھا، تم کبھی بھی انکار نہیں کروگی۔'' بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا گیا تھا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے دھمکی تو دی ہی نہیں۔ میری دل چاہا کہ میں اس کا سر پھاڑ دوں۔

''اچھا دیکھو، میں کرکٹ کھیلنے جارہا ہوں، ڈائیگرام بن جائے تو جرنل میری رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دینا۔'' بڑی بے نیازی سے کہہ کر وہ چل دیا اور میں اسے دل ہی دل میں گالیاں دیتی اس کے جرنل پر ڈائیگرام بنانے لگی۔

اگلے روز مما ہم دونوں کو حسبِ عادت شام کو پڑھانے بیٹھیں تو عمر کا فزکس کا جرنل دیکھ کر باقاعدہ اچھل پڑیں اور بولیں۔

''واؤ! عمر یہ اتنی زبردست ڈائیگرام تم نے بنائی ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا میں تو یہ سمجھتی تھی کہ ڈرائنگ کے علاوہ تم ہر سبجیکٹ میں ماسٹر ہو مگر تم نے تو کمال کردیا۔'' مما کی خوشی دیدنی تھی اور وہ بڑی انکساری اور عاجزی سے سر جھکا کر بولا۔

''بس چھوٹی ممی! میں نے سوچا کہ بہت اچھی نہ سہی تب بھی تھوڑی بہت کوشش کرکے میں اپنی ڈرائنگ امپروو کرہی سکتا ہوں۔''

''یہ تھوڑی بہت کوشش نہیں ہے عمر! تم تو بڑے چھپے رستم نکلے بھئی۔ یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ کسی بہت ہی آرٹسٹک قسم کے ہاتھوں کا کرشمہ ہے۔'' مما نے اسے دل کھول کر داد دی اور میں دل ہی دل میں کھولتی چپ بیٹھی تھی۔

ایک بار دل چاہا کہ ابھی اس کا بھانڈا پھوڑ دوں مگر پھر فوراً ہی اس بلیک میلر کی دھمکی یاد آئی تو دل مسوس کر رہ گئی۔

''کچھ تم بھی سبق سیکھو عمر سے، تم سے صرف چار سال بڑا ہے مگر اس کی ذہانت اور مینٹل لیول تم سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اپنی خامی کو اس نے کمزوری نہیں بنایا اور کوشش کر کے کتنا امپروو کر لیا اور ایک تم ہو۔ مما مجھے میتھس اچھا نہیں لگتا، مما میں سائنس نہیں پڑھوں گی۔ یہ نہیں ہوا کہ کبھی اپنی کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کی ہو۔'' اس خبیث کی تعریف ہو اور مما مجھے پھٹکارنا بھول جائیں ایسا تو تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔

اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر احتجاج کروں۔ میرے ڈرائنگ میں ''A'' آتے تو وہ میرے لیے بہت بڑا طعنہ بن جاتا اور اس نے اگر اچھی ڈرائنگ بنالی (جو کہ اس نے بنائی بھی نہیں تھی) تو واہ واہ۔ میرے اندر کے آرٹسٹ کو تو مما کے طنز اور طعنے ہی کھا گئے تھے ورنہ مجھے پورا یقین تھا کہ ایک دن میں بہت ہی بڑی مصورہ بن سکتی تھی مگر افسوس!

وہ بظاہر سر جھکائے معصومیت سے بیٹھا تھا اور میں غم و غصے سے بے حال ہو رہی تھی پھر ایسی کتنی ہی دھمکیاں دے کر اس نے اپنے فزکس کے پورے جرنل پر مجھ سے ڈائیگرامز بنوائی تھیں اور ہر بار میری کوئی نہ کوئی کمزوری اس کے ہاتھ ہوتی تھی۔ میری نالائقی سے تو مما واقف تھیں مگر یہ میں نہیں چاہتی تھی کہ انہیں پتا چلے کہ میں روزانہ بلا ناغہ میتھس اور سائنس کے پیریڈ میں بطور سزا کھڑی کی جاتی ہوں، اس لیے خاموشی ہی میں عافیت جانی اور اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتی رہی۔ پھر اس بلیک میلنگ سے نجات اس وقت ملی جب وہ میٹرک کر کے اسکول سے دفع ہوا۔

اس کا میٹرک کرنا بھی ایک دل جلانے والا واقعہ ہے۔ میٹرک میں اس نے کراچی بورڈ میں تیسری پوزیشن لی تھی اور باقاعدہ اس کی اخبار میں تصویر چھپی تھی اور انٹرویو بھی۔ مجھے اب اس کی کامیابیوں پر کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی اس لیے میں نے اسے جھوٹے منہ بھی مبارکباد نہیں دی تھی۔ رشتے دار، دوست احباب سب کا ہمارے گھر تانتا بندھ گیا تھا۔ کوئی مٹھائی، کوئی ہار اور کوئی تحفہ اٹھائے چلا آ رہا تھا اور وہ سب کی مبارکباد کے جواب میں بڑی بے نیازی کے ساتھ کہتا۔

''شکریہ، ویسے میں کچھ زیادہ خوش نہیں، اصل خوشی تو اس وقت ہوتی جب میں پورے سندھ میں پہلی پوزیشن لیتا، خیر اگلی بار سہی اور تمام لوگ اس کے بلند حوصلے اور اونچے ارادوں کی تعریفیں کرنے لگتے جبکہ میں دل ہی دل میں جل کر رہ جاتی۔

''اللہ کرے انٹر میں تمہارا ''D'' گریڈ آئے پھر گردن اکڑانا۔'' میں اسے بددعائیں دیتی۔

دادی اور گھر کے دیگر افراد کی نظروں میں اس واقعے کے بعد وہ اور بھی معتبر ہو گیا تھا۔ اس موقع پر بھی مما اور دادی مجھ پر طنز کرنا نہ بھولی تھیں اور خوب میرا دل جلایا تھا۔

مجھ سے اچھی تو مریم ہی تھی۔ اس کی جان ایسی کسی بھی مقابلہ بازی سے بچی ہوئی تھی۔ مریم مجھ سے سات سال چھوٹی تھی اور یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ میرے سات سال بعد اس دنیا میں آئی اور عمر نامی بلا کے چنگل سے بچ گئی۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی، سب سے چھوٹی۔ ہر کوئی اسے پیار کرتا عمر سمیت۔ وہ عمر سے اتنی چھوٹی تھی کہ مما یا دادی کبھی اس کا عمر کے ساتھ مقابلہ کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ بدنصیب تو میں تھی جس کی نہ کوئی قدر تھی نہ وقعت۔

نائنتھ کلاس میں پہنچی تو مما مجھے زبردستی سائنس دلوانے لگیں۔

''مما! میں سائنس نہیں پڑھوں گی۔ مجھے آگے جا کر فائن آرٹس پڑھنا ہے اس لیے آپ مجھے آرٹس لینے دیں۔'' میں نے دل کڑا کر کے مما کی مخالفت کی تو وہ صدمے سے پاگل ہونے لگیں۔

''میری بیٹی آرٹس پڑھے گی میری۔'' وہ یوں بول رہی تھیں جیسے میں نے کوئی بہت گھٹیا، خراب بات کر دی ہے۔

''کرو گی کیا تم آرٹس پڑھ کر، بی اے کرنے سے بہتر ہے کہ بندہ پڑھائی کرے ہی نہ۔ سارے جگ کے نکمے اور نالائق لوگ آرٹس پڑھتے ہیں، کچھ پتا ہے تمہیں۔''

مما ایم ایس سی گولڈ میڈلسٹ تھیں اور ان کا خیال تھا کہ صرف سائنس پڑھنے والے لوگ ہی قابل اور ذہین ہوتے ہیں۔ میں اس وقت اتنی چھوٹی تھی کہ ان سے بحث بھی نہیں کر سکتی تھی ورنہ ضرور پوچھتی یہ جو آپ اپنی گفتگو کے دوران شیکسپیئر، برنارڈ شا، شیلے اور کیٹس کے حوالے وقتاً فوقتاً دیا کرتی ہیں ان سب میں سے ذرا بتائیں کہ سائنسدان کون تھا۔ بندے کی اپنی دلچسپی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کسی کی قابلیت جانچنے کا یہ کوئی معیار نہیں کہ بندہ لازمی سائنس پڑھا ہوا ہو۔ مما کے ان ہی خیالات کی وجہ سے خاندان کی کتنی ہی لڑکیاں جو ایف اے، بی اے کر رہی تھیں مما سے ناراض تھیں مگر وہ مما ہی کیا جو کسی کی پرواہ کر لیں۔

''بس میں کچھ نہیں جانتی، تمہیں سائنس پڑھنی ہے اور اب اس موضوع پر کوئی بحث نہیں ہونی چاہیے، غضب خدا کا لوگ کیا کہیں گے کہ ہماری بیٹی اتنی ڈفر اور کند ذہن ہے۔'' مما نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا تو کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے عمر نے بھی ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھا اور بڑے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''چھوٹی ممی! اسے چراغ تلے اندھیرا کہتے ہیں۔''

''تم تو چپ بیٹھو خبیث۔'' پورا جملہ با آواز بلند اور خبیث منہ ہی منہ میں بول کر میں نے اسے گھورا تو دادی حسب عادت میدان میں کود پڑیں۔

''کچھ تمیز ہے بڑے بھائی سے بات کرنے کی یا نہیں۔ نہ تعلیم میں اچھی نہ اخلاق و آداب میں۔ ارے صوفیہ! میں سوچتی ہوں اس لڑکی کا بنے گا کیا، اگلے گھر جا کر تو یہ ناک ہی کٹوا دے گی۔'' ناک کے اوپر عینک جماتی دادی مجھے گھور رہی تھیں۔

میں پیر پٹختی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تھی۔ پھر وہی ہوا جو اس سے پہلے میرے ساتھ ہوتا آیا تھا۔ فزکس، کیمسٹری میتھ پڑھتے ہوئے میں روہانسی ہو جاتی مگر مما کا دل نہ پسیجتا۔

مڈٹرم میں میرے فزکس میں تو بمشکل پاسنگ مارکس آئے اور میتھس میں تو خوب شاندار طریقے سے فیل ہو گئی۔ مما نے گھر میں طوفان اٹھا دیا۔ مجھے تو جتنا برا بھلا کہہ سکتی تھیں کہا۔ میں نے ان کی ڈانٹ کی کچھ خاص پرواہ بھی نہیں کی کہ ان کی ڈانٹ کھا کھا کر اب میں خاصی ڈھیٹ ہو گئی تھی مگر ڈانٹ پھٹکار کے اختتام پر مما نے جو فیصلہ صادر فرمایا وہ میرے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

''تمہارے ٹیوٹر کو میں آج سے فارغ کر رہی ہوں، کل سے تمہیں فزکس اور میتھس عمر پڑھائے گا۔ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' مما نے

میرے احتجاج کے لیے کھلتے لبوں کو نظر انداز کر کے مجھے باہر نکل جانے کا حکم سنایا تو میں مرے مرے قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں آ گئی۔

مما کے دوٹوک انداز کے سامنے تو پاپا پر نہیں مار سکتے تھے، مجھ غریب کی کیا مجال۔ سو چپ چاپ مان جانے میں عافیت سمجھی۔

''تین بجے آ جانا اسٹڈی میں، وہیں پڑھاؤں گا تمہیں۔'' عمر نے اگلے روز ناشتے کی میز پر مجھ سے کہا تو میں اس کی کمینگی پر کھول کر رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ میں دوپہر میں کتنی پابندی سے سوتی ہوں اس لیے جان بوجھ کر اس نے وہی ٹائم رکھا تھا۔

''عمر! ہم شام میں نہیں پڑھ سکتے؟'' میں نے غصہ دباتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''شام میں میں فارغ نہیں ہوتا اگر پڑھنا ہے تو دوپہر ہی میں پڑھاؤں گا ورنہ جو دل چاہے کرو۔'' وہ بڑے بے مروت انداز میں بولا تو میں نے نرمی کا چولا اتار پھینکا اور اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں بولی۔

''بھاڑ میں جاؤ، یہاں تم سے پڑھنے کے لیے کون مر رہا ہے۔''

''تابی! کیا بدتمیزی ہے۔ تمہیں بات کرنے کی تمیز آخر کب آئے گی۔'' مما نے مجھے سب کے سامنے حسب عادت ڈانٹا تو میں بے اختیار رو پڑی اور بولی۔

''ہاں میں ہی بدتمیز ہوں یہ بڑا تمیز دار اور اچھا ہے۔ جان کر دوپہر کا ٹائم رکھا ہے تاکہ میں سو نہ سکوں اور خود نواب صاحب شام میں بڑے مصروف ہوتے ہیں، اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں۔'' اپنے دوستوں کے لیے لفظ آوارہ پر وہ تڑپ اٹھا مگر اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی دادی اس کی حمایت میں مجھ پر الٹ پڑیں۔

''پہلے اس جیسی بن کر دکھاؤ پھر اس کا مقابلہ کرنا، دوپہر میں سونا بہت ضروری ہے۔ اپنے مستقبل کی کچھ فکر نہیں۔ ارے میرے عمر جیسا سارے خاندان میں ایک بھی ڈھونڈ کر دکھاؤ تو میں جانوں، ایسا گنوں والا میرا بچہ ہے۔ تم سے صرف چار سال بڑا ہے مگر پڑھائی میں پانچ کلاسیں آگے ہے۔ اخلاق اور تمیز میں بھی تم سے بہتر ہے۔''

پتا نہیں دادی کو مجھ سے کون سی خاندانی دشمنی تھی، کبھی کبھی تو مجھے لگتا، میں شاید ان کی سگی پوتی ہی نہیں ہوں۔ پاپا اور ڈیڈی تو اس جھگڑے کے شروع ہونے سے پہلے ہی آفس جا چکے تھے ورنہ ڈیڈی ضرور میری حمایت میں بولتے۔ وہ عمر کی بے جا حمایت کرنے پر اکثر دادی کی مخالفت کرتے تھے۔ اسی لیے سارے گھر میں وہی مجھے سب سے اچھے اور سلجھے ہوئے انسان لگتے تھے۔

ممی بھی مجھ سے پیار کرتی تھیں مگر دادی کے مقابل ڈٹ جانے کی ان کی مجال نہ تھی۔ دادی تو ہمارے گھر کی ہٹلر تھیں۔ یہاں ان ہی کی ڈکٹیٹر شپ چلتی تھی اور ہم عوام کے لیے زبان بندی کا حکم تھا۔ دادی کے ہاتھوں میری عزت افزائی پر وہ بڑا خوش اور مسرور دکھائی دے رہا تھا اور میں چپ چاپ اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ دوپہر میں تین بجے اسٹڈی کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی۔ خوامخواہ اپنی بے عزتی کروائی، ہوا تو وہی جو اس نے چاہا تھا۔ آخر مجھے یہ بات کب سمجھ میں آئے گی کہ اس گھر میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔

''آپی! آپ رو رہی ہیں۔'' کوریڈور میں بیٹھی گڑیا سے کھیلتی مریم نے مجھے آنسو صاف کرتے دیکھ کر پوچھا تو میں بغیر کوئی جواب دیئے

آگے بڑھ گئی۔

''کاش مریم مجھ سے اتنی چھوٹی نہ ہوتی تو میں اسی سے اپنا دکھ سکھ کہہ لیا کرتی۔'' میں نے اسٹڈی میں قدم رکھتے ہوئے سوچا۔ وہ پہلے سے وہاں موجود کمپیوٹر پر گیم کھیل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھا اور ٹیبل کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے مقابل کرسی سنبھال کر بیٹھ گئی۔ پندرہ بیس منٹ وہ مجھے میتھس سمجھاتا رہا اور پھر یہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا کہ۔

''اب ایک ایک کر کے اس ایکسرسائز کے سارے سوال حل کرو۔'' اور خود دوبارہ گیم کھیلنے لگا۔

بہت دیر تک کوشش کرنے کے باوجود بھی مجھ سے ایک سوال بھی حل نہ ہو سکا تو میں روہانسی آواز میں بولی۔

''عمر! مجھ سے نہیں ہو رہا۔''

''کیوں نہیں ہو رہا، ابھی اتنی اچھی طرح تو میں نے سمجھائے ہیں۔'' وہ جھنجھلاتی ہوئی آواز سمیت میری طرف گھوما اور مجھے گھورتا ہوا کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھ آیا ''تم مجھے کھیلنے نہیں دو گی، بکو کیا تکلیف ہے؟'' اس وقت کیونکہ اسی کے رحم و کرم پر تھی اس لیے کچھ کہہ بھی نہ سکی کہ

''کھیلو مرو میرے اوپر احسان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' پتا تھا شکایتی ٹٹو بعد میں مما اور دادی کو ایک کی دس لگا کر سنائے گا اور جواباً میری عزت افزائی ہو گی اس لیے منت بھرے انداز میں بولی۔

''میرے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پلیز ایک دفعہ پھر سمجھا دو۔'' میرے منت بھرے انداز پر وہ مجھ پر ترس کھاتا ہوا مجھے پھر سمجھانے بیٹھ گیا اور بولا۔

''تم میرے سامنے حل کرو، جہاں غلط کرو گی میں ٹوک دوں گا۔'' میں نے اللہ کا نام لے کر سوال کرنا شروع کیا تو وہ چیخ اٹھا۔

''موٹو! تمہیں تو LCM لینا بھی نہیں آتا۔ اوہ مائی گڈنیس۔'' سب کے سامنے تابی اور اکیلے میں وہ اکثر مجھے موٹو کہہ کر مخاطب کرتا جس کی میں ہرگز بھی پرواہ نہیں کرتی تھی کہ ایک مرتبہ اس کی شکایت کرنے پر ممی نے مجھے سمجھایا تھا کہ

''میری بیٹی کوئی موٹی ووٹی نہیں، بس ذرا بھرے جسم کی ہے اور وہ سوکھا سڑا ہے اس لیے تم سے جلتا ہے۔'' بس اس دن سے میں مطمئن ہو گئی تھی۔

رات میں مما نے اس سے میری پروگریس پوچھی تو وہ بڑے مایوس کن انداز میں بولا ''چھوٹی مما! بہتر تھا آپ اسے آرٹس ہی پڑھنے دیتیں، گو میتھ تو وہاں بھی پڑھنا ہو گا مگر آرٹس اتنا مشکل نہیں ہوتا۔'' پھر وہ دونوں تا دیر میرے غم میں گھلتے رہے اور میں کھولتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

پھر بڑی پابندی کے ساتھ وہ بغیر کوئی ناغہ کیے مجھے پڑھانے لگا۔ تین سے پانچ پڑھا کر خود کرکٹ کھیلنے کلب چلا جاتا جبکہ میری چھٹی چھ بجے ہوتی تھی۔ پانچ سے چھ مجھے فزکس یاد کرنی ہوتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ میں مجھے سمجھا کر فارغ کر کے وہ کبھی واک مین کان سے لگائے فلور کشن پر نیم دراز ہو جاتا، کبھی کمپیوٹر پر گیم کھیلتا رہتا۔ وہ ان دنوں ایم ایس سی کے پہلے سمسٹر میں تھا اور میں میتھ سے پنجہ آزمائی کر رہی تھی۔ کبھی کبھار

مجھے کام دے کر وہ خود بھی اپنا پڑھنے لگتا۔ میرے امتحانوں میں تین مہینے رہ گئے تھے اسی لیے میرے اوپر ہر تفریح حرام قرار دے دی گئی تھی۔ دن بھر میں صرف ایک گھنٹہ ٹی وی دیکھنے کی اجازت تھی۔

اس رات بھی میں پڑھتے پڑھتے تھک گئی تو اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی۔ سب لوگ سو چکے تھے، عمر کے کمرے کی لائٹ بھی آف ہو چکی تھی۔ میں لاؤنج کی تمام کھڑکیاں اور دروازے احتیاطاً بند کر دیئے اور ہلکی آواز میں ٹی وی چلا کر بیٹھ گئی۔ سونی پر جوہی چاولہ اور عامر خان کی ''قیامت سے قیامت تک'' آ رہی تھی۔ بڑے دنوں کے بعد آنکھوں کو کچھ ڈھنگ کی چیز دیکھنے کو ملی تو موڈ فریش ہو گیا۔ خوب آرام سے پوری فلم دیکھ کر سوئی تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ منحوس عمر مجھے فلم دیکھتے دیکھ چکا ہے۔ مما تو عام حالات میں انڈین فلم دیکھنے کی اجازت نہ دیتی تھیں کہاں کہ امتحانوں سے تین مہینے پہلے۔ چنانچہ اگلے روز اس چغل خور کی وجہ سے مما نے مجھے کمرے میں بلا کر بے نقط سنائی۔ شکر تھا کہ کمرے میں کوئی اور نہ تھا ورنہ مما نے اس دن کوئی لحاظ روا نہ رکھا تھا۔ ان کے خیال سے میں اتنی بگڑ چکی تھی کہ اب میری اصلاح ممکن ہی نہ تھی پھر اس تمام ڈانٹ پھٹکار کا اختتام اس جملے پر ہوا کہ اب میرا وہ ایک گھنٹہ TV دیکھنا بھی بند کر دیا گیا ہے۔

''چلو جی چھٹی ہوئی یہ تو الٹی آنتیں گلے پڑنی والی بات ہوئی'' اب کسی بحث و تکرار کی گنجائش نہ تھی چنانچہ اتری ہوئی شکل کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی تو وہ سامنے کھڑا خباثت سے مسکرا رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ چھوٹی مما سے ڈانٹ کھا کر آ رہی ہو۔ ویسے اب تک تو تمہیں عادی ہو جانا چاہیے تھا۔ آخر بچپن سے ڈانٹ کھانے کی پریکٹس ہے تمہیں۔'' وہ طنز کے نشتر چلا رہا تھا اور میں انتقامی جذبات دل میں لیے اسے کوئی جواب دیئے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر اپنی اس تازہ ترین بے عزتی اور ٹی وی دیکھنے سے محرومی کا بدلہ لینے کا موقع مجھے صرف تین دن بعد ہی میسر آ گیا۔

اس روز عمر نے دوپہر میں مجھے پڑھنے کی چھٹی دے دی جس پر مجھے کافی حیرت ہوئی کہ اتنے دنوں میں اس نے کبھی ایک دن بھی چھٹی نہ دی تھی۔ میں پانی پینے کچن میں آئی تو نوری بڑی پھرتی سے ٹرے میں سموسے، کباب، کیک اور چائے کے کپ رکھ رہی تھی۔

''کوئی مہمان آیا ہے کیا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جی باجی جی! عمر بھائی کے دوست آئے ہیں جی۔ انہوں نے کہا تھا کہ چائے اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر ان کو کمرے میں پہنچا دوں۔'' اس نے اسی مصروفیت کے عالم میں جواب دیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔

''لاؤ یہ چائے مجھے دو، میں دے آؤں گی۔'' میں نے ٹرے اٹھا لی۔

''باجی جی! انہوں نے کہا تھا دروازہ بجا کر باہر سے ہی ٹرے پکڑا دینا۔'' نوری نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہا تو میں سر ہلا کر زینہ چڑھ گئی۔

آخر یہ لوگ کمرے میں بند ہو کر کیا کر رہے ہیں۔ کوئی مانے نہ مانے مگر مجھے تو عمر کے سارے دوست ایک نمبر کے لفنگے اور بدمعاش لگتے تھے۔ گھر میں اس بارے میں سب کا خیال میرے خیال سے قطعاً مختلف تھا۔ دروازہ پر دستک دیئے بغیر میں نے ایک دم انٹری دی تو اندر عجیب سی افراتفری پھیل گئی مگر میں بھی ایک کائیاں، ایک نظر میں اندر کا سارا جائزہ لے ڈالا۔

عمر اور جاوید (جس کے لمبے سلکی بالوں سے میں ہمیشہ جیلس رہتی تھی) کارپٹ پر فلور کشن پر اوندھے پڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ جبکہ احمد اور سہیل بیڈ پر دراز سگریٹ پی رہے تھے۔ پورے کمرے میں دھواں پھیلا ہوا تھا۔ سامنے ٹی وی پر Zee لگا ہوا تھا جس پر بیوٹی کانٹسٹ کی لائیو ٹیلی کاسٹ ہو رہی تھی۔ مختلف ممالک کی حسینائیں اپنا لباس فاخرہ لہراتی ادھر سے ادھر مٹکتی پھر رہی تھیں۔ ویسے ان کپڑوں کے لیے ''لباس'' خاصا غیر موزوں لفظ تھا۔ جاوید بوکھلا کر اپنے شانوں پر جھولتے بال سمیٹ کر ریموٹ سے چینل چینج کرنے لگا۔ احمد اور سہیل نے سگریٹیں ایش ٹرے میں مسل دیں۔ عمر ایک لمحے کو تو بوکھلا گیا تھا مگر اگلے پل دانت پیستے ہوئے غرا کر بولا۔

''کیوں آئی ہو تم؟'' میں نے اس کا لہجہ نظر انداز کیا اور ٹرے وہیں کارپٹ پر رکھ کر بولی۔

''تم لوگوں کے لیے چائے لے کر آئی ہوں۔'' اور پھر بڑے اطمینان سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اپنے کمرے میں لیٹ کر مجھے خوب ہنسی آ رہی تھی۔ کیسے سب کے سب ایک دم بوکھلا گئے تھے۔ میری مداخلت سے ان لوگوں کا پروگرام تو چوپٹ ہو گیا تھا اور مجھے بہت مزہ آ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں عمر کو زچ کرنے میں کامیاب ہوئی تھی اور یہ کامیابی کوئی چھوٹی موٹی کامیابی نہ تھی۔ اب جب میں اس کی اصلیت سب کو بتاؤں گی تو اس کی حالت کیا ہوگی۔ میں چشم تصور سے وہ خوشگوار اور روح پرور نظارا دیکھ رہی تھی۔ شام میں ڈیڈی کو میں نے آفس سے آتے ہی پورچ میں روک لیا اور عمر کے آج کے کرتوت کے بارے میں بتایا تو اس کی اسموکنگ کا سن کر انہیں کافی سے زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ ان کا ارادہ اسے شاید اکیلے میں سرزنش کرنے کا ہوگا مگر میں ان کے ساتھ چلتی ان کے بیڈ روم تک گئی اور انہیں اس بات پر آمادہ کر کے ہی چھوڑا کہ وہ سب کے سامنے اسے ڈانٹیں گے۔ عمر تو اپنے لفنگوں کے ساتھ اسی وقت کہیں چلا گیا تھا۔ رات کے کھانے پر اس کی واپسی ہوئی۔ میں نے ڈیڈی کو آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا تو میری بے تابی پر وہ ہنس پڑے۔ ہماری ایک دوسرے سے پیدائشی دشمنی گھر میں کسی سے ڈھکی چھپی بات تو نہیں تھی۔

پھر انہوں نے میری حسب خواہش عمر کو خوب کھری کھری سنائیں۔ اسے سگریٹ نوشی اور اس کے مضر اثرات پر سیر حاصل لیکچر دیا مگر بیوٹی کانٹسٹ دیکھنے والی بات انہوں نے دانستہ نظر انداز کر دی یا واقعی بھول گئے تو میں ان کو یاد دلانے کے لیے بولی۔

''پتا ہے ڈیڈی! یہ خوب گھور گھور کر ایشوریا کو دیکھ رہا تھا اور پتا ہے اس نے کیا پہنا ہوا تھا۔'' میں جوش میں بولتی شاید پٹڑی سے اترنے لگی تھی جب مما کی تنبیہی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''تابی! خاموشی سے کھانا کھاؤ۔'' میں نے مما کی طرف دیکھا وہ میری بے وقوفی اور بے عقلی پر شدید تاؤ کھا رہی تھیں۔ میں فوراً لب بھینچ کر چپ ہو گئی۔ عمر جو خاموشی سے سر جھکائے ڈیڈی کی تمام پھٹکار سنتا رہا تھا۔ ابھی بھی ویسے ہی بیٹھا ہوا تھا اور دادی کہاں برداشت کر سکتی تھیں کہ کوئی ان کے لاڈلے کی طرف میلی نظر سے دیکھے بھی۔ چنانچہ اور تو کوئی ہاتھ لگا نہیں میں ہی نظر آ گئی۔ دنیا کا دستور یہی ہے کہ کمزور کو ہر کوئی دباتا ہے اور دادی کا تو میں سب سے کمزور اور آسان ٹارگٹ تھی اس لیے انہوں نے بات کا رخ میری طرف موڑ دیا اور بڑے غصے میں بولیں۔

''تم وہاں عمر کے دوستوں میں کرنے کیا گئی تھیں؟ اتنی بڑی ہو گئی ہو، ذرا عقل نہیں۔ یوں غیر لڑکوں میں جا کر گھسنا کوئی اچھی بات ہے۔''

مگر ان کے لاڈلے کا دل شاید بہت بری طرح ٹوٹ چکا تھا اسی لیے دادی کی تمام گفتگو پر وہ بغیر کوئی دھیان دیئے چپ چاپ کھانا ختم کر کے اٹھ گیا

اور خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

دادی کا صدمے کے مارے برا حال تھا، کوئی ان کے عزیز از جان عمر کو تکلیف دے یا دکھ پہنچائے اسے تو وہ قبر میں بھی چین نہ لینے دیں۔ بڑی خار بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر ڈیڈی سے مخاطب ہوئیں۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے عثمان! اس کے ساتھ۔ ارے ایسا اس نے کیا کر دیا جو یوں اس کو ڈانٹا ڈپٹا جائے۔ اس کی عمر کے لڑکے ابھی تک انٹر اور بی کام میں اٹکے بیٹھے ہیں اور وہ اتنی چھوٹی عمر میں ایم ایس سی تک پہنچ گیا۔ آج کل کے تو ذرا ذرا سے چھوکرے سگریٹ پھونکتے پھرتے ہیں۔ وہ اب اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔ کیا ہو گیا اگر وہ دوستوں کے ساتھ تھوڑی سی تفریح کر رہا تھا۔'' دادی کی اس اقرباء پروری پر میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ کبھی ایسے پھول میرے لیے نہیں جھڑے منہ سے۔ کبھی مما سے یہ نہیں کہا کہ

''اس کی عمر کی لڑکیاں صبح شام ڈش دیکھتی ہیں اسے بھی انڈین فلمیں دیکھنے دو۔'' بلکہ ہمیشہ مما کو میرے خلاف اکساتی ہیں ورنہ مما اتنی بری نہیں ہیں۔

''پھر بھی اماں! اسموکنگ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ کسی بھی ایج کے آدمی کے لیے اچھی نہیں ہے۔'' ڈیڈی نے دادی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تو وہ بغیر کوئی جواب دیئے منہ بناتی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

دادی کی عمر کے لیے بے جا حمایت پر وقتی طور پر میرا موڈ خراب ہوا مگر رات جب میں سونے لیٹی تو میں نے سوچا کہ میرا مقصد تو پورا ہو ہی گیا۔ اسے ذلیل کروا کر اور ڈانٹ پڑوا کر مجھے اس رات بڑی چین کی نیند آئی۔

اگلے روز اسٹڈی کی طرف جاتے ہوئے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بھوکا شیر بے چینی سے بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے اور ابھی مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ پتا تھا وہ اتنی آسانی سے مجھے معاف کرنے والا تو ہے نہیں اسی لیے بہت ڈر لگ رہا تھا مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے کل کی کسی بھی بات کا کوئی حوالہ دیئے بغیر مجھے پڑھانا شروع کر دیا۔ ٹریگنومیٹری کے بنیادی اصول سمجھاتا وہ یوں لگ رہا تھا جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں۔ بڑے پیار سے اور پر شفقت انداز میں جو کہ اس کا خاصا ہرگز نہ تھا مجھے فارمولے یاد کروا رہا تھا۔ میں اس کی عظمت اور اعلیٰ ظرفی کی دل ہی دل میں معترف ہو گئی۔

''تمہارے ہاں ناخنوں کی چیکنگ نہیں ہوتی؟'' پڑھاتے ہوئے اچانک اس نے مجھ سے ایک غیر متعلقہ سوال کیا تو ایک لمحے کو میں حیران ہوئی پھر اپنے لمبے اور خوبصورت فائل ہوئے ناخنوں کو دیکھ کر بولی۔

''ارے بڑی زبردست چیکنگ ہوتی ہے مگر ہمیں کیا فرق پڑتا ہے، ارم ہی تو ہیڈ پرفیکٹ ہے۔'' میں نے اپنی بیسٹ فرینڈ کا نام لیا تو وہ سمجھ جانے والے انداز میں گردن ہلانے لگا۔ اس کے غیر معمولی خوشگوار رویئے سے متاثر ہو کر میں نے بھی اس سے باتیں شروع کر دیں۔

''مما تو کبھی بھی مجھے ناخن نہ بڑھانے دیں۔ میں نے ان سے چھپا کر ناخن بڑھائے ہیں۔ بس ارسلان بھائی کی شادی ہو جائے پھر کاٹ لوں گی۔''

ہمارے پھوپھی زاد ارسلان بھائی کی عنقریب شادی ہونے والی تھی۔ خاندان کی پہلی شادی تھی اس لیے ہم سب ہی بہت خوش تھے۔ عمر کی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے میں مزید گویا ہوئی۔

''پتا ہے عمر! ارسلان بھائی کی شادی کے لیے میں نے گرین کلر کا غرارہ بنایا ہے۔'' وہ میری بات سن کر بے ساختہ ہنس پڑا۔ کافی دیر تک جب اس کی ہنسی نہ رکی تو میں چڑ گئی۔

''ایسا میں نے کون سا لطیفہ سنایا ہے جو تمہاری ہنسی ہی نہیں رک رہی۔'' میرے چڑنے کی پرواہ کیے بغیر وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''اصل میں میں یہ سوچ رہا تھا کہ تم غرارہ پہن کر کیسی لگو گی، ذرا سوچو۔'' وہ پھر سے ہنسنے لگا۔ ''ایسا لگے گا جیسے کوئی توپ چلی آ رہی ہے۔'' وہ مزہ لیتے ہوئے بولا۔ اس کی اس بات پر میں ایک لمحے کو تو ناراض ہو کر بیٹھ گئی اور پھر کچھ دیر بعد بڑی فکرمندی سے بولی۔

''کیا واقعی غرارہ میرے اوپر اچھا نہیں لگے گا؟ عمر! کیا میں بہت موٹی ہوں؟'' میرے دروبھرے انداز پر وہ سنجیدگی سے بولا۔

''بہت کا لفظ ہٹا دو، تم صرف موٹی ہو۔'' اس کی بے نیازی پر میں غمزدہ ہو کر بولی۔

''میں نے مما سے ضد کر کے غرارہ بنوایا ہے اور مما نے بھی وعدہ کیا ہے کہ باوجود امتحانوں کے وہ مجھے ارسلان بھائی کی شادی کے ہر فنکشن پر جانے دیں گی۔'' میں بہت فکرمند ہو گئی تھی کہ غرارہ میرے اوپر اچھا نہیں لگے گا مگر میں جانتی نہ تھی کہ یہ غرارہ پہننا میری قسمت میں لکھا ہی نہیں گیا۔

اگلے ہی دن مما نے نیل کٹر سے اپنے سامنے ہی خوب اندر تک دھنسوا کر میرے ناخن کٹوائے تو میں حیران رہ گئی کہ انہیں پتا کیسے چلا؟ پھر اس کے بعد ارسلان بھائی کی شادی کے کسی بھی فنکشن پر مجھے لے جانے سے مما نے صاف انکار کر دیا۔

''امتحان سر پر ہیں اور تمہیں فنکشنز کی پڑی ہوئی ہے۔'' میں نے مما کو ان کا وعدہ یاد دلانا چاہا تو وہ بڑی ناراضی سے بولیں ''ٹھیک ہے میں نے کہا تھا مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ تمہاری ابھی تک ذرا بھی تیاری نہیں ہے۔ فزکس کے چار چیپٹر بغیر ہاتھ لگائے ایسے ہی رکھے ہیں، کچھ سنجیدہ ہو جاؤ پڑھائی میں۔''

اور پھر میں روتی رہ گئی مگر کسی نے میرے اوپر رحم نہ کھایا، عمر تو آگ لگا کر پھوپھو کے گھر چلا گیا تھا اور شادی کے تمام فنکشنز ختم ہونے تک وہ وہیں رہا تھا۔ اس کمینے نے کیسا بھرپور بدلہ لیا تھا مجھ سے۔ ہمارے خاندان کی پہلی شادی اور میں اس میں شرکت سے محروم رہ گئی تھی۔

وقت کیسا بھی ہو گزر ہی جاتا ہے چنانچہ یہ بدترین وقت بھی گزر ہی گیا اور پھر وہ لمحہ آیا جب میں اپنے گھر والوں کے سامنے سرخرو ہو سکی۔ میٹرک میں 70% میرے اپنے حساب سے بہت زیادہ تھے۔ گھر میں پہلے پہل تو کسی کو یقین ہی نہ آیا۔ میری نالائقی سے تو اب سب ویسے ہی سمجھوتا کر چکے تھے۔ کسی اور کو تو کیا مجھے خود یقین نہ آ رہا تھا۔ مما نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے گلے سے لگا کر پیار کیا تو میں خوشی سے بے حال ہو گئی۔ ممی نے سونے کی خوبصورت سی چین دی اور پاپا نے ہزار روپے دیے، میں خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ عمر سامنے ہی بیٹھا میرا خوشی سے گل رنگ چہرہ بڑے طنزیہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں اس کی طرح ناشکری نہیں ہوں کہ پوزیشن آنے پر بھی منہ بنایا جا رہا تھا۔ میں تو اے گریڈ پر بھی اپنے رب کی بڑی شکر

گزار رہوں۔'' اس کی طنزیہ نظریں نظر انداز کر کے میں نے دل ہی دل میں خود کو حوصلہ دیا۔ دادی ایسے موقع پر چپ کیسے رہ سکتی تھیں۔ میرا دل جلانے کو بڑے طنز سے بولیں۔

''ارے بی بی! میرے عمر کے پاؤں دھو دھو کر پیو، جس نے تم ایسی نکمی اور نالائق کو کسی لائق بنا دیا ورنہ مجھے امید نہ تھی کہ تم ایک ہی مرتبہ میں میٹرک کے پرچے پاس کر لوگی۔'' جب سے میں نے ڈیڈی سے عمر کو ڈانٹ پڑوائی تھی دادی میری اور بھی دشمن ہو گئی تھیں۔ حالانکہ ان کا چہیتا مجھ سے بدلہ لے چکا تھا مگر ان کا غم ابھی تک باقی تھا۔ میں نے دادی کا طنزیہ انداز بھی نظر انداز کر دیا اور خوشی خوشی ہزار روپوں کو ٹھکانے لگانے میں لگ گئی۔

☆

کالج میں آئی تو ایک بالکل ہی مختلف دنیا سے میرا تعارف ہوا۔ مما نے مجھے پری انجینئرنگ دلوائی تھی حالانکہ پاپا نے دبے لفظوں میں مما کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ

''اگر اس کا انٹرسٹ آرٹس کی طرف ہے تو اسے وہی پڑھنے دو۔'' مگر مما نے ان کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی تھی اور میں جو ابھی تک ان کے گلے لگا کر پیار کرنے پر سرشار تھی بلا چوں چرا ان کی بات مان گئی تھی۔

کالج میں ہم چاروں کا گروپ تو وہی پرانا تھا یعنی میں، ارم، لبنیٰ اور وردہ مگر ہمارے گروپ میں نیا اضافہ فرحانہ کا تھا جو ویسے تو ایج میں ہم لوگوں سے ڈیڑھ دو سال بڑی تھی مگر باتیں بڑی مزے کی کرتی تھی۔ پہلے ہی دن وہ ہمارے گروپ میں شامل ہو گئی تھی اور دوسرے دن بڑے مزے سے اپنے فیانسی کی تصویریں اٹھا کر لے آئی اور بتایا کہ اس کی منگنی عمران سے سال بھر پہلے ہی ہوئی ہے۔ وہ بھی بڑے زبردست قسم کے افیئر کے بعد اور یہ کہ وہ میٹرک میں مسلسل دو سال تک فیل ہوتی رہی، صرف اور صرف اسی چکر کی وجہ سے۔

''یار! میری ممی کہتی ہیں کہ لڑکیوں کو پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے، آخر کرنا تو وہی ہانڈی چولہا ہی ہے نا۔ بس میری تو انٹر کرتے ہی شادی ہو جائے گی۔ کالج بھی میں تو صرف ٹائم پاس کرنے آتی ہوں۔''

وہ بڑے اطمینان سے بتا رہی تھی اور ہم چاروں جنہیں پڑھائی کی خاطر دن رات گھر والوں سے جوتے پڑتے تھے اس کے نصیب پر رشک کرنے لگے۔ اس کی باتوں میں ہم لوگوں کو بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ روزانہ تفصیل کے ساتھ اپنی اور عمران کی ٹیلی فونک گفتگو کا احوال سناتی جو رات کو بارہ بجے سے صبح کے چار بجے تک بلا ناغہ جاری رہتی تھی۔ اس کا منگیتر بی کام کر کے اپنے ابا اور بھائیوں کے ساتھ بزنس کرتا تھا۔ ''عمران نے یہ کہا، میں شرما گئی، عمران نے وہ کہا میں بھی شرم سے سر جھکا کر رہ گئی'' اس کی باتوں پر ہم لوگوں کو حسرت سی محسوس ہوتی کہ کیا ہم اس قابل نہیں کہ کوئی ہمیں بھی پسند کرے۔ ہمیں تو آج تک کسی نے لفٹ ہی نہیں کروائی۔ ارم نے تو باقاعدہ اس روز کالج سے گھر آتے ہوئے کہہ بھی دیا۔

''فرحانہ سے تو زیادہ ہی خوبصورت ہوں میں، پتا نہیں لوگوں کی نظریں کمزور کیوں ہو گئی ہیں؟'' مجھے بھی کیونکہ اس کی اس بات سے مکمل اتفاق تھا اس لیے اس کی تائید کرنے لگی اور پھر کافی دیر تک ہم اپنی اس ناقدری پر افسوس کرتے رہے۔

فرحانہ کی باتیں سن سن کر ہم چاروں کو منگنی کروانے یا کم از کم ایک آدھ چکر چلانے کا بڑا شوق ہو گیا تھا۔ فرحانہ نے بتایا تھا کہ عمران نے

اسے اسکول سے گھر جاتے ہوئے راستے میں ایک دن لفٹ کی آفر کی تھی اور بس وہیں سے ان کی لو اسٹوری شروع ہوگئی تھی۔

یہ قصہ سننے کے بعد لاشعوری طور پر میں روزانہ کالج آتے اور جاتے وقت اپنے اردگرد آگے پیچھے چلتی تمام گاڑیوں کو نظر میں رکھنے لگی کہ شاید ان ہی میں سے کسی میں ''وہ بھی ہو جو روزانہ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے گاڑی میری گاڑی کے ساتھ دوڑاتا ہو۔'' مگر وائے افسوس ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم چاروں کی سپاٹ اور بے رنگ زندگی میں کوئی ہلچل نہ مچی۔

اس صبح میں ناشتے کی میز پر خاصی تاخیر سے آئی تو میز پر گھر کے تمام افراد موجود تھے۔ مما نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور غصے سے بولیں ''ابھی تک یونیفارم بھی نہیں پہنا، کالج جانے کا ارادہ ہے یا نہیں؟'' میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔

''مما! آج میرا کالج جانے کا موڈ نہیں ہے۔'' میں نے سستی سے کہتے ہوئے ایک لمبی سی جمائی لی تو میری جمائی پر دادی مجھے گھورنے لگیں۔ بے چاری دادی ساری زندگی میری تربیت پر توجہ دیتی رہیں مگر میں نے بھی سدھر کر نہ دیا۔ مجھے ان کے گھورنے پر خوامخواہ ہنسی آنے لگی۔

''کیا بات ہے آپ کے موڈ کی، انٹر کرنے کا ارادہ ہے یا نہیں۔'' مما نے طنز کا نشتر چلایا۔ ان کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر میں آرام سے آملیٹ سے لطف اندوز ہونے لگی۔

''چلو جاؤ جا کر یونیفارم پہن کر آؤ، نوابزادی اب اپنے موڈ سے کالج جایا کریں گی۔'' مما کا پارہ ہائی ہونے لگا تھا۔

''کیا ہے مما! مجھ سے نہیں ہوتی اتنی مشکل پڑھائی۔ فزکس پڑھو، کیمسٹری رٹو پھر میتھ کے ساتھ سر کھپاؤ۔ فائدہ اس ساری مغز ماری کا؟ آخر کرنا تو وہی ہانڈی چولہا ہی ہے ناں۔'' میں نے اپنے طور پر بڑی سنجیدہ بات کی تھی مگر پتا نہیں کیوں عمر کو خوامخواہ کھانسی ہونے لگی تھی اور ڈیڈی نے اپنے لبوں پر مچلنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کا گلا گھونٹتے ہوئے اخبار چہرے کے آگے پھیلا لیا تھا۔ مما خاموشی سے مجھے گھور رہی تھیں اور ان کے گھورنے کی وجہ سمجھ سے میں قاصر تھی۔

''شاباش ہے، اس بے حیائی کی کسر رہ گئی تھی، چلو وہ پوری ہوئی۔'' دادی نے غصے اور طنز کے ملے جلے انداز میں کہا تو میں ان کے ناراض ہونے پر حیران سی بیٹھی رہ گئی۔

''کیوں میں نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے۔ میری کلاس میں آدھی سے زیادہ لڑکیوں کی انگیجمنٹ ہوگئی ہے اور سب کی شادیاں انٹر کرتے ہی ہو جائیں گی۔'' انگیجمنٹ کا ذکر بڑی حسرت کے ساتھ کیا۔ ''تو انہیں کیا فائدہ ہوگا اتنے مشکل سبجیکٹ پڑھنے کا۔ شادی کے بعد ان کی ساس آئن اسٹائن کی Theory of relativity تو سنیں گی نہیں۔'' میں نے بڑی بے نیازی سے بات مکمل کی۔

مما اور دادی کے علاوہ میز پر موجود تمام لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی اور تو اور مریم بھی جواب خیر سے نو سال کی ہوگئی تھی وہ بھی ہنس رہی تھی۔ مجھے دادی اور مما کے گھورنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ بھئی یہ تو قدرتی بات ہے۔ کیا میری کبھی شادی نہیں ہوگی۔ عمر تو باقاعدہ قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔ مما پتا نہیں کیوں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں جبکہ میں بڑے آرام سے ناشتہ کرتی رہی تھی یہ اور بات کہ بعد میں مما نے خوب گھن گرج کے ساتھ مجھ پر برستے ہوئے پاپا اور ڈیڈی کے سامنے اس بے حیائی پر سخت سست سنائی تھیں۔

کچھ ہی دنوں بعد میری برتھ ڈے آئی تو وہ چاروں میرے ساتھ سالگرہ سیلیبریٹ کرنے گھر چلی آئیں۔ ممانے بھی میری دوستوں کی آمد کا لحاظ کرتے ہوئے کافی ساری چیزیں بنا کر رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے خود تو صرف چائے ہی بنانی آتی تھی۔ ہم پانچوں لان میں بیٹھے کھانے پینے اور ہلا گلا کرنے میں مصروف تھے۔ میں ان لوگوں کے دیئے گفٹس کھولنے لگی ہوئی تھی جب فرحانہ کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ بالکل میرے قریب ہو کر پوچھ رہی تھی۔

''تاباں! یہ اسمارٹ سا لڑکا کون ہے؟'' میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سے بڑی لاپرواہی سے عمر بلیک ٹی شرٹ اور بلیک جینز پہنے شاید جم خانہ جانے کے لیے پورچ کی طرف جا رہا تھا۔

''عمر ہے، میرا کزن۔'' میں نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا اور دوبارہ گفٹس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ چاروں تو پرانی سہیلیاں تھیں اس لیے عمر کو پہلے سے جانتی تھیں، فرحانہ نے پہلی دفعہ دیکھا تھا اس لیے پوچھ رہی تھی۔

''یہ اتنا اسمارٹ اور ہینڈسم لڑکا تمہارا کزن ہے اور پھر بھی تم اپنی قسمت پر افسوس کرتی ہو۔'' فرحانہ نے با آواز بلند فرمایا تو گاڑی کا دروازہ کھولتے عمر نے ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا اور پھر بڑی بے نیازی سے گاڑی نکال کر یہ جا وہ جا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنس پڑی اور بولی۔

''اول تو یہ کوئی ہینڈسم و ینڈسم نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو مائی فٹ، یہ تو میرا پیدائشی دشمن ہے۔'' عمر کو میں نے کبھی اس قابل سمجھا ہی نہیں تھا کہ دوستوں کے سامنے اس کا تذکرہ کرتی اس لیے ارم، وردہ اور لبنیٰ ابھی اس کی اور میری جدی پشتی دشمنی کے بارے میں زیادہ تفصیل سے نہیں جانتی تھیں۔ پھر فرحانہ کے بے حد اصرار پر میں نے مختصر ترین الفاظ میں اپنی عمر کی خاندانی دشمنی کا احوال سنایا۔ میری ساری کتھا سننے کے بعد فرحانہ بڑے فلسفیانہ انداز میں کچھ سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سر اٹھا کر سنجیدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ بتاؤ، اس کا یہ رویہ صرف تمہارے ہی ساتھ ہے یا وہ باقی ساری کزنز کے ساتھ بھی اسی طرح بی ہیو کرتا ہے؟'' میں اس کے سوال پر حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''نہیں باقی سب کے ساتھ تو وہ انسان کے بچوں کی طرح رہتا ہے۔ بڑی پھپھو، چھوٹی پھپھو کی بیٹیوں اور دیگر تمام خاندان کی لڑکیوں کے ساتھ وہ اچھی طرح ملتا ہے۔ دشمنی تو اسے صرف اور صرف مجھ سے ہے۔ وہ تو میرا ازل سے دشمن ہے۔'' میری اس بات پر فرحانہ خوشی سے اچھل پڑی اور مسرت سے بھرپور لہجے میں بولی۔

''بس دیکھ لیا، میرا اندازہ صحیح نکلا۔ اری بیوقوف وہ تجھے پسند کرتا ہے اور جان کر ستاتا ہے۔ لکھ لو میری بات، وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ میرا تجربہ کبھی غلط ثابت نہیں ہو سکتا۔ ابھی کل ہی میں نے ایک ناول پڑھا ہے جس میں ہیرو ہیروئن کو جان بوجھ کر خوب تنگ کرتا ہے، اسے رلاتا ہے اور اس کے سامنے دوسری لڑکیوں سے دوستی کرتا ہے۔ بے چاری ہیروئن اس غلط فہمی کا شکار رہتی ہے کہ یہ مجھے پسند نہیں کرتا آخر میں ساری بات کھلتی ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔'' فرحانہ بڑے عالمانہ انداز سے بول رہی تھی اور میرا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا تھا۔

''یہ عمر کا بچہ اور مجھ سے محبت کرے گا۔ یہ بڑی خبیث روح ہے اور اگر کرے بھی تو میں تو اسے کبھی منہ بھی نہ لگاؤں۔'' میں نے بڑی نفرت سے کہا۔ اس روز تو بات آئی گئی ہو گئی مگر بعد میں ان لوگوں کے ہاتھ جیسے ایک نیا موضوع آ گیا۔ فرحانہ کے منگیتر کے قصے سن سن کر سب لوگ شاید اب

''تاباں! تم عید پر عمر کو کارڈ اور کوئی گفٹ دو۔'' پہلے پہل تو میں نے منع کیا مگر وہ سب کی سب ہی میرے پیچھے پڑ گئیں۔ سب کا خیال تھا کہ وہ بے چارہ مجھ سے اظہار محبت کرتے ہوئے ڈرتا ہے اور میری پیش قدمی پر وہ خوشی سے پھولا نہیں سمائے گا۔ پھر میری سونی زندگی میں بھی بہار آجائے گی اور میں بھی اپنی دوستوں کو ''ان'' کے قصے سنا سکوں گی۔ ان لوگوں کے اتنے یقین سے کہنے پر مجھے بھی ایمان لانا پڑا۔ پھر وہیں کالج کی بک شاپ سے ہم نے بلیک کلر کی کارڈ شیٹ خریدی۔ ڈرائنگ تو میری تھی ہی اچھی۔ چنانچہ بلیک شیٹ پر خوبصورت ریڈ کلر کے گلاب کے پھول میں نے پینٹ کیے وہ چاروں میرے اردگرد بیٹھی مختلف مشوروں سے نواز رہی تھیں۔ اس روز ہم نے سارے پیریڈز بنک کیے اور کامن روم میں بیٹھ کر کارڈ بناتے رہے۔ گو بنا تو میں رہی تھی لیکن مشورے وہ لوگ دے رہی تھیں۔ کارڈ تیار ہو گیا تو مسئلہ کھڑا ہوا کہ اس پر لکھا کیا جائے؟ سب کی مشاورت سے بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے کٹ پین سے بڑے خوبصورت لکھائی میں کارڈ کے باہر سنہری حروف لکھے۔

Eid wishes to someone very Special

پھر اندر میں Dearest Umair لکھا اور اس کے نیچے لکھا۔

Special people like you bring warm thoughts to the mind and warm feeling the heart.

نیچے اپنا نام لکھا۔ ان لوگوں کے بے حد اصرار پر بھی میں ''تمہاری تاباں'' لکھنے پر تیار نہ ہوئی۔ آخر شرم و حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ارم کا خیال تھا کہ کارڈ ابھی کچھ سونا لگ رہا ہے۔ اس میں ایک آدھ شعر بھی ہونا چاہیے۔ ان دنوں ہماری شعر و شاعری کورس کی کتابوں تک ہی محدود تھی چنانچہ اپنی اردو کی ٹیکسٹ بک کھول کر بیٹھ گئے اور بڑی جدوجہد کے بعد مومن خان مومن کا یہ شعر ہمارے معیار پر پورا اترا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مجھے اس شعر پر خاصا اعتراض تھا مگر وہ لوگ بضد تھیں کہ یہی لکھو، آخر کار کارڈ مکمل ہوا۔

''بس اب تم اس کے ساتھ ایک گفٹ خرید کر چاند رات کو جا کر اسے دے دینا۔ پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ آخر یہ میرا دو سالہ کامیاب تجربہ ہے کوئی مذاق نہیں۔'' فرحانہ بڑے یقین سے کہہ رہی تھی۔

''جب تم اسے یہ کارڈ دو گی تو پہلے تو وہ کچھ حیران ہو گا پھر مسکرا دے گا اور اس کے بعد تم سے کہے گا کہ ہاں تابی میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں پتا نہیں کب سے، مگر کہنے سے ڈرتا تھا۔'' فرحانہ نے بڑا رومان پرور نقشہ کھینچا اور ہم سب کی سب مسحور سی ہو کر اسے تکنے لگیں۔

''پھر وہ تمہیں چوڑیاں پہنانے لے جائے گا، ہو سکتا ہے چوڑیاں اپنے ہاتھوں ہی سے پہنائے، اس کے بعد وہ تمہیں آئس کریم کھلائے گا۔ گویا یہ چاند رات تمہارے لیے خوشیوں کے دروازے کھول دے گی۔'' فرحانہ کی باتیں مجھے خیالی دنیا میں لے گئیں۔ عمر کے ہاتھوں سے چوڑیاں پہنتی میں بے تحاشا شرماتی ہوئی۔

بیزار ہو چکے تھے۔اس لیے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے آج کل عمر موضوع بحث بنا ہوا تھا۔

فرحانہ کے ساتھ وہ تینوں بھی مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ میرے گھر میں اک عدد اتنا ہینڈسم کزن موجود ہے اور میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں۔ارم نے جس پر فرحانہ کی محبت کا اثر سب سے زیادہ ہوا تھا میرے مسلسل انکار پر آخر ایک دن جل کر کہہ ہی دیا۔

''اترا لو خوب اپنے ہینڈسم اور اسمارٹ کزن پر۔ارے فرحانہ! ایک عمر پر ہی کیا موقوف، یہ محترمہ کزنز کے معاملے میں خاصی خود کفیل ہیں۔بدنصیب تو صرف ہم ہی ہیں جو اپنے کزنز کی رومال سے ناک صاف کرتے ہیں اور بوقت ضرورت ان کی اماؤں کی مدد کے خیال سے ان کے نیپی چینج کرتے ہیں۔''اس کی بات پر ہم سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا تھا۔اس کے امی اور ابا دونوں اپنے بہن بھائیوں میں بڑے تھے اس لیے اس کے تمام کزنز عمر میں اس سے کافی چھوٹے تھے اور اسے اس بات کا بے حد افسوس تھا۔

قطرہ قطرہ پانی گرتے رہنے سے تو پتھر میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے جبکہ میں تو ایک معصوم اور بھولی بھالی سی لڑکی تھی۔شروع میں ان کی یہ باتیں مجھے بری لگتی تھیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ مجھے بھی ان کی چھیڑ چھاڑ اچھی لگنے لگی۔

اس روز عمر اسٹڈی میں بیٹھا مجھے تھیورم سمجھا رہا تھا۔میتھ ابھی بھی مجھے عمر ہی پڑھاتا تھا۔باقی فزکس اور کیمسٹری کے لیے میں نے کوچنگ سنٹر جوائن کیا ہوا تھا۔وہ بے چارہ بڑی جانفشانی سے مختلف مثالیں دے کر مجھے سمجھانے میں مصروف تھا اور میں زندگی میں پہلی مرتبہ بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

''ہاں، عمر ہینڈسم تو ہے، کم از کم فرحانہ کے اس جوکر سے تو اچھا ہی ہے۔''میں نے اپنے آپ سے کہا۔نظروں کا زاویہ بدلا تو مجھے اس میں بہت سی خوبیاں نظر آنا شروع ہو گئیں''ہائٹ بھی اچھی ہے، اسپورٹس میں بھی اچھا ہے، پڑھائی میں تو خیر کیا بات ہے، وہ ہے ہی جینئس اور پرسنیلٹی تو بڑی زبردست ہے۔نو ڈاؤٹ اس کی لک بہت ہی مردانہ ہے۔''میں اس پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔

''لو اب تم مجھے یہ سوال کر کے دکھاؤ، ذرا جلدی سے، ہری اپ۔''عمر کی آواز مجھے ہوش و حواس کی دنیا میں واپس لائی۔وہ مجھے گھور کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا مصیبت ہے، بیٹھے بیٹھے سو گئی تھیں کیا؟ جلدی سے یہ سوال کر کے دکھاؤ تو میں جاؤں، مجھے کمپیوٹر پر بہت ضروری کام کرنا ہے۔''وہ بڑی بے زاری سے بولا تو میں شرمندہ سی آواز میں بولی۔

''سوری عمر! میری سمجھ میں بالکل بھی نہیں آیا۔''

''کیا؟''وہ چیخ اٹھا تھا۔''پاگل کر دو گی تم مجھے۔جنگلی، بدتمیز۔اتنی دیر سے بیٹھا اپنا وقت برباد کر رہا ہوں۔دفع ہو یہاں سے، ایڈیٹ۔''وہ میرے اوپر غصہ اتار کر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا تو میں اپنی چیزیں اٹھا کر خاموشی سے باہر نکل آئی مگر آج مجھے عمر کی ڈانٹ بری نہیں لگی تھی۔میرا ابھی اس بات پر ایمان پختہ ہو رہا تھا کہ عمر میرے ساتھ ایسا سلوک جان کر کرتا ہے ورنہ باقی سب کے ساتھ تو وہ بہت اچھا ہوتا ہے۔

انہیں گزرتے دنوں میں رمضان آ گئے تو فرحانہ نے ایک نیا شوشا چھوڑا۔

''مگر ہم لوگوں کو ساری رپورٹ سنائے بغیر اگر تم چوڑیاں پہننے چلی گئیں تو یاد رکھنا کہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' لبنیٰ نے مجھے دھمکی دی۔

''ایک ایک کو روداد سنانے بیٹھی تو چاند رات تو یونہی تمام ہو جائے گی، پھر میں چوڑیاں پہننے کب جاؤں گی؟'' میں نے فکرمندی سے کہا۔

''یہاں بھی فرحانہ کی ''ذہانت'' اور تجربہ کام آیا کہنے لگی ''تمہیں صرف میں فون کروں گی۔ تم ساری داستان سنا دینا، باقی لوگوں کو پھر میں بتا دوں گی۔''

ہم سب نے ہی اس کی بات سے اتفاق کیا اور پھر طے یہ کیا گیا کہ چاند رات کو نو سے دس کے درمیان میں عمر کو کارڈ اور گفٹ دوں گی اور فرحانہ ساڑھے دس بجے فون کر کے مجھ سے ساری تفصیلات سنے گی۔ عید کی وجہ سے چھٹیاں ہو رہی تھیں اور آج ہمارا چھٹیوں سے پہلے لاسٹ ڈے تھا۔ سب کو خدا حافظ کہتی میں اپنی گاڑی میں جا رہی تھی۔

راستے میں ڈرائیور سے گاڑی رکوا کر عمر کے لیے گیمز کی سی ڈی خریدی۔ ان دنوں میری پاکٹ منی مجھے اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ میں کوئی قیمتی پرفیوم یا قلم اسے تحفے میں دے سکتی۔ پھر کمپیوٹر میں تو اسے دلچسپی بھی بہت ہے، میں نے خود کو اطمینان دلایا۔

چاند رات آئی تو میں صبح ہی سے بڑی ایکسائیٹڈ تھی۔ گفٹ تو میں نے رات ہی پیک کر کے رکھ لیا تھا۔ سارا دن خیالوں میں عمر کے سنگ پتا نہیں کہاں کہاں کی سیر کرتی رہی۔ اللہ اللہ کر کے رات ہوئی۔ ٹی وی پر نو بجے چاند نظر آ جانے کا اعلان نشر ہوا تو مما وغیرہ فوراً ہی کچن میں گھس گئیں اور میں جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ دھڑکتے دل کیساتھ گفٹ اور کارڈ اٹھایا اور باہر نکلی۔ عمر کے کمرے میں جاتے ہوئے میں اس سے پہلے اتنی نروس کبھی نہ ہوتی تھی جتنی اس روز ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کو تو دل چاہا کہ رہنے دوں مگر پھر اپنی سہیلیوں کا خیال آیا۔ ابھی فرحانہ فون کر کے پوچھے گی اور اگر اسے پتا چلا کہ میں نے کارڈ نہیں دیا تو وہ کتنی گالیاں دے گی اور مجھے جاہل، گنوار اور بزدل کے القاب سے نوازے گی۔

''نہیں، میں بزدل نہیں ہوں۔'' میں نے خود کو سمجھایا اور دل کڑا کر کے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

''یس کم ان۔'' کی آواز سنائی دی تو میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ بیڈ پر بیٹھا جوگرز پہن رہا تھا، ایک نظر میری طرف دیکھا اور بولا۔

''فرمایئے۔'' میں نے گفٹ اور کارڈ دونوں اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر کمر سے لگائے ہوئے تھے، اس لیے اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ جب دو چار سیکنڈ گزر گئے اور میں کچھ بھی نہ بولی تو وہ جوگرز کے تسمے باندھ کر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

''کیا تکلیف ہے بول بھی چکو، مجھے جاوید کی طرف جانا ہے، جلدی کہو جو کہنا ہے۔'' بڑی بدتمیزی سے کہتا وہ گھڑی پہننے لگا تھا مگر میں نے اس کا لہجہ نظر انداز کر دیا۔ مجھے معلوم تھا ابھی یہی زبان میرے لیے پھول برسائے گی۔ بس ایک لمحے کی بات تھی، میں نے کارڈ اور گفٹ ایک دم اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ حیران نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہے یہ؟'' لہجہ بھی حیرت زدہ تھا۔

''وہ عمر! میں نے سوچا ہم ہمیشہ خوامخواہ لڑتے رہتے ہیں جبکہ اب ہم بڑے ہو چکے ہیں تو اب ہمیں آپس میں دوستی کر لینی چاہیے۔ اسی لیے میں تمہارے لیے یہ لائی ہوں۔'' میں نے اس کی طرف بڑی لگاوٹ سے دیکھتے ہوئے یہ جملے ادا کیے تھے۔ ویسے جملے میں لفظ ''بڑے'' پر میں

نے خاصا زور دیا تھا۔ اس کی حیرت بھی بجا تھی۔ ہم دونوں نے ساری زندگی کبھی ایک کینڈی یا مونگ پھلی تک تو ایک دوسرے کو دی نہ تھی اور کہاں آج میں اس کے لیے گفٹ لیے کھڑی تھی۔ ایک آدھ سیکنڈ کی حیرانی کے بعد اس نے دونوں چیزیں تھام لیں اور بولا۔

''تھینک یو۔'' میں فوراً ہی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ کارڈ کھول کر پڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی شوخ مسکراہٹ کو دیکھتے ہوئے میں اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ دروازہ بند کر کے میں نے بیڈ پر گرتے ہوئے اپنی بہادری اور جی داری پر خود کو شاباش دی۔

''فرحانہ کمبخت نے ابھی تک فون نہیں کیا تھا۔ پھر میں عمر کے ساتھ چلی جاؤں گی تو محترمہ ناراض ہوں گی کہ انہیں ساری روداد سنائے بغیر چلی گئی۔'' میں فرحانہ کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ اسے تو ساڑھے دس بجے فون کرنا ہے جبکہ ابھی محض ساڑھے نو بجے ہیں۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تو میرا دل دھڑک اٹھا۔

اللہ یہ فرحانہ کو تو آج سے میں گرو مان گئی۔ کتنا درست اندازہ تھا اس کا لیکن مجھے تو اتنی شرم آ رہی ہے، میں عمر کا سامنا کیسے کروں گی؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ مریم کی آواز سنائی دی۔

''آپی! دروازہ کھولیں، آپ کو مما بلا رہی ہیں۔'' وہ باہر سے چلا کر بولی تھی۔ میں ایک دم اپنے حواسوں میں واپس آئی اور دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ وہ مجھے کچن کی طرف جاتا دیکھ کر کہنے لگی۔

''مما اپنے کمرے میں ہیں۔'' مجھے یہ اطلاع فراہم کر کے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں اپنے ہی خیالوں میں گم مما کے کمرے میں داخل ہوئی۔

مما ادھر سے ادھر بڑے غصے میں ٹہل رہی تھیں اور سامنے صوفے پر عمر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر اس کے شرارت سے مسکراتے ہوئے چہرے پر ڈالی اور دوسری مما پر جو بڑے غصے اور جلال میں نظر آ رہی تھیں۔ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر بھی انہوں نے اپنی مارچ پاسٹ بند نہ کی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میں اپنی حیرانی چھپاتے ہوئے سعادت مندی سے سر جھکا کر بولی۔

''جی مما! آپ نے بلایا تھا؟'' مما جو غصے میں چلتی ہوئی دیوار تک پہنچ گئی تھیں میری بات پر رک کر میری طرف دیکھنے لگیں۔ چند لمحوں تک بڑے جاہ و جلال کے ساتھ مجھے گھورتی رہیں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے؟ میرے خیال سے تو میں نے آج دن بھر میں ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جو مما کے غصے کا باعث بنتی، پھر وہ اچانک میری طرف بڑھیں اور بیڈ سے کچھ اٹھا کر میرے منہ پر دے مارا۔

''کیا ہے یہ؟'' ان کی پھینکی گئی اشیاء دیکھ کر میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ میری حالت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی ہو رہی تھی۔ میرا ہی دیا ہوا کارڈ اور گفٹ میرے قدموں کے پاس پڑا ہوا تھا۔

''تم اتنی بے ہودہ اور بے لگام ہو جاؤ گی میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' میں مما کے غصے سے ڈری سہمی سر جھکائے کھڑی کانپ رہی تھی۔ مجھے ساری کائنات گردش کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی میں گر پڑوں گی۔ کاش زمین پھٹے اور میں اس میں سما سکوں۔ میری

''ہاں، یہ تو وہی تھا میرا برسوں پرانا دشمن۔ میرے اور اس کے بیچ تو صرف اور صرف دشمنی کا ہی رشتہ تھا۔ کیوں میں نے یہ بات فراموش کی۔ اس بات کی سزا تو مجھے ملنی ہی چاہیے تھی۔'' دادی بھی میری مسلسل خاموشی سے پریشان سی ہوگئیں اور بولیں۔

''صوفیہ! مجھے لگتا ہے تابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھو تو چہرہ کیسا اترا ہوا ہے۔'' زندگی میں پہلی مرتبہ دادی نے میرے لیے فکرمندی کا اظہار کیا تھا۔ ان کی بات پر ممی نے بھی بغور میری طرف دیکھا اور بولیں۔

''ہاں، اس کی طبیعت خراب لگ رہی ہے، کیوں تابی بیٹا! کیسی طبیعت ہے؟ تم نے مہندی بھی نہیں لگائی۔'' میں جواب دینے کی پوزیشن میں تھی ہی نہیں۔ منہ سے ایک بھی لفظ نکلنے سے پہلے آنسو نکل آتے، میں جانتی تھی اس لیے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میری کیفیت دیکھتے ہوئے مما بولیں۔

''ہاں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، جاؤ تابی تم کمرے میں جا کر آرام کرو۔'' مما کی اجازت ملنے کی دیر تھی میں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر کمرے میں آ کر دوبارہ رونے لگی۔ مریم کے ہاتھ میرے لیے کھانا بھجوایا گیا جو میں نے کھائے بغیر واپس کر دیا۔ وہ سارا دن میں نے کچھ بھی کھائے بغیر واپس کر دیا۔

نتیجتاً اگلے دن بخار چڑھا کر بیٹھ گئی۔ مما ساری خفگی بھلائے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں میرے سر پر رکھنے لگیں۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا، پورا گھر میرے کمرے میں جمع ہوگیا تھا، بخار کا زور ٹوٹا تو سب نے سکون کا سانس لیا۔

☆

اس سے اگلے روز میری طبیعت کافی بہتر تھی۔ میں بیڈ پر بیٹھی میگزین پڑھ رہی تھی جب ہلکی سی دستک دے کر عمر اندر آ گیا اور اس کو دیکھ کر میں غصے سے پاگل ہونے لگی۔

''کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟'' بڑے میٹھے لہجے میں دریافت کیا جا رہا تھا۔ میں نے میگزین بند کر کے سائیڈ میں پٹخا اور بیڈ پر سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی، وہ ابھی تک میرے جواب کا منتظر بڑی شرافت سے کھڑا تھا مگر اس شرافت کے پیچھے چھپی خباثت کو میں اچھی طرح پہچان چکی تھی۔ میں اب زندگی بھر اس سے ایک لفظ بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نہ لڑائی نہ جھگڑا، کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے اسے یونہی کھڑا چھوڑ کر خود کمرے سے باہر نکل آئی اور مما کے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ ذرا سا غور و فکر کیا تھا تو اپنے آپ پر بھی بہت غصہ آیا تھا کہ دوستوں کے الٹے سیدھے مشوروں پر عمل کرنے کی آخر مجھے ضرورت ہی کیا تھی؟ مما کی نظروں سے بھی گر گئی اور وہ باسٹرڈ سمجھ رہا ہوگا کہ میں اس کے عشق میں پاگل ہوگئی ہوں۔ اسے کیا پتا کہ یہ میری دوستوں کی پڑھائی ہوئی پٹیاں تھیں۔ عید کی چھٹیوں کے بعد کالج کھل گیا تھا مگر میرا جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

اس روز میں سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی تو وہ سامنے اسٹڈی سے نکلتا نظر آیا۔ میں اسے نظر انداز کر کے سائیڈ سے ہو کر گزرنے لگی۔ آج کل میرا اس سے اتفاقاً ہی آمنا سامنا ہوتا تھا۔ دوپہر اور رات کا کھانا میں بھوک کا شور مچا کر سب سے پہلے کھا لیتی تھی اور پھر فوراً ہی کبھی سونے کا اور کبھی پڑھنے کا بہانا کر کے کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔ مجھے خاموشی سے گزرتا دیکھ کر وہ میرے سامنے پھیل کر کھڑا ہوگیا تو مجھے رک جانا پڑا۔

مسلسل چپ نے مما کا اشتعال اور بڑھا دیا۔

''بولو جواب دو، کیوں کی تم نے یہ اتنی گری ہوئی حرکت؟'' پھر انہوں نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر دے مارا۔ میری مما نے زندگی میں پہلی مرتبہ میرے اوپر ہاتھ اٹھایا تھا اور میں چپ چاپ سر جھکائے کھڑی تھی۔ خوف کے مارے آنکھوں سے آنسو بھی نہیں نکل رہے تھے۔

''وہ تو عمر نے مجھے لاکر یہ چیزیں دے دیں، پہلے اگ تو جاؤ پھر عشق کرنا، پتا نہیں کیسی بری دوست بنائی ہوئی ہیں۔ بس آج سے ساری دوستیاں ختم اور اگر آئندہ تمہاری کوئی شکایت سنی تو پڑھائی سے ہی اٹھالوں گی اور اب دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' مما دھاڑی تھیں۔

میں پتا نہیں کیسے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آئی تو کب کے رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔ میں بڑی شدت سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوریڈور میں موجود فون کی بیل بجتی مگر میں اس سے بے خبر روتی رہی یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ وہ میری زندگی کی بدترین عید تھی۔ میں بستر پر پڑی سسک رہی تھی اور دعائیں مانگ رہی تھی۔

''یا اللہ! میں مرنا چاہتی ہوں۔ اس ذلت کے بعد جینے کو جی نہیں چاہتا۔'' میں تکیے میں منہ چھپائے خدا کو پکار رہی تھی۔ پاپا وغیرہ شاید عید کی نماز پڑھ کر آ گئے تھے اسی لیے نیچے سے خوب شور شرابے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سب سے بلند اور خوشی سے بھرپور آواز عمر کی تھی۔ اسی وقت میرے کمرے کا دروازہ کھول کر مما اندر آئیں اور بڑی بے رخی سے بولیں۔

''زیادہ مظلوم بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، فوراً کپڑے بدل کر نیچے آؤ، سب لوگ پوچھ رہے ہیں۔'' دوٹوک انداز میں حکم صادر کر کے مما کمرے سے باہر جا چکی تھیں اور میں ان کے سرد و سپاٹ لہجے سے خائف ہوتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے، بالوں میں برش کیا اور بڑے برے دل کے ساتھ سست رفتاری سے چلتی ہوئی نیچے آ گئی۔ حالانکہ عید کے لیے میں نے میچنگ جیولری اور چوڑیاں وغیرہ سب ہی چیزیں خریدی ہوئی تھیں مگر اس وقت کسی بھی سجاوٹ اور تیاری کے بغیر میں لاؤنج میں آ گئی تھی۔ سامنے ہی ڈیڈی مریم سے میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

''لو آ گئی ہماری بیٹی آ جاؤ بیٹا! عیدی نہیں لوگی کیا؟'' وہ بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے تو میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے آنکھیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا۔ کیا فائدہ سب کے سامنے خود کو ایکسپوز کرنے کا۔

مجھے معلوم تھا یہ راز صرف میرے، مما اور عمر کے بیچ ہی ہے۔ آخر مما کو اپنی لاڈلی کی عزت بھی تو عزیز تھی اب جو کوئی مجھے روتا بسورتا دیکھ لے تو ضرور ہی وجہ دریافت کرے گا۔ اس لیے خود کو بمشکل سنبھال کر زبردستی مسکرائی۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے کتنی تکلیف ہوئی یہ میں ہی جانتی ہوں۔ میرا دل رو رہا تھا اور میں اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجانے پر مجبور تھی۔ سامنے ہی وہ سفید کاٹن کی شلوار قمیص پہنے کھڑا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میرے ہاتھ میں اس وقت اگر لوڈڈ ریوالور ہوتو میں پورا کا پورا اس پر خالی کر دوں۔ وہ مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ سب خوش تھے۔ ظاہر ہے عید کا دن تھا، خوشیوں اور مسرتوں کا موقع تھا۔ خوب چہل پہل اور رونق ہو رہی تھی مگر میرا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی خود پر مرکوز نظریں میرا دماغ خراب کر رہی تھیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر میرے سامنے بیٹھا وہ بڑی شرارت سے میری آنسو بھری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے، آج کل تم پڑھنے نہیں آ رہیں۔'' وہ یوں بول رہا تھا جیسے ہمارے بیچ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں اس کی بات کا کوئی بھی جواب دیے بنا واپس سیڑھیوں کی طرف جانے لگی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

''تمہیں تکلیف کیا ہے؟ میری بات کا جواب دے کر جاؤ۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش کی مگر جب کامیابی نہ ہوئی تو چیخ کر دادی کو آواز دینے لگی۔

''دادی! جلدی آئیں۔'' میرے چیخنے پر بے اختیار بوکھلا کر اس نے فوراً ہی میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور میں اس پر نظر ڈالے بغیر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

اس واقعے کے بعد سے اس نے بھی پھر دوبارہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان دنوں ڈیڈی اسے پڑھنے کے لیے امریکہ بھیجنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس لیے وہ بھی گھر پر کم ہی ٹکتا تھا۔ اس واقعے کو کم و بیش مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ میں باوجود مما کے کہنے کے کالج نہیں جا رہی تھی۔ مما نے اس دن کے بعد سے دوبارہ مجھے کچھ نہ کہا تھا نہ صفائی مانگی تھی نہ برا بھلا کہا تھا بلکہ اس سارے قصے کو ایک طرح سے انہوں نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں اپنی انسلٹ نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی نہیں۔ میری فرینڈز کے فون آتے، میں بات کرنے سے انکار کر دیتی۔ پتا نہیں باقی سب کو میرے کالج نہ جانے کی مما نے کیا وجہ بتائی تھی کہ کسی نے بھی مجھ سے کچھ نہ پوچھا تھا۔ جتنی دیر وہ گھر پر نہ ہوتا میں سب کے ساتھ رہتی اور جیسے ہی وہ آتا میں کسی بھی بہانے سے اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔

☆

پھر اس مشقت سے بھی میری جان چھوٹ گئی اور وہ امریکہ چلا گیا۔ جس روز وہ جا رہا تھا گھر میں خوب رونا دھونا مچا تھا۔ مما، ممی اور دادی تینوں ہی خوب زور و شور سے رو رہی تھیں۔ میں نے مما کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اسے چھوڑنے ایئرپورٹ نہیں جاؤں گی۔ دادی اور میرے علاوہ باقی سب لوگ اسے سی آف کرنے ایئرپورٹ گئے تھے۔ میں اسے خدا حافظ کہنے کی بھی روادار نہ تھی اسی لیے جس وقت وہ لوگ جانے کے لیے نکل رہے تھے میں نہانے گھس گئی تھی اور جب یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ لوگ جا چکے ہیں اس وقت باتھ روم سے باہر نکلی تھی۔ اس کے جانے پر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میں اب اس کی منحوس صورت زندگی بھر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

اس کے جانے کے بعد دادی بے حد اداس رہنے لگی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے اسی کا ذکر لے کر بیٹھ جاتیں۔ اگر انہیں پتا چل جاتا کہ میں ان کے لاڈلے کے جانے پر جشن منا رہی ہوں تو وہ مجھے کچا چبا جاتیں۔ میرے امتحانوں میں صرف تین مہینے رہ گئے تھے اور میری کوئی تیاری نہ تھی۔ سارا سال تو ہم لوگوں نے کھیل تماشوں میں گزار دیا تھا۔ مما نے مجھے کالج جانے کے لیے مجبور کیا تو میں بالآخر مان گئی۔ کالج میں وہ لوگ والہانہ انداز میں میری طرف بڑھی تھیں مگر میں نے کسی سے بھی بات نہ کی تھی۔ میری بے رخی پر وہ لوگ چپ سی ہو گئی تھیں۔

میں بڑی توجہ اور لگن سے پڑھائی کرنے لگی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ مما کو مجھ سے اب کبھی کوئی شکایت ہو۔ مجھے ان کی نظروں میں سرخرو ہونا تھا اور اپنا اعتبار بحال کروانا تھا اس لیے میں دن رات ایک کر کے پڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھار مما ہی مجھے ٹوک دیتی تھیں۔

''تابی بیٹا! تھوڑی دیر سو جاؤ۔'' یا ''تابی! تھوڑا آرام کر لو کب سے پڑھ رہی ہو۔'' مگر مجھ پر ایک عجیب سا جنون سوار ہو گیا تھا۔ مجھے اب خود کو ثابت کر کے دکھانا تھا کہ میں نکمی، ناکارہ اور نالائق نہیں ہوں۔ میں مما کے لیے فخر کا باعث بننا چاہتی تھی۔ مجھے اس دن کا شدت سے انتظار تھا جب میں اس قابل ہو سکوں کہ مما کہہ اٹھیں۔

''تابی! میری بہت پیاری اور ذہین بیٹی ہے، مجھے اپنی بیٹی پر ناز ہے۔'' اور یہ جملہ سننے کے لیے میں انتھک محنت کر رہی تھی۔

امتحان شروع ہوئے اور پھر ختم بھی ہو گئے۔ ہم لوگ سیکنڈ ایئر میں آ گئے۔ کلاسیں شروع ہو گئیں۔ میرا اپنی دوستوں سے ابھی بھی وہی رویہ تھا۔ وہ میرے پاس آتیں میں رسمی سا ہیلو کہہ کر ہاتھ ملاتی اور وہاں سے چل دیتی۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ میرا رویہ درست نہیں ہے۔ دوستوں نے میرے گلے پر چھری رکھ کر تو مجھے مجبور نہیں کیا تھا کہ عمر کو ضرور ہی کارڈ دو۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ میں خود ہی ان ساری باتوں کے لیے دل و جان سے آمادہ ہو گئی تھی۔ اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں نے ان لوگوں سے اپنے رویے کی معذرت کی اور ہم سب پھر پہلے کی طرح اچھی فرینڈز بن گئیں۔ ''اس دن'' کے بارے میں ان لوگوں کی پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی مگر سب کو تجسس بھی ہوتا تھا۔ میری ناراضی کے خوف سے کوئی کچھ پوچھتا نہ تھا۔

میں نے خود ہی مختصر ترین الفاظ میں تھوڑا بہت سنسر کر کے ان لوگوں کو اس دن کا احوال سنا دیا تو فرحانہ نے مجھ سے بہت معافی مانگی کہ اس کی وجہ سے مجھے اتنی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ وہ بے چاری باقاعدہ رو پڑی تھی۔ میں نے اسے چپ کروایا اور کہا کہ اس سارے قصے میں اس کا یا کسی اور کا کوئی قصور نہیں۔ غلطی میری تھی اور اب میں اس ٹاپک پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی اور پھر واقعی ہم دوستوں نے دوبارہ کبھی اس موضوع پر کچھ نہیں کہا۔

☆

انٹر کے امتحان کے فوراً بعد فرحانہ کی شادی ہو رہی تھی۔ میں تو مما کے خوف سے شادی میں شرکت نہ کر سکی باقی تینوں شادی میں گئی تھیں۔ پھر اس کے بعد ہمارا اس سے کبھی کوئی رابطہ نہ ہوا۔ تھرڈ ایئر میں ایڈمشن کا وقت آیا تو مما نے پہلی مرتبہ مجھے میری پسند کے مضامین اختیار کرنے کے لیے کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔ مجھے اب ضد سی ہو گئی تھی کہ سائنس ہی پڑھنی ہے اور اسی میں خود کو ثابت کر کے دکھانا ہے۔ لبنیٰ اور وردہ نے تو سائنس پڑھنے کے نام پر کان پکڑ کر توبہ کی تھی اور ہمارے ہی کالج میں بی اے میں داخلہ لے لیا تھا جبکہ میں نے اور ارم نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ ارم بھی بی اے آنرز کر رہی تھی۔ صرف میں مستقل مزاجی سے اپنے محاذ پر ڈٹی ہوئی تھی۔

وقت بڑی سبک رفتاری سے گزر رہا تھا۔ لبنیٰ اور وردہ کی بی اے کرتے ہی آگے پیچھے شادیاں ہو گئی تھیں۔ جن میں میں نے اور ارم نے بھرپور شرکت کی تھی۔ لبنیٰ اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا چلی گئی تھی جبکہ وردہ یہیں کراچی میں تھی اور کبھی کبھار ہی اس سے فون پر بات ہو پاتی تھی۔

پھر ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ارم ایم اے انگلش اور میں ایم ایس سی میتھمیٹکس کر کے فارغ ہوئی تھیں۔ جس روز یونیورسٹی کا آخری دن تھا اس دن ارم کے گھر اس کے کلاس فیلو شہباز چودھری کی والدہ اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر چلی آئیں اور ارم حیران رہ گئی کہ میری تو اس سے بحیثیت کلاس فیلو بھی کبھی بات چیت نہ ہوئی تھی۔ منگنی کے بعد پتا چلا کہ موصوف یونیورسٹی کے پورے چار سال ارم کے عشق میں مبتلا رہے ہیں اور یوں ارم کا وہ شکوہ

بھی دور ہو گیا تھا کہ میں کسی کو نظر کیوں نہیں آتی۔ دو مہینے بعد اس کی شادی ہونے والی تھی اور آج کل وہ اپنی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

رہ گئی میں تو ان چھ سالوں میں میں بہت بدل گئی تھی۔ مما اور دادی جن کو ہمیشہ مجھ سے شکایتیں رہی تھی، اب مجھ سے بہت خوش تھیں۔ مما خوش تھیں کہ ان کی بیٹی نے ان کا نام نہیں ڈبویا اور کچھ پڑھ لکھ کر آخر کار دکھا ہی دیا اور دادی یوں خوش تھیں کہ اب میں ان کی پسند کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ بہت سگھڑ اور گھر داری کی شوقین۔ یہ گھر داری اور کھانا پکانے کا شوق بھی اچانک ہی میرے اندر پیدا ہو گیا تھا اور وہ تمام احباب جو میرے مستقبل سے مایوس اور ناامید رہا کرتے تھے اب مجھ سے بہت خوش تھے۔ پاکستانی، انڈین، چائنیز اور اٹالین کھانے بنانے تو میں نے ممی سے سیکھ لیے تھے اور اب فراغت کے ان دنوں میں بیکنگ اور فلاورارنجمنٹ کے کورسز ''رنگون والا'' سے کر رہی تھی۔

''فاطمہ! چاول تابی سے دم دلوانا، اس کے ہاتھ سے چاول بیٹھتا نہیں۔'' دادی ممی سے کہتیں یا پاپا مما سے کہتے۔

''تم رہنے دو کوفتے تابی بنائے گی۔'' پاپا تو میرے علاوہ اب کسی اور کے ہاتھ کی بنی چائے پینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

پاپا اور ڈیڈی کا مشترکہ خیال تھا کہ تمام خواتین بشمول دادی کو کچن سے ریٹائرمنٹ لے لینی چاہیے۔ اپنے لیے ایسے کمنٹس مجھے بہت خوش کرتے تھے اور میں اور زیادہ لگن سے نئی سے نئی چیزیں بنا کر سب کو کھلایا کرتی اور خوب داد وصول کرتی۔ آج کل کچن مکمل طور میرے کنٹرول میں تھا۔

عمران چھ سالوں میں کبھی پاکستان نہیں آیا تھا۔ ہر سال چھٹیوں میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں گھومنے چلا جاتا اور میں سکون کا سانس لیتی تھی۔ ڈیڈی اور مما خود ہی سال میں ایک مرتبہ جا کر اس سے مل آتے تھے۔ ایک مرتبہ دادی بھی ان کے ساتھ جا کر لاڈلے پوتے کا دیدار کر آئی تھیں۔ چھ سال وہ یہاں سے دور رہا تھا مگر گھر والوں کے دلوں سے وہ کبھی دور نہ ہوا تھا۔ دادی آج بھی اس سے ویسا ہی عشق کرتی تھیں۔ بس لاڈلے پوتے کی ضد کے آگے مجبور ہو گئی تھیں جوان برسوں میں بزنس ایڈمنسٹریشن اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں پتا نہیں کون کون سی ڈگریز لے کر اپنی قابلیت میں مزید اضافہ کر چکا تھا۔ ان کا بس چلتا تو اسے اپنے سے کبھی دور نہ جانے دیتیں۔ ان چھ سالوں میں شاید اس نے چھ مرتبہ ہی یہاں فون کیا ہو، وجہ یہ تھی کہ اسے موقع ہی نہیں دیا جاتا تھا۔

کبھی دادی کو پوتا بے طرح یاد آتا، کبھی ممی یا مما کو اس کی بہت یاد ستاتی، کبھی کسی اور کو وہ یاد آتا اور یوں تقریباً ہر دوسرے روز اسے فون کھڑکایا جاتا تھا۔ کبھی اگر اتفاق سے اس کا فون آیا بھی تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میں نے فون ریسیو نہیں کیا۔ میں کرنا بھی نہیں چاہتی تھی یہاں سے کسی فنکشن کی یا کسی اور موقع کی تصاویر اسے بھیجی جاتیں تو میں سب کی نظر بچا کر وہ تصویریں نکال لیتی جن میں میں بھی ہوتی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہ سمجھے کہ میں نے اپنی تصویریں جان کر بھیجی ہیں۔ مجھے اس کی ذہنیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔

ان گزرے برسوں میں میں کافی میچور ہو گئی تھی۔ مجھے اب اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس روز مما کا رویہ میرے ساتھ بالکل ٹھیک تھا۔ سولہ سال کی عمر عشق اور محبت جیسے فضول کاموں کے لیے بڑی نامناسب ہے مگر اپنی تمام تر سمجھ داری کے باوجود میں اسے معاف کرنے کے لیے ہرگز بھی تیار نہ تھی۔ اس کے لیے میرے دل میں آج بھی نفرت تھی، بے حد اور بے حد اور بے اندازہ۔ میں اس کی طرف سے اپنا دل صاف کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میری زندگی میں وہ وقت کبھی نہیں آ سکتا تھا جب میں اس سے ہاتھ ملاؤں اور پچھلی تمام باتیں بھول جاؤں۔

اس کی پڑھائی تو چار پانچ مہینے ہوئے ختم ہو چکی تھی مگر وہ سب کے بے حد اصرار کے باوجود بھی آنے میں ٹال مٹول کر رہا تھا۔ سب ہی اسے واپسی کا کہہ کہہ کر تھک چکے تھے۔ وہ ہر بار کوئی نیا بہانا تراش دیتا اور میں سوچتی کہ یقیناً اس نے وہاں کسی امریکن سے یا کسی سے بھی شادی وادی کر لی ہے اور اب اس کا واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے اور اپنی یہ سوچ مجھے بہت خوشی فراہم کرتی۔ دادی جو پوتے کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو میں دن گن گن کر گزار رہی ہیں اس کی شادی کا سنیں گی تو اسے کبھی معاف نہیں کریں گی۔ اپنی تمام تر میچورٹی کے باوجود میں آج بھی اسے سب کی نظروں سے گرتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ بتایا نا میں بڑی کینہ پرور اور منتقم مزاج ہوں مگر وہ ایک مرتبہ پھر میرے تمام اندازوں کو غلط ثابت کرتا ہوا واپس آ گیا تھا، وہ بھی بالکل اچانک۔

☆

اس کے بارے میں سوچتے سوچتے شاید میری آنکھ لگ گئی تھی۔ مریم کی تیز آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''آپی! کھانا لگ گیا ہے، جلدی سے نیچے آ جائیں۔'' وہ میرے گھورنے کی پرواہ کیے بغیر بڑے آرام سے چیختی چلاتی واپس چلی گئی تو میں بیڈ پر سے اتر گئی اور خود کو اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے لگی۔

اس کے آنے کا سن کر موڈ ایسا خراب ہوا تھا کہ کپڑے بدلے بغیر ہی لیٹ گئی تھی۔ خود میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا کرتے ہوئے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں برش چلایا اور دوپٹہ ٹھیک کرتی سیڑھیاں اترتی ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی۔ میز کے گرد گھر کے تمام افراد ہی کرسیاں سنبھالے بیٹھے تھے۔ ماحول بڑا خوشی سے بھرپور محسوس ہو رہا تھا۔ سب ہی کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ مجھے آتا کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں خاموشی سے آگے بڑھی اور اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بطور خاص کسی کا بھی نام لیے بغیر سلام کیا۔ وہ جو دادی سے کچھ کہہ رہا تھا ایک دم میری طرف متوجہ ہوا اور سلام کا جواب فوراً یوں دیا جیسے میں نے خاص طور پر اسے ہی سلام کیا تھا۔ میری طرف بڑے غور سے دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

''کیسی ہو تابی؟'' میں نے بڑی سرسری سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟'' لہجہ بڑا فارمل سا رکھنے کی میں نے پوری کوشش کی تھی۔ ایک لمحے کو وہ شاید میرے ''آپ'' پر حیران ہوا اور پھر فوراً ہی اپنی حیرانی چھپا کر بولا۔

''ٹھیک ہوں میں بھی۔'' پھر اس کے بعد ہمارے درمیان اور کوئی بات نہ ہوئی۔ میں نے تو اس سرسری سی نظر کے بعد اس کی طرف دوبارہ دیکھا بھی نہیں تھا۔ کھانے کے بعد سب لوگ لاؤنج میں ہی آ کر بیٹھ گئے۔ اسے اپنے درمیان بٹھائے ہر کوئی اس سے کچھ نہ کچھ بات کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ محبتوں کے معاملے میں بڑا خوش قسمت تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں سب چاہتے ہیں۔ وہ چاہے جاتے ہیں اور بے حد اور بے حساب۔ گھر میں ایک دم جیسے رونق سی ہو گئی تھی۔

میں سب کے چہروں پر پھیلی خوشیوں کے رنگ دیکھ رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ دوبارہ کسی بھی قسم کی خوش فہمی کا شکار ہو اس لیے سب لوگوں کے ساتھ میں بھی لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی کو خاص طور پر نظر انداز کرنے کا مطلب ہوتا ہے کہ ہم در پردہ اسے بہت اہمیت دیتے ہیں اور میں

اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ میرے لیے ہرگز بھی اہم نہیں ہے۔ وہ بس میرے لیے ایک عام سا آدمی ہے جس سے میں اخلاقاً دو چار باتیں کر سکتی ہوں مگر جس کی میرے لیے قطعاً کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں خاموشی سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے ایک نظر سب لوگوں پر بھی ڈال لیتی تھی مگر کوئی میری طرف متوجہ نہ تھا۔ ایک آدھ مرتبہ اتفاقاً اس پر بھی نظر پڑی تو وہ کسی نہ کسی سے بولتا ہوا ہنستا مسکراتا نظر آیا۔ اتنے سالوں میں وہ بھی کافی تبدیل ہو گیا تھا اور اب جو میرے سامنے تھا وہ ایک گریس فل اور سوبر سا بندہ نظر آ رہا تھا۔ محفل برخاست ہوئی تو میں بھی سب کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اگلے روز وہ بارہ بجے سو کر اٹھا تو پاپا، ڈیڈی اور مریم اپنے اپنے دھندوں پر روانہ ہو چکے تھے۔ تینوں خواتین بے چینی سے بیٹھی اس کے جاگنے کا انتظار کر رہی تھیں جبکہ میں کچن میں گھسی لنچ کے لیے کھڑے مسالے کا قیمہ اور یخنی پلاؤ پکانے میں مصروف تھی۔ اسے لاؤنج میں داخل ہوتا میں نے کچن ہی سے دیکھ لیا تھا۔ اسی وقت دادی کی آواز آئی۔

''تابی! عمر کے لیے ناشتہ لاؤ۔'' اب مجھے یہ تو پتا نہیں تھا کہ دادی کے لاڈلے ناشتے میں کیا تناول فرمائیں گے اسی لیے کھولتے ہوئے دماغ کے ساتھ کچن سے نکل آئی۔ اس کی خدمتیں کرنے اور اسے کچھ پکا کر کھلانے سے مجھے سخت چڑ ہو رہی تھی مگر مجھے اپنے رویے پر قابو رکھنا تھا اس لیے غصہ دباتی دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے لاؤنج میں آ گئی اور اس سے بولی۔

''کیا کھائیں گے آپ؟''

''بارہ بج گئے ہیں اب تو لنچ ٹائم ہونے والا ہے، سب کے ساتھ کھانا ہی کھاؤں گا، ایسا کرو صرف چائے لے آؤ۔'' اس کے جواب پر میں پلٹ کر کچن کی طرف جانے لگی تو پیچھے سے دادی کی آواز سنائی دی۔

''نہ بچے! خالی پیٹ چائے اچھی نہیں ہوتی، تابی! ایسا کرو اورنج جوس لے آؤ۔'' دادی اس کے نخرے چھوٹے بچوں کی طرح اٹھا رہی تھیں۔ میں نے جوس بنا کر برکت کے ہاتھ بھجوا دیا اور خود دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی۔

دو بجے میری کلاس ہوتی تھی اس لیے میں جلدی جلدی کام نمٹا کر تیار ہونے کمرے میں چلی گئی۔ کاٹن کا کلف لگا خوب اسٹائلش ریڈ اور یلو کلر کا سوٹ پہنا۔ شولڈرز سے ذرا نیچے آتے بالوں کو برش کر کے یونہی کھلا چھوڑ دیا۔ ہلکی سی لپ اسٹک لگائی۔ بیگ کاندھے پر ڈالا اور سن گلاسز لگاتی گاڑی کی چابیاں اٹھائے نیچے آئی تو لاؤنج میں ابھی تک دادی پوتا راز و نیاز میں مصروف تھے۔

''دادی! میں جا رہی ہوں، خدا حافظ۔'' میں نے ایک لمحے کو رک کر دادی سے کہا۔ وہ بڑی بے نیازی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک نگاہ بھی میرے اوپر نہ ڈالی تھی۔

''جاؤ بیٹا، اللہ کی امان میں۔'' دادی نے جواب دیا اور میں پورچ کی طرف چلی گئی۔

رات کو میں سونے کے لیے لیٹنے ہی لگی تھی کہ مریم زور دار دھماکے سے دروازہ کھولتی اندر آ گئی۔

''آپی! دیکھیں عمر بھائی میرے لیے کیا کیا چیزیں لائے ہیں۔'' وہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتی بہت ساری چیزیں میرے سامنے رکھنے لگی۔

''یہ دیکھیں پرفیوم، یہ کٹ کیٹ کے پورے دو ڈبے اور یہ شیفر کا فاؤنٹین پین اور سب سے قیمتی گفٹ تو یہ کیمرہ ہے، غور سے دیکھیں یاشیکا

ہے وہ بھی اور یجنل جاپانی۔ عمر بھائی کو کیسے میری پسند یاد رہی۔ میں نے انہیں فون پر بتایا تھا کہ مجھے فوٹو گرافی کا شوق ہے اور وہ میرے لیے کیمرہ لے آئے۔'' وہ ایک ایک چیز خوشی سے دکھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اتنی معصومیت اور بھول پن تھا کہ میں ان تمام چیزوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئی۔ اس کا دل رکھنے کے لیے تمام چیزوں کی تعریفیں بھی کیں۔

''میں تو عمر بھائی سے خوب لڑی۔'' مریم کی بات پر میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ''وہ آپ کے لیے کچھ نہیں لے کر آئے نا میں نے پوچھا تو کہنے لگے مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ دیکھیں ذرا آپ کے لیے گفٹ لانا بھول گئے۔ مجھے تو بڑا غصہ آیا، میں خوب لڑی ان سے، وہ کہنے لگے کہ۔'' مریم آگے کچھ اور بھی کہنے والی تھی کہ میں چیخ اٹھی۔

''مریم! تم کب بڑی ہو گی، تمہیں اس کے سامنے یہ ساری بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی، بیوقوف۔ اب تم کوئی چھوٹی سی بچی نہیں ہو۔ دو مہینے بعد میٹرک کر لو گی۔ کچھ ہوش کے ناخن لو۔'' میرے غصے پر وہ سہم سی گئی اور روہانسی آواز میں بولی۔

''میں تو آپ کی حمایت میں بولی تھی اور آپ۔'' اس کی روہانسی آواز کا کوئی نوٹس لیے بغیر میں غصے سے بولی۔

''اچھا بس جاؤ یہاں سے، میرا موڈ مت خراب کرو۔'' میری ڈانٹ پر وہ ناراض ہو کر باہر چلی گئی۔ مریم کی حماقت پر خاصی دیر تک کوفت کا شکار ہونے کے بعد میرا دھیان اس کی طرف چلا گیا۔

''بہت اچھا کیا عمر فاروق جو تم میرے لیے کچھ نہیں لائے۔ اگر لاتے تو میں نے وہ چیزیں تمہارے منہ پر دے مارنی تھیں۔ شکر ہے تم نے اپنی بے عزتی نہیں کروائی۔'' سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

ایک ڈیڑھ ہفتے تک وہ اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے ملانے میں لگا رہا۔ روزانہ صبح نکلتا تو رات گئے واپس آتا۔ خاندان میں بھی کافی لوگوں نے اس کی دعوتیں کی تھیں۔ اس لیے اس دوران وہ گھر پر کم ہی ٹکا۔ میری تو اتنے دنوں میں تین چار مرتبہ ہی اس سے ملاقات ہوئی وہ بھی سرسری سی، رسمی سی ہائے ہیلو اور بس۔ دعوتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ممی ڈیڈی نے بیٹے کی کامیاب و کامران واپسی کی خوشی میں فنکشن ارینج کیا۔ مجھے اور مریم کو ممی نے فنکشن کے لیے ہماری پسند کے کپڑے بنا کر دیے۔

میریٹ کے پول سائڈ پر فنکشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میں نے وائٹ کلر کی نیٹ کی شرٹ اور وائٹ ہی چوڑی دار پائجامہ پر نیٹ ہی کا لمبا سا دوپٹہ لیا تھا۔ بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ مناسب قسم کے میک اپ کے ساتھ میرا خیال تھا کہ میں ٹھیک ٹھاک لگ رہی ہوں۔ مریم نے چنری پرنٹ کا گرین اور پرپل کومبینیشن کا شرارہ پہنا تھا۔ ہم دونوں نے تیاری میں دیر لگا دی تو باقی سب لوگ چلے گئے صرف پاپا ہماری وجہ سے رک گئے۔ پاپا کے ساتھ ہم دونوں ہوٹل پہنچے تو ڈیڈی اور عمر مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے سامنے ہی کھڑے ہوئے تھے۔ ہم لوگ ان کے پاس پہنچے تو مریم چہکی۔

''عمر بھائی! بتائیں ہم دونوں میں سے کون زیادہ اچھا لگ رہا ہے؟'' میرا دل چاہا کہ مریم کا سر پھاڑ دوں۔ میں جتنی ریزرو رہنے کی کوشش کرتی ہوں یہ اتنا ہی مجھے ہر بات میں گھسیٹتی ہے۔ عمر کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی میں آگے بڑھ گئی اور سب لوگوں سے ملنے لگی۔

عمر فنکشن میں سارا وقت اپنے دوستوں اور کزنز کے ساتھ مصروف رہا۔ میری طرف تو اس نے شاید دیکھا بھی نہیں تھا۔ چھوٹی پھپھو کی ماریہ

سے البتہ اس کی کافی باتیں ہو رہی تھیں۔ میرا موڈ بہت بری طرح آف ہو چکا تھا۔ رات گئے تقریب ختم ہوئی اور ہم لوگ گھر لوٹے، سونے سے پہلے میں مریم کی کلاس لینا نہیں بھولی۔ میری ڈانٹ تھوڑی دیر تو وہ خاموشی سے سنتی رہی پھر بگڑ کر بولی۔

''ایسا میں نے کیا کہہ دیا ہے جس پر آپ اتنا خفا ہو رہی ہیں۔ اس دن بھی خوامخواہ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر مجھے اتنا ڈانٹا تھا۔'' وہ کوئی میرے جیسی معصوم سی بچی تو تھی نہیں جو خاموشی سے ڈانٹ سن لیتی، اس کی بات پر میں نے خاصا برا سا منہ بنا کر کہا۔

''بس مجھے اپنا ڈسکس کیا جانا اچھا نہیں لگتا۔'' وہ میرے برا ماننے پر کچھ دوستانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

''آپی! آپ اور عمر بھائی آپس میں بالکل بھی بات نہیں کرتے، اتنے ریزرو اور فارمل طریقے سے رہتے ہیں جبکہ آپ لوگوں کا تو سارا بچپن اکٹھے گزرا ہے اور مجھے تو دادی بتا رہی تھیں کہ بچپن میں آپ لوگ ہر وقت ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے بلکہ تھوڑا بہت تو مجھے بھی یاد ہے۔ اب تو لگتا ہی نہیں ہے کہ آپ دونوں فرسٹ کزنز ہیں۔'' اس کی حیرت کے جواب میں میں نے کندھے اچکا کر لاپرواہی سے کہا۔

''اب ہم بچے نہیں ہیں جو بلاوجہ لڑتے رہیں اور جہاں تک ریزرو رہنے کی بات ہے تو تمہیں پتا ہے میری نیچر نہیں ہے زیادہ گھلنے ملنے کی۔''

پتا نہیں مریم کی طرح اس بات کو کسی اور نے بھی محسوس کیا تھا یا نہیں مگر کسی نے مجھ سے کچھ کہا نہیں تھا۔ رات کھانے کے بعد میں کچن میں کچھ سمیٹا سمائی میں مصروف تھی جب مریم میرے پاس آئی اور بولی۔

''آپی! عمر بھائی ہم لوگوں کو آئس کریم کھلانے لے جا رہے ہیں، جلدی سے تیار ہو جائیں۔'' اس کی گرم جوشی کے جواب میں میں فریزر میں منہ ڈالے ڈالے ہی بولی۔

''تم چلی جاؤ، میرا موڈ نہیں ہے۔''

''کیا ہے آپی! چلیں ناں، اتنا مزہ آئے گا، آپ تو بالکل ہی ڈل اور بور ہو گئی ہیں۔'' وہ میری منت کرنے لگی تو میں پیار سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔

''مریم جان! تم چلی جاؤ سویٹ ہارٹ! مجھے ابھی کچن میں بہت دیر لگے گی اور پھر میں نے عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی۔'' میری معصوم بہن اسے میرے بغیر کوئی تفریح کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے جواب دے کر میں نے فریزر بند کیا اور دھلے ہوئے برتن خشک کرنے لگی۔ اس وقت عمر کچن کے دروازے کے پاس آ کر مریم سے بولا۔

''چلیں مریم؟'' مجھے مکمل طور پر نظر انداز کیے وہ بڑی محبت سے مریم سے مخاطب تھا۔

''بھاڑ میں جاؤ، یہاں تمہارے ساتھ جانے کے لیے مرکون رہا ہے۔'' اس کی بے نیازی پر اپنی انسلٹ محسوس کرتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں اسے دو چار گالیوں سے نوازا۔ میرے انکار پر مایوس ہوتی مریم عمر کے ساتھ چلی گئی۔

کچن سے فارغ ہو کر میں نے عشاء کی نماز پڑھی اور پھر دادی کے کمرے میں آ گئی۔ روز رات کو میں ان کے پیروں پر تیل کی مالش کرتی تھی۔ میرے اور دادی کے درمیان موجود تمام اختلافات اب دور ہو چکے تھے۔ اب میں بھی دادی کی پسندیدہ بن چکی تھی۔ میں تیل مل رہی تھی جب ممی

کیسے پائی جاسکتی ہیں۔ بندہ ہینڈسم بھی ہو، قابل بھی ہو، اس کا سینس آف ہیومر بھی اچھا ہو، پیسے والا بھی ہو اور اس کے علاوہ کیئرنگ بھی ہو۔ اچھے اچھوں کو یہ گھاس نہیں ڈالتیں تو ہم شوق رکھ کر کیا کریں۔'' مجھے مریم کی فضول بکواس وہ بھی اس کمینے کے سامنے زہر لگ رہی تھی۔ اس لیے تیل کی شیشی بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر جانے لگی۔

''تم کہاں چلیں؟ بیٹھو بھئی۔'' ممی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

''آپی شاید اپنی شادی کی بات پر شرما گئی ہیں۔'' مریم کی بکواس پر غصے سے کھولتی میں کچھ بھی بولے بغیر باہر نکل گئی۔

☆

عمر نے باقاعدگی کے ساتھ پاپا اور ڈیڈی کے ساتھ آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ آج کل وہ صبح کا گیا رات کو واپس آتا تھا۔ پاپا اور ڈیڈی اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے اور بزنس میں اس کے اتنے زیادہ دلچسپی لینے پر کافی حد تک ریلیکس بھی ہو گئے تھے۔

دادی حسبِ عادت اس کی فکر میں مبتلا رہتیں کہ ''میرا بچہ اتنا کام کر کے تھک جاتا ہوگا، یا کیا ضرورت ہے اتنی جان ماری کی آخر پہلے بھی کاروبار چل ہی رہا تھا۔'' وغیرہ۔

☆

اس روز ثناء کی شادی کی تاریخ رکھی جانی تھی۔ اس لیے میرے اور ڈیڈی کے علاوہ گھر کے تمام افراد پھپھو کے گھر گئے ہوئے تھے۔ میں ایک تو کچھ تھکی ہوئی بھی تھی اور دوسرے میرا موڈ بھی نہیں تھا اس لیے ڈیڈی کے ساتھ رک گئی تھی۔ عمر ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر ڈیڈی اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی۔ لیونارڈو کی دا ونچ آ رہی تھی اور میں مکمل طور پر فلم میں مگن ہو چکی تھی۔ ہیرو اور ہیروئن قابلِ اعتراض حد تک ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے جب لاؤنج کا دروازہ کھول کر عمر اندر داخل ہوا، اسے آتا دیکھ کر میں نے بے ساختہ انداز میں فوراً ہی ریموٹ سے چینل بدل کر بی بی سی لگا دیا۔

اپنی بے اختیاری پر مجھے خود بہت غصہ آیا، کیا میں اب بھی چھوٹی سی بچی ہوں جس کی وہ مما سے شکایت کر دے گا کہ ''چھوٹی ممی یہ موٹی ٹی وی پر پتا ہے کیا دیکھ رہی تھی۔'' میرے سلام کا جواب دیتا ہوا وہ میرے برابر والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں اس نے مجھے چینل بدلتے دیکھا تھا یا نہیں میں اس کے چہرے سے کوئی بھی اندازہ لگانے میں ناکام تھی۔

''کیا بات ہے، بڑا سناٹا ہے، سب لوگ کیا کہیں گئے ہوئے ہیں؟'' گھر میں پھیلی خاموشی محسوس کر کے وہ بولا تو میں نے مختصر لفظوں میں سب کی غیر موجودگی کا سبب بتایا اور پھر مما کی ہدایات کے پیشِ نظر اس سے کھانے کا پوچھا۔

''آپ کھانا کھائیں گے؟''

''ہاں پلیز! بڑی شدید بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ ایک نظر میرے اوپر ڈال کر بولا، میں کچن میں آ گئی۔ آج میں نے مچھلی فرائی کی تھی اور چائنیز رائس بنائے تھے۔ مجھے پتا تھا عمر کو سی فوڈ کتنے پسند ہیں۔ میں اور اس کی خاطر یں کروں اسے پکا پکا کر ٹھنساؤں، میرا دماغ کھولنے لگا۔

بھی وہی آ کر بیٹھ گئیں۔ ہم تینوں بیٹھے بڑی مزے دار باتیں کر رہے تھے جب عمر اور مریم اندر داخل ہوئے۔ وہ ابھی ابھی واپس آئے تھے۔ مریم نے میرے ہاتھ میں آئس کریم کا لیٹر پیک پکڑایا۔ میں نے لے کر لاپرواہی سے سائیڈ میں رکھ دیا اور دوبارہ دادی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ مریم بھی دادی کے بیڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئی جبکہ عمر سامنے صوفے پر براجمان ہوگیا۔

''کھالو، پگھل جائے گی۔'' دادی نے مجھے ٹوکا۔

''دادی! میں برش کر چکی، کل کھالوں گی۔'' میں نے بڑی بے توجہی سے جواب دیا۔ ہونہہ اس کمینے کا لایا ہوا تو میں آبِ حیات بھی نہ پیوں۔ میں نے خود سے کہا۔ میں بدستور دادی کے پیر دبانے میں مصروف تھی۔ آخر اسے بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ اب میرے اور دادی کے سفارتی تعلقات مستحکم ہو چکے ہیں اور پاکستان اور امریکہ دوستی کے بیچ اب بھارتی پروپیگنڈا ہرگز کامیاب ہونے والا نہیں۔

''دادی! اب ہمارے گھر میں شادی ہونی چاہیے۔ مجھے اتنا شوق ہے کہ ہمارے گھر میں مایوں، مہندی ہو۔ میں ڈھول بجاؤں اور لڈی ڈالوں۔ بس آپ ایسا کریں، عمر بھائی کی شادی کر دیں۔ بھابھی آئیں گی تو گھر میں کتنی رونق ہو جائے گی۔'' مریم دادی سے مخاطب ہوئی تو میرا دل جل کر خاک ہوگیا۔ مجھے اپنی بہن کا اس سے اتنا التفات ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔

''ہاں بیٹا! اللہ وہ دن ساتھ خیریت کے لائے۔ میں تو اب تم لوگوں کی خوشیاں دیکھنے کے لیے ہی جی رہی ہوں۔'' دادی نے خوش ہو کر اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ مریم بڑے پرجوش انداز میں بولی۔

''بس پھر ہم لوگ عمر بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دیتے ہیں یا آپ اپنی پسند سے کریں گے؟'' بات کے اختتام پر وہ عمر کی طرف متوجہ ہوئی جو اس کی باتوں پر مسکرا رہا تھا۔

''بتائیں ناں؟'' مریم نے اسے بولنے کے لیے اکسایا تو سنجیدگی سے بولا۔

''ابھی میں نے کچھ سوچا نہیں ہے۔'' مجھے پتا تھا اس وقت وہ ایکٹنگ کر رہا ہے ورنہ اپنی زندگی کے اتنے اہم موڑ کے بارے میں کیا اس نے کچھ سوچا نہیں ہوگا۔

''بیٹا! اور کب سوچو گے، میں تو اس دن کے انتظار میں دن گن گن کر گزار رہی ہوں۔'' دادی نے اس سے کہا۔ دادی کی بات پر وہ مسکرایا اور بولا۔

''اچھا، میں آپ کی پسند سے شادی کروں گا، لیکن ابھی نہیں کچھ عرصے بعد۔'' اللہ رے سعادت مندی۔ میں نے جل کر سوچا۔ ایسے ہی تو دادی اس پر عاشق نہیں ہیں۔ چمچہ گیری میں تو اس کا کوئی ثانی ہی نہیں ہے۔ دادی پوتے کی فرماں برداری پر خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں اور اسے خوب دعاؤں سے نواز رہا تھا۔

''تمہیں تابی کی شادی کا کوئی ارمان نہیں؟'' ممی نے مریم سے پوچھا۔ ان کے لہجے میں موجود شرارت میں صاف محسوس کر گئی تھی۔

''شوق اور ارمان تو بہت ہے مگر کیا کریں، ان کی پسند کا بندہ اس روئے زمین پر ملنا تو مشکل ہے۔ ایک ہی شخص میں اتنی ساری خصوصیات

دوپہر میں دادی کے لیے میں ان کے من پسند پیاز کریلے پکائے تھے۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک شیطانی منصوبہ آیا تو میں نے مچھلی اور چاول دونوں جلدی سے فریزر میں رکھ دیے۔ خوب ڈونگہ لبالب بھر کر کریلے نکالے۔ کچن ٹیبل پر کریلوں کا ڈونگہ، سلاد کا پیالہ اور ہاٹ پاٹ رکھ کر بے تابی سے اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ کپڑے چینج کر کے کچن میں آ گیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میں یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی اس لیے جان کر دو چار کیبنٹس میں سے سامان نکال اس طرح پوز کرنے لگی جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا تھا۔ وہ بغیر کوئی حیرانی یا ناپسندیدگی ظاہر کیے پلیٹ میں کریلے نکالنے لگا۔ ہاٹ پاٹ میں سے روٹی نکال کر وہ کریلے یوں کھانے لگا جیسے اس سے اچھی نعمت اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے دیکھتی، وہ بڑی رغبت سے کھاتا ہوا نظر آتا اور تو اور اس نے سلاد کی طرف بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے وہ ایک نہ دو پوری تین روٹیاں کھا گیا پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''بڑی شدید بھوک لگ رہی تھی۔ اصل میں آج لنچ کرنے کا ٹائم بھی نہیں ملا تھا۔'' میں اپنی حیرانی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے گردن ہلا کر فرج میں سے اس کے لیے رس ملائی نکالنے لگی جو مما نے بطورِ خاص اس کے لیے بنائی تھی۔ خود پر قابو پاتے ہوئے میں نے اس سے چائے کا پوچھا تو اس نے گردن ہلا دی۔ کھانا کھا کر وہ واپس لاؤنج میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں چائے لے کر آئی تو وہ چینل بدل چکا تھا اور اب ٹی وی پر دا بیچ چل رہی تھی۔ میرے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے وہ بولا۔

''تھینکس، آؤ تم بھی بیٹھو۔''

''نہیں، مجھے ابھی نماز پڑھنی ہے۔'' میں انکار کرتی اپنے کمرے میں آ گئی اور سوچتی رہ گئی کہ کیا چھ سال اتنا طویل عرصہ ہوتا ہے کہ بندے کی پسند ناپسند سب بدل جائے۔ مجھے معلوم تھا میری طرح کریلے اسے بھی زہر لگتے ہیں مگر آج اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

☆

کچن میں رول بناتے ہوئے میں بڑے سریلے انداز میں گنگنا رہی تھی۔

''وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا، اب اس کا حال سنائیں کیا۔''

مجھے اپنے پیچھے کچھ کھٹر پٹر کی آواز سنائی دی تو مڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔

عمر کیبنٹ کھولے اس میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ میں زبان دانتوں تلے دبائے کچھ شرمندہ سی کھڑی تھی۔ بھلا یہ بے وقت مجھے فریدہ خانم بننے کی ضرورت کیا تھی اور ان موصوف کو بھی اس وقت یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا دیکھ کر وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''پتی کہاں رکھی ہے؟'' میں نے آگے بڑھ کر چائے کی پتی نکال کر دے دی تو وہ چولہا جلا کر اپنے لیے چائے بنانے لگا۔

میں نے اخلاقاً بھی یہ نہیں کہا کہ لاؤ میں بنا دوں اور دوبارہ سے اپنا کام کرنے لگی۔ وہ چائے بنا کر چلا گیا تو میں نے اپنا کب کا رکا ہوا سانس بحال کیا۔ اس کے سامنے اتنا فضول گانا گانے پر مجھے خود پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا سمجھا ہوگا۔

رات کے کھانے کے بعد میں کمرے میں بیٹھی میگ پڑھ رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے کھڑے

عمر کو دیکھ کر میں اپنی حیرانی چھپا نہیں پائی۔ جب سے وہ واپس آیا تھا پہلی مرتبہ میرے کمرے میں آیا تھا۔ میری طرف بڑی مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' بڑا مہذب اور رکھ رکھاؤ والا بنا وہ مجھ سے دریافت کر رہا تھا۔ میں نے بھی ایٹی کیٹس کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک خوبصورت سا سرخ گلابوں سے مہکتا بکے اور خوبصورت سے پیکنگ پیپر میں لپٹا گفٹ میری طرف بڑھایا اور بولا ''یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں، آج چودہ فروری ہے ناں، ویلنٹائن ڈے۔'' اس کی بات پر میں غصے سے پاگل ہونے لگی۔ وہ مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

قریب تھا کہ میں وہ چیزیں اس کے منہ پر دے مارتی اور سارے ادب آداب بالائے طاق رکھ کر اسے ایسی ایسی گالیاں دیتی کہ وہ حیران رہ جاتا۔ اپنے اس خیال پر میں عمل کرنے ہی والی تھی کہ ایک اور بات میرے ذہن میں آئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی کوندا سا لپکا ہو۔ میری برسوں پرانی آگ ٹھنڈی ہونے کا موقع قدرت مجھے خود فراہم کر رہی تھی تو میں کیوں انکار کرتی، اس لیے میں جو غصے سے لال پیلی ہونے لگی تھی۔ ایک دم چہرے کے تاثرات بدل کر مسکرانے لگی اور دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے لے کر بولی۔

''تھینک یو سو مچ۔'' وہ بڑے غور سے میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ میرے شکریہ پر وہ بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اس کی یہ بے موقع ہنسی میری سمجھ سے باہر تھی۔

''تابی! میں نے گھر سے دور رہ کر اتنے سال سب سے زیادہ تمہیں مس کیا ہے۔ کیا تم نے بھی مجھے مس کیا تھا؟'' اس کے محبتوں سے چور لہجے پر میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا دماغ ٹھکانے لگا دوں لیکن خود پر جبر کرتی مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔'' پھر سامنے سے ہٹتے ہوئے اس سے بولی ''آپ اندر آئیے ناں۔'' میں اسے اپنے ارادوں کی بھنک بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔

''نہیں، بس میں چلوں گا۔'' اس کے جواب پر میں نے سر ہلا دیا اور بولی۔

''پھولوں کا بہت شکریہ، بہت خوبصورت پھول ہیں۔'' میں نے بڑی ادا سے مسکرا کر کہا۔ آخر تھی تو اس کی کزن، اتنی مکاری تو میں بھی کر سکتی تھی۔ میری بات پر وہ بڑی شریری مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارے پسند کرنے کا بہت شکریہ۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تو میں بیڈ پر بیٹھ کر کتنی ہی دیر تک کھولتی رہی۔ اس خبیث کی یہ جرأت مجھے ویلنٹائن ڈے پر پھول اور گفٹ دے جیسے میں تو کب سے اس کی طرف اظہارِ عشق کے لیے مری جا رہی تھی۔ گفٹ کے اوپر لگا کارڈ کھول کر پڑھا تو اس میں ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے بڑی خوبصورت باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ گفٹ کھولنے کی میں نے ضرورت محسوس نہ کی۔

''بیٹا آج تمہیں تمہاری ساری خباثتوں کی سزا نہ دی تو تاباں فاروقی نام نہیں۔'' میں ایک عزم کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ ہاتھوں میں بکے اور گفٹ اٹھا کر کمرے سے باہر نکلی۔ میرے تصور میں دادی کا صدمے سے چور چہرہ آ رہا تھا۔

''عمر! تمہیں شرم نہیں آئی میری معصوم پوتی سے عشق لڑاتے۔'' پھر مما سامنے آتیں عمر پر بڑی ملامتی نظریں ڈالتی ہوئی کہتیں۔

''ارے ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے، تم نے اپنے ہی گھر میں نقب لگائی۔'' ڈیڈی غصے سے چیختے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے، بے حیا، بے غیرت۔ اپنے گھر کی عزت پر بری نظر ڈالتے ہو، کمینے۔'' اس کے بعد ممی اٹھتی ہیں اور ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارتی ہیں اور کہتی ہیں۔

''عمر! تم نے تو ہمیں صوفیہ اور حسان سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔'' یہ خوش کن نظارا انشاء اللہ ابھی کچھ دیر بعد میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی۔ ابھی جب میں آنکھوں میں آنسو بھرے یہ تمام چیزیں جا کر ممی کو دکھاؤں گی تو یقیناً یہی سب کچھ ہوگا۔ اسے سب کی نظروں سے گرانے کی میری برسوں پرانی خواہش آج پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر میں لاؤنج میں داخل ہوئی تو سب ہی وہاں موجود تھے۔

ہاں اس کی ذلت کا تماشا دیکھنے کے لیے سب کو موجود ہونا چاہیے۔ میں اسے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گی۔ آج میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔

ممی، دادی اور مما ایک صوفے پر بیٹھی تھیں اور پاپا اور ڈیڈی دوسرے صوفے پر جبکہ عمر اور مریم فلور کشنز پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ مجھے لاؤنج میں داخل ہوتے عمر کے علاوہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑے بھرپور انداز میں مسکرایا۔

پتا نہیں کیوں اس کی آنکھوں میں مجھے اس وقت وہی خاص قسم کی چمک نظر آئی جو بچپن میں مجھے ستانے اور رلانے پر اس کی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔ عجیب سی سازشی اور مکار آنکھیں جو دوسروں کو ذہانت سے بھرپور نظر آتی تھیں۔ میں اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھی اور دونوں چیزیں ممی کی جھولی میں ڈال دیں۔ انہوں نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ باقی سب بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ عمر سر جھکا کر کارپٹ پر لکیریں کھینچ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''کیا بات ہے تابی؟'' ممی نے مجھ سے دریافت کیا، ان کا اشارہ میرے چیزیں ان کی گود میں ڈالنے کی طرف تھا۔ اب کسی قسم کی مروت یا لحاظ کی تو کوئی ضرورت نہیں تھی چنانچہ میں بڑے نڈر انداز میں بولی۔

''یہ مجھے عمر نے دیا ہے۔'' وہ چند لمحے حیرت سے مجھے دیکھتی رہیں پھر کارڈ اور پھولوں کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

''لیکن ایسی چیزیں اماں ابا کو نہیں دکھاتے، یہ نہیں بتایا اس نے تمہیں؟'' ممی کا جواب میری توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ ممی کے برابر میں بیٹھی مما نے بھی کارڈ کو مسکراتی نظروں سے دیکھا اور میری طرف دیکھ کر یوں ہنسنے لگیں جیسے میں بڑی بے وقوف ہوں جو یہ اٹھا کر سب کے پاس لے آئی ہوں۔

''اس نے مجھے ویلنٹائن ڈے پر پھول اور گفٹ دیا ہے اور آپ ہنس رہی ہیں۔'' میرا غصے سے برا حال تھا۔ کتنا دہرا معیار ہے ہمارے گھر میں اگر لڑکی کسی لڑکے کو پھول دے تو قابلِ نفرت اور لڑکوں کو کھلی چھوٹ ہے۔ وہ جو چاہے کرتے پھریں۔ میں اپنا اشتعال کنٹرول کرنے سے قاصر

تھی۔ میری بات پر سب چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ پھیل گئی تھی اور تو اور دادی بھی مسکرا رہی تھیں جیسے میں کوئی لطیفہ سنا رہی ہوں جبکہ وہ ہنوز کارپٹ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے ہنسی روک رہا تھا۔

''کیوں بھئی عمر! تم نے ہماری بیٹی کو پھول کیوں دیے ہیں؟'' ڈیڈی میرا لال بھبوکا چہرہ دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے عمر سے مخاطب ہوئے مگر ان کے لہجے میں چھپی شرارت صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ زبردستی سنجیدہ بنے ہنسی ضبط کیے بیٹھے تھے۔ مریم باقاعدہ قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھی۔

سب کے رویے میری امیدوں کے برخلاف تھے۔ میرا دل بھر آیا اور میں تیز قدموں سے دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی، پیچھے سے ڈیڈی اور ممی کی آوازیں آ رہی تھیں وہ مجھے منانے کے لیے کچھ کہہ رہے تھے مگر میں کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ کمرے تک آتے آتے باقاعدہ آنسو نکل آئے اور میں دروازہ بند کر کے رونے بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد مریم کی آواز آئی۔ وہ زور زور سے دروازہ پیٹ رہی تھی مگر میں ڈھیٹ بنی منہ سر لپیٹے پڑی رہی۔ صبح ہوئی تو میرا کمرے سے نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اسی لیے نہا کر کمرے ہی میں بیٹھی رہی۔ دروازے پر دستک دی اور مما کی آواز آئی۔

''تابی! بیٹا دروازہ کھولو۔'' مما کی آواز سن کر مجھے اٹھنا ہی پڑا۔ میرے دروازہ کھولنے پر وہ اندر داخل ہوئیں اور بغور میری طرف دیکھ کر ہنس پڑیں۔

''ابھی تک چھوٹے بچے کی طرح ناراض ہو جاتی ہو۔'' وہ مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ پھر مما نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بیڈ پر بٹھایا اور میرے بال سنوارتے ہوئے پیار سے کہنے لگیں۔

''اتنی بڑی ہو گئی ہو لیکن عقل نام کو بھی نہیں ہے، رات وہ چیزیں لے کر سب کے پاس آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ عثمان بھائی تو رات گئے تک اس بات پر عمر کا مذاق اڑاتے رہے کہ تم تو اپنی بیوی سے کبھی اظہارِ محبت بھی نہیں کر سکو گے کہ یہ ابھی جا کر سب کو بتا آئے گی۔'' مما جیسے کوئی بات یاد کر کے دوبارہ ہنسنے لگیں۔ مما کی اس بات پر میں ایک دم چونک گئی، یہ مما کیا کہہ رہی تھیں؟

''کون بیوی؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میرے آس پاس خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

''بیوقوف ہم تمہاری اور عمر کی منگنی کی بات طے کر چکے ہیں اور تم اس بے چارے کا اتنی چاہت سے دیا تحفہ سب کو دکھاتی پھر رہی ہو۔'' مما نے جیسے میری عقل پر ماتم کیا تھا۔ ان کی یہ بات سن کر میں اپنا غصہ چھپا نہیں پائی ایک دم پھٹ پڑی۔

''منگنی میری، وہ بھی اس خبیث سے، نیور۔'' مما میرے خبیث کہنے پر مجھے گھورنے لگیں مگر مجھے ان کے گھورنے کی کچھ خاص پروا نہ تھی۔ حد ہو گئی میری منگنی اور شادی کی باتیں کی جا رہی ہیں اور میں ہی لاعلم ہوں۔ مجھے اپنا ردعمل بالکل درست لگ رہا تھا۔

''عمر میں برائی کیا ہے؟'' مما نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اس ایڈیٹ میں اچھائی کیا ہے، مجھے اس سے نفرت ہے۔'' اب کے مما کو بھی غصہ آ گیا اس لیے ڈانٹنے والے انداز میں بولیں۔

''کیا بدتمیزی ہے تابی! اس طرح بولتے ہیں۔'' وہ ناراض ہوگئی تھیں۔

''مما! آپ میری بات اچھی طرح سن لیں، میں کنواری مرنا زیادہ پسند کروں گی بہ نسبت اس بات کے کہ میری اس سے شادی ہو۔ میں تو اس کی شادی میں شریک ہونا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔ میری منگنی کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجھ سے پوچھا تک نہیں گیا۔ جیسے میں تو کب سے تیار بیٹھی تھی، بس شہزادہ جانِ عالم کی سواری کا انتظار تھا۔'' مجھے ایک دم ڈھیر سارا رونا آ گیا تو اپنی بات ادھوری چھوڑ کر دھواں دھار رونے لگی۔

میرے رونے پر مما کا دل پسیج گیا اور وہ قدرے نرم لہجے میں کہنے لگیں۔ ''تابی! وہ بہت اچھا ہے، تم بہت خوش رہو گی۔ پھر یہ اماں کی اور ہم سب کی بھی خواہش ہے۔''

''ہاں، وہ بہت اچھا ہے، بس میں ہی اس کے قابل نہیں ہوں اس لیے آپ لوگ مجھے معاف کر دیں اور اس اچھے کے لیے کوئی اس سے زیادہ اچھی لڑکی ڈھونڈ لیں۔'' میں روتے روتے بولی اور اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ سامنے کوریڈور میں عمر اور مریم آپس میں کچھ بات چیت کرتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ میری آنسو برساتی آنکھوں کی طرف دونوں ہی نے غور سے دیکھا تھا۔ میں ان کو نظر انداز کرتی مریم کے کمرے میں گھس گئی۔ شام تک میں یونہی کمرے میں پڑی رہی۔ چھ بجے کے قریب مریم کمرے میں آئی اور میرے پاس بیٹھ کر کہنے لگی۔

''آپی!'' میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ ناراض لہجے میں بولی ''میں نے کیا کہا ہے جو آپ مجھ سے بھی ناراض ہو گئی ہیں۔ پلیز آپی اٹھیں ناں۔ یاد ہے کل آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ حرا کی برتھ ڈے کے لیے گفٹ خریدنے میرے ساتھ بازار چلیں گی۔'' اس کی منت پر میں نے تکیے میں منہ دیئے دیئے ہی جواب دیا۔

''مریم! آج میرا موڈ نہیں، یا تو کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ اور اگر میرے ہی ساتھ جانا ہے تو کل پر رکھو۔''

''کسی اور کے ساتھ کیوں جاؤں، وعدہ تو آپ نے کیا تھا اور آج ہی جانا ہے، کل تو اس کی برتھ ڈے ہے۔ آپ کو اپنی چھوٹی بہن کا ذرا سا بھی خیال نہیں ہے۔ آپ کی اکلوتی بہن ہوں میں جس کے ساتھ آپ اتنا برا سلوک کر رہی ہیں۔'' وہ رونے کی تیاری کرنے لگی تو مجھے اٹھنا ہی پڑا۔ اور پھر صرف مریم کا دل رکھنے کی خاطر میں بازار جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

ٹھیک ہے اس سارے قصے میں مریم کا کیا قصور ہے۔ اصل غصہ تو مجھے مما اور پاپا پر تھا۔ مریم تو بے قصور اور معصوم ہے۔ میں نے خود سے کہا اور مریم کا خوشی سے دمکتا چہرہ دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ میرے مان جانے پر بہت مسرور تھی۔ گاڑی کی چابی اٹھائے ہم دونوں لاؤنج میں آئے۔ مما، ممی اور دادی تینوں ہی وہاں بیٹھی تھیں۔ میں نے پھولے منہ سے بازار جانے کا بتایا اور ممی کی معنی خیز مسکراہٹ نظر انداز کرتی باہر آ گئی۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے مین روڈ پر ڈالی تو موسم کی خوشگواری نے میرے آف موڈ پر بھی خوشگوار اثر ڈالا۔ گاڑی میں اپنی پسند کا کیسٹ لگائے میں اس وقت ڈرائیونگ کو انجوائے کر رہی تھی۔

''آپی! شاپنگ بعد میں پہلے آپ مجھے ''میک ڈونلڈز'' سے برگر کھلوائیں۔'' مریم نے پھیلنا شروع کیا تو میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''میں تو آپ کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔ صبح سے بھوکی پیاسی ہیں، خالی پیٹ شاپنگ کیا خاک ہوگی۔'' وہ میرے گھورنے پر ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

اس کی بات پر مجھے بھی ہنسی آ گئی اور پھر واقعی مجھے بھوک بھی بہت شدید لگ رہی تھی اس لیے گاڑی ''میک ڈونلڈز'' کے سامنے روک دی۔ اندر داخل ہو کر میں کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے مریم سے پوچھنے لگی۔

''کیا لوگی؟'' وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔ میری بات کا جواب بھی اس نے بڑی بے توجہی سے دیا۔

''میں چکن ود چیز اور کوارٹر پاؤنڈر رکھاؤں گی مگر پہلے ذرا وہاں چلیں۔'' وہ ایک دم بڑے پر جوش انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے مجھے ایک میز کی طرف لے آئی اور وہاں بیٹھی شخصیت کو دیکھ کر میرا پارہ آسمان پر چڑھنے لگا۔

مجھے اپنا غصہ ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ مریم میرے غصے اور ناراضی سے بے نیاز اس سے مخاطب تھی۔

''ہم لوگ لیٹ تو نہیں ہوئے؟'' وہ گھڑی دیکھتا ہوا مسکرا کر بولا۔

''پورے دس منٹ لیٹ ہو۔''

''میں کیا کرتی، آپی نے تیاری میں اتنی دیر لگا دی۔ اچھا اب میں جا رہی ہوں۔ حرا اپنے ڈرائیور کے ساتھ باہر میرا انتظار کر رہی ہے اور واپسی میں میرے لیے برگر لینا اور مجھے پک کرنا مت بھولیے گا۔'' وہ دونوں مجھے نظر انداز کیے آپس میں مصروف تھے اور میں اپنی چھوٹی بھولی بھالی بہن کی سازشی ذہنیت ملاحظہ کر رہی تھی۔

''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔'' مجھے بہت پہلے کا پڑھا یہ مصرعہ اچانک ہی یاد آیا تھا۔ مارے غصے کے میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ مجھے کرنا کیا چاہیے۔ ایسے ہی تو غصے کو حرام نہیں قرار دیا گیا۔ یہ انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیتا ہے۔ مریم ہاتھ ہلاتی خدا حافظ کر کے جا چکی تھی اور میں اپنی مٹھیاں بھینچے کھڑی پتا نہیں کیا کرنا چاہتی تھی۔ مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اتنی گھٹیا سازش کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ بڑی تفصیلی اور گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ، لوگ تمہیں مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے ایک سرد نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور بولی۔

''اتنی چیپ فلمی قسم کی حرکت کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟''

''تم بیٹھو تو جاؤ، وجہ بھی بتا دیں گے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ دل تو میرا چاہ رہا تھا کہ اس کا سر پھاڑ دوں لیکن ایک دم ہی مجھے خیال آیا کہ ٹھیک ہے آج اس کی تمام خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور کر دینی چاہئیں۔ اس لیے کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھنے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا اور بڑے آرام سے پوچھنے لگا۔

''کیا کھاؤ گی؟'' جیسے میں اس کی مہمان ہوں جسے اس نے بڑی چاہت سے انوائیٹ کیا ہے اور اب میزبانی کے تقاضے نبھانے کے لیے دل و جان سے تیار ہے۔ میں کوئی جواب دیے بنا اسے گھورتی رہی۔ میرے گھورنے پر وہ سہمنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا بولا۔ ''ایسے مت گھورو، میں پہلے ہی خاصا ڈرا ہوا ہوں اسی لیے گھر کے بجائے تم سے یہاں بات کرنے کا فیصلہ کیا کہ گھر میں مجھے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ یہاں کم از کم اردگرد بیٹھے ہوئے

لوگوں کا لحاظ روا رکھتے ہوئے میری جان بخشی ہو جائے گی۔'' اس کی اوورا کیٹنگ پر میرا خون کھولنے لگا تھا، اسی لیے ایک دم پھنکاری۔

''تم میرے سامنے زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو، میں تمہاری ساری کمینگیاں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' میرے جواب پر وہ ہنس پڑا اور بولا۔

''اچھا آہستہ تو بولو، لوگ دیکھ رہے ہیں۔ ویسے مجھ میں برائی کیا ہے۔ تمہاری تمام شرائط پر پورا اترتا ہوں یعنی ہینڈسم، کیئرنگ، ویل آف، ایجوکیٹڈ وغیرہ ساری ہی خصوصیات مجھ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔'' وہ شوخ مسکراہٹ چہرے پر سجائے پوچھ رہا تھا۔

''تمہاری سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ تم ایک گھٹیا انسان ہو اور میں تم سے سخت نفرت کرتی ہوں، تمہارے ساتھ تو اگر جنت میں بھی جانے کو کہا جائے تو میں انکار کر دوں گی۔'' میں نے اپنی تمام تر نفرت پوری شدت کے ساتھ اس کے سامنے ظاہر کر دی تھی۔ لیکن وہ ڈھیٹ بنا مسکرائے جا رہا تھا جیسے میں نے ابھی کوئی دل دکھانے والی بات کہی ہی نہ ہو۔

''اچھا تو وہ تمام پرپوزلز کس خوشی میں ریجیکٹ کیے گئے تھے؟ وہ اپنی اصلیت پر آتا میرا دل جلانے لگا تو میں نے بڑے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''تمہاری وجہ سے، اصل میں مجھے تمہارا انتظار تھا۔'' وہ بھرپور انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''مجھے معلوم تھا، تم نے میری ہی وجہ سے انکار کیا ہوگا۔ تمہاری جیسی اچھی لڑکی تو مجھے اس پوری دنیا میں اور کوئی نہیں ملے گی جو میری خاطر ڈائٹنگ کر کر کے اتنی دبلی ہو گئی ہے۔'' اس کی بات پر میں بلبلا اٹھی۔

''میں کوئی ڈائٹنگ وائٹنگ نہیں کرتی۔''

''شاید تم میرے غم میں اتنی اسمارٹ ہو گئی ہو۔ جب ہی اس دن اتنا درد بھرا گیت بھی گا رہی تھیں۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''عمر! آئی ول کل یو۔'' مارے غصے کے الفاظ منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ وہ میری کیفیت پر ہنستا ہوا بولا۔

''میرا خیال ہے اس وقت تمہیں کسی ٹھنڈی چیز کی اشد ضرورت ہے۔ ٹھہرو میں تمہارے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر چلا گیا اور میں خود پر قابو پانے لگی۔ مجھے جذبات کو کنٹرول کر کے اس کو منہ توڑ جواب دینا چاہیے۔ میں نے خود کو سمجھایا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور ٹرے میرے سامنے کرتا ہوا بولا۔

''کھاؤ۔'' میں نے ٹرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تو وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''دیکھ لو، اس میں تمہاری پسند کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ میں کتنا اچھا میزبان ہوں۔ اپنے مہمانوں کو مچھلی اور چائنیز رائس فریزر میں چھپا کر کر یلے تو ہرگز نہیں کھلاتا۔'' اس کی بات پر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ کتنا چالاک ہے، میں نے دل میں سوچا۔ وہ میری شرمندہ سی شکل کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''اس دن صرف تمہاری خاطر وہ کر یلے حلق سے اتارے تھے۔ جو میرے اوپر گزر رہی تھی وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔''

اس کی بات پر میں نے ایک نظر اسے دیکھا، وہ براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکنے لگا تو میں نے ایک دم نظریں جھکا لی تھیں۔ اس کا اس طرح دیکھنا مجھے نروس کرنے لگا تھا اور میں اپنی اس کیفیت پر قابو پانے سے قاصر تھی۔

''اب تو ناراضگی ختم کر دو، اب تو تم مجھ سے بدلہ بھی لے چکی ہو، حالانکہ انگریزوں کے اس فضول سے تہوار کو میں نہیں مانتا مگر تمہاری خاطر فرسٹ فروری سے دن گن گن کر گزار رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا جب تک تم اپنا حساب برابر نہیں کرو گی تمہیں چین نہیں آئے گا۔'' وہ مزے سے کل کے واقعے کا ذکر کر کے میرا دل جلا رہا تھا۔ کل کی ساری بات یاد آئی تو میں نئے سرے سے چڑ گئی اور بڑے تنفر سے بولی۔

''میری تمہارے ساتھ کوئی ناراضی نہیں ہے، نہ ہی تم اتنے اہم ہو کہ میں تمہارے خلاف ناراضیاں پالوں۔ تمہیں اپنے بارے میں بڑی زبردست غلط فہمی ہے۔ تم تو اگر سونے چاندی کے بھی بن کر آ جاؤ میں تمہیں تب بھی منہ نہ لگاؤں۔''

''تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں، ویسے کسی نے مجھے بتایا تھا کہ میں بڑا ''اسپیشل ہوں'' اس کے چہرے پر وہی مخصوص مسکراہٹ تھی جو میرا دل جلایا کرتی تھی۔

''اور کہنے والوں نے تو میری شان میں بڑا خوب صورت شعر بھی کہا تھا۔'' وہ جس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا وہ میرے لیے باعثِ ندامت تھی اسی لیے میرا سر جھک گیا تھا۔

''تمہیں مجھ سے کس بات کی دشمنی ہے؟ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' میں نے ایک دم ہتھیار ڈال دیے اور وہ میرے پسپائی اختیار کرنے پر مسکرا دیا۔

''دشمنی اور تم سے؟ ہرگز نہیں، میں تو پچھلے بائیس سالوں سے تمہارے عشق میں مبتلا ہوں۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ میں نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے جذب سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری بے وقوف سہیلیوں نے کم از کم یہ ایک بات تمہیں بالکل صحیح بتائی تھی کہ تمہارا ہینڈسم اور اسمارٹ کزن صرف تمہیں اس لیے ستاتا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ ویسے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے سے ڈرتا ورتا اس وقت بھی نہیں تھا بس مجھے مزہ آتا تھا تمہیں چڑا کر، ستا کر۔ میری شرارتوں پر جب تم چڑتی تھیں تو مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ تم ہر وقت میرے بارے میں سوچتی رہو اور دیکھ لو، اپنی اس کوشش میں میں کامیاب رہا۔ تم نے اپنی تمام زندگی میں میرے علاوہ اور کسی کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔''

وہ بڑے یقین سے کہتا میری طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے اتنے پُریقین انداز پر میں نے اپنی ہارٹ بیٹ کچھ ڈسٹرب ہوتی محسوس کی تھی۔ میرا دل میرے خلاف بغاوت کر رہا تھا اور میں اسے بری طرح ڈانٹ رہی تھی۔

''میں تمہاری کسی بھی بکواس پر یقین نہیں کروں گی، تم ایک نمبر کے جھوٹے اور فراڈ انسان ہو، پیٹھ پر وار کرنا تمہاری اضافی خوبی ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بڑی بے بسی سے سر پکڑ کر بولا۔

''اب میں تمہیں اپنا یقین کیسے دلاؤں؟''

''تم کچھ بھی کرلو، میں تمہارے دھوکے میں کبھی بھی نہیں آؤں گی۔ تمہاری اصلیت مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔'' میں نے نفرت سے کہا۔

''تم جس وجہ سے مجھ سے اتنی شدید ناراض ہو اگر سوچو تو اس سے تمہیں فائدہ ہی پہنچا ہے۔ پھر بھی تمہاری خوشی کی خاطر میں ایکسکیوز کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' اس کی بات پر میں ایک عدد تردیدی بیان دینے ہی والی تھی کہ وہ مزید کہنے لگا۔

''یار! بیس سال کی عمر میں تم مجھ سے کس قسم کی سنجیدگی اور میچورٹی کی توقع رکھتی تھیں۔ ویسے بعد میں کچھ سال گزرنے کے بعد میں نے جب غور کیا تھا تو تمہاری بولڈنیس کو سلام کرنے کو دل چاہا تھا۔ میں مانتا ہوں وہ شرارت ذرا سی سنگین ہوگئی تھی۔ مجھے وہ کارڈ جا کر چھوٹی ممی کو نہیں دینا چاہیے تھا۔ تم اسے میری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف نہیں کرسکتیں اور اگر سوچو تو اس تمام واقعے نے تمہیں فائدہ ہی پہنچایا ہے۔ تم نے صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے خود کو اتنی اچھی طرح بدلا کہ سب خوش ہوگئے۔ امریکہ میں جب مجھے پتا چلا کہ وہ لڑکی جس کو ایل سی ایم لینا نہیں آتا تھا اور جو میتھ کے پیریڈ میں روز کھڑی کی جاتی تھی اس نے میتھس ہی میں ماسٹرز کرلیا ہے تو میں اتنا خوش ہوا کہ بتا نہیں سکتا۔ سارے گھر والے بشمول میرے یہی سمجھتے تھے کہ بہت سے بہت ہوا بھی تو یہی ہوگا کہ تم روتے پیٹتے بی اے کرلوگی اور تمہاری قابلیت جولیا رابرٹ، کیٹ ونسلیٹ، کاجل اور شاہ رخ خان کے قصوں سے آگے نہیں بڑھے گی۔ لیکن تم نے سب کے خیالات غلط ثابت کردیئے اور میں جو یہ چاہتا تھا کہ تم اپنی ذہانت کو درست طریقے سے استعمال کرو مگر کبھی کہہ نہ پاتا تھا تم نے میرے کہے بغیر میری خواہش پوری کردی۔ اچھی تو تم مجھے ویسے بھی لگتی تھیں اگر اتنا نہ پڑھتیں تب بھی مگر اب میں تم پر فخر کرتا ہوں پہلے صرف محبت کرتا تھا۔'' اس نے زندگی میں پہلی بار بڑی سنجیدگی اور بردباری سے مجھ سے کوئی بات کی تھی۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو ایسا لگا سب کچھ بدل رہا ہے۔ اس کے خلاف دل میں موجود سارا غصہ اور تمام نفرت پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ اس نے شاید میرے چہرے سے میری بدلتی کیفیت کا اندازہ لگالیا تھا اس لیے مسکرا کر بولا۔

''میں یہ بات پورے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں اس لیے اب مزید منتیں مت کرواؤ۔ جب دل سے مان چکی ہو تو زبان سے بھی قبول کرلو۔'' میرا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر وہ ہنس پڑا اور بولا۔

''شکر ہے تم کچھ شرما ورما بھی لیتی ہو ورنہ مجھے اپنے مستقبل کی بڑی فکر تھی اور ویسے تو تمہارا شکریہ بھی ادا کرنا تھا کہ تم نے دادی کی خدمتیں کرکے ان کا بھی دل جیت لیا ہے ورنہ تم دونوں کی قدیم دشمنی میں میرا تو بیڑا غرق ہوجانا تھا۔''

تمہاری طرح دادی کی چمچہ گیری نہیں کرتی ہوں، سمجھے۔'' میں شرمانا بھول کر اپنے ازلی منہ پھٹ انداز میں بولی تو وہ شوخی سے مسکرادیا اور کہنے لگا۔

''تمہارا وہ کارڈ آج بھی میرے پاس بڑی حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔ شادی کے بعد ہم اسے فریم کروا کر اپنے کمرے میں لگالیں گے۔''

وہ مجھے چھیڑ رہا تھا اور میں نروس سی ہوکر سر جھکا گئی تھی۔

''اور شادی کے بعد جب کسی دن دادی اپنے من پسند پیاز کریلے پکایا کریں گی تو ہم دونوں کمرے میں چھپ کر پیزا کھایا کریں گے۔''

اس کی بات پر میں بھی ہنس پڑی تھی۔

''تمہاری تسلی کے لیے میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تم کیسی بھی فلم دیکھو میں چھوٹی ممی سے شکایت نہیں کروں گا، چاہے وہ ڈائچ ہو یا شیکسپیئر ان لو یا پھر کوئی اور۔'' وہ شرارت بھرے انداز میں بولا تو میں نے بے ساختہ اس کو گھورا تھا۔

''عمر! تم واقعی بہت خبیث ہو۔'' میری بات پر وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''دیکھو یہ اتنے پیارے پیارے ناموں سے اکیلے میں پکار لیا کرنا۔ اگر دادی کے سامنے کہا تو نتائج کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہوگی۔'' اور جواب میں میں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

❁.....❁

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

صرف محبت

جہاز چند لمحوں میں لینڈ کرنے والا تھا۔ وہ بڑے اُلجھے ہوئے انداز میں بیٹھی آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بہت چھوٹی تھی وہ اس وقت جب ابو اور امی کے ساتھ ایک مرتبہ کراچی آئی تھی۔ اتنی چھوٹی کہ اسے اس وقت کی کوئی بات اب یاد بھی نہیں تھی۔ آج اتنے برسوں بعد وہ دوبارہ اس شہر میں آئی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ یہاں اسے کس طرح کے حالات سے گزرنا ہوگا۔ ابو کی وفات کے بعد جس قسم کے حالات سے ان لوگوں کو گزرنا پڑا، انہوں نے اسے کسی حد تک بہادر بنا دیا تھا لیکن پھر بھی ملازمت کے لیے کسی دوسرے شہر جانے کا تو یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ نیا شہر، نئے لوگ۔ وہ پتا نہیں خود کو یہاں پر ایڈجسٹ کر بھی پائے گی یا نہیں اور سب سے بڑھ کر پھوپھو کے گھر قیام..... کیا وہ ان کے گھر میں رہ سکے گی؟

حالانکہ وہ خود کو بار بار پھوپھو کے اس کے بچپن سے لے کر اب تک کے تمام اچھے رویوں اور محبت بھرے سلوک کے بارے میں یاد دلا رہی تھی، لیکن پھر بھی بہت سی سوچیں اور بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اس کو تشویش اور پریشانی میں مبتلا رکھے ہوئے تھیں۔ پھوپھو بہت اچھی ہیں۔ ان لوگوں سے بہت پیار کرتی ہیں، لیکن پھوپھو کے گھر میں صرف وہ اکیلی تو نہیں رہتیں۔ وہاں انکل اور اس کے کزنز بھی تو رہتے ہیں اور پتا نہیں وہ لوگ اس کے اپنے گھر قیام کو پسند کریں گے بھی کہ نہیں۔ ان لوگوں نے کب پھوپھو اور ان کی فیملی کے ساتھ کوئی بہت اچھے اور محبت آمیز سلوک کر رکھے تھے، جو وہ بدلے میں یہاں اپنی مہمان نوازیوں اور محبتوں کی کوئی اُمید رکھتی۔ جو رویہ ابو اور خاص طور پر امی نے زندگی بھر پھوپھو کے ساتھ روا کیا تھا، اسے دیکھتے ہوئے کسی اور کو تو کیا خود پھوپھو کو بھی اس کی آمد کی کوئی خوشی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ پھوپھو کے گھر یہ بن بلایا مہمان امی نے ہی اسے بنوایا تھا، ورنہ اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا، ان کے ہاں قیام کرنے کا۔

کراچی میں ایک سوفٹ ویئر ہاؤس (Software House) میں یہ جاب جس کے لیے اسے اپنا شہر اور اپنا گھر چھوڑنا پڑا، اسے عاقب خالو کے توسط سے ملی تھی۔ گو پنڈی میں اس کو جاب ملی ہوئی تھی، مگر بہت جان توڑ محنت اور انتہائی لگن سے کام کرنے کے بعد مہینے کے اختتام پر جتنے پیسے اس کے ہاتھ میں آتے، وہ ان لوگوں کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ اگر وہ شوقیہ ملازمت کر رہی ہوتی تو اپنی اسی جاب کو جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ پنڈی میں ہی کسی مناسب جاب کے لیے کوششیں جاری رکھتی، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جاب اس کے لیے شوق، وقت گزاری اور تعلیم کو استعمال کرنے والی چیز نہیں تھی۔ یہ اس کے اور اس کے گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے انتہائی ضروری تھی۔

دونوں بھائی جن تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے تھے، وہاں کی فیسیں اور دیگر اخراجات اس کی اس قلیل سی تنخواہ میں پورے نہیں ہو پاتے تھے۔ وہ بہت پریشان تھی۔ دورانِ تعلیم بھائی کہیں ملازمت کریں یا ٹیوشنز پڑھائیں۔ یہ بات نہ اسے پسند تھی نہ امی کو۔ ابو کی زندگی میں جو

عیش و آرام ان بھائیوں نے دیکھا تھا اور جتنے بے فکرے ماحول میں اپنے تعلیمی مدارج طے کیے تھے، اس کے بعد اسے یہ بات ناممکن دکھائی دیتی تھی کہ وہ پڑھائی اور جاب ساتھ ساتھ چلا سکتے ہیں۔

پھر ان دنوں جب وہ شدید ترین مایوسی کا شکار ہو کر اپنی کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کی ڈگری کو ایک کاغذ کے معمولی سے پرزے کے برابر سمجھنے لگی تھی، تب عاقب خالو نے اس کے لیے اس جاب کا بندوبست کر کے اسے مایوسی کے اس شدید ترین احساس سے باہر نکالا تھا، ورنہ خالہ کا حال تو یہ تھا کہ ابو کی وفات کے بعد جب جب وہ ان کے گھر آئیں اور بہن کی بیوگی اور معاشی پریشانیوں پر ان کے ساتھ مل کر روئیں تو اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں رونے سے ان کا میک اپ نہ خراب ہو جائے، پھر جب عاقب خالو کی کوششوں کے نتیجے میں اسے جاب ملی تو وہ خود تو بے حد خوش ہوئی، لیکن امی سخت فکر مند۔ اپنی نازوں پلی بیٹی کو ملازمت کے لیے دوسرے شہر بھیجنا ایک بہت مشکل کام تھا، ان کے لیے۔ جتنی بھاری بھرکم تنخواہ والی یہ جاب اسے کراچی میں ملی تھی۔ وہ اس وقت اس کی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ امی نے اسے اس شرط پر کراچی جانے کی اجازت دی تھی کہ وہ وہاں پھوپھو کے گھر میں رہے گی۔

ساری زندگی جس نند کو انہوں نے خود سے کم تر اور بہت حقیر سمجھا۔ اب ابو کی وفات کے بعد انہیں اچانک اس کی وہ محبت اور خلوص نظر آنا شروع ہو گیا تھا، جسے انہوں نے ہمیشہ مکاری اور بھائی کی دولت کا لالچ قرار دیا تھا۔ وہ امی کو منع کرنا چاہتی تھی کہ انہوں نے کراچی پھوپھو کو فون کر کے اس کی جاب اور ان کے گھر رہائش کے بارے میں بات کر لی۔

پھوپھو کی محبت اور خلوص پر تو اسے کوئی شک تھا ہی نہیں۔ بچپن ہی سے اس کے ذہن میں پھوپھو کا ایک بہت ہی ملنسار اور محبت کرنے والی خاتون کا امیج بنا ہوا تھا، حالانکہ ابو کی زندگی میں وہ پنڈی بہت کم آئی تھیں۔ اتنے برسوں میں شاید دو مرتبہ، لیکن فون وہ ان لوگوں کو باقاعدگی سے کیا کرتی تھیں۔ چاہے امی کو ان کا فون کرنا اچھا لگ رہا ہو یا نہیں۔ وہ فون پر ان لوگوں کی خیریت پوچھنا کبھی نہیں بھولتی تھیں۔

ابو کے انتقال کے بعد جب وہ پنڈی آئیں اور ان لوگوں کے پاس کافی دنوں تک رہیں تب اسے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اپنے تمام رشتہ داروں میں اسے پھوپھو ہی وہ واحد ہستی نظر آئی تھیں، جن کا چہرہ دکھ اور غم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ان کا رونا ایسا تھا جیسے انہوں نے کوئی بہت عزیز ہستی کھو دی ہو۔ ان دنوں میں اسے ان کے وجود کی نرمی اور محبت نے بہت متاثر کیا تھا۔ انہوں نے شکوہ شکایت کی کوئی پٹاری نہیں کھولی تھی۔ امی پر کوئی طنزیہ جملے نہیں کسے تھے، بلکہ اس مشکل وقت میں انہیں اپنی طرف سے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا تھا۔

ائیر پورٹ پر اسے لینے کے لیے عاصم بھائی آئے ہوئے تھے۔ وہ انہیں دور سے دیکھ کر ہی پہچان گئی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے ان سے کبھی ملی نہیں تھی۔ صرف ان کی تصویر ہی دیکھ رکھی تھی۔ وہ انہیں پہچانتے ہوئے آہستہ آہستہ کچھ ہچکچاتے ہوئے انداز میں ان کی طرف بڑھی، خود انہوں نے پتا نہیں اسے کیسے پہچانا تھا، جو بڑی تیزی سے اس سے پہلے ہی اس تک پہنچ گئے تھے۔

''السلام علیکم''۔ عجیب سی گھبراہٹ اور شرمندگی محسوس ہو رہی تھی، اسے ان کا سامنا کرتے ہوئے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے ان کی طرف دیکھا۔ کہیں ان کی آنکھوں میں طنز اور تمسخر تو نہیں؟

''اتنے امیر باپ کی بیٹی نوکری کے لیے شہر شہر ماری ماری پھر رہی ہے۔ بے چارے غریب رشتہ داروں کے ہاں رہائش اختیار کرنے والی ہے، جن سے کبھی اس نے ملنا پسند نہ کیا، ان کے گھر بن بلائی مہمان بننے والی ہے''۔

مگر ان کی آنکھوں میں وہ ان میں سے کوئی ایک جملہ بھی کھوج نہیں پائی تھی، بلکہ ایک پُر خلوص سی مُسکراہٹ جس نے ان کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا، وہ اسے نظر آئی تھی۔ اس کے سلام کا انہوں نے مُسکراتے ہوئے گرم جوشی سے جواب دیا اور پھر اسی خلوص اور اپنائیت کے ساتھ اسے لیے وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھے تھے۔

ان کی بالکل نئے ماڈل کی قیمتی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کے ذہن میں بجو کا کئی سال پہلے کا ایک جملہ گونجا تھا۔

''خالی ڈگریوں کو لے کر کیا میں نے چاٹنا ہے۔ بندے کے پاس ڈگریوں کا انبار ہو۔ گلے میں ڈھیر سارے گولڈ میڈلز بھی ہوں، مگر جیب خالی ہو۔ ایسی ڈگریوں اور ایسے میڈلز کو میں دور سے سلام کرتی ہوں۔ میں تو شادی اس سے کروں گی جس کے پاس اتنا پیسہ ہو کہ میرے سب شوق پورے کر سکے۔ مجھے اپنا دل نہ مارنا پڑے، جو عیش و آرام مجھے اپنے باپ کے گھر میں میسر ہیں، وہ مجھے وہاں بھی ملیں''۔

بجو کی کہی باتیں یاد آتے ہی ایک سرد آہ اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ بہت بے ساختگی میں اس نے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے عاصم بھائی کی طرف دیکھا۔ کتنے ہینڈسم اور ڈیسنٹ سے تھے وہ۔ جتنے ہینڈسم وہ اسے تصویروں میں لگے تھے، اس سے بھی بڑھ کر خوبرو تھے وہ۔ غیر شعوری طور وہ ان کا جلال بھائی کے ساتھ موازنہ کرنے لگی تھی۔ اسے امی، ابو کی چوائس پر ہمیشہ سے بھی بڑھ کر آج افسوس ہوا تھا۔ کرخت چہرے والے جلال بھائی جب اپنے نام کے معنی پورے کرتے ہوئے واقعی جلال میں آتے تو لمحہ بھر میں کسی کے بھی سامنے بجو کو بے عزت کر کے رکھ دیا کرتے تھے۔ ویسے بیوی بچوں کے ساتھ اچھی طرح، بڑی محبت سے رہتے تھے۔ بجو اور بچوں کی ہر شاپنگ دبئی، سنگاپور اور لندن سے ہوتی تھی۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں وہ لوگ یورپ میں گزارتے تھے۔ بجو سونے اور ڈائمنڈز سے لدی رہتی تھیں، لیکن یہ سب عیش و آسائش وہ ایک ہی منٹ میں برابر بھی کر دیا کرتے تھے۔ اپنے کرائے ہوئے عیش اور شاپنگز کے بجو کو بیچ محفل میں طعنے دے کر۔

''میں یوں گھماتا ہوں، یوں شاپنگ کراتا ہوں، اس قدر عیش کرواتا ہوں، تھی تمہاری اوقات اس سب کی؟ تمہارے باپ نے تو بس اتنی دولت کمائی تھی کہ ایک جھٹکے میں سب ختم ہو گیا''۔

وہ ابو، امی کی لاڈلی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینے والی لالہ رُخ ظفر جو شادی سے پہلے بہت نخریلی اور دوستوں کے حلقے میں بڑی مغرور مشہور تھی، پتا نہیں اپنے شوہر کے ہاتھوں یہ ذلت کس طرح سہتی تھی۔ خود دانیا کا جلال بھائی کا یہ انداز دیکھ کر ذلت اور غم و غصے سے بُرا حال ہو جاتا تھا۔

ایک بار اس نے بہت غصے کے عالم میں بجو کو ان کی بے حسی اور بے غیرتی کا احساس دِلانا چاہا تو وہ جواباً بڑی سنجیدگی سے سمجھانے والے انداز میں بولیں۔

''شوہر کے ساتھ گزارا کرنے کے لیے بیوی کو تھوڑا سا بے غیرت بننا ہی پڑتا ہے۔ اس رشتے میں انا کو لے آئیں تو یہ رشتہ نبھایا نہیں جا سکتا۔ اچھا یا بُرا جیسا بھی ہے، اب مجھے اسی شخص کے ساتھ گزارا کرنا ہے''۔ عجیب سا تھا ان کا فلسفہ۔ جس سے اس کو بہت اختلاف تھا۔

وہ یونہی گم صم سی بیٹھی بجو اور جلال بھائی کے بارے میں ہی سوچے چلے جا رہی تھی۔ تب ہی اچانک عاصم بھائی کی آواز پر چونکی تھی۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اپنے ذہن سے سب سوچوں کو جھٹکتے ہوئے، وہ ان کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ گاڑی بہت سے انجانے اور نئے نئے راستوں سے گزرتی ہوئی اس نہایت ہی عالی شان مکان کے خوب صورت سے پورچ میں جا کر رُکی تو وہ اس مکان کی خوب صورتی اور مکینوں کے ذوق کو سراہتی ہوئی گاڑی سے اُتر گئی۔ پھوپھو شاید اس کی آمد کے انتظار میں گیٹ کی طرف ہی دھیان لگائے بیٹھی تھیں، جو فوراً ہی داخلی دروازہ کھولتی، تیزی سے درمیانی راستہ عبور کرتے پورچ میں آئی تھیں۔

''آ گئی میری بیٹی''۔ ہمیشہ کی طرح ان کا انداز والہانہ اور محبت بھرا تھا۔ ان کے وجود میں سے وہی پیاری سی سانسوں کو معطر کر دینے والی خوشبو آ رہی تھی، جو ہمیشہ اسے مسحور کر دیا کرتی تھیں۔

وہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر آ گئیں۔

''ردا!'' انہوں نے بھابھی کو آواز دی، جو غالباً کچن میں تھیں۔ ان کی آواز سنتے ہی وہ فوراً لاؤنج میں آئیں۔

''کیسی ہو دانیا؟'' پھوپھو کے تعارف کروانے پر انہوں نے مُسکراتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نرم و نازک سے سراپے والی خوب صورت سی ردا عاصم کو اس نے بہت غور سے دیکھا۔

پھوپھو اسے گھر کے باقی افراد کی عدم موجودگی کی بابت بتا رہی تھیں۔

''ثمین ابھی کالج سے نہیں آئی۔ داؤد اور تمہارے انکل بھی شام میں گھر آئیں گے''۔

''آپ کو بھی میری وجہ سے اپنے آفس سے جلدی اُٹھنا پڑ گیا ہوگا''۔ اس نے اپنے بالکل سامنے صوفے پر بیٹھے ہوئے عاصم بھائی سے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ ایسے جیسے اپنی وجہ سے ان کا وقت ضائع کروا دینے پر نادم ہو رہی ہو۔

وہ ابھی اس کی اس پُرتکلف سی بات کے جواب میں کچھ بول بھی نہیں پائے تھے کہ بھاگتے دوڑتے دو بچے آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئے تھے۔ عاصم بھائی کی طرف جاتے جاتے وہ دونوں اسے دیکھ کر ٹھٹھک کر رُکے اور پھر فوراً ہی اس کے پاس آ گئے۔

''السلام علیکم۔ آپ دانیا پھوپھو ہیں نا''۔

لڑکی نے اس سے پوچھا تھا۔ اس نے مُسکراتے ہوئے سر ہلا دیا اور پھر اس کے سلام کا جواب دے کر بولی۔

''تم میرال ہو اور یہ شارم ہے''۔

''آپ کو ہم لوگوں کے نام کیسے پتا چلے؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔ وہ اس کی حیرت پر ہنس پڑی۔

''پھوپھو، عاصم بھائی اور بھابھی بھی اس گفتگو پر مُسکرا رہے تھے۔

''مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ تم دونوں کون سے اسکول میں اور کون سی کلاسز میں پڑھتے ہو''۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر ان دونوں کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

''بھئی اگر کھانا کھلا رہی ہو تو جلدی سے کھلا دو، ورنہ پھر میں چلوں''۔ عاصم بھائی نے بھابھی سے کہا تو وہ جلدی سے واپس کچن میں چلی گئیں۔

کھانے کے بعد وہ پھوپھو اور بھابھی کے ساتھ بیٹھ کر باتوں میں مصروف تھی کہ ''لو ثمین بھی آ گئی'' ثمین کو اندر آتا دیکھ کر بھابھی بولیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ پھوپھو، عاصم بھائی اور بھابھی کے برخلاف وہ اس کے ساتھ بڑے روکھے اور خشک سے انداز سے ملی۔ چہرے پر ہلکی سی خیر مقدمی مُسکراہٹ لانے کی بھی اس نے زحمت نہیں کی تھی۔

''بھابھی! بہت سخت بھوک لگ رہی ہے۔ جلدی سے یہ بتائیں کہ آج پکایا کیا ہے''۔ اس سے سلام دُعا کرتے ہی وہ بھابھی کی طرف گھومی۔

''تمہاری پسند کی ڈشز ہیں، فکر مت کرو۔ جاؤ فریش ہو کر آؤ۔ میں تب تک تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں''۔ بھابھی نے تسلی دینے والے انداز میں کہا تو وہ سر ہلاتی ہوئی فوراً کھڑی ہو گئی۔

پھوپھو اور ابو وہ دو ہی تو بہن بھائی تھے۔ کیسی بے غرض تھی پھوپھو کی محبت، جسے بھائی سے لاتعلقی اور بے گانگی کا کوئی شکوہ نہیں تھا۔ بہن کو زندگی بھر بھلائے رکھنے پر کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔ عصر کی اذانوں کے وقت ہی ان کی باتیں ختم ہوئی تھیں۔ نماز کے لیے اُٹھتے ہوئے انہوں نے اسے کچھ دیر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

''باتوں میں لگائے رکھا میں نے تمہیں، ایسا کرو، تھوڑی دیر سو جاؤ''۔ اسے نہ تو نیند آ رہی تھی اور نہ ہی یہ وقت اسے سونے کے لیے مناسب لگ رہا تھا۔ اس لیے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہیں اپنے بالکل فریش ہونے کا یقین دلایا تھا۔

مغرب کے بعد انکل اور پھوپھو دونوں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔

''بالکل اپنا گھر سمجھ کر رہنا یہاں۔ کسی قسم کا تکلف کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ انکل شاید اس کے تکلف کو محسوس کر گئے تھے، اسی لیے بڑی اپنائیت سے اس سے یہ بات کہی۔

اسی وقت لاؤنج کا دروازہ کھول کر گھر کا وہ آخری فرد اندر آیا تھا جس سے ابھی تک وہ ملی نہیں تھی۔

''بہت دیر لگا دی بیٹا''۔ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پھوپھو نے کہا تو وہ جواباً بڑی سنجیدگی کے ساتھ دیر ہو جانے کی وجہ بتانے لگا۔

وہ اندر آتے ہی اسے دیکھ چکا تھا، لیکن اس نے از خود اس کے ساتھ ہائے ہیلو کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ پھوپھو کے تعارف کروانے پر بہت رسمی اور ہلکی سی مُسکراہٹ صرف اتنی کہ اس میں کسی قسم کی گرم جوشی اور اپنائیت ظاہر نہ ہو، چہرے پر لاتے ہوئے اس نے دانیا سے سلام دعا کی..... اور پھر معذرت کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آفس میں پہلا دن ویسا ہی گزرا جیسا وہ توقع کر رہی تھی۔ کام کی نوعیت سمجھتے اور ساتھ کام کرنے والوں کا تعارف حاصل کرتے۔ جن کے انڈر میں اسے کام کرنا تھا۔ وہ بہت ہی اصول پسند، سخت مزاج اور پروفیشنلزم پر انتہائی حدوں تک یقین رکھنے والے انسان نظر آ رہے تھے۔ آفس کی طرف سے پک اینڈ ڈراپ کی کوئی سہولت نہیں تھی، لیکن اس کی بعض کولیگز نے اپنے طور پر آفس آنے جانے کے لیے وین لگوائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے لیے بھی اسی میں آنے جانے کا بندوبست کروا لیا تو بڑا سکون محسوس ہوا۔ کم از کم ایک پریشانی تو دور ہو گئی تھی۔

گھر واپسی پر پھوپھو کا اپنے لیے محبت بھرا پُرتشویش انداز اسے اجنبی فضاؤں میں اپنائیت کا بھرپور احساس دلا گیا تھا۔ وہ اس کی جاب

کے بارے میں، وہاں کے ماحول کے بارے میں، کولیگز کے رویے کے بارے میں، ایک ایک بات پوری تفصیل سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ ماں سے دور تھی مگر ماں کی طرح ہی اپنے لیے فکر مند ہونے اور محبت کرنے والی ایک ہستی اس کے پاس تھی۔

☆

آنے والے چند دن اس نے اس گھر کے ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے اور آفس میں کام سمجھنے میں گزار دیئے تھے۔ آفس جاب اس کے لیے نئی بات نہیں تھی، اس لیے تھوڑی سی کوشش کے بعد خود کو وہاں پر ایڈجسٹ کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ مگر حیرت تو اسے اس بات پر تھی کہ پھوپھو کے گھر میں جو وہ یہ سمجھتی تھی کہ وہ رہ ہی نہیں پائے گی تو اس کا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔

ان کے گھر کا ماحول اس کے گھر کے ماحول سے بالکل مختلف تھا، لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، اسے ان کے گھر کی ہر بات اچھی لگ رہی تھی۔ ان سب گھر والوں کی آپس میں ایک دوسرے سے محبت۔ پھوپھو کی اپنے شوہر اور بچوں سے محبت۔ وہ کسی این جی او اور کسی سوشل ورک کے غم میں مبتلا نہیں تھیں۔ اپنے گھر کی فکر چھوڑ کر وہ معاشرے کو سدھارنے کی فکر میں نہیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان بہن بھائیوں کی آپس میں محبت۔ عاصم بھائی کی اپنی بیوی اور بچوں سے محبت۔

وہ پیسہ کمانے کی دھن میں اس حد تک مگن نہیں ہو گئے تھے کہ اپنی فیملی کو نظر انداز کر دیتے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس گھر میں پیسے کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں، لیکن اسے اس حد تک اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے کہ رشتوں پر اسے ترجیح دے دیتے۔ اپنے گھر میں کب اس نے یہ ماحول دیکھا تھا۔ ساری زندگی ابو کو دولت بڑھانے اور آگے سے آگے بڑھنے کی فکر کرتے دیکھا تھا۔ وہ بزنس جو ابتدا میں انہوں نے بہت چھوٹے پیمانے پر شروع کیا تھا۔ آہستہ آہستہ اسے پھیلاتے چلے گئے تھے۔ اس معاملے میں امی، ابو میں زبردست ہم آہنگی تھی۔ وہ لوگ کوئی ہمیشہ سے ہی اس شان و شوکت سے نہیں رہ رہے تھے۔ اس کے پیچھے قسمت کے ساتھ ساتھ ابو کی یہ خوبی بھی تھی کہ وہ پیسہ کمانا جانتے تھے۔ لوگوں سے کونیکشنز کیسے بڑھانے ہیں، کن لوگوں سے ملنا فائدہ مند ہے اور کن لوگوں سے ملنا بے فائدہ اور یہی عادات امی کی بھی تھیں۔ جیسے جیسے ان کا اسٹیٹس اونچا ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنے تمام پرانے ملنے والوں اور دوستوں کو چھوڑتے چلے گئے۔ ان کے گھر میں آئے دن گیٹ ٹوگیدرز ہوا کرتی تھیں۔ بہانے بہانے سے گھر پر پارٹیز ارینج کی جاتی تھیں اور ان پارٹیز میں چُن چُن کر ان تمام کاروباری دوستوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ جن سے کسی بھی طرح کا فائدہ حاصل ہونے کی اُمید تھی۔ انہیں نئے زمانے کے ساتھ چلنے کے تمام انداز آتے تھے۔ ایمان داری اور اصولوں کو وہ کتابی باتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے۔ سوائے اپنے سگے بہن بھائیوں کے امی کسی کم حیثیت آدمی سے ملنا ہرگز پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان بہن بھائیوں نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی۔

لیکن اس پر پتا نہیں کیوں ان باتوں کا کبھی کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ دوستی کرتے وقت کبھی مقابل کے اسٹیٹس کی طرف دھیان نہیں دیتی تھی۔ حالانکہ بجو اس معاملے میں بالکل امی اور ابو کی جیسی سوچ رکھتی تھیں۔ امی اور بجو کو اس سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ پتا نہیں وہ کس پر پڑی تھی۔ اسے ملازمین کے ساتھ برابری کے درجے پر بات کرتا دیکھ کر امی کا بلڈ پریشر ہائی ہو جایا کرتا تھا۔ بجو اس کی غریب پروری کا مذاق اُڑایا کرتی تھیں۔

بعض دفعہ کئی کئی دن ہو جاتے ابو کو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے ہوئے۔ اسے یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کریں۔ ساتھ کھانا کھایا کریں۔ وہ کبھی ایسی کسی خواہش کا اظہار کرتی تھی تو امی جھٹ اسے ٹوک دیتیں۔

''بہت ضروری ڈنر میں شرکت کرنا ہے، تمہارے ابو کو۔ پتا ہے وہاں کون کون آیا ہوا ہوگا۔ اس قسم کے ڈنرز کو تو کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہیے''۔ ہنس کی چال چلنے کی کوشش کرتے وہ اپنا اصل ہی بھول گئیں تھیں۔ اپر کلاس کی بیگمات والے تمام شوق انہوں نے اختیار کر لیے تھے۔ کرسٹلز اور ڈائمنڈز کی باتیں، دبئی کے شاپنگ مالز کی باتیں، سوشل ورک اور مظلوم عورتوں کو ان کے حقوق دلوانے کی باتیں۔

پھوپھو ہمیشہ ان لوگوں سے فون پر رابطہ رکھا کرتی تھیں۔ کبھی ابو گھر پر ہوتے تو ان سے بات کر لیتے، ورنہ اگر کوئی اور فون اٹینڈ کر کے بعد میں انہیں میسج دیتا تو انہیں کبھی اس بات کے لیے وقت نہیں ملتا تھا کہ انہیں جوابی کال کر لیں۔

وہ شاید اس حد تک مادہ پرست ہو گئے تھے کہ سگی بہن سے ملتے ہوئے بھی ان کے ذہن میں یہ بات رہتی تھی کہ اس سے ملنے میں کیا فائدہ ہے۔ ایک کالج پروفیسر کی بیوی سے ملنے میں نہ امی کو کوئی فائدہ نظر آتا تھا نہ ابو کو، لیکن وہ بھائی سے یقیناً بہت محبت کرتی تھیں، جو کبھی ان کے رویے پر ناراض نہ ہوئی تھیں۔

اسی طرح ہر دوسرے تیسرے مہینے فون کر کے بھائی، بھاوج اور بچوں کی خیریت معلوم کیا کرتی تھیں۔ امی نے انہیں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی مگر ایک روز جب وہ اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر کنگلے بیٹے کا رشتہ ان سے مانگ لینے کی جسارت کر بیٹھیں تو امی تو امی خود بجو بھی سخت طیش میں آ گئیں۔ پھوپھو نے فون پر ابو سے رشتے کی بات کی تھی۔

''یہ اچھا شارٹ کٹ نکالا ہے۔ سوچا ہوگا ماموں اتنا مال دار ہے، میرے بیٹے کی تو زندگی بن جائے گی۔ خود کے میاں میں تو کوئی گٹس تھے نہیں۔ ساری زندگی حلال حرام کرتے، پروفیسری کرتے گزار دی۔ اب بھائی سے محبت کا ڈرامہ رچا کر بیٹے کا مستقبل سنوارنے کی تدبیر کی جا رہی ہے''۔

امی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ پھوپھو کو ایسی ایسی سنائیں کہ ان کی طبیعت صاف ہو جائے۔ ان کی جرأت کیسے ہوئی ان کی نازوں پلی حسین بیٹی کا اپنے بیٹے کے ساتھ نام بھی لینے کی۔ وہ عاصم بھائی کے کیریر کی شروعات تھی۔ انہوں نے نئی نئی جاب شروع کی تھی، اگرچہ یہ بات کسی اندھے کو بھی نظر آ سکتی تھی کہ ان کے کیریئر کا آغاز ہی بہت شان دار ہے۔ آگے ترقی اور کامیابی کے واضح امکانات تھے، مگر غرور اور گھمنڈ کی جو پٹی امی کی آنکھوں پر بندھی تھی، اس نے انہیں یہ بات دیکھنے ہی نہیں دی تھی کہ وہ خود اپنے ہاتھوں ایک ہیرے کو ٹھکرا رہی ہیں۔

پھوپھو کو انکار کر کے امی ابو نے جلال بھائی کا رشتہ قبول کر لیا تھا، وہاں رشتہ طے کرنے میں فائدے ہی فائدے تھے۔ اپنے سے بھی اونچے خاندان میں بیٹی بیاہ کر انہوں نے اپنی عقل مندی اور بیٹی کی خوش قسمتی پر ناز کیا تھا۔ رشتے سے انکار ہونے پر پھوپھو کو یقیناً دکھ تو ہوا ہوگا، لیکن انہوں نے پھر بھی بھائی سے قطع تعلق نہیں کیا تھا، لیکن اب امی ان سے پہلے سے بھی زیادہ چڑنے لگی تھیں۔ انہیں ایسا لگتا تھا کہ وہ بھائی کی دولت پر نظریں لگائے بیٹھی ہیں اور یہ محبت صرف ڈھکوسلہ ہے۔

ابو جو یہ سمجھتے تھے کہ یہ تمام دولت انہوں نے اپنی ذہانت اور عقل مندی سے کمائی ہے۔ اب اپنی تمام تر ذہانت اور عقل مندی کے باوجود وہ

ساتھ بیٹھنا اسے کچھ بھی پسند نہیں ہے۔ چند ابتدائی کوششوں کے بعد وہ خود بھی پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اسے ثمین کے رویے پر دُکھ ہوتا تھا، وہ اسے اس رویے کے لیے حق بجانب بھی سمجھتی تھی۔

پھوپھو کے اپنے سسرالی رشتہ داروں سے مثالی تعلقات تھے۔ ان کی نندیں، دیور سب ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ ہر کام کرنے سے پہلے ان سے مشورہ کرنا پسند کرتے تھے۔ ان کی رائے اور ان کا مشورہ سب کے لیے بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ بھابھی خود پھوپھو کی نند کی بیٹی تھیں اور شادی کے اتنے برسوں بعد، رشتے کے نوعیت تبدیل ہو جانے کے باوجود بھی بھابھی کے میکے والوں سے پھوپھو کے تعلقات اتنے ہی اچھے تھے، جتنا اس رشتہ سے پہلے تھے۔ کسی کے گھر میں کوئی مسئلہ، کوئی پریشانی ہوتی تو وہ پھوپھو کے پاس یوں دوڑتا ہوا آتا جیسے کوئی بچہ پریشانی میں ماں کو تلاش کرتا ہوا آتا ہے۔ ان سب کزنز کی بھی آپس میں بہت اچھی دوستی تھی۔

ثمین جس کے چہرے پر اس کے لیے ہلکی سی دوستانہ مُسکراہٹ بھی نہیں آتی تھی۔ اپنی کزنز کے ساتھ بلند بانگ قہقہے لگاتی تھی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پھوپھو کے دیور کا گھر ان سے اگلے ہی بلاک میں تھا۔ ان لوگوں کا ایک دوسرے کے گھر بہت زیادہ آنا جانا تھا۔ اس روز ثمین اپنی دونوں کزنز کے ساتھ لان میں بیٹھی باتیں کرتی ہوئی سموسوں اور چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ چھٹی کا دِن تھا۔ بالکل فارغ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتی وہ بے تحاشا بور ہو رہی تھی۔ گلاس ڈور سے اس پار لان میں باتیں کرتی وہ لوگ اسے صاف نظر آ رہی تھیں۔ زندہ دلی سے ہنستی، قہقہے لگاتی اس نے یونہی اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر ان لوگوں کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اسے ان خوش باش ہنستی کھلکھلاتی لڑکیوں کو دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔

اس کا بھی جی چاہا کہ وہ ان کے ساتھ بیٹھے مگر یہ صرف لمحہ بھر کی سوچ تھی۔ ثمین کا اجنبی سا انداز ذہن میں آیا تو اس نے فوراً سر جھٹک کر نظریں دوبارہ ٹی وی کی طرف کر لی تھیں۔ ''کیا بات ہے دانیا! تم اکیلی کیوں بیٹھی ہو''۔ عاصم بھائی، بھابھی اور بچے کہیں باہر سے گھوم پھر کر واپس آئے تھے۔ چلتے وقت اخلاقاً انہوں نے اس سے بھی چلنے کو کہا تھا، مگر اس نے تھکن کا بہانہ بنا کر معذرت کر لی تھی۔

''ہاں۔ باہر وہ ثمین، ندا اور سحر بیٹھی ہیں۔ تم ان کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھیں۔ اکیلے بور نہیں ہو رہیں''۔ بھابھی نے بھی محبت سے اس سے کہا۔

''اصل میں یہ پروگرام بڑا زبردست آ رہا ہے۔ اسے انجوائے کرتے ہوئے مجھے بور ہونے کا وقت ہی نہیں ملا''۔

اس سے یہ بات کہی نہیں جا سکی تھی کہ ثمین نے اسے باہر بلایا ہی نہیں تھا، لیکن عاصم بھائی نے بڑی سنجیدگی سے اس کی بات سنی۔ بہت غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے، وہ شاید کوئی بات اخذ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نظروں سے کنفیوژ ہو کر وہ انہیں اس ٹی وی پروگرام کے بارے میں بتانے لگی تھی۔

وہ رات کو اپنے اگلے دن پہننے والے کپڑے استری کر کے واپس لاؤنج میں آئی تو پھوپھو ثمین کو ڈانٹ رہی تھیں۔ عاصم بھائی اور داؤد بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

''آپ محبت نچھاور کریں اپنی لاڈلی بھتیجی پر۔ میں ایسے رشتے داروں کو دور سے سلام کرتی ہوں''۔

پتا نہیں اس سے پہلے پھوپھو نے اس سے کیا کہا تھا، جس کے جواب میں اس نے بہت چڑچڑے انداز میں کہا۔

اسے ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ جس کام میں اپنی طرف سے خوب سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالتے، اسی میں انہیں بھاری نقصان ہوتا۔ وہ بہت پریشان اور اُلجھے ہوئے رہنے لگے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہیں کوئی ڈوری اُلجھ گئی ہے۔ تقدیر کی مہربان پری ان سے روٹھ گئی تھی جو لوگ ان سے تعلقات بڑھانے اور کاروباری معاملات طے کرنے میں فخر محسوس کیا کرتے تھے، آہستہ آہستہ ان سے کھنچنے لگے تھے۔ دوستوں کا رویہ تبدیل ہونے لگا تھا۔

اپنے آفس ہی میں انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اتنا شدید کہ وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ اس روز بھی انہوں نے اپنے نقصان کی خبر سنی تھی۔ ان کا پہلے ہی سے پریشان اور فکروں میں ڈوبا دل اس خبر کو برداشت نہیں کر پایا تھا۔ خود کو اس مالی بحران سے نکالنے اور کاروبار کو سنبھالا دینے کے لیے انہوں نے مختلف جگہوں سے مختلف شکلوں میں بے تحاشا قرض لے رکھا تھا۔ ان کی زندگی میں تو وہ لوگ اس بات سے آگاہ نہیں تھے مگر ان کے مرنے کے بعد جب یہ ہولناک خبر ان لوگوں کو ملی تو ابو کا غم بھول کر وہ لوگ اس فکر میں مبتلا ہو گئے کہ اب ہوگا کیا۔

ان کی سب پراپرٹی، سارا بینک بیلنس سب ختم ہو گیا تھا۔ وہ بہت ساری جائیداد جو اتنے سالوں میں انہوں نے بڑی محبت سے بنائی تھی، سب فروخت کرنی پڑ گئی تھی۔ صرف وہ گھر جس میں وہ لوگ رہتے تھے، بکنے سے رہ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا، اب ان لوگوں کو زندگی نئے سرے سے شروع کرنی پڑے گی۔

وہ ان دنوں اپنے آخری سمسٹر میں مصروف تھی۔ امی کی ساری سوشل ایکٹویٹیز، فنکشنز، لوگوں سے میل جول، سب ختم ہو گیا تھا۔ وہ سارا سارا دن کمرے میں چپ چاپ پڑی رہتی تھیں۔ عادل اور شہود بھی اُداس اُداس اور خاموش رہنے لگے تھے۔ جلال بھائی کا رویہ تو ابو کی زندگی ہی میں بہت بدل گیا تھا۔ وہ بھی ابو اور امی کی طرح رشتہ داری میں بھی فائدہ نقصان ذہن میں رکھا کرتے تھے۔ اب سسرال سے کوئی فائدہ ملنے کی اُمید نہیں تھی، اس لیے وہ ان لوگوں کے ہاں زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتے تھے۔

امتحانوں سے فارغ ہوتے ہی اسے جاب مل گئی تھی، جتنی اس کی سیلری تھی، اتنے پیسوں کی ابو کی زندگی میں وہ ڈھنگ کی شاپنگ تک نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے مہینے جب اپنی بے حد معمولی مگر بڑی محنت سے کمائی ہوئی تنخواہ اس کے ہاتھ میں آئی تو خوشی کے ساتھ ساتھ اسے ایک عجیب سا احساس بھی ہوا۔ اتنے پیسے تو امی بڑے آرام سے بیوٹی پالر میں خرچ کر آیا کرتی تھیں۔ جتنے پیسوں میں آج ان کی بیٹی کو نوکری ملی تھی۔ آخر وہ بھی تو اسی گھر اور اسی ماحول کا حصہ تھی۔ اس نے بھی تو یہیں پرورش پائی تھی، پھر آخر اسے ہی صرف ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ یہ ان لوگوں کے بڑے بولوں کی سزا ہے۔ امی کی اپنے سے کم تر کو حقیر سمجھنے کی سزا ہے۔

☆

اسے پھوپھو کے گھر رہتے ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ ثمین کے علاوہ یہاں سب کا رویہ اس کے ساتھ اچھا تھا۔ داؤد گو اس کے ساتھ بہت زیادہ گفتگو نہیں کرتا تھا۔ اکثر کھانے کی میز یا آتے جاتے اس پر نظر پڑنے پر سلام دعا کر کے ''کیسی ہو؟''، ''جاب کیسی چل رہی ہے؟'' جیسے رسمی جملے بول دیا کرتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے آپ کسی مہمان کے ساتھ رسمی طور پر اخلاق برتتے ہیں۔

اس سے براہِ راست کچھ کہے بغیر بھی ثمین نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ اس سے سخت نفرت کرتی ہے اور اس سے بات کرنا، اس کے

''جو بھی ہے، وہ ہمارے گھر مہمان ہے۔ میں کئی دنوں سے تمہیں اس حوالے سے ٹوکنا چاہ رہا تھا۔ آج وہ جس طرح اکیلی بیٹھی ہوئی تھی، مجھے بہت بُرا لگا''۔ عاصم بھائی نے بہن کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

''ہماری امی ہی کافی تھیں، سارے جگ پر محبتیں نچھاور کرنے کے لیے۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے بھیا! زہر لگتی ہے مجھے ماموں کی ساری فیملی۔ اپنا مطلب پڑا تو رشتہ داری یاد آ گئی، ورنہ کبھی پلٹ کر بہن کو پوچھا تک نہیں تھا۔ یہ بھی تو ممانی ہی کی بیٹی ہے۔ اپنی اماں اور بہن صاحبہ سے کیا مختلف ہو گی''۔

ثمین نے بڑی خفگی سے ان کی بات کا جواب دیا۔ وہ چپ چاپ آ کر سونے لیٹ گئی تھی۔

اسے ثمین کی اپنے لیے نفرت بہت بُری اور تکلیف دہ لگی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ میں ایسی نہیں ہوں جیسا تم سمجھ رہی ہو، لیکن اسے یہ بات بتا نہیں سکتی تھی۔

☆

صبح وہ معمول کے انداز میں ہی جلدی جلدی تیار ہو کر بھابھی کے پاس کچن میں آ گئی۔

''مجھے بتائیں، کیا کام رہ گیا ہے۔'' اس نے کچن میں آتے ہی بھابھی کو مخاطب کیا۔ جو شارم کو دودھ پینے کے لیے بڑی مشکلوں سے راضی کر رہی تھیں۔ شارم اور میرال دونوں کچن ٹیبل پر ہی بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ بھابھی نے بڑے تشکرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

''شکر ہے تم آ گئیں۔ داؤد کو آفس سے دیر ہو رہی ہے۔ ذرا جلدی سے یہ آملیٹ فرائی کر کے اسے دے آؤ''۔ وہ سر ہلاتی ہوئی کوکنگ رینج کی طرف مڑی تھی۔ چولہے پر فرائنگ پین رکھ کر اس نے جلدی جلدی آملیٹ تیار کیا تھا۔ بڑی احتیاط کے باوجود بھی اس سے اس شکل صورت کا آملیٹ نہیں بن سکا تھا، جیسا بھابھی بناتی تھیں۔ وہ اس کی شکل وصورت پر غور کرتی پلیٹ اُٹھا کر ڈائننگ روم میں آئی۔

اخبار پڑھتے داؤد کے سامنے اس نے پلیٹ رکھی تو بھابھی کے بجائے اسے اپنی خدمت کرتا دیکھ کر وہ ایک پل کے لیے چونکا۔ وہ پلیٹ رکھتے ہی فوراً واپس پلٹ گئی۔ کچن کے دروازے پر رُکی، وہ داؤد کو آملیٹ کی طرف حیرت سے دیکھتا دیکھ رہی تھی۔ روزانہ سے مختلف شکل والا یہ آملیٹ اسے یقیناً حیران کر رہا تھا، لیکن بس اس نے ایک لمحہ ہی کے لیے اسے حیرت سے دیکھا تھا، پھر اس کے بعد وہ کھانے میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆

ثمین نے اس کے ساتھ اپنے رویے میں قدرے تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ بہت پُرتکلف انداز میں وہ اس کے ساتھ تھوڑی بہت بات چیت کرنے لگی تھی مگر اس کے چہرے پر بیزاری اور جھنجھلاہٹ صاف نظر آیا کرتی تھی۔ اس روز وہ آفس سے واپس آئی تو ثمین کو کچن میں دل و جان سے مصروف دیکھ کر چونک گئی۔ کچن میں نظر آتا پھیلاوا اور ثمین کی مصروفیت یہ ظاہر کر رہے تھے کہ شاید گھر میں کوئی دعوت ہے۔

''بہت شاندار دعوتی اہتمام ہو رہا ہے''۔ وہ کپڑے بدل کر پھوپھو کے پاس ہی آ کر لاؤنج میں بیٹھ گئی۔

''بس یہ ان بچوں کے شوق ہیں۔ آج کالج بھی نہیں گئی، ثمین، صبح سے کچن میں لگی ہے۔ میرے اور ردا کے کچن میں داخلے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ پتا نہیں شمیم کو ساتھ لگائے کیا پکا رہی ہے''۔ انہوں نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''آپ نے اب تک کپڑے بھی نہیں بدلے''۔ ثمین کچن سے نکل کر لاؤنج میں آئی تھی۔

''ارے ہٹاؤ بھی۔ اب اس عمر میں کوئی یہ چونچلے اچھے لگتے ہیں۔ سالگرہ بچوں کی منائی جاتی ہے یا بڈھوں کی۔ ٹھیک ہیں یہی کپڑے''۔ انہوں نے بیٹی کی فرمائش کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ جو بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سالگرہ کے ذکر پر خود ہی بات سمجھ گئی۔

''پلیز امی! میں نے کپڑے استری کر کے آپ کے کمرے میں رکھے ہوئے ہیں۔ ہم لوگوں کی خاطر ہی تیار ہو جائیں۔'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولی۔

ابھی ان دونوں کے درمیان یہ بحث ہو ہی رہی تھی کہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر داؤد اندر آیا۔ بہت سے شاپنگ بیگز ہاتھوں میں پکڑے، خوب لدا پھندا۔

''سنبھالو انہیں''۔ اس نے ثمین کو سارے تھیلے پکڑائے تھے۔ وہ کھڑے کھڑے ہی تمام تھیلے چیک کرنے لگی۔

''شکر ہے آپ کیک لے آئے داؤد بھائی! میں یہی سوچ رہی تھی کہ آج تو میں نے بھی کیک بیک نہیں کیا۔ اگر آپ کیک لانا بھول گئے تو مزہ آجائے گا''۔ ثمین نے گویا اطمینان کا سانس لیا تھا۔

''کیک لانا تو میں بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ بڑی یاد سے صبح ہی آرڈر کرتا ہوا گیا تھا۔ پچھلی بار جو تم نے شان دار قسم کا کیک بنایا تھا، اسے کاٹنے کے لیے سب آری ڈھونڈ رہے تھے، اس کے بعد تو میں کسی بھی طرح کا رسک لے ہی نہیں سکتا تھا''۔

وہ ثمین کو چڑاتا ہوا پھوپھو کے برابر ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ موبائل ایک طرف ڈالتے ہوئے اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی تھی۔ ''یہ سب بعد میں دیکھ لینا۔ پہلے مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلاؤ۔ آفس سے تھکا ہارا بازاروں میں خوار ہوتا ہوا آرہا ہوں''۔

اس نے سامان کا جائزہ لیتی ثمین کو ٹوکا تو وہ سب چیزیں ہاتھوں میں اُٹھائے واپس کچن میں چلی گئی۔ اور بہت خاموشی سے داؤد کو پانی لا کر دیا۔ اسی دوران سیڑھیاں اترتی بھابھی بھی اسے نظر آگئیں۔ بہت خوب صورت بلیک کلر کی ساڑھی پہنے وہ خوب سجی سنوری اور پیاری لگ رہی تھیں۔

''کیا مزے دار اور دلچسپ اتفاق ہے کہ ہم لوگوں کی ویڈنگ اینورسری ایک ہی دن ہوتی ہے''۔

''سوئیٹ بھابھی جان! یہ اتنا زیادہ اتفاقیہ واقعہ بھی نہیں ہے۔ آپ لوگوں کی شادی کی وہی ڈیٹ رکھنے میں جوامی، پاپا کی بھی شادی کی تاریخ تھی۔ میرے خیال سے پاپا کی اس سوچ کا زیادہ دخل تھا کہ میرے بیٹے کی شادی شدہ زندگی بھی اتنی ہی اچھی اور کامیاب گزرے جتنی میری گزری''۔

داؤد نے بھابھی کی بات کا جواب بڑے شرارتی سے انداز میں دیا۔ آپس میں بات چیت کرتے ہوئے وہ لوگ عاصم بھائی کا انتظار کر رہے تھے، جن کے آفس سے آنے پر سالگرہ منائی جانی تھی۔ اسے ثمین پر شدید قسم کا غصہ آرہا تھا۔ لاکھ وہ اسے ناپسند کرتی ہے، مگر اسے کم از کم یہ بات تو دنیا کو بتا دینی چاہیے تھی کہ آج پھوپھو اور انکل اور عاصم بھائی اور بھابھی کی شادی کی سالگرہ ہے۔ وہ ان کے گھر کی فرد نہیں، مگر فی الحال تو وہ ان ہی کے گھر میں رہ رہی ہے۔ اسے بے تحاشا انسلٹ کا احساس ہوا تھا۔

اسے ایسا لگا وہ ان سب سے الگ ہے۔ وہ بالکل پرائی اور غیر۔ اس کا دل چاہا وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے۔ اپنی یہاں موجودگی اسے بڑی بے معنی اور فضول لگ رہی تھی۔

''ہر سال یہ لوگ اس طرح امی پاپا کو اور مجھے اور عاصم کو سرپرائز دیتے ہیں۔ ایک ایسا سرپرائز جو اتنا زیادہ سرپرائز بھی نہیں ہوتا۔ پتا ہوتا ہے ہمیں کہ کچھ نہ کچھ خفیہ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کھانے کے لیے مینو سوچا جا رہا ہے۔ چھپ چھپ کر تحفے خریدے اور پیک کیے جا رہے ہیں''۔ بھابھی مُسکراتے ہوئے اس کے برابر میں بیٹھ گئیں۔ اس کا ان کی بات کے جواب میں کچھ بھی بولنے کا دل نہیں چاہا۔ وہ رسمی سے انداز میں مسکرائی تک نہیں۔

بھابھی نے اس کی خاموشی پر کچھ چونک کر بغور اس کی طرف دیکھا۔ انہیں ایک دم احساس ہوا تھا کہ وہ بہت زیادہ چپ بیٹھی ہوئی ہے۔

''تمہیں کیا ثمین نے بتایا نہیں تھا؟'' انہوں نے آہستگی سے پوچھا

سامنے بیٹھی پھوپھو جو اس سالگرہ کے سارے اہتمام کو ایک بچکانہ بات سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہی تھیں۔ وہ بھی بے ساختہ بھتیجی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ثمین پر بہت زیادہ غصے کے باوجود وہ اس وقت اپنی وجہ سے وہاں کا ماحول خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھوپھو اور باقی تمام افراد اس بات پر یقیناً ثمین کو بہت کچھ کہتے۔ خوشی کی تقریب میں اس کی وجہ سے ٹینشن اور بدمزگی پیدا ہو، یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ اس نے بہت خوش خوش لاؤنج میں آئی اور اپنے بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھی ثمین کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر جواباً بولی۔

''اس وقت بیٹھی میں اسی بات کا تو افسوس کر رہی ہوں۔ پتا نہیں میری یادداشت اتنی خراب کیوں ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے اب مجھے نہار منہ بادام کھانے شروع کر دینے چاہئیں۔ ابھی گھر واپس آ کر سارا اہتمام دیکھ کر بھی مجھے یاد نہیں آیا کہ آج کیا دن ہے

حالانکہ پچھلے ہفتہ ثمین نے مجھے بتایا تھا کہ 16th کو آپ لوگوں کی شادی کی سالگرہ ہے اور شرمندہ ہو رہی ہوں کہ آفس سے جلدی آ جاتی کچھ ثمین کی ہیلپ ہی کرا دیتی۔ بے چاری اکیلی کاموں میں لگی رہی''۔

ثمین کا چہرہ جو اس کے جواب سے پہلے بالکل فق ہو گیا تھا، ایک دم نارمل ہو گیا۔ اس نے اتنے مضبوط لہجے میں جھوٹ بولا تھا کہ اس پر جھوٹے ہونے کا گمان تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہاتھ ملتی وہ بہت ہی متاسفانہ انداز میں اپنی یادداشت کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔

''چھوڑ بھی یہ کون سی ایسی خاص تقریب ہے، جس کے یاد نہ رکھے جانے پر افسوس ہو۔ میں تو ان لوگوں سے کہتی ہوں کہ بس عاصم اور ردا کی شادی کی سالگرہ منائی جانی کافی ہے۔ یہ لوگ بلاوجہ ہم بڑھیا بڈھے کو بھی گھسیٹ لیتے ہیں''۔ پھوپھو سے بھتیجی کا افسوس زیادہ دیر تک برداشت نہیں ہوا۔ ثمین اس سے نظریں چرائے بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

داؤد جو بڑی دیر سے لاپروائی سے بیٹھا شارم سے باتیں کر رہا تھا۔ اپنی گفتگو موقوف کر کے اس نے بہت غور سے اسے اور پھر ثمین کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی ایک نظر کے بعد کسی بھی طرح ردِعمل ظاہر کیے بغیر وہ دوبارہ شارم کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اسے گدگدا کر ہنساتا، وہ بھتیجے کے ساتھ مگن تھا جبکہ بھابھی، پھوپھو کے اس دن کی مخالفت میں دیے جانے والے کمنٹس سے اختلاف کر رہی تھیں۔

''آخر حرج کیا ہے امی اس بات میں۔ ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں تو زندگی کا حُسن ہے۔ بڑی خوشیاں تو زندگی میں بہت کم کم اور بہت

دنوں میں آتی ہیں۔ کیا یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ جن لوگوں کے ساتھ آپ زندگی گزار رہے ہیں وہ وقتاً فوقتاً آپ کو اپنی محبت کا احساس دِلاتے رہیں۔ یہ بتاتے رہیں کہ آپ کا وجود ان کے لیے بہت اہم ہے۔'' پھوپھو، بھابھی کی بات پر تائیدی انداز میں مُسکرا دیں۔ یوں جیسے ان کی بات سے سو فیصد متفق ہوگئی ہوں۔

عاصم بھائی کو آتا دیکھ کر ثمین جلدی سے سجی ہوئی ڈائننگ ٹیبل کو فائنل ٹچز دینے کے لیے اُٹھی تھی۔ کچھ دیر پہلے کیونکہ وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کر چکی تھی کہ اس نے ثمین کی اس سارے اہتمام میں کوئی مدد نہیں کروائی، اسی لیے اپنی بات نبھانے کے لیے خود بھی اُٹھ کر اس کے پاس ڈائننگ روم میں آ گئی تھی۔ ثمین بہت شرمندہ سی نظر آ رہی تھی، وہ بغیر کچھ جتائے اس کی مدد کروانے لگی تھی۔

سب کے ساتھ مل کر اس گھریلو سی تقریب میں شرکت کرتی وہ خود کو اس ماحول کا حصہ ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی، ورنہ درحقیقت اس کا دل یہاں سے بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا۔

آئی ایم سوری دانیا! مجھے آپ کو یہ بات بتا دینی چاہیے تھے''۔ وہ سونے کے لیے لیٹ ہی رہی تھی، جب ثمین اس کے کمرے میں آئی۔

وہ آج کی بات پر ثمین سے بہت بُری طرح متنفر ہوگئی تھی۔ اسے اس لڑکی پر بے پناہ غصہ تھا، لیکن اس وقت جس طرح وہ شرمندگی سے سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر اسے بے ساختہ اس بات کا احساس ہوا کہ بظاہر بدتمیز اور بداخلاق نظر آنے والی یہ لڑکی اصل میں ایسی نہیں۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی، اپنے رویے پر شرمندگی تھی، اس کے بڑے پن کا اعتراف تھا۔

''آپ نے میری بدتمیزی کو اتنے بڑے پن سے نبھایا۔ سب کے سامنے جھوٹ بول کر میری بداخلاقی پر پردہ ڈالا۔ اگر امی اور پاپا کو اصل بات پتا چل جاتی تو وہ مجھ پر بہت ناراض ہوتے۔ سب کا موڈ خراب ہوتا اور تقریب کا سارا مزہ ہی ختم ہو جاتا''۔ وہ بیڈ پر اس کے پاس ہی آ کر بیٹھ گئی۔ سر جھکائے وہ اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

''چلو کوئی بات نہیں، میں نے تمہیں معاف کیا۔ تم بھی کیا یاد کرو گی، لیکن اب میں اتنی اچھی بھی نہیں ہوں۔ تھوڑی بہت پینلٹی تو تمہیں دینی ہی پڑے گی۔ اکیلے شاپنگ کرنے کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ اب کل تم ہی مجھے بازار لے کر چلو گی تاکہ میں پھوپھو اور انکل اور عاصم بھائی اور بھابھی کے لیے گفٹس خرید سکوں۔ کل میرا ہاف ڈے ہوگا۔ تم لنچ کے بعد تیار رہنا۔ کھانا کھاتے ہی ہم بازار چلیں گے''۔ ثمین نے بڑی بہنوں والے اس کے انداز پر بڑے متعجب سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے نا''۔ اس کی طرف دیکھتے اس نے تصدیق چاہی تو ثمین نے گردن ہلا دی۔

''آپ بہت اچھی ہے دانیا! میں آپ کو بالکل غلط سمجھتی تھی''۔

''ہم اکثر لوگوں کو غلط ہی سمجھتے ہیں۔ دراصل لوگوں کو سمجھنا ہے ہی بہت مشکل کام۔ اتنا مشکل کہ میرا خیال ہے اس سبجیکٹ میں بھی یونیورسٹیز میں کوئی ڈگری پروگرام شروع ہونا چاہیے''۔ وہ بے تکلفی سے کہتے ہوئے مُسکرائی۔ ثمین بھی اتنی دیر میں پہلی مرتبہ مُسکرائی۔

''ویسے چھوٹا بننے والے کوئی مسئلے مجھے لاحق نہیں ہیں۔ تم چاہو تو بڑی خوشی سے مجھے آپی، باجی جو چاہے کہہ سکتی ہو۔ میں ہرگز برا نہیں

مانوں گی''۔

وہ شرارتی سے انداز میں مُسکرائی۔ثمین اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اکثر لوگ برا مان جاتے ہیں ناں۔اس لیے میں تو کوشش کرتی ہوں کہ اپنے سے بڑی کسی خاتون کو آنٹی، باجی کہے بغیر صرف آپ جناب سے ہی کام چلالوں''۔وہ بے تکلفانہ انداز میں اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔

☆

عاصم بھائی، بھابھی اور بچے گھومنے کے لیے ہانگ کانگ اور بنکاک گئے ہوئے تھے۔ان لوگوں کے جانے کے بعد گھر میں بہت خاموشی اور اُداسی سی محسوس ہو رہی تھی اسے۔بچوں کے ہونے سے گھر میں خوب شور شرابا اور ہنگامہ رہا کرتا تھا۔اب ان کے بغیر بڑی خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔

''بھیا لوگوں کے جانے سے بڑی بوریت ہو رہی ہے ناں''۔رات کے کھانے کے بعد وہ اور ثمین لان میں واک کرتے ہوئے باتیں کر رہی تھیں۔اس نے گردن ہلا کر اس کی بات کی تائید کی۔

''چلو یار سونا نہیں ہے''۔ثمین کا اندر جانے کا موڈ نہ دیکھ کر اس نے خود ہی اسے ٹوکا۔وہ اس کے جمائی لینے اور اندر جانے کی بات پر چڑ گئی تھی۔

''آج تو ویک اینڈ ہے۔آج بھی آپ جلدی سوئیں گی''۔وہ اس کے جلدی سونے کی عادت پر ناراض نظر آ رہی تھی۔

''سونے کو تھوڑی کہہ رہی ہوں۔اندر چلتے ہیں۔کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھیں گے اور ساتھ باتیں کریں گے''۔وہ اس کی ناراضی کے خیال سے سونے کا خیال ملتوی کر گئی اور ثمین کے ساتھ اس کے کمرے ہی میں آ گئی۔ثمین کا غالباً خوب دیر تک جاگنے کا موڈ تھا، اسی لیے بڑے اہتمام سے کافی بنا کر اور پلیٹ میں ڈھیر سارے چپس رکھ کر کمرے میں آ گئی۔دھڑا دھڑ چپس کھاتی وہ دونوں مختلف چینلز بدل بدل کر کبھی کوئی پروگرام دیکھنے لگیں تو کبھی کوئی۔

''یہ فلم اچھی لگ رہی ہے''۔کوئی انگلش مووی تھی۔اسکرین پر نظر آتا ہینڈسم سا بندہ دیکھ کر ہی ثمین نے فلم کے اچھا ہونے کی پیشن گوئی کر دی تھی۔

''فلم اچھی نہیں ہے۔یہ کہو تمہیں ہیرو اچھا لگ رہا ہے''۔دانیا نے اسے چھیڑا۔

''یہ تو مجھے کوئی ہارر مووی لگ رہی ہے۔چینل چینج کرو ثمین''۔رات کا وقت، سنسان جنگل اور وہاں ایک اکیلی خوف زدہ لڑکی اسے اگلے سین میں نظر آئی تو بے ساختہ ثمین کو چینل تبدیل کرنے کے لیے کہا تھا۔

''نہیں۔ہارر تو نہیں لگ رہی۔میرا خیال ہے کچھ Detective اور سسپنس ٹائپ کی مووی ہے''۔ثمین کی ساری دلچسپی اس سین میں تھی۔

وہ تنہا لڑکی درختوں اور جھاڑیوں میں اُلجھتی پتا نہیں کس چیز سے بھاگ رہی تھی۔تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک آدمی کے صرف پیر بھی دکھائے جا رہے تھے۔لانگ شوز پہنا، وہ آدمی جیسے اس لڑکی کا تعاقب کر رہا تھا۔صرف ہلکی سی پیروں کی جھلک۔اس کے پیروں تلے آ کر پتوں کی چڑ چڑاہٹ تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ثمین کوٹوکنے کے باوجود وہ خود بھی اسکرین ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ڈر تو لگ رہا تھا، مگر

ایک تجسس سا بھی محسوس ہو رہا تھا۔ آگے کیا ہوگا۔ ہوتے ہوتے وہ آدمی اس لڑکی کے بالکل نزدیک پہنچ گیا تھا۔ اس ویران سے جنگل میں اندھا دھند بھاگتے اس لڑکی کو ایک پرانا کھنڈر نما مکان نظر آیا تو وہ خود کو بچانے کے لیے اس میں گھس گئی۔ بہت بڑا حویلی نما مکان۔ وہ مکان کا مرکزی دروازہ مضبوطی سے بند کر کے سیڑھیاں چڑھتی، تیزی سے ایک کمرے میں بند ہوگئی تھی۔ چٹخنی لگا کر جیسے ہی وہ مڑی تو اس کے بالکل پیچھے ایک بہت لمبا چوڑا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ پورے چہرے کو ہیٹ سے ڈھانپے ہوئے، لمبا سا اوور کوٹ پہنے ہوئے۔ اِدھر فلم میں اس لڑکی کے منہ سے چیخ نکلی تھی، ادھر اس کے پلٹنے پر اس آدمی کو کھڑا دیکھ کر ان دونوں کے لبوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ ثمین کے نزدیک ہوگئی تھی۔ اس نے اسکرین پر سے نظریں ہٹالی تھیں، لیکن کانوں میں تو ساری آوازیں آ رہی تھیں۔ اس لڑکی کی چیخیں، اس آدمی کے بے ہنگم قہقہے۔

''کیا ہوا مر گئی جولی؟'' کچھ دیر بعد اس نے ثمین سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، مر گئی ہے''۔ اس نے ''خیال'' کے لفظ پر ثمین کی طرف چونک کر دیکھا تو پتا چلا کہ وہ محترمہ بھی اسکرین سے نظریں ہٹائے صرف آوازوں پر کان لگائے بیٹھی ہیں۔

ڈرتے ڈرتے ان دونوں نے اسکرین کی طرف دیکھا تو وہ آدمی جولی کی لاش کو گھسیٹتا ہوا نظر آیا۔ جس کمرے میں وہ جولی کو لایا تھا۔ اس کمرے میں ڈھیر ساری انسانی کھوپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ درمیان میں رکھی چپس کی پلیٹ ہٹاتے ہوئے ثمین اس سے بالکل چپک کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ بالکل جڑ کر بیٹھی وہ ہینڈسم ہیرو کو جولی کا سر تن سے الگ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ اس کا سر الگ کر کے اس نے ہاتھوں میں لیا اور اس میں سے بہتا ہوا خون دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔

اگلا سین بالکل نارمل تھا۔ وہ ہینڈسم ہیرو جو یونیورسٹی میں لیکچرر تھا، کلاس روم میں اپنے اسٹوڈنٹس کو لیکچر دیتا نظر آیا تھا۔ کلاس روم میں داخل ہوتی ایک نئی اسٹوڈنٹ کو دیکھ کر ایک پل کے لیے اس کے چہرے پر شیطانی مُسکراہٹ اُبھری تھی۔

''میرا خیال ہے، یہ اسی طرح چن چن کر خوب صورت لڑکیوں کو مارتا ہے۔ دیکھو باقی بھی تو کلاس میں کتنی اور لڑکیاں ہیں، وہ کسی کو اس انداز سے نہیں دیکھ رہا۔ آگے فلم میں بتائیں گے کہ اس کی وجہ کیا ہے، لیکن بہر حال بات یہی ہے۔ جولی بھی تو کتنی خوب صورت تھی''۔ اس نے اپنی رائے ظاہر کی تھی۔

ثمین نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

اسی طرح ڈرتے اور ہر خوفناک سین پر اسکرین سے نظریں ہٹاتے ان دونوں نے پوری فلم دیکھی تھی۔ فلم ختم ہونے پر ٹی وی بند کر کے ثمین بیڈ کی طرف واپس آئی تو وہ ہنوز بیڈ پر جمی بیٹھی تھی۔

''ثمین! آج میں یہیں سو جاؤں''۔ یہ بات کہتے ہوئے اسے شرمندگی تو بہت ہو رہی تھی۔

''میں خود آپ سے یہی کہنے والی تھی دانیا آپی''۔ ثمین کی بات نے اس کی شرمندگی زائل کر دی تھی۔ بغیر لائٹ بند کیے وہ دونوں سونے کے

لیے لیٹ گئیں۔

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے ثمین!'' کچھ دیر بعد اپنے برابر لیٹی ثمین کو اس نے آواز دی۔

''بہت زیادہ۔ جیسے ہی آنکھیں بند کر رہی ہوں۔ ڈھیر ساری کھوپڑیاں نظر آنے لگتی ہیں'' ثمین نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

ساری رات یونہی ڈرتے اور سوتی جاگتی کیفیت میں گزر گئی تھی۔

پھوپھو فجر کی نماز کے لیے ثمین کو اُٹھانے آئیں تو ان دونوں کو ایک ساتھ اور وہ بھی لائٹ جلائے سوتا دیکھ کر بہت حیران ہوئیں۔ اس وقت تو وہ بغیر کچھ پوچھے صرف اُٹھا کر چلی گئیں، لیکن بعد میں کچن میں ناشتے کی تیاری کے دوران انہوں نے ان دونوں سے اس بارے میں پوچھا۔

پھوپھو نے ان دونوں کو مشترکہ ڈانٹ پلائی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ثمین اپنے شام میں پہننے والوں کپڑوں اور جیولری غیرہ کے چکر میں لگ گئی تھی۔ آج اس کی بیسٹ فرینڈ کی منگنی تھی۔ دوپہر کے کھانے سے بھی پہلے وہ داؤد کے ساتھ اپنی دوست کے گھر چلی گئی تھی۔ اس کا رات میں وہیں رُکنے کا ارادہ تھا۔

ثمین کے جانے کے بعد گھر میں مزید خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ پھوپھو کے ساتھ باتیں کرتی چھٹی کا دن گزارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ لوگ شام کی چائے پی رہے تھے، جب حیدر آباد سے انکل کے ایک عزیز کے انتقال کی خبر آئی۔ بہت افراتفری میں پھوپھو اور انکل حیدر آباد روانہ ہو گئے۔ رات میں کھانے کی میز پر صرف وہ اور داؤد تھے۔ آپس میں ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے کھانا کھایا۔

''کافی لاؤں آپ کے لیے؟'' ثمین روز رات میں داؤد کو کافی بنا کر دیا کرتی تھی۔ آج وہ نہیں تھی تو اس نے اخلاقاً داؤد سے پوچھا۔

''اگر زحمت نہ ہو تو پلیز''۔ لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے داؤد نے اسے جواب دیا۔ وہ کافی بنا کر لائی تو داؤد اس کے ہاتھ سے کپ لے کر شکریہ کہتا ہوا صوفے پر سے اُٹھ گیا تھا۔

''بہت دنوں سے اپنی میلز نہیں دیکھیں میں نے۔ اس وقت فرصت ہے، میرا خیال ہے یہ کام کر ہی ڈالوں''۔ وہ اپنے یوں اُٹھ جانے کی وجہ بتاتا ہوا لاؤنج سے نکل گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ لائٹ آف کرنے کے ساتھ ہی اسے عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ خوف جو آج دن بھر میں ایک مرتبہ بھی محسوس نہیں ہوا تھا، اس وقت ہو رہا تھا۔ قصداً اپنا دھیان ہر طرف سے ہٹا کر وہ آیت الکرسی پڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ معاً اسے لان میں کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ پتوں کی چڑ چڑاہٹ..... وہ بے ساختہ اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک نظر بہت ڈرتے ڈرتے اس نے اس بند کھڑکی کی طرف ڈالی جو بالکونی میں کھلتی تھی اور جس کے پیچھے لان میں اس وقت پتا نہیں کون تھا۔ اس کا دِل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے برف۔ اچانک کھڑکی بجی تھی، ایسا لگا تھا کہ کوئی کھڑکی کے باہر بالکونی میں کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور دروازہ کھول کر اندھا دھند بھاگتی ہوئی داؤد کے کمرے کی طرف آئی۔ زور زور سے دروازہ پیٹتے ہوئے وہ اسے آواز بھی دے رہی تھی۔

''داؤد! دروازہ کھولیں پلیز''۔ اسے آواز دینے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پیچھے بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ ہر بار پیچھے دیکھنے پر یہی لگتا کہ کوئی اس کے عین سر پر کھڑا شیطانی انداز میں ہنس رہا ہے۔ داؤد شاید سو چکا تھا۔ دروازہ کھول کر نیند سے بوجھل آنکھیں لیے اس نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''کیا ہوا دانیا؟'' اسے یوں متوحش دیکھ کر اس کی نیند بالکل بھاگ گئی تھی۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے، گھر میں کوئی گھس آیا ہے۔ میں نے لان میں کسی کے چلنے کی آواز سنی ہے''۔ پسینے میں نہائی تھرتھر کانپتی وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ داؤد اس کی بات سنتے ہی تیزی سے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ وہ خود بھی اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ اسے لاؤنج میں آ کر بے دھڑک دروازہ کھولنے کا ارادہ کرتا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے پاس آئی۔

اس طرح سے تو ایک دم باہر مت نکلیں، اگر واقعی کوئی ہوا اور اس کے پاس اسلحہ بھی ہوا تو پھر''۔ اس نے داؤد کو ہاتھ پکڑ کر روکا۔

اس نے ایک نظر دانیا کے خوف زدہ چہرے پر ڈالی اور پھر اس کا ہاتھ ہٹاتا ہوا باہر نکل گیا۔ صرف لان کا ہی کیا اچھی طرح ہر طرف کا جائزہ لینے کے بعد وہ واپس اندر آ گیا۔

''کوئی نہیں ہے۔ یونہی تمہیں وہم ہوا ہے''۔ لاؤنج کا دروازہ واپس بند کر کے وہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہ بھی سست قدموں سے اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

داؤد اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، جبکہ وہ بھی اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔ کمرے کا دروازہ کھولتے کھولتے وہ ایک جھرجھری سی لے کر فوراً رک گئی۔

''وہاں لان میں مجھے کہاں ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں تو یہاں بیٹھا ہوں''۔ اسے ایسا لگا جیسے ہی وہ دروازہ کھولے گی، اسے وہ سامنے ہی ہیٹ سے منہ چھپائے بیڈ پر بیٹھا نظر آئے گا۔ وہ بے ساختگی میں اُلٹے قدموں بھاگتی داؤد کے پاس آئی۔ اسے یوں دوڑ کر اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ کمرے میں جاتا جاتا رُک گیا۔

''اب کیا ہوا؟'' اس بار اس کے لہجے میں واضح جھنجھلاہٹ اور کوفت تھی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' بغیر شرمندہ ہوئے وہ اسے یہ اطلاع دے رہی تھی۔

''کس چیز سے ڈر لگ رہا ہے۔ دیکھ تو لیا ہے میں نے سب طرف۔ کوئی نہیں ہے، جاؤ آرام سے سو جاؤ شاباش''۔ اس نے بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو بدلحاظ ہونے سے روکا تھا، ورنہ اس کی ان حرکتوں پر اسے ٹھیک ٹھاک غصہ آ رہا تھا۔

''نہیں۔ میں اپنے کمرے میں نہیں جاؤں گی''۔ وہ اس سے پہلے اس کے کمرے میں گھس گئی۔

''مجھے پلیز، یہاں پر بیٹھا رہنے دیں''۔ وہ اس کے چہرے پر نظر آتی برہمی اور ناگواری کو دیکھتے ہوئے التجائیہ لب ولہجہ اختیار کر گئی تھی۔

''آخر تمہیں ڈر لگ کس چیز سے رہا ہے؟'' اس کی آنکھوں میں نظر آتے آنسو دیکھ کر اس نے اپنے لہجے کی سختی کم کی۔

''مجھے پتا ہے، کہیں پر بھی کوئی نہیں ہے۔ یہ سب میرا وہم ہے، لیکن پھر بھی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے''۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ داؤد لائٹ آن کرتا سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

''اصل میں کل میں نے اور ثمین نے ایک بہت ہی ہارر مووی دیکھی تھی۔ شاید اسی کا اثر ہے، ابھی تک''۔ بہت شرمندہ سے لہجے میں وہ سر

جھکا کر اسے صحیح بات بتانے لگی۔ داؤد نے اس کی بات سن کر شاید منہ ہی منہ میں لاحول ولاقوۃ کہا تھا۔

''ایک سفاک قاتل تھا، اس میں۔ وہ چن چن کر اپنے گرد موجود خوب صورت لڑکیوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا کرتا تھا۔ پھر ان کے سر جسم سے الگ کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیا کرتا تھا''۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں اسے فلم کی کہانی سنانے لگی تھی۔ انداز کچھ ایسا تھا کہ دیکھو میں بیکار میں نہیں ڈر رہی۔ بڑی معقول وجہ ہے، میرے پاس خوف زدہ ہونے کی۔ وہ جو اتنی دیر سے جھنجھلایا ہوا اور کوفت میں مبتلا، اس کی شکل دیکھ رہا تھا، بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''خوب صورت لڑکیوں کو''۔ اس نے لفظ خوب صورت کو خوب لمبا کھینچا تھا۔ ایسے جیسے اس لفظ کو بہت انجوائے کر رہا ہو۔

''اب اپنے کمرے میں جاتے ہوئے تمہیں ایسا لگ رہا ہے کہ وہ وہاں پہلے سے موجود ہوگا۔ ایک اور خوب صورت لڑکی کو قتل کرنے کے لیے۔ اس کا سر اپنے پاس اسٹاک کرنے کے لیے''۔ وہ ابھی تک با آواز بلند ہنس رہا تھا۔ وہ اس وقت جتنی خوف زدہ تھی، ایسے میں اس کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

''تمہیں ایسا نہیں لگ رہا کہ وہ آدمی میں ہی ہوں۔ دیکھو غور سے''۔ اس کے ہاتھ جیسے کوئی بہت ہی دلچسپ بات لگی تھی۔ وہ اس کے مذاق پر ایک پل کے لیے تو واقعی اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی تھی، پھر اس کے چہرے کی شرارتی سی مُسکراہٹ پر نظر پڑی تو بری طرح شرمندہ ہو کر نظروں کا زاویہ بدل گئی۔

''اچھا تو دانیا ظفر! جو ایک خوب صورت لڑکی ہیں، اس وقت سخت خوف زدہ ہیں۔ ایک انجانے قاتل سے۔ خوب صورت لڑکیوں کی کھوپڑیاں جمع کرنا جس کی ہابی ہے''۔ اس کا انداز سراسر مذاق اُڑانے والا تھا، لیکن اس وقت وہ اس کی کسی بھی بات کا بُرا نہیں مان رہی تھی۔

''اتنے خوف کی حالت میں خود ستائی کا یہ عالم ہے''۔ اس نے داؤد کی سرگوشی نما خود کلامی سنی۔ وہ بیڈ روم فریج میں سے کچھ نکال رہا تھا۔ چند سیکنڈز بعد وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں جوس کے دو کین تھے۔

''پی لو۔ پہلے ہی تمہارا خاصا خون خشک ہو چکا ہے''۔ کین کھول کر جوس پیتے ہوئے اس نے گم صُم سی دانیا کو مخاطب کیا۔

''میری وجہ سے آپ کی نیند ڈسٹرب ہو رہی ہے''۔ اسے خود پر سخت غصہ بھی آ رہا تھا، شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی، مگر یہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں واپس جانے کے خیال سے ہی اس کا دِل بیٹھ رہا تھا۔

''ہاں۔ نیند تو میری ڈسٹرب ہو رہی ہے، لیکن کیا کریں مجبوری ہے۔ وہاں وہ ظالم اور سفاک قاتل جو انتظار میں بیٹھا ہے، ایک خوب صورت لڑکی کے''۔ اس نے جیسے لفظ خوب صورت کو اس کی چھیڑ بنا لیا تھا۔ اسی ایک لفظ کو لیے وہ مسلسل اس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

وہ اس کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر خفگی کا اظہار کرتی بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ جوس کا کین خالی کر کے اسے ڈسٹ بن میں پھینکتا ہوا، وہ کمپیوٹر آن کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ انٹرنیٹ کنیکٹ (Connect) کرتا وہ مکمل طور پر مانیٹر کی طرف متوجہ تھا۔

''آپ کو سونا ہے تو سو جائیں''۔ وہ اس کی وجہ سے سو نہیں پا رہا اور وقت گزارنے کے لیے کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گیا ہے، یہ بات سمجھتے ہوئے وہ

بے ساختہ بولی تھی۔

''آپ یہیں تشریف رکھیں گی۔ مجھے سونا ہے تو میں سو جاؤں۔ بہت شکریہ، بڑی نوازش۔ آپ کی اتنی کرٹسی اور میری نیند کا خیال کرنے پر''۔ وہ اس کی طرف سر گھما کر کچھ طنزیہ سے انداز میں بولا اور پھر دوبارہ اپنا رُخ کمپیوٹر کی طرف کر لیا۔

گھڑی دو بجا رہی تھی۔ کتنی دیر تک وہ داؤد کو انٹرنیٹ پر مصروف دیکھتی رہی۔ وقت گزارنا اور صبح کا انتظار کرنا بہت ہی مشکل کام لگ رہا تھا۔ کتنی دیر بعد گھڑی کی طرف دیکھا تو بھی گھڑی کی سوئیاں تھوڑا سا ہی آگے بڑھی تھیں۔

آخر صبح کب ہوگی، دِن نکل آئے۔ ہر طرف روشنی پھیل جائے۔ رات ختم ہوگی تو یہ خوف بھی ختم ہو جائے گا۔

کہیں بہت دور سے اذان کی ہلکی سی آواز آنی شروع ہوئی تو اس نے سکون اور طمانیت بھری گہری سانس لی۔ کتنی دیر سے وہ بے دِلی سے میگزین کے اوراق پلٹ پلٹ کر وقت کو گزارنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ میگزین بند کر کے رکھتے ہوئے اس نے کمپیوٹر ٹیبل کی طرف دیکھا۔ داؤد ٹیبل پر سر رکھ کر بے خبر سو رہا تھا۔ اپنی وجہ سے اس کی نیند خراب کرنے پر افسوس کرتی، وہ آہستہ سے اُٹھی تھی۔ اس کی نیند نہ ٹوٹے، یہی سوچ کر اس نے اپنی طرف سے بڑی احتیاط سے اور بغیر آواز پیدا کیے دروازہ کھولا، لیکن پھر بھی وہ ایک دم چونک گیا تھا۔ ٹیبل سے سر اُٹھا کر اس نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر ایک نگاہ گھڑی پر ڈال کر وہ جلدی سے اُٹھا اور پھر اس سے بھی پہلے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ اسے اپنے سے آگے تیز تیز چلتا ہوا تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر گھسا اور پھر بغور پورے کمرے میں نظریں دوڑانے لگا۔

''خوب صورت لڑکی آپ اندر آسکتی ہیں۔ یہاں کوئی جن بھوت وغیرہ نہیں پائے جاتے''۔ وہ دروازہ کھول کر بالکونی میں جھانکتا ہوا باآواز بلند اس سے بولا۔ اس کے ہاتھوں اپنی یہ شامت اس نے خود ہی بلوائی تھی۔

''داؤد پلیز۔'' وہ روہانسی آواز میں چلائی۔ اسے ڈرتا دیکھ کر اس نے ہنستے ہوئے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیئے۔

☆

عاصم بھائی اور بھابھی واپس آگئے تو گھر کی ساری رونق بھی واپس آگئی۔ باقی سب کے ساتھ ساتھ بھابھی، اس کے لیے بھی تحفے لائی تھیں اور ان کے وہ تحفے اس نے بڑی خوشی خوشی قبول کر لیے تھے۔

''پھوپھو! آپ کے گھر میں مجھے ایسا کیوں لگتا ہے، جیسے میں اپنے ہی گھر میں ہوں۔ ذرا سی بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا، حالانکہ آپ لوگوں کا رہن سہن، طور طریقے، سب ہمارے گھر کے رہن سہن سے مختلف ہیں۔ بعض دفعہ تو مجھے ایسا لگتا ہے، یہ میرا ہی گھر ہے۔ میں جیسے ہمیشہ ہی سے یہاں رہتی رہی ہوں''۔ اس روز وہ پھوپھو سے کہہ بیٹھی تھی۔ وہ اس کی بات سن کر کھل کر مُسکرا دیں۔

''یہ تمہارا ہی گھر ہے میری جان''۔ پھوپھو کا جواب ویسا ہی محبت بھرا تھا، جیسا ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ داؤد کو کمرے میں آتا دیکھ کر وہ ایک دم چپ ہوگئی۔ وہ اس وقت پھوپھو کے کمرے میں ان کے پاس بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ داؤد پھوپھو کو ان کی دوا دینے آیا تھا۔ دوا پکڑ کر وہ جس سنجیدگی سے آیا تھا، اسی سنجیدگی کے ساتھ فوراً ہی چلا بھی گیا تھا۔

اسے اپنی یہ جذباتی سی باتیں داؤد کے سن لینے پر بہت بُرا محسوس ہوا۔

☆

''یہ رافعہ کیا تم لوگوں کی فرسٹ کزن ہے؟'' اس نے ثمین سے پوچھا۔

''فرسٹ کزن تو نہیں ہے۔ ہے تو کچھ دور کی رشتہ داری۔ مجھے تو سیدھے سادے رشتے ہی مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اتنے دور کے اور اُلجھے ہوئے رشتے تو میرے سر پر سے گزر جاتے ہیں''۔ ثمین نے اوون آن کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

چھٹی کا دِن تھا اور ثمین کا اچانک ہی چکن پیٹیز بنانے کا موڈ بن گیا تھا۔ وہ بھی اس کی مدد کرانے کچن میں آ گئی تھی۔ کام کرتے کرتے اس نے ثمین سے اس کی صبح سے گھر آئی ہوئی اس کزن کے بارے میں دریافت کیا تھا، جس سے آج وہ پہلی مرتبہ ملی تھی۔

''سی اے کر رہی ہے نا، رافعہ۔ کبھی پڑھائی میں کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو داؤد بھائی سے ہیلپ لینے آ جاتی ہے۔'' ثمین نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔

صبح گیارہ بجے سے رافعہ ان کے گھر آئی ہوئی تھی اور باقی سب سے خیر خیریت اور تھوڑی سی گفتگو کرنے کے بعد وہ داؤد کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ڈھیر ساری کتابیں اور فائلیں پھیلائے بیٹھی تھی اور اب جبکہ تین بج چکے تھے، تب بھی وہ دونوں اسی طرح مصروف نظر آ رہے تھے۔

''بہت بولڈ اور نڈر قسم کی ہے رافعہ! ہم لوگوں کی طرح کی نہیں ہے''۔ ثمین مزید گویا ہوئی۔ یہ بات تو ثمین کے بتائے بغیر بھی اس نے محسوس کر لی تھی۔

''ابھی پچھلے دنوں دو لڑکوں نے اس کی گاڑی گن پوائنٹ پر چھین لی تھی۔ اس نے بجائے نروس ہونے یا رونے دھونے کے بڑے سکون سے گاڑی کی چابی انہیں پکڑا دی اور کہا گاڑی بے شک تم لوگ لے جاؤ، مگر اس میں میری کتابیں اور کچھ اہم ڈاکومنٹس وغیرہ ہیں، وہ مجھے نکال لینے دو۔ میں اس کی جگہ ہوتی تو بے ہوش ہی ہو جاتی۔ وہ دونوں بھی اس کی شخصیت کے رعب میں آ گئے اور اسے ڈاکومنٹس وغیرہ نکال لینے دیئے۔ یہ صاحبہ بڑے سکون سے رکشہ میں بیٹھ کر گھر آ گئیں۔ ثمین ہنستے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔ پیٹیز اوون میں رکھے جا چکے تھے، اب وہ دونوں مل کر سارا پھیلاوا سمیٹ رہی تھیں۔

''بھابھی کا اور میرا مشترکہ خیال ہے کہ وہ داؤد بھائی کو پسند کرتی ہے۔ خود داؤد بھائی کا اس بارے میں کیا خیال ہے، یہ مجھے معلوم نہیں۔ بہت بے تکلفی کے باوجود میری ان سے اس طرح کی بات پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی''۔

''پچھلے چار گھنٹوں سے وہ اسے جس خلوص سے پڑھا رہے ہیں، اس کے بعد شک کی کوئی گنجائش رہ تو نہیں جاتی، ورنہ کوئی اور ہو تو چڑ جائے کہ ایک چھٹی کا دن ملا ہے''۔ اس نے ثمین کی بات کا سنجیدگی سے جواب دیا۔

''بات تو آپ صحیح کہہ رہی ہیں اور یہ بات تو خیر مجھے معلوم ہے ہی کہ داؤد بھائی کو ڈرپوک قسم کی لڑکیاں زہر لگتی ہیں۔ مجھے اکثر ڈانٹتے ہیں۔ انہیں بولڈ اور نڈر لڑکیاں اچھی لگتی ہیں''۔ کچن میں کام ختم ہو چکا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ دونوں لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

مغرب سے کچھ پہلے رافعہ واپس گئی تھی۔ اسے رُخصت کر کے داؤد عاصم بھائی کے ساتھ لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پھوپھو کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی، جب بھاگتی دوڑتی ثمین کمرے میں آئی تھی۔

''چلیں دانیا آپی! داؤد بھائی ہم لوگوں کو بڑی زبردست سی آؤٹنگ کرانے لے جا رہے ہیں۔ میں، آپ، میرال اور شارم مہمانوں میں شامل ہیں۔'' وہ بہت پُرجوش نظر آ رہی تھی۔

''جلدی اُٹھیں، ایسے موقع روز بروز نہیں آتے''۔

''میرا موڈ نہیں ہو رہا ثمین! تم لوگ چلے جاؤ''۔ اس کی دعوت پر اس نے سنجیدگی سے انکار کیا۔ اس کا انکار سنتے ہی ثمین کا موڈ بگڑنے لگا تھا۔

''اتنا اچھا ہم نے تفریح کا پروگرام بنایا ہے اور آپ نخرے کر رہی ہیں۔ چلیں نا، بہت مزہ آئے گا''۔

وہ اسے ہر قیمت پر ساتھ لے جانا چاہتی تھی، جبکہ اس کا اس وقت کہیں بھی جانے کا دِل نہیں چاہ رہا تھا۔

''چلی جاؤ دانیا! تھوڑی سی تفریح تو زندگی میں ہونی چاہیے۔ روز تو وہی گھر سے آفس اور آفس سے گھر والا ہی روٹین ہوتا ہے تمہارا''۔

پھوپھو کا یہ محبت بھرا انداز وہ ٹال ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے اُٹھتا دیکھ کر ثمین خوش ہو گئی۔

''آپ ساتھ نہیں جاتیں تو مجھے بالکل مزہ نہیں آتا''۔ وہ اس کی محبت اور خلوص پر مُسکرا دی۔

''ایسی کیا خاص بات ہے مجھ میں۔'' وہ اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔

''خاص اور عام کا تو مجھے نہیں پتا، لیکن بس آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ آپ پوز نہیں کرتی۔ سادگی سے رہتی ہیں۔ بننے بنانے اور پوز کرنے والے لوگوں کے ساتھ میری دو منٹ بھی نہیں بنتی۔'' وہ دونوں پورچ میں آ گئیں۔ داؤد، میرال اور شارم گاڑی میں ان لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔

''آپ بتائیں، کہاں چلیں۔'' ثمین نے اگلی سیٹ سے گردن موڑ کر اسے مخاطب کیا۔

''جہاں سب کا موڈ ہو وہیں۔ میرا اپنا کہیں جانے کا موڈ نہیں''۔ اس نے آہستگی سے اسے جواب دیا۔

''اب میری وجہ سے بغیر موڈ کے آ ہی گئی ہیں تو تھوڑا سا انجوائے بھی کر لیں''۔ ثمین کو اس کی بے نیازی پر غصہ آ گیا۔

''مشکل ہے بہت۔ تم لوگوں کا کسی ایک جگہ پر متفق ہونا۔ میرا خیال ہے میں خود ہی یہ کام کر لوں۔ اب لانگ ڈرائیو ہو گی اور ڈنر ہو گا اور وہ بھی میں اپنی مرضی کی جگہ پر کراؤں گا۔'' داؤد نے ان لوگوں کی بحث و تکرار پر چڑ کر کہا۔

کھانے کے بعد بھی ان لوگوں کا فوراً گھر واپسی کا ارادہ نہیں تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر یونہی ڈرائیو کرتے وہ لوگ باتیں کرتے میوزک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میرال اور ثمین میں اپنی اپنی پسند کے گانوں پر جھگڑا ہو رہا تھا۔

''فاخر کا ''دیوانہ'' لگے گا''

''نہیں ابرار کا پریتو''۔

ثمین بالکل بچی بنی اس کے ساتھ جھگڑ رہی تھی۔ ڈرائیو کرتے کرتے داؤد نے بیک ویو مرر سے دانیا پر ایک نظر ڈالی۔ اس جھگڑے سے

بے نیاز وہ کھڑکی سے باہر پتا نہیں کیا دیکھ رہی تھی۔ کچھ سوچ کر ایک شرارتی سی مُسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی تھی۔

''ثمین! یہ جو اُلٹے ہاتھ پر جھاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ پتا ہے یہاں سے پچھلے ہفتہ ایک لڑکی کی سڑی لاش ملی ہے''۔ ثمین لاش اور وہ بھی سڑی ہوئی لاش کا ذکر سن کر سارے جھگڑے بھول بھال بھائی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''بہت ڈھونڈا پولیس نے مگر اس کا سر کہیں بھی نہیں ملا''۔ اس نے بہت چپکے سے ایک نظر پھر پیچھے ڈالی۔ وہ خاموش تو اب بھی بیٹھی تھی، مگر بے نیازی اور لاتعلقی والا انداز ختم ہو گیا تھا۔

''آپ نے اخبار میں پڑھی ہو گی، یہ خبر''۔ ثمین نے بڑے خوف زدہ سے انداز میں پوچھا۔

''اخبار میں آئی ہو گی شاید یہ خبر، لیکن میں نے اسے اخبار میں نہیں پڑھا۔ میرے ایک کولیگ کی جاننے والی تھی، وہ لڑکی۔ مجھے تو ان کے ذریعے پتا چلا۔ پنڈی سے کراچی آئی ہوئی تھی، جاب کے لیے بے چاری۔ سب کہہ رہے تھے کہ شاید وہ قاتل پنڈی سے ہی پیچھا کرتا ہوا اسے قتل کرنے کراچی آیا تھا''۔

ثمین اس نادیدہ لڑکی کے قتل پر افسوس کا اظہار کر رہی تھی، جبکہ اس نے داؤد کو بیک ویو مرر میں اپنی طرف دیکھتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اس لیے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

☆

وہ میرال کے ساتھ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ دانیا اس کے ساتھ آ کر بیٹھی اور اسے بہت پرفیکٹ طریقے سے کھٹا کھٹ کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ وہ ماؤس کو ہاتھ لگائے بغیر ہر کام کی بورڈ کے ذریعے کر رہی تھی۔

''تم مجھ سے کیا سیکھو گی۔ تمہیں تو خود سب آتا ہے''۔ اس نے ستائشی انداز میں کہا۔

اسی وقت دروازہ کھول کر داؤد اندر داخل ہوا ''کیا کام ہو رہا ہے، اتنی توجہ کے ساتھ؟'' وہ مانیٹر پر نظریں دوڑاتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

''چاچو! میں دانیا پھوپھو سے ''Software Down Loading'' سیکھ رہی ہوں۔ انہیں انٹرنیٹ کے بارے میں اتنی ساری چیزیں آتی ہیں''۔ میرال نے گردن گھما کر معصومانہ سے انداز میں اس کی بات کا جواب دیا۔ وہ اس سے لاتعلق سی مانیٹر کی طرف دیکھتی کی بورڈ کے ساتھ مصروف تھی۔

''کچھ ہمیں بھی سکھا دیجیے، اس مشین کے بارے میں۔ تھوڑا سا فیض ہم بھی حاصل کر لیں۔ کچھ تو فائدہ ہو اتنی ذہین فطین کزن کے ہونے کا''۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھے وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''مجھے مفت میں ٹیوشنز پڑھانے کا کوئی شوق نہیں ہے''۔ بہت بے ساختہ یہ بات اس کے منہ سے نکلی تھی اور منہ سے نکلی اس بات پر جو محظوظ سی ہنسی اس کے چہرے پر نظر آئی، اس نے اسے اچھا خاصا نروس کر دیا تھا۔

وہ یوں مُسکرایا تھا، گویا کوئی بہت ہی دلچسپ بات سن لی ہو۔ اپنے بے سوچے سمجھے بولے، اس جملے میں اس خود ہی طنز اور جیلسی کی بو آئی تھی۔

''مفت نہیں، میں فیس دوں گا۔تم سے یہ اُمید کی بھی نہیں جاسکتی کہ رشتہ داری کا کوئی لحاظ کرو گی''۔وہ جیسے اس کے چہرے پر پھیلتے شرمندگی بھرے تاثرات کو جی بھر کر انجوائے کرنے لگا۔

''میرال یونہی تعریف کر رہی ہے۔ مجھے اتنا کچھ خاص نہیں آتا''۔اسے اپنی جان چھڑانی مشکل ہو رہی تھی۔ثمین کو اسٹڈی میں آتا دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔

رات گئے تک وہ اپنے اس فضول سے فقرے پر خود کو لعنت ملامت کرتی رہی تھی۔ دِل ہی دِل میں خود سے عہد کرتی رہی تھی کہ آئندہ وہ کم بولا کرے گی اور داؤد کے سامنے تو خاص طور پر۔

ضرورت سے زیادہ ذہین اور اسمارٹ لوگوں سے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ایسے لوگوں کے سامنے خود کو چھپانا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔اسے ایسا لگا کہ اس روز ڈنر کے لیے جب وہ لوگ گئے تھے،تب بھی وہ سارا وقت اس کی فیس ریڈنگ کرتا رہا تھا۔

اگلے روز ابھی اسے آفس سے آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔تب ہی فون کی بیل بجی تھی۔اس نے فون اٹینڈ کیا تو دوسری طرف رافعہ تھی۔

''میں رافعہ بول رہی ہوں۔داؤد ہیں؟''وہ اسے یہ جواب دینے ہی والی تھی کہ داؤد ابھی آفس سے نہیں آیا کہ وہ اندر آتا دکھائی دے گیا۔

''آپ کا فون ہے''۔اسے ہولڈ کرنے کا کہہ کر اس نے داؤد سے کہا۔بہت بیزار سی شکل ہو رہی تھی،اس کی۔شاید اس وقت وہ کوئی بھی کال اٹینڈ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔اپنا چائے کا کپ اُٹھائے بغیر ہی وہ لاؤنج سے چلی گئی تھی۔

''کیا پک رہا ہے خواتین''۔بھابھی نے نرگسی کوفتے بنائے ہیں اور میں نے دال چڑھائی ہے۔آپ کے اور اپنے لیے دال چاول پکا رہی ہوں اور اس کے ساتھ اچار''۔اس معاملے میں اس کی اور ثمین کی پسند سو فیصد ایک جیسی تھی۔

''کتنا اچار کھاتی ہو تم''۔بھابھی نے کہا۔

''آپ کو اچار کے فائدے ہی نہیں معلوم''۔اس نے جواباً تاسف سے کہا۔''پتا ہے آپ کو قلوپطرہ کے حسن کا ایک بڑا راز اچار بھی تھا۔تھوڑے دن پہلے میں ایک کتاب میں پڑھ رہی تھی کہ قلوپطرہ اپنے حسن کی حفاظت کے لیے اچار کا استعمال بڑی پابندی سے کرتی تھی''۔

''پھر تو واقعی خوب صورت لڑکیوں کو اپنے حسن کی حفاظت کے لیے اچار ضرور کھانا چاہیے''۔داؤد نے کچن میں آتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔وہ اس کی بات پر کچھ نہیں بولی تھی۔

''کب آئے تم؟''اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے،بھابھی نے دریافت کیا۔

''کافی دیر ہوگئی۔رافعہ کا فون آیا ہوا تھا۔اس سے بات کر رہا تھا''۔وہ اس کے بالکل سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''اچھا۔رافعہ کا فون آیا تھا؟''۔بھابھی نے چولہے کی آنچ ہلکی کرتے ہوئے پوچھا۔

''حالانکہ میرا بات کرنے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔میں نے اشارے سے ان محترمہ کو منع بھی کیا تھا،مگر انہوں نے پھر بھی اسے ہولڈ کروا دیا''۔دانیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے ناراضی سے کہا۔

''جیسے اس وقت آپ رشتہ داری کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے آفس ڈراپ کرنے جا رہے ہیں؟'' اس کا انداز استفہامیہ تھا۔ وہ اس کی بات پر دھیمے سے ہنسا۔

''ہاں۔ یہ بھی لحاظ اور مروّت کی ہی ایک قسم ہے۔ ویسے اس وقت میں کسی اور بارے میں بات کر رہا تھا''۔

کافی دیر تک وہ اس کے مزید کچھ اور بولنے کا انتظار کرتی رہی، لیکن اس ادھوری بات کو مکمل کرنے کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ایسے جیسے جو بول گیا، وہی بہت کافی ہے۔ وہ اسے خاموش دیکھ کر خود بھی سڑک پر نظریں دوڑانے لگی تھی۔

گاڑی اس کے آفس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ بیگ کندھے پر ڈال کر اس نے جلدی جلدی رسمی قسم کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایک دو فقرے مرتب کیے تھے، لیکن وہ تمام فقرے کہنے کی نوبت نہیں آئی، اسے اُتارتے ہی وہ خدا حافظ کہہ کر فوراً چلا گیا تھا۔

شام میں واپس آئی تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل اور رونق محسوس ہوئی۔

''کون آیا ہے؟'' وہ بھابھی کے پاس کچن میں آ گئی۔ وہ ثمین اور شمیم کو ساتھ لگائے بہت مصروف نظر آ رہی تھیں۔

''بہت خاص مہمان ہیں''۔ بھابھی نے ثمین کی طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا تو بات سمجھتے ہوئے وہ پُرتجسس سے انداز میں بولی۔

''مہمانوں کا خاص ہونا تو مجھے اس غیر معمولی اہتمام سے ہی نظر آ رہا ہے۔ ذرا کچھ اور تفصیلات تو ارشاد فرمایئے''۔

''تفصیل کچھ یوں ہے کہ بابل کا گھر چھوڑ کر گوری پیا گھر جانے والی ہے''۔ وہ بہت شرارتی موڈ میں تھیں۔ پھر اس کے چہرے پر پھیلے تجسس کا خاتمہ کرنے کے لیے وہ اسے سنجیدگی سے ساری بات بتانے لگیں۔

''داؤد کے دوست کی فیملی ہے۔ بہت پرانی دوستی ہے، داؤد کی سفیان کے ساتھ، اتنی پرانی کہ اب ان لوگوں کے ساتھ ہمارے فیملی ٹرمز ہیں۔ اسی کا چھوٹا بھائی ہے۔ فرید۔ انڈس ویلی سے گریجویشن کیا ہے، اس نے۔ تین چار سال پہلے ان کی ممی نے ثمین اور فرید کے رشتے کی بات کی تھی۔ اس وقت ثمین بھی بہت چھوٹی تھی اور فرید بھی پڑھ رہا تھا۔ اس لیے رشتے سے انکار تو نہیں کیا گیا تھا، لیکن ان لوگوں کو چند سال انتظار کرنے کے لیے کہہ دیا گیا تھا۔ اب کیونکہ فرید مزید اسٹڈیز کے لیے امریکہ جا رہا ہے تو میرا خیال ہے کہ آج آمد اسی سلسلے میں ہوئی ہے کہ رشتہ طے کر کے باقاعدہ منگنی وغیرہ کر لی جائے''۔

''ہے کیسا وہ۔ میں نے دیکھا ہوا ہے کیا اسے؟'' اس کا تجسس ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

''ہاں دیکھا ہوا، کیوں نہیں ہوگا۔ داؤد سے کافی دوستی ہے، اس کی۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو وہ آیا تھا۔ کافی دیر بیٹھا رہا تھا، داؤد اور عاصم کے ساتھ لان میں اور پھر ڈنر بھی ہم لوگوں کے ساتھ ہی کر کے گیا تھا''۔ بھابھی نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی تو وہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے یاد آ جانے پر مُسکرائی۔

''ہاں یاد آ گیا۔ وہ جس کے آنے پر اس دن اچانک ہی ثمین کو کھانے کے وقت بھوک نہیں لگ رہی تھی'' اور بعد میں جب بھوک لگے گی''

''آپ نے منع تو نہیں کیا تھا۔'' وہ خود پر الزام رکھے جانے پر چپ نہیں رہ سکی۔

''ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔ منہ سے چیخ کر تو کہہ نہیں سکتا تھا''۔

''اشاروں کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی۔'' وہ خود سے کیے عہد کے برخلاف بولنے میں مصروف تھی۔

''پھر کون سی زبان سمجھ میں آتی ہے؟'' اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بھابھی! میں پھوپھو کے پاس جا رہی ہوں۔ کوئی کام ہو تو آواز دے لیجیے گا''۔ وہ اس کا سوال اَن سُنا کر کے کرسی پر سے اُٹھ گئی۔

''تم لوگوں کی بحث و تکرار میں اصل بات تو رہ ہی گئی۔ فون کس لیے کیا تھا رافعہ نے؟'' بھابھی کاموں سے فارغ ہو کر مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''فون، ہاں وہ''۔ کہتے کہتے وہ ایک پل کے لیے خاموش ہوا۔

''کیا ہوا تم گئیں نہیں؟'' وہ سامنے سے بھاگ کر کچن میں آتے شارام کو راستہ دینے کے لیے صرف ایک سیکنڈ ہی رُکی تھی، جب پیچھے سے یہ جملہ اس کے کانوں سے ٹکرایا تھا۔ شارم کو آگے سے ہٹاتے وہ فوراً باہر چلی گئی۔

بھابھی اور ثمین اس کی بات سننے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے اس کا ایک دم غصے سے باہر نکلنا محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

☆

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ وہ بہت تیزی اور بھاگ دوڑ بھی مچاتی، تب بھی گاڑی لازماً مس ہو ہی جاتی تھی۔ تیار ہو کر باہر نکلی تو پورچ میں اپنی گاڑی کے پاس کھڑا داؤد کسی سے موبائل پر بات کرتا ہوا نظر آیا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر وہ گیٹ کی طرف بڑھی تو پیچھے سے اس نے اسے آواز دی۔

''تمہاری گاڑی مس ہو گئی ہے نا۔ چلو میں تمہیں ڈراپ کر دوں''۔

''شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی''۔ اس نے بردباری سے جواب دیا۔

''اچھا۔ میں تمہیں ٹھہر کر فون کرتا ہوں''۔ اس نے جلدی سے خدا حافظ کہہ کر بات ختم کی، پھر قدرے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں بلاوجہ فارمل ہونے کا زیادہ شوق ہے۔ جب مجھے وہاں سے گزرنا ہی ہے تو تمہیں بھی چھوڑ دوں گا''۔ جملے کے اختتام پر وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''جلدی بیٹھو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے''۔ وہ اس حکمیہ انداز پر کچھ چڑتی ہوئی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ بہت خاموشی سے ڈرائیو کرتا وہ اس سے مکمل طور پر لاتعلق سا بیٹھا ہوا تھا۔

''بہت سے کام انسان کو رشتہ داری کے لحاظ میں کرنے پڑ جاتے ہیں۔ اپنی خوشی سے یا ناخوشی سے نہیں، لیکن بعض اوقات رشتہ داری میں انسان کو لحاظ اور مروّت سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔'' کافی دیر بعد اس نے داؤد کی سنجیدہ سی آواز سنی۔ اس نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کی طرف دیکھے بغیر وہ اسی طرح ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔

کہہ کر یہ محترمہ اپنے کمرے میں بند ہوگئی تھیں''۔اس نے ثمین کو گھورا۔

''کتنی گھنی لڑکی ہے یہ۔ مجھے کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی کسی بات کی اور میں اتنی بے وقوف کہ ساری بات سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ اچانک بھوک پیاس کیوں اُڑ گئی ہے۔'' وہ ثمین کے سر پر کھڑی غصے سے بولی۔

''اس دن مجھے بتا دیا ہوتا تو میں بندے کو ڈھنگ سے دیکھ تو لیتی۔اشارتاً ہی بتا دیتیں کہ یہی ہیں پرنس چارمنگ۔'' ثمین لاپرواسی بنی ٹرالی سیٹ کرنے میں مصروف تھی،لیکن اس کے چہرے پر بکھری شرمیلی سی مُسکراہٹ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔

''بھابھی! آج پہلی مرتبہ مجھے پتا چلا ہے کہ افسانوں کی ہیروئنوں اور گرگٹ کے علاوہ بھی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو رنگ بدلتے ہیں۔ سچی بات ہے''۔آج پہلی بار میں نے کسی لڑکی کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھا ہے۔

بھابھی اس کے کمنٹس پر کھلکھلا کر ہنس دیں،جبکہ ثمین اسے شرارتی موڈ میں دیکھ کر سب کام وام چھوڑ کر کچن سے ہی چلی گئی تھی۔مہمانوں کو رُخصت کر کے جب گھر کے سب افراد لاؤنج میں بیٹھے تو وہ بھی وہیں آ گئی۔

''کیا طے ہوا پھوپھو؟'' وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''نکاح کی تاریخ طے کر کے گئے ہیں وہ لوگ،اگلے ہفتے کی۔ مجھے تو سوچ سوچ کر ہول اُٹھ رہے ہیں۔اتنے کم دنوں میں ساری تیاری کیسے ہوگی''۔اسے جواب دینے کے ساتھ انہوں نے اپنی فکرمندی کا بھی اظہار کیا۔

''ہو جائے گا سب۔کون سی رخصتی ہو رہی ہے۔صرف نکاح ہی تو ہے۔خواہ مخواہ ٹینشن مت لو''۔انکل نے انہیں سمجھایا تو وہ جواباً ناراضی سے بولیں۔

''تب بھی سو کام ہوتے ہیں۔ ماشاءاللہ اتنا بڑا خاندان ہے۔صرف لوگوں کو انوائٹ کرنا ہی بہت بڑا اور تھکا دینے والا کام ہوگا۔ پھر بازاروں کے چکر الگ لگیں گے''۔ وہ اُلجھ رہی تھیں۔اس وقت تو وہ خاموش رہی تھی،لیکن رات میں جب پھوپھو ہی کے کمرے میں اور بھابھی ان کے ساتھ اسی حوالے سے گفتگو کر رہی تھیں،تب اس نے اپنے آفس سے چھٹی لے لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

''میں تین چار دن کی چھٹی لے لیتی ہوں''۔

''تمہیں مسئلہ تو نہیں ہوگا؟'' پھوپھو کے استفسار پر وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''مسئلہ کیسا۔ویسے بھی اتنے سارے دنوں کی جاب میں،میں نے ابھی تک ایک بھی چھٹی نہیں کی''۔

اور پھر واقعی اس نے چھٹی لے لی تھی۔ثمین اسے جتنی پیاری ہوگئی تھی تو ایسے میں اس کی زندگی کی یہ خوشی اسے اپنی ہی خوشی لگ رہی تھی۔

اس صبح اسے گھر کے حلیہ میں بیٹھا دیکھ کر داؤد نے تعجب سے پوچھا۔

''تمہیں آفس نہیں جانا کیا؟'' تو اس کے جواب سے پہلے ہی پھوپھو اسے اس کی آفس سے چھٹی لے لینے کے بارے میں بتانے لگیں۔ ان کے لہجے میں اس کے لیے محبت تھی۔فخر تھا۔

''دیکھو کتنی اچھی ہے میری بھتیجی۔'' ان کی آنکھوں میں لکھی یہ تحریر اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''تم اس طرح آکر ہم لوگوں کے ساتھ گھل مل گئی ہو دانیا کہ غیریت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ کبھی تمہارے سامنے بات کرتے ہوئے یہ نہیں سوچنا پڑتا کہ یہ غیر ہے، اس کے سامنے یہ بات نہیں کرنی۔ تھوڑا سا تکلف قائم رکھنا ہے''۔

اس روز جب وہ بھابھی کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تو انہوں نے اس سے کہا اور جس پیار سے وہ میرال کے سرخ غرارے کے ساتھ میچ کرتی سرخ چوڑیاں پسند کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے بے ساختہ یہ بات ان کے منہ سے نکلی۔

''میں نے کبھی خود کو غیر سمجھا بھی نہیں بھابھی۔ یہ میری پھوپھو کا گھر ہے''۔ وہ اس کے جواب پر مسکرا دیں۔

''تم امی کی بھتیجی کے بجائے بیٹی لگتی ہو۔ ثمین سے زیادہ تمہاری عادتیں ان کے جیسی ہیں۔ داؤد کا تمہارے بارے میں یہی خیال ہے۔''

ان کی اس بات پر اس کا دل بڑی بے ترتیبی سے دھڑکا تھا۔

''کیا خیال ہے ان کا؟'' بظاہر اس نے لاپروا سے انداز میں پوچھا۔ ایسے جیسے یونہی پوچھ رہی ہو۔

''وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ یہ خاتون کچھ کچھ ہماری امی جیسی نہیں ہیں''۔ وہ جواب دیتے ہوئے مسکرائیں۔

''اس دن جب ہم لوگوں کی شادی کی سالگرہ تھی۔ اس کے بعد دیئے تھے، اس نے یہ کمنٹس۔ بھئی! سچی بات ہے مجھے تو پتا نہیں چلا تھا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو اور ثمین نے تمہیں جان بوجھ کر نہیں بتایا، لیکن داؤد کو معلوم نہیں کس طرح تمہارے جھوٹ کا اندازہ ہو گیا تھا۔ امی کی بھی تو یہی عادت ہے، لڑائی جھگڑے سے انہیں ٹینشن ہوتی ہے، دوسروں کو بہت آسانی سے معاف کر دیں گی۔ ان کی غلطیوں کو چھپا لیں گی، تاکہ جھگڑوں اور بدمزگی سے بچا جا سکے اور تم نے بھی تو اس روز اسی لیے جھوٹ بولا تھا''۔

اپنے لیے یہ تعریفی جملے اسے درحقیقت خوشی کا بہت انوکھا احساس بخش گئے تھے۔ کوئی ہے جو اسے بہت اچھا سمجھتا ہے۔ ساری زندگی اس کے گھر والے اس کی جن عادتوں سے بیزار رہے، یہاں کسی کے لیے وہ سب عادتیں قابلِ ستائش ہیں۔

☆

اس کی امی سے فون پر بات ہوئی تو اس کے پوچھنے سے پہلے ہی انہوں نے ثمین کے نکاح پر اپنے کراچی آنے کا بتایا۔ پھوپھو نے انہیں فون پر بلا وا دیا تو تھا، لیکن اسے یقین نہیں تھا ان کے آنے کا، جبکہ خود اس کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ کراچی آئیں۔ کتنے دن ہو گئے تھے ان سے ملے ہوئے۔ اس کا امی کے ساتھ ویسا تعلق نہیں تھا، جیسا ماں بیٹی کا ہوا کرتا ہے۔ کبھی انہوں نے ساتھ بیٹھ کر ایک دوسرے سے اپنے دکھ سکھ نہیں کہے تھے، لیکن پھر بھی وہ اس کی ماں تو تھیں۔ ان کی بہت سی باتوں سے اختلاف کے باوجود اسے ان سے بہت پیار تھا اور اب تو ابو کی وفات کے بعد سے وہ بہت تبدیل بھی ہو گئی تھیں۔

وہ امی کی آمد کی شدت سے منتظر تھی۔ نکاح سے ایک روز پہلے ہی وہ آ گئیں تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ سب ان سے بہت اچھی طرح ملے تھے، بغیر کسی پرانی بات کا حوالہ دیئے۔ اسے یاد تھا کہ عاصم بھائی کی شادی پر کس طرح ابو کھڑے کھڑے بالکل مہمانوں کی طرح شریک ہو کر فوراً ہی

پنڈی واپس آ گئے تھے۔ تب دولت ان کے گھر کی باندی تھی۔ آج اس کے برعکس تھا۔ دولت کا توازن اُلٹ چکا تھا، لیکن آج جن لوگوں کے پیچھے وہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی، وہ آج بھی ویسے ہی تھے جیسے اس دولت کے بغیر ہوا کرتے تھے۔

اب جب وہ ملیں تو اس نے پھوپھو کی فیملی کی تعریفوں میں زمین آسمان ایک کر دیئے تھے۔

''اتنا آئیڈیل گھر ہے یہ امی! یہاں سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں''۔ وہ اس کی تعریفوں کے جواب میں خاموشی سے مُسکرا دیں۔

انہوں نے اس سے اس بارے میں کچھ کہا تو نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے اندازہ تھا کہ اس کی طرح امی کو بھی یہاں آ کر پہلا قدم رکھتے ہی پچھتاوے کا احساس ہوا ہوگا۔ انہوں نے عاصم بھائی کے ساتھ جلال بھائی کا موازنہ بھی ضرور کیا ہوگا اور اپنے غرور اور غلط فیصلوں پر انہیں ندامت بھی ہوئی ہوگی۔

پھوپھو نے اسے فنکشن کے لیے کپڑے بنا کر دیئے تھے۔ خود ساتھ لے جا کر اسے اس کی پسند کا ڈریس دلوایا تھا۔ یہ اور بات کہ اس پسند میں صرف اس کا نام شامل تھا، ورنہ ڈریس پسند انہوں نے ہی کیا تھا۔ اس کے پسند کے سادہ سادہ سے لباس انہیں اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ ان کا پسند کیا ہوا آف وائٹ لباس اسے بہت بھاری لگ رہا تھا، لیکن انہوں نے اسے ڈانٹ کر چپ کروا دیا تھا۔

''میرا نکاح تھوڑی ہے پھوپھو''۔ انہیں پے منٹ کرتا دیکھ کر وہ منمنائی تو انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''ایسے کپڑے تو لڑکیاں شادی بیاہ میں بڑے شوق سے پہنتی ہیں۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے جو اتنا ہلکا سا کام تمہیں اوور لگ رہا ہے، دیکھنا کتنا سجے گا یہ رنگ تم پر''۔

اور اب جب وہ پھوپھو کا دلوایا یہ لباس پہن کر تیار ہوئی تو سب نے ہی اس کی تعریف کی۔ عام دنوں میں وہ جتنے سادہ سے انداز میں رہا کرتی تھی، اس کے بعد یہ چینج سب کو ہی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ فنکشن کا ارینجمنٹ لان میں کیا گیا تھا۔ امی مہمانوں کی طرح بیٹھی بیٹی کو میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

وہ ثمین کے پاس اسٹیج پر جا رہی تھی، تب درمیان ہی میں بھابھی نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ وہ اپنے ساتھ کھڑی ایک خاتون کا اس سے تعارف کروا رہی تھیں۔

''یہ میری کزن ہیں۔ جرمنی میں رہتی ہیں۔ آج کل پاکستان آئی ہوئی ہیں اور تہمینہ باجی! یہ دانیا ہے، عاصم کی ماموں زاد بہن''۔ اس نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے بڑی خوش اخلاقی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

سلام دُعا کے بعد اس کی چند منٹوں تک ان سے رسمی سی بات ہوئی، پھر وہ معذرت کرتی ثمین کے پاس اسٹیج پر آ گئی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر تصویریں کھنچوا کر اور مووی بنوا کر وہ اسٹیج سے اُتری تو رافعہ داؤد کے ساتھ باتیں کرتی نظر آئی۔

صرف رافعہ ہی کیا، وہاں اس کی کئی کزنز کا داؤد پر فدا ہونے والا انداز تھا۔ چند ایک کو چھوڑ کر اکثریت کا یہی رویہ تھا۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ

''پہلے تو میرا ارادہ نہیں تھا، یہ بات کرنے کا، لیکن یہاں جس طرح میں نے لڑکیوں اور ان کی ماؤں کو داؤد اور آپا کے آگے پیچھے دیکھا تو مجھے اپنا کہہ دینا مناسب لگا۔ کہیں ہم شرما شرمی میں رہ جائیں اور کوئی اور رشتہ دار ہاتھ مار جائے۔ تمہاری پھوپھو تو ہیں ہی سدا کی بے وقوف، جو اچھی طرح مل لے اسی کی گرویدہ۔ اب کم از کم میں نے بات تو ان کے کان میں ڈال دی۔ تمہیں تو ویسے بھی یہاں سب اتنا پسند کرتے ہیں۔ داؤد بھی مجھے ایسا نہیں لگتا کہ تمہیں ناپسند کرتا ہے۔ یہ دونوں بھائی اپنے خاندان کے ساتھ بہت مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں اور اسی لڑکی کو پسند کریں گے جو ان کی فیملی کو اپنا سمجھ کر اور یہاں کی ہر چیز کو اپنا کر رہے گی اور تم نے تو اتنے عرصے میں خود کو ایسا ہی ثابت کیا ہے۔ ایسی کوئی اور لڑکی انہیں کہیں اور ملے گی بھی کہاں۔ جس میں بیک وقت اتنی ساری خوبیاں ہوں۔ شکل وصورت میں تم لاکھوں میں ایک ہو۔ عادتوں اور مزاج سے وہ تمہارے واقف ہیں اور اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ کمی کس چیز کی ہے، تم میں؟ اب کیا میں بیٹھ کر اس بات کا انتظار کرتی کہ رشتہ وہ دیں۔ آج کل کا دور اسی طرح کا ہے۔ بیٹیوں کے اچھی جگہ رشتے طے کرنے کے لیے ماؤں کو بہت ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کر قسمت کا بند دروازہ کھلتا ہے''۔

وہ گم صم سکتے کی کیفیت میں ایک ٹک انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس کی گم صم سی کیفیت سے لاتعلق اپنے صحیح موقع پر صحیح بات کر لینے پر نازاں نظر آ رہی تھیں۔

''ابھی ان کے کمرے میں بیٹھی میں ان سے یہی سب باتیں تو کر رہی تھی۔ کل رات میں نے عاصم سے عادل کی جاب کے بارے میں بھی بات کی ہے۔ آخری سمسٹر ہے اس کا۔ اچھی سے اچھی پوزیشن کے ساتھ بھی ایم بی اے کر لے، تب بھی نوکریاں اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہیں۔ کوئی کیریئر والی جاب ہو، جس میں ترقی اور کامیابی کے امکانات ہوں۔ عاصم اور داؤد کے بہت کونیکشنز ہیں۔ مجھے اس نے انکار بھی نہیں کیا۔ کہہ رہا تھا کہ پوری کوشش کرے گا، عادل کی جاب کے لیے۔

پھر میں سوچ رہی ہوں کہ اگر عادل کی جاب کراچی میں ہوگی تو میں بھی گھر بیچ کر یہیں شفٹ ہو جاؤں۔ تمہاری شادی بھی یہیں ہوگی''۔ وہ اتنی خوش تھیں کہ اس خوشی میں انہیں اس کا اُجڑا ہوا دھواں دھواں چہرہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

''آپ بالکل نہیں بدلیں امی! آپ بالکل بھی نہیں بدلیں۔ آپ آج بھی وہی ہیں، بالکل ویسی ہی۔ ہر کام Calculate کر کے کرنے والی۔ نفع نقصان کا حساب کتاب کر کے''۔

وہ خاموش کھڑی ویران نگاہوں سے ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ سامنے بیٹھی عورت اس کی ماں تھی۔ وہ ان سے لڑ نہیں سکتی تھی۔ انہیں کوئی تلخ بات نہیں کہہ سکتی تھی۔ ان سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی۔

''آپ نے کیا مجھے یہاں بھیجا ہی اس لیے تھا۔ آپ کو پتا تھا آپ کی بیٹی ان لوگوں کے دِلوں سے تمام بدگمانیاں دور کر دے گی۔ آپ کی بچھائی بساط پر میں ایک مُہرہ تھی۔ آپ نے سب چالیں سوچ سمجھ کر چلیں۔ سب فائدہ نقصان ذہن میں رکھ کر''۔ اس کا پورا وجود سراپا احتجاج بنا ہوا تھا۔ وہ شکوہ بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کزن جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بڑے شاندار سے عہدے پر کام کر رہا ہے۔ بہت زبردست قسم کی سیلری وصول کر رہا ہے اور سب سے بڑھ کر ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔ سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ لڑکیوں کا اس کے ساتھ پوز کر کر کے باتیں کرنا اور بہانے بہانے سے اپنی طرف متوجہ کروانے والا اسٹائل اسے بہت بُرا لگ رہا تھا۔

فنکشن ختم ہونے پر جب سب مہمان چلے گئے تو وہ فوراً ہی اس لباس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اوپر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اور داؤد اُتر رہا تھا۔ اسے بہت تیزی میں دیکھ کر وہ چڑھنے کے لیے راستہ دیتا خود ایک طرف ہو گیا تھا۔ وہ اس کے قریب سے گزری تو ایک سرگوشی نما آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''یہ رنگ اکثر پہنا کرو''۔ اسے ایسا لگا، اس کا دِل اب سے پہلے کبھی اس رفتار سے نہیں دھڑکا تھا۔ بغیر رُکے وہ اوپر تو چڑھ گئی تھی۔ اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تک نہیں تھا، لیکن خود ابھی تک جیسے عالمِ حیرت میں تھی۔

فنکشن کے دوران ایک بار بھی اس نے اس کی خود پر نظریں محسوس نہیں کی تھیں۔ ایک بار بھی ایسا نہیں لگا تھا کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہے اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس بات پر اسے دُکھ بھی ہو رہا تھا کہ آج سب نے اسے سراہا ہے، لیکن جہاں سے سراہے جانے کی اسے خواہش تھی، وہاں سے ایک نگاہ تک اسے نہیں ملی۔

کمرے میں آ کر اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو ہموار کرتی، وہ کتنی دیر تک اس لمحہ کی گرفت میں رہی۔ کتنا وقت گزر گیا تھا اسے یونہی بیٹھے، اس بات کا اسے خود احساس نہیں تھا۔

''تم نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے''۔ امی کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ انہیں دیکھ کر شرمندہ سی ہوتی کھڑی ہو گئی۔

''جی بس اُٹھ ہی رہی تھی، کپڑے بدلنے کے لیے''۔ وہ اس کا جواب بے توجہی سے سنتی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی ہو کر جیولری اُتارنے لگی۔

''کیا بات ہے امی! بہت خوش نظر آ رہی ہیں آپ؟'' شیشے میں اسے ان کا مطمئن اور خوش باش چہرہ نظر آیا تو جھٹ سے پوچھا۔

''خوشی کی بات جو ہے۔ میں نے تمہاری پھوپھو سے تمہارے اور داؤد کے رشتے کے بارے میں بات کی ہے اور انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ تم انہیں بہت پسند ہو۔ بس وہ داؤد اور وقاص بھائی سے اس بارے میں بات کر لیں، پھر مجھے فائنل جواب دیں گی اور فائنل جواب ظاہری بات ہے، ہاں ہی ہوگا۔ سب تمہیں پسند کرتے ہیں، یہاں پر''۔ کانچ کی چوڑی بہت زور سے اس کی کلائی میں چبھی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' وہ اس ٹوٹی چوڑی اور خون نکلنے کی تکلیف پر توجہ دیئے بغیر مُڑ کر ان کے پاس آ گئی تھی۔

''کیا بات کی ہے آپ نے پھوپھو سے؟'' شاید اس نے کچھ غلط سنا تھا۔ امی شاید کچھ اور بات کہہ رہی تھی، وہ شاید بات سمجھی نہیں تھی۔

''کیا ہو گیا تمہیں۔ اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو۔ میں نے تمہارے رشتے کی ہی تو بات کی ہے۔ اس میں غلط کیا ہے۔'' وہ ناراضی اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

امی اس کی خاموشی پر دھیان دیئے بغیر واش روم میں چلی گئی تھیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کل وہ اس گھر کے مکینوں کا سامنا کس طرح کرے گی اور وہ شخص جو اس کی خوبیوں کا معترف ہے۔ اسے اپنی ماں کی جیسی عادتیں رکھنے والی شخصیت قرار دیتا ہے۔ کل وہ اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لے گا۔ یہ سب ان ماں بیٹی کی چالاک ذہنیت تھی۔ سب کچھ ان کے پلان کا حصہ تھا۔

اسے اپنا کیا ایک ایک کام یاد آ رہا تھا۔ وہ سب جو اس نے خلوص اور محبت میں کیا تھا، لیکن جسے اب مکاری اور اپنی اداؤں کے جال میں پھنسانا قرار دیا جائے گا۔ وہ اب کیونکر کسی کو یقین دلا پائے گی کہ میں کوئی ڈرامہ نہیں کر رہی تھی۔ میں یہ ضرور چاہتی تھی کہ آپ سب لوگ مجھے اپنا سمجھیں، اچھا سمجھیں، لیکن یہ میری ایک سادہ اور معصوم سی خواہش تھی۔ اس کے پیچھے کوئی مقاصد نہیں تھے۔ اس نے نادانستگی میں، وہ سب کیا جو امی چاہتی تھی۔ تب تو داؤد نے ایسا کچھ نہیں سوچا ہوگا، لیکن اب جب پھوپھو اسے سب کچھ بتائیں گی تو ضرور سوچے گا اور اب جب وہ اس بارے میں سوچے گا تو وہ اس کے سامنے کس طرح کی لڑکی ثابت ہوگی۔ اپنی بھولی بھالی اور معصوم شکل کو وہ کس کس طرح استعمال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اپنے اس حسین چہرے سے گھن آئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس خوب صورت چہرے پر تیزاب پھینک دے۔ تاکہ یہ اس قابل نہ رہے کہ اس کی خوب صورتی کو کیش کروایا جا سکے۔

اسے یاد آیا، ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ داؤد کی کزنز کو اس کے آگے پیچھے پھرتا دیکھ کر بڑے تمسخرانہ انداز میں ہنسی تھی اور انہیں حقارت اور تمسخر سے دیکھتے وقت وہ اپنی طرف دیکھنا بھول گئی تھی۔ اس کی وہ سب کزنز دانیا ظفر سے بہت بہتر تھیں، اس سے لاکھ گنا بہتر۔ وہ صرف اسے پسند ہی تو کر رہی تھیں۔ ان کی خواہش یہی تو تھی کہ یہ خوبرو بندہ ہمیں مل جائے، لیکن اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے انہوں نے کوئی گیم نہیں کھیلا تھا۔ کوئی پلاننگ نہیں کی تھی۔ خود کو بہت اچھا بنا کر اس کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ ان میں سے کسی کی ماں نے دکان داری نہیں کی تھی، جبکہ اس کی ماں نے دکان داری ہی تو کی تھی۔ بیٹی کی خوبیاں گاہک کے سامنے رکھ کر۔ اس کی چمک دمک دکھلا کر۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں خود کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

☆

امی نے غصے کے اظہار کے طور پر صبح اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ خود بھی بالکل خاموش تھی۔ داؤد انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے جا رہا تھا۔ وہ بہت مشکلوں سے خود کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لائی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ایک دم بالکل بے وقعت اور حقیر ہوگئی ہے۔ اس میں پھوپھو کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ داؤد کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا، لیکن پھر بھی وہ ان سب کا سامنا کر رہی تھی۔ داؤد نے ایک بار بھی براہِ راست اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس سے نظریں ملائے بغیر امی کو پورچ میں ہی خدا حافظ کہہ کر وہ پھوپھو کے ساتھ واپس اندر آ گئی تھی اور پھر ان سے تھکن کا بہانہ بنا کر دوبارہ کمرے میں چلی گئی۔

اس کا کمرے سے باہر نکلنے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ کہیں غائب ہو جائے۔ دوبارہ ان سے کبھی بھی نہ ملے، لیکن جو وہ

سوچ رہی تھی، ایسا ہونا ناممکن تھا۔ کہیں چلے جانا اور غائب ہو جانا اس کے بس سے باہر کی باتیں تھیں۔ ثمین اسے لنچ کے لیے بلانے آئی تھی۔

''مجھے بھوک نہیں لگ رہی ثمین''۔ اس سے نظریں چراتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔

''بھوک کیسے نہیں لگ رہی۔ خوشی میں میری بھوک ختم ہو جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ آپ کی بھوک کو کیا ہوا ہے''۔ اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیا۔

''صرف سویٹ ڈش کھا لیجئے گا۔ چلیں تو سہی۔ سب انتظار کر رہے ہیں کھانے پر''۔ وہ اسے کمرے سے گھسیٹ لائی۔

وہ ثمین کے ساتھ آ کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے سب ہی آپس میں کل کے فنکشن کے حوالے سے کچھ نہ کچھ گفتگو کر رہے تھے۔ وہ سر جھکائے اپنی پلیٹ میں چمچ چلا رہی تھی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے دانیا؟'' پتا نہیں اس کے چہرے پر ایسی کیا چیز نظر آئی تھی جس نے پھوپھو کو یہ سوال کرنے پر مجبور کیا تھا۔

''جی پھوپھو''۔ اس نے مختصر جواب دیا۔

''ہاں کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی ہے دانیا۔ میرا خیال ہے کل کی تھکن کا اثر ہے''۔ انکل نے پھوپھو سے کہا تو ثمین ایک نظر اس پر ڈال کر ان سے بڑے شوخ اور شگفتہ سے انداز میں بولی۔

''تھکن نہیں ہے پاپا! اصل میں کل یہ خوب صورت بہت لگ رہی تھیں۔ ضرور کسی کی نظر لگی ہے انہیں۔'' انکل ثمین کے کمنٹس پر مُسکرائے تھے۔ وہ خود کو موضوعِ گفتگو بنتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ خود پر خوش گفتاری اور خوش اخلاقی کا ملمع چڑھا کر روزانہ کی طرح سب سے باتیں کرے۔

کھانے کے بعد پھوپھو نے اس کے کمرے میں آ کر دوبارہ اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ اپنی بیماری چھپا رہی ہے۔ ان کی تشویش اور محبت اس کی آنکھوں میں آنسو لے آئے تھے۔

''پھوپھو! میں آپ کی بیٹی کیوں نہیں؟ کاش میں آپ کی بیٹی ہوتی۔ یا پھر میری امی آپ کے جیسی اچھی ہوتیں۔ میں خود اپنی نظروں سے گر گئی ہوں پھوپھو! خود سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی''۔ اس کا دِل چاہا کہ وہ ان کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر روئے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں پھوپھو''۔ چہرے پر بڑی مشکلوں سے تھوڑی سی مُسکراہٹ لاتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔

☆

شام میں وہ بھابھی اور ثمین کے ساتھ لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ داؤد نے باہر آ کر بھابھی کو ان کا فون آنے کی اطلاع دی اور پھر فوراً ہی واپس مڑ گیا۔ اس کے انداز میں بہت عجلت تھی۔ بھابھی فون سننے چلی گئی تھیں۔ ثمین اس کے ساتھ کل کا فنکشن ڈسکس کرنے میں مصروف تھی۔ اسے ثمین کی باتوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بہت بے دلی سے وہ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ بھابھی کافی دیر بعد واپس آئیں۔

''ثمین کا خیال صحیح تھا۔ تمہیں واقعی نظر لگی ہے اور یہ نظر کس کی تھی، یہ ابھی ابھی مجھے پتا چلا ہے''۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اسے

مخاطب کیا، بہت شرارتی سے انداز میں۔

''آپ کا انداز بڑا مشکوک سا ہے بھابھی! صاف صاف بتائیں کس کا فون تھا؟'' ثمین نے بے تابی اور بے صبری سے پوچھا تو وہ اس کی بے تابی پر مُسکراتی ہوئی گویا ہوئیں۔

''تمہینہ باجی کا تھا۔ انہیں عثمان کے لیے ہماری دانیا دِل و جان سے پسند آ گئی ہے۔ ماتھا تو خیر میرا کل ہی ٹھنکا تھا، جب انہوں نے بڑی دلچسپی سے دانیا کے بارے میں مجھ سے پوچھا تھا۔ پھر خود ہی مجھ سے اصرار کر کے اس سے تعارف حاصل کرنا چاہا تھا''۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں یاد ہے نا دانیا! کل میں نے تمہیں ایک خاتون سے اپنی کزن بتا کر تعارف کروایا تھا۔ گرین ساڑھی پہنی ہوئی تھی انہوں نے۔'' انہوں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی اور اسے کیونکہ پہلے ہی یاد آ چکا تھا، اسی لیے فوراً سر ہلایا۔

''دانیا آپی کو بعد میں یاد دِلاتی رہیے گا۔ پہلے مجھے ساری بات بتا دیں۔ کیا کہہ رہی تھیں وہ۔ تفصیل سے بتائیں''۔

ثمین کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ثمین اور بھابھی کی خوشی اور گرم جوشی دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ انہیں ابھی تک پھوپھو نے کچھ نہیں بتایا۔

''اب کی بار وہ پاکستان آئی ہی اس ارادے سے تھیں۔ بڑی فکر ہے انہیں بھائی کی شادی کی۔ عثمان نے بھی تو لڑکی پسند کرنے کا اختیار کلی طور پر بہن کو دے رکھا ہے''۔

بھابھی ثمین سے کہہ رہی تھی، اس کی خاموشی محسوس کی تو ثمین سے گفتگو موقوف کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''برلن میں رہتی ہیں تہمینہ باجی۔ ان کے شوہر کی وہیں جاب ہے۔ بس دو ہی بہن بھائی ہیں، تہمینہ باجی اور عثمان۔ والدین کا ان کے کئی سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔ اب کراچی میں عثمان اکیلا ہی رہتا ہے۔ بہت اچھا سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ''۔ اس کی خاموشی کا انہوں نے یہی مطلب لیا کہ شاید وہ ہچکچا رہی ہے، اس لیے از خود ہی اسے تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے لگیں۔

''آپ نے انہیں کیا جواب دیا؟'' اس سے پہلے کہ وہ دانیا کو مزید ہسٹری سنانا شروع کرتیں، ثمین نے پوچھا۔

''ایسے میں کیا جواب دیتی۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ میں امی سے بات کر لوں۔ امی، ممانی اور دانیا سے پوچھ لیں۔ اگر سب کو یہ رشتہ پسند آتا ہے تو پھر آپ باقاعدہ پرپوزل لائیے گا''۔

''کل فنکشن میں آیا تھا نا عثمان بھائی!'' ثمین نے بھابھی سے پوچھا۔

''ہاں آیا ہوا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ یہ نظر بہن صاحبہ کی تھی یا بھائی کی، جو ہماری سویٹ سی دانیا کو اتنی بُری طرح لگی ہے۔ دیکھو کیسی چپ چپ اور اُداس سی لگ رہی ہے۔'' بھابھی کا جواب حسبِ توقع شوخ سا تھا۔

''اب آپ یقیناً یہ جاننا چاہ رہی ہوں گی کہ موصوف دیکھنے میں کیسے ہیں؟'' ثمین نے اس کی طرف جھک کر رازداری سے دریافت کیا۔

''بے چاری مشرقی لڑکی شرما رہی ہے۔ چلیں میں خود ہی بتا دیتی ہوں، بلکہ میرا خیال ہے بھابھی بتا دیں۔ آخر ان کے کزن صاحب ہیں۔ انہیں ان کی ہائٹ ناک نقشہ سب ازبر ہوگا''۔

ثمین اس وقت مکمل طور پر شرارتی موڈ میں تھی۔ بہت خوش گوار سے انداز میں اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی، وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔

رات کا کھانا بغیر بھوک کے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا، اس نے۔ کھانے کے فوراً بعد وہ کمرے میں آ گئی تھی۔

بھابھی کی کزن شاید بہت ہی جلدی میں تھیں۔ اگلے روز صبح صبح ہی ان کا دوبارہ فون آ گیا تھا۔ اس بار پھوپھو نے ان سے بات کی تھی۔ اس وقت لاؤنج میں صرف وہ اور پھوپھو ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی گفتگو کے دوران وہ وہیں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ پھوپھو نے انہیں ہاں کہی تھی نہ ناں، بلکہ اپنی بھاوج سے پوچھ کر جواب دینے کی بات کہی تھی۔ وہ فون بند کر چکیں تو وہ اُٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔

''آپ کو یہ رشتہ کیسا لگ رہا ہے پھوپھو؟'' انہوں نے اس سوال پر تعجب سے اسے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے بھابھی تو بہت تعریف کر رہی تھیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟'' اس کا انداز بے جھجک سا تھا۔ انہیں ایک پل کے لیے تو اس کا خود اپنے رشتے کے بارے میں اس طرح بات کرنا پسند نہیں آیا، پھر فوراً ہی اپنی سوچ کو فرسودہ اور پرانے زمانے کی قرار دے کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''عثمان بہت اچھا لڑکا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ جاب بھی اس کی بہت اچھی ہے۔ عادت کا بھی اچھا ہی لگتا ہے۔ ویسے عادتوں کا صحیح سے پتا تو اسی وقت چلتا ہے جب کسی سے رشتہ جوڑا جاتا ہے، لیکن بظاہر اس میں کوئی خرابی نہیں''۔ انہوں نے اسے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تمہاری کیا مرضی ہے؟ تمہیں کیسا لگا یہ رشتہ؟''۔ انہوں نے اس کی دلچسپی اس رشتے میں محسوس کر لی تھی۔ اسی لیے اسے کریدا۔

''پھوپھو شادی کبھی نہ کبھی تو کرنی ہی ہوتی ہے۔ مجھے یہ رشتہ اچھا لگ رہا ہے۔ لمبی چوڑی سسرال میں میرا گزارا نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو نند، دیور اور جیٹھ، جٹھانی وغیرہ کے نام سن کر ہی کوفت ہونے لگتی ہے۔ ساری زندگی رشتے نبھاتے رہو اور یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اگر آپ کہہ رہی ہیں کہ باقی سب کچھ ٹھیک ہے تو پھر میرا ووٹ اسی رشتے کی طرف ہے''۔

وہ حیرت سے اس کی بات سن رہی تھیں۔ انہیں شاید یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ رشتوں سے بیزاری کا یہ اظہار دانیا کر رہی ہے۔ جو یہاں سب کے ساتھ اتنی محبت سے رہتی رہی تھی۔

''آپ لوگوں کی بات دوسری ہے۔ آپ لوگ کوئی میرے سسرال والے تھوڑی ہیں۔ آپ لوگوں سے محبت اس وجہ سے ہے کہ آپ میری پھوپھو ہیں اور باقی سب آپ کے حوالے سے عزیز ہیں، لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں پھوپھو! مجھے سسرالی جھمیلوں سے اُلجھن ہوتی ہے، وہاں پنڈی میں بجو کی اتنی لمبی سسرال ہے۔ وہ سسرالی رشتے نبھا نبھا کر ختم ہو گئی ہیں۔ بجو کا حال دیکھ کر ہی میری یہ خواہش ہے کہ مجھے زیادہ لوگوں میں نہ رہنا پڑے''۔

وہ ان کے چہرے پر پھیلی حیرت کو بھانپتے ہوئے خود ہی اپنے رویوں کی وضاحت کرنے لگی۔ ''ویسے تو کبھی نہ کبھی مجھے کراچی سے واپس پنڈی جانا ہی پڑ جاتا۔ اب اگر میری شادی کراچی میں ہو گئی تو میں آپ کے قریب ہی رہوں گی۔ آپ سے جلدی جلدی مل سکوں گی۔ بس آپ ان

سے یہ کہہ دیجئے گا کہ شادی میں کم از کم ایک سال بعد کروں گی۔ ابھی عادل کی جاب کا مسئلہ ہے۔ تب تک تو شہود کی پڑھائی اور گھر کے اخراجات کا مجھے ہی سوچنا ہے''۔

وہ بہت دوستانہ سے انداز میں ان سے ساری باتیں ڈسکس کر رہی تھی۔ اس کے یہ بات شروع کرنے پر جو انہیں بے باکی اور بدلحاظی کا احساس ہوا تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ انہیں ایسا لگا کہ وہ انہیں اپنا دوست سمجھ کر بالکل اسی طرح باتیں کر رہی ہے، جس طرح انسان دوستوں کے ساتھ کیا کرتا ہے اور دوست بزرگ بن کر نصیحتیں نہیں کیا کرتے۔ اس کی بھی وہی خواہش ہے جو اکثر لڑکیوں کی ہوا کرتی ہے۔ بس میں اور میرا شوہر۔ کوئی تیسرا فرد انہیں اپنے درمیان دیکھنا منظور نہیں ہوتا۔ اپنے گھر میں بہت سے بہن بھائیوں کے ساتھ خوشی خوشی محبت سے رہ لیں گی، لیکن سسرال میں دو تین افراد بھی انہیں بڑا خاندان اور وبالِ جان نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی خامی کا خود ہی اعتراف کر رہی تھی۔ وہ اسے کیا ٹوکتیں۔

''ہم لوگ تو تمہارے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رہے تھے، لیکن خیر اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں پنڈی فون کر کے نگین سے اس بارے میں بات کر لوں۔ پھر ہی تہمینہ کو کوئی جواب دیا جائے گا''۔ وہ آہستگی سے کہتی ہوئیں اس کے پاس سے اُٹھ گئیں۔ نہ اس نے پوچھا نہ انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ اس کے بارے میں ''کچھ اور'' کیا سوچ رہے تھے۔

اسے پھوپھو کی مروّت برتنے والی اس ادا پر ہنسی آئی، جو سوچ صرف اس کی ماں کی تھی، اس میں خود کو بھی شامل کر کے انہوں نے اسے فردِ واحد کی سوچ سے بدل کر دو لوگوں کی سوچ میں تبدیل کر لیا تھا۔

اس سے قبل کہ پھوپھو پنڈی فون کرتیں، اس نے خود امی کو فون کر لیا۔ بہت سنجیدگی سے اس نے انہیں اپنے لیے آئے، اس رشتے کے بارے میں بتایا۔

''کیا جاب کرتا ہے ردا کا کزن؟'' وہ ان کے سوال کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ وہ بندے کی حیثیت، مرتبے اور مالی پوزیشن کا اندازہ کرنا چاہتی تھیں، اگر اس کا اسٹیٹس پھوپھو کی فیملی سے اونچا ہے تو وہ ایک پل کے لیے بھی یہ بات نہیں سوچیں گی کہ ابھی دو روز پہلے وہ نند سے اس کے بیٹے کا رشتہ مانگ چکی ہیں اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس دوسرے رشتے کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گی۔ ایک طنزیہ مُسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری تھی، ان کا یہ سوال سن کر۔

''بہت اچھی جاب ہے اس کی۔ سیلری بھی بہت اچھی ہے، لیکن داؤد کے ساتھ اگر مقابلہ کیا جائے تو شاید اس سے آدھی تنخواہ ہوگی۔ تنخواہ کے ساتھ دیگر مراعات بھی اتنی شان دار نہیں جتنی داؤد کو میسر ہیں۔ پوسٹ بھی اس کے جتنی اونچی نہیں ہے۔ ملکوں ملکوں گھومنے کے وہ مواقع بھی نہیں جو داؤد کو حاصل ہیں۔ سوشل سرکل بھی داؤد کے جتنا وسیع نہیں اور تاجروں، صنعت کاروں اور اعلیٰ افسروں کے ساتھ کونیکٹس بھی داؤد کے جیسے نہیں۔ مختصراً یہ کہ داؤد کے ساتھ مقابلے میں ہر معاملے میں اس کے مارکس داؤد سے کم آئیں گے، لیکن اس کے باوجود میں اس رشتے کے حق میں ہوں اور یہ رشتہ اگر کسی وجہ سے نہیں بھی ہو سکا، تب بھی داؤد وقاص کے ساتھ، میں کبھی بھی اور کسی بھی قیمت پر شادی نہیں کروں گی۔ میں دُنیا کے کسی بھی مرد کے ساتھ شادی کر لوں گی، مگر اس کے ساتھ نہیں اور یہ میرا اٹل فیصلہ ہے''۔

اس کا انداز اتنی قطعیت لیے ہوئے تھا کہ وہ جواب میں کچھ بول ہی نہیں سکی تھیں۔ اس کے لہجے میں ضد تھی، سرکشی تھی، من مانی تھی۔ ایسے جیسے اب وہ کسی کی کوئی بات نہیں مانے گی۔ ان سے بات کرنے کے بعد کتنی دیر تک وہ چاپ چاپ بیٹھی رہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے ان کے ساتھ اس لہجے میں بات کی تھی۔ اس وقت وہ خاموش بیٹھی اپنے لہجے کی بدصورتی پر افسردہ ہو رہی تھی۔

☆

پھوپھو کی امی سے رات میں بات ہوئی تھی۔ اسے یہ تو نہیں معلوم تھا کہ ان کی امی سے کیا بات ہوئی ہے، لیکن اس نے انہیں اگلے روز تہمینہ باجی کو فون کرتے ضرور دیکھا تھا۔ انہوں نے تہمینہ باجی کو باقاعدہ رشتہ لے کر آنے کی دعوت دی تھی۔ ساتھ میں عثمان کو بھی بلایا تھا۔ شاید وہ یہ چاہتی تھیں کہ دانیا، عثمان کو دیکھ لے۔ شام میں وہ میرال کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی، جب داؤد بڑے غصیلے موڈ میں وہاں آیا۔

''تمہارے امتحان سر پر ہیں اور تم بجائے پڑھنے کے بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہی ہو''۔ اس نے درشتی سے میرال سے کہا۔

اس نے اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر ایک نظر اس پر اور پھر ایک نظر میرال پر ڈالی جو ہمیشہ دوستوں کی طرح رہنے والے چاچو کو بلاوجہ غصے میں آتا دیکھ کر سہم گئی تھی۔ ڈانٹ کھا کر رونے والی شکل بنائے وہ وہاں سے اُٹھ گئی تو وہ خود وہیں بیٹھ گیا اور اس کے پاس پڑا ریموٹ کنٹرول اُٹھا کر چینل بدل دیا۔

''الہ دین اور اس کے جادوئی چراغ کی کہانی دیکھنے کی عمر، میں عرصہ ہوا گزار چکا ہوں''۔ اسکرین پر نظریں مرکوز کیے یہ طنزیہ جملہ بولا گیا تھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیئے خاموشی سے وہاں سے اُٹھ گئی۔

سیڑھیوں کی طرف جاتے اسے ریموٹ کے بہت زور سے پٹخے جانے اور پھر ٹی وی بند کیے جانے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر اس طرف نہیں دیکھا تھا۔

پھر رات گئے تک وہ اسے اسی چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتا نظر آیا۔ سب سے زیادہ شامت ثمین میرال اور شارم کی آئی ہوئی تھی۔ جن کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ اس سے عمر میں چھوٹے تھے۔ بات بے بات اس نے کئی بار ثمین کو میرال کو جھڑکا تھا۔

''آپ کو کیا ہوا ہے داؤد بھائی؟'' ثمین نے آخر ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''کیا ہوا ہے مجھے؟'' وہ آنکھیں نکالے برہم سے انداز میں بولا۔

''لگتا ہے آج آفس میں کسی سے لڑائی ہوئی ہے اور اس کا غصہ گھر والوں پر اُتارا جا رہا ہے۔ اتنے تلخ اور بدمزاج ہو رہے ہیں۔ جو ڈش آج بھابھی نے پکائی ہے بالکل اسی جیسے''۔ ثمین نے سامنے باؤل میں رکھے قیمہ بھرے کریلوں کی طرف اشارہ کیا تو عاصم بھائی اس کی تشبیہ پر مسکرا دیئے، جبکہ وہ مزید غصے میں آ گیا۔

کھانے کی میز پر اس وقت عاصم بھائی، ثمین، داؤد اور دانیا موجود تھے۔ باقی لوگ ابھی کھانے کی میز پر نہیں آئے تھے۔

''ہاں پاگل ہو گیا ہوں میں۔ بلاوجہ غصہ آ رہا ہے مجھے''۔ وہ ایک جھٹکے سے کرسی سے اُٹھا اور پیر پٹختا ڈائننگ روم سے نکل گیا۔ پیچھے ثمین

اسے آواز دیتی رہ گئی تھی۔

''میں نے تو یونہی مذاق کیا تھا۔ داؤد بھائی ناراض ہو گئے''۔ اسے بھائی کا بغیر کھانا کھائے اُٹھ جانا بہت تکلیف پہنچا رہا تھا۔ وہ فوراً ہی اس کے پیچھے گئی تھی۔ اسے منانے اور واپس بلانے کے لیے لیکن اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ روزانہ کی طرح رات میں پھوپھو کے کمرے میں ان کے ساتھ باتیں کرنے کے ارادے سے آئی تو داؤد ان کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ ان کے پاس بیڈ پر بیٹھا وہ بڑے رازدارانہ اور خفیہ انداز میں کوئی بات کر رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر وہ یک دم ہی لب بھینچ کر بالکل خاموش ہو گیا۔ پھوپھو نے اسے بیٹھنے کی آفر کی، لیکن ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اس وقت وہ کوئی بہت ضروری بات کر رہے ہیں اور اس نے انہیں ڈسٹرب کر دیا ہے۔ اس نے انکار کیا تو انہوں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ کمرے میں واپس آ کر وہ آنے والے دن کے بارے میں سوچنے لگی۔

کل پھوپھو نے رات کے کھانے پر تہمینہ باجی کو انوائیٹ کر رکھا تھا۔ ان کے انداز سے تو یہ لگ رہا تھا کہ وہ کل ہی ہاں کروا کر جائیں گی۔

اگلے روز اس نے آفس کی چھٹی کی تھی۔

آج کی دعوت اس کے ہونے والے سسرالیوں کی تھی۔ پھوپھو تو عام مہمانوں کے لیے بھی بہت مہمان نواز خاتون ثابت ہوئی تھیں تو پھر بھتیجی کے سسرالیوں کے لیے تو انہوں نے لازمی بہت شاندار سے ڈنر کا اہتمام کرنا تھا۔ پھوپھو اور بھابھی دن بھر لگ کر اس کے سسرالیوں کی خاطر مدارت کا اہتمام کریں اور وہ شان بے نیازی سے آفس چل دے۔ اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی، اس لیے آفس سے چھٹی کر لی تھی۔ پھوپھو نے اسے آفس کے لیے تیار نہ ہوتا دیکھ کر استفسار کیا تو اس نے انہیں اپنی چھٹی کا بتا دیا۔

''لیکن وہ لوگ تو آج نہیں آ رہے''۔ ان کا جواب اسے حیران کر گیا۔

''کیوں؟''

میں نے ہی رات تہمینہ کو آج کے لیے معذرت کی تھی۔ اصل میں آج مجھے کچھ کام ہے''۔ انہوں نے جواب دیا۔

''پھر کب آئیں گے اب وہ لوگ؟'' ابھی اس کا سوال مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ داؤد کچن میں آ گیا۔

''بہت بے قراری ہے شادی کرنے کی۔'' عجب تمسخرانہ انداز میں اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ اسے آتا دیکھ کر ہی جھنجھلا گئی تھی۔ مزید کسر اس کے جملے نے پوری کر دی تھی۔ پھوپھو نے بیٹے کو گھور کر دیکھا، لیکن وہ ان کے گھورنے کی پروا کیے بنا فریج میں سے کچھ نکالنے لگا تھا۔

''اب شاید کل آئیں گے وہ لوگ''۔ دانیا کے چہرے پر پھیلتی ناگواری اور غصہ دیکھ کر انہوں نے رسانیت سے جواب دیا۔ وہ ان سے مزید کوئی سوال جواب کیے بغیر کچن سے نکل گئی تھی، جبکہ وہ ہنوز کچن میں کھڑا پانی پیتے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''شاید کل آئیں گے''۔ باہر نکل کر اس نے پھوپھو کا جواب دہرایا۔

''یہ شاید کیا ہوتا ہے؟'' وہ اُلجھی۔

''آئیں گے یا نہیں آئیں گے، ان دو باتوں کے بیچ یہ شاید کہاں سے ٹپک پڑا''۔

شام تک وہ اسی بات پر اُلجھتی رہی تھی۔ ثمین کو ندا سے کوئی کام تھا۔ وہ کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی تھی، اکثر پڑھائی کے حوالے سے ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت پڑ جایا کرتی تھی۔

''چچا کے گھر جا رہی ہوں میں، آپ چلیں گی، میرے ساتھ؟'' ثمین نے اس سے پوچھا تھا۔ چچا کا گھر قریب ہی تو تھا لیکن شاید اس وقت ہلکا ہلکا سا اندھیرا پھیلتا دیکھ کر وہ اکیلے جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ ثمین کے ساتھ جانے کے لیے اُٹھ گئی تھی۔ چچا کے گھر پہنچ کر ثمین تو ندا کے ساتھ مصروف ہوگئی، جبکہ وہ سحر اور چچی کے ساتھ باتیں کر کے ثمین کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

ابھی انہیں آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اسے داؤد اندر آتا نظر آیا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر وہ وہیں لاؤنج میں ہی فواد کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ بیچ بیچ میں چچی اور سحر سے بھی اس کی ہلکی پھلکی گفتگو جاری تھی۔ چچی نے اسے سحر کے کسی رشتے کے بارے میں بتایا تو وہ اس سے بولا۔

''اچھا تمہیں بھی شادی کی جلدی ہو رہی ہے''۔

''یہ بھی کا کیا مطلب ہے داؤد بھائی اور کس کس کو جلدی سے شادی کی''۔ فواد نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''یہی آج کل کی لڑکیوں کو اور کس کو، جسے دیکھو جلد سے جلد شادی کروانے کے شوق میں مبتلا ہے۔ پہلے لڑکیاں اپنے شادی بیاہ کے ذکر پر شرما جایا کرتی تھیں، اب تو وظیفے پڑھ پڑھ کر جلدی سے شادی ہو جانے کی دُعائیں مانگا کرتی ہیں''۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ فواد بھی اس کے کمنٹس پر ہنسنے لگا تھا، جبکہ سحر ان جملوں کا بُرا مان گئی تھی۔

''میں نے کوئی وظیفہ نہیں پڑھا اور نہ ہی مجھے شادی کا کوئی شوق ہے''۔

وہ کچھ دیر تو یہ باتیں برداشت کرتی رہی، مگر پھر یہ سوچ کر کہ جب تک وہ یہاں بیٹھی رہے گی، وہ اسی پر اس طرح طنزیہ فقرے اُچھالتا رہے گا، گھر واپسی کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''تمہیں تو ابھی دیر لگے گی۔ میں چلتی ہوں''۔ وہ نسبتاً الگ تھلگ سے صوفے پر ندا کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھی ہوئی ثمین سے مخاطب ہوئی اور پھر سب کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے باہر نکل آئی۔

باہر سرد ہوا کے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی چچی اور سحر کے ساتھ کراچی کے اس غیر متوقع سرد موسم پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ وہ لوگ اس سرد موسم کو بہت انجوائے کر رہے تھے۔

''کبھی کبھار سالوں میں تو ایسا موسم یہاں آتا ہے۔ آج کل تو ہم لوگ کراچی میں بیٹھ کر مری کے موسم کا مزہ لے رہے ہیں''۔ سرد ہوا سے بچنے کے لیے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر تیز تیز چلتے اسے سحر کا موسم کے حوالے سے کہا گیا جملہ یاد آیا۔

پتا نہیں جو موسم سب لوگوں کو بہت اچھا لگ رہا تھا، وہ اسے کیوں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ خوب صورت موسم بھی اس کی بیزاری اور اُداسی کو دور نہیں کر پایا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ نہ اسے یہ سرد ہوا کے جھونکے خوشگوار سی سردی کا احساس دِلا رہے ہیں۔ نہ آسمان پر چمکتا چودھویں

کا چاند اسے دلکش لگ رہا ہے۔ نہ درخت نہ پھول، نہ ہوائیں، اسے کچھ اپیل نہیں کر رہا اور اپنی اُداسی کی وجہ وہ دانستہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ خود اپنے آپ سے وہ اس وجہ کو چھپا لینا چاہتی تھی۔

اپنے پیچھے اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ وہ مُڑ کر دیکھتی، وہ قدم اس کے برابر آ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ سر اُٹھا کر دیکھے بغیر وہ اسے اس کے مخصوص پرفیوم کی وجہ سے پہچان گئی تھی۔

یہ خوشبو اس کے لیے اتنی مانوس ہے کہ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اسے پہچان گئی ہے۔ اس بات پر وہ خود اپنے آپ سے ہی خفا ہو گئی۔

''سنا ہے شادی کے لیے آپ کو ایک عدد لاوارث بندے کی تلاش ہے۔ وہ جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، نہ ماں باپ، نہ بھائی بہن۔'' آہستہ آواز میں، لیکن بڑے کڑک دار انداز میں کہا گیا تھا۔

وہ سر اُٹھا کر دیکھے بغیر جس طرح پہلے چل رہی تھی، اسی طرح چلتی رہی بنا جواب میں کچھ بولے۔

''اور سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ آپ کو سسرالی رشتے زہر لگتے ہیں، اسی لیے آپ ایک انجانے اور ان دیکھے شخص کا رشتہ قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئیں، محض اس وجہ سے کہ وہ اپنے گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ حالانکہ کچھ عرصہ پہلے تک آپ کو ایک ایسا گھر جہاں بہت سے لوگ تھے اور بہت سے رشتہ تھے، آئیڈیل لگا کرتا تھا۔ آپ کو وہ گھر اپنا ہی گھر لگا کرتا تھا، سوچ کی اس اچانک تبدیلی کو کیا نام دیا جائے؟ قول اور فعل کا تضاد یا پھر مجھ سے پیچھا چھڑانے کی ایک احمقانہ کوشش''۔ اس طنزیہ جملے کے اختتامی حصے نے اسے قدرے مشتعل کر دیا تھا۔

''اپنے انتہائی پرسنل معاملات کے بارے میں، میں نے آپ سے کوئی رائے نہیں مانگی۔ میں شادی کس سے کر رہی ہوں اور کیوں کر رہی ہوں۔ یہ سراسر میرا ذاتی معاملہ ہے''۔

''مجھے کوئی رائے دینے کے لیے تمہاری اجازت درکار بھی نہیں ہے''۔ طنزیہ انداز ترک کر کے وہ بھی غصے میں آ گیا تھا۔

''اور تمہارے ذاتی معاملوں کی کیا بات ہے۔ مجھ سے کسی بھی طرح تمہاری جان چھوٹ جائے، چاہے اس کے لیے تمہیں چراغ دین کے آٹھ بچوں کی سوتیلی اماں ہی کیوں نہ بننا پڑ جائے۔ تم وہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لو گی''۔

وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا غرایا۔ اپنا نام گھر میں کام کرنے والے مالی کے ساتھ جوڑے جانے پر اس نے طیش کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے دیکھتا بہت غصیلے انداز میں چل رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کو محسوس کر لینے کے باوجود اس نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

''اس کے گھر میں بھی تمہیں سسرالی رشتوں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا پڑے گا۔ صرف اس کے معصوم سے بچے ہی تو ہوں گے وہاں پر اور سوتیلے بچے غالباً سسرالی رشتہ داروں کی فہرست میں نہیں آتے۔ آج کل وہ ہے بھی دوسری شادی کے چکر میں، کہو تو تمہارے لیے وہاں کوشش کروں؟''

اس کا انداز استہزائیہ بلکہ کسی حد تک ہتک آمیز تھا۔ ایسے جیسے وہ جان بوجھ کر اسے اشتعال دِلانا چاہ رہا ہو۔

''آپ انتہائی فضول باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے، آپ کی ان بے ہودہ باتوں پر''۔

''تم دوسروں کے جذبات کا جس طرح چاہے مذاق اڑالو۔ تمہیں پورا پورا حق حاصل ہے اور وہ جواب میں اُف تک نہ کریں۔ صرف یہی ہے ناں کہ میں نے فلمی ہیروز کی طرح کوئی تھرڈ کلاس قسم کے ڈائیلاگ نہیں بولے تھے۔ باقی تو کوئی کمی نہیں تھی، میرے خلوص میں''۔ وہ اس کی بات پر بڑے جارحانہ انداز میں اس کی طرف گھوما۔

اب کی بار وہ جواب میں کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا، جبکہ وہ خود مسلسل اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''کیوں کر رہی ہوں تم یہ بے وقوفانہ حرکتیں۔ کیا مل رہا ہے تمہیں یہ سب کر کے''۔ اس کے چہرے پر بکھری اُداس سی خاموشی نے اسے جارحانہ انداز ترک کر کے نرمی اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔

''تم مجھ سے کیوں بھاگ رہی ہو دانیا! ایسا کیا ہو گیا ہے جو تمہیں مجھ سے دور بھاگنے پر مجبور کر رہا ہے''۔ اس کے اس نرمی بھرے سوال نے اسے بُری طرح نروس کر دیا تھا۔ جو بات وہ کسی بھی قیمت پر اس کے ساتھ ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود بخود اس بات کا سرا پکڑنے لگا تھا۔ اس نے اپنے قدموں یک رفتار بڑھا کر اس سے آگے ہو جانا چاہا۔

''میری بات کا جواب دو تم.....'' اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور خود بھی رُک گیا۔

''میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے گھر جانا ہے''۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

''سڑک پر تماشا بن رہا ہے''۔ اپنی کوشش کی ناکامی کے بعد کچھ عاجز آ کر اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

''میں تو صرف سڑک پر ہی تماشا بنا رہا ہوں۔ تم نے تو میری پوری زندگی کو تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ امی کہہ رہی ہیں کہ دانیا انہیں بہت پسند ہے، لیکن خود اسے بھابھی کا وہ اسٹوپڈ کزن اگر پسند آ رہا ہے تو پھر وہ اسے نہ تو اپنی مرضی کے کسی فیصلے کے لیے مجبور کر سکتی ہیں اور نہ ہی کسی بھی طرح اسے پریشرائز کرنے کے حق میں ہیں۔ پچھلے چار روز سے اس عذاب میں مبتلا ہوں۔ صدام حسین کو تو اپنا ملک تباہی اور بربادی سے بچانے کے لیے پھر سات دن کی مہلت ملی تھی، مجھے اپنا شہر محبت بچانے کے لیے صرف ایک دن ملا ہے۔ صرف ایک دن اور یہ ایک دن بھی کل رات امی کے ساتھ بہت بحث و تکرار کے بعد میں نے حاصل کیا ہے۔ انہوں نے صاف صاف مجھ سے کہا ہے کہ آج ہی انہوں نے بھابھی کی کزن کو فون کرنا ہے یا کل بلانے کے لیے یا کبھی بھی نہ بلانے کے لیے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ بلاوجہ کسی کو آس اور امید میں نہیں رکھنا چاہتیں۔ یا ہاں ہو یا شادی اور میں ان سے ایک دن کی مہلت لے کر آیا ہوں۔ یہ کہہ کر کہ اگر آپ کی بھتیجی بہت ضدی اور خود سر ہے تو میں بھی کم ضدی اور خود سر نہیں۔ تم ایک بار میری آنکھوں میں دیکھ کر یہ کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔ بس صرف اتنی سی بات ہے۔ اس سے زیادہ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا''۔

اس کا لہجہ بہت ضدی اور اپنی بات کسی بھی قیمت پر منوا لینے والا تھا۔ اس کا راستہ روک کر، اس کے بالکل سامنے جم کر وہ کچھ اس انداز میں کھڑا تھا، گویا اپنی بات کا جواب لیے بغیر اسے وہاں سے ہلنے بھی نہیں دے گا۔ اس نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ اس کی طرف دیکھ کر یہ بات کبھی بھی نہیں کہہ سکے گی۔ یہ بات اسے معلوم تھی اور اسی بات پر اسے خود پر سخت قسم کا غصہ آ رہا تھا۔

''پھوپھو کو اگر میں پسند ہوں تو پھر یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔ بحیثیت بھتیجی کے تو میں انہیں پسند ہو سکتی ہوں، مگر بہو بنانے کے لیے کبھی

بھی نہیں۔ کیا وہ ان لوگوں کے ساتھ نئے رشتے جوڑنے کے لیے آمادہ ہوسکتی ہیں، جنہوں نے پہلے سے موجود رشتوں ہی کا کبھی کوئی بھرم نہ رکھا ہو۔ میرا خیال ہے کہ پھوپھو نے یہ بات آپ سے یونہی مروتاً کہہ دی ہے کہ دانیا انہیں پسند ہے۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ دانیا انہیں پسند نہیں۔ ہاں البتہ دانیا کی ماں کو ان کا بیٹا اپنی بیٹی کے لیے دل و جان سے پسند ہے''۔

وہ بہت تلخ سے انداز میں بولی۔ اس کے لہجے میں خود اذیتی کی جھلک تھی۔ اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد اس نے داؤد کی طرف دیکھا۔ شاید اپنی بات کا ردِعمل اس کے چہرے پر پڑھنا چاہتی تھی۔

''تمہیں یہ بات بُری لگی ہے کہ ممانی یہاں رشتے کی بات کر کے گئی ہیں؟'' اس نے بردباری سے پوچھا۔ وہ اس کے اصل بات جاننے پر ذرا بھی متعجب نہیں ہوئی۔ البتہ ذلت کا احساس مزید شدت سے اس کے دل میں اُبھرا تھا۔

''میں یہاں نہ رشتے طے کروانے آئی تھی، نہ اپنی شادی کا مسئلہ حل کروانے۔ میں صرف اپنی جاب کے لیے کراچی آئی تھی۔ ہاں آپ لوگوں کے گھر کا ماحول مجھے شروع دن سے بہت اچھا لگا۔ میں نے ہمیشہ اسے آئیڈلائز کیا۔ یہاں سب کے ساتھ گھل مل کر رہنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ پھوپھو کا محبت بھرا اور شفیق انداز میرے دل کو بھاتا تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی بات نہیں تھی، لیکن اب جو یہ ساری باتیں ہو رہی ہیں، یہ سب سوائے مجھے ہرٹ کرنے کے کچھ نہیں دے رہیں اور آپ لوگ آخر اتنے اچھے اور فرشتہ صفت بننے کی کوششیں کیوں کر رہے ہیں، جن لوگوں سے آپ لوگوں کو نفرت کرنا چاہیے، آپ ان سے نفرت کیوں نہیں کرتے۔ مجھے نارمل انسان اچھے لگتے ہیں۔ فرشتوں اور دیوتاؤں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری ماں نے کبھی پھوپھو کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا اور اب جب آپ لوگ ہم سے زیادہ بلند اور بہتر معیارِ زندگی رکھتے ہیں تو ہمیں سب ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑنے کا خیال آ گیا ہے۔ مجھے ترس اور ہمدردی سے نفرت ہے''۔

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ خود کو رونے سے روک رہی تھی، لیکن یہ سب کچھ اتنا تکلیف دہ تھا کہ اسے آنسوؤں پر بند باندھنا مشکل ہو رہا تھا۔

''میں نہ دیوتا ہوں اور نہ فرشتہ۔ یقین کرو میں بالکل عام سا انسان ہوں۔ میں اتنا ہی اچھا یا اتنا ہی برا ہوں جتنا ایک نارمل انسان ہوا کرتا ہے۔ تم ان ساری باتوں کو بہت جذباتی ہو کر سوچ رہی ہو۔ ممانی سے کیا ہم لوگ نئے نئے ملے ہیں جو ان کے مزاج سے ناواقف ہوں۔ ہم انہیں ایک عرصے سے جانتے ہیں اور ان کے مزاج کی تمام اچھائیوں اور تمام برائیوں کے ساتھ انہیں قبول کر چکے ہیں۔ سب لوگ ویسے نہیں ہو سکتے جیسا ہم انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم اس بات کو اتنی جذباتیت اور اتنی شدت کے ساتھ کیوں سوچتی ہو کہ تمہاری امی ویسی نہیں جیسا تم انہیں دیکھنا چاہتی ہو۔ تم ان کا مسئلہ سمجھنے کی کوشش کرو، انہوں نے بہت کچھ پا کر کھو دیا ہے۔ وہ ابھی تک کھو دینے کی اس صدماتی کیفیت میں ہیں۔ اب اس عمر میں آ کر وہ نہیں بدل سکتیں۔ بہتر ہے تم انہیں ان ہی عادتوں کے ساتھ قبول کر لو''۔ اس نے متانت سے کہا۔ وہ خاموش کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

''اب دوسری بات جو تم نے اس بارے میں کی کہ مجھے تم سے نفرت ہونی چاہیے تھی۔ میں نے کبھی تم سے اور تمہاری فیملی سے نفرت نہیں کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تم لوگوں کی میری نزدیک ایسی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی کہ میں تم لوگوں کے بارے میں سوچتا اور نفرت کرتا۔ ہاں جب تم یہاں

آئیں تو شروع شروع میں تم میرے لیے ایک عام سی کزن اور ایک عام سی مہمان تھیں۔ ایسی کزن اور مہمان جس کی میرے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ لڑکے اپنی آئیڈیل لڑکی میں اپنی ماں کی اور لڑکیاں اپنے باپ کی سی عادتیں دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ میں نے جب کبھی اس آئیڈیل لڑکی کے بارے میں سوچا جسے میں اپنی شریک حیات بنانے کا فیصلہ کرتا تو لاشعوری طور پر میں اس میں اپنی ماں کی جیسی عادتیں دیکھنے کی خواہش کیا کرتا تھا۔ دوسروں کو چھوڑ و خود ہم گھر والوں اور خاص طور پر میرے لیے وہ ایک بہت ہی سیدھی اور نئے زمانے کے تقاضوں سے مطابقت نہ رکھنے والی خاتون ہیں۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی سادگی اور مروّت کو ہمیشہ میں نے برملا تنقید کا نشانہ بنایا، لیکن پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ جب کبھی میرے راستے میں کوئی رُکاوٹ آئی، کہیں میں ناکام ہونے لگا تو ایک اَن دیکھی قوت مجھے اس مشکل سے نکال لائی۔

بہت سی جگہوں پر مجھ سے بھی بڑھ کر قابل اور ذہین لوگ موجود ہیں، لیکن ان کے ہوتے ہوئے بھی کامیابی اور سرخروئی میرے ہی حصے میں آتی ہے۔ میں نے آج تک کبھی ان کے منہ پر یہ بات قبول نہیں کی، لیکن میں جانتا ہوں کہ ہم بہن بھائیوں نے جہاں جہاں اور جو جو کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں، ان سب کے پیچھے ہماری ماں کی اچھائیاں اور نیکیاں ہی کارفرما ہیں۔ تم بہت سی باتوں میں ان کے جیسی ہو۔ پہلی مرتبہ میں تمہیں اہمیت دینے پر اس وقت مجبور ہوا تھا، جب تم نے ثمین کی ایک غیر اخلاقی حرکت کو بڑی اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اگنور کر دیا تھا۔ وہی دِن تھا جب سے میں نے تمہارے بارے میں مختلف انداز سے سوچنا شروع کیا۔ ہر گزرتے دِن کے ساتھ تمہاری شخصیت میرے سامنے واضح ہوتی چلی گئی۔ اگرچہ تم پوری کی پوری امی جیسی نہیں ہو۔ وہ تمہاری طرح ضدی نہیں۔ وہ تمہاری طرح جذباتی اور جلد باز بھی نہیں۔ ان میں صبر، تحمل اور برداشت بہت زیادہ ہے، لیکن پھر بھی بعض باتوں میں تم کچھ کچھ ان کے ہی جیسی ہو''۔

وہ بہت رسانیت اور سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اس نے چھوڑ دیا تھا، لیکن وہ دونوں ابھی بھی اسی طرح سڑک کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے۔

''ثمین کے نکاح کے اگلے روز تمہاری غیر معمولی خاموشی اور خفگی کی میں یہ وجہ سمجھا کہ تمہیں ممانی کا عاصم بھائی اور مجھ سے عادل کی جاب کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگا ہے۔ جس لڑکی کو صرف اتنی سی بات بہت بڑا احسان نظر آتی ہو کہ میں یا عاصم بھائی اسے اس کے آفس تک ڈراپ کر دیں۔ وہ اس بات کو کس طرح پسند کر سکتی تھی کہ بھائی کی جاب کے لیے ہمارا احسان لے، لیکن پھر جس طرح تم نے آناً فاناً رشتہ قبول کیا اور شادی کے لیے آمادہ نظر آنے لگیں، اس نے مجھے چونکایا۔ مجھے احساس ہوا کہ بات یہ نہیں۔ اصل بات شاید کچھ اور ہے۔ پھر میں امی کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ آج کل میں مجھ سے تم سے شادی کے بارے میں میری رائے معلوم کرنے والی تھیں اور یہ کہ خود ممانی بھی اس بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کر کے گئی ہیں، لیکن تمہارا انٹرسٹ اس دوسرے رشتے میں ہے، تو پھر ظاہری بات ہے وہ تمہیں مجبور نہیں کر سکتیں۔

امی کو تمہارے اس فیصلے سے بہت دُکھ ہوا ہے۔ جو باتیں تم سوچ رہی ہو، وہ ہم میں سے کسی نے بھی تمہارے بارے میں کبھی نہیں سوچیں۔ پلیز اس طرح کی احمقانہ سی جذباتیت میں مبتلا ہو کر اپنے اور میرے لیے مشکلات مت پیدا کرو''۔ بہت نرمی اور رسانیت سے وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا واقعی سب مجھے اتنا عزیز رکھتے ہیں۔ مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں، لیکن میں اتنی اچھی ہوں تو نہیں''۔ وہ اچانک ہی رو پڑی تھی۔ ان گزرے دنوں میں اس نے خود کو بہت حقیر اور کم تر ہوتا محسوس کیا تھا۔ اپنے گزشتہ ایک ایک عمل اور ایک بات پر وہ ان گزرے دنوں میں شرمندہ ہوئی تھی۔ خود اپنے آپ کو وضاحتیں دیتی رہی تھی۔

''اس گھر کے محبت بھرے ماحول نے مجھے اچھا بنا دیا، ورنہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ سوائے اس کے، کہ میرے لیے زندگی میں سب سے اہم چیز محبت ہے۔ یہ بہت شدّت سے مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے اور یہاں مجھے ہر جگہ محبت ہی محبت نظر آئی۔ اس محبت نے مجھے باندھ لیا۔ مجھے بہت اچھا بنا دیا۔ میں دولت پرست نہیں۔ مجھے بڑے بڑے مکانات اور قیمتی گاڑیوں کی چاہ نہیں۔ میرے لیے انسانوں کی اچھائی اور برائی ناپنے کا پیمانہ دولت نہیں۔ میں لوگوں کے رویوں میں خلوص ڈھونڈتی ہوں۔ آپ کو میں بہت اچھا انسان سمجھتی ہوں، اس کی وجہ آپ کا اسٹیٹس نہیں، جو عادتیں آپ میں ہیں، وہی سب ہوتیں، لیکن آپ کہیں کوئی بہت معمولی سی جاب کر رہے ہوتے، میں تب بھی آپ کو اتنا ہی اچھا سمجھتی، جتنا اب سمجھتی ہوں''۔

وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی، اس کی یہ بات سن کر اس کے لبوں پر اچانک ہی بہت خوش گوار اور شوخ سی مُسکراہٹ بکھری تھی۔

''شکر ہے۔ آخر کار تمہارے منہ سے میرے لیے کوئی تو تعریفی جملہ نکلا۔ کتنی دیر سے میں تمہاری تعریفیں کیے چلا جا رہا ہوں اور جب ہم کسی کی تعریف کرتے ہیں تو دِل ہی دِل میں توقع کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمیں بھی جوابی تعریف سے نوازا جائے گا۔ ویسے تمہارے جملے سے مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اگر تم یوں کہتیں کہ میں تب بھی آپ ہی سے محبت کرتی تو بات زیادہ خوب صورت اور زیادہ سچی لگتی''۔

اس کا یہ برجستہ اور شوخ سا انداز اس کے لبوں پر بھی مُسکراہٹ لے آیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور لبوں پر مُسکراہٹ تھی۔ داؤد نے اس منظر کو بہت دلچسپی سے دیکھا۔

''کبھی تم نے بہت تیز بارش میں اچانک ہی دھوپ نکلتے دیکھی ہے''۔ وہ ایک دم جھینپ سی گئی تھی۔ بے اختیار اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور فوراً ہی چلنا شروع کر دیا۔ چند لمحے تک تو احساس نہیں ہوا تھا، لیکن اب یہ سوچ کر وہ سڑک پر اس کے عین سامنے کھڑے ہو کر روئی ہے۔ اسے کچھ شرمندہ سا کر گیا تھا۔ اسے چلتا دیکھ کر وہ بھی اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

''خوب صورت لڑکی! اتنی بے دردی سے بھی نہ پیش آؤ اپنے ساتھ''۔ اسے اسی طرح دوپٹے سے چہرہ رگڑتے دیکھ کر اس نے ٹوکا۔ وہ بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''تمہیں پہلی مرتبہ اس خوش فہمی میں مبتلا کس نے کیا تھا کہ تم خوب صورت ہو''۔

وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ اسے باتوں میں اُلجھا کر اس نے قصداً گھر پہنچنے کے لیے لمبا راستہ اختیار کیا تھا اور اب وہ دِل ہی دِل میں اس بات پر پچھتا رہی تھی کہ اسے کچھ دیر پہلے اس بات کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔ اب بقیہ تمام راستہ اسے اسی قسم کی گفتگو کا سامنا کرنا تھا۔ وہ اس کے جواب نہ دینے پر ذرا بھی بُرا نہیں مانا تھا، بلکہ اسی طرح مُسکرا رہا تھا۔

''تمہاری وہ فیوریٹ ہارر موویز میں دو مرتبہ دیکھ چکا ہوں اور دو مرتبہ دیکھنے کے باوجود بھی میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اس میں ڈرنا کہاں

''وعدہ میں بے شک کر لیتا ہوں، لیکن تم اسے اسی قسم کا ایک وعدہ سمجھو، جیسا ہمارے حکمران، غریب عوام کے ساتھ اکثر کرتے رہتے ہیں اور جس کے ایفا ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہوتی''۔

وہ لوگ گھر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اوپر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی پھوپھو نے ان دونوں کو ایک ساتھ آتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ داؤد کی دانیا کے ساتھ کیا بات ہوئی ہے اور دانیا نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ یہ سوال انہیں ان دونوں سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جو جیکٹ اس نے پہن رکھی تھی، اسے دیکھنے کے بعد کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں بچی تھی۔ ایک نظر ان دونوں کے مُسکراتے ہوئے چہروں پر ڈال کر وہ فوراً ہی کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی تھیں۔ کارڈلیس اُٹھا کر انہوں نے بہت تیز تیز ایک نمبر ملانا شروع کیا تھا اور دوسری طرف وہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔

''محبت کے اس شہر میں، میں تمہیں خوش آمدید کہہ رہا ہوں۔ یہاں ہم لڑیں گے بھی، جھگڑا بھی کریں گے۔ ایک دوسرے سے اختلاف بھی کریں گے، لیکن محبت ہمارے درمیان تعلق کی سب سے بنیادی وجہ ہمیشہ رہے گی''۔

❁.....❁

جو چلے تو جاں سے گزر گئے

ماہا ملک کا یہ خوبصورت ناول ہمارے اپنے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اسکے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ جیتے جاگتے کردار اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ زندگی کی راہوں میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے قرینوں سے بھی واقف ہیں اور رقابت اور نفرت کے آداب نبھانا بھی جانتے ہیں۔ انہیں جینے کا ہنر بھی آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ خیر و شر، ہر آدمی کی فطرت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ہر شخص کا خمیر انہی دو عناصر سے گندھا ہوا ہے۔ ان کی کشمکش غالبؔ ایسے شاعر سے کہلواتی ہے۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔

آدمی سے انسان ہونے کا سفر بڑا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن ''انسان'' درحقیقت وہی ہے جس کا ''شر'' اس کے ''خیر'' کو شکست نہیں دے پایا، جس کے اندر ''خیر'' کا الاؤ روشن رہتا ہے۔ یہی احساس اس ناول کی اساس ہے۔ **جو چلے تو جاں سے گزر گئے** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

تھا۔ سوچ رہا ہوں، اب اس کی ایک DVD خرید لوں اور پھر تیسری مرتبہ اسے تمہارے ساتھ دیکھوں۔ تم مجھے بتانا اس میں کس جگہ پر ڈرنا ہے اور میرا خیال ہے، ہماری شادی کا دِن وہ مووی دیکھنے کے لیے آئیڈیل دِن ہوگا''۔ وہ ہنوز اسی شرارتی سے موڈ میں اسے چھیڑ رہا تھا۔

''آپ خوامخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ میں نے اتنی دیر میں یہ بات تو ایک دفعہ بھی نہیں کہی کہ میں آپ سے شادی کے لیے راضی ہوگئی ہوں''۔ اپنے نروس ہونے اور احمقانہ سے انداز میں شرمائے چلے جانے پر اسے خود پر بے تحاشا غصہ آیا تھا اور غصے کے ردِعمل کے طور پر یہ جملہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''خوامخواہ بے تکلف ہو رہا ہوں.....'' اس نے بڑے افسوس بھرے انداز میں اس کی کہی بات دُہرائی۔

''جس لڑکی نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھے یہ بات بتائی ہے کہ اگر چراغ دین کی جگہ میں اس کے گھر کا مالی ہوتا یا پھر ادریس کی جگہ اس کے گھر کا ڈرائیور ہوتا تو وہ تب بھی مجھ ہی سے محبت کرتی۔ اگر میں اس لڑکی کے ساتھ بے تکلف نہ ہوں تو پھر تمہارے خیال میں مجھے کس کے ساتھ بے تکلف ہونا چاہیے؟''

بہت دُکھ بھرے انداز میں یہ سوال پوچھا گیا تھا۔ وہ اس کی بات سُنی اَن سُنی کر کے سردی سے بچنے کے لیے دوپٹہ اپنے گرد اچھی طرح لپیٹنے لگی تھی۔

''یہ لے لو''۔ اس نے اپنی جیکٹ اُتار کر اس کی طرف بڑھائی۔

''شکریہ''۔ اس نے جیکٹ لینے کے لیے ہاتھ آگے نہیں کیا۔

''یہ لڑکیوں کے سامنے ہیرو بننے کا اچھا طریقہ ہوتا ہے۔ اپنا کوٹ یا جیکٹ انہیں پیش کر دی جائے، خود کو پھر چاہے سردی سے بخار چڑھ جائے یا نمونیا ہی کیوں نہ ہو جائے''۔ وہ اس کے کمنٹس پر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''دیکھو، اس سال یہ موقع ملا ہے۔ اگلے دسمبر میں پتا نہیں سردی اپنی جھلک دکھائے گی بھی یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو، میں تمہارے سامنے ہیرو بننے کی سعادت سے محروم رہ جاؤں''۔

اسے خود بھی ہنسی آ گئی تھی اور یونہی ہنستے ہوئے اس نے وہ جیکٹ اس کے ہاتھ سے لے لی تھی۔

''اور سنو، امی ویسے چاہے جتنی بھی اچھی ہوں، لیکن انہیں پھوہڑ لڑکیاں بہت بُری لگتی ہیں۔ تم آملیٹ بنانا سیکھ لو، ورنہ پھر پھوہڑ پن پر طعنے سننے کے لیے تیار ہو جاؤ''۔ اس نے جیسے اسے ڈرانا چاہا۔

''میں ہارر موویز دیکھ کر ڈرنا بھی چھوڑ دوں گی، آملیٹ بنانا بھی سیکھ لوں گی، لیکن آپ سے بھی میری ایک درخواست ہے''۔ اس نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، وہ مُسکراتے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آپ تعلیم بالغان، علم کی روشنی گھر گھر پہنچاؤ اور تعلیم سب کے لیے..... قسم کے تمام سماجی اور معاشرتی بھلائی کے کام کرنا چھوڑ دیں گے۔'' اس نے بظاہر بہت سنجیدگی سے کہا تھا اور وہ ایک مرتبہ پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

ہم خواب کیوں دیکھیں

''بھئی واہ کیا معصوم ہیروئین تھی۔'' ایمن نے ڈائجسٹ زور سے بند کرتے ہوئے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی بال برش کرتی رامیہ اس کے انداز پر مُسکرا دی تھی۔

''اس طرز کی دو چار معصومائیں اور پیدا ہو گئیں تو ہم جیسوں کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے انہیں یہ نہیں پتا کہ ان کی شادی ہیرو یعنی کزن صاحب سے ہو رہی ہے۔ سارے جگ کو پتا ہے مگر بے چاری معصومہ لاعلم ہیں۔ شادی والے دن جب دولہا صاحب کمرے میں تشریف لاتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہیں اور تمام رنگ ان کے چہرے پر آ جاتے ہیں۔ یا یہ ہیروئن بات بے بات لال، گلابی، سرخ، ہری اور نیلی کیوں ہو جاتی ہیں''۔ ایمن بیڈ پر لیٹتے ہوئے بولی۔

''بھئی ہیروئن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی ہی ہو۔ تم نے پرانی پاکستانی اور انڈین فلموں میں۔

''بیٹے بڑے وہ ہیں آپ۔ جایئے کوئی دیکھ لے گا''۔ ٹائپ ڈائیلاگ نہیں سنے۔ ہیروئن کے بولنے کا اسٹائل بھی ایسا ہوتا ہے، جیسے بے چاری دمے کی دائمی مریضہ ہے۔ یعنی یہ کہ یہ روایت ہے کہ ہیروئن اور کچھ ہو نہ ہو شرمیلی ضرور ہو''۔ رامیہ اپنے سلکی کمر تک آتے بالوں کو بینڈ میں جکڑتے ہوئے بولی۔ اسے اپنے بالوں کے ساتھ نئے تجربات کرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ کبھی انہیں پرم کروا لیتی، کبھی اپنے کسی بھی پسندیدہ رنگ میں ڈائی کروا لیتی اور کبھی سیدھے۔ ایمن اس کی ان حرکتوں پر سخت چڑا کرتی تھی۔

''اری کمبخت قدر کر لے ان بالوں کی، مت یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کیا کر۔ ہمیں دیکھو مجال ہے بال بڑھ جائیں، چاہے کتنے ہی جتن کر لو''۔ وہ کہا کرتی۔

''ارے یہ ہیروئنز اپنے مطلب کے وقت معصوم اور شرمیلی بنتی ہیں۔ معصومیت پر تو یہ حال ہے کہ امریکہ پلٹ کزن کو پہلی ہی ملاقات میں اپنی طرف متوجہ کروا لیا۔ ارے ہم سے بہتر تو یہ پرائیویٹ میٹرک کر کے گھر بیٹھنے والی ہیروئن ہی ہے۔ یہاں تو سوائے یونیورسٹی میں چار سال گنوانے کے اور کچھ نہ کیا۔ اب اگر اس دوران بھی ہم کچھ نہ کر سکے تو سمجھ لو کہ کبھی کچھ نہیں کر سکتے۔'' ایمن بولتے بولتے جوش میں آ کر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کی بات پر رامیہ شوخی سے مُسکراتی بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کیوں تم اتنی فکر کر رہی ہو۔ میرا کچھ ہو نہ ہو، مگر تمہاری دلی خواہش تو پوری ہو ہی جائے گی۔ وہ عاشق مرزا صاحب مجھے تو واقعی اسم با مسمی لگے ہیں۔'' ایمن نے تکیہ اُٹھا کر اس کے منہ پر مارا تھا اور وہ ہنس ہنس کر بے حال ہوتی، اس کے حملے سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ہاں یہی تو اوقات رہ گئی ہے، اب میری کہ مجھے ان بڑے میاں کا نام لے کر چھیڑا جائے گا۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''بھئی ہم نے تو جو دیکھا ہے، وہی کہہ رہے ہیں۔ مس ایمن کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ مس ایمن تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ تھوڑی دیر ریسٹ کرلیں، مس ایمن یہ، مس ایمن وہ، کا وظیفہ پڑھتے ہی دیکھا انہیں''۔ وہ اس کے ممکنہ حملے سے بچنے کی خاطر دروازے کے پاس جا کر بولی۔

''ٹھہر جا''۔ ایمن دانت پیستی اُٹھی تھی اور وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔

صبح ایمن کی گاڑی کا ہارن سن کر وہ ٹوسٹ منہ میں ٹھونستی کرسی سے اُٹھی۔

''روزانہ جاتے وقت بھاگ دوڑ مچاتی ہو۔ جلدی کیوں نہیں اُٹھتیں۔ ناشتا بھی ڈھنگ سے نہیں کیا''۔ ممی نے پاپا کے آگے چائے کا کپ رکھتے ہوئے اسے ٹوکا تھا۔

''سوئیٹ ممی باقی لیکچر شام میں۔ اس وقت دیر ہو رہی ہے''۔ وہ بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''میری تو ہر بات ہی لیکچر ہے''۔ وہ ناراضگی سے بولیں۔ وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر مُسکراتے ہوئے بولی۔

''آپ ناراض ہوں گی تو میرا سارا دِن بُرا گزرے گا''۔

''اچھا اچھا اب یہ ڈرامے مت کرو۔ جاؤ ایمن انتظار کر رہی ہوگی''۔ وہ اس کے بازو ہٹاتے ہوئے بولی تھیں۔ پاپا، ماں بیٹی کے جھگڑے میں خاموش تماشائی بنے مُسکرا رہے تھے۔ ممی پاپا کو خدا حافظ کہتی وہ باہر نکل آئی۔

''آج پھر تمہاری وجہ سے دیر ہوگئی۔ پتا ہے ناں وہاں وہ موصوف ویسے ہی سفارشی سمجھ کر ہمارے ساتھ کیسے بی ہیو کرتے ہیں''۔ ایمن نے اسے گھورا تھا۔

''چھوڑو یار ہمیں کون سا کوئی گھر چلانے کے لیے نوکری کرنی ہے۔ زیادہ کچھ کہیں گے تو کھری کھری سنا کر اسی وقت وہاں سے اُٹھ جائیں گے''۔ وہ لاپروائی سے بولی۔

''یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ Intership کے 180 گھنٹوں کے بغیر ہمیں ڈگری نہیں ملے گی۔ ہر چیز کے بارے میں اتنا کیئر لیس ہو کر مت سوچا کرو'' اور اس سے یہ شکایت صرف ایمن ہی کو نہیں بلکہ ممی، پاپا، ندا باجی اور حنا کو بھی تھی۔ حنا جو اس سے صرف دو سال بڑی تھی، اکثر بڑی سنجیدگی سے سمجھایا کرتی۔

''زندگی کے بارے میں تمہارا رویہ بہت غیر سنجیدہ ہے۔ خود کو تبدیل کرو۔ زندگی کے لیے تمہارے کچھ مقاصد ہونے چاہئیں'' اور وہ اس کی ان نصیحتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتی تھی۔ وہ اکثر ایسی ہی باتوں کے جواب میں کہا کرتی۔

''بھئی میرا موٹو ہے کہ زندگی زندہ دِلی کا نام ہے۔ لہٰذا تم لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو''۔ ہلا گلا، شور شرابہ اور ہنگامہ پروری اس کی طبیعت میں شامل تھا۔ ایمن سے اتنی زیادہ دوستی کا سبب بھی عادتوں کی یہ مماثلت ہی تھی، مگر ایمن اس کی طرح اتنی لاپروا اور بے نیاز نہیں تھی۔ شوخی و شرارت کے ساتھ ساتھ اس کے پاس اپنی آنے والی زندگی کے لیے واضح لائحہ عمل موجود تھا۔ اسکول، کالج اور پھر یونیورسٹی، انہوں نے تمام تعلیمی مدارج ایک ساتھ طے کیے تھے۔ پاپا اسے انجینئرنگ کروانا چاہتے تھے۔ وہ خود سول، انجینئر تھے۔ ان ہی کے کہنے پر اس نے انٹر میں پری انجینئرنگ

لے لی تھی۔ جبکہ ایمن نے آرٹس کے مضامین لیے تھے۔ اسے سائنس کے مضامین بالخصوص میتھس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر وہ اس کا مست ملنگ اور لاپروا انداز کہ ''کچھ نہ کچھ تو پڑھنا ہے چلو یہی سہی''۔ تب حنا کی شادی نہیں ہوئی تھی، وہ اسے ٹوکتی، ''جب تمہاری دلچسپی نہیں ہے تو کیوں بے کار میں اپنی انرجی برباد کر رہی ہو۔ سبجیکٹ چینج کر لو۔ خوامخواہ فیل ویل ہو گئیں تو ہم لوگوں کو شرمندگی اُٹھانے پڑے گی۔

''گرتے ہیں شہہ سوار ہی میدانِ جنگ میں۔'' وہ شرارت سے گنگناتی اور حنا سر پیٹ کر رہ جاتی۔ وہ تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پاپا کو خود ہی اندازہ ہو گیا کہ ان مضامین میں وہ چلنے والی نہیں تو اس کے سبجیکٹ چینج کروا دیئے۔ انٹر کے بعد اس نے ایمن کے ساتھ ہی آنرز میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔

ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کرنے میں اس کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی کشش نہیں تھی کہ وہاں وہ اور ایمن ساتھ ساتھ تھیں۔ اس کے آنرز کرنے کے دوران ہی حنا کی شادی ہو گئی تھی۔ ندا باجی تو اس کے اسکول کے زمانے ہی میں پیا گھر سدھار چکی تھی۔ اب گھر میں صرف وہ، ممی اور پاپا ہی رہ گئے تھے۔ ان دونوں ہی نے ماسٹرز میں ایڈورٹائزنگ کے اسپیشل کورس کا انتخاب کیا تھا۔ ایمن کے ماموں نے بتایا تھا کہ ان کے کوئی جاننے والے اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلا رہے ہیں۔ وہ ان سے ان دونوں کے انٹرنشپ کے لیے بات کریں گے۔ فائنل سمسٹر کے ایگزیمز کے دوران ہی ایمن نے یہ خوش خبری اس کے گوش گزار کر دی تھی کہ ماموں نے ان صاحب سے بات کر لی ہے اور پیپرز سے فارغ ہوتے ہی انہیں وہاں جانا ہے۔

جس روز آخری پیپر تھا، اس سے اگلے ہی روز وہ ایمن اور اس کے ماموں کے ہمراہ دانیال سکندر کے روبرو بیٹھی تھیں۔ وہ تو ابھی امتحانوں کی تھکن اُتارنے کے موڈ میں تھی، مگر ایمن نے اس کی ایک نہیں چلنے دی تھی۔ دانیال سکندر ان لوگوں سے بڑے فارمل اور پروفیشنل انداز میں ملا تھا اور اگلے دِن سے انہیں جوائن کرنے کو کہا تھا۔ ایمن کے ماموں نے ان لوگوں کو بتایا تھا کہ وہ دانیال سکندر کو براہِ راست نہیں جانتے، وہ ان کے کسی کولیگ کا فرسٹ کزن ہے۔ اسی حوالے سے ان کی بھی اس سے رسمی سی سلام دُعا ہے۔

''آئیڈیل ایڈورٹائزرز'' میں دانیال سکندر اور اس کے دوست معاذ علی خان کی ففٹی ففٹی پارٹنرشپ تھی۔ تقریباً چھ سال پہلے انہوں نے اپنی یہ ایجنسی اسٹیبلش کی تھی۔ دانیال سکندر تو پورا ٹائم اسی آفس کو دیتا تھا۔ جبکہ معاذ علی خان کے بارے میں ان لوگوں نے سنا تھا کہ وہ آفس کو فل ٹائم نہیں دیتا۔ تین چار گھنٹے آفس میں گزار کر چلا جاتا ہے۔ وہ کسی بہت بڑے گروپ آف نیوز پیپر کے مالک کا اکلوتا بیٹا تھا اور اپنا بقیہ ٹائم وہ وہیں گزارتا تھا۔ یہ ایڈ ایجنسی تو اس نے محض اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال میں لانے کے لیے جوائن کی تھی۔ اسے اسٹیبلش کرنے کا بنیادی خیال بھی دانیال سکندر کا تھا اور دِن رات ایک کر کے اسے ترقی اور کامیابی سے ہمکنار کروانے میں بھی زیادہ ہاتھ اسی کا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ معاذ ہر موقع پر اس کے ساتھ ساتھ رہا تھا، سنا تھا کہ وہ بہت جینئس اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ رامیہ اور ایمن کو یہاں جوائن کیے پانچ چھ روز ہو گئے تھے، مگر اس دوران انہوں نے معاذ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

☆

ان دونوں کے علاوہ یہاں تین خواتین اور تھیں، جن میں ایک تو ریسپشنسٹ تھی، دوسری مسز عظمیٰ ظفر تھیں جو یہاں Creativedirector تھیں اور دانیال نے ان دونوں کو انہیں کی Supervision میں دیا تھا۔ پہلے روز ان دونوں کا ان سے تعارف کروانے کے

بعد وہ بولا تھا۔

''ان دونوں کو میں آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ آپ کو انہیں بہت اچھی طرح ٹرینڈ کرنا ہے۔ بالکل فریش پڑھ کر نکلی ہیں، یقیناً بہت سے اچھے آئیڈیاز یہ آپ کو فراہم کریں گی۔ ان کی نئی اور تازہ سوچ اور منفرد خیالات سے فائدہ اُٹھائیں''۔ ان دونوں کے لیے عظمیٰ ظفر کے برابر والے کمرے ہی میں دو ٹیبلز لگا دی گئی تھیں۔ اسی کمرے میں حمنٰی اور ہمایوں بھی بیٹھا کرتے تھے۔ وہ دونوں انڈس ویلی اسکول کے گریجویٹس تھے اور یہاں سیکھنے والوں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ دونوں سارا دن کمپیوٹر پر ڈیزائننگ میں مصروف رہتے۔ حمنٰی بڑی خشک مزاج اور لیے دیئے رہنے والی لڑکی تھی۔ اس لیے ان لوگوں کی اس سے ہائے ہیلو کی حد تک دوستی تھی۔ ہمایوں کی نیچر فرینڈلی تھی اور اس سے ان دونوں کی گپ شپ ہو جایا کرتی تھی۔ زیادہ وقت ان دونوں کو عظمیٰ ظفر نچائے رکھتی تھی۔ بقول رامیہ۔

''پتا نہیں کب کب کے بدلے نکال رہی ہیں یہ ہم لوگوں سے۔ ہمارے آنے سے پہلے ان کا کام کیسے ہوتا ہوگا۔ سارا کام تمہیں اور مجھے سونپ کر خود آرام سے یا تو دانیال سکندر کے آفس میں بیٹھ جائیں گی یا فون پر لمبی لمبی کالیں کریں گی''۔

اور اس کی بات پر ایمن ہنستے ہوئے سمجھانے کی کوشش کرتی۔

''بے وقوف، اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ ہم اس طرح اپنی فیلڈ کے بارے میں جلدی اور بہت کچھ سیکھ جائیں گے اور لوگ تو نئے آنے والوں کو سکھاتے بھی نہیں ہیں۔ یہ تو پھر بھی ہمارے ساتھ بہت کوپریٹ کر رہی ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کر ہی سہی، سکھا تو رہی ہیں اور فون پر وہ بے چاری کلائنٹس کے ساتھ بات کر رہی ہوتی ہیں اور دانیال سکندر کے روم میں اپنے مختلف پروجیکٹ ڈسکس کر رہی ہوتی ہیں''۔

''تمہیں بڑی اچھی لگ رہی ہیں، اور تیاری دیکھی ہے، ان کی، خود کو ہمارے برابر کا سمجھتی ہیں آئی ایم ہنڈریڈ پرسنٹ شیور، فورٹی تو یہ کب کا کراس کر چکیں اور حرکتیں ملاحظہ کی ہیں بے چاری کے ہر سوٹ میں کپڑا کم ہو جاتا ہے اور سارا زور بے چارے معصوم گلے پر پڑتا ہے۔ چلو کوئی حسین نازک سی کمر ہو تو بندہ اس کی نمائش کرتا اچھا بھی لگے، یہاں تو کمر نہیں پورا کمرہ ہے''۔

وہ بُری طرح چڑ کر بولی تھی اور ایمن ان کمنٹس پر سوائے ہنسنے کے اور کیا کر سکتی تھی۔

☆

''صبح صبح دل خوش ہو گیا''۔ ایمن نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا تھا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ صرف برابر والی میز پر بیٹھی رامیہ ہی سن سکے۔ وہ ابھی ابھی دانیال کے کمرے سے آئی تھی۔

''کیا دیکھ آئیں مجھے بھی بتاؤ''۔ رامیہ بے چینی سے بولی تھی۔

''یار ہماری لک واقعی بہت اچھی ہے۔ باس اور سیکنڈ باس دونوں ہی بے تحاشا ہینڈسم ہیں''۔ وہ پین اُٹھاتے ہوئے بولی تھی۔

''اچھا تو آپ معاذ علی خان کے دیدار کر کے آ رہی ہیں۔ کیسا ہے وہ؟ کیا دانیال سکندر سے زیادہ ہینڈسم ہے''۔ رامیہ اپنا سب کام چھوڑ چھاڑ کر ایمن کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''زیادہ کم کا تو نہیں پتا۔ ویسے ہائٹ دانیال سے تھوڑی زیادہ ہی لگ رہی تھی اور کیا ایتھلیٹ کی طرح اسٹرونگ باڈی ہے۔ پہلی نظر دیکھ کر میں سمجھی کہ شاید کوئی ماڈل ہے۔ وہ تو جب دانیال نے تعارف کروایا تو پتا چلا کہ وہ معاذ علی خان ہیں۔ یار اس بندے کو ماڈلنگ کرنی چاہیے۔ مالبرو کے ایڈ میں جلیٹ مارک ۳ کے ایڈ میں کسی نہ کسی میں ضرور کرنی چاہیے''۔ ایمن اس کے شوق کو ہوا دے رہی تھی۔

''واقعی وہ اتنا ہینڈسم ہے۔ ایسے ہی کمنٹس تم نے پہلی مرتبہ دانیال کو دیکھنے کے بعد گھر جا کر دیئے تھے''۔ رامیہ کی بات پر ایمن بڑی سنجیدگی سے بولی۔

''دونوں اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں۔ میں نمبرنگ نہیں کر پا رہی''۔

''چلو تو نمبروں کا فیصلہ میں کر دیتی ہوں''۔ وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

''پاگل ہو گئی ہو۔ وہاں وہ لوگ کسی میٹنگ میں مصروف ہیں۔ مجھے تو انہوں نے خود بلوایا تھا۔ تم خوامخواہ اندر کیسے جاؤ گی''۔ ایمن نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ رامیہ ہی کیا جو کسی کی سن لے۔ ایک دفعہ کوئی بات دماغ میں آ گئی تو آ گئی۔

''ڈانٹ کھاؤ گی۔ جاؤ میرا کیا ہے''۔ ایمن نے اسے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر غصے سے کہا تھا اور وہ لاپروائی سے اس کی بات سنتی باہر نکل گئی تھی۔ اس کی قسمت اچھی تھی یا ایمن کی دعائیں کام آ گئی تھیں کہ بغیر کمرے میں جائے وہ ''دیدار'' سے فیض یاب ہو گئی تھی۔ دانیال، معاذ اور مسز ظفر ایک ساتھ اسی طرف آ رہے تھے۔

''معاذ'' یہ مس رامیہ کمال ہیں۔ مس ایمن سے تو تم مل ہی چکے ہو۔ ان دونوں نے انٹرنشپ کے لیے یہاں جوائن کیا ہے اور مس رامیہ یہ معاذ علی خان ہے۔ میرا بیسٹ فرینڈ اور بزنس پارٹنر''۔

دانیال نے تعارف کی رسم ادا کی تھی۔ جواب میں وہ بندہ ''پلیز ٹو میٹ یو'' کہتا بڑے تکلف سے تھوڑا سا مسکرایا تھا اور اسے جواب کی مہلت دیئے بغیر دانیال سے کسی نئے ایڈ کے بارے میں بات کرنے لگا تھا۔ اسے اپنا یہاں کھڑا ہونا ایک دم بے کار محسوس ہوا تو واپس اپنے کمرے میں آ گئی، جتنا اچھا تاثر اسے دیکھ کر پڑا تھا، اتنا ہی بُرا اس کا اسٹائل دیکھ کر پڑا تھا۔

''کھالی ڈانٹ''۔ ایمن نے اسے آتا دیکھ کر کہا تھا۔

''ڈانٹ کھائیں میرے دشمن، آپ کے ان اپالو کو دیکھ کر آ رہی ہوں''۔ وہ جل کر بولی تھی۔ ایمن اس کے انداز پر حیران ہوتی ہوئی بولی۔

''کیوں تمہیں وہ ہینڈسم نہیں لگا''۔

''ہینڈسم تو خیر ہے، مگر اتنا بھی نہیں جتنا تم چڑھا رہی تھیں۔ دانیال سکندر اس سے زیادہ ہینڈسم ہے اور اس سے کہیں زیادہ اچھے دل والا بھی۔ مجھے تو موصوف ایک دم بناوٹی لگے۔ زبردستی خود کو بزی پوز کرنا''۔ وہ اپنی ناپسندیدگی کا واضح اظہار کرتے ہوئے بولی۔

معاذ کے بارے میں اس نے پہلی ملاقات میں جو رائے قائم کی تھی، وہ مزید خراب محض اگلے ہی روز ہو گئی۔ وہ بڑے انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ جب مسز ظفر نے اسے انٹر کام کیا۔

''مس رامیہ! کل جو میں نے آپ کو فائل دی تھی، وہ لے کر آئیں پلیز''۔ ان کا پیغام سنتے ہی وہ فائل کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی۔ بسکٹ بنانے والی ایک کمپنی اپنی نئی پروڈکٹ لاؤنچ کروا رہی تھی اور اس کام میں وہ مسز ظفر کی معاونت کر رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کام مکمل کر کے اس نے فائل بڑی احتیاط سے اپنی دراز میں رکھی تھی، مگر اب اس کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ وہ شدید پریشانی کے عالم میں فائل تلاش کر رہی تھی، جب مسز ظفر نے دوبارہ انٹر کام کیا، ''کیا کر رہی ہیں آپ، اتنے سے کام میں اتنی دیر لگا رہی ہیں۔ کلائنٹ آئے بیٹھے ہیں۔'' وہ خفگی سے بولی تھیں۔

''وہ مسز ظفر فائل پتا نہیں میں نے کہاں رکھ دی۔ مجھے مل نہیں رہی''۔ وہ اٹکتے ہوئے بولی تھی۔ اور جواب میں ان کی خاموشی شاید سامنے بیٹھے کلائنٹ کی وجہ سے رہی ہوگی۔ ایمن بھی اپنا کام چھوڑ کر اس کے ساتھ فائل ڈھونڈنے میں مصروف ہوگئی تھی اور ساتھ ساتھ اسے بُرا بھلا بھی کہتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد معاذ نے اسے اپنے آفس میں طلب کیا تھا۔ پیون کی زبانی یہ پیغام سن کر اس سے زیادہ ایمن پریشان ہوگئی تھی۔

''دیکھو غلطی تمہاری ہے۔ اگر وہ کچھ کہیں تو چپ چاپ سن لینا، جواب دینے مت کھڑی ہو جانا''۔ وہ اس سے التجائیہ انداز میں بولی تھی، وہ معاذ کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ سامنے مسز ظفر بھی بیٹھی ہوئی تھیں، اسے دیکھ کر انہوں نے بہت بُرا منہ بنایا تھا۔ اسے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہتا وہ ہنوز گفتگو میں مصروف تھا۔ اپنی تمام تر بولڈنیس کے باوجود تھوڑا تھوڑا ڈر تو اسے لگ ہی رہا تھا۔ شاید اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا، اس لیے۔ فون بند کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کچھ احساس ہے آپ کو آج آپ نے کیا حرکت کی ہے''۔ وہ برہمی سے گویا ہوا تھا۔

''جو شخص ایک فائل سنبھال کر نہ رکھ سکے، اس پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ کا رویہ کسی پیشہ ورانہ انسان کا رویہ لگ رہا ہے۔ کم سے کم مجھے تو نہیں لگ رہا۔ پیشہ ورانہ ایسے نہیں ہوتے''۔ وہ چیخ چلا نہیں رہا تھا۔ آرام سے بات کر رہا تھا، مگر انداز بہت برہم اور ناراضگی لیے ہوئے تھے۔ وہ اپنی عادت کے برخلاف چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''معاذ میں نے تو صرف دانیال کے کہنے پر کہ نئی ہیں، انہیں کام سکھانا ہے، سوچ کر فائل دے دی تھی کہ اس پر میرے ساتھ کام بھی کروائیں اور دیکھیں کہ کام کس طرح ہوتا ہے''۔ مسز ظفر نے ایک سخت نگاہ اس کی طرف ڈال کر معاذ کو مخاطب کیا۔

''آپ کو بھی سوچ سمجھ کر چلنا چاہیے۔ کام سکھانے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ کسی غیر ذمہ دار شخص کو اتنی اہم فائل دے دیتیں''۔ وہ ان کی بات کے جواب میں بڑے خشک اور روڈ انداز میں بولا تھا اور اس کی بات پر مسز ظفر کا منہ مزید پھول گیا تھا۔

''اگر ایسے ہی چلتا رہا تو ہو چکا کام۔ آپ لوگ تو بنا بنایا امیج خراب کر دیں گے۔ مارکیٹ میں کتنا سخت مقابلہ ہے۔ اس پر اگر ہم لوگ اس طرح اپنے کلائنٹس کے ساتھ ڈیل کرنے لگے تو کون آئے گا، ہمارے پاس۔ کلائنٹ کے پاس جب ہم سے بہتر چوائس موجود ہوگی جہاں اس کا کام وقت پر اور زیادہ اچھی طرح ہوگا تو وہ یہاں خوار ہونے کیوں آئے گا''۔ وہ اپنے سامنے بیٹھی دونوں خواتین سے بہت پروفیشنل اور روڈ انداز میں بولا تھا۔

''بہر حال میں نے ابھی تو انہیں بھیج دیا ہے۔ دوپہر تین بجے کا ٹائم طے ہوا ہے، ان کے ساتھ میٹنگ کے لیے۔ مجھے فائل ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنی ٹیبل پر چاہیے''۔ اب کے مخاطب صرف وہ تھی۔ اس کا دوٹوک، انتہائی سخت اور بے لچک انداز اسے سر بھی نہیں اُٹھانے دے رہا تھا۔

''کیا ہوا، کیا انہوں نے تمہیں ڈانٹا''۔ اسے اندر آتا دیکھ کر ایمن بے تابی سے اُٹھ گئی تھی۔ ہمایوں اور حمنیٰ بھی اُدھر ہی متوجہ تھے۔

''ایک گھنٹے کے اندر فائل ڈھونڈنے کا الٹی میٹم دیا ہے۔'' وہ حمنیٰ اور ہمایوں کی وجہ سے خود کو نارمل پوز کرتے ہوئے بولی تھی۔ ایمن نے مزید کچھ پوچھنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اس کے ساتھ دوبارہ فائل کی تلاش شروع کر دی تھی۔

''ارے یہ کیا ہے''۔ ایمن اس کی ٹیبل کے کونے میں دو تین کتابوں کے نیچے دبی ایک فائل نکالتے ہوئے بولی تھی۔

''یہی تو ہے، اوہ تھینکس گاڈ''۔ رامیہ نے سکون کا سانس لیا تھا اور ایمن نے اسے بُری طرح گھور کر دیکھا تھا۔

''تم کبھی نہیں سدھرو گی۔ یہ اس طرح یہاں رکھنے کی چیز تھی۔ حد ہے لاپروائی کی۔'' وہ اس کی بات اَن سنی کر کے معاذ کے کمرے میں آئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، اس لیے وہ ایسے ہی اندر آ گئی۔ دانیال اور وہ بیٹھے کسی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس رہے تھے۔

''دوسروں کو مصیبت میں ڈال کر خود قہقہے لگا رہے ہیں''۔ اس نے جل کر سوچا۔ اسے دیکھ کر دونوں چپ ہو گئے تھے۔

''فرمایئے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ جواب میں کچھ کہنے کی بجائے اس نے فائل اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

''مل گئی یہ؟'' رامیہ کا دل چاہا کہے ''نہیں ابھی ڈھونڈ رہی ہوں۔ مل گئی ہے تب ہی سامنے رکھی نظر آ رہی ہے''۔

''ٹھیک ہے آپ جائیں۔'' وہ ایک نظر اس پر ڈال کر بولا تھا۔ دانیال شاید اس تمام قصے سے لاعلم تھا۔ اس لیے خاموشی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جس خاموشی سے آئی تھی، ویسے ہی نکل بھی گئی تھی۔

''اگر عابد ماموں کا خیال نہ ہوتا تو میں اچھی طرح موصوف کا دماغ درست کر دیتی''۔ وہ پیپسی کا سپ لیتے ہوئے بہت بُرا منہ بنا کر بولی تھی۔

''چوری اور سینہ زوری اسے ہی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے تمہیں کچھ غلط تو نہیں کہا۔ غلطی بہر حال تمہاری تھی''۔ ایمن کی بات اسے بُری طرح تپا گئی تھی۔

''میری دوست ہو کر تم میرے خلاف بول رہی ہو''۔

''اپنے اندر برداشت پیدا کرو اور اب اس قصے کو ختم کرو''۔ ایمن نے فروٹ سیلڈ کھاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں مبارک ہو، وہاں جانا۔ میں تو کل سے نہیں جانے کی۔ پتا نہیں خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ سیدھے منہ بات تو کرتے نہیں ہیں۔ اتنے دن بھی صرف تمہاری وجہ سے برداشت کیا ہے۔ خود کو کوئی بہت اونچی شے سمجھتے ہیں۔ موصوف سن گلاسز لگا کر سگریٹ کا دھواں اُڑاتے اور عالی شان گاڑیوں میں بیٹھ کر وہ خود کو کوئی بہت بڑا لارڈ سمجھتے ہیں اور ہم بے چاری تو انہیں غریب غرباء نظر آتی ہیں۔ سمجھتے ہوں گے، چپ چاپ سن لیں گی۔ میرے پاپا کی ڈریسنگ دیکھیں تو دنگ رہ جائیں گے۔ خود کو تو کلر سینس تک نہیں ہے''۔ وہ کھانا پینا چھوڑ کر مسلسل بولنے میں مصروف تھی۔ ایمن اس کے تپے ہوئے انداز پر ہنس پڑی تھی۔ وہ آفس سے واپسی میں رامیہ کو ڈراپ کر کے گھر جانے کے بجائے اس کے ساتھ اندر آ گئی تھی اور اب

اسے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی کہ وہ اتنی سی بات پر سب چھوڑ چھاڑ کر گھر نہ بیٹھے۔ دو گھنٹوں کی مغز ماری کے باوجود وہ اسے قائل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ دونوں لاؤنج میں آئیں تو پاپا وہاں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

''کیا مسئلہ ہو گیا ہے بیٹا؟'' وہ شاید ان لوگوں کی تھوڑی بہت گفتگو سن چکے تھے۔ ان کے پوچھنے کے دیر تھی۔ ایمن اسے بولنے کا موقع دیئے بغیر نان اسٹاپ شروع ہو گئی تھی اور تمام قصہ من وعن سنا دیا تھا۔

''غلطی تو بیٹا آپ ہی کی ہے اور انہوں نے آپ کو ناجائز تو کچھ نہیں کہا۔ اپنے اندر برداشت پیدا کریں۔ ہاں یہ میں کبھی بھی نہیں کہوں گا کہ کسی کی غلط بات سن کر آ جائیں۔ جہاں آپ کو پتا ہو کہ میں حق پر ہوں تو وہاں اپنی بات پر ڈٹ جائیں، سامنے والے کو ایک کی چار سنائیں''۔ پاپا کی بات کا اختتامی حصہ ممی نے بھی سن لیا تھا۔

''آپ اور اسے شہ دیں۔ پہلے ہی یہ کون سی کم ہے۔ خاندان بھر میں ہر ایک یہی کہتا پھرتا ہے کہ صبا نے اپنی بڑی بیٹیوں کی تو بہت اچھی تربیت کی ہے۔ یہ چھوٹی ہری مرچ پتا نہیں کس پر چلی گئی ہے۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولی تھیں۔

''ہاں وہ اللہ میاں کی گائے نداباجی اور اخلاقیات کی ماری حنا تو سب کو اچھی ہی لگیں گی۔ منہ پر کسی کو جواب دینا جو نہیں آتا، بعد میں آ کر آپ کے سامنے اپنے دُکھڑے روتی ہیں۔ ممی، خالہ تو پکی ساس بن گئی ہیں، خالہ بھانجی کا رشتہ تو جیسے ختم ہو گیا''۔ وہ حنا کے لہجے میں عقل اُتارتے ہوئے بولی۔ پاپا اور ایمن اس کے انداز پر ہنس پڑے تھے، جبکہ ممی مزید غصے میں آ گئی تھیں۔

''تمہاری ہونے والی ساس سے تو مجھے ابھی سے ہمدردی ہے۔'' وہ ناراضگی سے بولی تھیں۔

''آنٹی وہ بے چاری تو جس دن یہ پیدا ہوئی ہو گی، اسی دن دہشت سے مر گئی ہوں گی۔'' ایمن نے لقمہ دیا تھا اور وہ پاپا کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے خاموش رہی تھی، ورنہ ایمن اور اپنی ہونے والی ساس کی شان میں ٹھیک ٹھاک قصیدہ خوانی کرتی، کیونکہ تمام بات ایمن کی وجہ سے پاپا کے علم میں آ چکی تھی، لہٰذا اب وہاں نہ جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ اگلے روز خود پر بڑا جبر کر کے آفس آئی تھی۔ دانیال نے اسے اور ایمن کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔

''کیسا لگ رہا ہے، آپ لوگوں کو یہاں پر۔ ہمارے ہاں کا ماحول، کام کرنے کا طریقہ کار، آپ لوگوں کو کوئی شکایت تو نہیں''۔ وہ بڑی سنجیدگی سے دریافت کر رہا تھا، ان دس دنوں میں یہ پہلا موقع تھا۔ وہ ان لوگوں سے اس طرح بات کر رہا تھا۔ ورنہ انہیں مسز ظفر کے سپرد کرنے کے بعد وہ ان دونوں سے تقریباً لاتعلق ہی ہو چکا تھا۔

''یہاں کا ماحول بہت اچھا ہے اور ہمیں یہاں سیکھنے کو بھی بہت کچھ مل رہا ہے۔'' ایمن فوراً بولی تھی۔ دانیال اس کے بعد فیلڈ سے متعلق ان لوگوں سے بات کرنے لگا تھا۔ رامیہ تمام گفتگو کے دوران خاموش رہی تھی۔

''مس رامیہ! بہت چپ ہیں''۔ وہ مُسکراتے ہوئے بولا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی معاذ اندر داخل ہوا تھا۔

''اسلام علیکم''۔ وہ مشترکہ سب پر سلامتی بھیجتا کرسی سنبھال چکا تھا۔

''آپ لوگوں کا رزلٹ تو ابھی نہیں آیا ناں''۔ معاذ کے سلام کا جواب دے کر وہ دوبارہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''نہیں ابھی نہیں آیا''۔ جواب پھر ایمن ہی نے دیا تھا۔

''کیا ارادے ہیں، خالی فرسٹ ڈویژن آ رہی ہے یا کوئی پوزیشن وغیرہ بھی''۔

''پوزیشن تو رامیہ ہی کی آئے گی۔ پچھلے سمسٹر میں بھی اس کی تھرڈ پوزیشن میں صرف ۵ نمبر ہی کم رہ گئے تھے''۔ ایمن کی اس غلط بیانی پر وہ اسے گھور کر رہ گئی۔ پانچ دس منٹ مزید وہاں بیٹھ کر وہ دونوں واپس اپنے کمرے میں آ گئی تھیں۔

''کیا تم چپ گھنوں کی طرح بیٹھی تھی۔ ویسے کیسی قینچی کی طرح زبان چلتی ہے اور جہاں بیٹھ کر بولنا چاہیے تھا، وہاں چپ شاہ کا روزہ رکھے بیٹھی رہیں''۔ ایمن نے اسے گھرکا تھا۔

''جن لوگوں سے میرا بات کرنے کا دل نہیں چاہتا، میں نہیں کرتی اور تم نے وہاں وہ فضول بکواس کیوں کی تھی''۔ وہ چڑ کر بولی تھی۔

''یار صرف تمہارا اچھا امپریشن ڈالنے کے لیے تاکہ ان لوگوں کو پتا چلے کہ ان کے سامنے ایک پوزیشن ہولڈر لڑکی بیٹھی ہے اور ویسے بھی ۵ اور ۵۰ میں صرف ایک زیرو ہی کا تو فرق ہے''۔ ایمن شرارتی مُسکراہٹ چہرے پر لیے بولی اور رامیہ غصے کے باوجود ہنس پڑی تھی۔

اگلے روز وہ اپنے نارمل موڈ میں تھی۔ اسے جتنی جلدی غصہ آیا کرتا تھا، اتنی ہی جلدی اُتر بھی جاتا تھا۔ وہ غصے کی تیز تھی۔ تحمل اور برداشت نام کو بھی نہیں تھا، مگر ایمن کو اس کی یہی بات سب سے زیادہ پسند تھی کہ وہ دوسروں کی طرف سے فوراً دل صاف کر لیا کرتی تھی۔ لڑائی جھگڑا کیا بُرا بھلا کہا اور بعد میں بالکل نارمل، ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

وہ اور ایمن مسز ظفر کے کمرے میں بیٹھی تھیں، جب کسی کام سے دانیال بھی وہیں آ گیا۔ انہیں دیکھ کر وہ گرم جوشی سے مُسکراتا ہوا مسز ظفر سے مخاطب ہوا۔

''اور سنائیں مسز ظفر، دونوں معزز خواتین کیسی جا رہی ہیں''۔ جواب میں وہ ایمن کے ساتھ ساتھ رامیہ کے بارے میں بھی اچھی رائے دینے پر مجبور تھیں۔ اس نے اس روز کے بعد سے بڑی سنجیدگی اور توجہ سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس میں بہت بڑا ہاتھ پاپا کا بھی تھا، جنہوں نے اسے خود کو اپنے کام کے ذریعے منوانے اور اپنی اہمیت دوسروں کے سامنے بڑھانے پر کافی سیر حاصل لیکچر دیا تھا۔

''ویری گڈ۔ ایسے ہی دل لگا کر کام کریں''۔ دانیال ان کے تبصرے کے جواب میں ان دونوں سے مخاطب ہوا تھا۔ عاشق مرزا صاحب کی انٹری پر وہ جو بڑی سنجیدگی سے بیٹھی پہلے مسز ظفر اور اب دانیال کے کمنٹس سن رہی تھی۔ ایک دم سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

یہ عاشق مرزا صاحب بھی بڑے مزے کی چیز تھے۔ شروع شروع میں ایک دو بار ایمن نے بزرگ سمجھتے ہوئے ان سے ذرا زیادہ ہی بات کر لی تو وہ پتا نہیں کس غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور اب روزانہ تین چار چکر ان کے سیکشن کے ضرور لگایا کرتے، حالانکہ وہ اکاؤنٹس کے شعبے میں تھے مگر اپنا کام کاج چھوڑ کر اکثر ایمن کے پاس آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ایمن ان کی حرکتوں پر چڑنے کے باوجود انہیں کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اپنے ڈیڈی کی ایج کے بندے کو خود میں انٹرسٹڈ دیکھ کر وہ رامیہ کے مذاق کا خوب ہی نشانہ بنتی تھی۔

''آیئے عاشق صاحب تشریف رکھیے''۔دانیال خوش اخلاقی سے بولا تھا۔

''باہر اتنا زبردست موسم ہو رہا ہے۔اس برستے موسم میں تو گرما گرم سموسے ہونے چاہئیں۔کیوں مس ایمن''۔ان کی اس بات پر رامیہ نے ٹیبل کے نیچے سے ایمن کو ٹانگ ماری تھی۔ان کے مس ایمن میں اتنی مٹھاس ہوتی کہ رامیہ سے ہنسی روکنی مشکل ہو جاتی تھی۔ایمن زبردستی مسکرا کر بولی تھی۔

''جی ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ''۔رامیہ کی طرف دیکھنے سے وہ قصداً گریز کر رہی تھی۔انہوں نے فوراً پیون کو بلا کر سموسے اور چائے لانے کو کہا تھا۔رامیہ نے ایمن کو دوبارہ ٹانگ ماری تو دانیال نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔پہلی مرتبہ اس کی ٹانگ لگنے کو تو وہ غلطی سمجھ کر نظر انداز کر گیا تھا، وہ ہنسی روکنے کی کوشش میں بے حال ہوتی ایمن کی طرف دیکھ رہی تھی۔عاشق صاحب بظاہر سب کے ساتھ باتیں کرتے گاہے بگاہے ایک پیار بھری نظر ایمن پر بھی ڈال لیتے تھے۔

''ایکسکیوزمی، میں ابھی آتی ہوں''۔ہنسی جب بالکل ہی برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ فوراً معذرت کرتی باہر نکلی تھی۔Reception پورا خالی پڑا تھا، وہ وہاں صوفے پر بیٹھ کر ہنسنے لگی تھی۔کسی سے فون پر بات کرتی زارا نے اسے تعجب سے دیکھا تھا۔ہنستے ہنستے آنکھوں سے پانی نکلنے لگا تھا۔آفس میں داخل ہوتا معاذ اسے اکیلے بے وقوفوں کی طرح ہنستے دیکھ کر ٹھٹھک کر رُک گیا تھا۔اسے دیکھ کر ایک دم رامیہ کی ہنسی کو بریک لگ گیا تھا۔

''اسلام علیکم''۔وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''وعلیکم سلام، خیریت سے ہیں آپ۔طبیعت وغیرہ ٹھیک ہے۔''وہ اس کا طنز سمجھ گئی تھی۔

''جی الحمدللہ خیریت ہے۔ایمن نے پرسوں مجھے ایک جوک سنایا تھا، اسی پر ہنس رہی تھی''۔

''ماشاءاللہ بڑی ذہین ہیں آپ''۔وہ طنزیہ انداز میں اسے جواب دیتا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور وہ بُرا سا منہ بناتی واپس ایمن وغیرہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی۔

☆

ایمن اور رامیہ لنچ کرنے کے ایف سی آئی تھیں۔آفس سے قریب ہونے کی وجہ سے وہ دونوں اکثر لنچ یہیں کیا کرتی تھیں۔دونوں ہی فاسٹ فوڈز بالخصوص کے ایف سی اور میکڈونلڈ کی دیوانی تھیں۔لنچ ٹائم ہونے کی وجہ سے بے تحاشا رش تھا۔وہ دونوں اپنا Meal سنبھالے جلدی سے خالی نظر آتی ایک ٹیبل کی طرف بڑھ گئیں۔دونوں ہی نے اپنی پچھلی ٹیبل پر بیٹھے دانیال اور معاذ کو نہیں دیکھا تھا۔

''خبردار اب اگر تم نے مجھے ان بڑے میاں کا نام لے کر چھیڑا تو میں تمہیں قتل کر دوں گی''۔ایمن نے بیٹھتے ساتھ ہی رامیہ کی کسی بات کے جواب میں کہا تھا۔رامیہ اس کے چڑچڑے انداز پر ہنس دی تھی۔

''کوئی ڈھنگ کا بندہ تو پسند کرتا نہیں ہے۔یونیورسٹی میں بھی جھک ماری اور اب آفس میں بھی کاش میں کسی رومانٹک ناول کی ہیروئن ہوتی، جس پر اس کے ہینڈسم اور اسمارٹ باس پہلے ہی دن مہربان ہو جاتے۔یہاں تو باس رسمی باتوں کے علاوہ منہ ہی نہیں لگاتے''۔وہ اپنی پلیٹ میں

دیر تھی، وہ ایک دم ریلیکس ہو کر بیٹھ گئی۔

''میرے مشاغل کی تو لمبی چوڑی لسٹ ہے۔ ویسے Top three میں کھانا، سونا اور بے تحاشا بولنا شامل ہیں''۔ دانیال جو بڑی دیر سے اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا، اس کے اتنی صاف گوئی سے اپنے مشاغل بتانے پر بے اختیار ہنس پڑا۔

''یہ خود سے بات شروع کرتے ہچکچا رہا ہے۔ مجھے خود ہی ایمن کا ذکر شروع کر دینا چاہیے''۔ وہ خود سے کہتی دانیال کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مُسکرائی اور بولی۔

''ویسے تو ہم لوگ بیسٹ فرینڈ ہیں، لیکن عادتیں بالکل مختلف ہیں۔ ایمن تو ہر کام وقت پر کرتی ہے۔ اس کی لائف میں بڑا ڈسپلن ہے۔ چاہے چھٹی کا دن ہو، وہ صبح سویرے اُٹھ جاتی ہے۔'' وہ دوستی کا حق ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

(کوئی بات نہیں، اتنے جھوٹ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ ویسے بھی اس جھوٹ پر جو کسی ''مصلحت'' کی وجہ سے بولا گیا ہو، بالکل ناراض نہیں ہوتے)

خود کو تسلی دی گئی تھی۔

''مجھے تو اس طرح کے لوگ بالکل نہیں پسند۔ یہ کیا کہ زندگی کو بالکل فوجیوں کے انداز میں گزارا جائے۔ مجھے تو ایسے لوگ پسند ہیں جو زندگی کو اپنے من پسند انداز میں گزاریں۔ کام سر پر نہ سوار کریں''۔ دانیال کا جواب اس کی توقعات کے بالکل برخلاف تھا۔

''خوامخواہ جھوٹ بول کر گناہ کمایا۔ پہلے سامنے والے کی پسند ناپسند تو معلوم کر لو۔ نادان دوست اسے ہی کہتے ہیں''۔ اسے نے خود کو ڈانٹا۔

''بائی داوے آج مس ایمن نہیں آئی ہیں تو آپ جائیں گی کیسے؟'' وہ یقیناً اس بات سے آگاہ تھا کہ روزانہ وہ ایمن کی گاڑی میں آتی ہے۔

''پاپا آئیں گے لینے''۔ وہ چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے بولی تھی۔

''ایسا کریں انہیں فون کر کے منع کر دیں۔ خوامخواہ انہیں تکلیف ہوگی۔ آپ کا گھر تو میرے راستے ہی میں آتا ہے، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا''۔ وہ آج اسے مسلسل حیران کر رہا تھا۔

''ایسا کریں، ابھی فون کر دیں۔ کہیں بعد میں آپ بھول نہ جائیں۔'' وہ اپنا موبائل اسے پکڑاتا ہوا بولا۔ اپنی تمام تر بولڈنیس کے باوجود وہ ایک دم نروس سی ہو گئی تھی۔ بہرحال پاپا کو فون کر کے اس نے منع کر دیا تھا۔

دانیال کے برابر گاڑی میں بیٹھ کر اسے اس کی علاوہ اور کوئی پرابلم نہیں تھی کہ یہ آج اچانک اس طرح مہربان کیوں ہوا ہے۔ اپنے صبح والے خیالات پر بھی اسے نظر ثانی کرنی پڑ رہی تھی، کیونکہ ایمن کے بارے میں تو اس نے ایک بھی بات نہیں کی تھی۔

''آپ مائینڈ تو نہیں کریں گی، اگر میں آپ سے ایک پرسنل سوال کروں''۔ دانیال نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

''جی پوچھیں''۔

''Are You Engaged''۔ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر بولا تھا اور رامیہ کا دِل دھک سے رہ گیا تھا۔ عام حالات میں دانیال میں کوئی

کیچ اپ ڈالتے ہوئے بڑے دکھ بھرے انداز میں بولی۔

''کیا پتا دانیال پہلے سے شادی شدہ ہوں، ورنہ اتنی خوب صورت لڑکیوں کو کون اگنور کرسکتا ہے''۔ رامیہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کے خوب صورت لڑکیاں کہنے پر دانیال اور معاذ دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیئے تھے۔

''کوئی نہیں شادی شدہ، میں نے ماموں سے پوچھا تھا'' ایمن نے اس کی بات رد کردی تھی۔

''تم نے ماموں سے یہ بات پوچھ لی۔ تمہیں شرم نہیں آئی''۔ رامیہ برگر واپس پلیٹ میں رکھ کر حیرانی سے بولی تھی۔

''بھئی باتوں باتوں میں۔ ایسی پاگل بھی نہیں ہوں''۔ ایمن نے بڑے مزے سے جواب دیا۔ ''ویسے معاملہ کچھ کچھ سیریس لگ رہا ہے۔ ماموں سے انفارمیشن بھی حاصل کرلی گئیں اور مجھے پتا تک نہیں''۔ رامیہ کی بات پر وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

''تمہیں کچھ بتانے کا فائدہ۔ کون سا تم نے میرے لیے کچھ کرنا ہے۔ لوگوں کی اتنی اچھی اچھی فرینڈز ہوتی ہیں۔ ایک تم ہو، ایک دم بکواس''۔ ایمن نے اسے غیرت دلانے کی کوشش کی تھی۔

''بیٹا تمہارے یہ زرین خیالات آج ہی آنٹی کو جا کر بتاؤں گی اور کہوں گی کہ جلدی سے کچھ انتظام کریں، لڑکی ہاتھوں سے نکل رہی ہے''۔ رامیہ نے اسے دھمکایا تھا۔

''ہاں تم سے اور اُمید بھی کیا کی جاسکتی ہے''۔ وہ جل کر بولی تھی۔ دانیال اور معاذ ان دونوں کی باتوں پر مُسکراتے وہاں سے اُٹھ گئے تھے۔ وہ اپنی لن ترانیوں میں مصروف انہیں دیکھ نہیں پائی تھیں۔

اگلا دن اپنے ساتھ بہت سی انوکھی باتیں لایا تھا۔ ایمن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے وہ نہیں آئی تھی۔ رامیہ کو صبح پاپا نے آفس ڈراپ کیا تھا۔ گھر میں دوسری گاڑی موجود تھی، اسے ڈرائیونگ بھی آتی تھی، مگر ممی اسے اکیلے گاڑی ڈرائیو کرنے کی اجازت کبھی بھی نہیں دیتی تھیں۔

''گاڑی تمہارے حوالے کردی تو میں تو سارا وقت مصلے پر بیٹھی رہوں گی''۔ وہ اس کی لاپروائیوں اور لاابالی پن سے عاجز تھیں۔ دانیال کے بلاوے پر وہ اس کے کمرے میں گئی تو وہ بڑی فرصت سے بیٹھا، اسی کا انتظار کررہا تھا۔ اسے آکر بیٹھے ایک منٹ ہی ہوا ہوگا کہ پیون نے چائے لا کر رکھ دی۔ اس کی آنکھوں پر نظر پڑی تو وہ مُسکرا کر بولا۔

''میرا چائے پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔ سوچا اکیلے کیوں پیوں۔ اس لیے آپ کو بلوالیا۔ ویسے آپ بزی تو نہیں تھیں''۔ وہ دِل ہی دِل میں حیران ہوتی نفی میں گردن ہلا گئی تھی۔ اس سے پہلے اتنے دنوں میں تو کبھی اس طرح چائے پینے کے لیے نہیں بلوایا گیا تھا۔

''اور سنائیں پڑھائی کے علاوہ آپ کے کیا مشاغل ہیں''۔ وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بولا تھا۔ اس طرح غیر متعلقہ گفتگو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اچانک اس کے دل میں ایک اور خیال آیا۔

''ہوسکتا ہے یہ مجھ سے ایمن کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہو۔ آفٹر آل وہ اتنی چارمنگ اور کیوٹ ہے، اسے کوئی بھی پسند کرسکتا ہے۔ اس نے یہ سوچا ہوگا کہ آج ایمن نہیں آئی، یہ بہترین موقع ہے اس کی دوست سے اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا''۔ یہ خیال آنے کی

برائی نہیں تھی، مگر اپنی دوست کے حق پر ڈاکہ ڈالنے کا تو وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ایمن کو پتا چلا تو اسے کتنا دُکھ ہوگا۔ میں اسے بتاؤں گی ہی نہیں کہ دانیال نے ایسی کوئی بات کہی ہے۔

''میری انگیجمینٹ تو بچپن ہی میں میرے فرسٹ کزن سے ہوگئی تھی، لیکن آپ نے یہ بات کیوں پوچھی''۔ وہ ایک دم معصوم بن گئی تھی اور دانیال اس کے جواب پر پتا نہیں کیا سوچ کر ہنس پڑا تھا۔ اپنی بات کے جواب میں اس کی یہ معنی خیز ہنسی رامیہ کی سمجھ سے باہر تھی۔

''دوست ہو تو ایسی ہو، مان گئے آپ کو، مس ایمن واقعی لکی ہیں کہ انہیں آپ جیسی مخلص فرینڈ ملی ہے''۔ دانیال نے مُسکراہٹ دباتے ہوئے قدرے شوخی سے کہا تھا۔

''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں''۔ وہ آخر کار بُری طرح چڑ گئی تھی۔

''صرف یہی کہ ایسی دوست اور کہاں ہوگی جو دوست کی خاطر اچانک اپنی منگنی کروالے، وہ بھی بچپن میں''۔ وہ دوبارہ ہنسا تھا۔ رامیہ کا سر شرمندگی سے جھک گیا تھا، مگر وہ یہ ضرور سوچ رہی تھی کہ اسے کیسے پتا چلا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔

''بھئی یہ صرف ایک چھوٹا سا ڈرامہ تھا۔ دراصل میں خود کو چیک کر رہا تھا کہ مجھ میں کامیاب اداکار بننے کی صلاحیت ہے یا نہیں''۔ دانیال کی بات پر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھایا اور جو دل میں آ رہا تھا، وہ فوراً ہی کہہ بھی دیا۔

''آپ ایمن کو پسند کرتے ہیں ناں''۔

''مان گئے تم واقعی جینئس ہو، تم سے فرسٹ ٹائم مل کر میں نے تمہارے بارے میں یہی رائے قائم کی تھی کہ تم ایک ذہین لڑکی ہو۔ ویسے تم نے میری بے تکلفی کا بُرا تو نہیں مانا''۔ وہ بڑے مزے سے اس کی بات تسلیم کر گیا تھا اور رامیہ خوشی سے چیختے چیختے رہ گئی تھی۔

''لیکن خبردار جو ابھی اپنی دوست صاحبہ کو کچھ بتایا ہو''۔ وہ اسے اپنے اگلے پروگرام سے آگاہ کرنے لگا۔

''لیکن اس طرح تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی''۔ وہ معترض تھی۔

''نہیں ہوگی۔ کم آن کیوں اگر مگر کر رہی ہو۔ تھوڑی تھرل رہے گی، مزہ آئے گا''۔ اسے گیٹ پر ڈراپ کرتا دانیال اس سے وعدہ لے چکا تھا کہ وہ ابھی ایمن کو کچھ نہیں بتائے گی۔

☆

''کیا واقعی تمہیں دانیال نے گھر ڈراپ کیا تھا؟'' ایمن کو جیسے یہ بات بڑی غیر یقینی سی لگ رہی تھی۔ سونے سے پہلے اس نے فون کر کے ایمن کی خیریت دریافت کی تھی اور ایمن کے پوچھنے پر کہ آج وہ واپسی میں کیسے آئی اسے دانیال کے ساتھ آنے کا بتایا تھا۔

''کیوں تم میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں جو تمہیں ڈراپ کرنے کی آفر کی گئی۔ بے چاری زار اروزانہ بس میں جاتی ہے۔ اسے تو کبھی ایسی کوئی آفر نہیں کی گئی''۔ ایمن کا جیلس اسٹائل رامیہ کو بہت مزہ دے رہا تھا۔

''چلو یہ بات تم خود کل دانیال سے پوچھ لینا''۔ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے سنجیدگی سے بولی تھی۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے، کچھ پوچھنے کی''۔ وہ ایک دم خود کو لاپرواپوز کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی اور پھر دانستہ طور پر اس نے گفتگو کا موضوع تبدیل کر دیا تھا، مگر اس کے لہجے میں چھپی بے چینی رامیہ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ سونے سے پہلے تک وہ ایمن کی کیفیت انجوائے کرتی رہی تھی۔

''ایمن یوسف بندہ تمہیں ٹھیک کا ٹکرایا ہے۔ سیر کو سوا سیر اسے ہی کہا جاتا ہے''۔ وہ مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

☆

صبح ان لوگوں کو آفس آ کر بیٹھے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی ہوگی کہ دانیال نے اسے انٹر کام پر اپنے کمرے میں بلایا۔ ایمن بظاہر کام میں مصروف تھی مگر اس کی تمام حسیات اِدھر ہی مرکوز تھیں۔ وہ ایک سرسری نظر ایمن پر ڈالتی اُٹھ گئی تھی۔ دانیال نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس کی زبانی ایمن کی کل کی تمام باتیں سن کر وہ بڑا محظوظ ہو رہا تھا۔

''لیکن جب اسے سب پتا چلے گا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی''۔ رامیہ کو تھوڑا تھوڑا ایمن کی ناراضی کا خوف بھی تھا۔

''تم یہ بتاؤ تمہیں مزہ آ رہا ہے یا نہیں''۔ وہ اطمینان سے بولا تھا۔

''مزہ تو خیر آ رہا ہے۔ ہمیشہ ہر شرارت ہم دونوں نے مل کر کی ہے اور ہماری شرارتوں سے آج تک کوئی محفوظ نہیں رہا۔ پہلی مرتبہ ایسا ہو رہا ہے کہ میں اسے ستا رہی ہوں''۔ وہ ایمن کی رونی شکل ذہن میں لاتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔

''بس تو پھر فکر چھوڑو اور جہاں تک ناراض ہونے کا سوال ہے تو اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں کہ وہ تم سے ناراض نہیں ہوگی''۔ وہ تسلی دیتا ہوا بولا تھا۔

''چائے پیو گی؟''

''اتنی گرمی میں چائے''۔ اس نے فوراً انکار کیا۔

''اچھا کولڈ ڈرنک''۔

''اگر میری خاطر مدارت کرنے کا اتنا ہی موڈ ہے تو میں تو آئس کریم کھاؤں گی''۔ دانیال اس کے بے تکلف انداز پر ہنس پڑا تھا۔ پھر دانیال کے ساتھ بیٹھ کر اپنی فیورٹ پائن ایپل آئس کریم کھاتے ہوئے اس نے دُنیا زمانے کی کتنی ساری باتیں کی تھیں۔ اسے کسی بھی نئے بندے سے بے تکلف ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ بس شرط صرف یہ تھی کہ سامنے والا اس کا ہم مزاج ہو، اسے روکھے پھیکے، ڈل اور خشک مزاج لوگ زہر لگتے تھے اور دانیال تو اسے بالکل اپنی ٹائپ کا لگا تھا۔ زندگی کو انجوائے کرنے والا۔ اس کا فرسٹ امپریشن ان لوگوں پر کتنا مختلف پڑا تھا۔ وہ لوگ اسے ایک پکا پروفیشنل اور قدرے خشک مزاج سا بندہ سمجھتی تھیں، جبکہ وہ تو بہت پیاری نیچر کا مالک تھا۔ رامیہ، ایمن کی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔ ایمن نے اس سے پوچھا نہیں تھا کہ دانیال نے کیوں بلایا ہے، مگر بے چینی اس کے ہر انداز سے ظاہر تھی۔ رامیہ نے آ کر بڑے آرام سے دوبارہ اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ایمن نے دو تین مرتبہ اس کی طرف دیکھا کہ شاید اب وہ بتائے گی کہ بلاوا کس خوشی میں تھا، مگر وہ تو اس طرح کام میں مگن تھی، جیسے اس سے زیادہ اہم کوئی اور بات ہی نہ ہو۔

☆

''سنا ہے میں بہت پوز کرتا ہوں۔ اپنے بارے میں مجھے کئی خوش فہمیاں ہیں۔ خود کو کسی ڈیوک یا لارڈ سے کم نہیں سمجھتا''۔ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بڑے اعتماد سے بولا تھا۔ وہ صرف ایک پل کے لیے نروس ہوئی تھی۔ اگلے لمحے وہ دانیال کو گھور کر دیکھ رہی تھی۔

''اسے کیا گھور رہی ہیں۔ میری بات کا جواب دیں''۔ وہ ٹیبل پر دونوں ہاتھ جما کر کھڑا اپنے جواب کا منتظر تھا۔

''جی ہاں آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے''۔ ڈرتی تو وہ کسی سے نہیں تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بڑے آرام سے بولی تھی اور اس کے جواب پر وہ دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناں یہ لڑکی بہت مختلف ہے۔ بہت بولڈ اور با اعتماد''۔ دانیال نے معاذ کو مخاطب کر کے کی تو اس کی تعریف ہی تھی، مگر اسے پھر بھی دانیال پر بے تحاشا غصہ آیا تھا۔

''میں نے آپ پر بھروسہ کر کے ایک بات کہی تھی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ اس کا ڈھنڈورا سارے جگ میں پیٹ دیں''۔ اس نے کل ہی باتوں باتوں میں دانیال سے اس کی اور معاذ کی دوستی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کے بارے میں یہ کمنٹس دیئے تھے۔

''بھئی میں نے سوچا کہ میرے دونوں فرینڈز کے بیچ مس انڈر اسٹینڈنگ اور ٹینشن نہیں رہنی چاہیے۔ اس لیے معاذ کو ساری بات بتا دی''۔ وہ اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

''میرا خیال ہے میرے دونوں فرینڈز کے بیچ بھی کسی قسم کی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے۔ میں بھی جا کر ایمن کو ساری بات بتا کر آتی ہوں''۔ اس کے لہجے میں چھپی دھمکی پر معاذ ہنس پڑا تھا، جبکہ دانیال فوراً اسے منانے لگا تھا۔

''تمہیں بُرا لگا تو سوری۔ میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ تم نے معاذ کے بارے میں جو غلط رائے قائم کی ہے، وہ دور ہو جائے۔ اس سے بھی میں نے یہی کہا تھا۔ مگر ان موصوف نے آ کر ساری بات حرف بہ حرف دُہرا کر کام خراب کر دیا''۔ وہ معاذ کو گھورتا ہوا بولا تھا۔

''اچھا چلو پینلٹی کے طور پر آج لنچ میری طرف سے، وہ بھی تمہاری کسی پسند کی جگہ پر''۔ دانیال نے اسے لالچ دیا تو وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

''شکریہ، لنچ تو میں ایمن کے ساتھ کروں گی''۔ معاذ جو اسے بڑی توجہ سے بغور دیکھ رہا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے دانیال سے بولا۔

''تمہاری قریب کی نظر کمزور ہو گئی ہے''۔ رامیہ نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے جملے کی معنی خیزی تو وہ محسوس کر گئی تھی مگر مطلب سمجھنے سے قاصر تھی۔ دانیال نے ہنستے ہوئے معاذ کو گھور کر دیکھا تھا۔ اسے کرسی پر سے اُٹھتا دیکھ کر دانیال بے ساختہ بولا۔

''کیا ہوا کہاں جا رہی ہو؟''

''خوامخواہ میری وجہ سے آپ لوگوں کو ''کوڈورڈز'' میں بات کرنی پڑ رہی ہے۔ میں چلی جاؤں گی تو آرام سے بات کر لیجیے گا۔'' وہ منہ بنا کر بولی تھی۔ معاذ ہنوز لبوں پر مُسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا، جبکہ دانیال ابھی اسے منانے کے لیے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ گلاس ڈور کے اس طرف کھڑی ایمن پر نظر پڑتے ہی ادھر متوجہ ہو گیا۔ رامیہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اس طرف دیکھا تو ایمن دکھائی دی۔ وہ اندر آنے کی بجائے واپس مڑ گئی تھی۔ وہ ایک دم اس کے پیچھے گئی تھی۔

''کیا ہوا ایمن؟ کوئی کام تھا؟'' وہ تیز قدموں سے چلتی اس تک پہنچ چکی تھی۔

''لنچ ٹائم ہوگیا ہے۔ میں اسی لیے تمہیں دیکھنے آئی تھی کہ کہاں ہو''۔ وہ آدھ گھنٹہ پہلے اس سے کہے بغیر خود ہی دانیال کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

''پھر اس طرح واپس کیوں آگئیں، اندر آجاتیں۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا کہ لنچ ٹائم ہوگیا ہے۔'' وہ اس کے اُداس چہرے پر ایک نظر ڈال کر بولی۔

''میں نے سوچا شاید کوئی امپورٹنٹ بات ہو رہی ہے، اس لیے ڈسٹرب نہیں کیا''۔ وہ اس سے بڑے شاکی لہجے میں بولی تھی۔ رامیہ نے ''امپورٹنٹ بات'' کی کوئی وضاحت کیے بغیر فوراً کہا۔

''چلو پھر چلتے ہیں۔ تم گاڑی نکالو۔ میں اپنا بیگ لے کر آرہی ہوں''۔ ایمن گردن ہلاتی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ لنچ کے دوران بھی وہ رامیہ سے کھچی کھچی رہی کھانا بھی اس نے برائے نام کھایا۔ رامیہ کو اس کی حالت پر ایک دم رحم آنے لگا۔

''بھاڑ میں گیا انجوائے منٹ اور تھرل۔ میں دانیال سے بات کروں گی کہ ختم کرے یہ ڈرامہ''۔ وہ دِل ہی دل میں پکا ارادہ کر چکی تھی۔ اچانک اس کا دھیان معاذ کے ان ناسمجھ میں آنے والے کمنٹس کی طرف چلا گیا اور ایک دم ہی اس کی سمجھ میں اس بات کا مطلب آگیا۔ ایمن اکثر بڑا چڑ کر اسے کہا کرتی تھی ''تم ساتھ ہوتی ہو تو مجھے تو کوئی دیکھتا بھی نہیں ہے۔ حالانکہ کوئی ایسی حسینہ عالم بھی نہیں ہو۔ بس یہ ہے کہ خود کو Maintain کر کے رکھا ہوا ہے۔ میک اپ کا سینس ہے۔ کپڑوں کی چوائس اچھی ہے۔ باقی اس کے علاوہ تو کچھ بھی نہیں ہے جو تمہیں مختلف بناتا ہو''۔ وہ ان کمنٹس پر دِل کھول کر ہنسا کرتی تھی۔

حنا کی شادی سے پہلے جب بھی کبھی وہ لوگ کسی فنکشن یا شادی وغیرہ میں جاتیں تو تیار ہونے کے بعد حنا اکثر کہا کرتی تھی۔

''تقریباً ایک جیسا ڈریس ہے ہم دونوں کا، مگر تم زیادہ اسٹائلش لگ رہی ہو۔ کچھ بات ہے تم میں جو تمہیں مختلف بناتی ہے۔ تم میں بہت اسٹائل ہے۔ عام سے لان کے سوٹ میں بالوں کو کلپ بھی کیا ہوا ہو تو بھی تم ماڈل نظر آتی ہو''۔

حالانکہ حنا کے نقوش اس سے زیادہ پیارے تھے۔ رنگت بھی اس کے مقابلے میں زیادہ صاف تھی، مگر جو اسٹائل جونزاکت اس میں تھی، وہ حنا میں نہ تھا۔ اپنی ان خوبیوں کا اسے خود بھی احساس تھا، مگر اس چیز کو اس نے کبھی بھی سر پر سوار نہیں کیا تھا۔

''کیا ہوا کہاں کھو گئیں؟'' ایمن نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ ایک دم چونک گئی۔

''کچھ نہیں''۔ ایمن اس کے جواب پر چپ سی ہوگئی تھی۔ شاید وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ رامیہ اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ شام میں گھر واپس جاتے ہوئے ایمن اس سے بولی۔

''رامیہ ہم نے کبھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپایا۔ ہے نا''۔

''ہاں لیکن تمہیں یہ بات کہنے کی ضرورت کیوں پڑی''۔ وہ کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتی بے نیازی سے بولی۔

''ابھی تو آپ کو معلوم نہیں ہے کہ نخرے کہتے کس کو ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں آگے مجھ سے بہت کام پڑیں گے۔ میں بتادوں گی''۔ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔ پھر کچھ دیر بعد جب اسے ایمن کا خیال آیا اور اس نے دانیال سے اس بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

''میں تو ابھی اور ستانے کے موڈ میں تھا، مگر تمہیں دوست کی ہمدردی کا بخار زیادہ ہی چڑھ رہا ہے۔ اس لیے مزید پروگرام ملتوی کر دیا، ویسے یہ دو دن خاموشی سے گزرے، میں نے کچھ زیادہ بات نہیں کی۔''

''کون سے جنم کا بدلہ لے رہے ہیں، اس بے چاری سے''۔ اس نے دانیال کو گھورا تھا اور وہ شریر سی مُسکراہٹ چہرے پر لیے شاید ایمن ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆

ایمن کے ساتھ Expo centre میں گھومتے ہوئے وہ بڑا انجوائے کر رہی تھی، جبکہ ایمن ابھی تک کچھ حیران سی تھی۔

''یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں سوجھی کیا۔ پہلے سے فون پر انفارم تو کر دیتیں۔ ایک دم ایسی افراتفری مچائی کہ میں تو بوکھلا گئی''۔ وہ اس کی حیرت کے جواب میں بڑے سکون سے مُسکراتے ہوئے بولی۔

''بس دو پاس اس ایگزیبیشن کے میرے ہاتھ لگے اور اتفاق سے فراز بھی آیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے، آرام سے اس کے ساتھ تمہارے گھر آ گئی۔ یار آئی ٹی کی اتنی شان دار ایگزیبیشن اگر ہم مس کر دیتے تو کتنا افسوس ہوتا''۔ وہ ایک سٹال کے سامنے رُکتی ہوئی بولی۔ ایمن تو پوری طرح نمائش دیکھنے میں محو تھی۔ جبکہ وہ کن انکھیوں سے گردوپیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ رش اتنا تھا کہ اللہ کی پناہ۔

''اس رش میں دانیال نظر کیسے آئے گا''۔ وہ دانیال کے اس بے تکے آئیڈیے پر ابھی چڑ ہی رہی تھی کہ وہ کچھ فاصلے پر کھڑا نظر آ گیا۔ وہ اسے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ ایک نظر دانیال پر ڈالنے کے بعد وہ ایمن کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس دھکم پیل میں بھی محترمہ نئے ماڈل کے Laptop کا پورا معائنہ کر رہی تھی۔ رامیہ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بڑی آہستگی سے وہاں سے کھسکنا شروع ہوئی۔ اگلے دو اسٹالز اور کراس کرنے کے بعد اس نے ایک دم اپنی رفتار بڑھا دی۔ مختلف لوگوں سے ٹکراتی ہو بلاخر ہال ''A'' سے باہر نکل آئی تھی، وہ دونوں یہاں فراز کے ساتھ آئی تھیں، جس کے دوست کا اسٹال ہال ''B'' میں لگا ہوا تھا اور وہ وہیں تھا۔ وہ ڈھونڈتی ہوئی فراز تک پہنچ گئی تھی۔

''اتنی جلدی واپس چلنا ہے اور وہ تمہاری فرینڈ کہاں رہ گئی''۔ وہ اس کے جلدی مچانے پر حیران ہوا تھا۔

''بس میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ مجھے گھر چلنا ہے''۔ وہ دوٹوک انداز میں بولی تو فراز اپنے دوستوں سے خدا حافظ کہتا، اس کے ساتھ آ گیا تھا۔ وہ بے چارہ سمجھا کہ شاید گرمی کی وجہ سے اس کا بی پی لو ہو رہا ہے۔ اس لیے جلدی سے اسے فریش جوس پلوایا اور فوراً ہی گھر ڈراپ کر دیا۔ آفس سے وہ لنچ ٹائم کے بعد ہی اُٹھ گئی تھی۔ پروگرام تو اس کا فون کر کے ایمن کو اپنے ہاں بلانے کا تھا، مگر اتفاق سے فراز آ گیا تو اس نے اپنے پروگرام میں تھوڑی سی رد و بدل کر لی تھی۔ ایمن نے اسے نہ پا کر کتنا ڈھونڈا ہوگا اور پتا نہیں دانیال نے اس سے کیا کیا باتیں کی ہوں گی۔ وہ سب تفصیلات جاننے کے لیے بُری طرح بے چین تھی اور اس کی بے چینی جلد ہی دور بھی ہو گئی تھی۔ ایمن نے کمرے میں آ کر تکیے کشنز اور جو جو کچھ اس

''اس سوال کا جواب بھی تمہارے ہی پاس ہے۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ ہماری دوستی میں کبھی کوئی دراڑ نہ آئے۔ ہم پہلے کی طرح ایک دوسرے سے صرف سچ بولیں۔'' ایمن نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا اور وہ بغیر کوئی جواب دیئے حدیقہ کے ''بوہے باریاں'' کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

رات میں اس نے دانیال کو فون کر کے ایمن کو سب کچھ صاف صاف بتانے کے لیے کہا تھا۔

''میں اب مزید اسے بے وقوف نہیں بنا سکتی، وہ بہت پریشان ہے''۔

''کیسی بور لڑکی ہو۔ نہ خود انجوائے کر رہی ہو، نہ دوسروں کو کرنے دے رہی ہو''۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا تھا۔ ان لوگوں کی وہاں Internship کے صرف دو ہی دن رہ گئے تھے۔ دانیال نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ دو دن بعد وہ ساری بات کلیئر کر کے اس ڈرامے کو ختم کر دے گا۔

اسے فکر نے ایسا گھیرا کہ وہ ان دو دنوں میں جا ہی نہ سکی۔ وہ سوچ رہی تھی، پتا نہیں کیا ہوا ہوگا۔ دانیال نے ایمن سے کچھ کہا ہوگا کہ نہیں۔ ممی نے مسلسل بستر پر لٹایا ہوا تھا۔

''حالت دیکھ ذرا اپنی چپس، برگر، پیپسی اور آئس کریم بس یہ اوٹ پٹانگ چیزیں کھلائے، جاؤ ڈھنگ کی کوئی چیز کھانے کو دو تو منہ بن جائے گا''۔ وہ زبردستی اسے دودھ پلواتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔

شام میں ممی نے اسے کارڈلیس پکڑاتے ہوئے کہا ''تمہارا فون ہے'' دوسری طرف سے آتی معاذ کی آواز سن کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

''میں نے سوچا خیریت دریافت کرلوں۔ آج دوسرا دن ہے شاید خاتون زیادہ ہی بیمار ہوگئی ہیں''۔ وہ اس کی حیرت کے جواب میں بولا تھا۔

''نہیں بیمار تو کوئی زیادہ نہیں ہوں۔ معمولی سے بخار اور نزلہ کھانسی پر ممی حد سے زیادہ پریشان ہوگئی ہیں، ورنہ میں تو آج آنا چاہ رہی تھی۔'' وہ کچھ بیزاری سے بولی تھی۔

''ویسے آپ کے فون کرنے کا بہت بہت شکریہ''۔ وہ مزید گویا ہوئی۔

''شکریہ۔'' وہ شکریہ کو خوب لمبا کھینچتا ہوا بولا تھا۔

''یہ اتنے بڑے بڑے وزنی جملے آپ کے منہ سے اچھے نہیں لگ رہے۔ آپ کا آؤٹ اسپوکن انداز زیادہ بہتر ہے۔ اینی وے اپنا خیال رکھیے گا، بائے''۔ وہ کارڈلیس ہاتھ میں لیے اب تک کچھ حیران سی تھی۔ اگلے روز وہ پاپا کے ساتھ آفس گئی تھی۔ ایمن کو تو ظاہر ہے، اب نہیں آنا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' دانیال نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا تھا۔

''بڑی فکر ہے میری طبیعت کی، فون کر کے خیریت تک تو پوچھی نہیں''۔ وہ خفگی سے بولی۔

''کیوں پرسوں کس نے فون کیا تھا''۔ دانیال نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''پرسوں کیا تھا۔ کل تو نہیں کیا''۔ وہ غصے سے بولی۔

''پرسوں بات کر کے ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ طبیعت زیادہ خراب نہیں ہے، بس نخرے ہو رہے ہیں۔'' وہ اطمینان سے کہتا اسے چڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کے ہاتھ لگ رہا تھا، اس کے اوپر پھینکنے شروع کر دیئے تھے۔

''ذلیل، کمینی، میرے خلاف سازشیں کرتے تمہیں ذرا بھی شرم نہ آئی۔ میری دوست ہو کر آلہ کار دوسروں کی بنی ہوئی تھیں۔'' وہ اِدھر سے اُدھر بھاگتی دوڑتی ان حملوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوریڈور سے گزرتی ممی نے جو اندر سے آتی عجیب و غریب آوازیں سنیں تو ایک دم بوکھلا کر اندر آ گئیں۔

''خیر تو ہے بیٹا؟'' انہیں دیکھ کر ایمن نے ہاتھ میں پکڑا گلدان بڑی شرمندگی کے عالم میں کمر کے پیچھے چھپا لیا تھا، جبکہ وہ اپنی سانسوں پر قابو پاتی بولی ''جی ممی'' وہ اتنی دیر میں کمرے کی ابتر حالت پر نظریں دوڑا چکی تھیں اور ایک مایوس نظر ان دونوں پر ڈالتی بغیر کچھ کہے کمرے سے چلی گئیں تو ایمن بُری طرح شرمندہ ہو گئی۔

''یار آنٹی ناراض ہو گئیں''۔ وہ فکر مند ہوئی۔ ''تمہیں آتے ہی سلطانہ ڈاکو بننے کے لیے کس نے کہا تھا، خدا کی بندی منہ سے بات نہیں کر سکتی تھیں''۔ وہ جلدی جلدی سب چیزیں اپنے ٹھکانے پر رکھتی ہوئی بولی۔

''بس وہ مجھے تم پر اتنا غصہ آ رہا تھا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں''۔ وہ ناراضی سے بولی۔

''ناراض ہونا ہے تو دانیال سے ہو۔ میرا اس سب میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں تو صرف ان کی بات ماننے کی گناہ گار ہوں اور وہ بھی تمہاری وجہ سے''۔ وہ اطمینان سے بولی۔

''میری وجہ سے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ہاں تو اور کس کی وجہ سے آئندہ ہماری دوستی اتنے ہی شان دار طریقے سے قائم و دائم رہے۔ اس کے لیے اولین شرط یہ کہ ہم دونوں کے ایک دوسرے کے ''ان'' کے ساتھ اچھے دوستانہ مراسم ہوں، تاکہ انہیں ہماری بے تحاشا دوستی اور میل جول پر کوئی اعتراض نہ ہو''۔ وہ فلور کشن پر گرتے ہوئے بولی۔

''ویسے ہوا کیا۔ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے۔ جب سے آئی ہوں پریشان بیٹھی ہوں، تمام تفصیلات جاننے کے لیے''۔ وہ بڑی پُر شوق نگاہوں سے ایمن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی اور وہ اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بڑے پُر جوش انداز میں اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''رامیہ! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ سب کچھ کسی خواب جیسا لگ رہا ہے۔'' وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور رامیہ اس کی خوشی پر اس سے زیادہ خوش تھی۔

''تمہیں پتا ہے دانیال مجھے پہلے دن ہی بہت اچھا لگا تھا، مگر سب کچھ اس طرح ہو جائے گا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' I am so happy'' ایک عجیب سی سرخوشی اور مسرت اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔

''لیکن تم نے مجھے اس کے ساتھ مل کر کتنا ستایا ہے۔ کتنی بری دوست ہو تم''۔ وہ منہ پھلا کر بولی اور اس کی یہ خفگی وہ تھوڑی ہی دیر میں دور کرنے کے بعد اس سے آج کے تمام واقعات سن رہی تھی۔

''خبردار اگر تم نے کچھ سنسر کیا تو''۔ اس نے ایمن کو پہلے ہی دھمکی دے دی تھی اور وہ اسے گھورتے ہوئے نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھی۔

☆

''پھر اب اس کے بعد آگے کیا ارادے ہیں۔ جاب کرنی ہے یا گھر بیٹھنا ہے۔'' معاذ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔ آج اس کا یہاں آخری دن تھا اور وہ معاذ سے ملنے اس کے کمرے میں آئی تھی۔

''پتا نہیں ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔ شاید جاب کروں یا شاید کچھ اور''۔

وہ لیمن ایڈ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

''بھئی واہ کیا شان بے نیازی ہے۔ محترمہ یہ آپ کی اپنی زندگی ہے جس کے بارے میں آپ اتنے سرسری اور عام سے انداز میں بات کر رہی ہیں۔ ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز بھی شاید یونہی اتفاقاً کر لیا ہوگا''۔ وہ مذاق اُڑانے والے انداز میں بولا اور وہ بُرا مانے بغیر بڑے اطمینان سے بولی۔

''بھئی میری عادت ہے کہ میں کسی بھی چیز کو سر پر سوار کر کے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بناتی۔ اب آپ چاہے اسے اچھی عادت سمجھیں یا بُری، ویسے میرے قریب ترین تمام افراد اسے میری سب سے بُری عادت قرار دیتے ہیں، مگر میں زندگی کو جیسی ہے جہاں ہے کی بنیاد پر گزارنا پسند کرتی ہوں۔ میں Ambitious نہیں ہوں۔ ہاں ایک نارمل انسان ہونے کی حیثیت سے میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے کسی ملٹی نیشنل فرم میں شان دار قسم کی جاب مل جائے یا پھر فیشن ڈیزائننگ پڑھنے لندن چلی جاؤں، مگر ان دونوں میں سے اگر کوئی ایک بات بھی نہ ہوئی تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں جتنی مطمئن آج ہوں، ایسی ہی رہوں گی''۔

''بڑے اونچے بلکہ درویشانہ قسم کے خیالات ہیں۔ سنا ہے درویش ٹائپ لوگ اتنے ہی بے نیاز ہوتے ہیں''۔ وہ جو اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ بے اختیار ہنستا ہوا بولا تھا اور وہ بھی اس کے تبصرے پر ہنس پڑی تھی۔

''ویسے اگر آپ چاہیں تو یہاں جوائن کر سکتی ہیں۔'' معاذ کی اس آفر پر وہ حیرت کے مارے اچھل پڑی تھی۔

''آپ جاب کی آفر کر رہے ہیں۔ وہ بھی مجھے جب کہ آپ کی رائے کے حساب سے تو میں ایک غیر ذمہ دار اور لاپروا لڑکی ہوں''۔ وہ اپنے ازلی صاف گو انداز میں بولی تھی۔

''ہاں تو میں اپنے بیان سے پھرا نہیں ہوں۔ غیر ذمہ دار تو آپ ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ بہت ذہین اور کری ایٹو دماغ بھی رکھتی ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ آپ کی ذہانت کو یہ لاپروائی ہی ڈبوتی ہے''۔ چائے کا کپ خالی کرتا ہوا، وہ بھی صاف گوئی سے بولا ''اور آپ کی لاپروائیوں اور غیر ذمہ داریوں کا علاج میں بہت اچھی طرح کر سکتا ہوں۔ اس لیے مجھے اس طرف سے کوئی فکر نہیں ہے۔ آفٹر آل آپ جانتی ہی ہیں۔ کام کے معاملے میں بدتمیزی کی حد تک روڈ اور بے حد پروفیشنل انداز اختیار کرتا ہوں''۔ وہ بڑے اطمینان سے مُسکراتے ہوئے بولا تھا۔ اسے سوچ میں پڑتا دیکھ کر وہ کہنے لگا۔

''میرا کام مکمل ہوگیا تھا۔ فارغ وقت میں بیٹھ کر میں جو بھی کروں۔ میں نے کام کرنے میں تو کوتاہی نہیں کی ناں''۔ وہ خود کو اطمینان دِلاتی بڑے سکون سے بیٹھی تھی۔

''کتنی فضول حرکت کر رہی تھیں۔ آپ اگر میرے بجائے پیچھے سے عاشق صاحب آجاتے تو کتنی بُری بات ہوتی کارٹون بنایا تو بنایا اس پر اتنا بڑا ''مسٹر عاشق'' بھی لکھ دیا۔'' وہ بھی شاید یہ دیکھ کر کہ کام تو وہ پورا کر چکی تھی، اب دوسری طرف آگیا تھا۔

''دنیا میں وہ اکیلے تو ''عاشق'' نہیں ہیں۔'' کہتے ساتھ ہی اپنے جملے کے نامناسب ہونے کا احساس ہوا تو وہ سنبھل کر فوراً تصحیح کرنے والے انداز میں بولی۔

''میرا مطلب ہے کہ اس نام کے بے شمار لوگ دُنیا میں موجود ہیں۔ اس پر بھی اگر وہ یہی سمجھتے تو ان کی مرضی''۔ اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، جبکہ معاذ نے بڑی مشکلوں سے خود کو قہقہہ لگانے سے روکا تھا، پھر بھی وہ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی ہنسی تو دیکھ ہی چکی تھی اور خود اسے بھی ایک دم ہنسی آگئی تھی۔

''اچھا تو آپ فارغ بیٹھی بور ہو رہی تھیں۔ چلیں اس کا حل ابھی نکال لیتے ہیں۔'' وہ ایک موٹی سی فائل اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

''اکرم آج چھٹی پر ہے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کس سے ٹائپ کرواؤں، چلیں میرا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور آپ کی بوریت بھی دور ہو جائے گی۔ ٹائپ ہو جائیں تو سارے صفحات کے لیٹر پیڈ پر پرنٹ لے لیجئے گا۔ پانچ بجے میری میٹنگ ہے۔ تب تک تو ہو ہی جائے گا''۔ وہ اس کے ہراساں چہرے پر ایک نظر ڈالتا ہوا بولا۔

''اتنے سارے پیج''۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

''زیادہ نہیں ہیں۔ دیکھنے میں اتنے لگ رہے ہیں۔ شاباش شروع ہو جائیں''۔ وہ اپنے کمرے میں موجود کمپیوٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا اور وہ مرے مرے قدموں سے چلتی کمپیوٹر تک آگئی تھی۔ اسے وہاں بیٹھا کر وہ خود کہیں چلا گیا تھا۔ اس کی ٹائپنگ اسپیڈ بس گزارے لائق تھی۔ صرف اس حد تک کہ وہ اپنے اسائنمنٹ وغیرہ خود ٹائپ کر لیا کرتی تھی، مگر یہ موٹی تازی فائل تو اسے بُری طرح ہولا رہی تھی۔ معاذ کی واپسی دو بجے سے کچھ پہلے ہوئی تھی۔

''کیا ہوا، ہو گئے ٹائپ''۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''یہ اتنے سارے پیج شام تک میں کبھی بھی ٹائپ نہیں کر سکتی''۔ وہ رونی صورت لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''جاب میں ''میں یہ نہیں کر سکتی'' اور یہ نہیں ہو سکتا ہے''۔ قسم کے جملوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ جاب کرنی ہے تو جو کام کہا جائے گا، وہ کرنا بھی ہوگا، بغیر کسی Argument کے''۔ وہ بڑی بے مروتی سے بولا تھا۔

''میری جاب ٹائپسٹ کی تو نہیں ہے''۔ وہ پھر منہ پھٹ انداز میں بول پڑی تھی اور وہ اس کے انداز پر طنزیہ انداز میں بولا تھا۔

''اچھا تو کیا کارٹونسٹ کی ہے؟'' وہ ایک دم سر جھکا کر شرمندہ سی ہوگئی تھی۔

''کیا ہوا؟ کیا سوچنے لگیں؟''

''کچھ نہیں میں بس یہ سوچ رہی تھی کہ مجھے آپ کی آفر قبول کر ہی لینی چاہیے۔ ویسے آپ نے دانیال سے اس بارے میں بات کی؟'' وہ جواباً بولی تھی۔

''بات تو نہیں کی، لیکن اسے کیا اعتراض ہوگا''۔ وہ کندھے اُچکا کر بولا۔

''ٹھیک ہے میں تو راضی ہوں، بس ذرا ممی پاپا سے اور مشورہ کرلوں پھر آپ کو انفارم کردوں گی''۔ وہ کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے بولی تھی اور معاذ نے گردن ہلادی تھی۔

ممی پاپا کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہاں کا ماحول بھی اچھا تھا اور فارغ گھر میں بیٹھنے سے بہتر تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کر ہی لے، لہٰذا اس نے اگلے ہی روز سے وہاں باقاعدہ جوائن کرلیا۔ ایمن کے لیے دانیال کا پروپوزل آچکا تھا اور وہ آج کل گھر میں رہ کر سگھڑ خاتون بننے کی کوششوں میں مصروف تھی۔

''یار دانیال بتا رہا تھا کہ اس کی مما کو بڑی سگھڑ قسم کی گھریلو لڑکی چاہیے جو دہلی والوں کی تمام ڈشز بڑی عمدہ بناتی ہو۔ اب تم بتاؤ مجھے کیا نہاری، قورمہ اور شاہی ٹکڑے بنانے آتے ہیں۔ بابا ہم تو سیدھی سادی عام سی ڈشز بنالیں، وہی غنیمت ہے''۔ وہ فون پر اپنے دکھڑے اسے سناتی اور جواب میں وہ ہنستے ہوئے گنگناتی۔

''یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھیے''۔

دانیال کی فیملی بظاہر لبرل نظر آنے کے باوجود کسی قدر کنزرویٹو بھی تھی، اسی وجہ سے اسے شادی کے بعد جاب کی اجازت ملنا مشکل ہی تھا۔

☆

وہ کمپیوٹر پر Game کھیل رہی تھی۔

''دیکھو ہمایوں میں نے کتنا شان دار کارٹون بنایا ہے''۔ وہ عاشق صاحب کا کارٹون بنا کر اب داد طلب نظروں سے ہمایوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''واقعی بہت اچھا بنا ہے''۔ اپنے عقب سے آتی معاذ کی آواز اسے کرنٹ لگا گئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے گردن گھما کر دیکھا تو وہ خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ حمنیٰ اور ہمایوں اپنے لبوں پر مچلتی مُسکراہٹ کا گلا گھونٹے بظاہر کام میں خود کو مصروف ظاہر کررہے تھے۔

''میں نے جو کام کہا تھا، وہ ہوگیا''۔ وہ سخت گیر باس بنا کھڑا تھا۔ جواب میں اس نے گردن ہلائی تو وہ۔

''ٹھیک ہے میرے کمرے میں آئیں''۔ کہتا باہر نکل گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی ہمایوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا، جبکہ حمنیٰ اس کی ناراضی کے خیال سے ہنوز اپنی مسکراہٹ دبائے بیٹھی تھی۔ وہ ہمایوں کی طرف مکا لہراتی باہر نکلی۔

''تشریف رکھیے''۔ معاذ نے اپنا خفگی بھرا انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا، جبکہ وہ بالکل مطمئن تھی۔

''آئندہ کبھی کسی کا کارٹون نہیں بناؤں گی، پرامس''۔اس مصیبت فائل سے جان چھڑانے کے لیے وہ بڑی عاجزی سے بولی تھی۔

''لنچ کرلیا؟'' وہ پیون کو ٹرے اُٹھائے اندر آتا دیکھ کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں''۔اسے ٹائپنگ کرتے اس بات کا دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ لنچ ٹائم شروع ہو کر ختم بھی ہو چکا ہے۔

''آجائیں پھر ساتھ لنچ کرتے ہیں''۔وہ کچھ دیر پہلے کا سخت گیر رویہ ترک کر کے دوستانہ انداز میں بولا۔

''تھینک یو۔میں لنچ لے کر آئی ہوں''۔ایمن کے بغیر اسے باہر کھانا کھانے کے لیے جانا عجیب سا لگتا تھا،اس لیے وہ لنچ لے کر آنے لگی تھی۔

''اور جو میں یہ اتنا سارا لے کر آیا ہوں، یہ سب کون کھائے گا''۔وہ ٹرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ میری وجہ سے یہ سب لے کر آئے ہیں؟'' وہ اس کی ٹیبل پر رکھی ٹرے پر نظریں ڈالتے ہوئے بولی۔''کے ایف سی'' کے برگر، چکن، فرائز، اور پیپسی سب ہی کچھ موجود تھا۔

''میں کسی پہلوان گھرانے سے تو تعلق رکھتا نہیں ہوں کہ اتنا سارا کچھ اکیلا کھا جاؤں گا''۔وہ منہ بنا کر بولا تو رامیہ اس کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''آپ کو یہ کیسے پتا تھا کہ میں نے اب تک لنچ نہیں کیا ہوگا''۔وہ گلاس میں اسٹرا لگاتے ہوئے بولی۔

''جو فائل میں آپ کو دے کر گیا تھا، اسے دیکھ کر کوئی بھی نارمل آدمی کھانا پینا بھول سکتا ہے''۔وہ شرارت سے مُسکرایا تھا اور رامیہ اپنی کچھ دیر پہلے کی کیفیت یاد کر کے ہنس پڑی تھی۔

☆

ایمن کی دانیال کے ساتھ بات پکی ہوگئی تھی اور بجائے منگنی وغیرہ کے ڈائریکٹ شادی ہو رہی تھی۔ایک مہینے بعد کی تاریخ رکھی گئی تھی اور اتنے شارٹ نوٹس پر ہونے والی یہ شادی ایمن کے ساتھ ساتھ اسے بھی بوکھلا گئی تھی۔دانیال کی بہن Denmead سے آئی ہوئی تھیں اور انہیں کی وجہ سے شادی اتنی جلدی ہو رہی تھی۔وہ آفس کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ ایمن کو تیاریوں میں بھی بھرپور حصہ لے رہی تھی۔

''شادی کے بعد اگر اسے مجھ سے ملنے سے روکا یا ہماری دوستی پر کوئی اعتراض کیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا''۔ہر بار دانیال سے ملنے پر وہ یہ جملہ ضرور کہتی اور وہ اس کی دھمکیوں پر ہنس دیا کرتا۔ممی کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر اور بہت سے وعدے کرنے کے بعد وہ انہیں اس بات پر آمادہ کر چکی تھی کہ وہ اسے آفس خود گاڑی ڈرائیو کر کے جانے دیں، جس روز اس کا ایمن کے ساتھ شاپنگ کا پروگرام ہوتا تو وہ دانیال کو بتا کر جلدی سے اُٹھ جایا کرتی اور وہ بے چارہ اسے انکار بھی نہیں کر پاتا تھا۔ان لوگوں کا فائنل سمسٹر کا رزلٹ آگیا تھا اور حیرت انگیز بات یہ ہوئی تھی کہ وہ Top Ten پوزیشن ہولڈرز میں شامل تھی،اس کی آٹھویں پوزیشن آئی تھی، جبکہ ایمن نے اسے فون پر یہ بات بتائی تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔

فرسٹ سمسٹر سے لے کر پچھلے سمسٹر تک اس کی کبھی کوئی پوزیشن نہیں آئی تھی۔بس سیدھا سادا پاس ہوگئے۔پیپرز تو خیر اس کے اچھے ہوئے تھے، مگر پھر بھی وہ ایسی کوئی اُمید نہیں کر رہی تھی۔دانیال، ممی پاپا اور بہنوں سب ہی نے اسے گفٹس دیئے تھے۔اس کی فرینڈز زوردار ٹریٹ کا

مطالبہ کررہی تھیں اور وہ خود بھی بے حد خوش تھی۔

وہ گاڑی پارک کر کے بیگ کندھے پر ڈالتی آگے بڑھی، اسی وقت معاذ بھی اپنی گاڑی سے اُترتا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر وہ رُک گئی تھی۔

''ہیلو! کیا حال ہیں''۔ اس کے پاس آتے ہی وہ مُسکرا کر بولی تھی۔

''ٹھیک ٹھاک، آپ سنائیں۔ آج کل تو جلدی غائب ہو جاتی ہیں''۔ وہ اس کے برابر چلتا ہوا بولا۔

''ہاں وہ شادی کی تیاریوں کی وجہ سے میں نے دانیال سے اسپیشلی پرمیشن لی ہوئی ہے''۔

''اسے سسرالیوں کی ہاں میں ہاں ملانے کے علاوہ اور آتا ہی کیا ہے اور آپ تو خاص الخاص سسرالی ہیں۔ آپ کی ناراضی تو وہ افورڈ کر ہی نہیں سکتا۔'' وہ لفٹ میں داخل ہوتا ہوا بولا۔

آفس میں داخل ہوئے تو وہ اسے اپنے کمرے میں بلاتا خود بھی اندر داخل ہو گیا۔ وہ اپنی ٹیبل کی دراز کھول کر اس میں سے کچھ نکالنے لگا تھا، جبکہ رامیہ خاموش کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

''تین دن سے یہ ساتھ لیے پھر رہا ہوں، مگر آپ سے ملاقات ہی نہیں ہو پاتی تھی۔ جس وقت میں آتا آپ جا چکی ہوتی تھیں۔ اینی وے میری طرف سے پوزیشن آنے پر بہت بہت مبارک باد قبول کریں''۔ وہ خوب صورت پیکنگ پیپر میں لپٹا تحفہ اس کی طرف بڑھائے کھڑا تھا۔

''اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے وش کر دیا، وہ بھی کافی تھا''۔ وہ تحفہ قبول کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔

''میں دوست بہت کم بناتا ہوں۔ صرف جو لوگ مجھے اچھے لگیں، انہیں سے دوستی کرتا ہوں، مگر جس سے ایک بار دوستی کر لوں، پھر اسے ہمیشہ نبھاتا ہوں اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ ان کی خوشیاں ضرور شیئر کرتا ہوں۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بول رہا تھا اور رامیہ نے کچھ سوچ کر تحفہ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

''تھینک یو۔ ویسے اس میں ہے کیا؟'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے گفٹ کھولنے لگی تھی۔ Blanc Mont کا خوب صورت پین سیٹ دیکھ کر وہ خوشی سے بولی تھی۔

''اتنے خوب صورت گفٹ کے لیے ایک دفعہ پھر تھینکس''۔

''اچھا لگا یا ایسے ہی مروت میں تعریف کر رہی ہیں''۔ وہ انٹر کام پر چائے کا کہنے کے بعد بولا تھا۔

''نہیں واقعی بہت اچھا ہے اور سب کے گفٹس سے ڈفرنٹ بھی، باقی سب نے تو زیادہ تر جیولری یا سوٹ ہی دیے ہیں۔'' وہ دوبارہ پین سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ پھر اس کے بعد وہ چائے پی کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اپنے کرسی سنبھالنے کے بعد بھی وہ کتنی ہی دیر تک پین سیٹ کو دیکھتی رہی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی اہمیت دے رہا تھا۔ اس سے پہلے یونیورسٹی میں ارسلان اور خاندان میں فراز اس کے کافی آگے پیچھے پھرتے تھے، مگر اس طرح سے اس نے کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کا دل الگ ہی انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ اپنی یہ بدلتی کیفیت تو وہ کافی عرصے سے محسوس کر رہی تھی، مگر قصداً خود کو لاپرواہ ظاہر کر کے اس طرف سے دھیان ہٹا لیا کرتی تھی۔ اس کے اوپر معاذ کا پہلا

تاثر قطعاً خوشگوار نہیں پڑا تھا، مگر بعد میں وہ جس طرح اس سے ملتا اور باتیں کرتا، وہ انداز اسے چونکنے پر مجبور کرتا۔

وہ دو دن نہیں آئی تو اس نے فون کر دیا۔ پھر اس کے کہے بغیر خود ہی جاب آفر کر دی۔ وہ اس کی ایک ایک بات سوچ رہی تھی۔

''لیکن اس نے ایسا کچھ کہا تو نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو''۔ وہ کچھ اُلجھ کر سوچنے لگی۔ مگر دماغ کی اس تاویل کو اس کے دِل نے فوراً ہی رد کر دیا۔

''وہم کیسا؟ کیا وہ ایسے ہر ایک کو گفٹ دیتا پھرتا ہے؟ کیا ہر ایک کے لیے خود جا کر لنچ لایا کرتا ہے؟'' جو بات اس کا دل اسے سمجھا رہا تھا، وہ بڑی خوب صورت اور انوکھی تھی۔ محبت اس کائنات کا سب سے خوب صورت اور حسین جذبہ جو اندر باہر ہر طرف روشنی ہی روشنی بھر دیتا ہے۔ یوں لگنے لگتا ہے، جیسے ہم خوش ہیں تو ہمارے ساتھ ساری دُنیا خوش ہے۔ کہیں کوئی دُکھ کوئی غم ہے ہی نہیں۔ اپنے تبدیل ہوتے انداز وہ خود ہی محسوس کر رہی تھی۔

صبح آفس کے لیے تیار ہوتے وقت اس کا دِل بہت اچھی طرح تیار ہونے کو چاہتا۔ وہ بمشکل خود کو سمجھاتی، اپنے روٹین کے انداز ہی میں تیار ہوتی۔ جس دن وہ آفس نہ آتا، وہ بے کل سی رہتی۔ اکثر وہ ایمن سے وعدہ کرنے کے باوجود آفس سے جلدی نہیں اُٹھتی تھی۔ ''اگر میرے جانے کے بعد وہ آ گیا تو''۔ وہ خود سے کہتی، حالانکہ معاذ سے اس کی وہی روٹین کی باتیں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ آفس اتنی تھوڑی دیر کے لیے آتا کہ صرف سلام دُعا ہی ہو پاتی تھی۔

ممی نے اسے فراز کے پروپوزل کی بابت بتایا تو وہ فوراً ہی انکار میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''کیا ممی..... ابھی تو میں فارغ ہوئی ہوں اور آپ کو اتنی جلدی شادی کی پڑ گئی ہے۔ مجھے لائف کو انجوائے کرنے دیں''۔ وہ اس کے دوٹوک انکار پر چڑ گئی تھیں۔

''فوراً شادی کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ صرف انگیجمنٹ کر دیتے ہیں، شادی پھر سال ڈیڑھ سال بعد کریں گے۔ اتنے اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے، پھر جیسی تمہاری نیچر ہے تو کسی لمبی چوڑی سسرال میں تو تمہارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ برداشت تم میں نام کو نہیں ہے اور وہاں سوائے فراز، نجمہ اور بھائی صاحب کے اور ہوتا ہی کون ہے اور ان دونوں کا بھی آدھا سال تو امریکہ ہی میں گزرتا ہے۔ تمہارے لحاظ سے یہ آئیڈیل پروپوزل ہے۔ پھر اس میں فراز کی اپنی مرضی بھی شامل ہے''۔ وہ اسے سمجھاتے ہوئے پیار سے بولیں تو وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

''فراز کی مرضی ہے تو میں کیا کروں۔ میری مرضی تو نہیں ہے ناں۔ ضروری ہے جو مجھے پسند کرے، میں بھی اسے پسند کروں''۔

''فراز میں آخر بُرائی کیا ہے؟ پڑھا لکھا ہے، اپنا ٹھیک ٹھاک بزنس ہے اور عادت کا بھی بہت اچھا ہے اور کیا چاہیے تمہیں؟'' وہ خفا ہو گئی تھیں۔

''میں نے کب کہا کہ وہ بُرا ہے۔ مجھے بھی وہ بہت اچھا لگتا ہے، مگر صرف ایک کزن اور دوست کی حیثیت سے''۔ وہ ان کی ناراضی کے جواب میں بڑے اطمینان سے بولی تھی اور وہ بغیر کچھ کہے خفگی سے اس کے پاس سے اُٹھ گئی تھیں۔

☆

ایمن کی شادی کا فنکشن پی سی میں ارینج کیا گیا تھا۔ وہ پچھلے دو دن سے ایمن ہی کے گھر میں رُکی ہوئی تھی۔ شادی کے دن کے لیے اس نے آف وائٹ کلر کا گھاگھرا بنایا تھا۔ تیار ہونے کے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو اپنا آپ خود ہی بڑا پیارا لگا۔ کل مہندی کے فنکشن میں معاذ کے دیئے کمنٹس اسے اب تک سرشاری میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔ کل اس نے مہندی کلر کا نیٹ کا سوٹ پہنا تھا اور اپنے لمبے بالوں کو برش کر کے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ایمن اور دو تین فرینڈز نے اس کی تعریف کی تھی، مگر ان کی تعریف اسے اتنی مختلف نہ لگی تھی، جتنی معاذ کی۔ وہ اسے دیکھ کر ہائے ہیلو کرنے کے لیے اس کے پاس آئی تھی۔

''کل میں سوچ رہا تھا کہ شاید بلیو کلر تم پر بہت اچھا لگتا ہے اور آج یہی رائے میری اس گرین کلر کے بارے میں بھی ہے''۔ وہ اس کی ہیلو کے جواب میں بولا تھا اور وہ مُسکراتے ہوئے بولی تھی۔

''میرا خیال ہے مجھ پر ہر رنگ اچھا لگتا ہے''۔ وہ اس کے انداز پر ہنس پڑا تھا۔

''جی ہاں بالکل ٹھیک کہا۔ وہ امجد اسلام امجد نے تمہارے ہی بارے میں تو کہا ہے۔ تو جس رنگ کا کپڑا پہنے وہ موسم کا رنگ ہو جائے''۔

وہ اپنی بات انجوائے کرتا ہوا خود بھی ہنس رہا تھا۔

''ویسے انہوں نے جس کسی کے بارے میں کہا ہو۔ تمہارے اوپر واقعی ہر کلر اچھا لگتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا اور ان چند جملوں نے اسے کل سے لے کر آج تک اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ باراتیوں کا استقبال کرتے وقت اس کی دانیال اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے معاذ سے سلام دُعا ہو گئی تھی۔ نکاح ہو گیا اور وہ ''حسب توفیق'' حق دوستی نبھانے کے لیے خوب سارے آنسو بھی بہا چکی تو واپس مہمانوں کی طرف آ گئی۔ ایمن سے اتنی پرانی دوستی کی وجہ سے وہ اس کے خاندان کے تقریباً تمام ہی افراد سے واقف تھی۔ اس لیے بڑی گرم جوشی سے سب سے ملتی پھر رہی تھی۔ وہ نادرہ اور افشین سے خیر خیریت پوچھتی آگے بڑھی تو سامنے سے آتے معاذ کو دیکھ کر رُک گئی۔ اس کا دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسی کے پاس آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ چلتی اس لڑکی کو رامیہ نے سرسری نظروں سے دیکھا تھا۔

''اتنی دیر سے تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں''۔ وہ اس کے پاس آ کر بولا تھا۔

''کیوں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''تمہیں مزنا سے ملوانا تھا''۔ وہ اپنے برابر کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو رامیہ نے اس لڑکی کو بغور دیکھا۔ عام سے نقوش اور بڑی عام سی پرسنیلٹی۔ اس کی شخصیت میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو اسے قابلِ توجہ بناتا ہو یا شاید معاذ کی شان دار اور بھرپور مردانہ شخصیت کے سامنے اس کی شخصیت دبی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ عام حالات میں وہ ایک قبول صورت لڑکی..... کہلائی جا سکتی تھی، مگر معاذ کے برابر کھڑے ہو کر تو وہ بالکل ہی عام سی لگ رہی تھی۔

''اس سے ملو یہ مزنا ہے، میری فرسٹ کزن۔ ویسے پچھلے ایک سال سے کزن کے علاوہ اس کا ایک اور تعارف بھی ہو گیا ہے، وہ یہ خود بتائے گی..... اور مزنا یہ ہے رامیہ میری دوست، بہت ذہین، بہت بولڈ اور بے حد با اعتماد۔ اس سے بات کرتے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا ہے کہ پتا نہیں

ابھی سامنے سے کیا جواب آجائے''۔اسے معاذ کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

ایسا لگا تھا جیسے اندر کہیں کوئی چیز بہت بری طرح کرچی کرچی ہوکر ٹوٹی تھی۔

''کیا ہے معاذ؟تم تعارف بھی ڈھنگ سے نہیں کرواسکتے''۔مزنا نے اسے گھورا تھا،پھر اس کی طرف متوجہ ہوکر بولی تھی۔

''ہماری لاسٹ ایئر انگیجمنٹ ہوئی ہے''۔

''اور شادی کافی الحال کوئی امکان نہیں ہے،کیونکہ محترمہ کو بائیو کیمسٹری میں M.S.C کرنے کے بعد اب سی ایس ایس کرنے کا بھوت سوار ہوا ہے۔تم ہی لوگوں کے ساتھ تو اس نے بھی پاس آؤٹ کیا ہے''۔وہ ایک نظر مزنا پر ڈالتا اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔

''بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر''۔وہ مزنا کا ہاتھ تھام کر گرم جوشی سے بولی۔

''مجھے بھی اور میرا تو معاذ سے تمہارا ذکر سن سن کر ہی تم سے ملنے کا بہت دل چاہنے لگا تھا۔یہ بہت کم ہی کسی کی تعریف کرتا ہے۔تمہاری تعریف سن کر مجھے یقین تھا کہ کوئی بہت ہی علیحدہ قسم کی لڑکی ہے،جس کی معاذ اس طرح تعریف کرتا ہے''۔وہ جواباً بڑی خوش دلی سے مُسکراتے ہوئے بولی تھی۔

''معاذ کہنے لگا،دانیال کی شادی ہے چلوگی،سچ پوچھو تو میں صرف تم سے ملنے ہی کی خاطر اس کے ساتھ آئی ہوں''۔وہ بڑی خوب صورت سی مسکراہٹ چہرے پر لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اپنے ساتھ کھڑے بندے پر انتہا سے زیادہ اعتبار اور بھروسہ ہے۔اسی لیے اس کی نظروں میں رامیہ کو نہ تو کسی قسم کی جیلیسی نظر آئی تھی اور نہ ہی کوئی شک۔اسے شاید پورا یقین تھا کہ ساتھ کھڑا یہ بے حد منفرد بندہ صرف اور صرف اسی کا ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا کبھی بھی نہیں لے سکتا۔

''پھر تمہیں مجھ سے مل کر کیسا لگا۔مایوسی تو نہیں ہوئی؟''وہ جتنے آرام سے کھڑی ہوکر اس سے باتیں کررہی تھی،اس پر اسے خود ہی تعجب ہو رہا تھا۔سب ہی کہتے تھے کہ اس میں برداشت نہیں ہے۔تحمل،معاملہ فہمی اور صبر جیسے لفظوں سے وہ قطعاً ناآشنا ہے اور آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اپنے بارے میں آگاہی حاصل ہورہی تھی۔

''ہم کسی اور کو سمجھنے کا دعویٰ کیسے کرسکتے ہیں،جبکہ اکثر اوقات ہم خود اپنے آپ ہی کو نہیں سمجھ پاتے''۔اسے ایسا لگا جیسے وہ خود پہلی دفعہ رامیہ کمال سے مل رہی ہے۔رامیہ کمال جو بے حد بولڈ اور آؤٹ اسپوکن ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی برداشت والی اور اپنے تمام تر احساسات دوسروں سے چھپا لینے والی ایک بڑی ہی مختلف لڑکی ہے۔وہ آج پہلی مرتبہ اس سے متعارف ہورہی تھی۔

''تم سے مل کر بہت اچھا لگا ہے۔مجھے یقین ہے جس طرح تمہاری معاذ سے دوستی ہے،اسی طرح مجھ سے بھی ہوجائے گی اور ویسے اس نے تمہاری اتنی تعریفیں کرنے کے باوجود ایک بات مجھے نہیں بتائی تھی اور وہ یہ کہ یو آر سو کیوٹ اینڈ چارمنگ''۔وہ بڑے دوستانہ انداز میں مُسکراتے ہوئے اس کی تعریف کررہی تھی۔معاذ خاموشی سے کھڑا مُسکراتا ہوا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ دونوں خواتین باتیں کریں میں ذرا دولہا میاں کو مورل سپورٹ دینے جارہا ہوں''۔وہ ایمن کی بہنوں اور کزنز کے نرغے میں

گھرے دانیال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ وہاں دودھ پلائی پر ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

''ویسے یہ دولہا بن کر اچھا خاصا معقول بندہ چغد کیوں نظر آنے لگتا ہے؟'' وہ دانیال کی حد درجہ معصوم سی شکل پر نظریں جمائے ہنستا ہوا بولا تھا۔

''بتاؤں گی دانیال کو آپ کے یہ سنہری خیالات بائی داوے آپ کب چغد بن رہے ہیں؟'' وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔

''دیکھو ابھی یہ محترمہ سی ایس ایس کا شوق پورا کرلیں۔ نومبر میں ان کے ایگزیمز ہوں گے۔ دعا کرو یہ Written میں ہی فیل ہو جائے۔ تو پھر تو فوراً ہی شادی ہو جائے گی، ورنہ خدانخواستہ اگر کلیئر کرلیا تو پھر تو شادی لمبی ہوگئی''۔ اس کی بات پر رامیہ ہنس پڑی تھی، جبکہ مزنا نے اسے بُری طرح گھور کر دیکھا تھا۔

''یہ دراصل میری ذہانت سے جیلس ہوتا ہے۔ وہی مردانہ انا کا مسئلہ عورت کا اپنے برابر آتے تو مرد حضرات کبھی برداشت کر ہی نہیں سکتے''۔

''دیکھا تم نے کتنی لڑاکا ہے یہ۔ اس سے مل تمہیں یقیناً میرے مستقبل کا سوچ کر مجھ پر رحم آیا ہوگا''۔ وہ رامیہ سے مخاطب ہوا تھا۔

''خیر تم لوگ باتیں کرو، میں ذرا دانیال کو سسرالیوں کے حملوں سے بچالوں۔'' وہ فوراً ہی آگے بڑھ گیا تھا اور مزنا اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگی تھیں۔

''یہ جب لندن سے پڑھ کر آیا، اسی وقت سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ پورے دو سال بڑی مستقل مزاجی سے میرے پیچھے لگا رہا تو مجھے اپنا رویہ بدلنا پڑا۔ دراصل میں ابھی منگنی یا شادی وغیرہ کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی تھی، مگر معاذ نے مجھے میرے خیالات تبدیل کرنے پر مجبور کر ہی دیا''۔ وہ اس بے حد عام سی لڑکی کی یہ باتیں بڑے تعجب سے سن رہی تھی۔ ایسا اس میں کیا تھا کہ معاذ جیسا شخص اس کے پیچھے دیوانہ ہوتا۔ ہمارے ہاں خوب صورتی کا جو پیمانہ مقرر ہے۔ ان میں سے وہ کسی ایک پر بھی پوری نہیں اُتر رہی تھی۔ کافی دیر تک اس سے باتیں کرنے کے بعد وہ وہاں سے اٹھی تو ایسا لگا جیسے شہرِ دل میں ہر طرف سکوت چھایا ہوا ہے۔ یوں جیسے کہیں کوئی آواز کوئی آہٹ تک نہیں ہے۔ اتنے سارے خوش باش لوگوں کے اس ہجوم میں وہ خود کو ایک دم تنہا اور بالکل اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ جب دِل خوش تھا تو تنہائی میں بھی محفلیں آباد تھیں، ہر سو خوشی تھی اور جب دِل اُداس ہوا تو محفل بھی ویران اور اجنبی لگنے لگی تھی۔

وہ خود کو سنبھالتی سارا وقت ہنستی مُسکراتی رہی تھی۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہم کبھی بھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتے۔ اپنے قریب ترین افراد سے بھی نہیں۔ ممی نے اس کی اُتری ہوئی شکل دیکھی تو پریشان ہوگئی تھیں۔

''کچھ نہیں ممی بس ذرا تھکن ہوگئی ہے۔ تین چار دن سے پوری نیند نہیں سوئی ہوں، اس لیے۔ ریسٹ کروں گی تو خود ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' وہ انہیں اطمینان دِلاتی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

''کب اس نے کہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کب اس نے کہا کہ مجھے تم اچھی لگتی ہو۔ اس کے خلوص اور دوستی کے میں نے خود ہی یہ معنی نکالے تھے، اس میں اس کا کیا قصور۔ غلطی تو میری اپنی ہے''۔ وہ بلک بلک کر روتے ہوئے اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔

''لیکن اس کا وہ انداز، وہ باتیں کیا سب کچھ غلط تھا۔ جو باتیں مجھے میرے دِل نے سمجھائی تھیں کیا سب غلط تھیں۔ میری اپنی ذہنی اختراع

مخلص اور سچا چاہنے والا ملے۔ ایسا اتفاقاً ہوتا ہے مگر جو میرے ساتھ ہوا وہ ہم میں سے اکثر لڑکیوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ ہم خوابوں کی دُنیا میں رہتی ہیں اور خود سے ملنے والا کوئی بھی ایسا شخص جس میں ہمیں ہمارے خوابوں کی تعبیر نظر آ رہی ہوتی ہے۔ اس پر اپنا آپ نچھاور کر دیتی ہیں۔ ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یونیورسٹی میں ساتھ پڑھنے والا کلاس فیلو جو بڑے خلوص سے ملتا ہے، ہمارے لیکچرز مس ہو جائیں تو اپنے لیکچرز اور نوٹس پیش کرنے والا زندگی بھر ہمارا ساتھ نبھائے گا، اگر جاب کرنے نکلیں تو اپنے کسی ہینڈسم سے کولیگ میں ہمیں ہمارے مسٹر رائٹ کی جھلک نظر آنی شروع ہو جاتی ہے۔ ہم کیوں ان مردوں کے جال میں پھنستے ہیں، کیوں ان کے ان اندازوں کو جو وہ ہمارے بارے میں لگاتے ہیں، صحیح ثابت کرتے ہیں اور جس وقت وہ تفریحاً ہمارے ساتھ وقت پاس کر رہے ہوتے ہیں اور ہم اسے سچی محبت سمجھ کر دل و جان لٹانے کو تیار ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ مرد ہم پر دِل ہی دِل میں کتنا ہنستے ہوں گے۔ وہ ہماری بے وقوفی سے کتنا محظوظ ہوتے ہوں گے۔ کیوں ہم خود کو دوسروں کے لیے تفریح فراہم کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔

ایک بہت بولڈ، بے تحاشا خوب صورت اور ذہین لڑکی تمہیں نظر انداز کر رہی تھی اور یہ بات تمہاری مردانہ انا اور وقار کو ٹھیس پہنچا رہی تھی۔ میرا یہ کہنا کہ میں کسی بھی چیز کو سر پر سوار کر کے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بناتی، بقول تمہارے میرا درویشانہ مزاج تمہیں میری طرف مائل کر گیا تھا۔ تمہیں رامیہ کمال کا مختلف ہونا اچھا نہیں لگا۔ تم نے سوچا اسے بھی اسی کیو میں کھڑا ہونا چاہیے۔ جہاں تم باقی لڑکیوں کو کھڑا دیکھتے ہو۔ جو تمہاری اسمارٹنیس، ذہانت اور دولت سے متاثر ہو جاتی ہیں اور دیکھ لو جو تم نے چاہا وہ ہو گیا۔ میں رامیہ کمال واقعی مختلف نہیں تھی، مگر میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں نے واقعی زندگی میں کبھی کسی چیز یا شخص کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ اس کے نہ ملنے پر خود کو روگ لگا لوں اور آج بھی میں ویسی ہی ہوں۔ مجھے تو اپنا خود اپنی ہی نظروں سے گر جانا بہت دُکھ دے رہا ہے۔ اب سے پہلے میں اپنے آپ سے محبت کرتی تھی، خود اپنی عزت کرتی تھی، مگر اب نہیں کرتی۔ اور یہ دُکھ ساری عمر میرے ساتھ رہے گا کہ رامیہ کمال خود اپنی ہی عزت نہیں کرتی۔ تمہیں تو شاید میں کبھی یاد بھی نہیں کروں گی۔

دو مہینے بعد جب میں تمہیں اپنی اور فراز کی شادی کارڈ دیتے ہوئے یہ بتاؤں گی کہ ہمارا رشتہ سات آٹھ ماہ پہلے طے ہو گیا تھا، تو شاید تمہیں شاک لگے گا۔ تم اپنی میرے بارے میں قائم کردہ رائے پر شاید نظر ثانی بھی کرو، مگر یہ سب بھی اس ذلت کا مداوا نہیں ہو سکتا جو میں نے محسوس کی۔ کاش ہم لڑکیاں جاگتے میں خواب دیکھنا چھوڑ دیں۔ ہمیں سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنی آ جائے۔ محبت اور فلرٹ میں ہم فرق کر سکیں۔ کاش کبھی کوئی ہمیں تفریح کی چیز نہ سمجھ سکے۔ کیا کبھی ہم لڑکیاں اتنی میچور ہوں گی۔ کیا کبھی ایسا ہو گا کہ کوئی رامیہ کمال کسی معاذ علی خان کے فون کرنے پر، اس کے گفٹ دینے اور روش کرنے پر، اس کی تعریفوں پر سر جھٹک کر آگے بڑھ جائے گی۔ وہ اس بات کو بڑے سرسری انداز میں لے گی کیا کبھی ایسا ہو گا؟ کب ہم خوابوں کی دُنیا سے نکل کر حقیقت کی دُنیا میں قدم رکھیں گے؟ آخر کب؟

تھیں۔اس کی وہ توجہ، وہ التفات، وہ تعریفیں کیا سب جھوٹ تھا۔ وہ اپنے ہر دوست سے اسی طرح ملتا ہے، جس طرح مجھ سے ملتا تھا۔ کیا سب کی اسی طرح پروا کرتا تھا، جیسی میری کرتا تھا۔ میں کس سے پوچھوں کون مجھے بتائے گا۔ یہ دوستی تھی، محبت تھی یا فلرٹ۔ مگر اس کی کوئی ایک بات بھی ایسی گرفت میں نہیں آ رہی جس کی بنیاد پر میں اسے فلرٹ قرار دے سکوں اور اس کا گریبان پکڑ کر پوچھوں کہ تم نے میرے ساتھ اس طرح کیوں کیا۔ یہ کیسا کھیل کھیلا ہے معاذ تم نے میرے ساتھ آخر کیا بگاڑا تھا، میں نے تمہارا۔ تمہارا مجھے مزنا سے خاص طور پر ملوانا۔ کیا تم میری بے بسی کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ کیا یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کبھی کسی کو خاطر میں نہ لانے والی رامیہ تمہارے لیے کس طرح ٹوٹ کر بکھرے گی، تم نے سب کچھ کتنی چالاکی سے کیا۔ میں تم سے جا کر لڑ بھی نہیں سکتی کہ جو باتیں میرے دِل نے مجھے سمجھائی تھیں، وہ تم نے اپنی زبان سے تو کبھی نہیں کہی تھیں۔ تم صاف انکار کر دو گے، میرا مذاق اڑاؤ گے۔ کبھی کبھی یہ دل ہمیں کتنا خوار کرتا ہے۔ کیا جو لوگ دل کا کہا مانتے ہیں، اس کی باتوں پر یقین کرتے ہیں، وہ گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ کیا دِل جھوٹ بھی بولتا ہے؟'' وہ خود ہی سوال جواب کرتی روئے جا رہی تھی۔

☆

ایمن کی شادی کے لیے اس نے چھٹیاں لی ہوئی تھیں، ولیمہ کے اگلے روز جب وہ آفس گئی تو معاذ کا اسے دیکھ کر اپنا سب کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جانا رامیہ نے پوری شدتوں سے محسوس کیا تھا۔ دانیال کی عدم موجودگی میں آج کل وہ سارا ٹائم یہیں دے رہا تھا۔ دن بھر میں کئی مرتبہ اپنے کام سے وہ معاذ کے کمرے میں گئی تھی۔ لنچ بھی اسی کے ساتھ کیا تھا۔ اس سے مزنا کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ ان دونوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ ایسا کر کے وہ اپنی زخمی انا کو تسکین پہنچا رہی ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ بھی کسی قسم کی حیرت ظاہر کیے بغیر معمول کے انداز میں اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

''تم بظاہر خود کو لاپرواپوز کرنے کے باوجود میرے ہر ہر انداز کا بغور جائزہ لے رہے ہو۔ مجھے پتا ہے اور شاید تم میرے بارے میں یہ سوچ رہے ہو گے کہ میں کتنی کامیاب اداکارہ ہوں۔ مجھے خود کو دوسروں سے چھپانا آتا ہے۔ جو تم میری آنکھوں میں دیکھنا چاہتے تھے وہ نہیں دیکھ پا رہے اور اس پر یقیناً تمہیں بہت کوفت ہو رہی ہو گی''۔

''ضروری ہے جو مجھے پسند کرے میں بھی اسے پسند کروں''۔ اپنی کچھ عرصہ پیشتر کہی بات گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

''نہیں یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو مجھے پسند کرے۔ اسے میں بھی پسند کروں اور جسے میں پسند کروں۔ وہ بھی مجھے پسند کرے ایسا ہونا بھی ضروری نہیں ہے''۔ اس نے بڑی تلخی سے سوچا تھا۔

''مگر میں خود اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی، وہ میرے لیے ایک عام انسان تھا۔ اس نے خود مجھے ضرورت سے زیادہ اہمیت دے کر، اپنی باتوں سے اپنے انداز سے اپنی طرف متوجہ کروایا تھا۔ ہم لڑکیاں چاہے پڑھی، لکھی ہوں یا جاہل، چاہے امیر ہوں یا غریب اندر سے سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ میٹھی باتوں اور غیر معمولی التفات پر سب کچھ قربان کر دینے والی۔ ہاں ایمن سب تمہاری طرح خوش قسمت نہیں ہوتے کہ انہیں

موسمِ گُل

''کیا بات ہے بڑی خوش نظر آ رہی ہو؟'' فارینہ کے اس جملے پر ہم سب ہی نے چونک کر نمرہ کی طرف دیکھا تھا۔ بتیسی کی نمائش کرتی وہ ہمیشہ کی طرح زہر بھی لگ رہی تھی۔

''بھئی کیوں نہ خوش ہو۔ خیر سے ہماری نمرہ کی بات جو پکی ہوگئی ہے۔ اس سنڈے کو لڑکے والے انگوٹھی پہنانے آ رہے ہیں۔ لڑکا امریکہ میں سیٹل ہے۔ M.S.C کر رکھا ہے۔ بڑی ویل آف فیملی کو بیلونگ کرتا ہے۔'' سیما کی اس بات سے ہم چاروں ہی کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ نمرہ بیگم زبردستی شرمانے کی کوشش کرتی ہوئیں، اپنے دوپٹے کے پلو کو مروڑ رہی تھیں۔

''ہمارے گروپ میں سب ہی کی نیا پار لگ گئی۔ تم لوگ کب خوش خبری سنا رہی ہو۔ پوری کلاس میں صرف تم لوگوں ہی کا گروپ بچا ہے، جس میں سب چھڑے چھانٹ پھر رہے ہیں۔'' دِل تو ہمارے پہلے ہی جل رہے تھے۔ مزید کسر عظمیٰ کے اس جملے نے پوری کر دی تھی۔

''چلو عظمی! کیمسٹری کا پریکٹیکل اٹینڈ نہیں کرنا کیا''۔ نمرہ نے ہمارے چہرے کے زاویوں سے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ اب یہاں ایک عدد معرکہ چھڑنے والا ہے۔ اس لیے پہلے ہی اپنے گروپ کو لے کر وہاں سے چل دی اور ہم چاروں شدید طیش کے عالم میں کھڑے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

''سمجھتی کیا ہے یہ عظمی خود کو''۔ مومو کے غصیلے انداز پر مجھے سخت تاؤ آیا۔

''اس کے سامنے تو چپ منہ بند کیے کھڑی تھیں۔ کیسے وہ ہم سب کو منہ پر ذلیل کر کے چل دی اور ہم کھڑے منہ دیکھتے رہے۔ لعنت ہے ہم چاروں پر''۔ میں نے مٹھیاں بھینچ کر اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ فارینہ اور نگار چپ چاپ منہ لٹکائے کھڑی تھیں۔ انہوں نے ہم دونوں کی گفتگو پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔

''تم دونوں کو کیا ہوا ہے۔ یہ بت بنی کیوں کھڑی ہو''۔ میں نے فارینہ اور نگار کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار وہ ٹھیک تو کہہ رہی تھی۔ پوری کلاس میں صرف ہمارا ہی گروپ وہ بدقسمت گروپ ہے جس کا کوئی بھی ممبر ابھی تک ''شدہ'' نہیں ہوا''۔

''یہ ''شدہ'' سے آپ کی کیا مراد ہے، وضاحت کرنا پسند فرمائیں گی''۔ میں نے نگار سے سوال کیا۔

''اوئے جاہل اُردو میں سابقے لاحقے نہیں پڑھے کیا۔ شدہ سے مراد ہے منگنی، شادی، نکاح شدہ، شادی شدہ، وغیرہ وغیرہ۔'' مومو نے میری عقل پر ماتم کیا تھا۔ فارینہ خاموش بیٹھی گھاس نوچ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا۔ نمرہ کی منگنی کا سب سے زیادہ صدمہ اسے ہی ہوا ہے۔

''چل میری جان، اب اتنا اُداس مت ہو۔ چلو آج نمرہ کی منگنی کے غم میں ہم سب مومو کی طرف سے کولڈ ڈرنگ اور سینڈوچز سے فیض

یاب ہوں گے''۔اپنی بات مکمل کرتے ہی میں کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑی ہوگئی تھی، جبکہ مومو بیٹھی مجھے خطرناک تیوروں سے گھور رہی تھی۔

''کل بھی تم لوگوں کو میں نے پیپسی پلوائی تھی۔ یہ کوئی انصاف ہے۔'' مومو نے صدائے احتجاج بلند کرنے کی کوشش کی، جسے ہم سب نے بے دردی سے کچل دیا۔

''ہاں تو ہم سب میں سب سے موٹی مرغی بھی تم ہو۔ یہاں تو پاکٹ منی اتنی ملتی ہے کہ مہینے کے پندرہ دن ہی سکون سے گزر پاتے ہیں۔ مجھے تمہارے جتنی پاکٹ منی ملتی ہو تو باقاعدہ اپنی دوستوں کا ماہانہ وظیفہ باندھ دیتی، مگر افسوس''۔ فارینہ کے شرارتی انداز پر ہم سب ہی ہنس پڑے تھے، سوائے مومو کے۔

کچھ دیر بعد ہم چاروں کولڈ ڈرنک اور سینڈوچز سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنا ''غم غلط'' کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

☆

ہم چاروں بچپن کی سہیلیاں ہیں۔ میں اور مومو تو پہلے دن اسکول بھی ایک ساتھ گئے تھے۔ یہ بات ظاہر ہے، مجھے ممی نے بتائی ہے۔ ہمارا ایک ساتھ ایڈمیشن ہوا تھا۔ مومو ہمارے برابر والے گھر میں رہتی ہے۔ ممی اور آنٹی کی شروع ہی سے بہت اچھی دوستی ہے۔ مونٹیسوری میں فارینہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئی۔ وہ بھی ہمارے گھر کے قریب ہی رہا کرتی تھی۔ فرسٹ اسینڈرڈ میں پہنچے تو نگار سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی لڑاکا اور جھگڑالو لڑکی تھی۔ شروع شروع میں ہم لوگوں کی اس کے ساتھ بہت لڑائیاں ہوئیں، مگر پھر پتا نہیں کیسے وہ بھی ہمارے گروپ میں شامل ہوگئی۔ وہ دن اور آج کا دن ہم چاروں کی دوستی میں کبھی کوئی دراڑ نہیں آئی۔ چھوٹی موٹی جھڑپوں سے قطع نظر ہم لوگ آپس میں کبھی نہیں لڑے۔ میٹرک کے بعد ایک ساتھ انٹر میں ایڈمیشن لیا۔ فارینہ پری میڈیکل گروپ میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ اس کا انٹرسٹ کامرس کی طرف تھا، مگر ہم لوگوں نے مجبور کر کے زبردستی اسے بائیولوجی رکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ تھرڈ ائیر کا امتحان دے کر ہم لوگ تازہ تازہ فورتھ ایئر میں آئے تھے۔ نمرہ لوگوں سے ہماری کبھی بھی نہیں بنتی تھی۔ ہمارے اور ان کے گروپ کے درمیان اکثر حالت جنگ رہا کرتی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ شروع ہی سے اسکول اور پھر کالج میں ہمیشہ ہر جگہ ہم لوگوں کی دادا گیری چلی تھی۔ ہمارا گروپ تو پیدا ہی لیڈرشپ کے لیے ہوا تھا اور نمرہ لوگوں نے کیونکہ شروع وقت سے ہمارا مقابلہ کرنے کی پالیسی اختیار کی تھی تو ہم کیوں پیچھے رہتے۔ بُری تو وہ لوگ ویسے بھی لگا کرتی تھیں، مگر آج کا ان کا طعنہ تو ہمیشہ سے زیادہ بُرا لگا تھا۔ انہوں نے ہماری غیرت کو للکارا تھا۔ مجھے تو خیر منگنی یا شادی کا کوئی خاص شوق نہیں تھا، مگر فارینہ کو منگنی کا بڑا ہی شوق تھا۔ ہماری کلاس میں جب بھی کسی لڑکی کی انگیجمنٹ ہوتی اور وہ اگلے دن اترا اترا کر سب کو مٹھائی کھلاتی اپنی منگنی کی خوش خبری سناتی پھر رہی ہوتی۔ اس وقت فارینہ کی رونی شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

☆

''نمرہ! تمہیں تمہارے سسر نے رنگ پہنائی تھی''۔ نگار نے بڑی سنجیدگی اور بردباری سے تصویروں پر نظریں جمائے نمرہ سے سوال کیا تھا۔ اس سنجیدگی کے پیچھے کتنی مکاری کارفرما تھی، یہ ہم سب ہی جانتے تھے۔ نگار کی بات پر نمرہ کی شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

روز ہی ملا کرتے تھے۔ مگر نگار اور فارینہ سے روز ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔ گو فارینہ اور نگار کے گھر بھی قریب ہی تھے، مگر بہر حال واکنگ ڈسٹینس پر نہیں تھے۔ ایک دوسرے سے ملنے کا زیادہ ہی دِل چاہا تو سب نے میرے گھر جمع ہونے کا پروگرام بنایا۔ شام پانچ بجے ان تینوں نے گھر پر دھاوا بول دیا۔ بھیا نے جوان تینوں کو ایک ساتھ آتے دیکھا تو جھٹ گاڑی کی چابی اُٹھا کر ممی سے بولے۔

''ممی میں عاطف کی طرف جا رہا ہوں''۔

''کیا بات ہے بھیا آپ کو ہم لوگوں کا آنا اچھا نہیں لگا جو اس طرح جا رہے ہیں''۔ مومو بُرا مان کے بولی تو ممی فوراً ہی بھیا کی طرف سے صفائی دینے لگیں۔

''تم لوگوں کا آنا کیوں بُرا لگے گا۔ اس کا تو پہلے سے پروگرام طے تھا''۔ بھیا نے چہرے پر سیاست دانوں کی طرح ''No Comments'' والے تاثرات سجائے ہوئے تھے۔ بھیا کے جانے کے بعد ہم چاروں نے مل کر اودھم مچانا شروع کیا تو ممی بھی کان پکڑ کر توبہ کرنے لگیں۔ ہم چاروں ساتھ ہوں اور شور شرابہ نہ ہو، ایسا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ شام کی چائے کے ساتھ ڈھیر سارے لوازمات ان لوگوں کو ٹھنسوانے کے بعد میں نے ممی کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے ان لوگوں سے کہا۔

''ایسا کرتے ہیں، پارک میں چلے چلتے ہیں۔ موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔ آؤٹنگ بھی ہو جائے گی''۔ میری اس تجویز سے سب ہی نے اتفاق کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم چاروں خراماں خراماں چلتی پارک پہنچ گئی تھیں۔ میں اور مومو تو آج کل بڑی پابندی کے ساتھ صبح میں واک کرنے پارک آ رہے تھے۔

''تم دونوں اتنی صبح واک کرنے کے لیے اُٹھ کیسے جاتی ہو۔ میں تو جس دن گیارہ بجے سے پہلے اُٹھ جاؤں تو سارا دن سر میں درد رہتا ہے''۔ فارینہ نے بڑی حیرت سے مجھ سے اور مومو سے دریافت کیا تھا۔

''جب سر پر ساس اماں کے ڈنڈے پڑیں گے تو سارا درد وغیرہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا''۔ ہم دونوں کے جواب دینے سے پہلے نگار بول اُٹھی تھی۔ میں اور مومو اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

''ارے ہمارے ایسے نصیب کہاں۔ لگتا ہے اس دنیا سے کنواری ہی رخصت ہو جاؤں گی۔ ابھی تو بچی بہت چھوٹی ہے۔ یہ عمر تو کھیلنے کودنے اور پڑھنے لکھنے کی ہوتی ہے۔ اتنی سی بچی شادی جیسی بڑی ذمہ داری کی ابھی اہل ہی نہیں ہے''۔ فارینہ نے اپنی دادی کے لہجے کی نقل اتاری تو ہم سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ کبھی کبھی اکلوتا ہونا بھی نقصان دہ ہو جاتا ہے، ایسا ہی حال فارینہ کا تھا۔ وہ چار بھائیوں سے چھوٹی اور اکلوتی بہن تھی۔ بھائیوں اور دادی وغیرہ کی نظروں میں وہ ابھی تک چھوٹی سی بچی ہی تھی۔ پچھلے ہی دنوں اس کے لیے آنے والے پروپوزل کو اس کے بڑے بھائی اور دادی نے اِن ہی ریمارکس کے ساتھ ریجیکٹ کر دیا تھا۔ گو اس کی ماما کو اس کی شادی کی جلدی تھی۔ پاپا اس کے اس معاملے میں غیر جانبدار تھے۔ اگر جو دادی کو خبر ہو جاتی کہ بچی تو کل کی ہوتی آج شادی کروانے کے چکروں میں ہے تو کان پکڑ کر توبہ استغفار پڑھتیں۔

''تمہارا کیا دِل چاہتا ہے، تمہارا لائف پارٹنر کیسا ہونا چاہیے؟ نگار نے فارینہ سے پوچھا تو وہ بے ساختہ بولی۔

''ارے ہاں یاد آیا تمہارے ''وہ'' تو امریکہ میں رہتے ہیں ناں۔ ظاہری بات ہے پھر رنگ ساس یا سسر میں سے کوئی پہنائے گا''۔ نگار نے ہم سب کے کلیجوں میں ٹھنڈ ڈالی تھی۔ نمرہ کی تقریباً روہانسی شکل ہو رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے سیما میدان میں اُتری۔

''کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو یہ ایوب بھائی ہیں۔ نمرہ کے فیانسی'' وہ ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

''اوہ! آئی ایم سوری یار، ویسے یار تمہارے فیانسی تم سے اتنے بڑے لگ رہے ہیں، اس لیے مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی۔ تم مائنڈ مت کرنا''۔ ہم سب کو اس لمحے نگار ہمیشہ سے زیادہ پیاری لگی۔ کیسا اس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا۔ فارینہ نے بعد میں باقاعدہ نگار کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے شاباشی دی تھی۔

''اس نکلو سے منگنی ہونے پر نمرہ اتنا اترا رہی ہے۔ لعنت ہے اس کی چوائس پر''۔ فری پریڈ میں لائبریری میں بیٹھ کر مختلف فیشن میگزینز کھنگالنا ہم لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس وقت اپنے اسی فیورٹ مشغلے میں منہمک ہم لوگ مختلف ماڈلز کے ناز و ادا ملاحظہ کر رہے تھے کہ فارینہ بول اُٹھی، اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''اگر ایسے ہی کسی کارٹون سے منگنی کرنی ہوتی تو میری اب تک درجن بھر منگنیاں ہو چکی ہوتی''۔ فارینہ کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔ اسے عظمی کا طعنہ ہم سب سے زیادہ بُرا لگا تھا۔

''چھوڑو بھی اب اس بات کو۔ دُنیا میں کوئی شادی اور منگنی ہی واحد مسئلہ نہیں ہے۔ نگار نے اس روز کی بات کا بدلہ لے تو لیا ہے۔ تم نے تو عظمی کی بات دِل پر ہی لے لی''۔ میں نے فارینہ کو ٹوکا تو وہ بڑی ناراضی سے گویا ہوئی۔

''عینا دِل پر لینے کی بات نہیں ہے۔ ہم چاروں میں سے کسی نہ کسی کی فوراً انگیجمنٹ ضرور ہو جانی چاہیے۔ مجھ سے نمرہ گروپ کی اتراہٹ نہیں دیکھی جاتی''۔

''انگیجمنٹ کے لیے ایک عدد بندے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بندہ کیا اچانک آسمان سے ٹپک پڑے گا''۔ مومو نے اپنے حساب سے بڑے کام کی بات بتائی تھی اور اب داد طلب نظروں سے مجھے اور نگار کو دیکھ رہی تھی۔

''تم تو چپ ہو بیٹھو۔ سوائے کھانے اور سونے کے تم کبھی زندگی میں کچھ نہیں کرنا۔ خاندان میں کزنز کا جمعہ بازار لگا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کوئی ڈھنگ کا کام کر لیں۔ ہر دوسرا بندہ تو انہیں اپنا بھائی نظر آتا ہے''۔ فارینہ نے مومو کو ڈپٹا تو وہ منہ بنا کر چپ ہو گئی۔

''پھر تو جیسے ہم چاروں کے بیچ یہ ''مسئلہ'' ایک سنگین مسئلے کی صورت اختیار کر گیا۔ فارینہ کے بقول ہمارا گروپ پڑھائی سے لے کر اسپورٹس اور دیگر غیر نصابی سرگرمیوں تک میں ہمیشہ صف اول میں شامل رہا ہے، اب کی بار ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ ہم لوگ پوری کلاس سے پیچھے رہ گئے ہیں''۔

''فائنل ایگزامز سے پہلے ہم میں سے کسی نہ کسی کی منگنی ضرور ہو جانی چاہیے''۔ فارینہ نے الٹی میٹم دیا تھا۔

کالج میں جون جولائی کی چھٹیاں ہوئیں تو ہمارا ایک دوسرے سے فون کی حد تک رابطہ رہ گیا۔ مومو اور میں تو گھر برابر ہونے کی وجہ سے

''کیسا بھی ہو، پر ہو تو سہی۔ بس نمرہ کے فیانسی کی طرح کی مخلوق نہ ہو، یعنی گزارے لائق ہو، کوالیفائیڈ ہو اور اتنا کماتا ہو کہ میں ہر مہینے میں دو جوڑے لازمی بنا سکوں۔ یونو میرا ایک ہی تو شوق ہے، اچھا پہننا اور اچھا لگنا''۔

''تم بتاؤ تمہارا آئیڈیل بندہ کیسا ہوگا'' فارینہ نے نگار سے پوچھا تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

''ہینڈسم ہو، ویل آف ہو، براڈ مائنڈڈ ہو، پڑھا لکھا ہو، بھئی میری فہرست تو بہت طویل ہے، مگر اصل بات تو یہ ہے کہ امی پاپا جو فیصلہ کریں گے، میرے لیے تو وہی قابلِ قبول ہوگا''۔ نگار نے فرماں برداری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

''ان سے تو پوچھنا ہی بے کار ہے یہ تو سوچتی بھی اپنی ممی کے ذہن سے ہیں۔ جہاں ممی کہیں گی، ہماری مومو بیگم وہیں شادی کرلیں گی''۔ فارینہ نے مومو کی شان میں قصیدہ پڑھا تو وہ بُرا مانے بغیر بولی۔

''یار مسئلہ یہ ہے کہ مجھے صرف انگیجمنٹ کروانے کا شوق ہے، وہ بھی فرینڈز کے سامنے اترانے کے لیے، اس سے زیادہ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ بس جلدی سے وہ مبارک موقع آئے جب میں پانچ چھ کلو مٹھائی بمعہ ڈائمنڈ رنگ کلاس میں پہنچوں اور نمرہ گروپ کو جا کر گلاب جامن کھلا کر یہ خبر سناؤں''۔ مومو تو ایسا لگ رہا تھا تصور میں نمرہ، عظمی اور سیما کو مٹھائی بھی کھلانے لگی تھی۔

''تم بہت چپ بیٹھی ہو، تمہارا مسٹر رائٹ کیسا ہوگا؟'' نگار نے میری طرف رُخ کیا تو میں جو بڑی دیر سے چپ بیٹھی، ان لوگوں کو بولتا سن رہی تھی جواباً بولی۔

''میرے ساتھ تم لوگوں والا مسئلہ نہیں ہے۔ ایسی شادیاں تو مجھے زہر لگتی ہیں جن میں لڑکی لڑکے نے تصویر کے علاوہ ایک دوسرے کو کبھی دیکھا بھی نہ ہو۔ غیر متعلقہ افراد سارے فیصلے کرتے پھریں اور جن کی زندگی کا فیصلہ ہو رہا ہے، وہ خاموش تماشائی بنے سب کو دیکھتے رہیں۔ ایسے منگنی کروانے کا مجھے تو ہرگز کوئی شوق نہیں ہے۔ ساس نندیں آئیں انہوں نے پسند کرلیا۔ بات پکی ہوگئی۔ اللہ اللہ خیر صلہ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ایسی شادی میں بھی کوئی تھرل ہے، نہ کوئی ظالم سماج نہ دیگر مسئلے مسائل۔'' اپنی اتنی پرانی دوستی میں یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ان لوگوں کو اپنے دِل کی بات بتائی تھی۔

''یعنی یہ کہ تم پسند کی شادی کرنا چاہتی ہو''۔ مومو نے تصدیق چاہی تھی۔ میں نے گردن ہلا دی۔

''میرا دِل چاہتا ہے، وہ بہت بولڈ ہو، بہت کانفیڈنٹ۔ وہ آئے اور آ کر بڑے اعتماد کے ساتھ مجھے شادی کی آفر کرے۔ اس طرح جیسے انکار کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا خوب صورت سا بکے ہو۔ میں وہ بکے قبول کرلوں۔ کیا خوب ہو اگر وہ ویلنٹائن ڈے ہو''۔ میں نے بڑی سچائی سے اپنے دِل کی بات بتا دی تھی۔

''اوئے ہوئے بچی تو بڑے ہی رومینٹک قسم کے خیالات رکھتی ہے۔ چلو بھئی ہم سب مل کر دُعا کرتے ہیں کہ اگلا ویلنٹائن ہماری عینا کے لیے بہت سی خوشیاں لے کر آئے''۔ نگار نے دعائیہ انداز میں کہا تو ہم سب ہی ہنس پڑے تھے۔

☆

چھٹیاں ختم ہوئیں اور ہم لوگوں کی پرانی روٹین بحال ہوگئی۔ یعنی صبح اُٹھنا، کالج کی تیاری، بھیا کا مجھے اور مومو کو کالج چھوڑنا۔ کالج میں وہی ہماری ہنگامہ آرائیاں اور نمرہ وغیرہ کے ساتھ جنگ وجدل۔ واپسی میں مومو کی ممی ہم لوگوں کو پک کرتیں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر سونا تو میرے لیے لازمی تھا، ورنہ تو سارا دن بوجھل گزرتا تھا۔ شام میں ٹی وی دیکھنا، ممی کے ساتھ گپیں مارنا۔ پھر جب بھیا اور پاپا گھر آجاتے تو ان کا دماغ چاٹنا۔ رات کے کھانے کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹہ اسٹڈیز کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ اپنی تمام تر شوخیوں، شرارتوں اور لاپرواہیوں کے باوجود میں نے ممی پاپا کو پڑھائی کے معاملے میں شکایت کا موقع کبھی بھی نہیں دیا تھا، بلکہ صرف میں ہی کیا ہمارا پورا ہی گروپ ہمیشہ امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتا تھا۔

دن یونہی گزر رہے تھے۔ فائنل ایگزیمز میں صرف دو ماہ باقی تھے۔ ہم سب ہی بڑا دِل لگا کر امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ پڑھائی لکھائی کے ساتھ ساتھ فارینہ کا غم اپنی جگہ برقرار تھا۔ اسے اس بات کا بڑا شدید دکھ تھا کہ ہم چاروں کی چاروں بغیر منگنی کے کالج سے رخصت ہو جائیں گی۔ اس روز کلاسز آف ہونے کے بعد ہم چاروں لائبریری میں بیٹھ کر Chemistry Organic کے ایک دوٹاپکس آپس میں کلیئر کر رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نگار سے سمجھ رہے تھے۔ کیمسٹری اس کا فیورٹ مضمون تھا اور اتنے بور مضمون میں اس کی دلچسپی ہم لوگوں کے لیے یوں فائدہ مند تھی کہ ہماری پریشانی نگار ہی حل کیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ استانی صاحبہ بنی ہم لوگوں کو ڈانٹتی سمجھا رہی تھی۔ پڑھائی کی دھن میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ گھر میں تو آج کل ہم دیر ہو جانے کا کہہ کر ہی آتے تھے، اس لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ واپسی میں آج کل ہم چاروں ہی فارینہ کی گاڑی میں جایا کرتی تھیں۔ آج اس کے ڈرائیور نے چھٹی کر لی تھی، اس لیے ہم سب ہی کو بس سے جانا تھا۔

''تین بج رہے ہیں، آج گھر جانے کا ارادہ نہیں ہے''۔ مومو نے ہم سب کی توجہ گھڑی کی طرف دلائی تو ہم چاروں جلدی جلدی اپنا ساز و سامان سمیٹ کر کھڑے ہو گئے۔ لائبریری میں اتنی دیر سے بند موسم کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ باہر نکل کر دیکھا تو ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔

''لو جی یہ تو بارش شروع ہوگئی۔ اب کیا بھیگتے ہوئے گھر جائیں گے۔ ایسا کرتے ہیں فون کر کے گاڑی منگوا لیتے ہیں''۔ مومو نے بارش کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم تو رہنا ہمیشہ ڈل اور بور..... بے وقوف یہی تو موسم ہے انجوائے کرنے کا۔ اتنی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ مزہ آئے گا ایسے موسم میں بھیگتے ہوئے اسٹاپ تک جائیں گے''۔ فارینہ نے اسے گھرکا۔ وہ مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے ہی والی تھی کہ میں نے فارینہ کی حمایت میں ایک عدد بیان جاری کر دیا۔

''صحیح تو کہہ رہی ہے فارینہ۔ ویسے بھی میرے گھر میں تو اس وقت ممی کے علاوہ کوئی ہوگا نہیں۔ نگار کے ہاں بھی کوئی نہیں ہوگا۔ رہ گئیں تمہاری ممی تو انہیں تکلیف دینے سے بہتر ہے کہ ہم لوگ خود ہی چلیں''۔ آخر کار مومو کو ہماری بات ماننے ہی بنی۔ نگار کو بھی یہ پروگرام پسند آیا تھا۔ باتیں کرتے ہم لوگ اسٹاپ تک پہنچ گئے اور کھڑے ہو کر اپنی مطلوبہ بس کا انتظار کرنے لگے۔ نگار اور فارینہ کو الگ بس میں جانا تھا اور مجھے اور مومو کو الگ میں، مگر بس تھی کہ آ کر نہیں دے رہی تھی۔

''ابھی اگر یہ کوئی فلمی سین ہوتا، یا پھر کوئی ناول اور اس میں ہیروئن یوں درخت کے نیچے کھڑی اپنی بس کا انتظار کر رہی ہوتی تو فوراً ہی ایک

عدد ہیرو کی انٹری ہو چکی ہوتی۔ ایک نہایت ہی قیمتی گاڑی آ کر ہیروئن کے پاس رُکتی وہ ایک لمحے کے لیے ڈر جاتی۔ غور سے دیکھتی تو گاڑی میں ایک نہایت ہی خوبرو بندہ بیٹھا نظر آتا۔ وہ اسے لفٹ کی پیش کش کرتا، پہلے وہ انکار کرتی، مگر پھر آخر کار اس کے اصرار کے آگے ہار مان کر گاڑی میں بیٹھ جاتی۔ بس پھر وہیں سے ہیروئن کی زندگی میں ٹرننگ پوائنٹ آتا۔ یار یہ ہم لوگوں کی زندگی میں اس طرح کا کوئی واقعہ کیوں پیش نہیں آتا''۔

اس قسم کی باتیں ظاہر ہے فارینہ ہی کر سکتی تھی۔ اس کے حسرت بھرے انداز پر ہم سب ہی ہنس پڑے تھے۔

''آپ کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تو افسوس نہیں آیا۔ البتہ بس آتی مجھے دور سے نظر آ رہی ہے۔ ویسے عینا اب میری سمجھ میں آیا یہ ہماری فارینہ کو آج اچانک ہی موسم انجوائے کرنے کا خیال کیوں آیا۔ چہ چہ۔ بیچاری، میری جان وہ فلمیں اور ناول ہوتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ چلو''۔ نگار نے فارینہ کا مذاق اُڑایا تو وہ منہ بنا کر رہ گئی۔ ہم دونوں انہیں خدا حافظ کر کے اب اپنی بس کا انتظار کر رہے تھے۔

''اچھا خاصا میں فون کر رہی تھی۔ فارینہ صاحبہ کی بے وقوفانہ تھرل نے لے کر ہم سب کو مروا دیا۔ بھوک الگ اتنی شدید لگ رہی ہے''۔ مومو خاصا چڑ کر بولی۔ وہ تو یوں بھی بھوک کی بہت کچی تھی۔ میں ابھی اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک ایک گاڑی ہمارے بالکل قریب آ کر رُکی۔ کالج کی چھٹی ہوئے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ اب اِردگرد بالکل سناٹا تھا۔ بارش بھی اب ہلکی ہلکی بوندا باندی سے بدل کر موسلا دھار برسات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو باتیں ہم آپس میں تھرل کے طور پر کر رہے تھے، وہ جب اصل میں وقوع پذیر ہوئی تو ہم دونوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ مومو تو تھی ہی سدا کی ڈرپوک اور بزدل، فوراً ہی میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر ڈر کے مارے دو چار قدم پیچھے ہٹ گئی۔

گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے وہ بے حد ہینڈسم بندہ بڑے ہی شائستہ اور مہذب لہجے میں بولا تھا۔

''کہاں جانا ہے آپ لوگوں کو۔ آیئے میں ڈراپ کر دوں''۔ ڈر تو میں بھی گئی تھی مگر اپنا ڈرنا اس کے سامنے ظاہر کیے بغیر مضبوط لہجے میں بولی۔

''شکریہ ہم لوگ چلے جائیں گے''۔

''آپ عباد کی بہن ہیں نا'' اس نے بھیا کا نام لیا تو میں ایک دم چونک گئی۔ مومو تو باقاعدہ کانپنا شروع ہو چکی تھی۔ اسے تو ویسے بھی روڈ پر چلتا ہر دوسرا بندہ چور اچکا اور بدمعاش نظر آتا تھا۔

''میں عباد کا دوست ہوں کامران۔ آپ کو پہچان کر ہی میں نے گاڑی روکی تھی''۔ اب کے اس نے تفصیلی تعارف کروایا تو مجھے بھی ایک دم اس کی شکل جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ دو چار مرتبہ اسے بھیا کے ساتھ آتے جاتے میں دیکھ چکی تھی۔ اب جبکہ وہ بھیا کا دوست نکل آیا تھا اور ہم لوگوں کو بیٹھنے کی آفر کر رہا تھا تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا تو مومو کی منمناتی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''پاگل ہو گئی ہو۔ ایسے ہی کوئی بھی بھیا کا دوست بن کر آ جائے گا اور تم ساتھ چل دو گی۔ مجھے تو شکل ہی سے بدمعاش لگ رہا ہے''۔ اچھا خاصا ہینڈسم بندہ اس سے ہماری مومو کو بدمعاش نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ جو مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا بولا۔

''[illegible] آپ رک کیوں گئیں۔ دیکھیں یہ [illegible] مجھ یک بدہ گرینجنی کی بہت ضرورت ہے۔ وہ تو میں آپ کو دیکھ کر رُک گیا، ورنہ میں لیٹ ہو رہا

ہوں''۔اس نے شائستہ انداز برقرار رکھتے ہوئے ہمیں ٹوکا تو مجھ سے پہلے ہی مومو بولی۔

''اتنی جلدی میں ہیں تو جایئے۔ہم نے آپ کو روکا تو نہیں''۔وہ پوری کی پوری میرے پیچھے یوں چھپی ہوئی تھی، جیسے مرغی کے بچے اپنی اماں کے پروں میں چھپتے ہیں۔ مجھے مومو کی بدتمیزی پر شدید غصہ آیا۔کیا سوچے گا وہ کہ عباد کی بہن اور اس کی فرینڈ اتنی ال میز ڈ ہیں۔

''مومو کیا بدتمیزی ہے''۔میں نے اپنی خفت چھپاتے ہوئے اسے ٹوکا تو وہ بدستور میرے پیچھے چھپی زور سے بولی۔

''ایسے کوئی بھی بھیا کا دوست بن کر آجائے گا اور تم یقین کرلوگی۔پتا نہیں تمہیں کب عقل آئے گی۔جایئے مسٹر اپنا راستہ ناپیے اور یہ مت سمجھیے گا کہ ہم آپ سے ڈر گئی ہیں۔یہ عینا بلیک بیلٹ ہے اور میں بھی کوئی گئی گزری نہیں۔خوامخواہ اکیلی لڑکیوں کو دیکھ کر ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں''۔

اس کی آواز کی کپکپاہٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔میں نے مومو کی بے وقوفی پر سر پیٹتے ہوئے سامنے دیکھا تو اتنی دیر سے سنجیدہ شکل بنائے بیٹھا بندہ اب بے ساختہ مُسکراتا نظر آیا۔اس کے چہرے کی شرارتی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ کسی بات کو بہت انجوائے کیا جا رہا ہے۔میری ہائٹ کیونکہ اپنی تمام فرینڈز میں سب سے زیادہ ہے، اسی لیے مومو صرف میرے کندھے تک آتی تھی اور اس وقت بھی میرے پیچھے چھپی کندھے پکڑ کر اچک کر سامنے دیکھ رہی تھی۔میں مومو کی بدتمیزی پر شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

''اچھا جی، آپ لوگ نہیں جانا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔میں چلتا ہوں، بائے''۔وہ ہم لوگوں کو ہاتھ ہلاتا چلا گیا تھا۔دو چار منٹ بعد ہی ہماری مطلوبہ بس آگئی تھی۔میں مومو سے شدید ناراض ہوگئی تھی۔مجھے پتا تھا کہ اب اس بات پر مجھے بھیا سے سخت سست سننا پڑیں گی، لاکھ وہ اس وقت بُرا مانے بغیر مُسکرا رہا تھا، مگر اسے مومو کی بات بری تو ضرور لگی ہوگی۔وہ تو اخلاقاً بھیا کی وجہ سے رُک گیا تھا اور مومو پاگل کہیں کی۔اب بھیا سے ڈانٹ کھانی پڑے گی۔

گھر آکر کھانا کھانے کے بعد سونے کے لیے لیٹنے تک میں یہی سب سوچتی رہی تھی، مگر جب وہ دن اور پھر اگلے دو چار دن بھی خیریت سے گزر گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔بھیا ویسے تو مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، مگر ان کا غصہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔مومو کی بعد میں، میں نے خوب کھنچائی کی تھی۔نگار اور فارینہ نے اس قصے کو بڑے مزے لے لے کر سنا تھا۔اس واقعے کو ہفتہ دس دن گزرے ہوں گے کہ اس رات بھیا میرے کمرے میں آئے۔

''کامران تمہیں کہاں ملا تھا؟'' بھیا نے دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جب یہ بات کی تو میں چونک گئی۔ان کے چہرے پر تفصیلی نظریں دوڑائیں تو وہاں کسی ناراضی کی کوئی آثار نہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا اور انہیں اس دن کا تمام ماجرا کہہ سنایا۔ساری بات سن کر بھیا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''اچھا تو مومو تمہارے ساتھ تھی۔ویسے اس قسم کی حرکتیں کر بھی صرف مومو ہی سکتی ہے''۔

''بھیا انہوں نے کیا آپ سے کوئی شکایت کی ہے؟'' میں نے دریافت کیا تو وہ نفی میں سر ہلا کر بولے۔

''نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔وہ تو یونہی ذکر نکل آیا تھا۔'' بھیا شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں بھی دوبارہ سے

کتابوں میں گم ہوگئی۔ ہوں ناں میں بے وقوف یہ نہیں سمجھ میں آیا کہ بھیا یہ بات پوچھ کیوں رہے تھے۔ قصہ کچھ یوں ہوا تھا کہ کامران صاحب ہماری مومو پر دل و جان سے فریفتہ ہوگئے تھے۔ انہوں نے ساری بات بھیا کو بتائی، کیونکہ مومو کے گھر تک پہنچنے کے لیے انہیں بہر حال میری مدد درکار تھی۔ بھیا نے ساری بات مجھ سے اس لیے کنفرم کی کہ آیا میرے ساتھ مومو ہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس روز میرے ساتھ کوئی اور فرینڈ ہو۔ یہ ساری بات تو میری سمجھ میں اس وقت آئی جب کامران آفاق کی والدہ اور بہنیں مومو کے لیے باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں۔ جیسے ہی یہ بات پتا چلی تو میں اُچھل پڑی۔ فوراً فون کھڑکا کر یہ قصہ فارینہ اور نگار کے گوش گزار کیا گیا۔ ہم فرینڈز میں سے کسی کی زندگی میں کچھ ڈفرنٹ ہو ہی گیا تھا۔ پروپوزل کا کیا جواب دیا جاتا ہے، یہ بعد کی بات تھی اور اس کا فیصلہ بڑوں کو کرنا تھا، مگر مومو کو چھیڑنا تو ہم لوگوں کا فرض تھا، سو وہ ہم پورا کر رہے تھے۔

مومو ٹپیکل افسانوی ہیروئنز کی طرح لال گلابی اور نیلی پیلی ہو رہی تھی۔ بھیا نے اپنے دوست کا مقدمہ بڑی کامیابی کے ساتھ لڑا تھا اور آخر کار آنٹی انکل نے کامران آفاق کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ کالج میں مٹھائی لے کر پہنچنے والا مومو کا سپنا سچ ہوگیا تھا۔ رسمی طور پر بات چیت طے ہوئی تھی۔ امتحانوں کے فوراً بعد مومو کی شادی کی تاریخ رکھی گئی تھی اس لیے انگیجمنٹ وغیرہ کا کوئی سلسلہ نہیں ہوا تھا۔

جس روز بات پکی ہوئی اور اگلے روز مومو مٹھائی لے کر کالج پہنچی تو مزہ ہی آ گیا۔ بھیا سارے راستے مومو کو چھیڑتے رہے تھے کہ اتنا خوش تو کامران بھی نہیں ہے۔ اس نے تو اپنے دوستوں کو ایک کینڈی تک نہیں کھلائی اور یہاں چار پانچ کلو مٹھائی جا رہی ہے۔ بات پکی تو مومو کی ہوئی تھی مگر ہم تینوں یوں خوش تھے جیسے ہماری شادی طے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری گردنیں نیچی ہونے سے بچالی تھیں۔ نمرہ کے کارٹون سے لاکھ گنا بہتر تھا کامران۔ بھیا کے ساتھ وہ ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھا اور آگے ترقی کے روشن امکانات تھے۔ نمرہ لوگوں کی جلن و حسد سے بھرپور شکلیں دیکھ کر ہم لوگوں کے کلیجوں میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔

آنٹی کیونکہ پرانے خیالات کی مالک تھیں، اسی لیے مومو نہ تو کہیں باہر کامران سے مل سکتی تھی اور نہ ہی فون پر بات کر سکتی تھی۔ اس بے وقوف کو ایسا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ اس کا شوق تو کالج میں مٹھائی کھلانا تھا، سو وہ پورا ہوگیا تھا۔ امتحان شروع ہوئے تو ہم سب تو بری طرح پڑھائی میں مصروف ہوگئے۔ مومو بے حد پریشان تھی کہ اپنی شادی کی تیاری کرے یا امتحانوں کی۔ Theroy کے پیپرز سے فارغ ہوئے تو بڑی حد تک ٹینشن ختم ہوگئی۔ پھر ہم سب ہی نے مل کر مومو کی تیاری میں بھرپور مدد کروائی۔

مومو کی شادی ہم لوگوں کی زندگی کا یادگار واقعہ رہے گی۔ مایوں، مہندی، شادی، ولیمہ ہم لوگوں نے ہر فنکشن بھرپور انجوائے کیا۔ ہم لوگوں نے ہر دن کے لیے نئے کپڑے بنوائے تھے۔ آخر یہ ہماری لاڈلی سہیلی کی شادی تھی۔ مومو کی رخصتی پر سب سے زیادہ زور و شور سے میں روئی تھی۔ شاید اس لیے کہ بچپن ہی سے ہم دونوں اتنے قریب رہے تھے کہ ہر جگہ ساتھ جانا، ہر کام ساتھ کرنا۔ اس کی کمی سب سے زیادہ مجھے ہی محسوس ہو رہی تھی، مگر یہ اداسی زیادہ دن برقرار نہ رہ سکی اور ہم لوگوں کو انجوائے منٹ کے لیے ایک اور واقعہ ہاتھ لگ گیا۔

فارینہ جسے ہم سب میں سے انگیجمنٹ کروانے کا سب سے زیادہ شوق تھا، اس کا شوق آخر کار پورا ہو ہی گیا تھا۔ مومو ہی کی شادی کے فنکشن میں کامران بھائی کی خالہ کو فارینہ اتنی بھائی کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے فارینہ کا رشتہ لے آئیں اور یوں فارینہ کی نیا پار لگی۔ شادی

اس کی چھ سات مہینے بعد ہوئی تھی۔

B.S.C. کا رزلٹ ڈکلیئر ہوا اور ہم سب ہی اچھے مارکس کے ساتھ پاس ہو گئے تو صرف میں نے اور نگار نے آگے پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ مومو تو ظاہر ہے اب پتی جی کی سیوا میں لگی تھیں اور فارینہ بھی اپنی عنقریب ہو جانے والی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ نگار نے اپنی دلچسپی کے پیش نظر کیمسٹری ہی میں ماسٹرز کرنے کی ٹھانی تھی۔ جبکہ میں بھیا کے مشورے پر MBA کے Aptitude ٹیسٹ میں شریک ہوئی۔ ٹیسٹ کی تیاری بھی مجھے بھیا ہی نے کروائی تھی۔ IBA کے Aptitude ٹیسٹ میں کامیاب ہو جانے کا مجھے ایک فی صد بھی یقین نہیں تھا، مگر یہ ناممکن کام میں نے سرانجام دے ہی لیا۔ مجھ سے زیادہ بھیا اور پاپا خوش تھے۔ انٹر میں کم پرسنٹیج آنے پر جب میرا میڈیکل میں ایڈمیشن نہیں ہوا تھا تو میں بہت ہی نا اُمید ہو گئی تھی۔ اس وقت پاپا نے مجھے بہت سمجھایا تھا۔

''چھوٹی موٹی ناکامیوں سے بددل نہیں ہونا چاہیے، جو چیز ہمیں نہیں ملتی تو یہ سوچ کر صبر کر لینا چاہیے کہ یہ ہمارے لیے تھی ہی نہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ یقیناً کہیں اور اس سے بھی زیادہ نوازیں گے''۔ اس وقت میں نے پاپا کی باتوں کو اتنا سیریسلی نہیں لیا تھا مگر آج جب ٹیسٹ کا رزلٹ دیکھا اور وہاں اپنا نام بھی نظر آیا تو مجھے پاپا کی بات پر یقین آ گیا۔ پتا نہیں ہم انسان اتنی جلدی مایوس کیوں ہو جاتے ہیں۔ بھیا کے منہ سے IBA کے قصے سن سن کر مجھے وہ کوئی خوابوں کی نگری لگنے لگی تھی۔ بھیا نے BBA اور پھر MBA وہیں سے کیا تھا۔

پہلے روز یونیورسٹی گئی اور اپنے انسٹی ٹیوٹ پہنچی تو بڑا عجیب سا لگا۔ وہ جوان تینوں کی عادت تھی، اب ان کے بغیر بالکل مزہ نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں ان لوگوں کو شادی کی اتنی جلدی کیا تھی۔ میں نے انتہائی بوریت سے سوچا تھا۔ میرے لیے نئے سرے سے کسی سے دوستی کرنا کارِ دشوار تھا۔ ہمیشہ ہی سے ہم چاروں ساتھ رہے تھے، ہم نے کبھی نئے دوست بنائے ہی نہیں تھے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ نئی دوستیاں کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پہلا دن تو بس انٹروڈکشن ہی میں گزر گیا۔ گھر آ کر اپنی پرابلم ممی سے ڈسکس کی تو وہ مجھے اطمینان دلانے لگیں کہ میں آہستہ آہستہ سیٹ ہو جاؤں گی اور نئی فرینڈز بھی بن جائیں گی۔ مجھے انسٹی ٹیوٹ جاتے ایک ماہ ہو چلا تھا، مگر ابھی تک بھی میری کسی سے سلام دُعا سے زیادہ دوستی نہیں ہو سکی تھی۔ ممی کہتی تھیں کہ ایسا نہیں کہ وہاں اچھے لوگ نہیں ہیں، بلکہ میں ہی کسی اور کو ایکسیپٹ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں نئے دوست بنانا ہی نہیں چاہتی۔ شاید ممی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ نگار کا کوئی پیریڈ فری ہوتا تو وہ مجھ سے ملنے آ جاتی۔ اسے دیکھ کر میں خوش ہوتی تھی، جیسے برسوں بعد ملے ہوں۔ کبھی اگر مجھے فارغ ٹائم ملتا تو میں اس کے پاس چلی جاتی تھی۔ اسے بھی میری طرح ایڈجسٹ کرنے میں مشکل ہو رہی تھی، مگر بہرحال وقت گزاری کے لیے اس نے دو تین لڑکیوں سے دوستی کر ہی لی تھی۔ اس روز Financial Accounting کی کلاس لے کر نکلی تو سامنے سے آتی نگار کو دیکھ کر میں بے اختیار پُرمسرت انداز میں چلائی تھی۔

''اوہ نگار شکر ہے، اس سڑے ہوئے ماحول میں کوئی تو اپنا نظر آیا۔ میں سخت بور ہو رہی تھی''۔

میری آواز شاید کچھ زیادہ ہی بلند تھی، تب ہی ہمارے پیچھے کھڑے لڑکوں کے گروپ نے بے ساختہ گردنیں گھما کر میری طرف دیکھا تھا۔ میں کیونکہ اس وقت نگار کے آنے کی خوشی میں مگن تھی، اس لیے ان کے دیکھنے کا نوٹس لیے بغیر اس سے بولی۔

باتیں جانتی تھی۔

''تینوں کے تینوں بڑے پراؤڈ قسم کے ہیں۔اپنے گروپ میں کبھی کسی چوتھے فرد کو شامل نہیں ہونے دیتے۔اپنے اسائنمنٹ اور نوٹس کسی کو بھی نہیں دیتے۔لڑکیوں سے دوستی کے معاملے میں تو انہیں بدتمیزی کی حد تک روڈ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ تینوں ویل آف فیملیز سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے بھی لڑکیاں ان کے زیادہ ہی آگے پیچھے پھرتی ہیں، مگر مجال ہے جو یہ کسی کو گھاس ڈالیں۔خصوصاً یہ ذیشان تو بڑا ہی نک چڑھا ہے۔ہر سمسٹر میں ٹاپ کرتا ہے، اس کے ڈیڈی کا اپنا بزنس ہے۔سارے ٹیچرز تک ان لوگوں کے گروپ سے خائف رہتے ہیں۔سنا ہے کلاس میں یہ ٹیچرز سے مشکل سوالات کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے''۔مریم نے میری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بندہ واقعی ہینڈسم تھا، بلکہ بندہ کیا وہ تینوں ہی اچھی پرسنیلیٹیز کے مالک تھے۔اس سے زیادہ مجھے ان لوگوں میں دلچسپی لینے کی کیا ضرورت تھی۔اس روز ریڈنگ روم میں جب مریم مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتا رہی تھی، ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے اس بندے نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا ہو، مگر اگلے پل جب وہ دوبارہ کتاب میں غرق ہو گیا تو مجھے اپنا وہم نظر انداز کرنا پڑا۔

''میں لان میں اکیلی بیٹھی سر غوری کے اسائنمنٹ کو مکمل کرنے کی کوششیں کر رہی تھی۔مریم طبیعت کی خرابی کی وجہ سے آئی نہیں تھی اور کل اسائنمنٹ جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی۔ Management of Principles کا یہ اسائنمنٹ مجھے حقیقی معنوں میں رلوا رہا تھا۔اتنے مشکل اور پیچیدہ سوالات تھے کہ میں انہیں حل کرنے میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ایک تو بھیا بھی آج کل کراچی میں نہیں تھے، ورنہ انہیں سے مدد لے لیتی۔ آفس کے کام سے وہ سنگاپور گئے ہوئے تھے۔مریم خود مجھ پر تکیہ کیے گھر میں بیمار پڑی تھی۔

''کیا ہوا تمہارا اسائنمنٹ ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ہم لوگ تو ابھی ابھی اپنا اسائنمنٹ سب مِٹ کروا کر آ رہے ہیں۔'' اسما کی آواز پر میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو وہ ترس کھاتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''اگر میرا فیانسی بھی یہاں تھرڈ یا فورتھ سمسٹر میں ہوتا تو میں بھی اپنا اسائنمنٹ آج کیا بلکہ کل یا پرسوں ہی سب مِٹ کروا چکی ہوتی۔'' ادھا رکھنا تو میں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔کوئی مجھ پر طنز کرے یہ تو مجھے برداشت ہی نہیں تھا۔پتا نہیں یہ نمرہ ٹائپ کی لڑکیاں مجھے ہر جگہ ہی مل کیوں جاتی ہیں۔ یہاں نمرہ لوگوں کی کمی پوری کرنے کے لیے اسما لوگوں کا گروپ موجود تھا۔اپنے منگیتر کے اسائمنٹس چھاپ چھاپ کر ٹیچرز کے سامنے واہ واہ کرواتی وہ، اور اس کا گروپ مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔میری بات ظاہر ہے اسے تیر کی طرح جا کر لگی تھی۔

''مطلب کیا ہے تمہارا، میں کیا فواد سے لے کر اسائمنٹس اُتارتی ہوں''۔وہ باقاعدہ مجھے گھورتی بڑے غصے سے بولی تھی۔

''تمہارا جو دِل چاہے مطلب سمجھو اور اب پلیز مجھے میرا کام کمپلیٹ کرنے دو''۔میں نے اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر اپنی توجہ بکس اور فائل پر مرکوز کر دی تو وہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔اس روز کلاسز آف ہونے کے بعد بھی میں یونیورسٹی میں رُکی رہی۔آج میں ہر قیمت پر اسائنمنٹ مکمل کرنا چاہتی تھی۔لائبریری میں بیٹھ کر مختلف ریفرنس بک کھنگالتی میں تقریباً روہانسی ہو گئی تھی۔مجھے مومو، فارینہ اور نگار کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ان کے ہوتے ہوئے میں نے کب اکیلے ایسی فکریں پالی تھیں۔ہم لوگ ہر کام مل جل کر کیا کرتے تھے۔یہاں تک کہ نوٹس

''یہاں ایسی ایسی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ بتا نہیں سکتی۔ IBA میں کیا آئے ہیں جیسے دُنیا فتح کر لی''۔ میری بات پر نگار ہنس پڑی تھی۔

''ایسے ہی تم Critisize مت کرو۔ دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں جا کر دیکھو IBA والوں کی ویلیو۔ یہاں کے لڑکوں کی مارکیٹ ویلیو کا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے''۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھے اور ان لڑکوں کے گروپ کے پاس سے گزرے تو وہ لوگ ابھی تک بڑے غور سے ہمیں ہی دیکھ رہے تھے۔

''تم بھی کہیں مجھ سے ملنے کا بہانہ کر کے اسی لیے تو نہیں آتیں''۔ میں نے نگار کی نیت پر شبہ کیا تو وہ ہنس پڑی۔

''تم سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ دوستوں کے خلوص پر شک کرو''۔

''لگتا ہے اب کی بار تمہارا نمبر ہے۔ وہ بلیک شرٹ والے موصوف تمہیں بڑے غور سے دیکھ رہے تھے''۔ ذرا آگے بڑھے تو میں نے نگار سے بولا۔

''مجھے نہیں، بلکہ وہ تمہیں دیکھ رہا تھا'' نگار نے میری غلط فہمی دور کی تو میں بڑے ہی غم زدہ انداز میں بولی۔

''آپ جیسی حسینہ عالم کے سامنے مشکل ہی ہے کہ کوئی مجھے گھاس ڈالے''۔ ویسے اس بات میں مبالغہ آرائی تھی بھی نہیں۔ ہم لوگوں کے گروپ میں نگار سب سے زیادہ خوب صورت تھی اور جو چیز اس کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث بنتی تھی، وہ یہ تھی کہ اسے اپنی اس خوب صورتی کا بالکل بھی احساس نہیں تھا۔ دوسرے لوگ اس کی تعریفیں کرتے اسے سراہتے تھے، مگر وہ خود مست ملنگ تھی جو مل گیا پہن لیا۔ یہ اور بات کہ عام سے کپڑے بھی اس کے تن پر آ کر سج جاتے تھے۔

☆

میں تنہا کب تک رہتی، آخر کار مجھے بھی نئے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنا ہی پڑ گیا تھا۔ مریم نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اکیلے رہنے سے بہتر یہی سمجھا کہ اس سے دوستی کر لی جائے۔ اس کے ساتھ دوستی میں ظاہر ہے وہ بات تو کبھی پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی، جو فارینہ، مومو اور نگار کے ساتھ تھی، مگر بہر حال وقت گزاری کے لیے یہ ساتھ بھی بہت غنیمت تھا۔ فورتھ سمسٹر کے ذیشان حیدر کا گروپ پورے IBA میں بڑا ہی مشہور و معروف گروپ تھا۔ ان کے گروپ کو IBA کی کریم کہا جاتا تھا۔ اکثر پروفیسرز اور اسٹوڈنٹس کے منہ سے ان کے قصے سن سن کر مجھے انہیں دیکھنے کا شدید شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے بنائے اسائنمنٹ، ان کے نوٹس، ان کے لیکچرز، میں نے ان لوگوں کا ہر کسی سے اتنا ذکر سنا تھا کہ میرا دل چاہنے لگا تھا کہ جلد از جلد ان ذہین ترین افراد کو دیکھ سکوں۔ پھر آخر میرا یہ شوق پورا ہو ہی گیا۔ اس روز مریم کے ساتھ ریڈنگ روم میں داخل ہوئی تو اس نے مجھے اشارے سے دکھا کر سرگوشی میں بتایا۔

''وہ رہا ذیشان حیدر کا گروپ''۔ میں نے جو سامنے دیکھا تو وہ وہی بندہ تھا جس کے بارے میں، میں نے اور نگار نے آپس میں بحث کی تھی کہ وہ ہم میں سے کسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تینوں بڑی سنجیدگی سے کتابوں میں منہ دیئے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کی شان دار پرسنالٹی دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ لڑکیوں میں صحیح مقبول ہیں۔ مریم کی کزن بھی فائنل سمسٹر میں تھی۔ اسی کے توسط سے مریم ان لوگوں کے بارے میں بہت سی

وغیرہ بھی مل کر بناتے تھے۔ بڑے انصاف کے ساتھ کام آپس میں بانٹ لیا جاتا اور ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داری پوری دیانت داری سے نبھاتا اور یہاں اتنے مشکل مضامین اور پڑھائی کے ساتھ میں تنہا تھی۔

دو تین گھنٹے لائبریری میں گزار کر بھی میرا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ کبھی میں ایک شیلف سے جا کر ایک بک نکالتی، کبھی دوسری زیادہ وقت گھن چکر بنی کتابیں نکالتی اور رکھتی ہی رہی تھی، مگر افسوس میری یہ خواری بھی میرے کام نہ آئی اور میں مایوس اور دل گرفتہ گھر لوٹ آئی۔

اپنے کمرے میں بیٹھی میں اپنی فائل کے صفحات پلٹتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ مجھے اتنی مشکل پڑھائی میں گھسنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا میں کسی آسان سے مضمون میں ماسٹرز نہیں کر سکتی تھی۔ خود کو کوستے کوستے جو اچانک میری نظر اپنے سامنے رکھے صفحے پر پڑی تو وہ ہرگز بھی میری رائٹنگ نہیں تھی۔ میری فائل میں کسی اور کے پیپرز کا کیا کام تھا۔ میں بے اختیار چونک گئی تھی۔ وہ تو سرغوری کے اسائنمنٹ سے ملتی جلتی ہی کوئی چیز تھی۔ میں نے وہ صفحات فائل میں سے نکالے اور اچھی طرح اُلٹ پلٹ کر ہر طرف سے دیکھا مگر ان پر کہیں بھی کسی کا نام نہیں لکھا تھا۔ باقاعدہ میری فائل میں اٹیچ کیے ہوئے وہ پیپرز آخر کس نے رکھے تھے۔ کیا کسی کے پیپرز غلطی سے میری فائل میں آ گئے، میں نے خود سے پوچھا اور پھر آخر کار مجھے یہی بات ماننی پڑی کہ یہ کسی اور کے پیپرز شاید آج لائبریری میں کسی غلط فہمی کی بنا پر میری فائل میں آ گئے ہیں۔ یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد جو میں نے ذرا غور و فکر سے ان صفحات کا مطالعہ کیا تو میں مارے خوشی کے اُچھل پڑی۔

سرغوری کے اسائنمنٹ کے بارے میں بڑی مہارت کے ساتھ پوائنٹس درج تھے۔ جو جو باتیں مجھے کنفیوژ کر رہی تھی، وہ سب ایک ایک کر کے ان پوائنٹس کے ذریعے حل ہوتی چلی گئیں اور یہ اسائنمنٹ جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ میں اسے کبھی بنا ہی نہیں سکتی، محض ایک گھنٹے میں مکمل ہو گیا۔ کون ہو گا وہ جینئس جس نے اتنی عمدگی سے یہ پوائنٹس تیار کیے ہوں گے، اگر سر اتنے ڈھنگ سے یہ باتیں لیکچر میں سمجھا دیتے تو مجھے پریشانی کس بات کی تھی۔ میرا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ پیپرز درحقیقت تھے کس کے۔ جس کسی کے بھی ہوں گے وہ بے چارہ انہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہو گا۔ اگلے روز میں نے بڑی شان سے اسائنمنٹ سب مِٹ کروا دیا تھا۔ اس واقعے کا ذکر میں نے مریم سے نہیں کیا تھا۔

Executive Students Forum نے Per-budget Seminar کا انعقاد کروایا تھا۔ اپنی کلاس کے دیگر افراد کی طرح میں اور مریم بھی اس میں شرکت کے لیے آڈیٹوریم پہنچے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے اس سلسلے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ IBA کے اسٹوڈنٹس کی نمائندگی ذیشان حیدر نے کی تھی۔ اس کی اسپیچ شان دار تھی۔ میں اس بندے سے اچھی خاصی مرعوب ہو گئی تھی۔ اس بندے کے انداز میں کس قدر شان بے نیازی تھی۔ بلا کا اعتماد تھا، اس کے لہجے میں۔ سیمینار میں شرکت کے بعد جب ہم باہر نکلے تو میں اور مریم اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

''ٹھیک ہی پراؤڈ ہے یہ بندہ۔ میں بھی اگر اتنی ہی جینئس ہوتی پلس یہ کہ اتنی ہی پُراعتماد اور شان دار شخصیت کی مالک ہوتی تو Proudness میں اس سے بھی دو جوتے آگے ہی ہوتی۔ میں تو کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہ کرتی''۔ میرے جملوں پر مریم ہنس پڑی تھی۔

''یار کتنی لکی ہو گی وہ لڑکی جسے اتنا شان دار بندہ پسند کرے گا''۔ میرے لہجے میں اچھا خاصا رشک بلکہ کسی حد تک حسد شامل تھا۔ اس سے

پہلے کہ مریم میری بات کے جواب میں کچھ کہتی، ہمارے بالکل پاس سے انتہائی تیز قدموں سے ذیشان اور اس کے دونوں دوست گزرتے ہوئے آگے بڑھے تھے..... ایک لمحے کے لیے میں بُری طرح شرمندہ ہوگئی تھی۔ پتا نہیں ان لوگوں نے ہماری باتیں سنی تھیں کہ نہیں۔

انہیں دنوں فارینہ کی شادی کا ہنگامہ جاگا تو ہم چاروں دوستوں کو دوبارہ سے مل بیٹھنے کا موقع میسر آ گیا۔ اس کی شادی کے چکر میں یونیورسٹی کی بھی دو تین دن کی چھٹی ہوگئی۔ ورنہ اب تک میں بالکل ریگولر جا رہی تھی۔ تین دن کی چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی پہنچی تو پتا چلا کہ ان تین دنوں میں میرا کتنا نقصان ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر عرفان نے ایک اسائنمنٹ دیا تھا، جس کی آج آخری ڈیٹ تھی۔ مجھے مریم پر شدید غصہ آیا۔ وہ کیا مجھے فون کر کے بتا نہیں سکتی تھی کہ اسائنمنٹ ملا ہے۔ میں نے اس سے شکوہ کیا تو وہ بڑے آرام سے بولی۔

''سوری یار بس وہ میرے ذہن سے نکل گیا۔ تم ایسا کرو میرا اسائنمنٹ کاپی کر لو''۔ مریم کی اس خودغرضی پر مجھے بے اختیار فارینہ وغیرہ یاد آئی تھیں۔ اس کی خودغرضی اس سے پہلے بھی دو چار بار مجھے فیل ہوئی تھی، مگر میں نظر انداز کر گئی تھی، لیکن آج مجھے انتہائی غصہ آیا تھا۔ پتا نہیں یہ لڑکیاں ایک دوسرے سے باتیں چھپا کر کس قسم کا اطمینان حاصل کرتی ہیں۔ میں اس کی آفر نظر انداز کر کے کلاس سے نکل آئی۔ ڈاکٹر عرفان جیسے سخت گیر استاد سے کسی رحم کی اُمید کی ہی نہیں جا سکتی تھی، پھر بھی ایک کوشش کرنے میں کیا حرج ہے، یہ سوچتی میں ان کے آفس میں داخل ہوئی۔ وہ اپنی رعب دار شخصیت سمیت چہرے پر خشونت بھرے تاثرات لیے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ذیشان حیدر بیٹھا تھا۔ کسی اور کے سامنے ڈانٹ کھانے سے ڈر لگ رہا تھا، مگر اب اندر آ چکی تھی اور وہ مجھے گھور گھور کر دیکھ بھی رہے تھے تو میں چپ چاپ تو نہیں کھڑی رہ سکتی تھی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے جھجکتے اٹکتے اپنا مدعا بیان کیا، ظاہر ہے یہ تو کہہ نہیں سکتی تھی کہ میری سہیلی کی شادی تھی، عافیت اسی میں تھی کہ بیماری کا بہانہ کر دیا جائے، مگر وہ بھی ایک جلاد، بڑی بے رحمی سے گویا ہوئے۔

''دیکھیں بی بی اُصول، اصول ہوتا ہے۔ جب میں نے کہہ دیا کہ آج لاسٹ ڈیٹ ہے تو ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی''۔ میں ان کا ٹکا سا جواب سن کر منہ لٹکائے باہر نکلی۔ اب بیٹھ کر غم منانے کا تو ٹائم ہی نہیں تھا، اس لیے لائبریری چلی آئی۔ یہی سوچا کہ جیسا بھی بنے گا، جمع کروا دوں گی۔ کم سے کم نہ سے ہاں تو ہو جائے گی۔ مجھے لائبریری میں بیٹھے آدھا گھنٹہ ہوگیا تھا اور میں سر جھکائے کام میں مگن بیٹھی تھی۔ ایک ریفرنس بک کی ضرورت پڑی اور میں وہ لانے کے لیے اُٹھ گئی۔ کتاب نکال کر واپس اپنی ٹیبل کی طرف آئی تو کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ خود کو سنبھالتے ہوئے سامنے دیکھا تو ذیشان نظر آیا۔ غلطی دونوں میں سے کسی کی بھی نہیں تھی، پھر بھی میں نے اخلاقاً سوری کہہ دیا، وہ بغیر میری سوری کا جواب دیئے آگے بڑھ گیا تھا۔ غصہ تو مجھے ویسے بھی آ ہی رہا تھا، مزید کسر اس بدتمیز نے پوری کر دی تھی۔ پتا نہیں نواب کا بچہ خود کو سمجھتا کیا ہے۔ اپنی کرسی سنبھالتے میں اسے دِل ہی دِل میں گالیاں دے رہی تھی۔ گالیاں دے کر فارغ ہوئی اور اپنی بکس اور فائل کی طرف نظر کرم کی تو میں بے اختیار اُچھل کر رہ گئی۔ میری بند فائل کے اوپر تین چار فل اسکیپ اسٹیپل ہوئے پیپرز رکھے ہوئے تھے۔ حسب سابق ان پیپرز میں میری ساری پریشانیوں کا علاج موجود تھا۔ میں بجائے خوش ہونے کے ڈر گئی۔ کیا کوئی جن بھوت میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ کون تھا جو اس طرح میری مدد کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اس روز بھی وہ پیپر زاتفاقاً نہیں بلکہ جان بوجھ کر میری فائل میں رکھے گئے تھے۔

کافی دیر تک میں اپنے آپ سے بیٹھی اُلجھتی رہی، مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں لگا۔ اپنی کلاس کے ہر بندے اور بندی کے بارے میں سوچا مگر مجھے یہ اپنے کسی کلاس فیلو کی حرکت لگ نہیں رہی تھی۔ وہی اس دن کا انداز تھا۔ پورا اسائنمنٹ مختلف مثالوں اور خاص خاص پوائنٹس کے ذریعے واضح کیا گیا تھا۔ جو بھی تھا، یہ بات تو طے شدہ تھی کہ جو کوئی بھی تھا یا تھی آخر ہے تو میرا ہمدرد ہی۔ میں نے ان پیپرز کی مدد سے اسائنمنٹ مکمل کیا اور جمع بھی کروا دیا۔ مریم نے مجھ سے سوری کرنے اور مختلف بہانے بازیاں کرنے کی بہت کوشش کی مگر میرا دِل اس کی طرف سے کھٹا ہو چکا تھا۔ اس لیے اس کی معذرتوں کا کوئی بھی جواب دیئے بغیر میں گھر چلی آئی۔ پتا نہیں مجھے لوگوں کو سمجھنا اور..... کرنا کب آئے گا۔ کیا ہو جاتا جو میں بھی مریم کی طرح منافقت کا ثبوت دیتی اور دل میں اس کے لیے کینہ رکھنے کے باوجود بظاہر اس کی معذرت قبول کر لیتی۔ گھر میں تو کوئی ایسا تھا نہیں جس سے میں اپنی یہ پرابلم شیئر کر سکتی۔

آخر کار میں نے نگار کو فون کھڑکایا اور اسے اپنے گمنام ہمدرد کے بارے میں بتایا تو وہ میری پریشانیوں کے جواب میں بجائے پریشان ہونے کے قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''لگتا ہے، تجھ پر کوئی جن عاشق ہو گیا ہے۔'' میں جتنا پریشان تھی، وہ اتنا ہی اس بات کو انجوائے کر رہی تھی۔ آخر جب میں ناراض ہو کر فون بند کرنے لگی تو وہ سیریس ہوئی۔

''بھئی اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے، جو بھی کوئی ہے، ہے تو تمہارا ویل وشر۔ چلو ایسا کرتے ہیں کل میں تمہارے ڈیپارٹمنٹ آؤں گی اور ہم دونوں مل کر غور کریں گے کہ وہ ہمدرد بندہ ہے کون'' اگلے روز نگار صبح صبح ہی ہمارے ڈیپارٹمنٹ آ گئی۔ پہلے تو اس نے کسی ماہر سراغ رساں کی طرح پہلے والے پیپرز اور بعد والے پیپرز میں موجود لکھائی کا تجزیہ کیا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں رائٹنگ ایک ہی بندے کی ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہ یقیناً کسی لڑکے کی رائٹنگ ہے''۔

''بڑا کمال کیا۔ اتنی بات تو میں بھی سمجھ چکی ہوں''۔ میں نے جل کر کہا تو وہ بُرا مانے بغیر ہنس پڑی۔ پھر اس روز نگار نے سارا دن میرے ساتھ گزارا۔ میری کلاس کے ہر ہر بندے کو بڑے غور و فکر سے جانچا۔ کوریڈور سے گزرتے، لان میں بیٹھے، کیفے ٹیریا میں کولڈ ڈرنک پیتے، وہ ہر بندے کو مشکوک نگاہوں سے گھورتی رہی۔ میں خاموشی سے اس کی جاسوسی ملاحظہ کر رہی تھی۔ سارا دِن ساتھ گزار کر جب نگار نے کندھے اچکا کر یہ جملے کہے۔

''سوری یار! میں ناکام ہو گئی۔ مجھے تو کوئی ایک بندہ بھی ایسا نظر نہیں آیا جو تم میں انٹرسٹڈ محسوس ہوا ہو، بلکہ آئی ایم سوری ٹو سے کہ تمہیں لڑکوں کے حلقے میں کوئی اتنا خاص جانتا ہوا مجھے محسوس بھی نہیں ہوا''۔ تو میرا دِل چاہا کہ اس کا سر پھاڑ دوں۔ سارا دن ریسرچ تو یوں کر رہی تھی جیسے کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ کر ہی دم لے گی۔

نگار نے مدد تو کیا کرنی تھی بس یہ ہوا کہ ان محترمہ کے ہاتھ ایک ٹاپک لگ گیا تھا۔ فوراً ہی فارینہ اور مومو کے بھی گوش گزار کیا گیا۔

''عینا پر کوئی جن عاشق ہو گیا ہے۔ جو ہے بھی بڑا نیک دل اور پڑھاکو''۔ سب نے مل کر میرا اچھا خاصا ریکارڈ لگایا تھا۔ پھر ان دو واقعات

پر ہی بس نہیں ہوا اس کے بعد بھی دو چار مرتبہ اسی قسم کے واقعات پیش آئے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں لائبریری کوئی بک ایشو کرانے جاتی اور وہ مجھے وہاں نہیں ملتی۔ واپس کلاس میں پہنچتی تو وہ کتاب میری چیئر پر رکھی ہوتی۔ ڈرنا تو خیر میں نے اب چھوڑ دیا تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، مجھے نقصان تو ہرگز نہیں پہنچا رہا تھا۔ مگر وہ تھا کون اور آخر سامنے کیوں نہیں آ رہا تھا۔ میں ان دنوں سخت اُلجھن کا شکار رہنے لگی تھی۔ پہلا سمسٹر ختم ہوا اور امتحانات سے فارغ ہو کر ہم لوگ سیکنڈ سمسٹر میں آ گئے۔

ذیشان حیدر کا گروپ یونیورسٹی سے رُخصت ہو چکا تھا۔ میں نے کتنی ہی لڑکیوں کو اس کے لیے آنسو بہاتے دیکھا اور ان کی عقلوں پر ماتم بھی کیا۔ جب وہ کسی کو لفٹ نہیں دیتا تھا تو ان لڑکیوں کا یہ حال تھا اگر جو وہ ذرا کسی سے بات کر لیتا تو پتا نہیں کتنی لڑکیاں اس کی جدائی میں اس دار فانی سے کوچ کر گئی ہوتیں۔

ان گزرتے دنوں میں دو دو خوشی کی خبریں آگے پیچھے سننے کو ملی تھیں۔ پہلی خبر تو یہ تھی کہ ہماری مومو خیر سے اماں جان بن گئی تھیں۔ اس کی بیٹی اسی کی طرح کیوٹ تھی اور دوسری خوش خبری یہ تھی کہ نگار کی اپنے تایا زاد کے ساتھ بات طے ہو گئی تھی۔ شادی اس کے ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد ہونا قرار پائی تھی۔ ہم سب دوستیں بہت دنوں بعد مومو کی بیٹی کو دیکھنے کے بہانے جمع ہوئے تو وہاں سب ہی کو میری فکر تھی۔ یار اب عینا کے لیے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔ مسٹر رائٹ کا تو کہیں پتا چل نہیں رہا۔ ایسا کرتے ہیں ہم ہی لوگ کوئی اچھا سا بندہ اپنی چندا کے لیے ڈھونڈتے ہیں۔'' فارینہ نے میرے لیے فکر ظاہر کی تھی۔ میں نے جواباً ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو وہ سب کی سب مجھے ڈانٹنے بیٹھ گئیں۔

''چپ بیٹھو تم تو، گلٹس خود میں کوئی ہیں نہیں اور شوق ہے پسند کی شادی کا۔ لڑکوں کو تو ایک طرف چھوڑو، اس کی تو وہاں کسی لڑکی تک سے دوستی نہیں ہے۔ ایسے کوئی نہیں تمہیں پسند کرے گا۔ بہتر ہے بڑوں کا کہنا مانو۔ اب دیکھنا میں اپنی عینا کے لیے کیسا شان دار بندہ ڈھونڈتی ہوں''۔ وہ سب کی سب اسی قسم کی باتیں کرتی رہی تھیں اور میں انہیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتی رہی تھی۔

پتا نہیں کیا بات تھی، اب مجھے میری مطلوبہ کتاب چیئر پر رکھی نہیں ملتی تھی۔ اسائمنٹس اور نوٹس میری فائلوں میں سے برآمد ہونا بند ہو گئے تھے۔ میں جو اس غیبی امداد کی بڑی حد تک عادی ہو گئی تھی، ایک دم پریشان ہو گئی۔ وہ میرا نادیدہ ہمدرد اور خیر خواہ پتا نہیں ایک دم کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ میری مدد کیوں کرتا ہے۔ مگر وہ تو ایسا غائب ہوا تھا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ میرا دل ایک دم ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا، یہاں تک کہ پڑھائی اور کتابیں بھی مجھے زہر لگنے لگی تھی۔ یہ محبت کی کون سی قسم ہے، میں نہیں جانتی، مگر مجھے اتنا ضرور پتا ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہے اور جیسا بھی ہے میرے لیے وہ دنیا کا سب سے پیارا انسان ہے، جسے میری پرواہ تھی، جو میرا خیال رکھتا تھا، مگر وہ ایک دم آخر چلا کہاں گیا۔

☆

میں ذیشان حیدر ہوں۔ اپنے والدین کا سب سے چھوٹا بیٹا۔ مجھ سے بڑے دونوں بھائیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ دونوں بھائی ڈیڈی کے ساتھ مل کر ہمارے بزنس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ میری ساری ایجوکیشن پاکستان سے باہر ہوئی ہے۔ لندن میں سنیئر کیمبرج کے بعد میں نے

وہیں BBA میں داخلہ لے لیا۔ گریجویشن کے بعد میرا وہیں سے MBA کرنے کا پروگرام تھا مگر مما کو اچانک ہی میری یاد زیادہ ہی شدتوں سے آنے لگی تو مجھے ناچار پاکستان لوٹنا پڑا۔ ڈیڈی نے بھی مجھے یہی سمجھایا تھا کہ فی الحال مما کا دل رکھنے کی خاطر مجھے واپس آجانا چاہیے۔ بعد میں سال دو سال بعد وہ مجھے دوبارہ میری پسند کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن دلوادیں گے۔

کراچی آکر میں نے IBA میں ایڈمیشن لے لیا اور ساتھ ہی ساتھ ڈیڈی کے آفس بھی جانا شروع کر دیا، تاکہ مجھے یہاں کس طرح کام کیا جاتا ہے، وہ بھی سمجھ میں آجائے۔ یہاں آنے کے بعد شروع شروع میں مجھے سخت بوریت محسوس ہوتی تھی۔ گو خاور اور اسد جو میرے فرسٹ کزنز اور بچپن کے دوست ہیں، بھرپور کمپنی دیتے تھے، مگر مجھے پھر بھی ایڈجسٹ کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ انہی بوردنوں میں اچانک مجھے وہ مل گئی۔

مجھے نہیں پتا میں اس کی کس بات سے متاثر ہو کر اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوا تھا، مگر یہ بات طے ہے کہ وہ لڑکی مجھے پہلی نظر ہی میں دل و جان سے پسند آگئی تھی۔ اس روز میں خاور کے ہاں گیا تھا۔ آنٹی سے پتا چلا کہ وہ گھر پر نہیں ہے تو میں سخت بوریت اور ڈپریشن محسوس کرتا وہیں خاور کے گھر کے قریب موجود پارک میں چلا آیا۔ یونہی بینچ پر بیٹھا میں وقت گزاری کر رہا تھا کہ کچھ ہی فاصلے پر بیٹھی بے فکری سے قہقہہ لگاتی لڑکیوں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ وہ چار لڑکیوں کا گروپ تھا۔ میں یونہی اپنی بوریت دور کرنے کے لیے ان لوگوں کی باتیں سننے لگا۔ اس کے لیے مجھے کوئی خاص کوشش بھی نہیں کرنی پڑی، وہ لوگ اتنا زور زور سے بول رہی تھیں کہ میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بھی ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔ وہ سب ہی کچھ نہ کچھ بول رہی تھیں، مگر ان کے درمیان بیٹھی وہ ہرے کپڑوں میں ملبوس لڑکی بڑی خاموش بیٹھی تھی۔ پتا نہیں اسے دیکھ کر بے اختیار میرا دل یہ کیوں چاہا کہ وہ بھی کچھ بولے۔ پھر اس کی کسی دوست نے براہِ راست اسے مخاطب کر کے کچھ پوچھا تو وہ اپنی اتنی دیر کی خاموشی توڑ کر بڑی ہی مدھر آواز میں انہیں اپنی پسند ناپسند سے آگاہ کرنے لگی۔ وہ اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔ کندھوں سے نیچے آتے سلکی بال جنہیں وہ لاپرواہی سے بار بار پیچھے کر رہی تھی، اس کی شخصیت میں چار چاند لگا رہے تھے۔ اس کی آواز بے حد خوب صورت تھی۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی خوب صورت لڑکی تھی۔ بے شمار لڑکیاں میرے آگے پیچھے منڈلاتی ہیں، مگر میں نے کبھی بھی تفریحاً کسی لڑکی کے ساتھ وقت نہیں گزارا۔

میں عورتوں کی عزت کرتا ہوں۔ ایسی لڑکیوں پر مجھے صرف اور صرف ترس آتا ہے جو خود کو اتنا حقیر کر دیتی ہیں اور مردوں کے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ خیر بات ہو رہی تھی اس لڑکی کی جس کا نام تھا عینا۔ اس کی دوستوں ہی کے ذریعے مجھے اس کا نام پتا چلا تھا۔

''میرا دل چاہتا ہے وہ بہت بولڈ ہو، بہت کانفیڈنٹ۔ وہ آئے اور آکر بڑے اعتماد کے ساتھ مجھے شادی کی آفر کرے۔ اس طرح جیسے انکار کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا خوب صورت سا بکے ہو۔ میں وہ بکے قبول کرلوں۔ کیا خوب ہو اگر وہ ویلنٹائن ڈے ہو''۔ وہ اتنے جذب سے اور اتنی سچائی سے بول رہی تھی کہ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل چاہا کہ ابھی اس کے سامنے جاؤں اور جا کر اسے پروپوز کر دوں، مگر پھر فوراً ہی خود کو ایسا کرنے سے روکا۔ جب تک وہ لوگ چلی نہیں گئیں میں وہیں بیٹھا رہا۔ زندگی میں پہلی بار تھا کہ مجھے کسی لڑکی نے اتنا متاثر کیا تھا۔ میں اپنی فیلنگ کو خود ہی اچھی طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس روز گھر آکر یہاں تک کہ رات میں سونے سے پہلے بھی مجھے وقفے وقفے سے اسی کا خیال آتا رہا تو میں خود کو قصداً دوسرے کاموں میں مصروف کر کے اس کی طرف سے دھیان

ہٹانے کی کوشش کرنے لگا، مگر پھر صرف اسی دن نہیں بلکہ اس کے بعد بھی جب کئی دن گزرنے پر بھی میں اس کے خیال کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پایا تو پہلے پہل تو خود پر ہی بہت جھلایا، غصہ آیا۔ آخر ایسا اس لڑکی میں غیر معمولی تھا ہی کیا کہ میں یوں اس کے بارے میں سوچنے بیٹھ جاؤں۔ اس سے کہیں حسین لڑکیاں میرے خاندان اور فیملی فرینڈز میں موجود تھیں۔ میں تو اس کے بارے میں ڈھنگ سے کچھ جانتا تک نہیں تھا۔ وہ کون تھی، کہاں رہتی تھی، کس فیملی سے تعلق رکھتی تھی، اس کے عادتیں، پسند ناپسند، مجھے کبھی بھی تو معلوم نہیں تھا۔

اپنا یہ عشق مجھے انتہائی احمقانہ محسوس ہو رہا تھا۔ خود سے لڑتے جھگڑتے آخر کار میں نے ہار مان لی تھی اور تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھی اور جیسی بھی تھی اس نے مجھے فتح کر لیا تھا۔ خود سے یہ بات تسلیم کرنے کی دیر تھی، میں فوراً ہی دوبارہ پارک پہنچ گیا۔ اس اُمید پر کہ شاید وہ اس روز کی طرح آج بھی مجھے وہیں پارک میں مل جائے گی، مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میں نے خود ہی اندازہ لگایا کہ اس کا گھر شاید پارک کے قریب ہی کہیں موجود ہوگا، یہ سوچ کر احمقوں کی طرح وہاں پارک کے پاس کی تمام گلیاں چھان ماریں، مگر اسے نہیں ملنا تھا سو نہیں ملی۔ پھر اسی ایک دن پر موقوف نہیں میں اس کے بعد بھی اکثر شام میں آفس سے واپسی میں پارک کا ایک چکر لگاتا، اس آس پر کہ آج شاید وہ نظر آ جائے۔ شکر ہے خاور نے کبھی مجھے یہ بے وقوفانہ کام کرتے رنگے ہاتھوں نہیں پکڑا، ورنہ وہ میرا خوب ہی مذاق اُڑاتا۔ میں نے یہ بات کسی سے بھی شیئر نہیں کی تھی۔ اپنا یہ قبل مسیح کے زمانے کا عشق کسی اور سے بیان کر کے مجھے اپنا مذاق اُڑوانے کا ہرگز کوئی شوق نہیں تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ کوئی اس طرح اچھا لگا تھا اور میں نے اسے کھو دیا تھا، پھر جب میں اس کی تلاش میں ناکام ہو کر مایوس ہونے ہی لگا تھا کہ وہ مجھے دوبارہ مل گئی۔ میں، خاور، اسد اور سلمان کوریڈور میں کھڑے باتیں کر رہے تھے، جب میں نے اپنی پشت پر ایک چہکتی، زندگی سے بھرپور آواز سنی۔ میں نے بے اختیار گردن گھما کر پیچھے دیکھا تھا اور میرا دل چاہا تھا کہ اُچھل اُچھل کر اپنی خوشی کا اظہار کروں۔ وہ جسے میں نے کھو دیا تھا، اچانک ہی دوبارہ مل گئی تھی۔ وہ اپنی دوست کے ساتھ مگن باتیں کرتی ہوئی ہمارے پاس سے گزر گئی تھی۔

اس روز یونیورسٹی سے لوٹتے وقت میرے پاس اس کے بارے میں تمام ضروری معلومات موجود تھیں۔ اب مجھے اس کے کھو جانے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ اس کا پورا بائیو ڈیٹا میں نے انتہائی خفیہ ذرائع سے حاصل کیا تھا اور اس بات کی بھنک اپنے جگری یاروں کو بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ مجھے یونیورسٹی کے اندر پروان چڑھنے والے عشق و عاشقی کے سلسلے کبھی بھی پسند نہیں آئے۔ اسی لیے خاموشی اختیار کیے رکھنے کو ترجیح دی۔ اس کے سامنے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے مجھے کچھ عرصہ اور صبر سے گزارنا تھا۔ میں اپنے فائنل سمسٹر کے ختم ہو جانے کا منتظر تھا۔ یوں بھی اب اس کے کھو جانے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ روزانہ صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں کسی نہ کسی بہانے اس کی کلاس کے پاس سے گزرا کرتا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں ہوگا کہ کوئی اس طرح اس کے پیچھے خوار ہوتا پھر رہا ہے۔ خود سے کیے اس عہد سے کہ جب تک میں یہاں سے MBA کر کے فارغ نہیں ہو جاتا، اس سے کسی قسم کا تعلق استوار نہیں کروں گا، مجھے خود ہی پھر جانا پڑا۔ اس روز وہ لان میں اتنی معصوم سی شکل بنائے بیٹھی تھی کہ مجھے بے اختیار اس پر ترس آ گیا۔ ہم لوگ اس سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے آج کے لیکچرز ڈسکس کر رہے تھے۔

''اگر میرا فیانسی بھی تھرڈ ایا فورتھ سمسٹر میں ہوتا تو میں بھی اپنا اسائنمنٹ آج نہیں بلکہ کل یا پرسوں ہی سب مٹ کروا چکی ہوتی''۔ اپنی کسی

کلاس فیلو سے بڑا جل کر بولی تھی اور اس کی یہ بات سیدھی جا کر میرے دل پر لگی تھی۔ وہ پریشان تھی، مشکل میں تھی اور میں کیا اس قابل بھی نہیں تھا کہ اس کی پریشانی دور کر سکوں۔ خاور اور اسد نے دو تین مرتبہ مجھے میری بے توجہی پر ٹوکا تو میں نے ان سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے معذرت کی اور کھڑا ہو گیا۔ میری وجہ سے وہ لوگ بھی اُٹھ گئے اور گھر جانے کے لیے ہم تینوں ہی پارکنگ کی طرف آ گئے۔ گاڑی کا لاک کھولتے میں نے ایک دم سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

''دیکھو ذرا مجھے یاد ہی نہیں رہا، ڈاکٹر شیراز نے مجھے اپنے آفس میں بلایا تھا۔ ایسا کرو تم لوگ نکلو، میں بعد میں آ جاؤں گا''۔ ان لوگوں کو رخصت کر کے میں لائبریری چلا آیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ مصیبت کی ماری، دکھیاری خاتون یہیں پائی جاتی ہوں گی۔ نوٹس بورڈ سے اسائنمنٹ کے سوالات تو میں پہلے ہی اُتار چکا تھا، جس کام کے لیے محترمہ کبھی ایک کتاب اُٹھا رہی تھیں، کبھی دوسری، وہ بھی کوئی کام تھا۔ میں نے دس پندرہ منٹ میں اسائنمنٹ میں موجود تمام حل طلب باتوں کو واضح کیا۔ میں چاہتا تو پورا کا پورا بھی حل کر سکتا تھا، مگر یہ بات مجھے پسند نہیں تھی اور جو بات مجھے ناپسند ہو، وہ میں کسی کے مجبور کرنے پر بھی نہیں کرتا۔ وہ ادھر سے اُدھر لائبریری میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ اس لیے مجھے وہ صفحات اس کی فائل کے اندر رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کے فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہ ہوئی ہوگی۔ اگلے روز اس کی ہنستی مسکراتی شکل دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ ویسے اتنی ذرا سی بات پر اس کا یوں ٹینس ہونا مجھے اچھا نہیں لگا تھا، جب بھی کبھی زندگی میں موقع آیا اور ہم ساتھ بیٹھے تو میں اسے اس بات پر ضرور ٹوکوں گا۔ ایک اسائنمنٹ کے پیچھے جو اپنا حشر کر لے اسے اگر کبھی زندگی میں کسی سنگین اُلجھن کا سامنا کرنا پڑے تو وہ تو پتا نہیں کیا کر ڈالے گی۔ غوری صاحب کے آفس میں اسائنمنٹ جمع کروا کر وہ بڑی خوش اور گردن اکڑائے نکل رہی تھی اور اسے خوش دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ پھر اس روز سیمینار والے دن تو مجھے مزہ ہی آ گیا۔ آخر کار میں محترمہ کو امپریس کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ گو میں نے ایسی کوئی شعوری کوشش نہیں کی تھی۔ شاید مجھے خود پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا۔ مجھے کبھی بھی اس بات کی فکر نہیں ہوئی تھی کہ آیا وہ مجھے پسند کرے گی یا نہیں۔ مجھے اپنی تعریف سن کر کبھی بھی اتنی خوشی نہیں ہوئی، جتنی اس روز اس کے منہ سے اپنے لیے توصیفی کلمات سن کر ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہی تو پراؤڈ ہے یہ بندہ۔ میں بھی اگر اتنی ہی جینئس ہوتی پلس یہ کہ اتنی ہی پُراعتماد اور شان دار شخصیت کی مالک ہوتی تو پراؤڈ نس میں اس سے دو جوتے آگے ہی ہوتی۔ میں تو کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہ کرتی''۔ دوسری بہت سی لڑکیوں کی طرح وہ بھی مجھے مغرور سمجھتی تھی۔

''یار کتنی لکی ہوگی وہ لڑکی جسے اتنا شان دار بندہ پسند کرے گا''۔ اس کے اس جملے پر میں جو خاور وغیرہ کے ساتھ اس سے چند قدم پیچھے ہی چل رہا تھا، بے اختیار مسکرا دیا۔ میرا دِل چاہا کہ اس سے کہوں۔

''وہ لکی لڑکی تم ہی ہو جسے اس اتنے شان دار بندے نے پسند کیا ہے''۔ مگر خود پر ضبط کرتا میں خاموشی سے اس کے پاس سے گزر گیا۔ اگلی بار وہ ڈاکٹر عرفان کے کمرے میں حسب معمول پریشان حال داخل ہوئی۔ میں جو اس کی اتنے دنوں کی غیر حاضری پر تشویش میں مبتلا ہونے لگا تھا، اسے سامنے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ اس کے ساتھ پھر وہی پرانا مسئلہ تھا۔ پتا نہیں اس لڑکی کو بات بے بات پریشان ہونے کا اس قدر شوق کیوں ہے۔

ڈاکٹر عرفان نے ظاہر ہے اسے صاف انکار کر دیا تھا اور وہ منہ لٹکائے وہاں سے چلی گئی تھی۔ میں نے وہیں ڈاکٹر صاحب سے اسائنمنٹ

کے سوالات معلوم کیے اور اُٹھ آیا۔ لائبریری میں آیا تو وہ اسی روز کی طرح پریشان حال ہونق نظر آئی۔ میں اس سے کافی فاصلے پر دوسری ٹیبل پر بیٹھ گیا اور جلدی جلدی اس کے مسائل کا حل نکالنے لگا۔ وہ جیسے ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی میں بھی جلدی سے اُٹھ گیا اور تیزی سے لاکر وہ صفحات اس کی فائل کے اوپر رکھ دیئے۔ میں صفحات رکھ کر ہٹا ہی تھا کہ وہ ایک دم واپس آ گئی۔ شکر تھا کہ اس نے مجھے یہ حرکت کرتے دیکھا نہیں تھا۔ میں جلدی سے لائبریری سے باہر نکل گیا۔ اس کے ایکسپریشن میں نے دور ہی سے دیکھ لیے تھے۔ وہ آنکھوں میں حیرانی بھرے ان پیپرز کو تک رہی تھی۔ میں نے اسے حیران پریشان چھوڑ کر اپنی راہ لی تھی۔

اس روز کے بعد میں ہر وقت اس کی آنکھوں میں اُلجھن اور حیرانی دیکھا کرتا تھا۔ پہلے پہل تو میں نے صرف اس کی مدد کے خیال سے ایسا کیا تھا مگر اب میں صرف اس کی وہ اُلجھی ہوئی حیران شکل دیکھنے کے لیے کبھی اس کی فائل میں اسائنمنٹ، کبھی نوٹس اور کبھی اس کی مطلوبہ کتب رکھنے لگا۔ یہ تمام کام میں اتنی چالاکی سے کرتا تھا کہ کسی کو بھی اس کا پتا نہیں چلتا تھا۔ میں نے سوچا تھا جس روز لاسٹ پیپر دے کر فارغ ہوں گا، اس دن محترمہ سے دو بدو گفتگو ہوگی۔ مگر ہوا یہ کہ ڈیڈی نے اچانک ہی مجھ سے بزنس کے کام سے ٹیکساس جانے کے لیے کہا۔ جس دن میرا آخری پیپر تھا، اسی روز میری روانگی تھی۔ جانے کی افراتفری اس قدر مچی تھی کہ میں پیپر دے کر سیدھا گھر آ گیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ میں جاتے جاتے ایک بہت ہی ضروری کام ادھورا چھوڑ کر جا رہا ہوں، مگر کیا کرتا ڈیڈی نے سارا پروگرام اتنا اچانک بنایا تھا کہ میں کچھ کر ہی نہیں پایا تھا۔ پھر بھی جانے سے پہلے میں نے مما کے گوش گزار کر دیا تھا کہ انہیں اپنی بہو ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ کام خود ہی سرانجام دے چکا ہوں۔ ٹیکساس میں، مجھے میری توقع کے برخلاف زیادہ ہی وقت لگ گیا۔

پورا ڈیڑھ مہینہ وہاں آفس کے کاموں میں مصروف رہ کر جب میں واپس کراچی آیا تو مجھ سے زیادہ مما اس بارے میں ایکسائیٹڈ تھیں۔ وہ فوراً سے بیشتر عینا کے گھر جانا چاہتی تھیں، میں نے انہیں بڑی مشکلوں سے چند دن رکنے کے لیے آمادہ کیا۔ وہ حیران تھیں کہ مجھے آخر انتظار کس چیز کا ہے۔ اب میں اپنی بھولی بھالی مما کو یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ آپ کی ہونے والی بہو سے اپنی پسندیدگی کا اظہار مجھے خود کرنا ہے اور وہ بھی ویلنٹائن ڈے پر۔ اٹھائیس جنوری کو میں واپس آیا تھا اور اب چودہ فروری کا انتہائی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

☆

لائبریری میں بیٹھ کر کل ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری کرتی میں ہمیشہ ہی کی طرح اِردگرد سے بے نیاز بیٹھی تھی۔ میں تو شاید یونہی پڑھتی رہتی اگر جو اچانک ہی شدید قسم کی بھوک لگنی نہ شروع ہوگئی ہوتی۔ کیفے ٹیریا جانے سے بہتر میں نے یہی سمجھا کہ گھر جا کر ممی کے ہاتھ کے بنے مزے دار کھانے کھائے جائیں۔ اس لیے اپنی چیزیں سمیٹ کر اور بیگ کندھے پر ڈال کر لائبریری سے نکل آئی۔ آج یونیورسٹی میں بسنت میلہ تھا، اس لیے ہمارا ڈیپارٹمنٹ تقریباً خالی ہی تھا۔ زیادہ تر اسٹوڈنٹس بسنت منانے پہنچے ہوئے تھے۔ کوریڈور میں سامنے سے آتے ذیشان حیدر کو دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے چونکی تھی۔ چونکی اس لیے تھی کہ وہ وہاں ہاتھ میں بڑا خوب صورت سا بکے اُٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں پھول دیکھ کر مجھے ایک دم یاد آیا کہ آج کیا تاریخ ہے اور تاریخ یاد آتے ہی خوامخواہ میرے ہونٹوں سے ایک سرد آہ برآمد ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے چلتی اس کے سامنے

سے گزر جانا چاہتی تھی کہ اس نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔

''عینا!'' میں ایک دم چونک کر رُک گئی تھی۔ اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا۔ میں اس کی طرح ڈیپارٹمنٹ کی کریم تو تھی نہیں کہ ہر کوئی مجھے جانتا ہو۔ وہ میری طرف مُسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے تو سنا تھا وہ کسی لڑکی سے بات نہیں کرتا اور خود دیکھا بھی تھا، اسے مغرورانہ انداز میں چلتے پھرتے۔ پھر وہ مجھ سے کیوں مخاطب تھا۔

''کیسی ہو عینا!'' اس سوال پر میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ میری خیریت یوں دریافت کی جا رہی تھی جیسے کب کے بچھڑے دوست اچانک مل گئے ہوں۔ مارے حیرانی کے میں کوئی جواب بھی نہ دے سکی، صرف اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ وہ میری حیرانی سے قطع نظر گہری مسکراہٹ سمیت مجھے دیکھ رہا تھا۔

''میں ذیشان حیدر، تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بولو قبول ہے''۔ اس کے اس جملے پر میں ہونق بنی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ یہ ہو کیا رہا تھا میرے ساتھ، میں سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ وہ گلدستہ میری طرف بڑھائے اس طرح کھڑا تھا جیسے مجھے اسے قبول کرنے میں ہرگز کوئی عار نہ ہوگی۔

آپ کا مطلب کیا ہے اس بات سے''۔ مجھے اس کی بے باکی پر ایک دم ہی شدید قسم کا غصہ آیا تھا۔ کیا میں ایسی گئی گزری تھی کہ کوئی بھی راہ چلتا مجھے شادی کی آفر کرتا پھرے۔

''میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے''۔ وہ جواباً قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اس طرح جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے۔

''آپ نے تو کہا تھا کہ آپ وہ بکے قبول کر لیں گی۔ آج پتا چلا کہ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دیکھ لیں بندہ بولڈ بھی ہے، کانفیڈنٹ بھی اور آج ویلنٹائن ڈے بھی ہے۔ اب آپ خود ہی اپنی کہی بات سے مکر جائیں گی یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا''۔ وہ کتنی عجیب سے باتیں کر رہا تھا جس شخص سے میری کبھی سلام دعا بھی نہ ہوئی ہو وہ آئے اور آ کر میری ہی کہی کسی بہت پرانی بات کا حوالہ دے تو ظاہر ہے میں ڈروں گی ہی۔

''ڈرو نہیں، میں کوئی جن بھوت نہیں ہوں''۔ اس نے میری شکل سے شاید میرے ڈرنے کا پتا چلا لیا تھا۔ اس لیے ہنس کر بولا۔

''ویسے آج کل تمہارے اسائنمنٹ پایہ تکمیل تک کس طرح پہنچتے ہیں۔ سنا ہے کوئی جن تم پر عاشق ہو گیا تھا''۔ وہ بڑے شرارتی انداز میں بولا تھا اور اچانک ہی میرے اتنے دنوں کی الجھنوں کا خاتمہ بھی ہو گیا تھا۔ تو وہ گمنام ہمدرد ذیشان تھا، مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ مجھے کبھی ایسا فیل کیوں نہیں ہوا کہ وہ شخص ذیشان ہے۔ کیا میں اتنی خوش قسمت تھی کہ جس شخص کے پیچھے ایک زمانہ پڑا تھا، وہ میرے بارے میں سوچتا تھا۔ وہ مجھے مزید حیران ہونے کا موقع دیے بغیر بولا۔

''کب سے ہاتھ بڑھائے کھڑا ہوں۔ اب تو اسے ایکسیپٹ کر لو''۔ اور میں نے بلا تامل وہ بکے پکڑ لیا تھا۔ اپنی اس بے اختیاری پر اگلے ہی پل میں سخت شرمندہ ہوئی تھی اور میرا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر وہ بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ میں اس سے بہت سی باتوں کی وضاحت چاہتی تھی مگر اس وقت سوائے بے وقوفوں کی طرح شرمانے کے اور کچھ کیا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''مجھے پتا ہے تم مجھ سے بہت سی باتیں جاننا چاہتی ہو۔ انشاء اللہ وقت آنے پر وہ ساری باتیں کریں گے۔ اس وقت تو میں صرف یہ پھول

تمہیں دینے آیا تھا۔ آج شام میں میری مما اور ڈیڈی تمہارے گھر آئیں گے۔ اوکے بائے۔'' وہ مجھے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع دیئے بغیر جا چکا تھا اور اب ان سرخ گلابوں کو ہاتھ میں تھامے جیسے میں کسی اور ہی دُنیا میں پہنچ گئی تھی۔ آج صبح میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آج کا دن میری زندگی میں خوشیوں کے انمول خزانے لانے والا ہے۔ کیا واقعی بعض لمحے قبولیت کے ہوتے ہیں۔ ان میں جو مانگا جائے وہ ضرور ملتا ہے۔ میری زندگی میں بھی وہ لمحہ شاید قبولیت ہی کا تھا۔ جو کچھ میں چاہتی تھی، وہ سب مجھے میرے رب نے دے دیا تھا۔ میں جیسے زمین پر نہیں چل رہی تھی، بلکہ ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ اپنا آپ بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ اب کا موسم بہار واقعی میری زندگی میں بہاریں لے آیا تھا۔ مجھے گھر پہنچنے کی ایک دم جلدی تھی۔ ابھی گھر جا کر مومو، فارینہ اور نگار کو آج کا یہ اہم ترین واقعہ سنانا ہے.....اور سب سے اہم بات شام میں آنے والے مہمانوں کے استقبال کی تیاریاں بھی تو کرنی ہیں

❁.....❁

ختم شد